



جناب مالک رام کو ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ ملنے کی خوشی میں اور پاکستان کے مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر انور سجاد کی
ہندوستان تشریف آوری کے موقع پر انجمن ترقی اُردو (ہند) کے جنرل سیکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی رہائش گاہ
پر عصرانہ دیا۔ تصویر میں دائیں طرف سے ڈاکٹر انور سجاد، جناب مالک رام، سرور تونسوی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور میزبان



ڈاکٹر نثار فاروقی، کرنل بشیر حسین زیدی، جناب مالک رام، سرور تونسوی، ڈاکٹر انور سجاد اور [illegible]



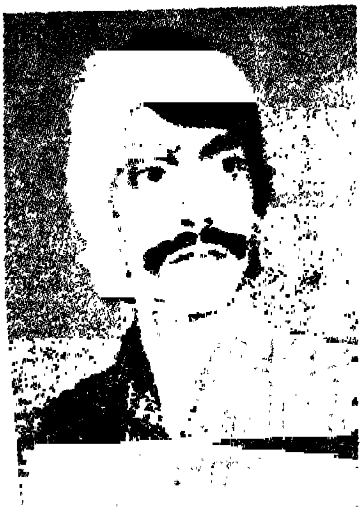


عرفان پربھنوی

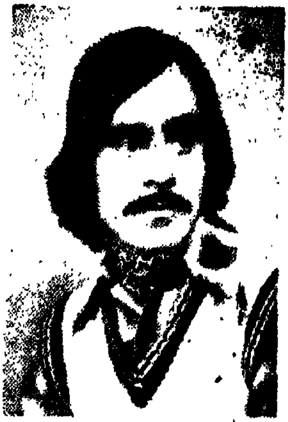


جناب جوہیں نحیف دہلوی کا
مجموعہ کلام "آوازِ دل" جسے دفتر شانِ
ہند نے شائع کیا ہے

جناب زیڈ اے ہلال
ایڈوکیٹ سناود







جناب عبدالمالک محبوب کھڑا
ہزاری باغوی بوکارو سٹیل سٹی

جناب اختر سعیدی (رانچی)



برصغیر ہند و پاک کے مشہور افسانہ
نگار جناب رام لعل صاحب کے سفرنامہ
پاکستان "زرد پتوں کی بہار" کے بعد
سفرنامہ یوروپ "خواب خواب سفر" نے
سفرناموں کے انداز تحریر کو ایک نیا موڑ دیا ہے



جناب عبدالرب نشتر فتحپوری



نعت و منقبت کا منفرد شاعر
علامہ آرزو سہارنپوری جو ۲۵/دسمبر ۸۳ء
کو انتقال فرما گئے۔



جناب احتشام اشرف خان گوہر
امراپوری

قارئینِ شانِ ہند کو ۳۴ واں جشنِ جمہوریت مبارک



جناب فخرالدین چکی والا

مالک المور یجی ٹریڈنگ کمپنی کویت کے حکم سے بزمِ سخن کویت نے دو طرحی غزلوں پر بہترین غزلیں کہنے والے شعرا کے لیے پانچ صد امریکی ڈالر کا انعام دینے کا اعلان کیا تھا۔

ان طرحی غزلوں کا فیصلہ ہو چکا ہے جس کا اعلان بہت جلد شانِ ہند میں شائع کیا جا رہا ہے۔

مستحق شعرائے کرام کو انعامات وزیر اعظم صاحبہ ہند کے مبارک ہاتھوں سے دیئے جائیں گے۔



الحاج جناب نصیر فتح پوری جن کا انتقال پچھلے دنوں ہوا آپ جناب عقیل صدیقی (بانڈہ) کے والدِ محترم تھے۔



ماسٹر چھجّل سنگھ بی۔اے آنرز
مری ہرگو بند پور

ٹیلی فون نمبر ۲۷۵۰۹۲ — رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۴۴۸۴ — رجسٹرڈ نمبر دہلی DN/۳۰۷۰

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
واعظ پرست ہوں نہ کلیسا پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں

فیاض گوالیاری

ماہنامہ

شانِ ہند نئی دہلی

جشنِ جمہوریت نمبر

ایڈیٹر
سرور تونسوی

فی پرچہ ۲/۵۰ روپیے
زرِ سالانہ = ۲۴/ روپیے
اس شمارہ کی قیمت = ۱۲/ روپیے

جلد نمبر ۴۵ — جنوری ۱۹۸۴ء — شمارہ نمبر ۱

۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء سے ہر سال

۲۶ جنوری ہمیں یاد دلاتی ہے

کہ

ہم ایک ایسے جمہوری ملک کے باشندے ہیں جو دنیا بھر میں اپنی کچھ روایات کے لئے مشہور ہے

آئیے آج ۲۶ جنوری ۱۹۸۴ء کو ہم پھر اس عہد کو دہرائیں کہ ہم اپنے ملک کا کسی طور پر بھی سر نیچا نہیں ہونے دینگے

اور وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی کے بیس نکاتی پروگرام کو کامیاب بنانے میں ہی اپنی اور اپنے ملک کی بہتری سمجھتے ہیں۔

ہندوستان زندہ باد اور ہماری جمہوریت پائندہ باد

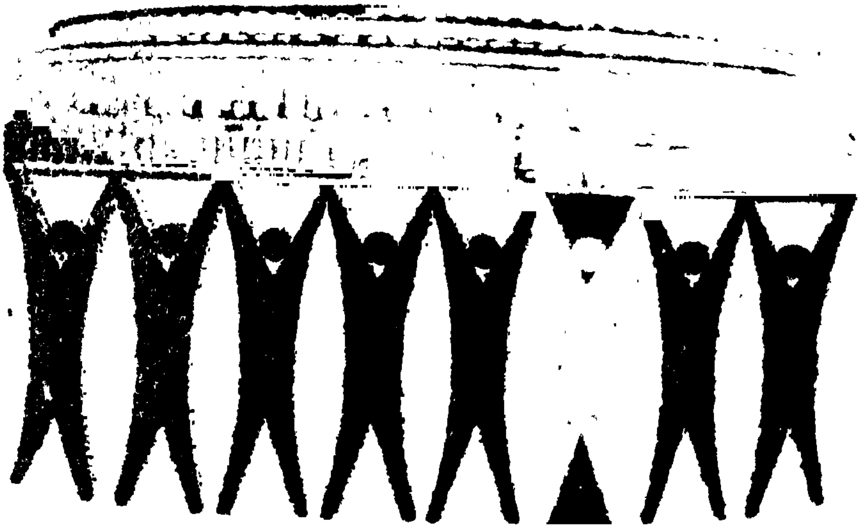
پرنٹر، پبلشر نے [illegible] خواجہ پریس [illegible] جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند [illegible] دہلی سے شائع کیا

یوم جمہوریہ

کی اس 34 ویں سالگرہ پر

آیئے حلف اٹھائیں کہ ہم

- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]



ان تمام طاقتوں سے ہوشیار رہیں گے
جو ہمیں کمزور کرنا چاہتی ہیں

موجودہ اور آئندہ

چنوتیوں

کا مقابلہ کرنے کو مستعد رہیں گے

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ وصبا چہ کرد؟

مشاعرہ لال قلعہ

۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان آزاد ہوا تو اردو شاعری تو کیا خود "اردو" کو ملک بدر کیا جا رہا تھا جب حالات قدرے سنبھلے اور ہندوستان کو ایک جمہوری ملک قرار دیا گیا تو اس موقع پر ۱۹۵۰ء میں پہلا جشن جمہوریت منایا گیا جو اس وقت کے چیف کمشنر جناب شنکر پرشاد صاحب کی سرپرستی اور اس وقت کے سٹی مجسٹریٹ کنور مہندر سنگھ بیدی کی دیکھ ریکھ میں تین دن تک لال قلعہ کے دیوانِ خاص میں منعقد ہوا۔ اس جشن میں ہندی کوی سمیلن، پنجابی کوی دربار اور اردو مشاعرہ بھی ہوا۔ باوجود کچھ اختلافات کے یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس جشن جمہوریت میں جو اردو مشاعرہ ہوا پھر لال قلعہ نے ویسا مشاعرہ نہیں دیکھا۔ قریب قریب ملک کے ہر حصہ کے صفِ اول کے شعرائے کرام اس مشاعرہ میں مدعو تھے جن میں سے نوے فیصد شعراء اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو بہ نفسِ نفیس اپنی ہمشیرہ محترمہ وجے لکشمی پنڈت اور اپنی بھانجی ریٹا کے ساتھ اس مشاعرہ میں تشریف لائے اور تقریباً ڈھائی گھنٹے تک شعراء کا کلام سماعت فرماتے رہے اور دوسرے روز حضرت جوش ملیح آبادی سے وہی کلام اپنی رہائش گاہ پر سنا جو کہ جوش صاحب نے مشاعرہ میں سنایا تھا۔ اس کے بعد ہر سال یہ روایت رہی کہ ۲۶ جنوری کو لال قلعہ میں جشن جمہوریت کے مبارک موقع پر ایک دن ہندی کوی سمیلن دوسرے دن اردو مشاعرہ اور تیسرے روز پنجابی کوی دربار منعقد کیا جاتا رہا۔ چونکہ ۲۶ جنوری کی پریڈ وغیرہ خالص ڈیفنس منسٹری کا معاملہ تھا لہٰذا اس سلسلے کی دوسری تقریبات کا انتظام بھی ڈیفنس منسٹری کے سپرد رہا اور ۱۹۵۳ء میں ڈیفنس منسٹری کی طرف سے جناب گلزار دہلوی صاحب کو ایک خط موصول ہوا کہ چونکہ ہر سال جشن جمہوریت کے مبارک موقع پر مشاعرہ سرکاری طور پر منعقد ہوتا ہے اس لئے آپ اپنی انجمن تعمیر ادب کے تحت اس قومی تقریب پر مشاعرہ الگ سے کرانے کی نسبت سرکاری مشاعرہ کو بہتر بنانے میں تعاون دیں۔

کچھ سالوں تک یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ مگر اس میں دو رائیں قطعاً نہیں ہو سکتیں کہ مشاعرہ ہر سال اپنی روایات کے مطابق ہوتا رہا اور نہ معلوم کن وجوہات کے باعث ڈیفنس منسٹری نے مشاعرہ ہندی کوی سمیلن اور پنجابی کوی دربار کا معاملہ دہلی انتظامیہ کے سپرد کر دیا۔ اور ۱۹۶۲ء تک یہاں اردو مشاعرہ ایسا ہوتا رہا جسے لال قلعہ کی مناسبت سے معیاری مشاعرہ کہا جا سکتا تھا اور اس کے بعد مشاعرہ کمیٹی کے ارکان کی بے جا سفارش اور نا اہل شعراء کے باعث لال قلعہ کے مشاعرے کا معیار ہر سال کم سے کم تر ہوتا چلا گیا۔

راقم الحروف نے ۱۹۶۳ء تک لال قلعہ کے مشاعرے قلم بند کئے مگر جب لال قلعہ کے اس مشاعرہ کو ایک قومی مشاعرہ کی نسبت عوامی مشاعرہ کی شکل میں پایا تو لال قلعہ کے مشاعرہ کی کارروائی قلم بند کرنی ترک کر دی۔

چونکہ آج سے بیس سال پہلے یہ حالت ہو گئی تھی کہ جشنِ جمہوریت کے اس مشاعرہ میں جس شاعر نے بھی قومی یک جہتی حب الوطنی اور فرقہ پرستی کے خلاف کلام سنایا اسے بُری طرح ہوٹ کیا جاتا۔ جبکہ ہندی کوی سمیلن اور پنجابی دربار میں وطن کی حب الوطنی اور قومی ایکتا پر مبنی کویتائیں بڑے ہی سکون سے سنی جاتی ہیں اور انھیں سراہا جاتا ہے۔

اردو مشاعرہ میں سامعین کی تعداد بیشتر مسلم حضرات کی ہوتی ہے اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مسلمان سامعین قومی یک جہتی وطن پرستی اور حب الوطنی پر مبنی کلام سننے کی بجائے عشقیہ

اور بدذوقی کی حد تک مزاحیہ کلام سننا پسند کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ لال قلعہ کا یہ خالص قومی مشاعرہ عشقیہ اور گھٹیا قسم کی مزاحیہ شاعری کی آماجگاہ بن کر رہ گیا ہے اور اسی وجہ سے گذشتہ بیس سال سے راقم الحروف نے لال قلعہ کے اس قومی مشاعرہ کو قلم بند کرنا تو درکنار اسے سننا بھی پسند نہیں کیا۔

اس سال ساہتیہ کلا پریشد اور اردو اکاڈمی دہلی کے تعاون سے یہ مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے لہٰذا اردو اکاڈمی دہلی کے سکریٹری جناب ظہیر الحسن صاحب نقوی کا فرمان ہے کہ ایڈیٹر شانِ ہند اس مشاعرہ کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سُنا حال قلم بند کرے۔ اور راقم الحروف نے نقوی صاحب کے اس فرمان کی تکمیل کا وعدہ بھی کر لیا ہے لہٰذا شانِ ہند کی آئندہ اشاعت میں لال قلعہ کے مشاعرے کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سُنا حال آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔

نیشنل پوئیٹ

ایک سرکاری دفتر کے سربراہ کی میز پر ایک وزیٹنگ کارڈ پر نظر گئی "نیشنل پوئیٹ" کارڈ اٹھا کر پڑھا تو انگریزی حروف میں لکھا تھا امیر دہلوی (نیشنل پوئیٹ) ہندوستان نواب اور راجے اپنے دورِ حکومت میں چاپلوس اور خوشامدی قصیدہ گو شعراء کو کسی نہ کسی خطاب سے نوازا کرتے تھے اور جو شاعر قصیدہ گوئی میں زیادہ سے زیادہ جھوٹی تعریف کرتا اسے درباری شاعر کا معزز القاب عطا فرمایا جاتا تھا جب سے ہندوستان آزاد ہوا ہے ہمارے شعرائے کرام کو قصیدہ گوئی یا خوشامد کی بجائے ان کی قومی شاعری پر "پدم شری" "پدم وبھوشن" ایسے اعزازات سے نوازا جا رہا ہے مگر کسی بھی شاعر کو قومی شاعر یا "نیشنل پوئیٹ" کا اعزاز نہیں بخشا گیا مگر آفریں ہے امیر دہلوی کے زرخیز دماغ کی کہ انھوں نے اپنے لئے از خود "قومی شاعر" کا اعزاز منتخب کر لیا اور نہایت بے باکی کے ساتھ اپنے نام کے ساتھ اس انداز سے نیشنل پوئیٹ لکھا ہے کہ جیسے یہ اعزاز انھیں قوم یا حکومت نے بخشا ہو "پدم شری" یا "پدم وبھوشن" ایسے قومی اعزاز پانے والے شعراء یا دوسرے حضرات اپنے نام کے ساتھ ان اعزازات کو لکھ نہیں سکتے۔ مگر ہمارے "نیشنل پوئیٹ" کی داد دیجئے کہ انھیں اپنے نام کے ساتھ اس خودساختہ اعزاز کو لکھنے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔

ہمیں امیر دہلوی کے اس خود عطا کردہ اعزاز پر کوئی اعتراض نہیں ہے وہ چاہیں تو اپنے نام کے ساتھ آل ورلڈ پوئیٹ بھی لکھ سکتے ہیں۔ مگر ستم ظریفی تو یہ ہے کہ جب عوام اس نیشنل پوئیٹ کا کلام کسی مشاعرہ میں سُنتے ہیں تو وہ سنجیدگی سے سوچتے ہیں کہ اگر نیشنل پوئیٹ کا کلام ایسا عامیانہ ہے تو دوسرے شعراء کا کیا حال ہوگا۔ داد دیجئے مشاعرہ کمیٹی کے ممبران کو جنھوں نے اس مرتبہ لال قلعہ کے مشاعرہ جشنِ جمہوریت میں اس خودساختہ نیشنل پوئیٹ کو مدعو کر کے اپنے ذوقِ سلیم کا مظاہرہ اور سامعین کے ساتھ مذاق کیا ہے۔"

ہندی بنام اردو

ہندی ساہتیہ سمیلن پریاگ نے لکھنؤ ہائی کورٹ میں یو۔پی گورنمنٹ اور گورنر یو۔پی کے خلاف اردو کو یو۔پی کی دوسری سرکاری زبان بننے کا بل پیش کرنے کے خلاف رٹ داخل کی ہے جس کی سماعت منظور کر لی گئی ہے۔

آل انڈیا غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس کے جنرل سکریٹری اور کنوینر کی حیثیت سے جناب رام لعل صاحب بھی ایک فریق کی حیثیت سے ساہتیہ سمیلن پریاگ کی اس رٹ کا سامنا کریں گے چنانچہ اس سلسلہ میں رام لعل صاحب نے اپنا وکالت نامہ قانونی مشیر کے حوالے کر دیا ہے جناب رام لعل صاحب جو حلف نامہ اس سلسلے میں دے رہے ہیں اس میں کانفرنس کے جملہ منعقدین اور قرار دادوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

حضرت آرزو سہارن پوری کا انتقال

برصغیر ہند و پاک میں نعت اور منقبت کے بادشاہ حضرت آرزو سہارن پوری کا ۱۵ دسمبر ۱۹۸۳ء کو سہارنپور

میں کسمپرسی کے عالم میں انتقال ہو گیا۔ آرزو صاحب نے اپنی عمر میں خدمتِ خلق کے لئے جو کام انجام دیئے اس کی وجہ سے انھوں نے اپنی عاقبت سنوار لی۔ لیکن پاکستانی روزنامے صفِ اول یا آرزو صاحب کی نعتوں کو بڑے اہتمام سے اب تک شائع کر رہے ہیں۔

مگر اس حقیقت کا صرف چند حضرات کو ہی علم ہے کہ آرزو صاحب غیر مسلم تھے اور ان کا اسم گرامی سادھو رام تھا مگر نعت و منقبت کے میدان میں اُن کے مقابلہ میں کسی بھی مسلمان شاعر کا نام نامی پیش نہیں کیا جا سکتا۔ جب آرزو صاحب کراچی میں مقیم تھے تو ان کی نعت گوئی اور خصوصاً حضرت حسینؓ اور حضرت علیؓ کے مدح و ثنا میں مناقب کی پسندیدگی کے باعث ایک سرکردہ شیعہ گھرانے کی صاحبزادی نے یہ پیش کش کی کہ اگر وہ شیعہ مسلمان ہو جائیں تو وہ ان سے شادی کرنے کو تیار ہیں یہ شیعہ گھرانا آرزو صاحب کو اپنے ہمراہ کربلا شریف کی زیارت کو بھی لے گیا۔ مگر آرزو صاحب نے تبدیلیٔ مذہب سے معذوری ظاہر کی اور کراچی چھوڑ کر حیدرآباد دکن چلے آئے اور حیدرآباد میں انھوں نے شہزادہ نیلوفر کے اتالیق کے فرائض انجام دیئے۔

آرزو صاحب کے متعدد مجموعہ ہائے کلام شائع ہوئے جن میں سے اب کوئی مجموعہ نہیں ملتا۔ غزل کے میدان میں بھی آرزو صاحب اپنا ایک اعلیٰ اور ارفع مقام رکھتے تھے۔ ان کی نعتوں کا مجموعہ "ظہورِ قدسی" کے پانچ ایڈیشن شائع ہوئے۔ ظہورِ قدسی بھی اب کہیں نہیں ملتا مگر کہا جاتا ہے کہ نعتوں کا ایسا مجموعہ اردو ادب میں کم ہی پایا جاتا ہے۔ ان کی مناقب کا مجموعہ جو (ہندوستانی اور پاکستانی) متعدد ولی اللہ حضرات کی شان میں کہی گئی ہیں۔

"بہارستانِ اولیاء" کی ایک صد جلدیں جناب فخر الدین صاحب چکی والا (کویت) نے اکثر و بیشتر درگاہوں کو مفت بھجوائیں۔ دفتر شانِ ہند میں کچھ جلدیں موجود ہیں۔ مناقب کا یہ مجموعہ ایڈیٹر شانِ ہند نے مرتب کیا ہے۔ سال ۱۹۸۳ء کے شروع میں انجمن پرورشِ اردو اکاڈمی نے آرزو صاحب کی ادبی و علمی خدمات کے باعث دو صد روپئے ماہوار [illegible] منظور کی تھی۔ آرزو صاحب نے زندگی کا بیشتر حصہ کلکتہ میں گزارا اور اپنی شرافت۔ حسنِ اخلاق اور اعلیٰ انسانیت کے باعث اہلِ کلکتہ کے دلوں کو مسخر کیا اور ہر ہندو، مسلمان اُن کی عزت کرتا تھا۔ آرزو صاحب کی موت اُردو ادب کے لئے یقیناً ایک ایسا سانحہ ہے جس پر جس قدر بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ کی شاخ دہلی نے جو ترقی چند دنوں میں کی ہے اس کی مثال بینکنگ کے زمرہ میں ملنا مشکل ہے اس بینک کی دیگر خصوصیات کے علاوہ یہ خصوصیت عوام کے دلوں میں گھر کر گئی ہے کہ بینک کے جملہ ملازمین تہذیب و شرافت سے بات کرتے ہیں جس سے حساب داروں کو ایک قسم کی دلی خوشی ہوتی ہے۔ آجکل نیشنلائزڈ بینکوں میں عوام کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے اس کی امید پولیس اسٹیشنوں کے بعض بد دماغ پولیس ملازمین سے بھی نہیں کی جا سکتی۔

اس بینک کی دلی شاخ میں اس وقت گیارہ ہزار سے زیادہ کھاتے ہیں اور کھاتے داروں کی بھیڑ بینک کے اوقاتِ کار میں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے مگر کیا مجال ہے کہ کسی بھی کھاتے دار کو بینک کے کسی ملازم سے بدسلوکی کی شکایت ہو۔

جناب ایس شمیم کاظم صاحب نے جب اس بینک کی دلی شاخ کا چارج سنبھالا تھا تو وہ ایک منیجر کی حیثیت سے آئے تھے مگر انھوں نے اپنی ان تھک کوششوں، بہترین ذہانت اور خدمتِ خلق و قوم کے جذبے کے تحت اس بینک کو آج کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے اور بینک کے ذمہ دار سربراہوں نے بھی جناب ایس شمیم کاظم صاحب کی قابلِ تعریف خدمات کے پیشِ نظر انھیں شمالی ہندوستان کا ڈپٹی جنرل منیجر بنا دیا ہے۔

اس وقت اس بینک کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اہلِ دہلی، بلی ماران اور نئی دہلی میں اس بینک کی برانچیں جاری کئے جانے کی سخت ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ میرٹھ

مرادآباد، لکھنؤ اور دیگر کئی مقامات میں اس بینک کی شاخیں قائم کئے جانے کے لئے عوام کی زبردست خواہش ہے۔ لہٰذا بینک ہٰذا کے چیئرمین جناب حسنی ایس ڈاکٹر اور مینیجنگ ڈائریکٹر جناب زین حق زیگون والا کا فرض ہے کہ وہ اس سلسلہ میں ہر ممکن کوشش فرمائیں۔

دُور درشن کی ناکام نیو ایئر ایو

اس سال ۳۱ دسمبر کی رات کو دُور درشن کی طرف سے "نیو ایئر ایو" کے لئے جو پروگرام پیش کیا گیا وہ سابقہ سالوں کی نسبت نہ صرف کمزور تھا بلکہ مضحکہ خیز بھی تھا۔ حالانکہ اس شام کو دُور درشن دہلی نے "آشنگین" کسی حد تک اچھا پروگرام پیش کیا۔ بمبئی سے جو پروگرام اس سلسلہ میں پیش کیا گیا وہ اس حد تک مضحکہ خیز تھا۔ کہ عوام کا وقت ضائع کرنے کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا سا ریکا گوانا ڈانسر کے طور پر پیش کرنے کے لئے نہ معلوم دُور درشن کے کس افسر نے حماقت کا ثبوت دیا بیچاری کے چہرے پر بقول محترمہ شہناز کنول مدیرہ گلشن بمبئی محرّم برس رہا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یکم جنوری ۱۹۸۴ء کو "فانی انسان لافانی نغمے" کے عنوان سے جو پروگرام پیش کیا گیا بہت عمدہ رہا۔ کیا سُر سنگیت تھے کیا آوازیں اور فن تھا۔ موجودہ دَور کے گانے سُن کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس جدید دَور میں سنگیت کے آلات نے تو ترقی ضرور کی ہے مگر فن نے نہیں۔ ہم مغرب کی تقلید کر کے اپنی پاکیزگی کا مذاق خود اُڑا رہے ہیں۔ جتنا اعلیٰ سنگیت ہندوستان کے پاس ہے اتنا شاید دُنیا کے کسی بھی مُلک کے پاس نہیں ہے۔ لیکن نہ جانے ہم اس احساسِ کمتری میں کیوں مبتلا ہیں۔ بہرحال اس مرتبہ نئے سال کی آمد پہ دُور درشن سے جو گھٹیا پروگرام پیش کیا گیا اس کا نوٹس وزیر متعلقہ جناب بھگت صاحب کو ضرور لینا چاہیئے۔

احتشام اشرف خاں گوہر امراپوری۔

محمد مبین نغمہ (سورت)

خوبصورت قدرتی مناظر سے گھری ہوئی سرزمین امراپور کا نوجوان شاعر جناب احتشام اشرف خاں گوہر ایک ایسے خاندان کا چشم و چراغ ہے جو شرافت، خلوص اور انسانی قدروں کا ہمیشہ ضامن رہا ہے گوہر صاحب کی والدہ محترمہ جیلانی بانو صاحبہ ہیڈ مسٹرس امراپور نے اپنے نورِ چشم کی اس طرح سے پرورش کی ہے کہ جملہ خاندانی اوصاف گوہر صاحب میں نمایاں نظر آتے ہیں گوہر صاحب کے ذوقِ شعری کو بڑھاوا دینے میں ان کی والدہ محترمہ کا یقینی ہاتھ ہے اور جس خوش نصیب بیٹے کو ماں کا پیار۔ ماں کی دُعائیں اور ماں کی بہترین تربیت نصیب ہو اس کے لئے کامیابی شہرت اور حصولِ عزت کی راہیں اپنے آپ ہموار ہوتی چلی جاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ گوہر صاحب کو امراپور کی فعال انجمن "بزمِ شمعِ ادب" کا صدر بنایا گیا ہے۔ بنفلن کا قول ہے کہ کوئی شاعر اس وقت تک اچھا شاعر ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ ایک اچھا انسان نہ ہو اور اس قول کی تصدیق احتشام اشرف خاں گوہر کی ذاتِ ستودہ صفات ہے گوہر صاحب جہاں ایک خوش اخلاق شیریں زبان اور نیک طینت نوجوان ہیں وہاں صحیح معنوں میں ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ گوہر صاحب سے پہلی ملاقات میں ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ان سے برسوں سے ملاقات ہو مخلصانہ سی مسکراہٹ لئے جب وہ کسی بھی شناسا یا غیر شناسا سے بات کرتے ہیں تو ہر مخاطب یہی سمجھتا ہے کہ گوہر کے دل میں اس کے لئے عزت و احترام ہے ذیل میں گوہر صاحب کے کچھ اشعار نمونۂ کلام کے طور پر دیئے جا رہے ہیں۔ فقط دعاگو۔ محمد مبین نغمہ

جس بشر میں نہ ہو خلوص و وفا ٭ وہ بشر تو بشر نہیں ہوتا
کہہ تو لیتے ہیں ہم کو سب اپنا ٭ کوئی اپنا مگر نہیں ہوتا

اک نیا دردِ دل کو دو میرے ٭ آج موسم بڑا سہانا ہے
بے سبب دل کو وہ دُکھاتے ہیں ٭ جن کی فطرت ہی دل دُکھانا ہے

چلے گا مکمل ارادوں کو لے کر ٭ وہ پائے گا منزل بشر رفتہ رفتہ
ابھی اپنی زلفیں نہ رُخ سے ہٹاؤ ٭ کہیں چھپ نہ جائے قمر رفتہ رفتہ

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گذر

— : سرور تونسوی : —

۱۹۵۰ء سے کئی سال بعد تک جشنِ جمہوریت کے سلسلے میں مشاعرہ لال قلعہ دیوانِ خاص میں ہی منعقد کیا جاتا تھا۔ شہ نشین پر صدرِ مشاعرہ بیٹھتے تھے ایک طرف نقیب الشعراء اور صدر کی دوسری طرف کلام سنانے والے شاعر بیٹھا کرتے تھے پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی (مرحوم) بھی ایک مرتبہ لال قلعہ کے مشاعرہ میں شریک ہوگئے (مدعو تو خیر انھیں ہر سال کیا جاتا تھا مگر وہ نحیف الجثہ اور پیرانہ سالی کی وجہ سے مشاعرے میں شرکت سے معذوری فرما دیتے تھے) جب ان کی باری کلام سنانے کی آئی تو وہ شاہ نشین کے قریب کھڑے ہو گئے اور فرمانے لگے کہ جس شہ نشین پر تشریف فرما ہو کر بادشاہ بہادر شاہ ظفر حکومت کا کاروبار چلاتے تھے میری مجال نہیں کہ اس شہ نشین پر بیٹھ سکوں۔ لہٰذا میں شہ نشین کے قریب ہی کھڑا ہو کر کلام پیش خدمت کر رہا ہوں۔ بیشک بادشاہ بہادر شاہ اب نہیں ہیں مگر میں ان کے بعد بھی یہ گستاخی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ کیفی صاحب نے کھڑے ہو کر کلام سنایا جس پر سامعین کی کئی منٹ تک لگاتار تالیوں کی جھنکار سے دیوانِ خاص کے در و دیوار تک کہہ اٹھے "بادشاہ بہادر شاہ زندہ باد" مگر اس ستم ظریفی کو بھی ذہن میں رکھئے کہ کیفی صاحب سے پہلے جس شاعر نے شہ نشین پر بیٹھ کر کلام سنایا وہ تھے فکر تونسوی جو لال کنواں کے علاقہ میں ان دنوں پنواڑی کی دوکان سجاتے تھے۔

میرا یہ معمول تھا کہ ہر روز صبح پنڈت دتاتریہ کیفی صاحب کے ہاں حاضری دیتا کیفی صاحب علی پور روڈ پر مرحوم سری رام کی کوٹھی میں مستقل قیام فرما تھے۔ ان دنوں ایک ہفتہ وار اخبار جو محض چار صفحات پر شائع ہوتا تھا مگر انتہائی درجہ کا ذلیل اخبار تھا۔ چنانچہ میں نے اس اخبار کے ایڈیٹر کے خلاف ایک ایڈیٹوریل لکھا جس میں اس اخبار کو "دو ورقی اخبار" لکھ گیا۔ شانِ ہند ہر ماہ میں خود ہی کیفی صاحب کی خدمت میں پیش کرتا۔ چنانچہ شانِ ہند کا یہ شمارہ بھی ان کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ دوسرے دن جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور آداب بجا لایا تو بغیر آداب کا کوئی جواب دیئے فرمانے لگے۔ پہلے یہ بتاؤ "دو ورقی" کسے کہتے ہیں میں نے بے ساختہ عرض کیا جس کے دو ورق ہوں۔ میرا اتنا کہنا تھا کہ بھویں اوپر کو اٹھا کر بڑی ناگواری کے لہجے میں فرمانے لگے تو اچھا جناب کو "دو ورقی" کے معنی بھی معلوم نہیں۔ میں نے پھر عرض کیا حضور جو معنی معلوم تھے وہ میں نے عرض کر دیئے ہیں اگر اس کے کوئی اور معنی ہیں تو آپ فرما دیجئے۔ پھر ترش روئی سے کہنے لگے بڑے ایڈیٹر بنے پھرتے ہو جو بھی ادیب شاعر یا نقاد ملاقات کے لئے آتا ہے "شانِ ہند" اور تمھارے اداریوں اور مشاعروں کی کھلی دیکھا اور کانوں سنا حال کی تعریف کرتا ہے اور حیرت ہے کہ تم یہ کہہ رہے ہو کہ "دو ورقی" کے معنی دو ورق ہوتے ہیں میں نے انتہائی عاجزی سے اقبال کیا کہ مجھے اس کے کوئی اور معنی قطعاً معلوم نہیں ہیں۔ تو کافی ترش لہجے میں کہنے لگے دو ورقی کہتے ہیں عورت کے نازک اعضاء نہانی کو جسے انگریزی میں کہتے ہیں ..... اور پنجابی میں کھتے نہیں کہتے ہیں۔ مجھ پر گھڑوں پانی پڑ چکا تھا چنانچہ میں دو چار منٹ بالکل خاموش بیٹھا رہا اور پھر اجازت لے کر چلا آیا حالانکہ ہر روز دو تین گھنٹے کی نشست ہوتی تھی

یوم غالب کے مشاعرے کا آنکھوں دیکھا کانوں سنا حال لکھ رہا تھا کہ ایک شاعر کے دو اشعار میں کچھ فنی سقم محسوس ہوا تو اس کی تصدیق کے لئے میں نے کیفی صاحب سے رجوع کیا فرمانے لگے جو کچھ تم ان اشعار کے بارے میں بتا رہے ہو اس سے کہیں زیادہ ان اشعار میں فنی اسقام ہیں۔ عرض کیا گیا کہ چونکہ میں عروض سے واقفیت نہیں رکھتا ہوں۔ اس لئے عروضی اصطلاح کے

پیشِ نظر ان اشعار کے فنی نقائص کے بارے میں آپ بولتے جائیے اور میں لکھ لیتا ہوں چنانچہ فنی اعتراضات کے بارے میں لکھاتے ہوئے آخر میں انھوں نے لکھوایا کہ ثقہ حضرات کے نزدیک یہ دلیل بے معنی ہے میں نے لکھتے وقت ثقہ کو "سقہ" لکھ دیا اور جب مضمون کاتب کو کتابت کے لئے دیا گیا تو بھی سقہ لکھا گیا اور کاتب نے بھی سقہ لکھ دیا اور اسی طرح شائع بھی ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد فرمانے لگے وہ تمھارے مضمون میں کتابت کی غلطی رہ گئی ہے ثقہ کو "س" سے لکھا گیا ہے کیا تم نے یہ دف نہیں پڑھا تھا میں نے نہایت متانت سے عرض کیا حضور میں نے ہی ثقہ کو "س" سے لکھا ہے اس میں کاتب کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میرا یہ کہنا تھا کہ کیفی صاحب کی آنکھیں چمک اٹھیں اور بڑے خوشگوار لہجے میں فرمانے لگے بہت اچھا ہوا اپنی غلطی کو فوراً تسلیم کر لیا۔ کوئی دوسرا ایڈیٹر ہوتا تو اسے کاتب کے سر منڈھ دیتا۔ فرمانے لگے ہمیشہ اپنے آپ کو طالب علم سمجھو اور کبھی یہ خیال بھی نہ کرنا کہ تمھیں سب کچھ آتا ہے۔ جس چیز کے بارے میں تمھیں کچھ معلوم نہ ہو۔ جس لفظ کے معنی معلوم نہ ہوں یا کسی لفظ کے ہجے معلوم نہ ہوں یا اس کی صحت کے بارے میں شک ہو تو کسی سے دریافت کرنے میں کبھی بے عزتی یا کم مائیگی محسوس نہ کرنا۔

مشاعروں کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا حال میں نے سردار دیوان سنگھ مفتون (مرحوم) ایڈیٹر "ریاست" کے فرمانے پر ہی لکھنا شروع کیا اور مشاعروں کی یہ روداد "ریاست" میں ہی شائع بھی ہوتی تھی اُن دنوں علامہ کیفی کے ہاں میرا آنا جانا نہیں تھا۔ صرف ایک بار ان سے بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب (مرحوم) کے توسط سے ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر دریا گنج دفتر انجمن ترقی اردو ہند میں ۱۹۴۶ء میں ملاقات ہوئی تھی۔ "ریاست" میں کیفی صاحب مشاعروں کی یہ روداد پڑھتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ مشاعروں کی روداد کی تحریر کو نیا انداز دینے والے کو دیکھیں۔ یونیورسٹی کانووکیشن ہال میں یوم سپرو کا مشاعرہ تھا۔ میں بھی اس مشاعرے کی کارروائی نوٹ کرنے کے لئے پہنچا تو مرحوم منشی بشیشور پرشاد منور دہلوی مجھے ہاتھ سے پکڑے ہوئے علامہ کیفی کے سامنے لے گئے جو اسٹیج پر تشریف فرما تھے۔ منور صاحب نے کیفی صاحب سے فرمایا لیجیے آپ کا ملزم حاضر ہے یہی ہے وہ سرور تونسوی جسے دیکھنے کے لئے آپ نے بارہا فرمایا تھا میں نے دست بستہ قدم بوسی کی تو فرمانے لگے بیٹھ جاؤ اور ریاست میں شائع شدہ مشاعروں کی روداد کی تعریف کرتے ہوئے فرمانے لگے بھائی اس مشاعرے کی کارروائی لکھتے وقت میرا خیال رکھنا میں نے پھر اُن کے قدموں پر ہاتھ رکھتے ہوئے عرض کیا حضور میں تو آپ کا کفش بردار ہوں۔ میری کیا مجال کہ آپ کے اشعار۔ آپ کی چال ڈھال یا آپ کے اشعار سنانے کے انداز وغیرہ سے متعلق کچھ لکھ سکوں۔ پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے فرمانے لگے مجھے دلی مسرت ہے کہ تمھاری بیباکانہ اور سچی تحریروں میں ایک نئے دیوان سنگھ مفتون کا عکس دکھائی دے رہا ہے۔

تصحیح

ماہ نومبر ۸۳ء کے رسالہ شانِ ہند صفحہ ۳۰ پر میری غزل کے پانچویں شعر کے مصرعِ اولیٰ میں ذوقِ منزل کی جگہ فروغِ منزل شائع ہو گیا ہے ناظرین اصلاح فرمالیں۔

یوسف ثانی سلیمانی۔ پالی (راجستھان)

ماہ ستمبر ۸۳ء کے شانِ ہند میں مطبوعہ رودادِ مشاعرہ انجمن عروجِ ادب دہلی میں والدِ محترم جناب گوہر عثمانی مرادآبادی کے دو مصرعے حسنِ کتابت پر قربان ہو گئے ہیں ازراہِ کرم زیرِ اشاعت شمارہ میں تصحیح کر دیجیے۔ صحیح اشعار یوں ہیں

ترا خیال بھی پرچھائیں ہے تری شاید
نہ مجھ سے دور رہے ہے نہ میرے پاس آئے

یہ دل ہے سنگ سمجھ کر نہ توڑیئے اس کو
یہ آئینہ تو نگاہوں سے ٹوٹ جاتا ہے

منصور عثمانی (مرادآبادی)

مشاعرۂ نعت جے پور

جناب رضی الدین صاحب رضا مالک ایجنسی ہمدرد دواخانہ جے پور ہر سال اظہارِ عقیدت کے طور پر ۱۲ ربیع الاول کو مشاعرۂ نعت ایجنسی کے سامنے رام گنج بازار میں منعقد کرتے ہیں۔ اس سال بھی یہ مشاعرہ بڑے تزک و احتشام سے ہوا۔ ملک بھر سے قریباً چالیس شعرائے کرام نے نعتیہ کلام سنا کر ہدیۂ عقیدت پیش کی۔ ذیل میں اس مشاعرہ کے مختلف جو دہ مناظر پیش خدمت ہیں۔

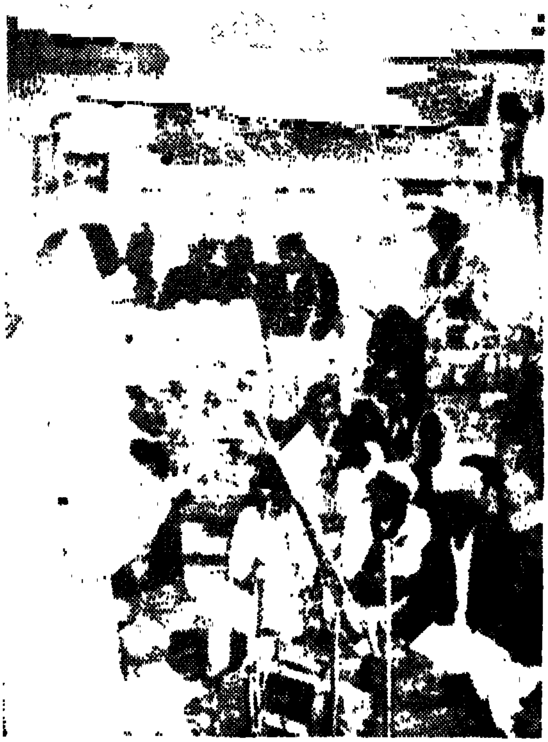


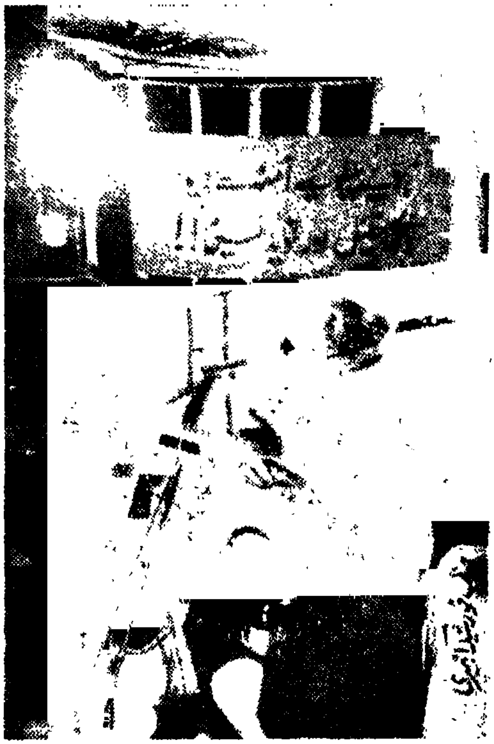
جناب محسن نوشی جے پوری



جناب خداداد مونس جے پوری





















گوشۂ عقیل صدیقی

آل انڈیا مشاعرۂ نعت جے پور

جناب رضی الدین رضاؔ مالک ایجنسی ہمدرد دواخانہ جے پور (راجستھان) ہر سال ۱۲/ربیع الاول کو حضور آقائے نامدار حضرت محمدؐ سے ازلی عقیدت کا اظہار ایک مشاعرۂ نعت سے کرتے ہیں اور قریب قریب ہر سال انھوں نے اس مبارک موقع پر ایڈیٹر شانِ ہند کو مشاعرۂ نعتیہ کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سُنا حال لکھنے کی دعوت دی۔ مگر بدقسمتی سے میں اس سعادت سے محروم رہا۔ اس مرتبہ بھی انھوں نے حسبِ دستور دعوت دی اور میں علالت کے عالم میں ڈاکٹر صاحب اور بیوی کے منع کرنے کے باوجود اس خدمت کیلئے جے پور جا پہنچا۔ اور رات کے نو بجے سے صبح کے ساڑھے تین بجے تک اس مشاعرہ میں حاضر رہا۔ رب العزت اور اس کے رسولِ اکرم کا احسانِ عظیم ہے کہ اس روز سے میری صحت ٹھیک ہے۔

اس مشاعرۂ نعت کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سُنا حال پڑھنے سے پہلے اس امر کا خاص خیال فرمایئے کہ نعت کہنے والے ہر شاعر نے اظہارِ عقیدت میں نعتیہ اشعار کہے ہیں۔ لہٰذا اللہ اور اس کے رسولؐ کی عقیدت میں کہی گئی حمد اور نعت میں فنی اسقام یا دیگر شعری معائب تلاش کرنا کسی لحاظ سے بھی قابلِ تعریف فعل نہیں ہے۔

آیئے اب عاشقانِ رسولؐ کے ایمان افروز اور روح پرور نعتیہ کلام کے حامل اس مشاعرے کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سُنا حال پڑھیئے۔ (سرور تونسوی)

آج ۱۲/ربیع الاول ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۸/دسمبر ۱۹۸۳ء اتوار ہے رام گنج بازار جے پور ایجنسی ہمدرد دواخانہ سے ملحق شامیانے اور قناتوں سے خوبصورت پنڈال بنایا گیا ہے جس میں روشنی کا بہترین انتظام ہے۔ اسٹیج پر جناب ڈاکٹر کامل قریشی صاحب جناب محمود سعیدی صاحب اور دیگر شعرائے کرام تشریف فرما ہیں۔ جے پور مجھے دلی کی طرح عزیز ہے۔ اہلِ جے پور خصوصاً مسلم حضرات کی اکثریت مجھ سے واقف ہے۔ چنانچہ تقریباً پانچ چھ سال بعد جے پور کے کسی مشاعرہ میں میری حاضری پر سامعین کی اکثریت نے خوش آمدید کہا ہے اور مجھے اسٹیج پر ہی جگہ دی گئی ہے۔ سب سے پہلے راگی ٹونکی سے نعت سنانے کا اعلان جناب رضا صاحب نے فرمایا تو راگی صاحب مائک پر تشریف لائے ارشاد ہوا ہے:

کب آپ ہو یہ ہر کامل نہ ہو سکا
ذرے سے یقین کے مہ مقابل نہ ہو سکا

ترنم۔ راگی کی مناسبت سے قابلِ تعریف ہے راگی صاحب کا فن کارانہ اندازِ ترنم اور بھی لطف دے رہا ہے۔ فرماتے ہیں:

کیا کیا غمِ فراق میں یہ دل نہ ہو سکا
لیکن تمہارے درد کے قابل نہ ہو سکا

بے رنگ و بے مزہ ہی رہا افسانۂ ازل
جب تک کہ نام آپ کا شامل نہ ہو سکا

نعتیہ کلام میں فنی معائب دیکھنے کی تو واقعی ضرورت نہیں مگر شاعری کی املا اگر غلط ہو تو اُسے نظر انداز کرنا اہلِ ذوق کی توہین ہے۔ راگی صاحب نے اس شعر کے دوسرے مصرع میں کہ کو کے لکھا ہے۔ سنیئے راگی صاحب کس قدر اچھا شعر فرما رہے ہیں:

حاصل اُسے متاعِ دو عالم نہ ہو سکی
عرفانِ دینِ حق جسے حاصل نہ ہو سکا

اس شعر پر داد بھی خوب دی گئی ہے اور راگی صاحب نے بھی اس شعر کو دو تین بار اچھے انداز میں سُنا کر شعر کو مزید داد کے قابل بنا دیا ہے۔ راگی صاحب خاصی دیر تک پڑھتے

اپنی جگہ پر تشریف لے گئے تو رضا صاحب نے جناب رضا شیدائی سے پوری سے نعت سنانے کی درخواست کی ہے۔ سنیئے رضا شیدائی راگ پہاڑی میں مطلع عطا فرما رہے ہیں ؎

ہر لوہے لب پر بس یہی ترانا ہے سرکار کے روضے پہ ہر حال میں جانا ہے

اچھا مطلع ہے۔ نیک خواہش اور عام پسند راگنی پہاڑی کی شمولیت نے سننے والوں پر وجد طاری کر دیا ہے اور شاد ہے کہ رضا صاحب اسے رضائے الٰہی سمجھ کر خدا کا شکر بجا لا رہے ہیں۔ سنیئے رضا صاحب کس قدر والہانہ انداز میں نغمہ سرا ہیں ؎

بیٹھے ہیں تصور میں سرکارِ دو عالم کے آتا ہے نہ جاتا ہے کھانا ہے نہ آنا ہے

واہ اس شعر کا حق ہے اور داد ملی بھی خوب مگر حیرت ہے کہ رضا صاحب سرکارِ دو عالم کو "سرکارے دو عالم" سے لکھ گئے۔ مولانا کوثر مرحوم اور شیدائی صاحب مرحوم کے نام لیوا بھی اگر اس طرح سے املا کی غلطیاں کرنے لگے تو افسوس کا مقام ہے۔ سنیئے رضا صاحب کیا فرما رہے ہیں ؎

اے بادِ صبا جا کر یہ کام ذرا کرنا
سرکار سے کہہ دینا جو میرا فسانا ہے
کیا روضۂ انور کے نزدیک ہی آپہنچا
ہر سمت بہاریں ہیں موسم بھی سہانا ہے
اللہ نے رکھا ہے دن حشر کا اس خاطر
کیا شانِ محمدؐ ہے دنیا کو دکھانا ہے

اس شعر پر داد نے پھر رضا صاحب کی جھولیاں بھر دی ہیں مگر بادِ صبا کو "بادے صبا" اور روضۂ انور کو "روضئے انور" لکھنا ظاہر کرتا ہے کہ انہیں اُردو لکھنا بھولتا جا رہا ہے۔ بہرکیف رضا صاحب اچھی خاصی داد وصول کئے اپنی جگہ تشریف لے گئے تو جناب رضا نے جناب آصف بچہ رہی کو نعت سننے کیلئے پکارا ہے۔ سنیئے آصف صاحب چار سطرے سنانے کے بعد نعت تحت میں سنا رہے ہیں ؎

خدا نے روزِ ازل ہی بنایا نورِ کامل کو
کیا پھر نورِ کامل نے فروزاں پوری محفل کو
خدا کے نیک بندوں کی زباں میں یہ اثر رکھا
بنا دیں باتوں باتوں میں مسلماں اپنے قاتل کو

اس شعر پر آصف صاحب کو داد مناسب انداز میں دی گئی ہے۔ اور آصف صاحب فرما رہے ہیں ؎

پڑھو جا تو تری کشتی محمدؐ نام لے لے کر
چلا آئے گا خود آگے غرض ہوگی جو ساحل کو
غلامِ مصطفےٰ ہوں میں مجھے سنگ بھی کہتے ہیں
یہ منزل پہنچتے ہی بتا دینا یہ منزل کو

آصف صاحب نے بھی خود کو "غلاا" اور مصطفےٰ کو "مُسطفےٰ" لکھا ہے۔ املا کی ان اغلاط سے محض یا ثابت کرتا ہے کہ مسلمانوں پر ہندی دن بدن اس طرح غالب آ رہی ہے کہ وہ مصطفےٰ کو "ص" کی بجائے "س" سے لکھنے لگے ہیں۔

اعلان ہوا ہے کہ گو یہ مقام تو نہیں کہ جناب دلؔ ایوبی ٹونکی سے نعت عطا فرمانے کی درخواست کی جائے مگر ان کی طبیعت ناساز ہے اور وہ جلد تشریف لے جانا چاہتے ہیں لہٰذا عوام "تو کر رہا" دلؔ ایوبی صاحب سے مودبانہ گذارش کی جا رہی ہے کہ نعت ارشاد فرمائیں۔ دلؔ ایوبی ٹونک کے صفِ اول کے شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ آج سے تیس سال پہلے حضرت قبلہ صولت ٹونکی دلؔ ایوبی کے اشعار پر خوب داد دیا کرتے تھے۔ میں بھی ان کا کلام ایک زمانے کے بعد سننے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔ سنیئے شاعرانہ ترنم سے عطا ہو رہا ہے ؎

اے تعالیٰ اللہ یوں جلوہ نما ہو عرش پر
جیسے تم خود ہی نہیں ہو دوسرا ہو عرش پر
غرقِ حیرت ہیں وہ عالم بھی کہ کیا ہو عرش پر
مُدعی ہو عرش پر یا مُدعا ہو عرش پر

داد ہے کہ سامعین کے باہوش ہونے کا ثبوت دے رہی ہے جناب رضی الدین رضاؔ کی درخواست پر دلؔ صاحب نے یہ شعر دوبارہ سنایا ہے اور پھر بھرپور داد پائی ہے۔ سنیئے دلؔ صاحب ارشاد فرما رہے ہیں۔

یہ تمیزِ بندہ و مولا یہیں تک ہے کہ تم
مسند آرا کے سریرِ کبریا ہو عرش پر

کسی صاحب کی بے احتیاطی سے مائک خراب ہو گیا ہے

پندرہ بیس منٹ کے بعد مائیک پر افضل صاحب
یوں گویا ہوئے ؎

گم فضا سے یوں ملے گویا فضا میں مل گئے
یہ بھی اندازہ ہے، اس سے بھی سوا ہو عرش پر

اس شعر پر سامعین نے بے ساختہ داد دی ہے اور
دلؔ صاحب نہایت متانت سے فرما رہے ہیں ؎

کوئی عظمت کا تمھاری کیا احاطہ کر سکے
ماورائے ابتدا و انتہا ہو عرش پر
صرف بندہ آپ کو اہلِ محبت تب کہیں
آپ سے پہلے بھی جب کوئی گیا ہو عرش پر
عقل بھی اے دلؔ کہاں تک گتھیاں سلجھائیگی
کون جانے کیا خدائی سلسلہ ہو عرش پر

دلؔ صاحب خوب خوب داد پاکر مائیک سے الگ ہونے
لگے تو رضاؔ صاحب نے ایک نعت اور عطا فرمانے کی
گذارش کی ہے سنیئے دلؔ صاحب دوسری نعت شروع
کر رہے ہیں ؎

سرورِ سروراں مصطفیٰؐ — خسروِ خسرواں مصطفیٰؐ

مطلع ہی بتا رہا ہے کہ کتنی مشکل زمین میں دلؔ
صاحب نے نعت کہی ہے۔ سنیئے دلؔ صاحب کیا استادانہ
اشعار سنا رہے ہیں ؎

رہبرِ رہبراں مصطفیٰؐ — منزلِ کارواں مصطفیٰؐ
مرکزِ چشمِ وارفتگاں — دلبرِ عاشقاں مصطفیٰؐ
غیرتِ رفعتِ لامکاں — عظمتوں کے نشاں مصطفیٰؐ
نازشِ عرش و لوح و قلم — زینتِ آسماں مصطفیٰؐ
ہر حقیقت کے روحِ رواں — جانِ ہر داستاں مصطفیٰؐ
بیکسوں کے رفیق و شفیق — غمزدوں کی اماں مصطفیٰؐ
حشر کی اس کڑی دھوپ میں — لطف کا سائباں مصطفیٰؐ
ورنہ اے دلؔ کئے جایئے — مصطفیٰؐ مصطفیٰؐ، مصطفیٰؐ

دلؔ ایوبی صاحب داد و ستائش سے لدے پھندے
جائے قیام پر تشریف لے گئے ہیں اور رضاؔ صاحب نے جناب
زائرؔ ٹونکی مرحوم کے فرزندِ ارجمند شادؔ کیفی ٹونکی سے نعت
سنانے کو کہا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ شادؔ کا ترنم اپنا جواب آپ
تھا مگر اب وہ بات نہیں رہی تاہم نعت اچھے ڈھنگ سے
پیش کر رہے ہیں ؎

کالے طوفان کبھی سر پہ جو چھانے آئے
یاد امّت کو محمدؐ کے زمانے آئے
شمعِ اسلام کی ہر حال میں جلتی ہی رہی
کتنے طوفان اٹھے اِس کو بجھانے آئے
جھولیاں آپ نے پھولوں سے بھری ہیں اُن کی
کانٹے راہوں میں جو دشمن بھی بچھانے آئے
آپ کے نور سے دُنیا میں اُجالا پھیلا
آپ کے آنے سے رحمت کے خزانے آئے
مرحبا صلِ علیٰ! آپ کی شان و شوکت
خود فرشتے شبِ معراج بلانے آئے
جب یہ پیغامِ محمدؐ پہ عمل پیرا ہوا
تب کہیں عقل زمانے کی ٹھکانے آئے
مہک سے جس کی زمانہ ہے معطّر اے شادؔ
باغِ عالم میں وہ گل آپ کھلانے آئے

شادؔ اچھی داد پانے کے بعد اپنی جگہ گئے تو دہلی کے
جناب جمیلؔ تاباں صاحب سے نعت مرحمت فرمانے کی
درخواست موزوں الفاظ میں کی گئی ہے۔ جمیل صاحب
پر بڑھاپے کے آثار تو نمایاں ہیں مگر ترنم پہلے سے زیادہ
پختہ اور شاعرانہ ہو گیا ہے۔ سنیئے مطلع ارشاد ہے ؎

محمد مصطفیٰؐ وہ صاحبِ کردار بیٹھے ہیں
ملائک صف بہ صف سب مالکِ مختار بیٹھے ہیں

مطلع پر داد کا عالم دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔
داد کا زور کچھ کم ہوا تو مطلع ثانی عطا ہوا ؎

تمہارے عشق میں آقا سبھی سرشار بیٹھے ہیں
ادھر دو چار بیٹھے ہیں ادھر دو چار بیٹھے ہیں

اب تو داد ہے کہ شورِ قیامت کا سماں پیش کر رہی ہے
اور جمیلؔ تاباں ہیں کہ اپنی بے تابیٔ دل کا حال مطلع ثالث
میں یوں پیش کر رہے ہیں ؎

بُلا لیجیے آپ ہیں پھر رعنا اطہر یہ اسے آقا
جُدائی سے تمہاری ہند میں بیمار بیٹھے ہیں

داد کا زور کم ہوگیا ہے اور جمیل تاباں داد حسبِ سابق حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر وہ بات پیدا نہ ہوسکی تاہم ان کے کچھ نعتیہ اشعار مزید سماعت فرمائیے ؎

گناہگارو، امام الانبیاء کو پھر پکار آؤ
سرِ محشر شفاعت کے لیے تیار بیٹھے ہیں
اُٹھی اُنگلی شہادت کی ہوا ہے چاند دو ٹکڑے
گریبانوں میں سر ڈالے ہوئے کفار بیٹھے ہیں
فدایانِ رسالت شاد اور آباد ہیں تاباں
حریفانِ رسالت سر دریچے آزاد بیٹھے ہیں

اچھی اور مناسب داد پانے کے بعد جمیل تاباں صاحب اپنی جگہ آگئے ہیں اور رعنا صاحب نے جناب راشد ٹونکی سے مائیک پر آنے کی درخواست کی ہے۔ راشد صاحب نے ترنم سے مطلع پڑھا ہے ؎

مرحبا کیا مرتبہ ہے احمدِ مختار کا
ذکر کرتا ہے فلک خود ہی شہِ ابرار کا

ابرار پر راشد صاحب کو ایسا اتقوا آیا ہے کہ ترنم بھول گئے ہیں اور تحت میں پڑھنا شروع کر دیا ہے ؎

کیا عظیم الشان قربت تھی شبِ معراج میں
عکس آئینے میں تھا آئینہ کردار کا

نہ معلوم ترنم سے پڑھنا شعرا نے اپنی کامیابی کا زینہ کیوں سمجھ رکھا ہے۔ راشد صاحب کو ترنم کی نسبت تحت میں پڑھنے پر وہ داد ملی ہے کہ ترنم منہ دیکھتا رہ گیا ہے۔ سنیئے ارشاد ہوا ہے:

ہوچکا ہے فردوس کی رعنائیوں سے بے نیاز
جس نے دیکھا ہے رُخِ انور مرے سرکار کا
رو جہاں موجود ہیں تیمار داری کے لیے
عرش والا ہے مسیحا آپ کے بیمار کا
کثرتِ بخشش تو راشد حشر کے دن دیکھنا
عام ہوگا...... لُطف و کرم سرکار کا

راشد صاحب اچھی بلکہ بہت اچھی داد پاکر مائیک سے ہٹے تو رعنا صاحب نے، جناب آرزو جے پوری کو نعت سُنانے کی دعوت دی ہے یہ یاد دلانے کی تو ضرورت نہیں کہ آرزو صاحب ترنم کے لحاظ سے راجستھان کے ایک مشہور ترین شاعر ہیں نعت کے اشعار تو میں آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں رہا ترنم تو بس اس کا تصور ہی فرما لیجیے سُنیئے آرزو نغمہ سرا ہیں ؎

حُسنِ ازل کا مظہرِ کامل تمہیں تو ہو
تصدیقِ کائنات کا حاصل تمہیں تو ہو
ہے احترام جن کا مقدم خدا کے بعد
اس درجہ احترام کے قابل تمہیں تو ہو
جس کشتیٔ امید کا ساحل نہ ہو کوئی
اُس کشتیٔ امید کا ساحل تمہیں تو ہو
منزل کو جس کے نقشِ کفِ پا پہ ناز تھا
وہ رہنمائے جادۂ منزل تمہیں تو ہو
تم نے کیا ہے رسمِ غلامی کو پائمال
وجہِ شکستِ بند و سلاسل تمہیں تو ہو
ہنگامِ حشر دفترِ عصیاں کے باوجود
آسان کر دے سب کی جو مشکل تمہیں تو ہو
ہے آرزو کے دل کا سکوں جن پہ منحصر
بخشش کا وہ ذریعۂ کامل تمہیں تو ہو

آرزو صاحب داد سے جھولیاں بھرے اور لحنِ داؤدی کی بازگشت فضا میں پھیلائے ہوئے اپنی جگہ پہ آگئے ہیں ترنم سے کلام سُنانے والے شعرا میرے لیے مفید ثابت ہوتے ہیں کیونکہ اُن کے اشعار آسانی سے نوٹ کیے جا سکتے ہیں تحت اور رواں دواں کلام سُنانے والے شعرا کا کلام نوٹ کرنے کا ملکہ اب وہ نہیں رہا جو آج سے بیس سال پہلے تھا اُس وقت تو حاضر دماغی کا یہ عالم تھا کہ شاعر نے پہلا مصرع بھی پورا نہیں کیا ہوتا تھا کہ دوسرا مصرع میں از خود ہی لکھ لیتا تھا۔

آرزو صاحب ترنم کی نسبت سے مشاعرہ کو جس مقام پہ لے گئے ہیں اُسے قائم رکھنے کے لیے رعنا صاحب نے بڑی سوجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے جناب مخدوم زادہ مختار عثمانی صاحب کو نعت سنانے کو کہا ہے مختار عثمانی کو میں جب تیمر دہلوی کے ہمراہ دیکھتا آرہا ہوں

جبکہ وہ غلمان کے لغوی معنوں کی منہ بولتی تفسیر تھے۔ مگر ان کے کلام اور ترنم سے آج پہلی بار جناب رضی الدین صاحب رضاؔ کے فیضان سے فیض یاب ہونے کا موقع نصیب ہو رہا ہے سُنئے قیصر دہلوی صاحب کے مایۂ ناز شاگرد جو سایہ کی طرح اپنے استاد کے ہمراہ چلتے پھرتے۔ اُٹھتے۔ بیٹھتے۔ سوتے اور جاگتے ہیں یعنی مخدوم زادہ مختارؔ شاہ [illegible] صاحب رطب اللسان ہیں۔

شاہانِ زمانہ کا مقام اپنی جگہ ہے
سرکارِ دو عالم کا غلام اپنی جگہ ہے

ترنم ایسا سمجھا ہوا ہے کہ جنت کے غلمان بھی اس خاکی شاعر کو داد دینے پہ مجبور ہو جائیں۔ داد کا یہ عالم ہے کہ شورِ قیامت بھی شرمسار ہو کر رہ جائے۔ "سرکارِ دو عالم کا غلام اپنی جگہ ہے"۔ نے وہ رنگ باندھا ہے کہ مشاعرہ اپنے عروج پہ آگیا ہے۔ داد ذرا کم ہوئی تو مخدوم زادہ نے دوسرا تیر پھینکا ہے ؎ اُن کے رُخِ روشن سے نہیں کوئی بھی نسبت

وہ اپنی جگہ، ماہِ تمام اپنی جگہ ہے

داد و ستائش کا اندازہ آپ اپنی بساط کے مطابق لگا لیجیے اور مخدوم زادہ کے تین اشعار اور سُن لیجیے ؎

چلنے کو تو چلتی ہے نسیمِ سحری بھی
پر آپکا اندازِ خرام اپنی جگہ ہے
ہر آن بدلتی ہے خرد نظمِ سیاست
سرکار جو لائے وہ نظام اپنی جگہ ہے
یوں آنے کو آئے ہیں نبی اور بھی مختارؔ
لیکن میرے آقا کا مقام اپنی جگہ ہے

توقع سے کہیں بڑھ کر مختار صاحب داد و ستائش سمیٹے اپنی جگہ پہ تشریف لے آئے ہیں اور فضا ہے کہ ابھی تک غلام۔ ماہِ تمام۔ اندازِ خرام کے سحر میں سرمست و سرشار ہے۔ اِدھر رضاؔ صاحب پھر اُلجھن میں پڑ گئے ہیں کہ شاعرے کے موجودہ ماحول کو کیسے قائم رکھا جائے تاہم رضاؔ صاحب نے پھر حکمتِ عملی سے کام لیا ہے اور جناب فریدؔ ایوبی سے پوری کو اس نازک موقع پہ نعت عطا فرمانے کی فرمائش کی ہے۔ فریدؔ ایوبی صاحب بھی راجستھان تو کیا مُلک بھر کے گنے چُنے مترنم شاعروں میں شمار ہوتے ہیں پھر بھی گذارش ہے کہ ترنم کا سحر تو میں آپ تک نہیں پہنچا سکتا مگر فریدؔ ایوبی صاحب کی نعت آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

کونین میں تیرا کوئی ثانی ہی نہیں ہے
صورت بھی حسیں ہے تری سیرت بھی حسیں ہے
کس درجہ تری بات کا لوگوں کو یقیں ہے
دشمن بھی تجھے کہتے ہیں صادق ہے امیں ہے
سر اس لیے جھکتے ہیں ترے نقشِ قدم پر
تو بانیٔ اسلام ہے تو ہادیٔ دیں ہے
آنکھوں میں پھرا کرتے ہیں قرآن کے پارے
ہر وقت تصور میں ترا روئے مبیں ہے
قرآن رسالت کی مدلل ہے شہادت
جو چیز ہے وہ آپ ہی کے زیرِ نگیں ہے
جنت کے طلبگار مدینے میں تو آئیں
جنت بھی یہیں ہے ارے کوثر بھی یہیں ہے
رکھتی ہے دماغ عرشِ معلےٰ پہ جو اپنا
وہ خاکِ مدینہ ہے وہ طیبہ کی زمیں ہے
ہو جائے فریدؔ اب مجھے روضے کی زیارت
بجز اس کے کوئی اور تمنا ہی نہیں ہے

جناب فریدؔ ایوبی صاحب اپنا حقِ داد وصول کرتے ہوئے اپنی جگہ تشریف لے گئے۔ تو جناب منانؔ راہی اجمیری مائیک پر تشریف لائے ہیں۔ اور نعت شروع کر رہے ہیں ؎

کس سے ممکن ہے بھلا مدحت رسول اللہ کی
آسماں بر دوش ہے عظمت رسول اللہ کی
کلمۂ طیب گواہی دے رہا ہے دیکھ لو
کتنی ہے اللہ سے قربت رسول اللہ کی
ان سے ہٹ کر نسبتیں ساری دھری رہ جائینگی
حشر میں کام آئےگی نسبت رسول اللہ کی
جستجو میں دین کی بھٹکے نہ کوئی دربدر
ہے مکمل دینِ حق سیرت رسول اللہ کی
سربلندی ہم گنہگاروں کی لوگو دیکھنا
حشر میں کہلائیں گے امت رسول اللہ کی

ہر شعر پر داد پاتے ہوئے منان راہی صاحب فرما رہے ہیں ؎

سر ہی کیا وہ جو نہیں جھکتا ہو اُن کے نام پر
دل ہی کیا جس میں نہ ہو الفت رسول اللہ کی
رحل ہے ریشِ مبارک چہرہ قرآنِ مجید
مرحبا صلِ اللہ صورت رسول اللہ کی
ورد ہے کہ اہلِ اجمیر بھی سن رہے ہونگے۔ نعت میں بھی راہی صاحب خواجہ اجمیریؒ کا ذکرِ مبارک لے ہی آئے ہیں سنیئے ؎

ہند میں خواجہ معین سے جو بھی چاہو مانگ لو
اُن کے ہی ہاتھوں میں ہے دولت رسول اللہ کی
آرزو مرنے کی رکھتا ہوں میں راہیؔ اس لیے
دیکھ لونگا قبر میں صورت رسول اللہ کی

منان راہی صاحب خوب خوب داد پانے کے بعد مائیک سے الگ ہوئے تو رضا صاحب نے ٹونک کے جناب برہان الدین کلیم کو نعت سُنانے کی دعوت دی ہے۔ لیجئے کلیم صاحب لحنِ داؤدی میں نعت کا آغاز کر رہے ہیں ؎

سر پہ عصیاں کا ہے انبار مدینے والے
رحم کیجئے مرے سرکار مدینے والے
آپ کے سر پہ شفاعت کا بندھا ہے سہرا
آپ ہیں نبیوں کے سردار مدینے والے
شب معراج میں اُمت کے لیے بخشش کا
حق سے لے آئے ہیں اقرار مدینے والے
آپ کے یمنِ قدم سے گل گلزار بنا
دشتِ طیبہ کا ہر اک خار مدینے والے
بحرِ عصیاں میں بری طرح پھنسا ہے اکر
بیڑا کر دیجیے مرا پار مدینے والے
عرصۂ حشر میں اُمت کے گنہگاروں کو
بھول سکتے نہیں زنہار مدینے والے
بخشوائیں گے تجھے روزِ جزا حق سے کلیم
تیرے حامی ترے غمخوار مدینے والے

کلیم ٹونکی مناسب داد پانے کے بعد ڈائس پر میرے قریب آ کر بیٹھ گئے ہیں اور جناب چندنؔ صاحب ٹونکی کے زیر اشاعت مجموعۂ کلام کے بارے میں دریافت فرما رہے ہیں۔ اتنے میں اعلان ہوا ہے کہ جناب عزیزؔ ایوبی مائیک پر تشریف لا رہے ہیں عزیز صاحب نے تحت میں ایک مخمس شروع کی ہے جو اُمت کھڑی ہے آج سر بار دیکھئے۔ کچھ بند ملاحظہ فرمائیے۔

گھبرا رہے ہیں طالبِ دیدار دیکھئے
در پہ کھڑے ہوئے ہیں گنہگار دیکھئے
اک بار اس طرف شہِ ابرار دیکھئے
بعد از خدا ہیں آپ ہی غمخوار دیکھئے
اُمت کھڑی ہے آج سرِ دار دیکھئے

پہلے تو فقر و فاقہ کے ہم تاج دار تھے
گلشن کو جس پہ ناز تھا ہم وہ بہار تھے
قول و عمل میں آپ ہی اپنا شعار تھے
اب بک رہے ہیں ہم سرِ بازار دیکھئے
اُمت کھڑی ہے آج سرِ دار دیکھئے

لیڈر بنی ہوئی ہیں لیڈروں کی ٹولیاں
کھلوا رہی ہیں خون کی آپس میں ہولیاں
پھیلی ہوئی ہیں چاروں طرف جنگی جھولیاں
وہ بن گئے ہیں قوم کے سردار دیکھئے
اُمت کھڑی ہوئی ہے سرِ دار دیکھئے

اس بند پر تو عبدالحق عزیز ایوبی کی اپنی جھولی داد سے بھر گئی ہے۔ اور وہ ایک بند اور سُنا کر اور بہت اچھی داد پا کر اپنی جگہ تشریف لے گئے ہیں ترنم سے پڑھنے والے شعراء عزیزؔ صاحب کے تحت پر رشک کرتے نظر آ رہے ہیں۔ اور اب جے پور کے ہی رفیق صاحب کے نام کا اعلان ہوا ہے۔ رفیق صاحب فرما رہے ہیں ؎

یہ خود ارشادِ ربِ العالمین ہے
محمدؐ رحمتہ اللعالمین ہے
مدینے کی وہی تو سرزمیں ہے
[illegible]

شب معراج یہ آواز حق تھی
میرا تم سے کوئی پردہ نہیں ہے
مہکتے رہتے ہیں جس سے دو عالم
وہی تو اُن کی زلف عنبریں ہے
جہاں نقش قدم مل جائیں اُنکے
حقیقت میں مرا کعبہ وہیں ہے
بُلائیں گے مجھے بھی شاہ بطحا
رفیق اس بات کا مجھ کو یقیں ہے

رفیق صاحب بھی نعت پر داد لے ہی گئے۔ اور اب رضا صاحب نے نہایت احترام سے جناب قیصر حیدری دہلوی کو دعوت سخن دی ہے۔ سنیئے قیصر صاحب اپنے مخصوص لب و لہجہ میں نعت شروع کر رہے ہیں۔

ہر بے کس کے مونس و ہمدم ۔ رحمت حق سرکار دو عالم
میری طرف بھی چشم توجہ ۔ آپ ہیں ذات حق کے محرم
آنکھوں کو ہے حسرت جلوہ ۔ دل ہے اب ارمان مجسم
حسن و جمال ذات الٰہی ۔ محبوب خلاق دو عالم
لاکھوں ہیں عصیاں لاکھ خطائیں ۔ چشم کرم اے رحمت عالم
آپ ہیں سب سے افضل و اعلیٰ ۔ مرے مکرم ۔ مرے معظم
قیصر ہے بیمار تمہارا رشک مسیحا بہ حسرت آدم

قیصر صاحب نے بہت زور مارا مگر داد شاگرد کے مقابلے میں کم ملی ہے۔ دراصل اُستاد حضرات اچھا کلام اور بہترین اشعار شاگردوں کی ایک جنبش نگاہ پر قربان کر دیتے ہیں اور خود مشاعروں میں شاگردوں کو مل رہی داد پر خوش ہو کر اپنے ذوق نظر کو مزید تسکین دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

اب جناب موہن شیدائی مائیک پر تشریف لائے ہیں اور ارشاد ہوا ہے ؎

میں پاپی ہوں تمھارا یا رسول اللہ
سنبھالو آن کر مجھ کو خدارا یا رسول اللہ
ملا منظی میں بھی مجھ کو سہارا یا رسول اللہ
تمہارا نام لے کر جو پکارا یا رسول اللہ

موہن جی کی بخشش کے لیے یہ چار مصرعے ہی کافی ہیں

اب جناب ارشاد حسین فاروقی تنویر سیکری مائیک پر آگئے ہیں فرماتے ہیں ؎

آپ ختم المرسلیں نبیوں کے سرور آپ ہیں
آپ محبوب خدا ہیں سب سے بہتر آپ ہیں
حضرت عیسیٰ تو جو تھے آسماں ہی پر رہے
اور شب معراج میں عرش بریں پر آپ ہیں
رب نے اپنے نور سے پیدا کیا ہے آپ کو
آپ ہیں نور مجسم اور اطہر آپ ہیں
کیا ملک، کیا حور و غلماں اور کیا جن و بشر
سب کے حامی سب کے یاور سب کے رہبر آپ ہیں
دل میں کیا تنویر کھٹکا حشر کے میدان کا
شافع روز جزا، حامیٔ محشر آپ ہیں

تنویر سیکری بھی مناسب داد پا کر اپنی جگہ آ گئے ہیں اور جناب رضا نے جناب خورشید اجمیری سے نعت عطا فرمانے کی استدعا کی ہے۔ خورشید نغمہ ریز ہیں ؎

اے باد صبا آہستہ ذرا سرکار دو عالم آتے ہیں
اے خوشبوئے گل مہکا دیئے فضا سرکار دو عالم آتے ہیں
یہ مالک دین و دنیا ہیں جو مانگے گا مل جائے گا
اے ذوق طلب دامن پھیلا سرکار دو عالم آتے ہیں
لائے گا نہ تاب نظارہ شرمندہ بھی ہو جائے گا
اے چاند کہیں جا کر چھپ جا سرکار دو عالم آتے ہیں
اُس راہ کا ہر اک ذرہ صد رشک بہار جنت ہے
جس راہ سے اے صبح و مسا سرکار دو عالم آتے ہیں

داد اور خورشید دونوں کا ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ میں خورشید صاحب کو گذشتہ ۳۴ برسوں سے جانتا ہوں اور انھیں متعدد مشاعروں میں سُنا داد اُنکے اشعار لے ہی لیتے ہیں۔

اب ایک دوسرے خورشید بھی جناب خورشید احمد سحر جے پوری مائیک پہ تشریف لائے ہیں اور ترنم سے ارشاد فرما رہے ہیں ؎ گردش میں رہتے تھے مدتوں شام و پگاہ کی
دُنیا سمٹ رہی ہے حضوری میں شاہ کی

اب مُلزِم آپ ہی کو ہے کچھ رُو سیاہ کی
تصویر بن چُکا ہوں سراپا گناہ کی
جلوہ جو اُس کا آپ کی صورت میں دیکھتی
یہ تاب ہی کہاں تھی کسی کم نگاہ کی
پہنچا دے کاش عشقِ تصوّر ہی ان دنوں
مجھ کو حریم خاص میں اُس جلوہ گاہ کی
سب انبیاء ہیں اُمتِ خیرالوریٰ کے ساتھ
یہ مرتبت یہ شان ہے بطحا کے شاہ کی
شمس الضحیٰ ابھی ہیں وہی بدرالدجیٰ بھی ہیں
روشن ہے بزم جن کے سبب مہر و ماہ کی
ہم نے بدلتے دیکھے ہیں قسمت کے فیصلے
بس جنبشِ کرم سے ستم ریک نگاہ کی

خورشید احمد توحید ۔ بدری بھی مناسب داد پاکر اپنی جگہ آگئے ہیں ۔ اب سامنے جناب رفیق نوشکی کے سامنے ہے نغمہ سرا ہیں ؎

گزرے جس راہ سے وہ نورِ سراپا ہو کر
تجلّیں بہہ گئیں نور کا دریا ہو کر
زعمِ باطل پہ گرے برقِ تجلّی ہو کر
رہ گیا کفر کا آئینہ شکستہ ہو کر
سازِ ہستی کا ہر اک تار سنوارا تم نے
پھیل گئے دہر پہ توحید کا نغمہ ہو کر
زندگی حُسن کے جلوؤں سے سنورتی کیسے
آپ آتے نہ اگر انجمن آرا ہو کر
اُن کے اقرارِ رسالت کا یہ اعجاز ہوا
اک گدائی خواں رہا تاجِ کسریٰ ہو کر
بس ندامت وہی ہوتی ہے خدا کو منظور
پھوٹ پڑتی ہے جو چہرے سے پسینہ ہو کر
لوگ سمجھے مجھے بیٹھا ہوا محفل میں رفیق
میں تصور ہیں چلا آیا مدینہ ہو کر

رفیق صاحب بھی اچھی داد لے گئے اور اب رہنما صاحب نے جناب حسین کوثری کو دعوت مرحمت فرمانے

کی فرمائش کی ہے ۔ حسین نے شعر و شعبۂ زندگی میں اپنے والد محترم جناب شمیم کوثری (مرحوم) کی پیروی کی ہے ۔ حکیم مرحوم باغ و بہار طبیعت کے مالک تھے ۔ اہل جے پور بلکہ اجتماعی شمیم صاحب کو نہیں بھول سکتا ۔ سنیئے حسین کس جاں سوزی سے خراجِ عقیدت پیش کر رہا ہے ؎

ندا آئی سرِ محشر تمھارے کون کام آیا
محمدؐ کا زبانِ شوق پہ برجستہ نام آیا
ملے خلوت میں حُسن و عشق بے پردہ شبِ اسریٰ
محبت کے سفر میں ایک ایسا بھی مقام آیا

داد ہے کہ اس شعر کا حق ہے یہ شعر دوبارہ سنانے کے بعد حسین صاحب فرما رہے ہیں ؎

تصدقِ حوضِ کوثر تشنگی پیاسے رندوں کی
پلائے ساقیؐ کوثر جنھیں وحدت کا جام آیا
ذرا کُھل اُن کی نوازش پہ جو رحمت بن کے کام آئی
سلام اوصاف پر اُن کے جو شفاعت بن کے کام آیا
نوازا عرش والوں کو سنوارا فرش والوں کو
محمدؐ کا مبارک نقشِ پا کس کس کے کام آیا

داد کا ایک ریلا ہے کہ عاشقانِ محمدؐ اپنا اظہارِ عقیدت بڑھ چڑھ کر کر رہے ہیں ۔ اور حسین نغمہ سرا ہیں ؎

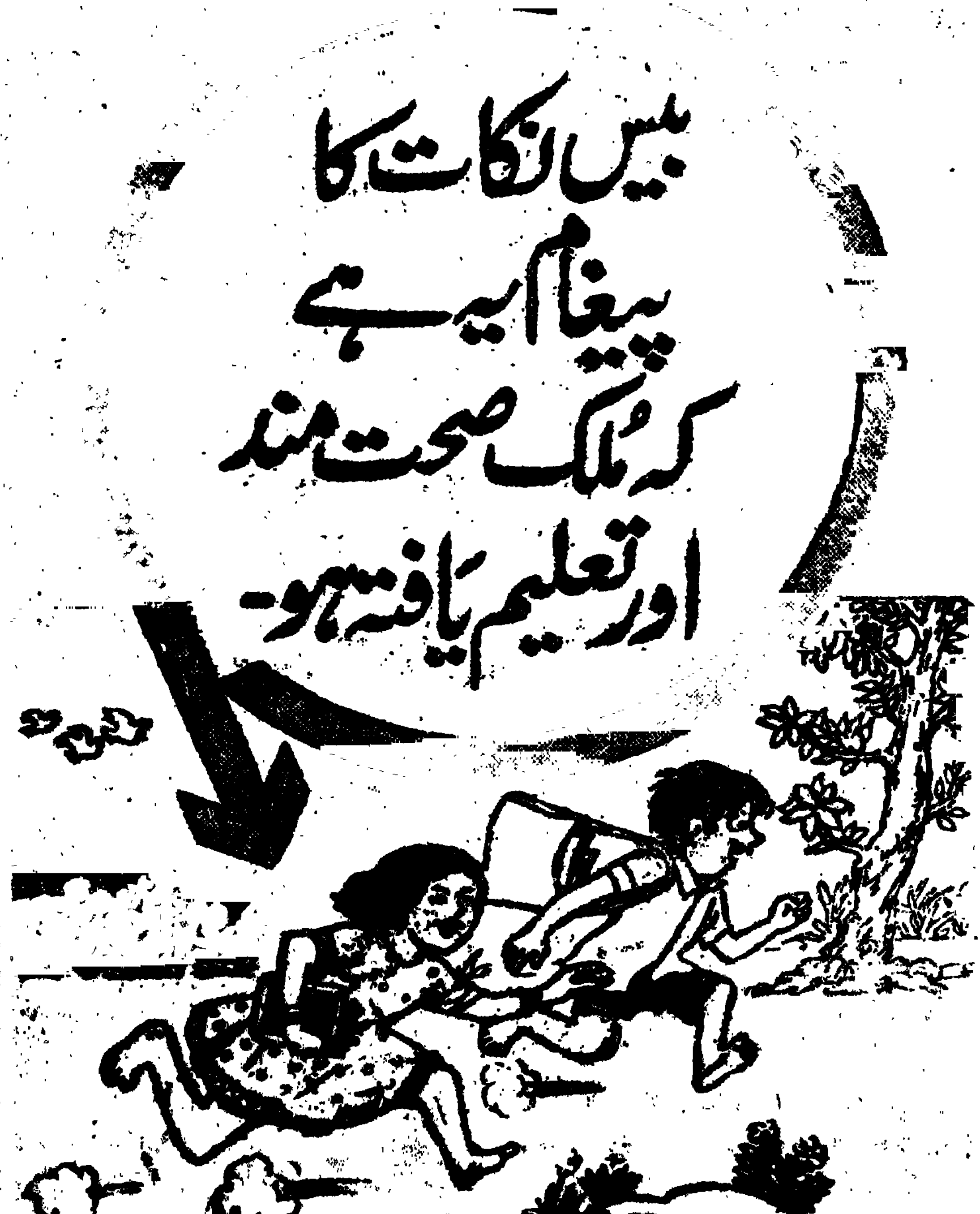
خدا کی بارگاہِ ناز میں اُمت کا غم لے کر
فرشتوں میں یہ غل ہے ساکنِ بیت الحرام آیا
مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرا منہ چوما
نکل کر دل سے جب میری زباں پر اُن کا نام آیا

داد نے پھر شورِ قیامت کی شہادت دی ہے ...
راقم الحروف نے حسین صاحب سے کہا ہے کہ تمھارا اشعر اس شعر کی تفسیر دل پذیر ہے ؎

زباں پہ بارے خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلیے

حسین داد و تحسینِ عشق کا شور کم ہونے پر ارشاد فرما رہے ہیں ؎ اذانوں میں نمازوں میں درودوں میں وظیفوں میں

خدا کے بعد آیا تو محمدؐ کا ہی نام آیا



بیس نکات کا
پیغام یہ ہے
کہ ملک صحت مند
اور تعلیم یافتہ ہو۔

بھٹکے ہوئے چاند کے ٹکڑے حسین جبین مصطفیٰ کی
نکل کر برجِ وحدت سے وہ جب ماہِ رسالت آیا

حسین صاحب داد و ستائش سے لدے پھندے اپنی جگہ پر بیٹھ گئے ہیں اور سرورؔ صاحب نے جے پور کی آفت معروف جناب راہیؔ شہابی صاحب کے نام نامی کا اعلان فرمایا ہے۔ اور راہیؔ اپنی روایات کے مطابق چہکتے ہوئے مائیک پر آ گئے ہیں سنیئے جے پور کی یہ آفت معروف کس قدر دلپسند انداز اور رواں دواں ترنم سے سامعین کو محظوظ کر رہا ہے کہ ہر شعر پر داد کا شور قیامت کبریٰ کے شور کا نمونہ پیش کر رہا ہے۔

منور کر کے تم خلد بریں سوئے زمیں آئے
زمیں پر انبیا اس شان و شوکت سے نہیں آئے

شعر آپ نے پڑھ لیا داد کا اندازہ آپ خود لگا لیجئے اب میں راہیؔ صاحب کی نعت کے صرف اشعار ہی پیش کروں گا داد کی روداد کہاں تک پیش کروں۔

عدم سے سوئے دُنیا ایسے ختم المرسلیں آئے
اُتر کر فرش پر جس طرح خود عرشِ بریں آئے
یہاں چھوڑے ہیں تو نے نقش پا اے رہبرِ اعظم
تلاشِ حق میں آخر قافلے سارے وہیں آئے
ہزاروں کارواں تیرے سبب اے محسنِ عالم
گماں کی سرحدوں سے لوٹ کر سوئے یقیں آئے
تمہیں ہو سب سے پہلی سینۂ تخلیق کی دھڑکن
عدم کی تیرگی میں بن کے نورِ اولیں آئے
تمہیں ہو بہجتِ نقاشیِ ازل کی جنبشِ آخر
تمہارے بعد پھر خالق کو بھی ارماں نہیں آئے

راہیؔ شہابی صاحب بے پناہ داد و ستائش سے جھولیاں بھرے اپنی جگہ گئے تو سرورؔ صاحب نے جناب پارساؔ کوٹھری سے نعت سے نوازنے کی درخواست کی ہے ہر شاعر کی مائیک پر آنے سے پہلے فرید ایوبی صاحب یا حسین صاحب قبلہ کوثر مرحوم یا قبلہ بابا جے پوری مرحوم کوئی نعتیہ شعر سناتے رہے۔ سنیئے پارساؔ صاحب نعت میں کرم فرما رہے ہیں۔

حشر میں شانِ شفاعت دیکھنا
تم ہو جائے گی رحمت دیکھنا

ان کے دیوانوں کی حالت دیکھنا ... قیامت میں قیامت دیکھنا

"اک قیامت میں قیامت دیکھنا" پر سامعین ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے آپ تو پارساؔ صاحب کے نعتیہ اشعار سنیئے

اے گنہگارانِ اُمت روزِ حشر
جوششِ بارانِ رحمت دیکھنا
اُنکی اُمت میں ہوں بخشا جاؤں گا
زاہد و روزِ قیامت دیکھنا
ہیں شفیع المذنبیں کے اُمتی
ہم گنہگاروں کی قسمت دیکھنا
کر رہا ہوں وصفِ رخسارِ نبی
میری قرآں کی تلاوت دیکھنا

داد کی آوازیں بلند ہوئی ہیں اور پارساؔ صاحب فرما رہے ہیں

اب مدینے پہنچے اے صبحِ وطن
اب ہماری شامِ غربت دیکھنا
دار پر منصور کو چڑھنا پڑا
رتبۂ فرمانِ شریعت دیکھنا
خوابِ راحت میں ہے شیدائے نبی
دیکھنا شورِ قیامت دیکھنا
ہم تو دیکھیں گے مدینہ واعظو
تم مبارک ہو تم کو جنت دیکھنا
پارساؔ سے بادہ کش پر حشر میں
بارشِ بارانِ رحمت دیکھنا

جناب پارساؔ بہت اچھی داد پانے کے بعد جناب سرورؔ صاحب کے قریب بیٹھ گئے ہیں اور سرورؔ صاحب نے جناب حقؔ صاحب بنارسی سے ارشاد فرمانے کی درخواست کی ہے حقؔ بنارسی صاحب اہلِ جے پور کے پسندیدہ شعرا میں سے ہیں لہٰذا سامعین بڑے شوق سے حقؔ صاحب کی نعت سننے کیلئے منتظر تھے۔ ارشاد ہوتا ہے

میرے آقا کے کرم سے ہوئی شہرت میری
ورنہ پہلے تھی نہ اب کچھ ہے حقیقت میری
معجزات نبوی پر تو ہے میرا ایمان
تو جو منکر ہے تو دوزخ تری جنت میری
دیر ہے صرف مدینے میں قدم رکھنے کی
آپ سے آپ سنور جائیگی قسمت میری
آپ کا ہو کے درِ غیر پہ جاؤں آقا
یہ گوارا نہ کرے گی کبھی غیرت میری
مل گیا مجھ کو محمد کی غلامی کا شرف
اب کوئی سوچ بھی سکتا نہیں قیمت میری
سن کے آقا کو مرے ہوگی یقیناً تکلیف
اے صبا اُن سے نہ کہدینا مصیبت میری
اک نظر دیکھ لوں میں گنبدِ خضرا کا جمال
چاہے چھن جائے پھر آنکھوں کی بصارت میری

ہر شعر پہ خوب سے خوب تر داد پانے کے بعد مقطع عطا ہو رہا ہے ؎

میں نہ حسان نہ سعدی ہوں نہ حافظ ایسے
آشکارا ہے زمانے پہ حقیقت میری

داد و ستائش کی آوازوں میں حق صاحب مائک سے میرے قریب تشریف لے آتے ہیں اور محمد اقبال ندیم صاحب بے پور تی مائک پر فرما رہے ہیں ؎

مخلوق میں اشرف جو محبوب نبی ہے
قرآں کی تفسیر حیات اُن کی رہی ہے
اس دورِ مصائب میں یہی وجہ خوشی ہے
خوش ہوں کہ مرے دل میں تمنائے نبی ہے
بیٹے بھی ثنا خواں ہیں ہر اک گل تو شجر بھی
صبح کی کلی نعت میں مشغول رہی ہے
تخلیق دو عالم کی ہوئی جس کی بنا پر
وہ میرا نبی میرا نبی میرا نبی ہے

داد پاتے ہوئے ندیم ایوبی صاحب بہت اچھے نعتیہ معار سُنا رہے ہیں۔ سنیئے ؎

ایک کرن جو کبھی کعبہ سے چلی تھی
اس ایک کرن نے ہی تو بیداری کی ہے

مجھ کو بھی بلائیں گے کبھی آپ مدینے
ہر لمحہ مجھے آپ سے امید لگی ہے
اُمت کی شفاعت کا انھیں غم رہا ہر دم
عصیاں کے سمندر میں گھری آج بھی ہے
ہر گام معاصی ہیں تعاقب میں تعجب
جو آپ سنبھالیں اسے اُمت پہ بنی ہے
پھر آج ندیم ان کے وسیلے سے دعا کر
جو فخرِ دو عالم بھی ہے نبیوں کا نبی ہے

جناب رضی الدین صاحب رضا بہت ہی اچھے انداز میں فخر و ابتہاج اور ملک کے نامور شاعر جناب مخمور نوگانوی سے گذارش کر رہے ہیں کہ نعت عنایت فرمائیں۔ مخمور سعیدی صاحب فرما رہے ہیں کہ یہ پہلا موقع ہے کہ کسی نعتیہ مشاعرے میں مجھ ایسے گنہگار کو شرکت کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ اور اس سعادت کے لیے میں رضا صاحب کا ممنون احسان ہوں مخمور صاحب آج بالکل صوفی حالت میں تشریف فرما ہیں۔۔۔ سفید اونی شال اوڑھے انتہائی عقیدت مندانہ انداز میں شام کے آٹھ بجے سے بیٹھے ہیں ایمان کی بات ہے کہ آج مخمور صاحب کے چہرے پر جو نور ہے وہ دُخترِ رز کی فراوانی بھی پیدا نہ کرسکی ہوگی۔ سنیئے مخمور صاحب قطعہ ارشاد فرما رہے ہیں ؎

یہ شعر تھا شبِ معراج آسمانوں پہ
اُٹھو کہ جشنِ عقیدت کا اہتمام کریں
زمیں سے آج وہ انسان آنے والا ہے
قدم قدم پہ جسے فرشتے سلام کریں

قطعہ پر داد پانے اور دوبارہ قطعہ سُنانے کے بعد نعت ملاحظہ فرمائیے۔ میں داد کا ذکر قصداً نہیں کروں گا کیونکہ اس سے اشعار کا تسلسل ٹوٹ جائے گا بس یوں سمجھئے کہ ہر شعر پہ مخمور صاحب کو ایسی داد ملی ہے کہ شاید بہترین غزلوں پر بھی انھیں کسی مشاعرے میں داد نہ ملی ہوگی سنیئے کہ تمہ سادے انداز کی نعت ہے ؎

شانے پہ ڈال کر زلفِ چلی پڑو ذرا پہ محمد کی

انھوں نے اُدھر کا رخ کیا | مدحِ شہِ حق، عطرِ محمدؐ کی
رنگ باطل کے پڑ گئے پھیکے | سادگی دیکھ کر محمدؐ کی
ایک دن سب کو دیکھنا ہے اُدھر | جس طرف حق نظر محمدؐ کی
تم نہیں یہ وجودِ حق کا ثبوت | دی ہوئی اک خبر محمدؐ کی
سبب اقتباسِ مہرِ جہاں | ہستی معتبر محمدؐ کی
تا ازل تا ابد سفر [illegible] کا | وقت تحریرِ سفر محمدؐ کی
جس سے روشن ہے کائنات کی رات | معنی دُعا ہے سحر محمدؐ کی

[illegible] صاحب کی اس سادہ سی رواں دواں نعت شریف نے رنگ باندھ دیا! [illegible] داد و ستائش کی پرجوش آوازوں کے درمیان محمود صاحب اپنی جگہ تشریف لے آئے ہیں اور اب عزیز تبسم پوری مائیک پر ہیں فرما رہے ہیں ؎

کوئی حاجت ہے حاجت روا کیلیے + کوئی مشکل ہے مشکل کشا کیلیے
پا رہی ہیں جو قسمت کا مارا ہے میری بگڑی بنا دو خدا کیلیے
ظلم تقدیر کے میں کہاں تک سہوں + کوئی سنتا نہیں ہے میں کس سے کہوں
کیا یہ اچھا ہے در در بھٹکتا رہوں + اپنے در پر بلا لو خدا کیلیے

عزیز صاحب نے طیبہ کو تیسرا عرش کو ارش، مسند کو مسند لکھا ہے تاہم ان کی عقیدت اپنی جگہ مستند ہے خدا انھیں جزائے خیر دے۔ اب رفعا صاحب نے اعلان کیا ہے کہ جناب ڈاکٹر کامل قریشی صاحب دہلوی نعت عنایت فرمائیں گے۔ ڈاکٹر کامل قریشی مائیک پر تشریف لے آئے ہیں۔ فرما رہے ہیں کہ حج کے موقع پر ایک مطلع ہوا تھا اور وہی مطلع ہی اس نعت کا موجب ہوا ہے۔ یہ نعت حج کے موقع پر اردو سروس آل انڈیا ریڈیو نے ریلے بھی کی۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

ملے کاش صہبائے جامِ محمدؐ
ازل سے ہوں میں تشنہ کامِ محمدؐ
درودِ محمدؐ سلامِ محمدؐ
لبِ دو جہاں پہ ہے نامِ محمدؐ
ازل سے ہے تابندہ نامِ محمدؐ
ابد تک رہے گا نظامِ محمدؐ
مقامِ خدا سے محمدؐ ہیں واقف
خدا جانتا ہے مقامِ محمدؐ

کلامِ محمدؐ، کلامِ خدا ہے
کلامِ خدا ہے کلامِ محمدؐ

داد ہے کہ ہر سامع درود شریف پڑھ رہا ہے اور کامل صاحب نغمہ سرا ہیں ؎

حقیقت میں آرام کا مستحق ہے
وہ بندہ ہوا جو بھی رامِ محمدؐ
رہے پیش زمیں جانبِ سبز گنبد
فلک خم، بعد احترامِ محمدؐ
بیانِ محمدؐ ہے اک عکسِ قرآں
پیامِ خدا ہے پیامِ محمدؐ
چلو صبحِ اسلام سے فیض پائیں
کھلا ہے درِ فیضِ عامِ محمدؐ
در و بام کونین پر ضو فشاں ہے
عرب کا وہ ماہِ تمامِ محمدؐ
زمانے کے شاہوں سے رتبہ ہے افضل
فقط ایک کامل غلامِ محمدؐ

جناب کامل قریشی صاحب بھی داد سمیٹتے ہوئے اپنی جگہ پر آ گئے ہیں اور اب جناب ناظر صاحب پوری مائیک پر آ گئے ہیں اور ایک قطعہ کے بعد فرما رہے ہیں ؎

انتہائے عشق تم ہو حُسن کا آغاز تم
راندۂ اہلِ سرا تم کُن فکاں کا راز تم
تم سے بڑھ کر کون سبحان اللہ کہے رموز
خالقِ اکبر کی خاموشی کے بھی ہو ہم راز تم
اسیر من الظلومی انسان ہو گیا جس کے سبب
حق نے آدم کو جو بخشا وہ حسین اعزاز تم
حُسن کی تشہیر تم ہو عشق کا تم سے وجود
حُسن کا انداز تم ہو عشق کی آواز تم
اک تمہارے نام سے ہے قلب مومن میں تڑپ
[illegible]
شمع توحید تم ہو سوز تم ہو ساز تم ہو
ناظرِ بے کس بھلا کس کو پکارے مصطفےٰ
بے کسوں کے کس بھی تم ہو ہمدم و دمساز تم

ناظر صاحب مناسب داد پا کر مائیک سے ہٹے تو جناب

ساجد صاحب یوں نغمہ سرا ہوئے ؎

تم میکدۂ وحدت حق کی ضیا ہو — وہ جام ہو جو بادۂ عرفاں سے بھرا ہو
رُتبے میں ہر اک مرسل ہادی کے سوا ہو
تم بعدِ خدا بعدِ خدا بعدِ خدا ہو

داد خوب زوروں سے دی جا رہی ہے اور ساجد صاحب فرما رہے ہیں ؎

کرنا ہی پڑی اُمت مرحوم کی بخشش
کیونکر نہ خدا چاہے اُسے جس کو جسے چاہا ہو
اک برق تجلی کہ سرِ طور اُڑیں ہوش
اک جلوہ نمائی کہ سرِ عرش علا ہو
ساجد کی تمنا ہے کہ اے جانِ تمنا
ہر سجدہ ترے پائے نگاراں پہ ادا ہو

ساجد صاحب بھی بہت اچھی داد پا کر مائیک سے رخصت ہوئے تو رضا صاحب نے جناب منظر کوثری صاحب سے نعت شریف سنانے کی درخواست کی ہے چار مصرعوں کے بعد نعت ارشاد فرما رہے ہیں ؎

اللہ غنی آمدِ سرکارِ دو عالم
آپے میں نہیں ہیں در و دیوارِ دو عالم
مصحف ہے ترا مطلع انوارِ دو عالم
ہے زلف تری ابرِ گہر بارِ دو عالم
کلیوں میں ترا تکلم ترا غنچوں میں تبسم
اے جانِ بہارِ گل و گلزارِ دو عالم
ناداں ہے تری ذات پہ خود علم نجومی
اے شرح میں کاشفِ اسرارِ دو عالم
جھڑتے ہیں دہن سے ترے گلہائے معانی
اور خلق ترا لذتِ گفتارِ دو عالم
ادنےٰ سی یہ اک شان ہے دیوانوں کی تیرے
ٹھوکر سے بدل دیتے ہیں رفتارِ دو عالم
منظرؔ ہے در ساقیِ کوثر کا بھکاری
.... طلب کارِ دو عالم

منظر صاحب بہت اچھی داد پانے کے بعد اپنی جگہ تشریف لے گئے ہیں۔ میں کسی ضرورت سے مشاعرہ گاہ سے باہر گیا ہوا تھا واپس آیا تو جناب فرحت ایوبی صاحب نعت سنا چکے تھے مگر افسوس کہ میں ان کا کوئی شعر بھی نوٹ نہ کر سکا اور نہ ہی انھوں نے نعت کی نقل مہیا کی ہے۔ اب جناب اعظم زیدی صاحب مائیک پر تشریف لائے ہیں ایک قطعہ سنانے کے بعد نعتیہ اشعار پیش کر رہے ہیں ؎

کرم گستر و مہرباں آپ ہی ہیں
قرارِ دلِ بیکساں آپ ہی ہیں
ہے قرآن بے شک کتابِ الٰہی
مگر اس کی روحِ رواں آپ ہی ہیں
ادھر عاصیوں کی امیدوں کا مرکز
اُدھر رشکِ پیغمبراں آپ ہی ہیں
وہ جن کے مبارک قدم کی بدولت
مدینہ ہے دار الاماں آپ ہی ہیں

دار الاماں کو اعظم صاحب "دار الاماں" کہتا ہے اب مائیک پر تشریف لا چکے ہیں جناب مغنی تبسم چودھری فرماتے ہیں ؎

زہے یا رُوحِ جانِ محمد ما تشریف لے آئے
محمد مصطفیٰ صلِ علیٰ تشریف لے آئے
حبیبِ کبریا فخرِ الورا تشریف لے آئے
وہ دستِ نازِ فطرت کی ادا تشریف لے آئے
اندھیرا کفر کا جب چھا رہا تھا سارے عالم میں
وہ بن کر مشعلِ راہ ہدیٰ تشریف لے آئے
ہوا ہے اور نہ ہوگا اُن کا ثانی دو جہاں میں
کہ فخرِ انبیاء نازِ خدا تشریف لے آئے
گنہگاروں کی قسمت جاگ اُٹھی دیکھو
کہ وہ رحمت لقب دستِ دعا تشریف لے آئے

مغنی صاحب بھی داد پاتے ہوئے مائیک سے ہٹے تو رضا صاحب نے جناب خدا داد صاحب خوشتر سے پونچھی سے درخواست کی ہے کہ مائیک پر تشریف لا کر بھی اللہ نعت مرحمت فرمائیں خوشتر صاحب ایک قطعہ سنا کر نعت شروع کر رہے ہیں ؎

بے شک بلند [illegible] تمہیں تو ہو
شہکارِ دستِ [illegible] اگر حسیں تو ہو
منسلک ہیں جس سے سارے پیمبر تمہیں تو ہو
دریا جہاں میں وہ سمندر تمہیں تو ہو
حق بیں و حق شناس و حق آگاہ و حق نگر
حق کے قریب ہو کے قریں تر تمہیں تو ہو
کلمے میں ہو اذان میں تم ہو نماز میں
اسلام کے جہاز کا لنگر تمہیں تو ہو

داد ہے کہ ان اشعار کا حق ہے۔ سنیے مونس صاحب فرما رہے ہیں ؎

مہکائے جس نے زلف و اخلاص کے گلاب
چھلکائے جس نے لطف کے ساغر تمہیں تو ہو
آرزو جس کی جنبشِ ابرو کا منتظر
جس نے کیا دلوں کو مسخر تمہیں تو ہو
جس ذات پر ہے ختم صفت کا معاملہ
اُس ذات کی صفات کا مظہر تمہیں تو ہو
سائل نہ جس کے در سے تہی دست جا سکا
باندھے ہیں جس نے پیٹ پہ پتھر تمہیں تو ہو

داد کا عالم بیان نہیں ہو سکتا۔ مونس صاحب بڑے اچھے انداز سے تحت میں ارشاد فرما رہے ہیں ؎

اللہ کا کلام تمہاری زباں سے
لذت شناسِ قندِ مکرر تمہیں تو ہو
آدم سے تا مسیح جو ابھرا کرن کرن
وہ آفتابِ صبح منور تمہیں تو ہو
ہم سے گناہگاروں کی قسمت کے واسطے
لائی ہے جس کی ایک ہی ٹھوکر تمہیں تو ہو
فرمان روائے مُلک خدا اور پھر نہیں
نانِ جویں بھی جس کو میسر تمہیں تو ہو
مشکل میں غم میں نزع میں مرقد میں حشر میں
مونس رفیقِ ہم دم و [illegible] تمہیں تو ہو

مونس صاحب داد و ستائش سے سرشار اپنی [illegible] سے آئے ہیں اب جناب ڈاکٹر متین نیازی کا نمبر ہے کہ نعت جو انہوں نے کان پور سے بھجوائی ہے ملاحظہ فرمایئے۔

جہاں وہ جس سے حیاتِ نبی نظر آئے
پڑھو درود کہ وابستگی نظر آئے
کمالِ عشقِ محمد اگر میسر ہو
فضائے دل میں جمالِ نبی نظر آئے
نبی کے عشق سے بنتی ہے سیرتِ مومن
یہی نہیں کہ فقط مولوی نظر آئے
ادب سے چوم لے نامِ نبی تصور میں
ادا ادا سے تری عاشقی نظر آئے
سنوار دی وہ ذاتِ دشمن بھی ہم کو دکھلا دی ایسے
کہ دشمنوں کو بھی پیمبری نظر آئے
متین کاش عطا ہوں وہ جو من نورانی
جدھر اٹھاؤں نظر روشنی نظر آئے

متین صاحب کو غائبانہ داد خوب ملی اور اب جناب قمر صاحب کی نعت سماعت فرمایئے ؎

یہاں تشریف لائے آپ شاہِ دوسرا بن کر
محمد مصطفیٰ بن کر حبیبِ کبریا بن کر
مٹائیں کفر کی تاریکیاں سارے زمانے سے
کبھی بدر الدجیٰ بن کر کبھی شمس الضحیٰ بن کر
اگرچہ آپ سے پہلے بہت سے انبیا آئے
مگر دنیا میں آپ آئے ہیں ختم الانبیاء بن کر
شبِ اسریٰ یہ ظاہر ہو گیا بیت المقدس میں
کہ آپ آئے جہاں میں انبیاء کے پیشوا بن کر
کیا ہے آپ ہی نے بے نیازِ دو جہاں ہم کو
کبھی جود و سخا بن کر کبھی بحرِ عطا بن کر
عطا ہوں نعمتیں کونین کی ہم کو شہِ والا
ہم آئے ہیں درِ اقدس پہ مفلس اور گدا بن کر
قمر لائی ہے قسمت، آستانِ پاک تک مجھ کو
درِ اقدس سے میں جاؤں گا جلوہ کیا سے کیا بن کر

اب جناب اختر اکبرآبادی مائیک پر تشریف لائے ہیں اُن

وہ نعت اشعار سن چکے ہے

ہے بلندیوں کے مقام پر یہی مجتبےٰ یہی مصطفےٰ
علیٰ الکمال کے قریب تر یہی مجتبےٰ یہی مصطفےٰ
یہی حق نما یہی حق نگر یہی مجتبےٰ یہی مصطفےٰ
یہی رہنمائے علیم تر یہی مجتبےٰ یہی مصطفےٰ

اب جناب رضی الدین صاحب رضا کنوینر مشاعرہ ہذا کی نعت بھی پیش خدمت ہے۔ رضا صاحب جس عقیدت اور خلوص سے ہر سال حضور رسول اکرم کے یوم پیدائش پر مشاعرۂ نعت منعقد کراتے ہیں یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ خدا نے انھیں اپنے رسول کے صدقہ میں ہر طرح سے نواز رکھا ہے۔ خدا ان پر اپنی جملہ نعمتوں کی ارزانی فرمائیں اور رسول اکرم انھیں یہاں اور وہاں اپنے قدموں میں جگہ دیں۔ رضا صاحب کی نعت پر خوب داد دی گئی ہے۔

حبیبِ خدا محترم آپ ہی ہیں
محمدؐ! خدا کی قسم آپ ہی ہیں
زمین مدینہ سے عرشِ بریں تک
ملے جن کے نقشِ قدم آپ ہی ہیں
منور ہیں کونین جس کی ضیا سے
وہ تنویر شمعِ حرم آپ ہی ہیں
ازل ہی میں لکھا گیا نام جن کا
وہ مکتوب لوح و قلم آپ ہی ہیں
نہ ہوتے اگر آپ کچھ بھی نہ ہوتا
بنائے وجود و عدم آپ ہی ہیں
ہوئی خلد آراستہ جن کے دم سے
وہ زینت باغ ارم آپ ہی ہیں
ہزاروں ستم اہل مکہ کے سہہ کر
کئے جس نے لطف و کرم آپ ہی ہیں
جہاں نفسی نفسی کہیں گے نبی تک
وہاں پر شفیع الامم آپ ہی ہیں

وہ [illegible] رہا وہ آتا
رضا [illegible]

سکتے تھے سن چکے ہیں اور مشاعرہ ہذا کے اختتام پر دعائے خیر مانگی جا رہی ہیں۔ ●●

شانِ وطن

اخترؔ سعیدی۔ ڈونڈا (رانچی)

خون مانگے اگر مجھ سے میرا وطن
اس پہ قرباں کروں میں جان اور تن
اس کی جانب اٹھائے جو ترچھی نظر
ایسے سفاک کا چیر دوں گا بدن
جو قرباں اپنے وطن پر ہوئے
وہ کہلائیں گے سرفروشِ وطن
خطابت کا سرتاج ابوالکلام
رہے گا ابد تک وہ نازِ چمن
کام باقی ہیں لاکھوں وطن کے ابھی
کام کرنے کی دل میں اگر ہو لگن
جو شیرازہ اپنا بکھر جائے گا
تمام ہو کے رہ جائے گا بانکپن
اگر ہم نے سازش میں حصہ لیا
کہے گا زمانہ غدارِ وطن
سعادت اگر ہو سکی یہ نصیب
تو اخترؔ بھی ہوگا شہیدِ وطن





بھگوان کا وجود

ڈاکٹر طاودے سرن آرکہ
(بلاری)

گارڈینل کی چالیس گولیاں دیجیے نوجوان نے کیمسٹ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا گاہکوں میں سے ایک فیشن ایبل خاتون بے ساختہ کہہ اٹھیں کیا خودکشی کا ارادہ ہے نوجوان نے ناپسندیدہ نظروں سے خاتون کو دیکھتے ہوئے کہا خودکشی نہیں - مرگی کے دورے پڑتے ہیں۔ ڈاکٹر کے بتلانے پر ان گولیوں کا استعمال کرتا ہوں کیمسٹ نے ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ لائیے ڈاکٹر کا پرچہ۔

نوجوان نے ناگواری کے ساتھ ذرا تلخی سے کہا آپ کا کام دوائیں بیچنا ہے۔ اور میں آپ سے ایک دوا ہی طلب کر رہا ہوں پھر ڈاکٹر کے پرچے کی کیا تک ہے کیمسٹ نے نہایت نرم لہجہ میں نوجوان سے پوچھا، آپ اس مرض کے لئے اور کون کون سی دوائیں لیتے ہیں اور کون کون سے انجکشن لگواتے ہیں۔ نوجوان نے مضبوط لہجے میں کہا بس مجھے اسی دوا سے ہی فائدہ ہوتا ہے تو پھر دوسری دوائیں یا انجکشن لگوانے کی کیا ضرورت ہے کیمسٹ نے معذرت کرتے ہوئے کہا معاف کیجیے اول تو کوئی دوا بھی بغیر ڈاکٹر کے پرچے کے نہیں دیتا مگر اس قسم کی دوائیں میں کسی صورت میں بھی ڈاکٹر کے پرچے کے بغیر نہیں دے سکتا۔ آپ کہیں اور سے خرید لیجیے۔ نوجوان کے لب و لہجہ سے اب بے زاری کا اظہار نمایاں ہو چکا تھا بگڑتے ہوئے بولا آپ صاحب جسے مرنا ہوتا ہے وہ کسی اور طریقے سے بھی مر سکتا ہے ویسے زیادہ مقدار میں کسی بھی دوا کا استعمال زہر بن جاتا ہے نہ معلوم آپ گارڈینل کی چالیس گولیاں اکٹھی دینے میں کیوں معترض ہو رہے ہیں نوجوان ناگواری کے ساتھ کیمسٹ کی دوکان سے باہر چلا گیا۔

اور کچھ فاصلے پر ہی ایک دوسرے کیمسٹ کی دوکان کے سامنے جاکر کاغذ کے پرزے پر کچھ لکھ رہا تھا کہ پہلی دوکان والی فیشن ایبل خاتون نے نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تم واقعی خودکشی کے چکر میں ہو۔ اگر مجھ پر اعتماد کر سکو تو اپنے اس خطرناک ارادہ کی وجہ بتاؤ۔ شاید میں تمہاری کچھ خدمت کر سکوں نوجوان نے ایک نامحرم خوش پوش خاتون کی زبان سے ہمدردی کے یہ بول سنے تو اسے صاف الفاظ میں یہ اعتراف کرتے ہی بنا کہ ہاں میں واقعی خودکشی کرنا چاہتا ہوں کیونکہ اب مجھ سے اپنی بیوی اور بچوں کی تکالیف دیکھی نہیں جاتیں۔ میں ایم۔ اے، بی ایڈ ہوں اور ہزار کوششیں کرنے پر بھی بیکار ہوں۔

خاتون نے ہمدردانہ انداز میں حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا بھائی صاحب پریشانیوں کا مقابلہ ہمت اور جوانمردی سے کرنا چاہیے اور مشکلات کا حل سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔ خودکشی سے آپ تو نجات پا جائیں گے مگر آپ کے بیوی بچوں کا کیا ہوگا۔ آپ نے یہ سوچا ہے جن کی پریشانیوں اور تکالیف کی خاطر آپ خودکشی کرنے پر تیار ہیں آپ کی خودکشی کے بعد ان کی تکالیف اور پریشانیوں میں کمی نہیں آئے گی بلکہ اضافہ ہوگا۔ نوجوان نے طنز یہ انداز میں کہا کہ نصیحت کرنا آسان ہے مگر عملی طور پر کسی کی پریشانی اور مصیبت کو دور کرنا مشکل۔ اجنبی خاتون نے سنجیدگی سے کہا نہیں ایسی بات نہیں۔ چلیئے سامنے ریسٹورنٹ میں بیٹھتے ہیں۔ چائے بھی پی لیں گے اور آپ کی مشکلات کا کوئی حل بھی تلاش کریں گے۔ کیونکہ خاتون سمجھتی اور جانتی تھیں کہ خودکشی ایک ایسی جذباتی تحریک ہوتی ہے

جو ذرا سی بھی دلی سچی ہمدردی ملنے پر فوراً دب جاتی ہے۔
ریسٹورنٹ میں چائے کا آرڈر دے کر خاتون نے جوان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا اگر آپ اپنے ہی محلے میں دس پانچ بچوں کو ٹیوشن پر بھی پڑھاتے تو اچھی خاصی آمدنی ہو سکتی تھی آپ ایسے قابل نوجوان کا خودکشی کے بارے میں سوچنا بھی انسان کے اشرف المخلوق ہونے کی توہین ہے۔ خاتون نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

نوجوان نے مایوس بھرے لہجے میں کہا محترمہ میں نے یہ کوشش بھی کی مگر آجکل ٹیوشن کا دھندہ بھی ان ٹیچروں کو ملتا ہے جو سکول میں پڑھاتے ہیں۔ بچوں کے والدین کو یہ یقین ہوتا ہے کہ اگر بچے کی ٹیوشن اس کے کلاس ٹیچر سے پڑھوائیں گے تو ان کا بچہ یقینی طور پر اچھے نمبروں میں پاس ہو جائے گا۔ خواہ بچہ امتحانی پرچہ کورے کا کورا ہی کیوں نہ چھوڑ آئے۔ رہی ملازمت تو اس کے حصول کے لئے رشوت پہلی سیڑھی ہے اور میں رشوت کہاں سے دوں جبکہ میری جیب خالی ہے۔ ہاں تم ٹھیک ہی کہتے ہو نوجوان یہ کہتے ہوئے خاتون نے بل اور ٹپ کے پیسے پلیٹ میں رکھتے ہوئے اپنا پرس سنبھالا اور ریسٹورنٹ سے باہر آکر کسی سواری کا انتظار کرنے لگی۔ معاً نہ جانے ان کے دل میں کیا آیا کہنے لگیں میرے ساتھ چلو گے تم۔
"کہاں" "جہاں میں جاؤں گی" میں ابھی کچھ کہہ بھی نہ پایا تھا کہ وہ نہایت بے باکی سے کہنے لگیں، کیا میرے ساتھ چلنے میں اعتراض ہے یا سماج سے ڈرتے ہو۔ خاتون نے خود ہی ایک رکشہ والے کو آواز دی اور رکشہ میں اسے اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے رکشہ والے سے کہا چلو ڈی۔ ایم کے بنگلے پر۔ کچھ ہی دیر میں ڈی۔ ایم صاحب کے بنگلے پر تھے۔ رکشہ والے کو پیسے دیتے ہوئے یہ محترمہ اسے اپنے ساتھ لئے بلا کھٹک ڈی۔ ایم صاحب کے بنگلے میں ایسے داخل ہوئیں جیسے یہ ان کی رہائش گاہ ہو وہ حیران سے ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ ایک منٹ میں ہی وہ بنگلے کے لان سے گزر کر برآمدے میں پہنچ گئے اور جالی لگے دروازے کے ایک پٹ کو کھولتے ہوئے خاتون کمرے کے اندر چلی گئیں وہ برآمدے میں ہی ٹھہر رہا تو وہ فوراً دروازے کا پٹ کھول کر اس سے کہنے لگیں کہ باہر کیوں رہ گئے اندر آجاؤ۔ دیکھا تو ڈی۔ ایم صاحب چائے پی رہے تھے۔ خاتون کو دیکھتے ہی کہنے لگے۔ آیئے، آیئے مسز راج آج اس وقت کیسے آنا ہوا۔ خاتون نے انتہائی بے تکلفی سے کہا بالکل خیریت ہے۔ آج میں اپنے نہیں بلکہ اس نوجوان کے کام سے آئی ہوں ابھی نے نہایت ادب کے ساتھ ڈی۔ ایم صاحب کو نمشکار کیا۔ محترمہ تو خود بخود بغیر ڈی۔ ایم کے کہے ہی کرسی پر تشریف فرما ہو چکی تھیں۔ اور ابھی جب ڈی۔ ایم صاحب نے فرمایا کہ بیٹھ جاؤ تو وہ بھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ خاتون نے بغیر کسی تمہید کے کہنا شروع کر دیا۔ یہ فرسٹ کلاس ایم۔ اے، بی۔ ایڈ ہیں اور میں چاہتی ہوں کہ انہیں کسی اچھے کام پر لگا دیجئے۔ بے روزگاری کے باعث ان کے بیوی بچے اور یہ خود پریشان ہیں۔
"کیا نام ہے ماسٹر صاحب۔ ڈی۔ ایم صاحب نے حاکمانہ انداز میں پوچھا۔ "دھرمیش"
ٹھیک ہے آپ کی ملازمت کا بندوبست کر دیا جائے گا۔ مسز راج کی سفارش تو ماننی ہی پڑے گی۔
مسز راج فوراً بول پڑیں۔ میں ان کو آپ کے بنگلے پر ہی چھوڑے جا رہی ہوں۔ جب تک آپ ان کی ملازمت کا انتظام نہیں کریں گے یہ یہاں سے جائیں گے نہیں۔
ڈی۔ ایم صاحب فرمانے لگے ٹھیک ہے جب تک ان کی ملازمت کا کوئی معقول انتظام نہیں ہو جاتا یہ میرے بچوں کو پڑھائیں اور یہیں رہیں۔ وہ ڈی۔ ایم صاحب کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ سوچ ہی رہا تھا کہ مسز راج ڈی۔ ایم صاحب سے کہنے لگیں۔ آج آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ ڈی۔ ایم صاحب نے بلیئر دیتے ہوئے بے تکلفی کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہنے لگے اجی

چھوٹ بیٹے کیا احسان یہ تو آپ کے حکم کی تعمیل کی گئی ہے اب ہم ریٹائرمینٹ کے قریب آچکے ہیں کوئی اور خدمت ہو تو لے لیجئے۔ کیونکہ جب تک کرسی پر ہیں آپ کی خدمت کر سکتے ہیں پھر تو ہمارے اختیار میں کچھ بھی نہ رہیگا

مترا نے مقنوی حسن مسکراہٹ کے ساتھ ڈی۔ ایم صاحب سے اجازت چاہی تو انہوں نے بھی مودبانہ انداز میں التجا کی کہ حضور میں بھی اپنے بیوی بچوں کو خوشخبری دے آؤں کل سے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔

ڈی۔ ایم صاحب نے ہنستے ہوئے کہا ضرور ضرور۔ وہ دونوں بنگلے سے باہر آکر رکشہ کا انتظار کرنے لگے۔ مترا مسکراتے ہوئے کہنے لگیں خودکشی کے بعد گھر والوں کی خیر خبر کون لیتا جواب تمھیں گھر والوں کی یاد آرہی ہے۔ جاؤ جلدی سے گھر والوں کو یہ خوشخبری سناؤ اور پھر کبھی ایسا سوچنا بھی نہ۔ اتنے میں ایک خالی رکشہ بھی آگیا جس پر مترا سوار ہوتے ہوئے بولیں آؤ میں تمھیں تمھارے گھر تک پہنچا کر پھر گھر چلی جاؤں گی۔ رکشہ والے نے پوچھا بیگم صاحب کہاں چلوں۔ مترا مجھے دیکھتے ہوئے کہنے لگیں کہ تمہارا گھر کس محلے میں ہے "گاندھی نگر" رکشہ چل پڑی۔ میں نے احسان سے دبی ہوئی آنکھوں سے مترا کو دیکھتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا میں حیران ہوں کہ آخر آپ ہیں کون جن سے ڈی۔ ایم صاحب بھی خم کھا رہے تھے۔ اگر تم یہ سب کچھ جاننا چاہتے ہو تو پھر چلو میرے گھر پہ تمھاری سب حیرت دور ہو جائے گی۔ مجھ ناچیز کو آپ اپنے گھر لے جا کر کیا کریں گی میں تو ویسے ہی آپ کا ممنون احسان ہوں مگر مترا نے رکشا والے کو بجائے گاندھی نگر جانے کے اپنے گھر کی طرف جانے کو کہا۔ چند ہی منٹ میں رکشا مترا جی کی کوٹھی کے سامنے تھا۔ اندر داخل ہوتے تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ گھر کی ملازمہ نے چند ہی منٹ میں پر تکلف چائے میز پر لگا دی۔ مترا نے کہا سنو شکنتلا دھرمیش جی کھانا بھی یہیں کھائیں گے۔ چائے پیتے ہوئے اسکی نظریں میز پر رکھے ایک نوجوان کے فوٹو پر پڑیں۔ تو میں نے پوچھ ہی لیا بہن جی یہ فوٹو کس کا ہے۔ یہ میرے بیٹے کی تصویر ہے۔ میرے دو لڑکے تھے اور میرے شوہر نے میری نس بندی کرا دی۔ ایک سال بعد میرا چھوٹا بیٹا چل بسا۔ اور اس کے ایک ماہ بعد ہی میرا شوہر بھی بھگوان کو پیارا ہو گیا۔ اب میری زندگی کا سہارا یہی میرا بیٹا ہے۔ یہ دہلی میں انکم ٹیکس کمشنر ہے اس کوٹھی پر ساڑھے گیارہ لاکھ روپیہ لگا ہے ایک ماہ ہی ہوا کہ میں اس کوٹھی میں آئی ہوں۔ پہلے آپ کہاں رہتی تھیں۔ غازی آباد میں ایک کرائے کے مکان میں۔ میں نے حیرت سے پوچھا آپ ودھوا ہیں اور پھر بھی اس قدر ماڈرن فیشن کے لباس اور بناؤ سنگار سے آپ کو لگاؤ ہے۔

اس لئے کہ کوئی میری پیٹھ ہلکی نہ سمجھ لے۔ دھرمیش جس عورت اور زمین کا کوئی مالک نہیں ہوتا اس کا زمانہ دشمن ہو جاتا ہے ہر ایک اسے ہڑپ کرنا چاہتا ہے" اتنی بڑی کوٹھی میں آپ اکیلی رہتی ہیں۔ کیا آپ کو ڈر نہیں لگتا۔ جبکہ زمانہ اتنا خراب ہے۔ میں زمانے کو خوب جانتی پہچانتی ہوں دھرمیش۔ میں نے اسے بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ اور یہ بھی ہے عورت کا کوئی دشمن نہیں ہوتا وہ اپنے دشمن آپ پیدا کرتی ہے۔ اس لئے میں دنیا میں جینا جانتی ہوں۔

کیا ڈی۔ ایم صاحب آپ کے رشتہ دار ہیں۔؟

جی نہیں۔ وہ میرے دوست ہیں۔ میں رشتہ داری میں یقین نہیں رکھتی رشتہ داروں کے مقابلے میں دوست مشکل وقت میں زیادہ ساتھ دیتے ہیں۔ اور وہ رشتہ داروں کی طرح لالچی بھی نہیں ہوتے۔

اگر آپ برا نہ مانیں تو میں یہ کہوں گا کہ ڈی۔ ایم صاحب سے دوستی والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔

مترا جی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ تمھارے سوچنے کے بھی ڈھنگ نرالے ہی ہیں۔ اگر میں بھی تمھاری طرح لکیر کی فقیر بنی رہتی تو آج کسی کے ہاں برتن صاف کر رہی ہوتی یا رسوئی کے دھوئیں میں گھٹ رہی ہوتی۔

مترا جی کچھ دیر تک قطعاً خاموش رہیں اور پھر دھیرے سے کہنے

لگیں۔ میں جانتی ہوں کہ تم میری زندگی کے نشیب و فراز جاننے کے لئے بے قرار ہو۔ دھوبش یاد رکھو کہ دنیا میں جو جتنا بڑا ہے اس میں اتنی ہی کمیاں ہیں۔ اور ان بڑے لوگوں کی کمیوں سے فائدہ اٹھانا دانائی ہے۔ مترا جی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے غمگین لہجہ میں بتانا شروع کیا کہ میرے شوہر امر ناتھ دھان کرشنا شوگر ملز میں سٹور کیپر تھے۔ ایک دن اسٹور میں سے کوئی چیز نکالتے وقت ایک کوئنٹل وزنی شکّر کی گانٹھ ان پر گر پڑی اور وہ ان کی گردن پر اس انداز سے گری کہ آناً فاناً ان کی موت ہو گئی۔ سیٹھ کے چمچوں نے ان کی لاش کو علاج کے بہانے ہسپتال بھجوا دیا تاکہ یہ ظاہر کیا جا سکے کہ ان کی موت ڈیوٹی پر نہیں بلکہ مل کے باہر واقع ہوئی۔ تاکہ سیٹھ جی کو میرے شوہر کی موت کا معاوضہ یا دہ نہ دینا پڑے۔ اس وقت میرا یہ بیٹا جگدیپ پانچ سال کا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد مل کا کوارٹر خالی کرنے کا نوٹس مل گیا۔ نہ تو میرا سسرال میں ہی کوئی اور سہارا تھا اور نہ ہی میرے مائکے میں کوئی ایسا تھا جو مجھے ایک وقت بھی پیٹ بھر کھانا کھلا سکے اور نہ ہی میں ایسا کوئی ہنر جانتی تھی کہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکوں۔ مکان خالی کرنے کا نوٹس پا کر میں نے رات بھر روتے ہوئے بھگوان سے پرارتھنا کی کہ میری مدد کرو۔ جگدیپ کے پتا کہا کرتے تھے کہ وہ اپنے بیٹے کو گزیٹیڈ آفیسر بنائیں گے۔ ان کا سپنا تو کیا پورا ہوتا یہاں تو سر چھپانے کے لئے چھت اور پیٹ بھرنے کے لئے دو روٹیوں کے بھی لالے پڑ گئے تھے۔

آخر کار صبح کو میں نے کافی سوچنے کے بعد گھر سے قدم باہر رکھا اور سیٹھ جی کی کوٹھی پہنچ گئی تاکہ ان سے اپنے لائق کوئی ملازمت کی درخواست کروں۔ پتہ چلا کہ وہ ایک شادی میں شرکت کے لئے سہارنپور گئے ہوئے ہیں شام کو آ جائیں گے۔ چنانچہ میں پھر شام کو کوٹھی پر گئی۔ گیٹ کیپر نے آن واحد میں سیٹھ جی کے سامنے پیش کر دیا۔ سیٹھ جی نے مجھے دیکھتے ہی مسکرا کر کہا۔ آؤ بیٹھو کیسے آنا ہوا۔ میں نے اپنی بپتا سنانے کے بعد ملازمت کی گزارش کی تو سیٹھ جی کہنے لگے۔ جو تین دن میں تمہارا کچھ نہ کچھ انتظام کر دیا جائے گا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا کل صبح ہی یونین والے مجھ سے کوارٹر خالی کرا لیں گے مجھ پر دیا کیجئے۔ کچھ خاموشی کے بعد سیٹھ جی ایسے بھولے پن سے جیسے کہ ناگ کسی پر وار کرنے سے پہلے بالکل معصوم دکھائی دیتا ہے بولے ادھر میرے قریب آ کر پلنگ پر بیٹھ کر میری بات سنو تاکہ تمہیں کوارٹر خالی نہ کرنا پڑے۔ دنیا میں خدا کی بنائی ہوئی جتنی بھی مخلوق ہے اس میں عورت کو ہی قدرت نے یہ فوقیت بخشی ہے کہ وہ مرد کی خباثت کو چشم زدن میں بھانپ جاتی ہے۔ سیٹھ جی کی بات میری سمجھ میں آ گئی تھی اور میں چپ چاپ سیٹھ جی کے پلنگ کی پائنتی پر جا کر بیٹھ گئی۔ کڑاکے کی سردی کے باوجود میں پسینے سے شرابور ہو رہی تھی۔ سیٹھ جی نے میرے کان میں بات کہنے کی بجائے میرا ہاتھ پکڑ کر لحاف کے اندر کر لیا اور کہنے لگے اس قدر سردی میں تم الگ بیٹھی ہو یہ اچھا نہیں لگتا۔ میں تو لحاف میں بھی کانپ رہا ہوں۔ کیا تمہیں سردی نہیں لگتی جو پائنتی پر اکڑوں بیٹھی ہو۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر میں نے کوئی مزاحمت کی یا شور مچایا تو سیٹھ جی کے چمچے مجھے اسی وقت ختم کر کے لاش کسی تہہ خانے میں دبا دیں گے چنانچہ میں نے اپنے آپ کو "سمرپت" کر دیا اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ سارے سماج میں ہر طرف اس قسم کے بھیڑیئے دندناتے پھر رہے ہیں میں کہیں بھی جاؤں میری جوانی اور خوبصورتی کا پیچھا یہ کتے ضرور کریں گے۔ لہٰذا لاتعداد شکاریوں کا شکار بننے سے بہتر ہے کہ ایک کی ہی ہو کر مشکل کے دن کاٹ لوں

چلتے وقت سیٹھ جی نے ایک سو روپیہ کا نوٹ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا پہلی بار آئی ہو خالی ہاتھ جانا ٹھیک نہیں یہ لیتی جاؤ اور کل صبح اپنے بچوں کو لے کر کوٹھی میں آ جانا۔ کل سے تم ہماری کوٹھی میں لیڈی ریسیپشنسٹ کی ڈیوٹی دو گی۔ کھانا اور دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملے گی۔ ہاں کرنے کے سوا اور میں کر بھی کیا سکتی تھی۔ لہٰذا میں نے سر جھکاتے ہوئے سیٹھ جی کی اس پیشکش کو منظور کر لیا شرم و حیا سے میری جھکی ہوئی گردن دیکھ کر سیٹھ جی بولے۔ اتنی شرماتی کیوں ہو یہاں تمہیں کون دیکھ رہا ہے

"بھگوان دیکھ رہا ہے سیٹھ جی"۔

پگلی کہیں کی بھگوان تو اندھا ہے۔ بہرا ہے اور بے زبان ہے۔ تم ان پران وتیانوسی باتوں میں کہاں الجھ گئی ہو تم اپنے سوچنے کا طریقہ بدل دو۔ میں اس خیال سے سہمت نہیں

ہوں سیٹھ جی" - اگر تم اس سے سہمت نہیں ہو تو پھر سیلاب، طوفان، بھونچال اور بیماریوں، آگ زنی اور فسادات میں لاکھوں بے گناہ - بے خطا اور معصوم کیوں مارے جاتے ہیں اگر بھگوان کچھ ہوتا تو ان بے گناہوں کو کیوں مرنے دیتا انہیں بچانے کی اس میں شکتی ہوتی تو صرف گنہگار ہی مرتے - لہٰذا بھگوان کے چکر میں مت پڑو - بلکہ جو تم چاہو گی وہی ہوگا۔ تم جو کرو گی وہی ہوگا۔ بھگوان کے سہارے بیٹھی رہیں تو پچھڑ جاؤ گی - زمانے کے ساتھ چلو اور ہوا کا رُخ پہچانو - یہی ترقی کا زینہ ہے سیٹھ جی کہتے رہے اور میں چپ چاپ سُن رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ آدمی کتنا چالاک ہوتا ہے اپنے پھندے میں پھنسانے کے لئے کیا کیا دلیلیں گھڑتا ہے - اور میں سیٹھ جی کی اس چالاکی پر مسکرا دی - مگر سیٹھ جی نے میرے مسکرانے کا مطلب اپنی جیت سمجھے - اپنے کوارٹر میں آنے کے بعد ساری رات میں نے گھائل سانپ کی طرح کروٹیں بدل کر کاٹی - دن ہوتے ہی میں نے گھر کا سامان باندھنا شروع کر دیا اور تھوڑی دیر بعد سیٹھ جی کا نوکر آیا جو مجھے معہ میرے سامان کے کوٹھی میں لے گیا - سیٹھ جی کی کوٹھی پر آئے دن بڑے بڑے سرکاری افسروں کی دعوتیں ہوتی رہتی تھیں اور سیٹھ جی کو جس افسر سے بھی کوئی کام نکالنا ہوتا تھا مجھے اس افسر کی اردلی میں رات بھر رہنا ہوتا تھا کچھ دنوں کے بعد میں نے سمجھا کہ میرا بیٹا میری ڈیوٹی میں خلل انداز ہوتا ہے چنانچہ میرے کہنے پر سیٹھ جی نے اسے بھی نینی تال اسکول میں حصول تعلیم کے لئے داخل کرا دیا جہاں کہ خود سیٹھ جی کا لڑکا زیر تعلیم تھا سیٹھ جی میرے اس اقدام پر بہت خوش ہوئے کیونکہ میں نے ان کے حکم بجا لانے کے لئے اپنے آپ کو اور بھی آزاد . . . . سیٹھ جی کی کوٹھی میں ہر قسم کا آرام اور اچھا کھانے پینے کی وجہ سے میری خوبصورتی میں اور بھی نکھار آ گیا - کچھ عرصہ . . . اعلیٰ سرکاری افسر سے کوئی کام نکالنے کی خاطر سیٹھ جی نے مجھے آلۂ کار بنایا تو وہ افسر میرے تیر نگاہ کا ایسا شکار ہوا کہ آئے دن وہ سیٹھ جی کی کوٹھی پر آنے لگا - مگر جلد ہی یہ افسر کسی دور دراز مقام پر تبدیل ہو کر چلا گیا۔ وقت گزرتا رہا اور میں سیٹھ جی کی کوٹھی پر ریسپشنسٹ کی خدمات انجام دیتی رہی - اب میرا بیٹا گریجویٹ ہو چکا تھا کہ اس اثنا میں وہی سرکاری افسر جو میرے تیر نگاہ سے گھائل ہو چکا تھا ڈی - ایم بن کر پھر اسی شہر میں آ گیا - اور سیٹھ جی نے نئے ڈی - ایم صاحب کو اپنی کوٹھی پر دعوت دی - ڈی - ایم صاحب نے مجھے دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا یہ پارٹی رات کے بارہ بجے تک چلی - پارٹی کے جملہ انتظامات کی دیکھ ریکھ میرے فرائض میں تھی - میں نے بارہا کنکھیوں سے دیکھا کہ ڈی - ایم صاحب مجھے کافی کے پیالے میں گھول کر پی جانا چاہتے ہیں - پارٹی ختم ہونے کے بعد جب سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تو مجھے حکم ہوا کہ میں ڈی - ایم صاحب کے ساتھ ان کے بنگلے پر جاؤں - چنانچہ میں نے اس حکم کی تعمیل کی - اور ڈی - ایم صاحب کی یہ خدمت مجھے بارہا کرنی پڑی - میں حیران رہ جاتی تھی کہ پارٹی روم میں سیٹھ جی کے آتے ہی تمام مہمان جن میں کلکٹر صاحب بھی شامل ہوتے تھے سیٹھ جی کے آتے ہی اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور یہ دیکھ کر میں بھگوان سے پرارتھنا کرتی تھی کہ میرے بیٹے کو بھی ایسا بنا دینا کہ اس کے سامنے بھی یہ سیٹھ کرسی چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہو -

میرا لڑکا بہت زیرک اور ذہین تھا لہٰذا اس نے محنت سے تعلیم حاصل کی اور ہر امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا - جب میرا لڑکا تعلیم سے فارغ ہو گیا تو کسی نوکر نے سیٹھ جی کے لڑکے کے کان بھر دیئے کہ تمہارے پتا کے جگر بیپ کی ماں سے ناجائز تعلقات تھیا اور یہی وجہ ہے کہ ایک نوکرانی کے لڑکے کو اپنے بیٹے کے برابر پڑھایا ہے - سیٹھ جی کے لڑکے کے دل کو یہ بات لگ گئی اور گھر میں ناخوشگوار کا ماحول پیدا ہو گیا - آخر کار مجھے کوٹھی چھوڑنا پڑی اور مجھے کرایہ کے مکان میں رہنا پڑا - میرا لڑکا اب قابل ہو چکا تھا - میں نے سیٹھ جی کی ملازمت سے کافی روپیہ جمع کر لیا تھا - جس سے گزر بسر میں کوئی دقت نہیں تھی - میں آدمی کی خصلت سے اچھی طرح واقف ہو چکی تھی - اور مردوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کے ڈھنگ مجھے آتے تھے چنانچہ میں نے ایک ایم - ایل - اے کو پھانسا - ایم - پی کے ذریعہ ایک خوش ذوق منسٹر تک رسائی پائی - اور ایسے زینوں سے

ہوتے ہوئے میں نے اپنے بیٹے کو اس بلندی پر پہنچا دیا کہ آجکل وہ انکم ٹیکس کمشنر ہے۔

پچھلے دنوں سیٹھ جی نے جب جگدیپ کو اپنی کوٹھی پر دعوت پر بلایا میں بھی جگدیپ کے ساتھ دعوت میں شریک ہوئی شاید سیٹھ جی جگدیپ کو پہچان نہ سکے ہوں۔ مگر میں نے دیکھا کہ سیٹھ جی نے جگدیپ کا ایک باعزت مہمان کی طرح کرسی سے اٹھ کر سواگت کیا اور سمان کیا۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے تمام پاپ دھل گئے ہیں۔ میں نے بھی سیٹھ جی کو نمستے کی اور جگدیپ کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ سیٹھ جی بھگوان نہ اندھا ہے نہ بہرا اور نہ ہی بے زبان لنگڑا لولا۔ سیٹھ جی یہ سنتے ہی خاموش ہو گئے اور میری طرف دیکھ کر مسکراتے رہے جیسے وہ اپنی ہار مان چکے تھے۔ ••

اردو کے مشہور افسانہ نگار رام لعل کے سفر یورپ کی دلچسپ داستان

خوابُ خوابُ سفر

رام لعل نے ۲۷ جولائی ۱۹۷۸ء سے یکم اکتوبر ۱۹۷۹ء تک ناروے لندن۔ ڈنمارک۔ اور سویڈن کا سفر کیا واپسی میں وہ چند گھنٹوں کے لیئے ماسکو میں بھی رکے۔ زیادہ تر ان کا قیام ناروے میں رہا کیونکہ دراصل یہ سفر انھوں نے اپنے عزیز... افسانہ نگار دوست جناب سرچرن چاولہ کی دعوت پر کیا تھا جس کا ذکر جگہ جگہ موجود ہے اس طرح ہمیں ایک اور افسانہ نگار کے بارے میں وافر معلومات بہم کی گئی ہیں لندن میں وہ صرف ایک ہفتہ رہے لندن کے حالات پر ایک طویل باب میں الگ سے اظہار خیال کیا گیا ہے رام لعل جیسے قدآور افسانہ نگار کا یہ سفرنامہ بہت ہی خوشنما اور مفید کارنامہ ہے جو ہمیں مختلف ملکوں کی رنگارنگ دلچسپیوں تہذیب و تمدن۔ رسم و رواج طرز معاشرت طریقِ زندگی اور زندگی کی گوناگونی اور ہمہ جہتی سے روشناس کراتا ہے چار صد صفحات پر پھیلی ہوئی یہ عظیم و ضخیم ادبی دستاویز ہر صاحب ذوق کو دعوتِ مطالعہ دیتی ہے کتابت طباعت عمدہ بڑا سائز ••

(قیمت پچاس روپئے) =/۵۰

طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ

عصر حاضر کے مزاح نگاروں میں خواجہ عبدالغفور کا نام ایک بلند امتیازی شان کا حامل ہے انھوں نے طنز و مزاح کو زندگی کی تنقید اور اصلاح دلوں کے لیئے برتا ہے ان کا طنز تو جدید پسند رقیق اور جاندار ہوتا ہی ہے تحقیق اور تنقید کے میدان میں بھی وہ کسی سے کم نہیں اس کا منہ بولتا ثبوت ان کی تازہ ترین تحقیقی کاوش ہے جسے انھوں نے "طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ" کے نام سے شائع کیا ہے جس کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ یہ اردو میں اپنے موضوع پر پہلی بھرپور جامع اور سیر حاصل تحقیقی کاوش ہے اور اس لئے بھی کہ یہ ریسرچ اسکالرز کے لئے ایک گائڈ بک کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے کہ اس میں انشائے لطیف بلکہ ہجو طنز اور دوسری زبانوں سے مزاح غرضیکہ طنز و مزاح کی جملہ انواع و اقسام اصناف و امثال حتیٰ کہ جزویات تک تبسم۔ ہنسی اور قہقہہ کے محرکات اور موجہات کا سیر حاصل جائزہ لیا گیا ہے۔

بڑا سائز ڈھائی صد صفحات عمدہ کتابت روشن طباعت مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔

قیمت پچاس روپئے۔ =/۵۰

پتہ

دفتر ماہنامہ شانِ ہند۔ فلیٹ نمبر ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۲

کسک

مسز شیلا اعجاز
(بلاسپور)

ابھی گھر پر آئے مجھے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ اچانک میرے دل میں خیال آیا کہ کچھ دیر کے لئے اپنے بیٹے نیصل سے جاکر باتیں کروں۔ ادھر کئی دنوں سے میں اس قدر مصروف تھی کہ کچھ دیر کے لئے اپنے بیٹے سے بات بھی نہیں کر سکی تھی۔ اس کے کالج جانے سے پہلے ہی میں نرسنگ ہوم چلی جاتی تھی۔ اور پھر کہیں شام ڈھلنے تک واپس ہوتی تھی۔ اس وقت اپنے دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے گیا ہوتا تھا۔ پھر میں بھی اتنی تھکی ہوتی تھی کہ کچھ دیر تک اس کا انتظار بھی نہیں کر پاتی تھی اور آتے ہی اپنے آپ کو بستر کے حوالے کر دیتی تھی۔ تھکان کی وجہ سے نیند بھی آکر مجھ کو جلدی گھیر لیتی تھی اور دوسرے دن پھر وہی اپنے کام پر جانا۔

آج جبکہ میں وقت پر گھر آگئی تھی اور نیصل بھی گھر ہی میں موجود تھا تو میں نے سوچا کیوں نہ کچھ دیر کے لئے اس کے پاس جاکر بیٹھوں اور اس سے کچھ باتیں کروں۔ بس اس خیال کے آتے ہی میں اٹھ کر نیصل کے کمرے کی طرف چلدی کمرے میں جاکر دیکھا تو نیصل بستر پر لیٹا گہری نیند سو رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے اس کو اٹھانا مناسب نہ سمجھا۔ مگر میرا دل بے قابو ہو رہا تھا کیونکہ نہ جانے کتنے دن گزر گئے تھے میں نے شفقت بھرا ہاتھ اس کے سر پر نہ رکھا تھا۔ میں دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس کے بیڈ تک پہنچ گئی اور پھر اپنا پیار بھرا ہاتھ اس کے سر پر پھیرنے لگی۔ وہ اسی طرح گہری نیند میں سوتا رہا اُف کتنا بڑا ہو گیا ہے یہ کل کا ننھا منا بچہ۔ اس وقت پورے بیس سال کا ہے۔ میں اس کو پیار بھری نظروں سے نہارتی رہی۔ میرا ہاتھ برابر اس کے بالوں میں گھوم رہا تھا اور وہ مزے سے سو رہا تھا شاید نیند بہت گہری تھی جو اس کو میرے پاس ہونے تک کا احساس بھی نہ ہو سکا۔ میں گھنٹوں اس کے پاس بیٹھی رہی اس کے بھولے بھالے چہرے کو نہارتی رہی۔ اس کی صورت دیکھ کر ایک ایک کرکے ماضی کی ساری یادیں میری آنکھوں کے سامنے یوں آکر ناچنے لگیں گویا یہ ساری باتیں کل کی ہوں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی تھی اس وقت میری عمر ۲۴ سال کی تھی۔ میرے ڈاکٹر بننے کے بعد ایک ایک کرکے نہ جانے کتنے رشتے آگئے۔ میرے والدین جلد ہی میری شادی کر دینا چاہتے تھے اور پھر ایک دن ایک ڈاکٹر کے ساتھ میرا رشتہ پکا کر ہی دیا۔ میرے ڈیڈی کی شدید خواہش تھی کہ ان کا داماد بھی ڈاکٹر ہی ہو اپنی خواہش پوری ہوتے دیکھ کر ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اور انھوں نے جلد ہی میری شادی کر دی۔ شریک حیات ڈاکٹر پاکر میری خوشی کا بھی کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ مگر شاید خدا کو میرے ہونٹوں پر تبسم کی لہر دیکھنا گوارہ نہیں تھی۔ ابھی میرے ہاتھوں پر لگی مہندی کا رنگ بھی ہلکا نہ ہو پایا تھا یعنی میری شادی کو صرف چار دن ہی ہوئے تھے کہ میرے شوہر کا ایک تیز رفتار ٹرک سے ایکسیڈینٹ ہو گیا اور بری طرح زخمی ہو گئے تھے فوراً ہی ان کو ہسپتال پہنچایا گیا مگر جو خدا کی مرضی تھی وہی ہوا اسپتال پہونچنے سے پہلے ہی راستے میں انھوں نے دم توڑ دیا۔ میری تو دنیا ہی لٹ گئی تھی میں اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھی تھی۔

میرے والدین میرے غم میں جیسے پاگل ہو گئے تھے میں ان کی اکلوتی بیٹی تھی وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئے۔ یہاں آکر انھوں نے میرا علاج کروانا شروع کر دیا۔ کافی دن تک میرا علاج چلتا رہا۔ مگر پھر بھی میں پہلے جیسی صحت مند نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر نے رائے دی کہ اگر میری دوسری شادی کر دی جائے تو میں ایک دم ٹھیک

ہو جاؤں گی۔ میرے والدین کو بھی یہ بات پہنچ گئی۔ وہ مجھ سے دوسری شادی کے لئے ضد کرنے لگے۔ مگر میں کہیں سے کہیں تک بھی راضی نہ ہوئی۔ مجھے پکا یقین ہو گیا کہ میرے نصیب میں شوہر کی محبت نہیں ہے۔ میرے والدین مجھ سے بار بار اصرار کرتے کرتے ہار چکے تھے اور میں دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اتنی لمبی عمر تنہا گزارنا بھی میرے لئے مشکل تھا۔ اس لئے میں نے اپنے ہی شہر میں ایک چھوٹا سا نرسنگ ہوم کھول لیا اور ساتھ ہی اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ میں اپنی تمام عمر غریبوں کی خدمت میں گزار دوں گی اور میں نے کیا بھی وہی۔ میں اپنے نرسنگ ہوم میں ایک ڈاکٹر کا فرض پوری طرح نبھاتی رہی۔ میں اپنے ہر مریض سے ہنس کر بات کرتی تھی۔ میرے اس ہنسی کے پردہ کے پیچھے کتنے غم پوشیدہ تھے۔ اس کا اندازہ میرے والدین کے علاوہ کسی کو نہ تھا۔ ہوتا بھی کیسے بس وہی دو شخص ایسے تھے جو مجھکو اس قدر غمگین دیکھتے تھے۔ کہ یہ سب دیکھنا ان کی برداشت کے باہر تھا۔ وہ اپنی جوان بیٹی کی یہ حالت زیادہ دنوں تک نہیں دیکھ سکے اور ایک ایک کرکے اس دنیا سے کوچ کر گئے اور میں بدنصیب پھر سے تنہا ہو گئی۔ بالکل تنہا۔

پھر بھی میں نے ہمت نہیں ہاری۔ میں اپنا کام اور بھی لگن سے کرنے لگی۔ اور پھر ایک دن ایک بے حد غریب عورت روتی پیٹتی میرے نرسنگ ہوم میں آئی آتے ہی اس نے میرے پیر پکڑ لئے اور بلک بلک کر رونے لگی۔ اس کو دیکھ کر ہی میں سمجھ گئی تھی کہ وہ ماں بننے والی ہے میں نے اس کو اوپر اٹھایا اور رونے کی وجہ پوچھی۔ وہ کچھ بتانے کے بجائے اور بھی زیادہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں نے اس کو بہت تسلی دی اور سب کچھ صاف صاف بتانے کو کہا۔ کافی اصرار کرنے کے بعد اس نے بتایا کہ کل ایک ایکسیڈینٹ میں اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ ایکسیڈینٹ کا نام سنتے ہی میں کانپ گئی۔ مجھ کو فوراً اپنے مرحوم شوہر کی یاد آ گئی۔

آج اس کے سسرال والوں نے اس کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا ہے جبکہ وہ ماں بننے والی ہے ایسے میں وہ کہاں جائے۔ جبکہ اس دنیا میں اس کا کوئی بھی نہیں ہے۔ میری فراخ دلی اور میری غریبوں کے لئے ہمدردی کے بارے میں اس نے پہلے ہی سن رکھا تھا اس لئے وہ بیچاری سیدھی میرے پاس چلی آئی مجھ کو اس کی حالت پر بے حد ترس آیا۔ میں نے اس کے ساتھ پوری ہمدردی ظاہر کی اور فوراً ہی اس کو اپنے یہاں بھرتی کر لیا وہ ابھی بھی رو رہی تھی بار بار یہ کہہ رہی تھی کہ مجھے کچھ ہو گیا تو پھر میرے بچے کا کیا ہوگا میں نے اسے بہت سمجھایا کہ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ تم بالکل ٹھیک ہوگی۔ مگر شاید اس کو میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا وہ برابر سسکے جا رہی تھی۔ اور پھر اس نے اسی رات ایک چاند سے بیٹے کو جنم دیا مگر ہوا وہی جس کا ڈر تھا۔ لاکھ کوششیں کرنے پر بھی میں اس کو بچا نہ سکی۔ جبکہ بچہ پوری طرح ٹھیک تھا وہ اپنے بچہ کی صورت دیکھے بنا ہی اس دنیا سے چل بسی۔ مجھے اس کی موت سے بے حد صدمہ ہوا میں نے اس کے بچے کو پالنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اس بچہ کو گھر لے آئی۔ جو میری اندھیری زندگی میں روشنی کی ایک کرن بن کر آیا تھا۔ اس کی پرورش کے لئے میں نے ایک آیا رکھ لی۔

میں اس بچہ کو بہت زیادہ پیار کرنے لگی اس کو گود میں لیکر میرے اندر کی ممتا جاگ اٹھتی۔ مجھے محسوس ہوتا جیسے وہ میرا ہی بچہ ہے اور میں ہی اس کی سگی ماں ہوں۔ میں نے اس کا نام فیصل رکھا۔ وہی فیصل جو اس وقت میری گود میں سر رکھے بے خبر سو رہا ہے بیس سال اسی طرح پر لگا کر اڑ گئے کہ کچھ پتہ ہی نہ چلا میں نے اسے اب تک اس حقیقت سے آگاہ نہیں کیا تھا وہ بھی مجھے ہی اپنی ماں سمجھتا ہے۔ میں اسے حقیقت سے دور ہی رکھنا چاہتی ہوں تاکہ وہ احساس کمتری کا شکار نہ ہو۔

ماضی سمندر میں ڈوبے مجھے نہ جانے کتنی دیر ہو جاتی ہے وقت کا پتہ ہی نہیں چلتا اور پھر جب میں خیالات کی دنیا سے باہر آتی ہوں تو میری آنکھیں چھت کو گھور رہی ہوتی ہیں۔ میرا بیٹا فیصل مجھے جھنجھوڑ کر کہہ رہا ہوتا ہے۔ ممی آپ کو کیا ہو گیا۔ آپ بولتی کیوں نہیں۔" ●●

نائیلہ اعجاز - محلہ ٹھاکران
متصل بیج گودام۔ قصبہ بلاری۔ ڈاکخانہ بلاری
ضلع مرادآباد - (یو۔پی)

ریل کی چھت پر

سفر کرنا

غیر قانونی حرکت ہے

اور یہ انڈین ریلویز ایکٹ کے دفعہ [illegible](2) کے تحت
قابلِ سزا ہے جس میں تین ماہ کی قید اور جرمانہ شامل ہے۔

• اس غیر قانونی اور خطرناک حرکت سے گریز کریں

اس لیے کہ آپ:

* [illegible] سے گر سکتے ہیں
* [illegible] سے ٹکرا سکتے ہیں
* [illegible] میں آ سکتے ہیں

غزل

حضرت سلام ساگری

[illegible] اپنا غم نہیں ہے
[illegible]وں بھی کم نہیں ہے

میری بھی نگاہ کم نہیں ہے
پردے میں تمہارے دم نہیں ہے

[illegible] قفس میں اب گھٹے
[illegible] بہار کم نہیں ہے

[illegible]ب عشق کی زندگی سلامت
یہ غم ہے تو کوئی غم نہیں ہے

[illegible]یب میں ہے الجھن
[illegible] سے ہی غم نہیں ہے

تو دل سے تو پوچھ رازِ الفت
ماتھے پہ مرے رقم نہیں ہے

[illegible] ابھی تمہاری منزل
[illegible] میں مرا قدم نہیں ہے

کیا نام رکھوں اس آستاں کا
بتخانہ نہیں حرم نہیں ہے

[illegible] سے روشن
خوشی جو غم نہیں ہے

شبنم کے دھوئیں سے اٹھ رہی ہیں
پھولوں کی بھی آنچ کم نہیں ہے

[illegible] سلام عزم بندی
دنیا کا کرم کرم نہیں ہے

آرزو

جناب منوہر لال منوہر گوڑگانوی

آرزو یہ ہے یہ خواہش ہے دلِ دلگیر میں
مذہب و ملت کے سب جلوے ہوں اک تصویر میں
جب کے سب ہندو و مسلم سکھ عیسائی ایک ہوں
رنجشیں مٹ جائیں دل سے سارے بھائی ایک ہوں
پھر مٹائیں اس جہاں سے بغض و نفرت کا وجود
اور محبت ہو محبت میں صداقت کا وجود
ختم جب ہو جائیگا چھوٹے بڑے کا امتیاز
ایک ہی حلقے میں جب بیٹھیں گے محمود و ایاز
دین و مذہب میں نہ ریگی جب سیاست کچھ دخل
ظاہر و باطن سے ہوگا ایک ہی قول و عمل
مرہم زخم جگر جب خود بنے گا چارہ گر
در پہ بیمار کے جب مر مٹے گا چارہ گر
ہر مسافر جان لے گا جب کہ منزل کا نشاں
فرض کو سمجھے گا اپنے جب امیر کارواں
بھول جائیں اہلِ غم جب رنج و غم کی داستاں
مائل فریاد ہوگی جب نہ کوئی بھی زباں
امن کا دشمن نہ ہوگا کوئی بھی جب دیس میں غیر
آدمی آ جائیگا جب آدمی کے جس میں پھر
پھر تو یہ ہندوستاں جنت نشاں ہو جائے گا
چپہ چپہ اس زمیں کا گلستاں ہو جائے گا

غزل

ساحر سیالکوٹی

پھر آپ جو دے رہے ہیں فریبِ وفا مجھے
حیران ہوں کہ آپ سمجھتے ہیں کیا مجھے

اے حسن یہ گلا تو ہے بالکل بجا مجھے
دل کی خطا تھی اور ملی ہے سزا مجھے

بربادیِ سکوں کا نہیں کچھ گلا مجھے
ہوتا ہے یوں بھی عشق میں یہ علم تھا مجھے

دیر و حرم سے کچھ بھی نہ تھا واسطا مجھے
سن کر تمہارا نام ٹھہرنا پڑا مجھے

کافر بتوں نے مائلِ ایماں کیا مجھے
آتا ہے بات بات پہ یاد اب خدا مجھے

دیکھا تھا ایک دن کہیں تجھ سا ملا مجھے
وہ بے وفا بھی کہتا ہے اب بے وفا مجھے

ناکامیوں کی وجہ کوئی اور ڈھونڈ لوں
یہ کیا کہوں کہ آپ نے دھوکا دیا مجھے

کس ڈھب سے کہہ گیا کوئی افسانۂ حیات
معلوم ہو رہا ہے حقیقت نما مجھے

یہ برہمی بجا نہیں دل کے سوال پر
دل کی اگر خبر ہے تو یا مجھ کو یا مجھے

دنیا میں تو یہ شکوۂ دنیا ہے بے محل
محشر میں کچھ کہوں گا جو کہنا پڑا مجھے

بازارِ شوق میں کھلتا نہیں یہ راز
دھوکہ دیا کسی نے کہ دھوکا ہوا مجھے

وہ سامنے ہیں اور نظر ہے حجاب
اے آرزوئے دید یہ کیا ہو گیا مجھے

ساحر نگاہِ خلق میں ہوں رند بادہ نوش
ہر چند جانتا ہے خدا پارسا مجھے

چھبیس جنوری

توصیف علوی ماحتی کیرانوی

اک [illegible] کی تصویر ہے چھبیس جنوری
اک جذبۂ تعمیر ہے چھبیس جنوری

پیغامِ حریت ہے یہ [illegible] کے واسطے
اک نغمۂ دلگیر ہے چھبیس جنوری

[illegible] کا جس نے مٹائی ہیں ظلمتیں
وہ صبح کی تنویر ہے چھبیس جنوری

صدیوں رہا تھا جن کو کہ اپنے وطن سے [illegible]
اُن خوابوں کی تعبیر ہے چھبیس جنوری

جمہوریت کی شان، مساوات کے نقوش
آزادی کی تفسیر ہے چھبیس جنوری

روشن ہوئی ہے جس سے نئی منزلِ حیات
اس راہ کی تعمیر ہے چھبیس جنوری

[illegible] کے اسیر سبھی عاملانِ شوق
وہ زلفِ گرہ گیر ہے چھبیس جنوری

[illegible] کے اخلاق کو دی جس نے عظمتیں
اس بات کی تحریر ہے چھبیس جنوری

[illegible] ہے جس میں ہر اک رنگ [illegible]
وہ ذوق کی تصویر ہے چھبیس جنوری

[illegible] جس سے [illegible] منزلیاں شوق کا
اُس جذبہ کی تاثیر ہے چھبیس جنوری

[illegible] کا جس کو کہیں ایک آئینہ
وہ اک نئی تصویر ہے چھبیس جنوری

[illegible] کے جس پہ اٹھتے رہیں گے [illegible]
وہ نقشۂ تعمیر ہے چھبیس جنوری

[illegible] ہے کہ زندگی کو ملا ہے نیا شعور
وہ فکر کی تنویر ہے چھبیس جنوری

[illegible] کے جن سے کہ پرچم ہوئے بلند
اُن قدروں کی توقیر ہے چھبیس جنوری

جس نے غزل سنوار دی ماحتی حیات کی
وہ مطلعِ تنویر ہے چھبیس جنوری

میرا پنجاب

کندن لال گردھر بیری والا [illegible]

[illegible] کی انصاف کی ہر التجا خاموش ہے
تیشہ زن اس کوہستاں میں آج بھی ہے کوہکن

[illegible] انسانیت کی [illegible] ہے
ہے مگر یہ تیشہ جوئے خوں بہانے کے لیے

[illegible] تو قابیل کا
ہاتھ میں سقراط کے گو آج بھی ہے جامِ سم

[illegible] آدم [illegible]
ہے یہ جام خاص انسانوں کو پلانے کے لیے

غزلیں

[illegible]

[illegible] دل بیمار ہے آج
[illegible] میں مرا خیال آیا ہے
اب [illegible] مرا مجرم اسرار ہے آج
آدمی ہی نے بنائے ہیں ہزاروں سے جلتے
اور پھر خود ہی وہ حلقوں میں گرفتار ہے آج
منزلیں گرچہ بہت [illegible] بھی جاتی ہیں
تیرگی کو ہر اک شخص کی رفتار ہے آج
کوئی دنیا کی جھلک تک نہیں جانے والا
نتھی [illegible] میں غرق ہونے کا اصرار ہے آج
دشت و صحرا کو کیا ترک مگر وائے نصیب
سیر گلشن میں بھی پیدا خلش یار ہے آج
مونس و ہمدم و احباب سبھی روٹھ گئے
ان کا جلتا ہوا اک غم ہی تو غمخوار ہے آج
آشنا من سبھی سو گئے گہری نیند میں
جس طرف دیکھئے اک فتنہ بیدار ہے آج
یا الٰہی [illegible] اس درجہ گنہگار بھی ہے!
جس طرح ساقی مایوس گنہگار ہے آج

● ڈاکٹر [illegible] کے اشتی گورو کشیتر یونیورسٹی

ہے کس قدر تابناک شگفتہ کھلا ہوا سا گلاب چہرہ
وہ آپ اپنی مثال آنکھیں، وہ آپ اپنا جواب چہرہ
ہزار پونم کے چاند دیکھے مگر سب اس وقت ماند دیکھے
کہ جب بھی بے تکلفی میں وہ ہو گیا بے نقاب چہرہ
تمام عالم کے حسن والے سبھی صدیوں میں ڈھل گئے
یہ چاند تارے حسین پیشانی چھپائے ہے کتنا شاداب چہرہ
اسے نہ ہرگز میں بھول پاؤں خیال میں اس کے کھو جاؤں
[illegible] حسن [illegible] کتاب چہرہ
[illegible] رشتہ [illegible] ہے وہ خزانہ
[illegible] شاعری کی کتاب چہرہ
[illegible] حسین [illegible]
[illegible] کر کے بتا دو اک لاجواب چہرہ

خضر برنی

چلتا ہوا کوئی پیمانہ ہے
رند ہیں، ساقی ہے، میخانہ ہے
تیری مرضی کی بات [illegible]
زد میں تیرے جو آشیانہ ہے
آپ [illegible] سمجھیں جیسے ہو
دوستو کیا یہ [illegible] افسانہ ہے
ہر کوئی تجھ پہ ہوتا ہے قرباں
سارا عالم ترا دیوانہ ہے
تو ہے سالک کا جانشیں خضر
سارا انداز شاعرانہ ہے

جشنِ سالِ نو

بیدلؔ سرحدی بی۔ اے، بی۔ ایڈ

وہ شور رستخیز، حشر ہا و ہو، خموش ہے
کہ میکدے میں پچھلی شب سبو سبو خموش ہے
تہی سبو، شکستہ جام، مضمحل صراحیاں
تھکی تھکی سی خوابناک اجنبی جماہیاں
حیات کچھ نہیں ہے اور مست و بیخودی نہیں
یہ خوب زندگی ہے زیست کا وجود کچھ نہیں
وہ پو پھٹی اجالے ناچنے لگے فضاؤں میں
ہیں تتلیاں سی نور یوں کی صبح کی ہواؤں میں
گلوں کے بے حجاب قہقہے فضا میں گھل گئے
کلی کلی کی قربِ گل سے سانس تیز ہو گئی
لٹا گیا شگفتگی بہار جھومتا ہوا
جبین شاخ خشک کے سجدہ ریز ہو گئی
رباب لاؤ آج ہم نیا ترانہ گائیں گے
کہ آج جشن سال نو بہ صد جلال ہے

غزلیات

گوپال کرشن شفقؔ

بے وفاؤں سے وفا کرتے رہے
ہم وفا کا حق ادا کرتے رہے
اُن کے در پہ لب کبھی کھلتے نہیں
ہم بیاباں میں صدا کرتے رہے
دوستوں کی سازشیں ہوتی رہیں
دشمنوں کا ہم گلا کرتے رہے
اور بھی گہرے ہوئے زخم جگر
چارہ گر کیسی دوا کرتے رہے
غم میں تیرے ہم جلے مثل چراغ
بزم الفت میں ضیا کرتے رہے
تجھ کو بخشندہ سمجھ کر اے کریم
ہم خطاؤں پہ خطا کرتے رہے
اے شفقؔ اُن پہ کھلا راز حیات
جو غموں کا سامنا کرتے رہے

عرفانؔ پربھنوی

جب تصور میں کوئی چاند سا پیکر مہکے
ہوں سوا نیم بھی زر پھول تو بستر مہکے
ایک قطرہ بھی اگر اُس کے پسینے کا گرے
مشک ہر موج میں گھل جائے سمندر مہکے
جس نگر سے بھی گذر جائے کوئی رشک بہار
پھول رستوں پہ کھلیں اور ہر اک گھر مہکے
کیا حقیقت ہے گلابوں کی یہ دعویٰ ہے مرا
اُس کے ہاتھوں میں اگر آئے تو پتھر مہکے
وہ جسے پیار سے عرفانؔ چھولے خود ہی
جسم تیرے مس سے پھر کیوں نہ زیادہ مہکے

مرتضیٰ صہبائی

زندگی تو نے دکھائے ہیں یہ منظر کیا کیا
ہم پہ اپنوں ہی نے برسائے ہیں پتھر کیا کیا
غمِ دوراں سے فراغت ہی نہیں تھی ہم کو
ورنہ چھلکے ہیں تری یاد کے ساغر کیا کیا
ایسے لگتا ہے کہ برسوں کی شناسائی ہے
حادثے دیکھتے ہیں ہم کو پلٹ کر کیا کیا
اُن کے جلووں میں ہیں مصروف نگاہیں لیکن
دل نے کھولے ہیں شکایات کے دفتر کیا کیا
اب نگاہوں میں ہے ہر رات انھیں کا پیکر
اور بھی پھیل گئے ہیں وہ سمٹ کر کیا کیا
شوق پابند رہا اس کے اشارے کا مگر
دل کو گھیرے رہے خدشات کے لشکر کیا کیا
عرش کا چہرہ ہے تو بنتا ہے ستوں کا ملبہ
اور محشر ہیں بپا جسم کے اندر کیا کیا

قمر ایلولوی۔ بی۔ اے

برق و باراں سے متعلق اُسے فرصت تھا کو
دشت صحرا میں کہیں خشک شجر تھا کو
خضر منزل اگر وہ آشنائے نظر تھا کو
ایک تارا سا سر راہ گزر تھا کو
کس کی ناموس کی بطلی گردش دوراں دشمن
کیا مرے شہر میں خوشحال بشر تھا کو
آج یہ حق ہے تمہیں میری سنو یا نہ سنو
کل نہ کہنا کہ یہاں اہل نظر تھا کو
شعلۂ اشک سے تجلی اُٹھے مناظر کتنے
میری آنکھوں میں نہاں غم کا شرر تھا کو
کہیں کھنڈر کہیں مرگھٹ نظر آتے ہیں جہاں
کہتے ہیں کل وہاں آباد نگر تھا کو
چار جانب اور قمر آپ کی شہرت ہیں۔
اعلیٰ تخلیق کا شاید یہ اثر تھا کو

روسی سفارت خانے کے سامنے

انجمن افغان دوستان کا مظاہرہ

نئی دہلی ۲۷/دسمبر ۱۹۸۳ء کو انجمن افغان دوستان کی جانب سے افغانستان میں روسی فوجوں کے داخلے کی مخالفت میں اظہار ناراضی و تشویش ظاہر کرنے کے لیے ایک عظیم اور پُر اثر مظاہرہ کیا گیا جس میں انجمن افغان دوستان کے بائیس صد باقاعدہ ممبران کے علاوہ انجمن افغان دوستان کے ہمدردوں، بہی خواہوں اور افغانستان کی آزادی چاہنے والوں نیز روس کی افغانستان میں بے جا مداخلت کو ناپسند فرمانے والے ہزاروں افراد نے شمولیت کی نو صد کے قریب سکولی [illegible] نے حصہ لیا۔ اس کے علاوہ افغانی نسل کے ساڑھے تین ہزار افراد بھی انجمن افغان دوستان کے [illegible] کی قیادت میں شریک مظاہرہ ہوئے۔ ہندوستان میں مقیم افغانوں کے لیڈر جناب داک مان صاحب نے اپنے افغانی بھائیوں کی پیش قدمی کی۔

انجمن افغان دوستان کے سرکردہ رہنماؤں آچاریہ دھرمیندر ناتھ اور جناب عارف بیگ صاحب ([illegible] سیکریٹریان انجمن افغان دوستان) نے مظاہرین سے خطاب کیا۔

مظاہرین کو روسی سفارت خانے کے باہر تک پہنچانے کے لیے انجمن افغان دوستان نے اٹھتیس بسوں کا انتظام کیا ہے اور ہر بس میں سوار مظاہرین کی قیادت ایک سرکردہ ممبر کر رہا تھا۔ بسوں میں اپنے اپنے گروپ کی قیادت کرنے والوں میں جناب چمن لال۔ جناب نانک رام۔ جناب بھگوان داس۔ جناب کنہیا لال۔ جناب انور شاہ۔ جناب ظہور خان۔ جناب باب الدین خان۔ محترمہ مسز کرپلانی۔ محترمہ سوشیلا دیوی۔ جناب امرناتھ بھگت۔ جناب گوپال ورما

... ہندوستان میں مقیم احباب نے ... گرامی ... نظر کیا۔ ... مظاہرین کی
قیادت ... فرمارہے تھے۔ یہ مظاہرہ روسی سفارت خانہ ... کے گیارہ بجے ...
... ایک بجے تک جاری رہا اور مظاہرین نے نہایت پُرامن طور پر شائستگی کا مظاہرہ کیا۔
... اپنا ... اور دیگر مظاہرین نے مختلف شائستہ اور پُراثر نعروں سے اپنا مافی الضمیر بیان کیا۔
جب ... مظاہرین کا جلوس گزر رہا تھا تو ساڑھے تین ہزار افغانی الاصل خواتین و حضرات نے
اس جلوس میں شریک ہو کر مظاہرے کو اور بھی تقویت بخشی۔

دیگر مقررین کے علاوہ اچاریہ دھرمیندر ناتھ نے بھی فارسی زبان میں تقریر فرماکر افغان باشندوں کو مظاہرے کی غرض و غایت سے آگاہ کرتے ہوئے روسی سفارت خانے کے ذمہ دار افسران تک مظاہرین کی آواز پہنچائی۔
ٹائمز آف انڈیا، سٹیٹسمین، انڈین ایکسپریس۔ ہندوستان ٹائمز، نوبھارت ٹائمز، دینک ہندوستان، قومی آواز اور دیگر کئی نامور اخبارات نے انجمن افغان دوستان کے اس مظاہرہ کی بابت تعریفی نوٹ لکھے اور خبر کو نمایاں طور پر شائع کیا۔

ہندی دانشوروں میں اس امر کو محسوس کیا جارہا ہے کہ اچاریہ دھرمیندر ناتھ نے افغانستان میں روسی فوجوں کی مداخلت کے بارے میں جو تحریک انجمن افغان دوستان کے ذریعہ چلائی ہے اسے زیادہ سے زیادہ عوام کی ہمدردیاں حاصل ہیں کیونکہ ہندوستان بنیادی طور پر ہر ملک و قوم کی سالمیت اور اس کی آزادی کو برقرار رکھنا اپنا اولین اصول سمجھتا ہے۔

اچاریہ دھرمیندر ناتھ چونکہ فارسی زبان میں پوری پوری دسترس رکھتے ہیں اس لیے وہ افغان باشندوں کو اپنا مافی الضمیر بہتر انداز میں سمجھا سکتے ہیں۔ اچاریہ دھرمیندر ناتھ کے علاوہ جناب ... بیگ صاحب بھی اس مقدس کاز کے لیے اپنی تمام تر خدمات انجمن افغان دوستان کو دیے ہوئے ہیں۔ نیز اچاریہ دھرمیندر ناتھ صاحب کے جملہ احباب بھی خواہ اور نیاز مند ... کے ساتھ قدم ملاکر اس مقدس کام میں ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔

افغانستان میں روسی فوجوں کی موجودگی افغانوں کی آزادی کی توہین ہے

انجمن اردو کینیڈا کی دوسری اُردو کانفرنس
اور
عظیم الشان مشاعرہ

محمد مصطفیٰ اکبر قریشی

حسبِ معمول انجمن اردو کینیڈا نے اس سال بھی ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد کی جس میں شرکت کے لیے ہندوستان، پاکستان، انگلینڈ اور شمالی امریکہ سے اُردو کے ادیب و شعراء تشریف لائے۔ اس دفعہ انجمن نے خصوصی طور سے شمس الرحمٰن فاروقی کو جشنِ غالب کے لیے مدعو کیا تھا اور مجروح سلطانپوری کو مشاعرہ کیلئے۔ ان حضرات کے علاوہ احمد فراز، ساقی فاروقی کو انگلینڈ سے اور سلیم احمد کو پاکستان سے۔ افسوس کہ سلیم احمد کانفرنس شروع ہونے سے پہلے ہی انتقال فرما گئے۔ ہندوستان سے مشاعرہ میں شرکت کیلئے بشیر بدر اور رئیل انصاری مدعو کیے گئے۔ مشاعرے سے پہلے ایک کانفرنس کا بھی اہتمام کیا گیا تھا جس کا موضوع غالب تھا۔ جشنِ غالب میں شمالی امریکہ کی یونیورسٹیوں کے اساتذہ مدعو کیے گئے تھے جنہیں شکاگو سے چودھری محمد نعیم کولمبیا نیویارک سے مس پیری چیٹ، ریک یونیورسٹی سے ڈاکٹر براتن سلوہ وسکانسن سے ڈاکٹر محمد عمر میمن، مانٹریال سے ڈاکٹر فاروقی حسن اور مٹی گنا سے منیب الرحمٰن تشریف لائے۔ ان کے علاوہ ہندوستان سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی آمد کی بھی توقع تھی لیکن بوجوہ وہ نہ آسکے۔ ان مخصوص مہمانوں کے علاوہ اس جشن میں شرکت کیلئے اردگرد اور مضافاتی علاقوں سے بڑی تعداد میں اردو صاحب کے رسیا تشریف لائے۔

۲۲ اکتوبر کو جشنِ غالب کا افتتاح معظم جاہ بہادر نے فرمایا اور ایک نہایت پُر مغز تقریر فرمائی۔

صبح کے سیشن کی صدارت جناب محمد حفیظ [illegible] قریشی صاحب نے فرمائی جس میں پروفیسر چودھری نعیم نے غالب کی دلی پہ مضمون پڑھا۔ ان کے علاوہ پروفیسر پیری چیٹ نے ترجمہ کے مسائل پہ اور ڈاکٹر براتن سلوہ نے غالب پہ اپنے مضامین پڑھے۔ مضامین کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ ہوا جس میں مجروح سلطانپوری، احمد فراز اور محمد عمر میمن نے حصہ لیا۔

دوپہر کے سیشن کی صدارت جناب منیب الرحمٰن صاحب نے فرمائی جس میں ڈاکٹر بشیر بدر نے اپنا مضمون پڑھا۔ جس کے بعد تمام حاضرین جلسہ میں مجروح، ساقی [illegible]، احمد فاروقی حسن شہد برنی کے علاوہ شہر کے ممتاز ادیب و شعراء شریک تھے، غالب کے فن اور شخصیت پہ ایک مذاکرے میں حصہ لیا۔

شام میں یونیورسٹی کے کنووکیشن ہال میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ مشاعرہ کا بھی افتتاح معظم جاہ بہادر۔ نظام حیدرآباد نے فرمایا اور نہایت دلکش تقریر فرمائی۔ صدارت کیلئے مجروح سلطانپوری سے درخواست کی گئی۔ اس مشاعرہ میں بشیر بدر، احمد فراز، ساقی فاروقی کے علاوہ نیویارک سے شاہد خیف انگر، اور رفعت اشارت شریک ہوئے۔ چودھری نعیم اور حسن فاروقی نے بھی اپنا کلام سنایا۔ محفلِ مشاعرہ و سماعت کیلئے رنگ و نغمہ کا غیر معمولی اہتمام ہوا تھا۔ مشاعرہ کی کارروائی انشاء اللہ آئندہ ماہ دی جائے گی۔

نیا عزم

پنارا عبدالرب نشتر فتحپوری (دہلی)

حیران ہوں کہ رسم مروت کہاں گئی
پہلے جو ہم میں تھی وہ محبت کہاں گئی
وہ عزم اتحاد خدا جانے کیا ہوا
اللہ جانے یاروں کی ہمت کہاں گئی
ہیں رہبرانِ قوم لیڈروں کے بھیس میں
ہمدردیاں کھڑی ہیں فریبوں کے بھیس میں
لے کر امیری اور غریبی کے فرق کو
غیروں کی طرح آتے ہیں اپنوں کے بھیس میں
اتنی سی عرض ہے مری سب رہنماؤں سے
لینا ہے ہم کو درس بدلتی ہواؤں سے
جاری رکھیں گے ہم تو محبت کی جستجو
نشتر چبھونے والوں سے مرہم کی آرزو

غزل ۔۔ سوہن راہی (لندن)

اک ترا غم مرا شناسائی
اور سب کچھ یہاں تماشائی
آج اس طرح تیری یاد آئی
ٹوٹ کر رو رہی ہے تنہائی
لوگ جانے ہیں جس کو شوخ ہوا
وہ ترے پیار کی ہے پروائی
رنگ موسم کھلا تو زخم کھلے
موج دل پر ہے درد آرائی
لوگ کس طرح جھوٹ بولتے ہیں
دل میں جب چیخی ہو سچائی

ضرورت ہے

منشی پریم چند (مرحوم) کی حسب ذیل کتابوں کی ضرورت ہے اگر کوئی صاحب فروخت کرنا چاہیں تو کتاب کی حالت کے بارے میں اور جو قیمت وہ لینا چاہیں پتہ ذیل پر لکھیں ۔

(ناول) چوگانِ ہستی ۔ گوشۂ عافیت ۔ پردۂ مجاز

(افسانوی مجموعے) خاکِ پروانہ ۔ فردوس خیال ۔ پریم چالیسی حصہ اول و حصہ دوم

اس کے علاوہ زمانہ اور ادیب کے پرانے شمارے بھی مطلوب ہیں خاص کر وہ شمارے جن میں پریم چند سے متعلق کوئی بھی تحریر ہو یا ان کی کتابوں کے متعلق اشتہار وغیرہ ہوں

پتہ جی ۔ کے ۔ ایم معرفت ماہنامہ شان ہند فلیٹ ۳ انصاری مارکیٹ دریا گنج ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ ۔

خود نوشتہ انٹرویو

زیڈ۔ اے۔ ہلالؔ
ایڈووکیٹ (سناودہ)

محترم سرورؔ صاحب

تسلیم۔ آپ کے فرمان کے مطابق میں اپنی ادبی زندگی کا خاکہ پیش کر رہا ہوں۔ اور آپ کے سوالات کا جواب اپنے اس خود نوشتہ انٹرویو میں دے رہا ہوں

س ۱: اسم گرامی۔ وطن۔ شاعری کی ابتدا کب ہوئی اور کن کن اساتذہ سے آپ نے مشورۂ سخن کیا؟

ج :۔ سرور بھائی۔ میرا نام زبیر احمد ہے۔ اور ہلالؔ تخلص مدھیہ پردیس کے کھرگون ضلع میں واقع۔ قصبہ گلشن آباد جو آج کل سناودہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ میرا آبائی وطن ہے میری شاعری کی ابتدا تقسیم وطن سے پہلے ہو چکی تھی جبکہ میں آٹھویں کلاس کا طالب علم تھا ابتدا میں میں نے مرحوم نیاز محمد عاجزؔ سناودی اور اس کے بعد جب میں اندور میں زیر تعلیم تھا مرحوم و مغفور استاد حضرت ادیبؔ سہارنپوری سے وابستہ رہا مگر یہ سلسلہ بد قسمتی سے تقسیم وطن کے بعد حضرت ادیبؔ صاحب کے پاکستان چلے جانے سے ٹوٹ گیا۔

لیکن میں اب بھی مناسب مشورہ کو قبول کرنے کو تیار رہتا ہوں۔

س ۲: پہلی بار مشاعرہ میں کب شرکت کی؟

ج :۔ جہاں تک یاد ہے مورخہ ۲۰/ فروری ۱۹۴۴ء میں جب ایک مشاعرہ سناودہ کے گاندھی چوک میں جشنِ صحت یابی مہاراجہ یشونت راؤ ہولکر کے سلسلہ میں منعقد کیا گیا تھا۔ طرح مصرع تھا..... ع "مٹا جو تیرے لیے اس کی یادگار کہاں" اس طرح غزل کے کچھ اشعار حاضر ہیں ؎

مجھ ہم داغ سے اب سینہ لالہ زار کہاں ۔ خزاں کا ہو جیسے کھٹکا وہ بہار کہاں
جہاں فانی ہے۔ باقی نشاں مزار کہاں ۔ مٹا جو تیرے لیے اس کی یادگار کہاں
خضر کفن ہو سرکار کی کہا سب نے ۔ ہلالؔ اپنی دعاؤں کا اب شمار کہاں

اور اس کے بعد متعدد مشاعروں میں شرکت کی اور آج بھی وقت ملتا ہے۔ تو شرکت کرتا ہوں۔ مگر ان دنوں ؎

گردشِ وقت اور غمِ جاناں ۔ اپنے غم کے ہیں دو ہی افسانے
فصلِ گل میں یہ تشنہ کام بہار ۔ کیا کھلائیں گے گل خدا جانے

س ۳: کیا آجکل کے مشاعرے معیاری ادب کے ترجمان ہیں؟

ج :۔ میرے نزدیک آج کے مشاعرے ذریعۂ معاش کی ترجمانی کرتے ہیں۔ شاعر "ادب برائے معاش" میں یقین رکھتا ہے آج کے مشاعرے محفلِ تفریح ہو کر رہ گئے ہیں۔ کلام کی اہمیت ختم ہو گئی ہے اور آواز کا سحر اہم ہو گیا ہے۔ خوش گلو مترنم شاعر حاصلِ مشاعرہ رہتا ہے چاہے اس کے اشعار مہملات کا پلندہ ہی کیوں نہ ہوں اور سامعین کی اکثریت بھی مشاعرہ کو محفل قوالی سمجھتے ہیں۔

آج کے مشاعرے گروہ بندی کے عذاب میں مبتلا ہیں یعنی بزم مشاعرہ دورِ حاضر کی "متعصب بزم" ہے۔

س ۴: کسی ایسے یادگاری مشاعرے کا ذکر فرمایئے جس میں آپ نے شرکت کی ہو

ج :۔ جب میں نے اند۔ کرسچین کالج میں چار سال ہولکر کالج میں دو سال زیر تعلیم رہ کر آگرہ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا تو اس اثناء میں اندور میں جو مشاعرہ مہاتما گاندھی کی شہادت کے سلسلہ میں ہوا تھا۔ وہ مشاعرہ تعزیتی یادگار حیثیت کا مالک تھا جس میں اندور اور بھوپال کے مشہور شعرائے کرام نے شرکت فرمائی تھی۔

اس مشاعرہ میں ایک نظم "آہ باپو" کے عنوان سے میں نے بھی پیش کی تھی۔ کچھ اشعار سماعت فرمائیں

ے ہندوستان لیا یہ طوفان آگیا۔ ہر طرف رنج و الم کا ابر کیسا چھا گیا

ئینۂ احساس پر غم کا غبار۔ اہلِ ہندوستان کا دل ہو گیا ہے پاش پاش

سا ہے بیٹھ کے سر اپنا ہندوستاں۔ اٹھ گیا ہے کارواں سے آج میرِ کارواں

ت اظہارِ خیال اور محسوسات کو قلمبند کرنے کے لیے کیا آپ صنفِ غزل کو ہی کیوں منتخب کیا ہے؟

میرے نزدیک "اردو غزل" فضائے بسیط کی وسعت رکھتی ہے۔

"اردو غزل میں انسان کی ذہنی، جذباتی، سماجی، معاشی، سیاسی کیفیتوں کی تصویر کشی مختصر الفاظ میں پیش کرنے کی صلاحیت ہے۔ آج کی غزل دورِ حاضر کی ترجمانی کرتی ہے اور اپنے عہد کی نمائندگی کرتا ہے۔ اور اس کی تخلیقات ماضی، حال اور مستقبل کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ اس لیے میں نے غزل ہی فکر و فن کے اظہار کے لیے وسیلہ بنایا ہے۔ یوں نظم بھی کہتا ہوں۔ اور سلام بھی۔ صنفِ غزل میں کہاں تک کامیابی ہے ہو سکا ہوں اس کا فیصلہ قارئین شانِ ہند کریں گے لہٰذا مختلف احساسات کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے

غمِ زندگی

آیا الم ہے فسانۂ آدم — کریں ذکر کس سے غمِ زندگی کا

ہی علم و حکمت کا حامل ہے یارو — کہ محتاج ہے آدمی آدمی کا

کے مارے ہوئے انسان کے لیے ہم — درِ خوشحال کا پیغام لیے ہوئے ہیں

ضبطِ الم معراج ہی پستی سے گزرنے والوں کی

خون کی حدِ فاضل پہ ہر زخم زباں ہو جاتا ہے

جذبۂ قومیت و سیاست

لٹیں گر قافلے آکر سرِ منزل تعجب کیا

لباس رہبری پہنے ہوئے ہیں راہزن اب تک

اٹھتا ہے کس طرف سے دھواں دیکھتے چلیں

جلتا ہے آج کس کا مکاں دیکھتے چلیں

پابندیاں لگیں زبان و بیان پر

کھلتی ہے آج کس کی زبان دیکھتے چلیں

مشرق ہونے کو ہے سرمایہ داری کا نظام

اب ابھرنے کو ہے دنیا اک نئے انداز کی

اب فضا کے بیکراں تسخیر کر لو بلال

آزمائش ہو رہی ہے قوتِ پرواز کی

وطنیت

نویدِ صبحِ آزادی سنا دو — وطن جنت نشاں اپنا بنا دو

عروسِ وادیٔ گنگ و جمن ہے — سرودِ رنگ و کیف کے دھارے بہا دو

جبینِ روحِ گاندھی کی ضیا ہے — وطن کا ذرہ ذرہ جگمگا دو

اٹھے ہیں پھر یزیدی عصرِ حاضر

بلال اب امتحانِ کربلا دو

رنگِ تغزل

ازل سے ہے دلِ بسمل میں آرزو تیری

مرے وجود کا حاصل ہے جستجو تیری

اڑا کے تیرے ہی کوچہ کی خاک وحشی نے

کہانی کہہ دی زمانے کے روبرو تیری

دولتِ ضبطِ دل میں کر لوں جمع

ان کی نظرِ کرم سے ہے مدد سے

اک دورِ زیست ایسا بھی پروردگار ہو

میری نگاہِ شوق پیامِ بہار ہو

بدلو نگا ایسے ڈھنگ سے ماحولِ زندگی

انکی تجلیوں کو میرا انتظار ہو

اک دھوم ہے کہ وہ ہیں جواں دیکھتے چلیں

کتنی ہے دل میں تاب و تواں دیکھتے چلیں

ان کی جواں نگاہ سے ماحول گرم ہے

گرتی ہے کس پہ برقِ تپاں دیکھتے چلیں

تعجب رہن ہے شمعِ انجمن سرِ محفل

حریمِ ناز کے پردے اٹھا رہا ہے کون

منشی پریم چند کے افسانوں میں مسلم کردار

"شدھی"

از:۔ مانک ٹالا

ہندوؤں کے فرقہ پرست طبقے (جس میں آریہ سماجی پیش پیش تھے) نے جب مسلمانوں کی تبلیغ کا مقابلہ کرنے کے لیے شدھی کی تحریک کا آغاز کیا تو پریم چند نے آریہ سماجی ہونے کے باوجود اس تحریک کی سخت مخالفت کی تھی۔ "زمانہ" کے مئی ۱۹۲۳ء کے شمارے میں "راجپوت مسلمانوں کی شدھی" کے عنوان سے شدھی کے خلاف ایک انتہائی سخت مضمون لکھا۔ جس سے بلبلا کر سری رام شرما نے "زمانہ" کے جون ۱۹۲۳ء کے شمارے میں پریم چند کے اس مضمون کے خلاف لکھا۔ یہ دونوں مضامین فی الحال دستیاب نہیں ہیں۔ انھیں حاصل کرنے کی کوشش جاری ہے۔

اس سے پہلے دسمبر ۱۹۲۲ء کے "زمانہ" میں "موجودہ جد و جہد کے راستے میں رکاوٹیں" اور اس کے بعد فروری ۱۹۲۴ء کے "زمانہ" ہی میں "قحط الرجال" کے عنوان سے ایک طویل مضمون سپردِ قلم کیا۔ ان دونوں مضامین میں پریم چند نے ہندو فرقہ پرستوں کے خلاف انتہائی سخت ترین الفاظ میں لکھا۔ ان کے کچھ ضروری حصے "عظیم آباد ایکسپریس" اور "فروغِ اردو" میں پیش کر چکا ہوں۔

اسی پس منظر میں پریم چند نے اسی زمانے میں ایک کہانی شدھی کے نام سے لکھی تھی۔ جو "خواب و خیال" کی کہانیوں کے مجموعے میں شامل ہے۔ میرے پاس اس مجموعے کا دسواں ایڈیشن ہے۔

میرے خیال میں انھیں اس کہانی کے لکھنے کی تحریک اس لیے پیدا ہوئی ہوگی کہ شدھی کی گہما گہمی میں جب فرقہ پرست ہندو مسلمانوں کو شُدھ کرکے ہندو دھرم میں لا رہے تھے تو پریم چند کے ذہن میں ایک خیال ابھرا ہوگا کہ مسلمانوں کو تو شُدھ (یعنی پاک) کیا جا رہا ہے لیکن ہندو سماج کے اندر ایسے ایسے لوگ موجود ہیں جن کے ہاتھ کا پانی پینا بھی گوارہ نہیں کیا جا سکتا چنانچہ ان کے دل میں اس کہانی "شدھی" کا تانا بانا تیار ہو گیا۔ میرے اس خیال کو تقویت اس کہانی کے کلائمکس کی مندرجہ ذیل سطور سے ملتی ہے۔

"میں شدھی کا حامی نہیں ہوں گو متی ہندو سماج میں اب بھی ایسے بے شمار آدمی پڑے ہوئے ہیں جن کے ہاتھ کا پانی پینا مجھے گوارا نہ ہوگا۔ ہمارا سماج ایسے ہی آدمیوں سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن ان کے ساتھ ملنے کے لیے میں اپنی شدھی کرانی شرمناک سمجھتا ہوں۔ لیکن تمھاری خاطر مجھے یہ آزمائش بھی قبول ہے"

اس خیال کے گرد کہانی کا تانا بانا بُننے کے لیے پریم چند کو ایک ہندو نوجوان پریم ناتھ کو مسلمان (الفت حسین) بنانا پڑا۔ اگر وہ نوجوان حضرت محمدؐ کی فضیلت، اسلام کی تعلیمات یا اسلام کی کسی اور قابلِ تحسین بات سے متاثر ہو کر مسلمان بنتا تو اسے پھر سے "شدھ" کرنے کے لیے پریم چند کو ہندو اوتاروں اور ہندو رشی منیوں کی فضیلت اور ہندو دھرم کی عظمت پر ایک طویل لیکچر پلانا پڑتا۔ اگر پریم چند ایسا کرتے تو شبلی صاحب کو انھیں فرقہ پرست کہہ کر انھیں سنگسار کرنے کا اختیار تھا۔

لیکن پریم چند ایسا کرتے تو نہ صرف ان کا وہ مقصد ہی فوت ہو جاتا جس کے مدِ نظر انھوں نے یہ کہانی لکھی تھی بلکہ کہانی بھی پھسپھسی ہو جاتی۔

اسے کہتے ہیں افسانہ اور اس کے لوازمات سمجھنے کا شعور جس کا ذکر میں نے "دو اندھے اور ایک ہاتھی" میں کیا تھا۔ اور شبلی صاحب میری اس بات سے چڑ کر مجھے پیوندی افسانے لکھنے کا طعنہ دیتے ہیں۔ خدا جانے "پیوندی افسانے" سے شبلی صاحب

[illegible] شبلی [illegible] کا احتمال ہوتا میں سپونڈی تو کیا شبلی صاحب [illegible] پریم چند کی کے افسانے میں کیڑے نکالنے کے لیے حاضر ہوں ۔

خیر ـــــ پریم چند کو ایک ہندو کو مسلمان بنانے کیلیے ایک ایسے [illegible] کی ضرورت تھی جو کسی بھی طرح قابلِ تحسین اقدام نہ ہو ۔ اور یہ اقدام تھا پریم ناتھ کا ایک مسلمان طوائف حسنہ کے عشق میں گرفتار ہو کر اس کے ساتھ شادی کرنے کی غرض سے مسلمان ہو کر الفت حسین ہو جانا ۔

شبلی صاحب کے نزدیک شاید ایسا ہونا ممکن نہیں لیکن مجھے اس سے شادی کرنے کے لیے موسیٰ باؤ کو مسلمان بنتا پڑا تھا ۔ اور جہاں تک میری یاد داشت کام کرتی ہے موہن بابو کے تبدیلی مذہب اور جہاں بانو سے شادی کا کام عالمِ اسلام کی ایک مقتدر ہستی کے ہاتھوں سر انجام ہوا تھا ۔

طوائفوں میں گناہ کی زندگی گزارنے کے باعث احساسِ گناہ نہایت شدت سے ہوتا ہے ۔ اور اس کے ردِ عمل کے طور پر وہ مذہب کے بارے میں دوسروں سے زیادہ کٹر ہو جاتی ہیں ۔ شاید اس امید پر کہ آخرت میں اُن کے گناہ بخش دیئے جائیں گے !

طوائفوں میں یہ کٹرپن بلا تخصیص مذہب ہوتا ہے ۔ ایک ہندو طوائف زندگی بھر کسی مسلمان رئیس کی داشتہ بن کر رہ سکتی ہے ۔ اسی طرح ایک مسلمان طوائف کسی ہندو رئیس کا رکھیل بن کر رہ سکتی ہے لیکن جب شادی کا سوال آئے گا تو اس کی انتہائی خواہش ہوگی کہ اس کی شادی اس کے کسی ہم مذہب کے ساتھ ہو ۔ (مستثنیات ہر جگہ ہوتی ہیں)

چنانچہ اگر حسنہ طوائف سے شادی کرنے کی خاطر پریم ناتھ الفت حسین بن گیا تو اس میں نہ حیرانی کی کوئی بات ہے نہ ہی کوئی انہونی بات ۔

اس کہانی کی مختصر ترین تلخیص پیشِ خدمت ہے :-

ایک رئیس ہندو نوجوان پریم ناتھ ایک مسلمان طوائف حسنہ کے عشق میں گرفتار ہو کر اس سے شادی کرنے کے لیے مسلمان بن گیا ۔ طوائف نے اس کی ساری دولت نچوڑ کر اُسے بیماری کی حالت میں نکال دیا ۔ پریم ناتھ جو کہ اب الفت حسین بن گیا تھا ۔ ایک پرانی مسجد میں پناہ گزیں ہو جاتا ہے ۔ اُس مسجد کا رحم دل مولوی اُسے اپنے کھانے میں شریک کر لیتا ہے ۔ پریم ناتھ کی بیماری بڑھتی گئی اور اُس کے بچنے کی امید ختم ہونے لگی تو مولوی نے اُس کے گھر والوں کا پتہ دریافت کیا ۔ لیکن وہ اپنے گھر والوں کو اپنی شکل بھی نہیں دکھانا چاہتا تھا ۔ بہر حال اُس نے اس شرط پر اُس مولوی کو پتہ دے دیا کہ اُس کے مرنے کے بعد اس کی تجہیز و تکفین کے بعد ہی اس کے گھر والوں کو اُس کی موت کی اطلاع دی جائے ۔ (پریم ناتھ کے الفت حسین بننے کے بعد اُس کی ماں تیرتھ یاترا کی غرض سے چلی گئی تھی اور بیوی اپنے میکے میں جا بیٹھی تھی) ۔ مولوی صاحب سے اُس کی یہ ابتر حالت دیکھی نہ گئی تو اُس نے اُس کی بیوی کو ایک خط لکھ کر اطلاع دے دی اور مسجد کا پتہ دے دیا ۔ اُس کی بیوی اپنی بوڑھی نوکرانی کے ساتھ مسجد میں آتی ہے ۔ شکوے گلے کے بعد الفت حسین اپنی بیوی کے پیار کی خاطر پھر سے ہندو ہو جانے پر تیار ہو جاتا ہے حالانکہ شدھی میں اُس کا یقین نہیں تھا ۔ یہ بات شروع ہی میں مَیں نے اس کہانی کا اقتباس دے کر واضح کر دی ہے ۔

چونکہ پریم ناتھ کسی ارفع و اعلیٰ مقصد کے پیشِ نظر مسلمان نہیں ہوا تھا بلکہ ایک طوائف سے شادی کرنے کا جذبہ کارفرما تھا اس لیے اُسے " اسلام سے کوئی خاص عقیدت نہ تھی ۔ جذبات ہندو تھے ۔ خیالات ہندو تھے ۔ صرف دیا ہندو نہیں ۔"

شبلی صاحب نے اس کہانی کے صرف مندرجہ بالا الفاظ حسبِ عادت سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کیے ہیں تا کہ مسلمان قارئین کو بے وقوف بنایا جا سکے اور پریم چند کے خلاف اپنے غلط اور بے بنیاد موقف کی حمایت اور ہمدردی حاصل کی جا سکے ۔ پھر اس منظر کو واضح کرنے کے لیے پریم چند کے الفاظ ضروری حصہ پیش کیا جاتا ہے :-

" ان پانچ برسوں میں پریم ناتھ نے دولت عزت ننگ و ایمان سب کچھ ہی حسنہ کی نذر کر دیا ۔ اگر وہ ایشور کی پرستش عمر بھر کیا کرتے تو کوئی بازپرس نہ ہوتی لیکن طائف

کھلے بیٹھوں۔ ڈنکے کی چوٹ رنگ رلیاں منانا سماج کو کب برداشت ہو سکتا ہے۔ لوگوں کی آمد و رفت بند ہو گئی۔ اقربا بے گانے ہو گئے۔ انھیں دیکھ کر کترا جاتے۔ ماں نے رو رو کر سمجھایا۔ بیوی نے منتیں کیں۔ دانہ پانی چھوڑ دیا۔ مگر پریم ناتھ کے دل میں حسنہ کے سوا اور کسی کے لیے اب جگہ نہیں تھی یہاں تک کہ آخر ماں مجبور ہو کر تیرتھ یاترا کرنے چلی گئی۔ اور گومتی (پریم ناتھ کی بیوی ـــ م) نے میکے کی راہ لی۔ پریم ناتھ کا راستہ اور بھی صاف ہو گیا۔ عطائیوں اور مراثیوں کی صحبت رہنے لگی مذہبی پابندیاں پہلے ہی شاخ پر جا بیٹھی تھیں۔ اب اُن کے پر نکل آئے۔ اُڑ گئیں۔ ہم پیالہ و ہم نوالہ ہوئے بغیر لطف صحبت کہاں خلوص میں امتیاز کہاں؟ اُلفت میں مغائرت کیسی؟ چھوت چھات مٹتے ہی ہندو پن بھی مٹ گیا۔ جب ہندو نہ رہے تو مسلمان، عیسائی جو چاہے کہو۔ جو چاہے سمجھو۔ ماں اور بیوی کی کنارہ کشی نے بغاوت کی۔ اور پھر تحریک کی۔ ایک دن مسجد میں کلمہ پڑھ لیا۔ انھیں اسلام سے کوئی عقیدت نہ تھی۔ جذبات ہندو تھے۔ خیالات ہندو تھے۔ ہمدردیاں ہندو تھیں۔ لیکن آداب ہندو نہیں تھے۔ اس لیے وہ مسلمان تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا۔ کھانا، پینا۔ کیا اُن کے مسلمان ہونے کی دلیل قاطع نہ تھی۔ پر اس سے فائدہ ہی کیا کہ ادھر میں نہ اُدھر۔ کلمہ پڑھتے ہی پریم ناتھ اُلفت حسین ہو گئے۔"

پریم چند نے پریم ناتھ کے مسلمان ہونے کی جو توجیہ پیش کی ہے کیا اُس میں آپ کو اُس گہرے طنز کی چوٹ نظر نہیں آتی جو انھوں نے پریم چند کے اُلفت حسین بننے پر بیان کی ہے؟ کیا اس سے صاف صاف طور پر ظاہر نہیں ہوتا کہ پریم ناتھ اسلام کی تعلیمات سے عقیدت کے باعث مسلمان نہیں ہوا بلکہ ایک سفلہ جذبے کی تسکین کی خاطر ـــــ

دوسری طرف میدانِ عمل میں نائنا، کا ہیرو امرکانت جب ایک شریف زادی سکینہ کی محبت میں گرفتار ہو کر مسلمان بننے کے لیے تیار ہوتا ہے تو اگرچہ یہ عمل بھی اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہو کر نہیں ہوتا لیکن یہاں ایک شریف زادی کا معاملہ تھا اور پریم چند اپنی ذمہ داری کو سمجھتے ہوئے انتہائی محتاط

ہے کہ ان کی کسی بات سے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے چنانچہ یہاں وہ انتہائی گہبیرتا سے فرماتے ہیں:۔

"مجھے اسلام میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی جو میرا ضمیر قبول نہ کرتا ہو۔ سارے مذہبوں کی حقیقتیں ایک ہیں۔ حضرت محمد کو خدا کا رسول ماننے میں مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔ جس خدمت، ایثار، رحم اور تہذیب نفس پر ہندو مذہب کی بنیاد قائم ہے۔ اسلام مجھے بدھ، کرشن، اور رام کا احترام کرنے سے نہیں روکتا۔ پھر اس نوکت میں اپنی خوشی سے ہندو نہیں ہوں۔ بلکہ اس لیے کہ ہندو خاندان میں پیدا ہوا ہوں ... اسلام کی طرف اپنا طبعی میلان نہیں پاتا۔ ہاں سکینہ کے سامنے اپنا سر جھکاؤں گا۔ مگر اپنا ایمان یہ ہے کہ مذہب روح کے لیے بندش ہے۔ میری عقل جسے قبول کرے وہی میرا مذہب ہے۔ باقی سب خرافات۔" (میدانِ عمل۔ تیسرا ایڈیشن۔ ص ۱۲۴۔ ۱۲۵)

شادی کر لینے کے باوجود حسنہ اپنی طوائفانہ خو نہیں چھوڑ اور پریم ناتھ عرف اُلفت حسین کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ کر اُسے بے یار و مددگار بنا دیتی ہے اور وہ ایک پرانی مسجد میں پناہ گزین ہو جاتا ہے۔ پریم چند جی کے الفاظ میں یہ سلسلہ واقعہ پیش ہے۔

"لیکن اس کوچہ میں کون صاحب زر گیا جو چند دنوں میں دانوں کا محتاج نہ ہو گیا ہو۔ دنیا کے بازار میں نقد جنس کی صورت اختیار کرتی ہے نشاط کے باغ میں رندی اور فاقہ مستی کے سوا اور کیا ہے شمع بجھتے ہی پروانے منتشر ہو گئے۔ نخل بے ثمر پر طیور کیوں چہکیں۔ بابا آدم کے زمانے سے جو ہوتا ہے وہی پھر ہوا۔ حسنہ نے نئے عاشق ڈھونڈ نکالے اور میاں الفت حسین بے یار و مددگار بد نصیب غمگسار ایک پرانی مسجد میں پناہ گزین ہو سکے۔ ساری دولت خرچ کر کے رسوائی۔ خلعت ذلت اور حسرت جیسی بے بہا چیزیں خرید لائے بیماری گھاٹے میں ملی!!"

ممکن ہے کہ شبلی صاحب اس بات پر سیخ پا ہو رہے ہوں کہ پریم چند نے ایک مسلمان عورت (چاہے وہ طوائف ہی کیوں نہ ہو) کا ایسا گھناؤنا کردار کیوں دکھایا ہے۔ لیکن پریم چند نے یہ کسی مسلمان شریف زادی کا نہیں بلکہ ایک طوائف کا کردار دکھایا ہے جو ابدا سے ملے ہوئے مذہب کے باوجود اپنے طوائفانہ ہتھکنڈوں کے استعمال کے وقت نہ ہندو ہوتی ہے اور نہ ہی مسلمان بلکہ سرتاپا طوائف ہوتی ہے۔ سنا تو یہ ہے کہ طوائفوں کا مذہب پیسہ ہوتا ہے۔ چنانچہ سردار دیوان سنگھ مفتوں ایڈیٹر ریاست کے ساتھ پیش آیا ہوا ایک سچا واقعہ پیشِ خدمت ہے۔

ہندوؤں کا ایک مشہور مندر ہے ناتھ دوارہ جس کی سالانہ مذہبی تقریب میں رقص کرنے کے لیے دوسری طوائفوں کے علاوہ ایک ہندو طوائف ہنسا بھی اپنے طائفے کے ساتھ مدعو تھی۔ اُس وقت کے مہنت صاحب دل و جان سے اُس پر عاشق ہو گئے۔ اور اُس کے ساتھ بیاہ رچا لیا۔ جس سے سناتن دھرمی ہندوؤں میں بہت بے چینی پھیل گئی۔ اور اُن کے خلاف ایجی ٹیشن بھی شروع ہو گئی۔ مہنت صاحب اور اُن کے حاشیہ بردار یہ کہتے تھے کہ انھوں نے ایک طوائف سے شادی کر کے اُسے ایک نیک چلن گھریلو عورت بنا کر ایک بہت زبردست ریفارمر کا کام کیا ہے۔ لیکن جب مخالفت زیادہ بڑھی تو مہنت صاحب مشورہ کے لیے مفتوں صاحب سے ملے۔ اور پھر انھیں دہلی ہی میں اپنے بنگلے پر بلوایا۔ جہاں ایک گھنٹہ کی بات چیت کے بعد ہنسا بائی انھیں الگ اپنے کمرے میں لے گئی۔ اور ـــــ

ہنسا نے جب باتیں شروع کیں تو اُسی طوائفانہ انداز سے جو اُس کی فطرت تھی۔ جسم کے ہر حصہ کی حرکت دینا بات بات پر مسکرانا۔ تکلف۔ نمائشِ حسن اور سیمابیت وغیرہ ـــ میں نے اُس کے ذہن کی کیفیت معلوم کرنے اور تمام حالات کی درستی و صحیح پوزیشن سمجھنے کے لیے اُس سے سوال کیا ـــ

...نے اب تک اس مٹھ سے کتنا روپیہ حاصل کیا۔ اور کیا یہ مگرمچھ تمھارے پنجے سے نکل تو نہیں جائے گا۔

میرے اس سوال کا جو جواب ہنسا نے دیا اس نے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔ اور وہ الفاظ مجھے اب تک یاد ہیں۔ اُس نے کہا ـــ

"کیا آپ مجھے اتنی بے وقوف سمجھتے ہیں کہ میں اس حرامزادہ کو اپنے چنگل سے نکلنے دوں گی۔ اس کا خیال تک بھی نہ کیجیے۔" (ناقابلِ فراموش۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۵۷ء۔ ص ۲۸۶)

اس سارے واقعہ کے بیان کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ شبلی صاحب اور ان کے قبیل کے لوگوں کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ حسینہ طوائف نے مسلمان ہوتے ہوئے بھی اگر اپنے "مسلمان" خاوند کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ کر اُسے ایک نچوڑی ہوئی گٹھلی کی طرح ایک مسجد کے دروازے پر پھینک دیا تھا تو یہ کوئی اَن ہونی بات نہ تھی بلکہ دنیا میں اکثر ایسا ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ طوائفیں بلا تخصیص مذہب اپنے بے وقوف عشاق کو ہمیشہ دونوں ہاتھوں سے لوٹتی رہی ہیں اور لوٹتی رہیں گی۔ اور اگر پریم چند نے ایک ایسی مسلمان طوائف کا کردار اپنی کہانی میں پیش کیا ہے تو کہانی کے تقاضے کے پیشِ نظر ـــ اس سے نہ تو اسلام کی توہین ہوتی ہے اور نہ ہی مسلمانوں کی مونچھ نیچی ہوتی ہے۔

آگے چل کر پریم چند مسجد کے ایماندار اور خداترس مُلا طاہر علی کا کردار پیش کرتے ہیں۔ اس کردار کو پیش کرنے کا مقصد نہایت واضح ہے مسلمانوں میں صرف کم ظرف اور شقی القلب کٹھ ملا ہی نہیں ہوتے بلکہ روشن خیال اور خدا ترس مولوی بھی ہوتے ہیں۔ لیکن شبلی صاحب نے پریم چند کی اس تین چار صفحے کی تفصیل کو اپنے غلط اور گمراہ کن موقف کی حمایت میں حسبِ عادت جزئیات سے کاٹ کر اس طرح پیش کیا ہے کہ پریم چند کو کسی نہ کسی بہانے مجرم ثابت کر دیا جائے۔ شبلی صاحب کا پیش کردہ اقتباس یہ ہے۔

"طاہر علی تمام تقاضے لوٹ رہے تھے۔ انھیں پریم ناتھ کی حالت پر رحم آتا تھا۔

[ا]پنے کھانے میں شریک کر لیتے ایک دن اُن سے کہا کیوں نہیں [ا]پنے گھر چلے جاتے۔ مندرجہ بالا اقتباس کے ساتھ اب شبلی [ص]احب کی تنقید ملاحظہ ہو۔

"لیکن متعصب اتنے تھے (یعنی پریم چند نے جس مولوی کا مندرجہ بالا الفاظ میں تعارف پیش کیا ہے۔ شبلی صاحب کے نزدیک پریم چند نے اُسے دراصل ایک متعصب مُلّا کے روپ میں پیش کیا ہے ـــ م) ۔ ایک بار ترش ہو کر پریم ناتھ سے کہا تھا ' ایشور کیوں ۔ خدا کہو صاحب ۔ یہ افسانہ تضاد کا مجموعہ ہے ۔ اور افسانہ نویس کی ذہنی اُلجھنوں کا عکاس ہے ۔ تقریباً ۹ صفحوں کی اس کہانی میں حسنہ اور پریم چند کے تعلقات اور اُس کے معاشی انجام کا ذکر ڈیڑھ صفحوں سے زیادہ نہ پھیل سکا اور افسانہ نویس یہ گتھی سلجھانے سے قاصر ہے کہ ــ "انھیں اسلام سے کوئی خاص عقیدت نہ تھی ــ"

شبلی صاحب! پریم چند نے یہ کہانی حسنہ طوائف اور [پر]یم ناتھ کے عیش و عشرت کی رنگین داستان پیش کرنے کی خاطر [نہ]یں لکھی تھی اس لیے ۹ صفحے کی کہانی میں اس داستان کے لیے [صر]ف ڈیڑھ صفحے صرف کیے ۔ اور یہی اُن کی بالغ النظری کی دلیل [ہے] ۔ اور جسے آپ کہانی کا نقص یا کمزوری سمجھ رہے ہیں وہی [اس] کہانی کی خوبی ہے ۔ دراصل ذہنی الجھنوں کا شکار پریم چند [نہ]یں بلکہ آپ خود ہیں ۔ اور اسے ہی کہتے ہیں افسانہ اور اس کے [لو]ازمات کے سمجھنے کا شعور ــــ جس سے چڑ کر آپ نے [...]ے پیوندی افسانے لکھنے کا مجرم گردانا اور اس طرح اپنے [...]دل کے پھپھولے پھوڑے ـ!

اب قارئین کی خدمت میں مسجد کے مولوی طاہر حسین کے [با]رے میں منشی پریم چند کی پیش کردہ تفصیل پیش کی جاتی [ہ]ے تاکہ وہ خود اندازہ لگا سکیں کہ پریم چند نے طاہر علی کے بارے [میں ...]کیا اور شبلی صاحب نے کس طرح پیش کیا ۔ اس تفصیل [میں ج]ہاں ضرورت پڑے گی پریم چند کی اپنی تفصیل واوین میں [بیا]ن کر دوں گا ـ

پریم ناتھ عرف الفت حسین حسنہ طوائف کے ہاتھوں لٹ کر بے یار و مددگار ایک پرانی مسجد میں پناہ گزیں ہوتا ہے ۔ "ساری دولت خرچ کر کے رُسوائی ۔ ندامت ۔ ذلت اور حسرت جیسی بے بہا چیز خرید لائے ۔ بیماری گھاٹے میں ملی"۔ وہ تین ہفتے مسجد کے ایک گوشے میں پڑا بیماری سے کراہتا رہا۔ "مسجد میں ایک مولوی صاحب تھے ۔ طاہر علی نام تھا ۔ بے لوث آدمی تھے انھیں پریم ناتھ کی حالت پر رحم آتا تھا ۔ اپنے کھانے میں اُسے شریک کر لیتے ۔ ایک دن اُن سے کہا کیوں اپنے گھر نہیں چلے جاتے یہاں کب تک پڑے رہو گے ۔ آخر گھر تو نہیں گر گیا ۔ میں دیکھتا ہوں یہاں تمہاری حالت روز بروز ابتر ہوتی جا رہی ہے" پریم ناتھ اپنے گھر والوں کو اپنی منحوس صورت نہیں دکھانا چاہتا وہ صاف طور پر انکار کر دیتا ہے ۔ اس پر مولوی صاحب فرماتے ہیں: "بھلا ایک بار اپنے گھر والوں کو بلاؤ ۔ تو دیکھو کیا جواب آتا ہے ۔ بیوی کو تو نہیں کہتا ۔ لیکن ماں بچے کی حالت دیکھ کر اس کے سارے قصور معاف کر دے گی ۔ اور چھاتی سے لگا لے گی۔" اس کے جواب میں اُلفت حسین (پریم ناتھ) نے مایوسانہ انداز میں کہا "اچھا جانتا ہوں مولوی صاحب ۔ اماں کو خبر مل جائے تو وہ چاہے کہیں ہوں دوڑی چلی آئیں گی ۔ بیوی کی جانب سے بھی مجھے اس کا کامل یقین ہے ۔ وہ وفا کی دیوی ہے ۔ مولوی صاحب ایسی شرم و حیا تو میں نے کبھی دیکھی نہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور آئے گی ۔ مگر کس منہ سے جاؤں اب انھیں یہ روئے سیاہ نہیں دکھا سکتا ۔ یہیں پڑے پڑے مر جانا قبول ہے ان کے غم کو تازہ نہیں کر سکتا ۔ آہ! میں ننگِ خاندان ہوں ۔ مولوی صاحب میں نے بزرگوں کا نام ڈبویا ۔ میرے پاس اتنا اثاثہ تھا کہ کئی پیڑھیوں تک فراغت سے گزران ہوتی ۔ لیکن اب قلاش ہوں ۔ یہاں تک کہ ہمت کی لکڑی بھی ہاتھ میں نہیں ہے ۔ اب تو ایشور سے یہی دعا ہے کہ جتنی جلد ہو سکے میری مصیبتوں کا خاتمہ کر دیں۔

"مولوی صاحب نے ترش ہو کر کہا ۔ ایشور کیوں خدا کہو صاحب۔

"پریم ناتھ حقارت آمیز لہجے میں بولے ۔ آپ کے لیے

خدا اور ایشور دو ہوں گے جناب میرے لیے ایک ہیں۔ دنیا سیاست کی کھیتی نہیں ہے ایشور خدا۔ برہما لارڈ اور جیہوا نے مل کر بنائی ہو۔

"مولوی صاحب نادم ہو کر بولے۔ بات تو یہی ہے برادر ہاں ایک معبود کا جو نام ہمیشہ سنتے آئے ہیں اس کی بجائے کوئی دوسرا نام سنتے ہیں تو وہ ذرا کانوں کو غیر مانوس معلوم ہوتا ہے خیر کہو تو تمہارے سسرال ایک خط لکھ دوں۔"

مندرجہ بالا طویل اقتباس پیش کرنے کا مقصد یہی ہے کہ قارئین یہ بات پورے تناظر میں سمجھ سکیں اور شبلی صاحب کی مذکورہ بالا تنقید میں کس قدر گہرائی ہے اور کہ پریم چند نے کس حد تک طاہر علی کو متعصب گردانا ہے!

بہر حال پریم ناتھ (اُلفت حسین) صاف طور پر مولوی صاحب کو منع کر دیتا ہے کہ اُس کی بیماری کی خبر اُس کے گھر والوں تک نہ پہنچائی جائے۔ اور اپنی سسرال کا پتہ اس شرط پر دیتا ہے کہ صرف اس کے مرنے کے بعد ہی اُن لوگوں کو اطلاع دی جائے۔ لیکن رحم دل مولوی، سے اُس کی بیماری کی خبر پہنچا دیتا ہے (دیکھیے شبلی صاحب! کیا یہ نقشہ ایک متعصب مولوی کا ہے جو پریم چند نے کھینچا ہے؟)

خط ملنے پر پریم چند (اُلفت حسین) کی بیوی ایک بڑھیا نوکرانی کے ساتھ مسجد کا پتہ ڈھونڈتی ہوئی آ پہنچتی ہے۔ مولوی صاحب اُسے مسجد کے باہر ہی مل جاتے ہیں اور وہ مولوی صاحب سے پریم ناتھ کے بارے میں دریافت کرتی ہے۔ مولوی صاحب اُس کو جواب دینے سے پہلے مسجد کی سیڑھیاں چڑھ کر پریم ناتھ کو اطلاع دیتے ہیں۔ اس پر پریم ناتھ (اُلفت حسین) غیض و غضب کی حالت میں مولوی صاحب پر اس طرح لعن طعن کرتا ہے کہ کوئی اور ہوتا تو شاید اُس کا خون کر دیتا۔ لیکن مولوی صاحب اس لعن طعن کو شیرِ مادر کی طرح پی جاتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں "بھائی جان معاف کرو۔ مجھ سے غلطی ہوئی حق تو یہ ہے کہ مجھے اُن کے آنے کی اُمید نہ تھی۔"

"پریم۔ میں نے تو تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ گومتی میری حالت کی خبر پاتے ہی خود چلی آئے گی۔ خیر اب تو امتحان لے چکے معلوم ہو گیا کہ ہندو عورت کتنی وفادار ہوتی ہے۔"

شبلی صاحب! آپ نے پریم چند کے مندرجہ بالا الفاظ کا تجزیہ نہیں بتایا؟ آپ کو تو کہنا چاہیئے تھا کہ پریم چند کی اسلام دشمنی کی انتہا یہ ہے کہ وہ ایک ہندو عورت کو وفا کی دیوی کہتے ہیں لیکن ایک طوائف کو مسلمان کہہ کر کہانی میں پیش کرتے ہیں!

خیر ـــــ پریم ناتھ مولوی صاحب کو منع کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ جا کر کہہ دو کہ یہاں پریم ناتھ نام کا کوئی آدمی نہیں ہے۔ اس پر مولوی صاحب کیا فرماتے ہیں۔ سنیئے!

"طاہر علی نے بیکسانہ انداز سے کہا۔ بھائی جان مجھ پر رحم کرو۔ ایک عفیفہ کے ساتھ دغا کرنے کے لیے مجھے مجبور نہ کرو۔ جو تم کہتے ہو وہ میرے منہ سے نہیں نکل سکتا۔"

لیجیئے اب متعصب اور اسلام دشمن پریم چند ایک مسلمان مولوی کا چہرہ اس قدر مسخ کر دیتا ہے کہ قاری کراہت محسوس کرنے لگتا ہے: ـــ پریم چند کے الفاظ ذرا غور سے پڑھیئے۔

"پریم ناتھ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اس ملا کے دل میں کتنا درد۔ کتنا خلوص کتنی ہمدردی ہے۔ مولوی صاحب کی طرف احسان مندانہ نگاہوں سے دیکھ کر بولے۔ جایئے بُلا لایئے۔ کہہ دیجیئے۔ بدنصیب پریم ناتھ یہیں ہے۔ طے تو کر چکا تھا کہ گھر والوں کو صورت نہ دکھاؤں۔ ایسی جگہ مرنا چاہتا تھا جہاں کوئی آنسو بہانے والا نہ ہو۔ لیکن ایشور کو میری ایسی پُرسکون موت بھی منظور نہ تھی۔"

اس کے بعد گومتی کی پریم ناتھ سے ملاقات ہوتی ہے دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا زبان دونوں کی بند۔ جذبات کے طوفان میں الفاظ ڈگمگائے ہوئے چلتے تھے۔ پر ناطقہ تک پہنچتے پہنچتے غرقاب ہو جاتے تھے۔ پریم ناتھ کے سوال کے جواب میں گومتی کہتی ہے ـــ

"..... میرے لیے تمہاری خدمت ہی سب سے بڑی دولت ہے۔ سہاگ عورت کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے۔ تم نے مجھے چھوڑ دیا تھا۔ لیکن میں تمہیں کیونکر

چھوڑ دیتی۔ میں تو ہمیشہ کے لیے تمھاری ہوں۔"

"پریم ناتھ نے مشتبہ انداز سے کہا۔ پر یہ کیسے ہوگا گومتی ہمارے درمیان تو ایک آہنی دیوار کھڑی ہے دنیا مجھے مسلمان کہتی ہے۔ اور مسلمان سمجھتی ہے۔ حالانکہ میں سچے دل سے کہتا ہوں مجھے اسلام سے کبھی عقیدت نہ تھی مجھے مرجانا قبول ہے پر تمھیں رسوا نہیں کر سکتا۔"

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ پریم ناتھ کی تبدیلی مذہب کی وجہ اسلام سے عقیدت کے باعث نہیں تھی۔ بلکہ ایک طوائف کے عشق میں گرفتار ہو کر اُس نے یہ اقدام کیا تھا۔ جس مقصد کے لیے یہ کہانی لکھی گئی تھی اس کہانی کی کوئی بھی دوسری APPROACH اس کہانی کا مقصد ہی فوت کر دیتی۔ لیکن شبلی صاحب پریم چند کے یہ الفاظ پکڑ کر کہ "مجھے اسلام سے کبھی عقیدت نہ تھی" پریم چند کو اسلام اور مسلمانوں کا دشمن ثابت کرنے کے درپے ہیں۔ اِسے کہتے ہیں "مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ"۔

آگے چل کر گومتی کہتی ہے ——

"...... دل تمھاری طرف دوڑتا ہے۔ مگر جسم پیچھے ہٹتا ہے۔ میں تمھارے لیے اس وقت بھی جان قربان کر سکتی ہوں۔ لیکن......"

گومتی کی یہ "لیکن" اور اس کے بعد پانچ لفظ کہانی کی اُٹھان کے لیے بہت اہم ہیں۔ اُس زمانے کے ماحول اور ہندو مسلمانوں کے مذہبی خیالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو یقیناً پریم چند بہت بڑے حقیقت نگار ہیں۔ چنانچہ گومتی کے "لیکن" کے بعد کا گریز اور اُس کی خاموشی کے جواب میں پریم ناتھ (الفت حسین) کہتا ہے ——

"...... میں تمھارا مطلب سمجھ رہا ہوں گومتی اور خوش ہوں کہ تم نے اِسے ظاہر کر دیا۔ آپس میں کسی طرح کا پردہ نہ چاہیے۔ میری شدھی تو ہو سکتی ہے۔ کیا تب بھی تمھیں اعتراض ہوگا۔ میں شدھی کا حامی نہیں ہوں گومتی۔ ہندو سماج میں اب بھی ایسے بے شمار لوگ پڑے ہوئے ہیں جن کے ہاتھ کا پانی پینا مجھے گوارا نہ ہوگا۔ ہمارا سماج ایسے ہی آدمیوں سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن ان کے ساتھ ملنے کے لیے میں اپنی شدھی کروانا شرمناک سمجھتا ہوں۔ لیکن تمھاری خاطر مجھے یہ آزمائش بھی قبول ہے۔"

پریم چند نے ہندو سماج کے کن لوگوں کے لیے لکھا ہے کہ "جن کے ہاتھ کا پانی پینا گوارا نہیں —— یا —— ان کے ساتھ ملنے کے لیے شدھی کرانی شرمناک سمجھتا ہوں"۔ یہ یقیناً انھوں نے ہندو سماج کے اعلیٰ ذات کے طبقوں کے سفلہ صفت لوگوں کے لیے لکھا ہے نہ کہ ہندو سماج کے ادنیٰ ذات (شودروں وغیرہ) کے لوگوں کے لیے۔ کیوں کہ وہ ہمیشہ ہندوؤں کے اعلیٰ ذات کے لوگوں کی ادنیٰ حرکتوں کو بے نقاب کرتے رہے ہیں۔ پریم چند کی ان "حرکتوں" کے باعث تنگ نظر ہندو ادیب اُن کے خلاف اُن کی زندگی ہی میں بہت کچھ لکھتے رہے۔ لیکن انھوں نے ان باتوں کی کبھی پرواہ نہ کی۔ اور ہمیشہ اپنے قلم کے تازیانے ان پر برساتے رہے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود شبلی صاحب کے نزدیک پریم چند اسلام دشمن تھے۔

اب اس کے بعد شبلی صاحب کے زریں خیالات ملاحظہ فرمایئے:۔

"اب اگر میں نے پنچ پرمیشور اور شطرنج کے کھلاڑی میں منشی جی کی فرقہ پرستی کی نفسیات کو سمجھ کر پڑھنے والے لوگوں کے سامنے پیش کر دیا تھا تو کیا قصور کیا تھا......"

(عظیم آباد ایکسپریس۔ ویکلی۔ ۵/ستمبر ۱۹۸۲ء مالک "مالا کے جواب میں")

"پنچ پرمیشور" (رہا پنچایت) کے بارے میں ایک مفصل مضمون شانِ ہند (اگست ۸۲ء) میں پیش کر چکا ہوں۔ یہ وہ کہانی ہے جسے پریم چند کی بہترین کہانیوں میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اور جسے پڑھ کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے پڑھے لکھے طبقے نے پریم چند پر تحسین کے ڈونگرے برسائے۔ یہ کہانی ہندو مسلمان یک جہتی کی طرف ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن شبلی صاحب کو اس میں بھی فرقہ پرستی کی عفونت بھری ہوئی لگتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود شبلی

صاحب اور ان کی ذہنیت کے لوگوں کے دل و دماغ میں فرقہ پرستی کی گندگی بھری ہوئی ہے۔ پنچائت کے ساتھ میں نے پریم چند جی کی ایک دوسری کہانی "آہ بے کس" کا تقابلی اور مفصل جائزہ لیا تھا جس میں پریم چند نے ایک ہندو کردار منشی رام سیوک، اُس کی بیوی اور اُس کے لڑکے کی حرص وطمع اور کمینگی کی کردار نگاری میں قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں اس کے مقابلے میں پنچائت کے جمن میاں کی حرص وطمع کی کردار نگاری میں پریم چند نے اپنے قلم کے جوہر کا عشرِ عشیر بھی نہیں دکھایا۔ بلکہ اسی کہانی میں پریم چند نے سمجھو سیٹھ (ایک ہندو بنیا) کی ہوس اور کمینگی کی جو تصویر کشی کی ہے اُس کے مقابلے میں جمن میاں کی ہوس رانی کی تصویر کشی کچھ بھی نہیں۔ عظیم آباد ایکسپریس کے "قارئین" کی خاطر یہ کہانی آہ بے کسی کے تقابلی مطالعہ کے ساتھ جلد ہی پیش کی جائے گی۔ اس کے بعد "شطرنج کے کھلاڑی" بھی پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ اصل بات یہ ہے کہ پریم چند کو "فرقہ پرستی کی نفسیات" کے سمجھنے یا سمجھانے کی ضرورت نہیں)۔ بلکہ جس ہستی کی "فرقہ پرستی کی نفسیات" کے سمجھنے یا سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ جس ہستی کی "فرقہ پرستی کی نفسیات" کو سمجھنے یا سمجھانے کی ضرورت ہے وہ ہے شبلی صاحب کی ذاتِ گرامی۔

اسی خط میں شبلی صاحب آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

"اور اگر میں نے 'شدھی' کے بارے میں یہ سمجھا ہے کہ شدھی جی ہندو نوجوانوں کو بازارِ حسن کی سیر سے تو نہیں روکتے بلکہ حسنہ نام کی طوائفوں سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اسی لیے کہ اس نام کی طوائفیں دولت سے ہی نہیں کھیلتیں بلکہ ان کے فیضِ صحبت سے پریم ناتھ اُنعت حسین بن کر گھر اور سماج سے بیگانہ ہو جاتا ہے تو کیا غلط سمجھا ہے؟" (ایضاً)

جی ہاں شبلی صاحب آپ نے بالکل "صحیح" سمجھا ہے میری پیش کردہ مندرجہ بالا تفصیل سے قارئین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شبلی صاحب کی ذہنی اُفتاد میں کس حد تک صحیح اور کس حد تک غلط سمجھنے کی صلاحیت ہے۔

شبلی صاحب کے ترکش میں ابھی اور بھی تیر باقی ہیں نیا پہ

آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

"کیا یہ انتہا نہیں ہے پریم چند کی فرقہ پرستی اور علیحدگی پسندی کی؟ کیا یہ مضحکہ خیز حقیقت نہیں ہے کہ وہ ہندو قوم کی تعمیر کے لیے نہ صرف ماضی کے متعفن خانوں کی تلاشی لیتے پھرتے تھے۔ بلکہ حال کے گندے نالوں میں گھس کر اُس کی بدبو کو ہندو اور مسلم خانوں میں تقسیم کرتے پھرتے تھے؟ اور کیا یہ تصدیق نہیں ہے اس اعلان کی کہ "اب میرا ہندوستانی قوم پر اعتقاد نہیں رہا۔ اور اس کی کوشش فضول ہے"

(ایضاً)

ساون کے اندھے کو ہمیشہ ہرا بادل ہی ہرا بادل نظر آتا ہے۔ اس لیے شبلی صاحب کو پریم چند کے ہر افسانے میں فرقہ پرستی کی بدبو نظر آتی ہے۔ دراصل گندے نالوں میں گھسنے کا کام پریم چند نے نہیں کیا بلکہ یہ فریضہ خود شبلی صاحب سر انجام دے رہے ہیں۔ ورنہ جہاں انھوں نے پریم چند کے ایک سو ساٹھ افسانے پڑھے ہیں اُن کے ساتھ اگر وہ "نیائے" "زیرِ حرم" اور عید گاہ قسم کے دو چار افسانے اور پڑھ لینے کی زحمت گوارہ فرما لیتے تو شاید اُن کی ذہنی صحت پر تھوڑا بہت خوشگوار اثر پڑ جاتا اور انھیں پتہ چل جاتا کہ پریم چند نے "ان انسانی کرداروں کا جن کا تعلق اسلام سے ہے چہرہ کس قدر مسخ کر ڈالا ہے کہ قاری کراہت محسوس کرنے لگتا ہے"

اب شبلی صاحب کی طرف سے پیش کردہ پریم چند کے مندرجہ بالا الفاظ پڑھیے:۔

"اب میرا ہندوستانی قوم پر اعتقاد نہیں رہا۔ اور اس کی کوشش فضول ہے" (پریم چند کے خطوط صفحہ نمبر ۲۴۴)

پریم چند نے یہ نہیں کہا کہ "میرا ہندوستانی قوم پر اعتقاد نہیں" بلکہ یہ کہا ہے کہ "اب میرا ہندوستانی قوم پر اعتقاد نہیں رہا"

پریم چند نے یہ الفاظ جس کرب کے عالم میں کہے ہیں اُس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پریم چند کے زمانہ

بقیہ ص ۷۷ پر

ممتاز افسانہ نگار

ہری سنگھ امر

اُردو محض ایک زبان ہی نہیں بلکہ ہماری مشترکہ تہذیب کا جنم داتا ہے۔ یہ ایک ایسی زبان ہے جس کا کردار سیکولر ہے اور انسان دوستی۔ روا داری۔ قوم پرستی۔ اور جذبات ہم آہنگی کے جذبات کا اظہار والہانہ طور پر اُردو زبان و ادب میں ہمیں ملتا ہے۔ سرزمین پنجاب کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس خطّے نے اُردو زبان و ادب کو اپنے خون سے سینچا ہے جب ہم ماضی کی طرف مڑ کر دیکھتے ہیں تو ایک طویل فہرست ہمارے سامنے آتی ہے جس میں اُن بے شمار عظیم قلمکاروں کے نام درج ہیں جنھوں نے اُردو زبان و ادب کے ذریعہ گلشنِ ادب کو سجایا سنوارا ہے۔ اور جن کا رشتہ پنجاب کی اسی سرزمین کے ساتھ ہے۔ اُردو افسانوی ادب میں جو چند قابلِ ذکر نام اس دھرتی سے منسلک ہیں اُن میں ایک اہم نام ہے ڈاکٹر کیول دھیر۔

سن ۱۹۵۸ میں ڈاکٹر کیول دھیر کے قلم نے پہلا اُردو افسانہ لکھا اور سن ۱۹۸۳ء میں اُنھوں نے اپنی ادبی زندگی کے پچیس برس پورے کر کے برصغیر ہند و پاک کے صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا۔ تیرہ نومبر ۱۹۸۳ء کو ڈاکٹر دھیر کی گراں قدر ادبی خدمات کے اعتراف میں یہ مقام لدھیانہ۔ انجمن "ادیب" اور محکمہ السنہ (بھاشا وبھاگ) پنجاب کی جانب سے مشترکہ طور پر صوبائی سطح پر ایک شاندار تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعہ پر اُن کی اور ادبی اشاعت "بکھری ہوئی زندگی" (افسانوی مجموعہ) کی رسم رونمائی بھی کی گئی۔ اس سلسلے میں صوبائی اُردو ادبی سیمینار کل ہند اُردو مشاعرہ اور نمائش اُردو مکتب کا انعقاد کیا گیا تقریب میں سماجی ہندوستان کے طول و عرض سے ڈیڑھ سو سے زائد ممتاز اُدبا و شعرا حضرات کے علاوہ اردو ہندی، پنجابی اور انگریزی کے مقامی اہلِ حضرات و خواتین نے بھی بہت بڑی تعداد میں شرکت فرمائی۔ شمالی ہندوستان کی تاریخ میں یہ ایک لا مثال اور شاندار ادبی اجتماع تھا۔ جسے برسوں یاد رکھا جائے گا۔

صوبائی تقریب تین حصّوں پر مشتمل تھی ڈاکٹر دھیر کی پچیس سالہ ادبی خدمات کے اعتراف میں صوبائی اُردو ادبی سیمینار کل ہند اُردو مشاعرہ اور نمائش کتب منعقد کی گئی۔ اس سے قبل کی شب کلادرپن چنڈی گڑھ کے زیرِ اہتمام محفلِ قوالی بھی منعقد کی گئی جس میں ہند و پاک کے نامور و جوان سال قوّال جناب اسلم صابری نے سامعین کو اپنے مخصوص انداز اور دلکش قوالیوں سے مسحور کیا۔ صوبائی ادبی سیمینار کا افتتاح جناب جوگندر پال پانٹے سابقہ وزیر تعلقات عامہ پنجاب نے کیا۔ جناب ڈاکٹر ہارون ایوب صدر شعبۂ اُردو پنجاب یونیورسٹی نے "پنجاب میں اُردو افسانہ" موضوع پر مقالہ پڑھا۔ جناب پریمی آنند گلاٹی نے ڈاکٹر کیول دھیر کے افسانوی ادب کے پچیس برس موضوع پر مقالہ پڑھا۔ جناب سُورج تنویر کے مقالہ کا موضوع تھا: "ڈاکٹر دھیر کا فن اور شخصیت"

شری پانٹے نے اپنی افتتاحی تقریر میں فرمایا کہ اُردو کی عوام دوستی پیار اور روا داری کے پیچھے صدیوں کا جو نشار ہے۔ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ زبان کسی احاطے میں محصور نہیں ہے۔ اُردو زبان کی پشت پر ہمیشہ انسان دوستی۔ وسیع النظری اور محبت کا تصور رہا ہے جس سے قومیں عروج پاتی ہیں۔ اُنھوں نے ڈاکٹر کیول دھیر کی افسانہ نگاری کا ذکر کرتے ہوئے کہا اُن کی کہانیاں اُردو ادب کا سہاگ ہیں۔ وہ ہند و پاک کے ایک ممتاز افسانہ

نگاروں اور پنجاب کی دھرتی کو۔ پنجاب کے لوگوں کو اپنے اِس عظیم افسانہ نگار پر فخر ہے۔ کیول دھیر کے افسانوں میں زندگی مچلتی ہے اُن کا بے باک اور طاقتور قلم انسانی زندگی کے حقائق کی ترجمانی کرتا ہے۔

جب ڈاکٹر ہارون ایوب نے اپنے مقالے میں گزشتہ پچیس برس کے اُردو افسانوی ادب کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ اور پنجاب میں اُردو افسانے کا ذکر کرتے ہوئے کیول دھیر کو اِس دَور کا کامیاب اور منفرد اور سحر انگیز جادو بیان افسانہ نگار قرار دیا۔ پروفیسر آزاد گلاٹی نے ڈاکٹر دھیر کی کہانیوں پر تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ کیول دھیر کی مختصر کہانیوں کے مختصر وجود میں کئی ناولوں کی وسعت سمائی ہوئی ہے۔ اسلوبِ ادا کی نغمگی و شادابی مشاہدے کی وسعت۔ لب و لہجہ کی ندرت۔ تجربے کی گہرائی۔ فن کی پختگی اور کہانی کہنے کی تکنیکی مہارت اُن کے افسانوں کی ایسی خصوصیات ہیں جو عہدِ حاضر کے بہت کم افسانہ نگاروں میں ملتی ہیں کیول دھیر حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں اُنکے قلم میں جہاں بے پناہ خلوص۔ پیار اور انکساری ہے وہاں تلخی۔ بے باکی اور تیز نشتر کی چبھن کا شدید احساس بھی نمایاں ہے۔ جناب سورج تنویر نے بے حد جذباتی انداز میں کیول دھیر کے فن اور شخصیت پر روشنی ڈالی اور انھیں بطور انسان و فنکار خلوص و محبت کا پیکر قرار دیا۔ کیول دھیر کی کہانیوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اُن کی خوبصورت تحریروں میں بے پناہ شیرینیت نغمگی اور شگفتگی ہوتی ہے عظیم افسانہ نگار کرشن چندر کے بعد کیول دھیر ہی عہدِ جدید کے ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے نثر میں شاعری کی ہے۔ اُن کے اندازِ نگارش میں بے پناہ شیرینیت جاذبیت اور حُسن ہے۔ عہدِ حاضر کے افسانہ نگاروں میں اُن کا خاص پہچان و احترام ہے۔

تقریب کی صدارت برصغیر ہند و پاک کے ممتاز شاعر و قلمکار جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے فرمائی۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر اِس خوبصورت شعر کے ساتھ کی۔

علم و حُسن و عشق کی تصویر دیکھ
گر نہیں دیکھی تو کیول دھیر دیکھ

اپنی تقریر میں انھوں نے فرمایا کہ کیول دھیر علم و ادب خلوص و محبت اور انسان دوستی کا سنگم ہے۔ پنجاب کی مقدس مٹی سے اُس کا رشتہ بہت گہرا ہے۔ کیول دھیر کو زبردست خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ پنجاب کی دھرتی کو جس طرح اپنے جانباز اور محنتی سپوتوں پر فخر ہے اِسی طرح میدانِ ادب میں کیول دھیر کی فنی عظمتوں پر بھی بجا طور پر فخر ہے۔ اپنی تحریروں میں وہ ایسی خوبصورت و شیریں زبان کا استعمال کرتا ہے جس سے نثر میں نغمگی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ جو قلب اور روح کو تسکین عطا کرتی ہے۔ اُس کی کہانیاں اِس دھرتی سے اور اِس دھرتی پر بسنے والے لوگوں سے جڑی ہوتی ہیں۔ اِس موقع پر انھوں نے کیول دھیر کے افسانوی مجموعے "بکھری ہوئی زندگی" کا عالمی ایڈیشن بھی ریلیز کیا۔ اور کیول دھیر کے پچیس سالہ ادبی سفر کی تکمیل پر اُردو برادری کی طرف سے ادبی مبارکباد پیش کی۔

ادب دوست و ادب نواز شخصیت جناب اے۔ سی سندھو۔ کمشنر انکم ٹیکس نے اِس موقع پر ادبی سووینیر ریلیز کیا اور تقریب کے کامیاب انعقاد پر پنجاب سرکار کے محکمۂ السنہ اور انجمن "ادیب" کے منتظمین کو مبارکباد پیش کی۔ پروفیسر ایچ ایس ڈیلیر، شعبۂ صحافت پنجاب یونیورسٹی نے کیول دھیر کو انسانیت کا علمبردار قرار دیا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ عنقریب پنجاب میں دوسری عالمی اُردو کانفرنس کا انعقاد کیا جا رہا ہے۔ محکمہ السنہ پنجاب کے ڈائرکٹر جناب اپوُر سنگھ گل نے ڈاکٹر کیول دھیر کو اُن کی پچیس سالہ ادبی خدمات اور افسانوی مجموعے کی رسم رونمائی کے موقع پر پنجاب سرکار کی طرف سے نیک خواہشات پیش کیں۔ انجمن ادیب کے صدر جناب سے۔ آر کشور نے مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے اِس عظیم الشان ادبی تقریب کو ایک تاریخی واقعہ قرار دیا۔

ڈاکٹر کیول دھیر نے اظہار تشکر کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا کہ میرے افسانوی مجموعے "بکھری ہوئی زندگی" کی رسم رونمائی میرے لیے ایک خوشگوار ادبی حادثہ ہے۔ اس کی وجہ وہ خلوص اور محبت ہے جو آج مجھے میسر ہوئی ہے اپنے ادبی دوستوں اور قارئین کی اس بے پناہ محبت پر مجھے فخر ہے۔ میرے قلم نے جو کچھ بھی لکھا ہے پوری ایمانداری اور اعتماد کے ساتھ لکھا ہے۔ میرا قلم کسی تحریک کا کبھی پابند نہیں ہوا۔ میرے نزدیک تحریک کے معنی گرد و پیش کا ماحول ہے جس کی خامیاں کمزوریاں۔ اچھائیاں گہرائیاں قلمکار کے قلم کو متحرک کرتی ہیں کہ آؤ مجھے اپنے قلم کی زد میں لو میں ایک سیاسی سماجی۔ اخلاقی یا تہذیبی گناہ ہوں اپنے قلم کے نشتر گناہ کے اس ناسور کا آپریشن کر دو تاکہ اس کا زہر پھیل کر معاشرے کو بیمار نہ کر دے ـــــ تاکہ ان ہولے کے جراثیم بکھر کر ماحول کو پراگندہ نہ کر دے۔ کیول دھیر نے کہا کہ یہ امر باعث افسوس ہے کہ آج کل ادب میں مختلف سکول آف تھاٹ بنے ہوئے ہیں۔ میرے نزدیک یہ سب محض ایک تماشہ ہیں یا ایک طرح کی گروہ بندی ہے جو اپنا قد اونچا کرنے کے مقصد کے تحت استعمال کی جاتی ہے۔ میں صنفِ افسانہ نگاری کا ایک ادنیٰ سا طالب علم ہوں اور صرف یہ جانتا ہوں کہ کوئی کہانی روایتی یا جدید نہیں ہوتی بلکہ کہانی صرف کہانی ہوتی ہے۔ اپنے ارد گرد کے ماحول میں جو مجھے اپنی جانب متوجہ کرتی ہے اسے میں کہانی کا روپ دیتا ہوں۔ کیول دھیر نے اپنے قارئین کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میرے قلمکار کو جو عزت اور مقام آج حاصل ہوا ہے دراصل یہ ایک نئی اہم ترین ذمہ داری ہے۔ اسے پورا کرنا اب میرا فرض مقدس ہوگا۔

اس موقع پر اردو کتابوں کی ایک شاندار نمائش بھی لگائی گئی جس کا افتتاح ضلع لدھیانہ کے ڈپٹی کمشنر جناب کے آر لکھنپال نے کیا۔ نمائش میں پانچ سو سے زائد اردو کتابیں شامل کی گئیں اور ملک کے بیشتر پبلشرز نے اس میں شرکت فرمائی۔ ترقی اردو بیورو بھارت سرکار کی جانب سے رسالہ اردو دنیا کا خصوصی شمارہ حاضرین میں مفت تقسیم کیا گیا۔

تقریب کا اختتام اردو مشاعرے کے ساتھ ہوا جس میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر۔ آزاد گلاٹی۔ ستیہ پال آنند۔ سورج سوئرن تنویر۔ بھگوان شاد۔ کرشن ادیب۔ نسیم لدھیانوی۔ کماری ووگولا۔ عجائب چترکار۔ بنیٹر باوری کے علاوہ کئی دیگر شعرا حضرات نے سامعین کو اپنے کلام سے نوازا۔ تقریب کے موقع اردو ہندی اور پنجابی اخبارات نے خصوصی مضامین و ضمیمے شائع کیے اور پروگرام خاص طور پر ٹیلیویژن پر دکھایا گیا اور آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے اس تقریب پر بھی پروگرام نشر کیا گیا۔

مینارۂ نور



MINARA -E NOOR

- پیارے نبیؐ کی حیاتِ طیبہ مختصر مگر دلنشین انداز میں
- صداقت کو اپیل کرنے والی قرآن، وید، پران توریت اور انجیل کی گواہی ـــــ
- دین و دنیا میں فلاح پہنچانے والی ۴۰ احادیث کا ترجمہ ـــــ
- عمل پر ابھارنے، دل میں حرارت پیدا کرنے والے صحابہ کرامؓ کی زندگی کے واقعات۔
- آنکھوں کو سرور بخشنے والے آپ کے خطوط کا عکس و ترجمہ
- صداقتِ نبوت کا جیتا جاگتا ثبوت۔ آپ کی پیشنگوئیاں
- ایک نادر انمول کتاب
- بہترین طباعت۔ قیمت ۱۰ روپیہ

حکیموں، ڈاکٹروں، رجسٹرڈ میڈیکل پریکٹیشنرز کیلئے بیش بہا تحفہ

UP-TO-DATE MEDICAL GUIDE

جدید رہنمائے علاج

- بنگال اردو اکیڈمی سے ۲ ہزار روپے انعام یافتہ
- آسان اردو زبان میں ڈاکٹری کی بہترین کتاب، جدید معلومات سے لبریز ۱۶ اہم کتابوں کا نچوڑ اس میں ۲۰۰ سے زائد امراض کی تعریف، اسباب، علامات دنیا کے بہترین ڈاکٹروں کا مجرب علاج، جسمانی اعضا کی مختصر تشریح، بے حد بیش قیمت معلومات، مثلاً بلڈ پریشر دیکھنا، انجکشن لگانا، اسٹیتھسکوپ، انیما، کیتھیٹر، تھرمامیٹر لگانا۔ خون پیشاب پاخانے کی طبعی اور غیر طبعی حالت، جانچ کرنا مطب میں چلنے والے مکسچر، مرہم و لوشن نسخوں کے اشارات و اوزان کی تشریح، فوائد کے لحاظ سے دواؤں کی تقسیم، کتاب کا قیمتی حصہ بیس سالہ مطالعہ اور تجربات کا خلاصہ، ایک طبیب اور ڈاکٹر کو نامور بنانے، مطب اور آمدنی بڑھانے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ انتہائی مفید ثابت ہوگا۔

دلکش طباعت، صفحات ۴۰۰، سہ رنگا ٹائیٹل

قیمت ۳۰ روپیہ

جدید رہنمائے ادویہ

UPTO DATE- MEDICINE GUIDE

- پانچ ہزار سے زائد ایلوپیتھی، یونانی اور ایورویدک کی پیٹنٹ دواؤں کا بیان
- ادویہ کے تجارتی اور فارماکوپیائی نام
- افعال و امراض کے لحاظ سے دواؤں کی درجہ بندی
- حاملہ عورتوں پر دواؤں کا اثر
- کئی دواؤں کے ایک ساتھ استعمال کے اثرات ـــــ
- غذا کے ساتھ دواؤں کا اثر، ادویہ کا ری ایکشن اور اس کا علاج
- ویکسین سیرم۔ آکسیجن تھیراپی۔
- دوا ساز کمپنیوں کے مکمل پتے
- لٹریچر منگانے کے لیے خط کا نمونہ ـــــ
- نسخوں میں لکھے اشارات کی تشریح۔
- پیٹنٹ دواؤں پر ایسی مستند کتاب اردو زبان میں آج تک شائع نہیں ہوئی ـــــ
- بہترین طباعت۔ خوشنما جلد صفحات ۵۸۴

قیمت :۔ ۴۰ روپئے

زیادہ تعداد میں کتب منگانے کی صورت میں اپنے نزدیکی ریلوے اسٹیشن کا نام وغیرہ ضرور لکھیں

پتہ :۔ ڈاکٹر عبد الجبار، ڈانگ، ضلع پیلی بھیت یو، پی

سول ایجنٹ برائے دہلی : ماہنامہ شانِ ہند۔ فلیٹ ۸، انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۲

اُجین کے چند قدیم شعرا

از ــــــ محمد خالد عابدی آل انڈیا ریڈیو اندور

ساغر چشتی اُجینی

:۔ آپ کا نام حافظ عبدالستار
ہے ۴ر اکتوبر ۱۹۰۴ء میں
ین میں پیدا ہوئے چشتیہ خاندان سے منسوب ہیں اس لیے
تی لکھتے ہیں۔ آپ کی تعلیم مکتب اور ذاتی مطالعے کی ہے۔
وی سید محمد مہدی رہبر پروفیسر مادھو کالج اُجین سے آپ
اُردو اور فارسی پڑھی تھی۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر سے
رِ سخن میں دلچسپی ہوئی تو مضطر خیرآبادی کے جانشین
"غنی محمد صاحب" برق مضطر" گوالیاری کے سامنے ۱۹۲۲ء
، زانوئے تلمذ طے کیا۔ غنی محمد گوالیاری سے قبل آپ نے
رصے سید کرامت علی بشرا اُجینی سے بھی مشورہ سخن کیا تھا
، کا پہلا تخلص "گل" تھا جو اُستاد غنی گوالیاری نے بذریعہ
ِ انداز ساغر تخلص تجویز کیا۔ ۱۹۳۲ء میں آپ کو
ق حسین ایڈوکیٹ۔ نے بزم سخن کے ایک جلسے میں
درِ جذبات" اور الاصلاح دہلی کے مدیر اے۔ کے یکتا
"سحر البیان" کے خطابات سے بھی نوازا ہے۔
۱۹۲۸ء میں ہفت روزہ "سروش" بمبئی میں آپ
غزل پہلی بار شائع ہوئی اور وہ غزل یہ تھی ؎

تم مہرباں رہو کہ اجل مہرباں رہے
کوئی بھی تو شریک غم جاوداں رہے
اک روز ڈوبنے کو ہے یہ کشتی حیات
کاغذ کی ناؤ پانی پہ کب تک رواں رہے
دو دن کی زندگی ہے اُسے مانتے ہیں ہم
دو دن کے واسطے تو کوئی مہرباں رہے
یارب نہ کم ہو خانہ ویراں کی روشنی
ظلمت میں بجلیوں کے مرا آشیاں رہے

ساقی بتا خدا کے لیے جائیں اب کدھر
ساغر نہ میکدے میں رہے تو کہاں رہے

۱۹۲۹ء میں ساغر چشتی فارغ الاصلاح ہو چکے تھے آپ کا ابتدائی دور کا کلام گھر میں آگ لگنے کے سبب نذرِ آتش ہو گیا۔ ۱۹۴۱ء میں سلطان احمد صدیقی گورکھپوری ثم اُجینی نے آپ کا شعری مجموعہ "دورِ ساغر" رسالہ مست قلندر لاہور کا مقدمہ پروفیسر سید ظہیر الدین علوی نے اور تبصرہ سلطان احمد صدیقی نے لکھا ہے۔ "دورِ ساغر" رسالہ "مست قلندر" لاہور کے مدیر پرتھوی سنگھ نے لاہور پریس سے شایع کیا تھا۔ "دورِ ساغر" زماں روائے جاورہ نواب افتخار الملک افتخار علی خاں صاحب بہادر کا نام نامی تھا۔ مقبول سلطان احمد صدیقی یہ مالوہ کا پہلا مجموعہ کلام تھا جو رائلٹی کے طریقے پر طبع ہوا تھا۔ "دورِ ساغر" کی ہزار جلدیں ریلوے بک اسٹال سے سارے ہندوستان میں فروخت ہو کر مقبول خاص و عام ہوئی تھیں۔

آپ کا حلقۂ تلامذہ کافی وسیع ہے۔ کچھ تلامذہ کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں صہبا قریشی، باسط اُجینی، واحد کمر گونی، گوہر سیہوری، راز، اظہر دھاروی، سحر نوگانوی، صہبا اندوری، ساقی اُجینی، صابر اندوری، اسحاق اثر، اور سید زشباب، ناظر اندوری، خلیجی اور نظر اندوری وغیرہ ہیں۔ آپ نے اپنے شاگردوں کے لیے اپنے استاد غنی گوالیاری کا ہی طریقہ اصلاح روا رکھا ہے کہ شاگرد کو سامنے بٹھا کر غزل سنتے ہیں، خامیاں بتا کر درستی کرتے ہیں اور نکات شاعری کی وضاحت فرماتے ہیں۔

سلطان احمد صدیقی نے ساغر چشتی کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے مجھے لکھا ہے کہ وہ شاعری بطور شوق الہامی انداز میں کرتے ہیں۔ طبیعت موزوں ہوتی ہے تو بے ساختہ آمد میں

اشعار نازل ہوتے ہیں۔ ساغر صاحب آورد کو پسند نہیں کرتے ہیں۔ دہلی اسکول شاعری کی پابندی کرتے ہیں ساٹھ سال کی عمر کے بعد نعت کی طرف مخصوص توجہ دی ہے اور اس میں ایک خاص تغزل کا رنگ پیدا کیا ہے جو منفرد طور سے آپ کا حصہ ہے"

ساغر چشتی نے نظمیں، غزلیں، قطعات، رباعیات، مخمس، مسدس، تشطیر اور نعتیں وغیرہ خوب لکھی ہیں پروفیسر عزیز اندروی نے روزنامہ آفتاب جدید بھوپال میں ۲۴/ اگست ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں "نظم گو۔ ساغر چشتی" عنوان کے تحت مضمون میں اُن کی نظم گوئی کا بھرپور جائزہ لیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ "اُن کے یہاں معصوم دوشیزہ، پیمانہ، مجبوبہ کا دارِ دلات، ملاپ اور "لاری" جیسی رومان پرور نظمیں مل جاتی ہیں ان کی نظموں میں رومان پروری کا جو جذبہ نظر آتا ہے اُس کا سلسلہ بڑی حد تک اختر شیرانی، حفیظ جالندھری اور جوش ملیح آبادی کی اُس تخیلی رومان پرستی سے جا ملتا ہے جس نے اردو نظم کو ایک نئے رجحان سے آشنا کرایا تھا۔ رومان پروری کے ساتھ ساتھ ساغر چشتی کی نظموں میں ملک و قوم کی دلچسپیوں کی جو جھلکیاں نظر آتی ہیں انھیں دیکھنے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے بعض زندہ مسائل کی جانب بھی متوجہ ہونا چاہتے تھے۔ ہر چند اُس سلسلے میں اُن کی نظموں میں قومی اصلاح یا آزادیٔ وطن کا کوئی ایسا تصور نہیں ملتا جس سے ان کی نظموں کو اصلاحی یا وطنی نظموں کے اعلیٰ معیار پر رکھ کر پرکھا جا سکے لیکن انھوں نے سرسید، ٹیگور اور اقبال کو جس طرح منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اُس سے اُن کی حب الوطنی اور قومی اصلاح کے جذبے کا پتہ ضرور چلتا ہے"

۱۹۸۰ء میں حضرت ساغر چشتی اُجینی کا پچاس سالہ جشن منعقد کیا گیا تھا۔ روزنامہ آفتاب جدید بھوپال نے ۱۱/ دسمبر ۱۹۸۰ء کو اس جشن کے اقدام میں "اپنی دھرتی اپنے لوگ" کالم کے تحت کچھ مضامین شائع کیے تھے۔ عارف عزیز نے "ساغر چشتی اور اُن کا نعتیہ کلام" عنوان کے تحت اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ

"یوں تو ساغر چشتی کا پورا کلام وہ غزل ہو یا نظم شرابِ معرفت سے سرشار نظر آتا ہے مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کہی گئی اُن کی نعتیں تو جذبات کی پاکیزگی، فکر و خیال کی لطافت عقل و اندیشہ کی تگ و تاز، عشق و یقیں کے سوز اور طرزِ ادا کے والہانہ پن کا ایک نمونہ نظر آتی ہے ساغر چشتی زبان و بیان نیز فن کے قدیم اصولوں پر سختی سے پابند رہے ہیں اس کے دوش بدوش اُن کے یہاں تخیل کی بلند پروازی بھی نظر آتی ہے اُن کے یہاں سلجھاؤ ہے دل نشینی ہے لطفِ بیان ہے"

رفعت روانتی نے "ساغر میرے ہمعصر" تاثر کے تحت لکھا ہے کہ

"ساغر کو شعر گوئی سے فطری مناسبت ہے اس لیے اپنے ماحول میں بھی نمایاں رہے ہیں ساغر صاحب کے کلام میں عصری رجحانات کا عکس نظر آتا ہے اور یہی سبب ہے کہ وہ اپنے معاصرین میں ممتاز مقام بنا سکے"

اور خالدہ بلگرامی نے "ساغر چشتی اور ان کی نظمیں میں مقامی رنگ اور منظر نگاری" تلاش کرتے ہوئے لکھا ہے

"نظیر اکبر آبادی کی طرح ساغر چشتی بھی حقیقی ہندوستان کے مصور ہیں وہ رنگوں سے نہیں لفظوں سے میلوں کی تصویر بناتے ہیں اور ایسا نقشہ کھینچتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ قاری خود میلے میں موجود ہے"

ساغر چشتی نے اپنا نظریۂ شاعری اور زندگی کی صحیح قدر اس طرح نظم کیا ہے ؎

میں جو کہتا ہوں خود کہتا نہیں اپنی طبیعت سے
کوئی قوت ہے پوشیدہ جو مجھ سے کہلواتی ہے

اور

ہر مصیبت سے گزرنا خندہ پیشانی کے ساتھ
زندگی شاید اسی زندہ دلی کا نام ہے

ساغر چشتی کا اجین میں والدین کے انتقال کے بعد

چنانچہ وہ ترک سکونت کر کے اندور منتقل ہو گئے، اور وہیں ہی ۲ رمئی ۱۹۸۳ء کو انتقال ہوا۔
ساغر چشتی مرحوم کے بڑے صاحبزادے عبدالسلام کو بھی سخن سے دلچسپی ہے اور وہ شاعری میں اختر تخلص کرتے ہیں۔

نمونہ کلام

نزد ساحل حسرتوں کی کشتیاں ڈوبا کریں
ہائے ایسے وقت بھی وہ دور سے دیکھا کریں
درد کا شکوہ کریں یا درد کا چرچا کریں
کچھ تو فرمائیں کہ دیوانے تمہارے کیا کریں
لائق جلوہ نہیں میری نگاہیں تو نہ ہوں
آپ نے وعدہ کیا ہے آپ تو ایفا کریں
چل دیئے وہ تو شراب حسن برساتے ہوئے
اب نگاہیں نور کی موجوں میں لہرایا کریں
تیرے جلووں سے مرا اک نقش معمور ہے
کاش تیرے دیکھنے والے مجھے دیکھا کریں
کھو گیا ہوں میں تو عکس روئے تاباں دیکھ کر
وہ چراغ طور لے کر اب مجھے ڈھونڈا کریں
ہنس رہے ہیں غنچہ و گل کھل رہی ہے چاندنی
لائیے کچھ ایسے میں ذکر ساغر و صہبا کریں

جناب نصیر فتحپوری

ملک کے بہترین اور ممتاز شاعر جناب نصیر فتح پوری کا پچھلے دنوں فتحپور میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم اپنی گوناگوں اوصاف کے باعث ایک جداگانہ شان کے مالک تھے۔
مرحوم جناب عقیل صدیقی (گوشہ عقیل صدیقی) کے والد محترم تھے۔ ایڈیٹر شان ہند عقیل بھائی کے اس صدمہ میں برابر کا شریک غم ہے۔ دعا ہے مرحوم جنت الفردوس میں جگہ پائیں۔
(مرید تونسوی)

بقیہ صفحہ ۷۰ کا پریم چند

بھی شبلی صاحب کی طرح کے مسلمان موجود تھے جو ہندوؤں کے خلاف جھوٹی اشتعال انگیزی سے باز نہیں آتے تھے اور فرقہ واریت کے بارود میں چنگاری ڈالنے کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔ اسی لیے انھیں انتہائی کرب اور یاس کے عالم میں ایسے الفاظ کا اظہار کرنا پڑا۔ اور یہ ۱۹۱۲ء کا زمانہ تھا جبکہ پریم چند کا ذہن پختہ نہیں ہوا تھا اور انھوں نے یہ الفاظ مسلمان فرقہ پرستوں کی اشتعال انگیزی سے متاثر ہو کر لکھے تھے۔

ان الفاظ کے بعد اور ان الفاظ کے باوجود پریم چند ہمیشہ ہندو فرقہ پرستی کے خلاف سینہ سپر رہے۔ لیکن مسلم فرقہ پرستی کے خلاف وہ تقریباً تقریباً خاموش رہے۔ اس کے ثبوت میں پریم چند کے ایک دو نہیں بلکہ بیسیوں مضامین اور کہانیاں پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن شبلی صاحب ہیں کہ پریم چند کے ان الفاظ کا غلط مفہوم پیش کر کے ان الفاظ کو تعویز کی طرح گلے میں لٹکائے گھوم رہے ہیں۔

اب شبلی صاحب کی اشتعال انگیزی اور شر پسندی کا نمونہ بھی پیش خدمت ہے۔ مذکورہ بالا خط ہی میں شبلی صاحب فرماتے ہیں:-

"راقم السطور جس کا سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ اس نے پریم چند جیسے تحت کے اُلٹے کو من کا میلا ثابت کرنے کی کوشش کی ......" (ایضاً)

شبلی صاحب کے مندرجہ الفاظ پڑھ کر انگریزی کی ایک حکایت یاد آگئی۔ وہ یہ کہ ایک مینڈک اپنے جیسے کسی آبی جانور ساتھی کو خوبصورت بننے کا نسخہ بہ ترکیب استعمال بڑی تفصیل سے بیان کر رہا تھا تو اس کے ساتھی نے اکتا کر جواب دیا کہ قبلہ ڈاکٹر صاحب یہ نسخہ پہلے آپ اپنے اوپر استعمال فرمایئے دیسے بھی ساری دنیا کو جانا ہے کہ کتنے پانی کا حشر معلوم ہے۔

شبلی صاحب کی اشتعال انگیزی اور دریدہ دہنی یہیں پر ختم نہیں ہے۔ بلکہ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں دوسروں کے کندھے پر بندوق رکھ کر پریم چند اور ان کی سوتیلی ماں کے درمیان ناجائز تعلق کا بھی الزام لگایا ہے۔ اس پر تفصیلی بحث پھر کبھی کریں گے۔

۱۱۱۲ ۔ ۲۔

سالِ نو مبارک

عیسوی و قمری کلینڈر برائے سنہ ۱۹۸۴ء و سنہ ۱۴۰۴ھ

طریقہ :- اِس کلینڈر میں جس ماہ کی تاریخ معلوم کرنی ہو اُس ماہ کے نیچے دن دیکھئے اور پھر دن کے مقابلہ میں بائیں سمت گوشوارہ میں مطلوبہ تاریخ ملاحظہ فرمایئے ۔

نوٹ :- آپ کو یہ تو معلوم ہی ہے کہ اگر ماہ فروری ۲۹ دن کا نہ ہو تو ماہ فروری، مارچ اور نومبر ایک دن شروع ہوتے ہیں اور یکم اکتوبر کو وہی دن ہوتا ہے جو یکم جنوری کو ہوتا ہے مگر ماہ مارچ اور نومبر ہمیشہ ایک دن شروع ہوتے ہیں اِسی طرح جس دن ماہ ستمبر کی پہلی تاریخ ہوتی ہے ہمیشہ اُسی دن ماہ دسمبر کی پہلی تاریخ ہوا کرتی ہے البتہ ماہ مئی جون اور اگست مختلف دنوں سے شروع ہوتے ہیں اور کوئی صدی آئندہ بدھ اور جمعہ سے شروع نہیں ہوتی اور صحیح معنٰی میں ایک سال ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے ۴۸ منٹ اور ۴۸ سکنڈ کا ہوتا ہے ۔

۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
جمادی الآخر	صفر	٠	ربیع الاول	٠	٠	محرم
شوال	ذی القعدہ	رجب	شعبان	ربیع الثانی	جمادی الاول	٠
جنوری	٠	٠	ذوالحجہ	رمضان	جون	٠
اپریل	٠	مئی	فروری	مارچ	٠	ستمبر
جولائی	اکتوبر	٠	اگست	نومبر	٠	دسمبر

اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر	۱	۸	۱۵	۲۲	۲۹
پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر	اتوار	۲	۹	۱۶	۲۳	۳۰
منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر	اتوار	پیر	۳	۱۰	۱۷	۲۴	۳۱
بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر	اتوار	پیر	منگل	۴	۱۱	۱۸	۲۵	٠
جمعرات	جمعہ	سنیچر	اتوار	پیر	منگل	بدھ	۵	۱۲	۱۹	۲۶	٠
جمعہ	سنیچر	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	۶	۱۳	۲۰	۲۷	٠
سنیچر	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	۷	۱۴	۲۱	۲۸	٠



THE ... MONTHLY NEW DELHI
Regd. w/ the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57





بالوں کا انداز چاہے کوئی بھی ہو لیکن اگر بالوں کی یہ گھٹائیں ہمیشہ قائم رکھنا چاہیں، انہیں دراز، ملائم اور کالا دیکھنا چاہیں تو زلفی ہیر ٹانک ہی استعمال کیجئے۔ یہ گرتے بالوں کو روکتا ہے، خشکی دور کرتا ہے اور بالوں کی جڑوں کے نیچے تک پہنچ کر بالوں کی بیماریوں کو ختم کر دیتا ہے۔ زلفی ہیر ٹانک تیل نہیں بالوں کی غذا ہے۔ سر پر نئے بال اگانے میں مدد دیتا ہے۔ اپنے بال صابن سے نہ دھویئے۔ یہ بالوں کی جڑوں کو جلا دیتا ہے۔ سر دھونے کے لئے زلفی پاؤڈر استعمال کیجئے جو بالوں کو صاف رکھتا ہے۔ ان کو ریشم کی طرح ملائم بناتا ہے۔



قیمت زلفی ہیر ٹانک: بارہ روپے ● شمع (یونانی انڈ آیورویدک) لیبارٹریز، لال کنواں، دہلی ● زلفی پاؤڈر: چھ روپے

عرب ممالک میں زلفی حاصل کرنے کے لئے رجوع فرمائیں!
جدہ اور مکہ معظمہ میں
ایم۔ ایم۔ ملیباری
باب شریف، عرب بلڈنگ جدہ

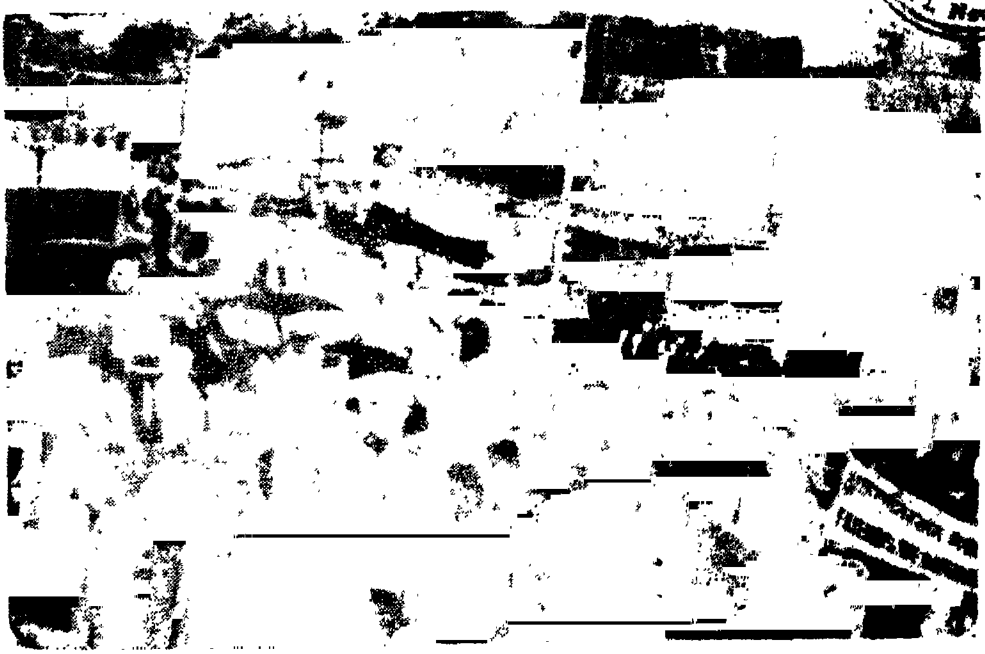
متحدہ عرب امارات میں
منک نیوز ایجنسی:
● دبئی (فون نمبر: ۲۲۵۶۵۲، ۲۲۳۶۵۰)
● ستوہ (فون نمبر: ۲۲۲۴۸۳)

● دیرہ (فون نمبر: ۲۲۴۴۴۹)
● شارجہ ● ابوظہبی
دیگر ممالک کیلئے ایجنسی حاصل کرنے کیلئے لکھئے



STOP KILLING AFGHAN CHILDREN

Demonstrators Gathering Near The SOVIET EMBASSY, New Delhi



FRIENDS OF AFGHANISTAN ASSOCIATION

Organised A Mammoth Demonstration Out Side The U.S.S.R. EMBASSY

On 27th Decemb r 1983

ٹیلیفون نمبر۔ ۲۷۵۶۰۲ ♦ رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر۔ ۵۷/۹۴۳ ♦ رجسٹرڈ نمبر DL/۲۷۰

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
فیاض گوالیاری

ماہنامہ
ایڈیٹر سرور تونسوی
شانِ ہند
نئی دہلی
فی پرچہ ۲/۵۰ روپے
زرِ سالانہ = /۲۴ روپے

جلد نمبر ۳ ♦ فروری ۱۹۸۴ء ♦ شمارہ نمبر ۲

انتساب

شانِ ہند کا یہ شمارہ اردو اکادمی کے زیر اہتمام ہوئے مشاعرۂ لال قلعہ کے آنکھوں دیکھے اور کانوں سُنے حال کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ اس کے علاوہ دلی اردو اکادمی کی کارگزاریوں پر بے لاگ تبصرہ بھی اسی اشاعت شانِ ہند میں شامل ہے

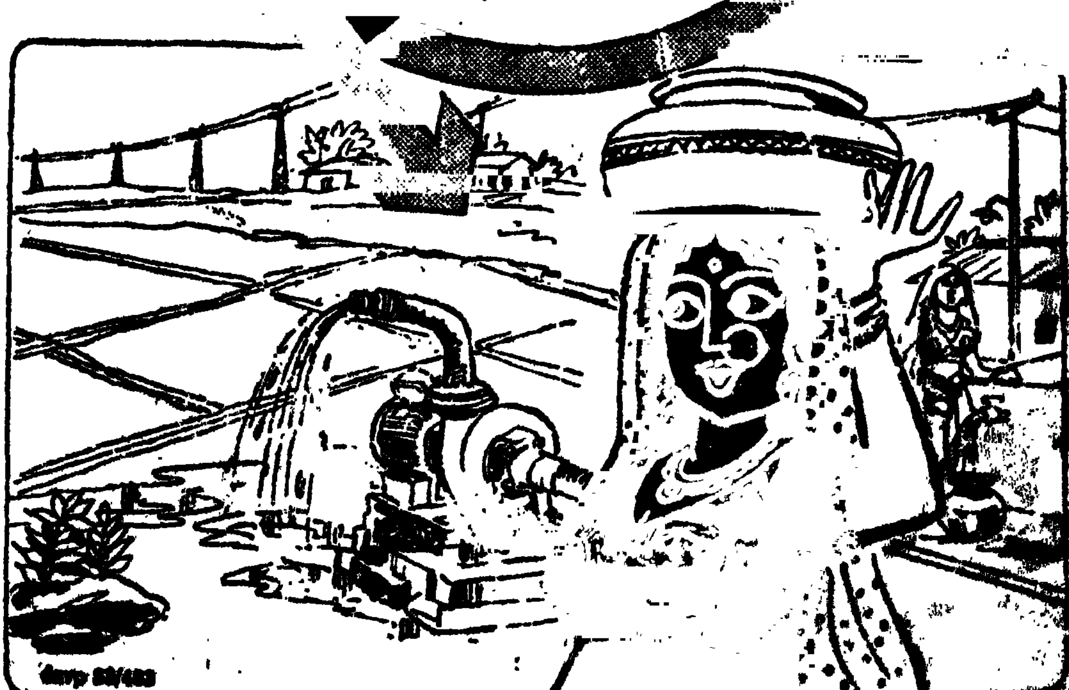
لہٰذا

شانِ ہند کا یہ شمارہ دلی اردو اکادمی کے بانی عالی جناب جگ موہن صاحب لفٹننٹ گورنر دلی کے نام منسوب کیا جا رہا ہے۔

(ایڈیٹر)

دریا پرکاش سرور ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے لیتھو کے صفحات خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی اور سرورق پائلٹ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

بیس نکات کی
یہ کہانی
گاؤں گاؤں
میں بجلی پانی



بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

دلی اردو اکادمی —— ایک جائزہ

دلی میں اردو اکادمی کا وجود ظہور پذیر ہوا ہی تھا کہ لفٹننٹ گورنر جناب جگ موہن صاحب گوا کے لفٹننٹ گورنر مقرر ہو گئے اور جو نئے لفٹننٹ گورنر تشریف لائے انھیں نہ تو اردو سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی انھوں نے اس اکادمی کو فعال بنانے کی کوئی کوشش کی۔ اکادمی کا بجٹ بھی بہت ہی معمولی رقم کا تھا جس سے دفتر کے اخراجات ہی کا پورا ہونا مشکل تھا تو ایسی حالت میں اکادمی کر بھی کیا سکتی تھی۔ اُن دنوں دلی میٹروپالیٹن کونسل کالعدم ہو چکی تھی اور دلی کی حکومت لفٹننٹ گورنر کے ہی ہاتھوں میں تھی۔ جناب شریف الحسن صاحب نقوی کا تقرر بطور سکریٹری اردو اکادمی عالیجناب جگ موہن صاحب ہی نے فرمایا تھا۔

تقریباً ایک سال جگ موہن صاحب گوا کے لفٹننٹ گورنر رہے اور انھیں پھر دلی کا لفٹننٹ گورنر مقرر کیا گیا۔ کیونکہ دلی اور دلی والوں کے مزاج کی پہچان جس قدر جگ موہن صاحب کو ہے جناب سندر لال صاحب کھورانہ کو نہیں تھی۔ دلی والے جانتے ہیں کہ دلی کی نشاۃ ثانیہ میں جناب جگ موہن صاحب کا رول نمایاں رہا ہے لہٰذا انھوں نے دوسری بار دلی کی گورنری سنبھالتے ہی اپنی روایات کو شدت کے ساتھ دُہرانا شروع کر دیا اور اب کی بار ان کا نشانہ صرف دلی کو خوبصورت بنانے یا مزید رہائشی مکانات کی تعمیر ہی نہ رہا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اردو، ہندی، پنجابی اکادمیوں اور دیگر متعدد شعبوں میں بھی دل و جان سے دلچسپی لی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ ادارے نہ صرف فعال بن کر مفید کارنامے سرانجام دینے لگے بلکہ ان کی حیثیت مثالی بن گئی۔

ہمارا زیر نظر مقالہ محض اردو اکادمی کی کارگزاریوں تک ہی محدود ہے لہٰذا اس ضمن میں دلی کے لفٹننٹ گورنر جناب جگ موہن صاحب، دلی کے میٹروپالیٹن چیف ایگزیکٹو کونسلر جناب جگ پرویش چندر اور جناب کلانند بھارتی ایگزیکٹو کونسلر برائے تعلیم یقیناً ستائش کے قابل ہیں جنھوں نے اردو اکادمی کے بجٹ کو اتنی تقویت بخشی کہ دلی اردو اکادمی بھی فخر کے ساتھ اپنے وجود کا اظہار کر سکے۔ دلی اسٹیٹ کے اردو پڑھنے والے طلباء کے مختلف درجوں میں مناسب ٹیسٹ لینے کے بعد ہونہار طلباء کو وظائف دیئے گئے جس سے اردو کے طلباء و طالبات میں اردو کی تعلیم حاصل کرنے کا حوصلہ ہوا اور آج جس انداز سے دیکھا گیا کہ اردو پڑھنے والے طلباء میں بلند حوصلگی کے ساتھ ساتھ اردو پڑھنے کا والہانہ شوق و ذوق دیکھا جا رہا ہے وہ صرف اردو اکادمی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اردو پڑھنے والے متعلمین اور معلمات میں بھی ایک نیا جذبہ پیدا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں اردو اکادمی تجاویز پر عمل پیرا ہونے کے لئے پر تول رہی ہے لہٰذا اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دلی میں اردو پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ اردو اکادمی کی صدق دلانہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ایسی کوششیں دیگر پردیشوں کی اردو اکادمیوں نے بھی کی مگر محض تنخواہ حاصل کرنے یا دکھاوے کا معاملہ اور ہوتا ہے اور دلی لگن کا معاملہ اور ہوتا ہے۔ دلی اردو اکادمی کے سکریٹری اردو اکادمی سے تنخواہ نہیں پاتے بلکہ انھیں تنخواہ اُن کی مستقل ملازمت کے سلسلے میں دوسرے محکمہ سرکار سے ملتی ہے اور وہ اردو اکادمی کا کام آنریری کرتے ہیں اور اسی دلی لگن سے کرتے ہیں کہ آج دلی کے اسکولوں میں اردو پڑھنے والے ہر طالب علم اور طالبہ اور اردو پڑھانے والے معلمین و معلمات سب کے سب نقوی صاحب کے شکر گزار ہیں کہ ان کی

کوششوں سے اردو کے ذریعے معلم و معلمات کو ملازم رکھا جا رہا ہے اور جن اسکولوں میں اردو پڑھنے والے طلباء کو ٹرخا دیا جاتا تھا اب وہاں باقاعدہ اردو پڑھانے کے لئے کلاسیں لگتی ہیں۔ یہ انعام و مصنفین کو کتابوں پر انعامات اور دیگر خرچات محض دکھاوے کی باتیں ہیں اصل ضرورت تو اردو پڑھانے اور پڑھنے والوں کی ہے یعنی جو اردو کی بقا و حیات کے لئے اصل بنیاد ہے اور دلی اردو اکادمی نے اردو کی اس بنیادی ضرورت پر یقیناً دھیان دیا ہے اور اس کا ثبوت ہمارے سامنے ہے۔

اس سال جشنِ جمہوریت کے موقع پر لال قلعہ کا اردو مشاعرہ کا انتظام بھی حکومتِ دلی کے محکمہ ساہتیہ پریشد نے اردو اکادمی کو سونپ دیا تھا۔ مشاعرے کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا حال شانِ ہند کے زیر نظر شمارہ میں ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے۔ مشاعرہ بحیثیت مجموعی برا نہیں رہا مگر جو خامیاں رہ گئی تھیں وہ یقیناً ممبران مشاعرہ کمیٹی کی ذاتی پسند دوست نوازی اور غلط نوازی کی وجہ سے ظہور پذیر ہوئیں سکریٹری اردو اکادمی اس سلسلے میں بے بس نظر آئے۔

اردو اکادمی نے نواب خواجہ محمد شفیع صاحب کی دلی تشریف آوری کے موقع پر ان کے استقبال کے لئے ایک تقریب کا انتظام کیا۔ جس میں ان شعراء کو بھی مدعو کیا گیا جو لال قلعہ کے مشاعرہ میں مدعو نہ کئے جانے کے باعث ناراض تھے کہا جاتا ہے کہ جب لال قلعہ کے مشاعرہ کے لئے شعراء کا انتخاب کیا گیا تو اس وقت کنور مہندر سنگھ بیدی سحر صاحب پاکستان گئے ہوئے تھے۔ لہذا کوشش کی گئی کہ کنور صاحب کے گروپ کے شعراء کو لال قلعہ کے مشاعرہ میں مدعو نہ کیا جائے لہذا دوسرے الفاظ میں یہ ایک ایسی کمپنسیٹری محفلِ مشاعرہ تھی جس میں ان ناراض شعراء کو دو دو صد روپئے دے کر ان کا آدھا غم غلط کیا گیا۔ ویسے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ نواب خواجہ شفیع کے اعزاز میں دہلی میں جتنی بھی تقریبات ہوئیں ان سب میں اردو اکادمی کی یہ تقریب بہت زیادہ کامیاب رہی۔

اردو اکادمی نے ہائر سیکنڈری اسکولوں میں پچیس لائبریریاں قائم کی ہیں اور جیسا کہ لفٹننٹ گورنر صاحب نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ ایسی ساٹھ لائبریریاں کھولنے کی اسکیم ہے لہذا اس سال اردو اکادمی مزید لائبریریاں بھی کھولنے کی اسکیم بنائے ہوئے ہے۔ ان لائبریریوں کے لئے جن کتابوں کی ۲۵-۲۵ جلدیں خریدی گئی ہیں ان کا انتخاب یقیناً جانبداری سے کیا گیا ہے۔ اردو اکادمی کے دفتر میں بھی ایک لائبریری کھولی گئی ہے پچیس پچیس کتب کی خریداری اور مرکزی لائبریری کے لئے کتب کی خریداری میں یقینی طور پر خامیاں اردو اکادمی سے ہوئی ہیں جن کی تفصیل میں جانا اس لئے اچھا نہیں لگتا کہ شانِ ہند کا مکتبہ ہے اور مکتبہ شانِ ہند میں فروختگی کے لئے اردو کتب کا جو ذخیرہ موجود ہے ویسا بہترین انتخاب ہندوستان کی کسی ایک دوکاندار کے ہاں نہیں ہے یہاں تک کہ مکتبہ جامعہ اور دلی کے دوسرے ادارے بھی مکتبہ شانِ ہند سے اپنی ضروریات کتب پوری کرتے ہیں۔

دلی اردو اکادمی نے ۱۹۸۲ء کی مطبوعات پر مصنفین کو دو دو ہزار روپئے کے انعامات دیئے ہیں بے شک یہ انعامات موزوں اور مناسب کتابوں پر دیئے گئے ہوں گے مگر اعلیٰ معیار یہ تقاضا کرتا ہے کہ کتابوں پر انعام بغیر کتابیں پڑھے نہیں دیا جانا چاہیئے۔

اردو اکادمی نے ۱۹۸۲ء اور ۱۹۸۳ء کے جو ایوارڈ دیے ہیں وہ واقعی مستحق احباب کو دیئے گئے ہیں مگر ڈاکٹر نثار احمد صاحب ایک متنازعہ شخصیت ہیں ان پر نسخۂ عرشی کے بارے میں جو الزامات لگائے گئے ہیں ان کے بارے میں پارلیمنٹ میں معاملہ اٹھایا گیا تھا اور سی۔ بی۔ آئی تک تحقیقات کئے جانے کے احکام جاری ہوئے تھے۔ اب تو کھلے بندوں کچھ لوگ بھی کہنے لگے ہیں کہ ڈاکٹر نثار فاروقی کو نسخۂ عرشی پاکستان لے جانے کا جو معاوضہ ملا وہ روپیہ ہندوستان کس ذریعہ سے آیا اس کی بھی نشاندہی سچی یا سنی سنائی باتوں کی

...یا جا رہی ہے۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے ان الزامات کی تردید آج تک نہیں کی حالانکہ اگر کسی پر کوئی جھوٹا الزام لگایا جاتا ہو تو اسے تردید یا صحیح حالات بیان کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ کسی الزامی مسئلے پر خاموش رہنا الزام کو تسلیم کر لینے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا ایسی متنازعہ شخصیت کو ایوارڈ دینا اردو اکاڈمی کا یہ فعل مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ جب ایوارڈ کمیٹی میں ڈاکٹر نثار فاروقی کا نام پیش ہوا تو یہ نسخۂ عرشی کی چوری میں ڈاکٹر نثار صاحب کے ملوث ہونے کا ذکر آیا جس پر کسی معزز ممبر نے یہ دلیل پیش کی کہ جناب سردار جعفری نے کہا تھا کہ اگر چین ہندوستان میں آجائے تو وہ اس کی حکومت کو تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کریں گے اسے کہتے ہیں "مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ" سردار جعفری صاحب نے اگر ایسا کہا تھا تو وہ ایک مفروضہ کے بارے میں کہہ رہے ہیں۔ مگر یہاں تو ایک واقعہ کے بارے میں ذکر ہو رہا ہے اور اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ یہ چوری ہوئی اور ملک کا قومی سرمایہ سمگل کیا گیا۔ غالباً اردو اکاڈمی کے سکریٹری صاحب اور ایوارڈ کمیٹی کے ممبران نے [illegible] ایڈمنسٹریشن کے سربراہ جناب لفٹننٹ گورنر صاحب کو اس معاملہ سے بے خبر رکھا تاہم اکاڈمی اور ایوارڈ کمیٹی کے ممبران نے نثار صاحب کو یہ ایوارڈ دے کر ملک پرستی کے صحیح جذبہ کو ٹھیس پہنچائی ہے

جناب دھرم پال گپتا وفا قابلِ صد مبارکباد ہیں جنھوں نے ایوارڈ کی پوری رقم اردو پڑھنے والے اسکولی بچوں کو وظائف دینے کے لئے اکاڈمی کو واپس کر دی۔ اردو کے مرحوم شعرا ادیبوں اور صحافیوں کی بیواؤں کو جو امدادی رقوم دی گئی ہیں وہ بھی اکاڈمی کا ایک مستحسن قدم ہے اور اردو کے بعض شعراء اور ادیبوں کو امدادی رقوم دی گئی ہیں اُن کے بارے میں بھی اکاڈمی کی تعریف کی جانی چاہیئے مگر اکاڈمی کے عہدیداران اور ممبران کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اردو سب کی زبان ہے اور اگر وہ ایسا سمجھتے ہیں تو کیا وہ بتا سکیں گے کہ اردو کے عیسائی شعراء اور ادیب اکاڈمی کی نظرِ کرم سے کیوں اوجھل ہیں یا تو اکاڈمی کے ممبران اور عہدیداران اردو کے عیسائی جاں نثاروں سے واقفیت ہی نہیں رکھتے اور یا پھر اُن کی چشم پوشی کسی خاص وجہ سے ہے۔ حال ہی ایک عیسائی اُستاد شاعر جناب مورخ زیبائی کس مپرسی کے عالم میں ایک سال متواتر بیمار رہ کر دم توڑ گیا۔ مگر اکاڈمی نے نہ تو علالت کے عالم میں اُس اُستاد شاعر کی خبر لی اور نہ اُس کے انتقال پر اُس کی بیوہ کے یہاں آنسو پونچھنے کی کوشش کی۔ اکاڈمی کے ذمہ دار حضرات کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ خان نمازی کابلی سیاسی طور پر ایک ایسے صحافی ہیں جو پاکستان بننے کے بعد ہندوستان چلے آئے۔

خان عبدالغفار خاں سرحدی گاندھی کا یہ جاں نثار سپاہی ایک عرصہ سے بیمار ہے مگر اس کی مالی مدد نہ جانے اکاڈمی نے کیوں نہیں کی۔ صحافت کے زمرہ میں جناب جمنا داس اختر کا پلڑہ کافی وزنی ہے مگر انھیں بھی بھلا دیا گیا ہے۔ جبکہ وہ ایک عرصہ سے علیل چلے آرہے ہیں۔ جناب بخشی اختر امرتسری ایک عرصہ سے علیل ہیں اور پچھتر سال کی عمر میں اور علالت کے باوجود سیکڑوں شعرائے کرام کو اپنے مفید مشوروں سے نواز رہے ہیں اکاڈمی کو یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ حضرت طالب چکوالی جنکی عمر اس وقت اسی سال سے تجاوز کر چکی ہے اردو شاعری میں اُستادانہ مقام رکھتے ہیں۔ گلزار دہلوی صاحب جدید دور کا آصف علی ہے اور اس کی اردو خدمات کا اعتراف نہ کرنا۔ اردو اکاڈمی کو زیب نہیں دیتا۔ اردو اکاڈمی نے ۱۹۸۴ء کے اردو کتابیں شائع کرنے والے دو اداروں مکتبہ جامعہ اور مکتبہ شانِ ہند کو دو دو ہزار روپئے کا ایوارڈ دیا ہے اس میں کوئی شک کہ مکتبہ جامعہ اس ضمن میں انعام کا مستحق ہے البتہ مکتبہ شانِ ہند کو اس زمرہ میں انعام دیئے جانے پر کچھ حضرات کے پیٹ میں مروڑ ہی نہیں اُن کے دل و

دماغ میں کینسر کے جراثیم پلنے لگے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مکتبہ شانِ ہند نے ۱۹۸۲ء میں ہندی کے مسلمان شعراء ایک کتاب شائع کرکے ہندوستانی مسلمانوں کا سر اونچا کردیا ہے کہ ہندی زبان اور ہندی شاعری کے مقابلے میں ہندوستان کے مسلمان اپنے برادرانِ وطن سے کوسوں آگے رہے ہیں۔ اس کتاب پر بنگال اردو اکاڈمی نے دو ہزار روپے اور بہار اردو اکاڈمی نے تین ہزار روپے کا انعام دیا اور اب دلی اردو اکاڈمی نے اس کتاب کو موضوع اور معیار کے لحاظ سے ایک اعلیٰ ترین تصنیف قرار دیتے ہوئے اس کے ناشر مکتبہ شانِ ہند کو دو ہزار روپے کا ایوارڈ دیا۔ اس سلسلے میں صرف اردو اکاڈمی اتر پردیش کی ۱۹۸۳ء کی مطبوعات پر انعامی فیصلہ کرنے والی کمیٹی کے بعض ممبران نے اس کتاب کو انعامی مقابلہ سے محض اس بناء پر کہ یہ کتاب مکتبہ شانِ ہند نے شائع کی ہے باہر کردیا کیونکہ شانِ ہند کو یہ حضرات اپنا مخالف سمجھتے تھے تاہم بنگال اور بہار کی اردو اکاڈمیوں کے بعد دلی اردو اکاڈمی نے بھی ان حضرات کے منہ پر کالک پوت دی کہ محض تعصب کی بناء پر اس بہترین کتاب کو اتر پردیش اردو اکاڈمی کے ان بعض ممبران نے اپنی ذاتی دشمنی پر قربان کردیا ۱۹۸۳ء میں بھی مکتبہ شانِ ہند نے سرمایۂ بلاغت شائع کرکے اردو کے تمام اشاعتی اداروں میں اپنا نام روشن کیا ہے مکتبہ شانِ ہند کو ایوارڈ دے کر اردو اکاڈمی نے اپنی نیک نامی کرائی ہے کہ ان کا یہ فیصلہ ہر لحاظ سے حق بحق داد کا مستحق تھا۔ حال ہی میں اردو اکاڈمی نے "دلی کی تہذیب" پر ایک روزہ سیمینار کیا جس کے افتتاحی اجلاس میں ایوانِ غالب میں اتنی بھیڑ دیکھنے میں کبھی نہیں آئی۔ یہ بھیڑ جناب شریف الحسن صاحب نقوی کے دماغ کی اپج کے کارن پہلے خواجہ محمد شفیع صاحب کی استقبالیہ تقریب میں اور اب اس ایک روزہ سیمینار میں دیکھنے میں آئی۔ نقوی صاحب ایسی تقاریب میں ہاؤس فل کرنے کے لئے اردو میڈیم اسکولوں میں چھٹی کرا دیتے ہیں۔ اور تمام طالب علموں اور طالبات نیز معلمین و معلمات کو ایسی تقاریب میں حاضر رہنے کا حکم دے دیتے ہیں۔ ایسا کرنا مناسب نہیں۔ فروری مارچ کا مہینہ بچوں کی تعلیم کے دن ہوتے ہیں لہٰذا انھیں اس قسم کی تقاریب کے لئے اسکول سے چھٹی نہیں کرانی چاہئے اور ویسے بھی سوچا جائے تو خواجہ محمد شفیع صاحب کے استقبالیہ اور "دلی کی تہذیب" پر سیمینار کے لئے بچوں کی تعداد میں ہاؤس فل بے شک ایل۔ جی صاحب اور جگ پرویش چندر صاحب پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ جبکہ جگ پرویش چندر صاحب کی تقریر پر بھی بچے اپنی اپنی باتوں میں مشغول تھے۔

لال قلعہ کے مشاعرہ خواجہ محمد شفیع صاحب کے استقبالیہ اور ایک روزہ سیمینار اور جلسۂ تقسیم ایوارڈ پر پھولوں کے گلدستوں اور اکاڈمی کے ممبران و والنٹیرز کے لئے خصوصی ریشمی بلوں پر جو اخراجات ہوئے اس رقم سے یقیناً کسی مستحق علیل شاعر کو چھ ماہ تک وظیفہ دیا جا سکتا تھا۔ یا دو طالب علموں کی سال بھر کی تعلیم کے اخراجات پورے ہو سکتے تھے۔ عوامی روپئے کو ایسے الٹے تلٹے اخراجات پر برباد نہیں کرنا چاہئے۔ ایل۔ جی اور جگ پرویش چندر پر منوں پھول نچھاور ہو چکے ہیں۔ انھیں پھولوں کے گلدستوں کی بجائے یقیناً بہترین کارکردگی سے خوشی ہوگی۔

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر۔

سرور تونسوی

اخبار "الامان" دہلی کے ایڈیٹر کا قتل ہوا تو مشہور کانگریسی کارکن منشی عبدالقدیر صاحب کا نام بھی مسلم لیگیوں نے فائلوں میں لکھوا دیا۔ چنانچہ الف۔ آئی۔ آر کے مطابق جب نامزد اشخاص کی باقاعدہ گرفتاری ہوئی تو منشی عبدالقدیر صاحب کو بھی کوچہ چیلاں سے اُن کے مکان سے گرفتار کر لیا گیا۔ اہلِ محلہ اور دہلی کے تمام کانگریسی کارکن جانتے تھے کہ منشی عبدالقدیر پر سراسر یہ بہتان ہے اور وہ کسی کو قتل کرنا تو درکنار کسی سے سخت کلامی سے بھی پیش نہیں آتے تھے

اُن دنوں ملتان سے میرا دہلی آنا اکثر ہوتا رہتا تھا حالی پبلیشنگ ہاؤس اُردو بازار کے دو مالکان تھے خالد صاحب اور بدر صاحب خالد صاحب منشی عبدالقدیر صاحب کے فرزندِ ارجمند تھے۔ دہلی کے اُردو اداروں کی تمام کتابیں میں حالی پبلیشنگ ہاؤس سے ہی خریدتا تھا۔ اس لئے خالد صاحب اور بدر صاحب دونوں سے خاصے دوستانہ تعلقات تھے اور خالد صاحب نے ہی اپنے والدِ محترم جناب منشی عبدالقدیر صاحب سے مجھے متعارف کرایا تھا۔ منشی صاحب بہترین خوشنویس (دہلی کے سب سے بہترین خوشنویس یوسف صاحب اُن کے چھوٹے بھائی تھے) اور ایک اچھے عالم تھے اور کٹر کانگریسی تھے۔ منشی صاحب کے سر کے اور داڑھی کے بال بڑھے ہوئے تھے اور وہ پگڑی باندھتے تھے لہٰذا انھیں اکثر سکھ مسلمان کہا جاتا تھا۔

منشی عبدالقدیر کے احباب اور اُن سے محبت کرنے والوں کا دہلی میں بہت بڑا حلقہ تھا اور اس حلقہ میں سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست بھی شامل تھے چنانچہ سردار دیوان سنگھ مفتون منشی عبدالقدیر صاحب کی ناحق گرفتاری اور قتل کے جھوٹے الزام سے بڑے پریشان تھے اور چاہتے تھے کہ سچ کا بول بالا ہو۔ مگر اُن دنوں مسلم لیگ کا زور تھا اور وہ ہر قیمت پر جھوٹی شہادتوں سے منشی جی کو تختۂ دار پر چڑھانے کی تیاریاں کر رہے تھے جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا۔ سردار دیوان سنگھ کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ کرنا خدا کا کیا ہوا کہ جب مقدمہ ابتدائی عدالت سے چالان ہو کر جس سیشن کورٹ میں گیا وہ سیشن جج اخبار ریاست اور سردار دیوان سنگھ مفتون کا بڑا مداح تھا۔ مگر نہ تو کوئی سیشن جج اپنی عدالت میں کسی زیرِ سماعت مقدمہ میں اپنے بڑے سے بڑے دوست کی سفارش مان سکتا ہے اور نہ ہی سردار دیوان سنگھ مفتون ایسے آدمی تھے کہ ایسی حماقت کرتے۔

سیشن کورٹ میں مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی تھی اور دو تین پیشیاں ہو بھی چکی تھیں یعنی منشی عبدالقدیر کو پھانسی پر لٹکائے جانے کے دن قریب آتے جا رہے تھے اور سردار دیوان سنگھ مفتون کی راتوں کی نیند اُڑ گئی تھی۔ اس لئے نہیں کہ اُن کا دوست پھانسی پا جائیگا اس لئے کہ ایک بے گناہ کو سیاسی مخالفت کی بنا پر جھوٹے الزام میں پھنسا کر پھانسی کا کھیل کھیلا جا رہا تھا جس سے ایک بے گناہ کو پھانسی ہو سکتی تھی۔ بڑے غور و خوض کے بعد سردار صاحب نے اُن سیشن جج اور اُن کی بیوی کو اپنے ہاں کھانے پر بلایا اور سیشن جج صاحب وقت مقررہ پر سردار صاحب کے یہاں تشریف لے آئے کھانے سے پہلے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ دلّی کے موسم اور [illegible]

بھی سردار صاحب نے کھانے پر بلایا ہوا تھا لہٰذا خوش گپیاں ہوتی رہیں اور کھانے کی میز پر ہی ایک صاحب نے (جسے سردار صاحب نے پہلے ہی کہہ رکھا تھا) سردار صاحب سے دریافت کیا۔ سردار صاحب وہ منشی صاحب کے مقدمہ میں آپ کس کی گواہی ہوئی ہے۔ سردار صاحب نے بڑی بے اعتنائی سے فرمایا کہ بھائی: تو سیاسی مقدمہ ہے مسلم لیگ والے ایک شریف اور غریب کانگریس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور باتوں باتوں میں سارے واقعات کا پس منظر بیان کر گئے۔ احباب اور سیشن جج صاحب کھانا بھی کھاتے رہے اور باتیں بھی ہوتی رہیں۔ مگر سیشن جج صاحب بات چیت میں کسی قسم کی غلط اندازی کے بغیر بڑے غور سے سب کی باتیں سنتے رہے اور بظاہر چھری کانٹے کو پوری طرح سے کام میں لاتے رہے۔ جونہی سردار صاحب اور دوسرے دوستوں نے اس بات پر انتہائی افسوس کیا کہ ایک بے گناہ پھانسی پر چڑھ جائے گا۔ تو سیشن جج صاحب چونکے اور کہنے لگے یہ کیس تو میری عدالت میں ہے۔ اس پر سب چپ ہو گئے اور سردار صاحب نے معذرت کی کہ انھیں یہ قطعاً معلوم نہ تھا کہ اس مقدمہ کی سماعت آپ کی عدالت میں ہو رہی ہے اس پر سیشن جج صاحب نے فرمایا کہ کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں بلکہ آپ لوگوں کی بات چیت سے میں چوکنا ہو گیا ہوں کہ کوئی بے گناہ نہ مارا جائے۔ مقدمہ کئی ماہ تک چلتا رہا۔ اور آخر کار جب فیصلہ ہوا تو منشی عبدالقدیر صاحب کو باعزت بری کیا گیا۔ اور سیشن جج نے ایسا مدلل فیصلہ لکھا کہ اپیل میں بھی منشی عبدالقدیر صاحب کا بال بیکا نہ ہو سکا۔ ۱۹۴۷ء کے [illegible] کے بعد جب میں دہلی آیا تو ہر روز منشی عبدالقدیر صاحب سے سردار دیوان سنگھ صاحب مفتون کے ہاں ملاقات ہوتی تھی اور انھوں نے ہی سوئی والان میں اپنی ذمہ داری پر مجھے مکان دلایا۔ منشی عبدالقدیر صاحب واقعی سکھ نظر آتے تھے اور ۱۹۴۷ء کی خون ریزی میں بھی وہ ہر گلی محلے میں پھرتے رہے اور انھوں نے دلی کے مسلمانوں کی ہر طرح سے مدد کی اور اس کے ساتھ ساتھ پاکستان سے آنے والے ہندو شرنارتھیوں کے بسانے میں بھی پورا پورا تعاون دیا۔

منشی عبدالقدیر صاحب ایسے مرنجان مرنج۔ شریف خلیق اور ہر کسی کے کام آنے والے بے غرض انسان اب دنیا میں نظر نہیں آتے۔ کچھ عرصہ ہوا کہ منشی جی کا انتقال ہوا مگر ان کی فرشتہ صورت اب بھی آنکھوں کے سامنے ہے

رہے نام اللہ کا۔

گوشۂ عقیل صدیقی

مشاعرۂ جشنِ جمہوریت لال قلعہ

سرور تونسوی

ہر سال جشنِ جمہوریت کے مبارک موقع پر ایک کل ہند مشاعرہ دلّی کے لال قلعہ میں منعقد کیا جاتا ہے بتیس سال سے میں نے اس مشاعرہ کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سُنا حال لکھنا محض اس وجہ سے چھوڑ دیا تھا کہ مشاعرہ میں حب الوطنی۔ قومی یک جہتی۔ اخوت اور قوم پرستی کی بجائے محض عشقیہ کلام ہی سُنایا اور پسند کیا جاتا ہے۔ اگر کسی شاعر نے موقع مناسبت کے لحاظ سے کلام سُنانے کی کوشش کی تو اسے ہُوٹ ہونا پڑتا۔ دوسرے مدعو شعرائے کرام ہر سال وہی کلام سُناتے جو وہ اپنے شاعرانہ وجُود کے ظہور پذیر ہونے سے اب تک سُناتے آئے ہیں۔ تیسرے اس لئے کہ مشاعرہ کمیٹی کے ممبران ایسے شعراء کو بُلانے میں دلچسپی رکھتے جو انھیں ذاتی طور پر یا ذاتی اغراض کی وجہ سے پسند ہوتے۔ اس کا خیال قطعاً نہ رکھا جاتا تھا کہ عوام کن شاعروں کو پسند کرتے ہیں

اس سال چونکہ حکومت دہلی کا ساہتیہ پریشد یہ مشاعرہ اُردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام کر رہا تھا۔ اور مشاعرہ کمیٹی میں کچھ نیا خون بھی شامل کیا گیا ہے لہٰذا اُمید کی جاسکتی تھی کہ مشاعرہ بہتر انداز میں ہوگا۔ چنانچہ دلّی اُردو اکادمی کے سکریٹری جناب نقوی صاحب کے فرمان پر وعدہ کر لیا تھا کہ مشاعرہ کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سُنا حال لکھوں گا۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ حالت پہلے سے بہتر نہ تھی۔ اگر ایک ممبر مشاعرہ کمیٹی نے کسی شاعر کا نام پیش کیا تو دوسرے نے اس کے مقابلے میں اپنے پسندیدہ شاعر کا نام پیش کر دیا۔ پہلے تو یہ مشہور تھا کہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کے مجوزہ شعراء کو زیادہ تر مدعو کیا جاتا ہے مگر اس مرتبہ تو وہ دہلی میں نہیں تھے اور اُن کی غیر موجودگی میں شعراء کی فہرست ترتیب دی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ رفعت سروش صاحب نے ہر ایسے نئے شاعر کو بُلانے کی مخالفت کی جنھیں وہ پسند نہ کرتے تھے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ خود اُن شعراء کی مقبولیت سے گھبراتے تھے اور رفعت سروش میں یہ جراثیم کچھ زیادہ ہی سرایت کئے ہوئے ہیں کہ اُن سے آگے بڑھ جانے یا مقبولیت پانے والے شاعر کو نہ بلایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ش۔ ک۔ نظام (جودھپور) اور جناب گوہر عثمانی (مُرادآباد) کے اسمائے گرامی کی سخت ترین مخالفت کی۔ اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ش ک نظام اس کم عمری میں بھی رفعت سروش کے مقابلہ میں ہر مشاعرہ میں زیادہ داد پاتا ہے اور گوہر عثمانی کی مقبولیت کا عالم وہ انجمن عروجِ ادب کے سالانہ مشاعرہ میں دیکھ چکے تھے۔ جس میں کہ عالیجناب راشٹرپتی صاحب بھی موجود تھے۔ تاہم اس بار ۴۵ شاعروں کا جم غفیر مدعو کیا گیا۔ جس میں سے ۳۷ شعرائے کرام تشریف لائے۔ مشاعرہ کمیٹی نے مقامی شعراء میں جناب ساحرؔ ہوشیارپوری۔ جناب محمود سعیدی۔ جناب گلزار دہلوی ایسے شعراء کو نہ بُلا کر کسی ہوشمندی کا ثبوت نہیں دیا۔ یہ تو بھلا ہو چیف کونسلر جناب جگ پرویش چندر صاحب کا کہ جنھوں نے مدعو شعراء کی فہرست میں گلزار دہلوی کا نام نہ پاکر منتظمین کے سامنے اپنی حیرت کا اظہار فرمایا۔ لہٰذا گلزار صاحب کو بعد میں مدعو کیا گیا۔ گلزار صاحب میں لاکھ بُرائیاں ہوں گی۔ مگر موجودہ

دلّی کا یہ اضعف عمل ہے۔ اس نے دلّی میں اردو کے لئے جو کچھ کیا ہے اُسے تسلیم نہ کرنا ستم ظریفی ہے۔ کیا مذاق ہے کہ آل انڈیا ریڈیو ملکی زبانوں کے مشاعرہ میں اردو زبان کے نمائندے شاعر کی حیثیت سے جس مخمور سعیدی کا انتخاب کرتا ہے اُسے لال قلعہ کے مشاعرہ کمیٹی کے ممبران مدعو نہیں کرتے۔ ساحر صاحب ہوشیارپوری کو اس قصور کا سعودی کتنی گروہ پرانے ہو گئے ہیں۔ بہرکیف کچھ بھی ہو اردو اکادمی دلّی نے اپنی طرف سے ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ البتہ اردو اکادمی کے کارکنان تک یہ آواز پہنچ سکے تو عرض کروں گا کہ آئندہ اگر وہ حسب ذیل تجاویز پر غور کرے تو یہ مشاعرہ پھر اپنی مثال آپ بن سکتا ہے۔

۱۔ مشاعرہ کمیٹی کا کسی بھی شاعر کو ممبر نہ بنایا جائے۔ اور اگر کسی شاعر کا ممبر بنایا جانا ناگزیر ہو تو اُسے مشاعرہ میں کلام سنانے کی اجازت نہ ہو۔ جیسا کہ شروع شروع میں ایسا کیا گیا۔ یہاں تک کہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور جناب ساحر ہوشیارپوری نے مشاعرہ میں کلام نہ سنایا۔ کیوں کہ یہ دونوں حضرات مشاعرہ کمیٹی کے صدر اور جنرل سکریٹری تھے۔

۲۔ مدعو شدہ شعرائے کرام کی تعداد کسی بھی حالت میں ۲۵ سے زیادہ نہ ہو۔ تاکہ موضوع کے لحاظ سے ایک دَور ہو سکے اور دوسرا دَور غزلیات کا ہو۔ بلکہ ہر شاعر پہلے موضوع پر کلام سنائے اور اس کے بعد غزل سنائے۔

۳۔ مقامی شعراء زیادہ سے زیادہ پانچ لئے جائیں۔ کیونکہ عوام مقامی شعراء کو ہر وقت سنتے ہی رہتے ہیں۔ اس لئے ایسے اجتماع میں مقامی شعراء کو زیادہ تعداد میں برداشت نہیں کیا جاتا اور مقامی شعراء کو ہوٹ کیا جاتا ہے جس مشاعرہ اکثر و بیشتر مقامی شعراء کے مائک پر آتے ہی ڈانواں ڈول ہونے لگتا ہے۔

۴۔ ہندوستان کے ہر پردیش کو اس مشاعرے میں نمائندگی دی جائے۔ بنگال۔ بہار۔ مدراس۔ آندھرا۔ مدھیہ پردیش مہاراشٹرا اور دیگر پردیشوں کے شعراء نے کونسا گناہ کیا ہے کہ انھیں اس قومی مشاعرے میں نہ بلایا جائے۔ اگر مشاعرہ کمیٹی کے ارکان ذرا محنت سے کام لیں تو انھیں ہر پردیش میں اردو کے بہترین شاعر دستیاب ہو سکتے ہیں۔

۵۔ مشاعرہ کمیٹی جب شاعروں کا انتخاب کرے تو ایسے چند ایکسپرٹ حضرات کو بھی میٹنگ میں شریک کرے جو مشاعروں اور شاعروں کے بابت کمیٹی کے اکثر ممبران سے کہیں زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان کی رائے سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے۔

۶۔ مشاعرہ کمیٹی کو چاہئے کہ شاعروں کو دعوت نامہ بھجواتے وقت یہ صاف طور پر لکھ دے کہ انھیں قوم پرستی وطن پرستی۔ اتحاد پرستی وغیرہ پر چند اشعار ضروری سنانے ہوں گے۔

۷۔ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے سامعین کے ذہن نشین کرا دیا جائے کہ مشاعرہ جشنِ جمہوریت کے سلسلہ میں ہو رہا ہے لہٰذا موضوع کے لحاظ سے شعراء حضرات کچھ اشعار ضرور سنائیں گے اور بعدہٗ غزلیات سنائیں گے لہٰذا کسی قسم کا شور و شر کئے بغیر اطمینان سے قوم پرستانہ اشعار سنئے اور اس پر بھی اگر سامعین کا کوئی گروہ شور و شر کرتا ہے تو اسے یقیناً ملک دشمن سمجھا جائے اور ایسے حضرات کو اس پر سرزنش کرتے ہوئے اعلان کیا جائے کہ اس کا یہ فعل ملک دشمنانہ ہے۔ اُمید ہے کہ اردو اکادمی دہلی آئندہ ان مشوروں پر عمل کرے گی تاکہ لال قلعہ کا مشاعرہ مثالی مشاعرہ بن سکے۔ آئیے اب اس سال کے مشاعرۂ جشنِ جمہوریت لال قلعہ کا آنکھوں دیکھا کانوں سنا حال ملاحظہ فرمائیے۔

(سرور تونسوی)

آج ۲۶ جنوری سنہ [illegible] جشن دار ہے۔ لال قلعہ میں جشن جمہوریت کے مشاعرہ کے لئے اسٹیج کو خوب سجایا گیا ہے۔ مگر اسٹیج پر روشنی اس قدر زیادہ ہے کہ اسٹیج پر بیٹھنے والوں کو سامعین نظر نہیں آرہے ہیں۔ پنڈال میں روشنی بہت ہی کم ہے۔ اسٹیج اور پنڈال بنانے والے حضرات کو چاہیے کہ آئندہ ان باتوں کا خاص خیال رکھیں کہ اسٹیج پر بیٹھنے والوں خصوصاً جو شاعر کلام سنا رہا ہو اُسے سامعین بخوبی نظر آسکیں۔ اسٹیج پر روشنی کا موجودہ نظام کسی ڈانس پروگرام کے لئے تو ٹھیک ہے مگر مشاعرہ کے لئے قطعاً نامناسب ہے

ساڑھے آٹھ بجے لفٹننٹ گورنر جناب جگ موہن صاحب چیف میٹروپالیٹن کونسلر جناب جگ پرویش چندر صاحب جناب گوئل صاحب چیرمین میٹروپالیٹن کونسل اور جناب گلزار جی بھارتی تشریف لائے ہیں، استقبالیہ کمیٹی کے ارکان اور دیگر معززین نے ان سب کا استقبال کیا ہے۔ آٹھ بجکر چالیس منٹ پر جناب نقوی صاحب سکریٹری اردو اکادمی دہلی مائک پر تشریف لائے ہیں فرما رہے ہیں عالیجناب ایل۔ جی صاحب۔ عالیجناب چیف میٹروپالیٹن کونسلر۔ عالیجناب چیرمین صاحب میٹروپالیٹن کونسل عالیجناب بھارتی جی مدعو شعرائے کرام اکادمی کے ممبر حضرات ہمارے سامعین۔ ہمارے ساتھی۔ دہلی انتظامیہ کے دیگر حضرات مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ آپ کے سامنے یوم جمہوریت کے مبارک موقع پر دہلی انتظامیہ کا ساہتیہ کلا پریشد اور دہلی اردو اکادمی مشاعرہ کا پروگرام پیش کر رہے ہیں۔ میں چاہونگا کہ حسب دستور پروگرام گلپوشی سے شروع ہو۔ لہٰذا جناب انور دہلوی صاحب۔ عالیجناب لفٹننٹ گورنر صاحب کی گلپوشی فرمائیں گے۔ انور صاحب نے ایل۔ جی صاحب کو گلدستہ پیش کیا ہے۔ جناب ڈاکٹر صلاح الدین صاحب نے چیف ایگزیکیٹو کونسلر ڈاکٹر کامل قزلباش صاحب نے بھارتی صاحب کو گلدستہ پیش کئے تو نقوی صاحب فرمانے لگے کہ اب میں کنور مہندر سنگھ بیدی ساحر سے درخواست کر رہا ہوں کہ چیرمین صاحب میٹروپالیٹن کونسل جناب پرشوتم گوئل صاحب کی گلپوشی فرمائیں۔ لہٰذا کنور صاحب نے گوئل صاحب کو گلدستہ پیش کیا ہے۔ نقوی صاحب فرما رہے ہیں کہ مشاعرہ کے صدر مجوزہ جناب گلزار جی بھارتی جو کہ اردو اکادمی کے وائس چیرمین بھی ہیں۔ خیر مقدمی تقریر فرمائیں گے۔ بھارتی جی فرما رہے ہیں کہ میں نے عرض کیا تھا کہ مشاعرہ کی صدارت اردو کے کسی ودوان یا شاعر کو سونپی جائے۔ مگر ان حضرات کا کہنا تھا کہ یہ تہوار کی پہچان ہونا ضروری ہے لہٰذا ہم اردو کے شاعر کی صدارت ایک ہندی سیوک سے کرانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ یہ جشن جمہوریت ہے۔ لہٰذا میں نے مشاعرے کی صدارت قبول کر لی۔ دلی بھارت کا دل ہے۔ ہمارے گورنر صاحب ودوان ہیں اور ان کے دل میں دلی بسی ہوئی ہے۔ ان کا رشتہ دہلی سے بہت پرانا ہے اور ہمارے چیف ایگزیکیٹو کونسلر صاحب جو کہ خود رائٹر اور شاعر ہیں ان کا بھی سواگت کرتا ہوں جناب گوئل صاحب پروفیسر ان کا اور تمام مدعو شعرائے کرام کا سواگت کرتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ جہاں جائے نہ روی وہاں جائے کوی۔ تھوڑی دیر میں آپ شاعروں کا کلام سنیں گے۔ میں تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دو لائنیں سنا رہا ہوں۔ گو میں شاعر نہیں ہوں۔ اس کے بعد بھارتی جی نے "بکھر بکھیاں" بلا عنوان شعر سنائے ہیں اور تالیوں کے شور میں اپنی جگہ پر تشریف لے آئے ہیں اور نقوی صاحب نے جہاں خصوصی عالیجناب گورنر صاحب سے درخواست کی ہے کہ اپنے قیمتی خیالات سے نوازیں۔ گورنر صاحب رواں دواں اردو میں فرما رہے ہیں۔ جگ پرویش چندر جی معزز شعراء۔ معزز مہمانو اور دوستو! مجھے آج اس میں شامل ہو کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ بھارتی جی نے فرمایا کہ دہلی بھارت کا دل ہے یہ بات صحیح ہے مگر دلی کا جو دل ہے وہ اردو ہے (تالیاں) اور اردو کا جو دل ہے وہ اردو شاعری ہے گورنر صاحب بڑا با موقع شعر سنانے کے بعد فرما رہے ہیں کہ اردو کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں ہیں۔ ویسے ہمارے ملک میں اور بھی بہت سی غلط فہمیاں ہیں مگر اب یہ غلط فہمیاں دور ہو رہی ہیں

گورنر صاحب پھر برمحل مجاز لکھنوی کا شعر ؎

ادھر مشکوک ہیں میری نگاہیں

سُنا کر پھر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرما رہے ہیں اُردو کے بارے میں جو غلط فہمیاں ہیں آج جو شعراء جشن جمہوریت کے اس مشاعرہ میں تشریف لائے ہیں وہ آج ان غلط فہمیوں کو دُور کریں۔ اس کے بعد گورنر صاحب نے ڈاکٹر اقبال کے ترانۂ ہند کے کچھ اشعار سُنا کر فرمایا کہ اگر ہم اُردو کو مٹانا نہیں چاہتے ہیں تو دوسری باتوں میں اُلجھنے کی بجائے اس کی طرف خاص توجہ دیں۔ مشاعرہ کی اہمیت کیوں ہے اس لئے کہ شاعر اندرونی حالت کو دیکھتا ہے اور دیگر سب بیرونی حالت کو دیکھتے ہیں۔ آج میں جنوبی بستی کی گندی بستیوں کے اچانک دورہ پر گیا وہاں کی حالت دیکھنے کے بعد واپسی پر راستے میں کچھ لکھا ہے۔ آپ بھی سُن لیجئے۔ گورنر صاحب نے اقبال کے مشہور شعر ؎

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہ ہو روزی

اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو۔

کی زمین میں کچھ اشعار سُنائے جس کا ایک مصرعہ ہی یاد رہ گیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ ؎

اُٹھو میری بستی کے مکینوں کو جگا دو

گورنر صاحب نے آخر میں فرمایا کہ اُردو اکاڈمی ساہتیہ کلا پریشد اور دیگر سب حضرات کو مبارک باد دیتا ہوں جنھوں نے اس سلسلہ میں کام کیا ہے۔ اُردو اکاڈمی بہت اچھا کام کر رہی ہے نظر آتا ہے کہ یہ اُردو کے لئے بہت کچھ کرے گی۔

جناب جگ موہن صاحب لفٹننٹ گورنر مائک سے ہٹے تو نقوی صاحب نے مہمان محترم چیف ایگزیکیٹو کونسلر کی خدمت میں گزارش کی ہے کہ مائک پر تشریف لائیں۔

چیف ایگزیکیٹو کونسلر صاحب فرما رہے ہیں جگ موہن جی گاندھی جی اور میرے ساتھیو۔ نمسکار۔ جب جگ موہن جی تقریر فرما رہے تھے تو میں نے اپنے آپ کو سیوا گرام میں پایا۔ ۱۹۴۲ء میں میں سیوا گرام میں گیا وہاں کتاب لکھی اور گاندھی جی کو دکھانے کے لئے ڈرتا تھا۔ گاندھی جی کی کُٹیا میں بجلی نہیں تھی ایک رسّی سے کھینچنے والا پنکھا ہوتا تھا۔ بڑے بڑے لیڈر اُن سے ملاقات کے لئے انتظار کرتے تھے اور پنکھا کھینچنے کے لئے ہر ایک منتظر رہتا تھا۔ گاندھی جی سے ملاقات کے لئے آنے والوں میں بڑے بڑے جو دوان ہوتے تھے گاندھی جی سے پوچھا گیا کہ گاندھی جی آپکی زندگی کا مقصد کیا ہے فرمانے لگے خدا کو آمنے سامنے دیکھنا۔ تو پھر آپ شہروں اور قصبوں میں کیوں رہتے ہیں۔ کسی پہاڑ پر جائیے وہاں پرماتما آپ کو مل جائے گا۔ گاندھی جی نے فرمایا کہ پرماتما گندی سے گندی جھونپڑی کے اندر غریبوں اور دُکھیوں کی سیوا کرتے ہیں۔ گورنر صاحب میں آپ کی بڑائی نہیں کرتا بلکہ یہ حقیقت ہے کہ ماڈرن دلّی کے بنانے میں جو آپ کا یوگ دان ہے اُس کی مثال نہیں ملتی۔ دلّی کا گزارہ جگ موہن کے بغیر نہیں اور میرا بھی گزارہ جگ موہن کے بغیر نہیں۔

اب نقوی صاحب فرما رہے ہیں۔ پاکستان سے احمد فراز صاحب تشریف لائے ہیں ہم اُن کا بھی استقبال کرتے ہیں اس کے بعد نقوی صاحب نے جناب وسیم بریلوی سے استدعا کی ہے کہ مشاعرہ کی نظامت سنبھالیں اور مشاعرہ شروع کروائیں۔

وسیم صاحب نے مائک سنبھال لیا ہے۔ فرما رہے ہیں۔ لال قلعہ کا یہ مشاعرہ ایک تاریخی حیثیت کا حامل ہے مُلک میں ہونے والے مشاعرے کچھ تو شاعروں کی وجہ سے اور کچھ اپنے نظم و نسق کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ مگر یہ مشاعرہ اپنی تاریخی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے کیوں کہ اس مشاعرہ میں شعراء کا مدعو ہونا ہی اُن کی عزت افزائی ہے اور سامعین کی حیثیت سے کتنا خوش نصیبی ہے۔ وسیم صاحب نے مقامی شعراء سے صرف پانچ اشعار سُنانے کی درخواست کرنے کے بعد متین صاحب سے مشاعرہ کی بسم اللہ کی ہے۔ متین صاحب نے ایک قطعہ داغنے کے بعد غزل شروع کی ہے ذرا غور سے سُنئے گا۔

قتل گاہوں کا ہماری اُن کو اندازہ نہیں
گھُٹ رہا ہے دم ہمارا کوئی دروازہ نہیں
پھُول جو تم نے کھلائے تھے کبھی مُرجھا گئے
زخم اب کوئی ہمارے جسم کا تازہ نہیں
ہم سدا ہوتے رہے اپنے لہو سے سُرخ رُو
کیا یہ بربادی ہماری اُس کا خمیازہ نہیں
ہم نے کشتی سے بھنور کے دائرے توڑے متین
ناخداؤں کو ہمارے فن کا اندازہ نہیں

جشنِ جمہوریت کے مشاعرہ کی بسم اللہ جن اشعار سے ہوئی ہے ہم مشاعرہ کمیٹی کے ممبران سے اُن اشعار کے معنیٰ دریافت کرنا چاہیں گے۔ کیوں کہ اگر ان اشعار کی تشریح ہم نے کی تو وہ یوں ہوگی کہ متین صاحب کا ہندوستان میں دم گھُٹ رہا ہے اور انھیں اب یہاں پھُولنے پھلنے کی کوئی اُمید نہیں ہے اور آخری شعر میں تو انھوں نے مُلک کے خاندانوں کو اپنے ماہرِ فن ہونے کی دھمکی بھی دی ہے۔ کاش کہ مشاعرہ کمیٹی کے ممبران اپنی ذمہ داری کا احساس فرماتے۔ سُنا ہے جناب رفعت سروش صاحب بڑے بڑے مشکل اور پیچیدہ اشعار کی تشریح کرنے میں خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ اگر وہ ان اشعار کی تفصیل تشریح فرما سکیں تو شانِ ہند کے صفحات حاضر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ متین صاحب کی متعدد سفارشیں اُردو اکاڈمی کے یہاں آئیں کہ انھیں ضرور مشاعرہ میں مدعو کیا جائے اور یہ سفارش کرنے والوں میں کچھ انگریزی اخبار کے مدیرانِ کرام بھی تھے۔

اب وسیم صاحب نے جمیل تاباںؔ کو کلام سُنانے کی دعوت دی ہے۔ جمیل تاباںؔ صاحب اپنے مخصوص ترنم سے نغمہ سرا ہیں۔ ــــ

جو آگ سُلگی دِل میں وہ بجھ ہی نہیں پائی
آنکھوں نے تو اشکوں کی برسات بھی برسائی
کانٹوں میں کہیں تیرا دامن نہ اُلجھ جائے
یہ بھی کبھی سوچا ہے پھولوں کے تمنائی
ڈر ڈر کے جو آتے ہیں طوفان کنارے پر
یہ اُن سے کوئی کہہ دے ساحل پہ ہے گہرائی
پھر آنکھ بھر آئی ہے پھر درد ہے پہلو میں
شاید کہ ترے غم کی چلنے لگی پُروائی
جس رہ سے گزرتا ہوں اک شور سا اُٹھتا ہے
مجھ سے کہیں آگے ہے تاباںؔ مری رُسوائی

داد کی آواز بھُولے سے بھی سُنائی نہیں دی۔ اب آیئے وقت کے شہنشاہِ مشاعرہ جناب دلؔ لکھنوی مرحوم کے صاحبزادے ثروت نواز کو وسیم صاحب نے مائک پر تشریف لانے کو کہا ہے۔ سُنئے ثروت نواز ترنم سے سُنا رہے ہیں۔ ــــ

خموش لب تھے مگر مجھ کو ایسا لگتا تھا
وہ جیسے مجھ سے کوئی بات کہنے والا تھا
اُڑا کے لے گئیں اُس کو بھی آندھیاں غم کی
جو میرے شہر کی قسمت بدلنے والا تھا
وہ اس سے پہلے کبھی اس طرح ملا تو نہ تھا
یہ کیا خبر تھی کہ وہ مجھ سے بچھڑنے والا تھا
بھلا ہو صبح کا جس نے بچا لیا جس نے
میں اک چراغ کی لو سے لپٹنے والا تھا
یہ کیا ہوا کہ گھٹا گھر کے کھُل گئی ثروتؔ
ابھی ابھی تو یہ بادل برسنے والا تھا

داد مناسب ملی ہے اس پہ فرمائش ہوئی کہ ایک غزل اور سُنائیں ثروت نواز کہہ رہے ہیں کہ دہلی میں سُنائی ہوئی غزل کی فرمائش ہوئی ہے" وہ سُنا رہا ہے"۔ ایک آوا آئی ہے۔ میاں تم دہلی میں سُنائی ہوئی غزل کا ذکر کر رہے ہو یہاں تو شعراء کی اکثریت وہی کلام ہر سال سُناتی ہے۔ جب سے کہ وہ شاعر بنے ہیں۔ دیکھا تو ثروت نواز بڑے اچھے ترنم سے مطلع سُنا رہا تھا ــــ

اُس کی محفل میں روشنی ہوگی
میری دُنیا اُجڑ رہی ہوگی
شاید اب بھی ترے خلوص کے پھُول
وہ کتابوں میں ڈھونڈتی ہوگی

آپ بھی ... سے سنئے

گا ہے گا ہے وہ پوچھتی ہوگی

... رہے ہیں حضرات جن غزل کا رنگ یہاں سے بدل رہا ہوں۔ سے

جنگلوں کی طرف نکل چلئے ۔۔ زندگی راہ دیکھتی ہوگی
یہ پرندوں کا شور کہتا ہے ۔۔ کوئی بستی اُجڑ گئی ہوگی

ایک طرف سے کچھ نعرے بازی ہوتی ہے جس پر وسیم صاحب فرمانے لگے یہ پرندوں کا شور ہے اس وقت رات کے ساڑھے نو بجے ہیں پنڈال سامعین سے پوری طرح سے بھر گیا ہے مگر پنڈال میں روشنی کی کمی نے سارا کھیل بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ نہ شاعر سامعین کو دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی داد حاصل کر سکتا ہے۔ مروت نواز مناسب داد کے بعد اپنی جگہ چلے آئے تو وسیم صاحب نے اکبر دہلوی کا نام پکارا ہے۔ اکبر دہلوی کا نام سنتے ہی سامعین نے قہقہہ لگایا ہے۔ دراصل یہ قہقہہ مشاعرہ کمیٹی کے ذوقِ انتخاب کے فقدان کی نشاندہی کر رہا ہے۔ اکبر دہلوی صاحب نے تین قطعات جو وہ ہر مشاعرہ میں سناتے ہیں۔ سنا رہے ہیں۔ سامعین نے مزاحیہ انداز میں واہ واہ کی ہے اور اکبر صاحب چار صد روپئے کا لفافہ وصول کرنے عابدی صاحب کے پاس لپک کر جا پہنچے ہیں۔ وسیم صاحب فرما رہے ہیں۔ اب میں ایسے شاعر کو پیش کر رہا ہوں کہ اگر ان کا کلام آپ کی سمجھ میں آ گیا تو آپ کی عاقبت خراب ہے اور اگر آپ کی سمجھ میں نہ آیا تو ان کی عاقبت خراب ہے۔ اور یہ عاقبت خراب شاعر ہیں۔ شاعر خیامی۔ نہ معلوم ان صاحب کو کس طرح یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ یہ مزاحیہ شاعر ہیں اور اس پر ان کی عاقبت نااندیشی کا یہ حال ہے کہ صرف تین قطعات کو ہی یہ اپنا سرمایۂ شاعری سمجھتے ہیں اور دینے والے کے بھی ڈھنگ نرالے ہیں کہ یہ ان تین قطعات کی بدولت کسی نہ کسی طرح مقامی مشاعروں میں اور کہیں کہیں قرب و جوار کے مشاعروں میں بھی دعوت نامہ حاصل کر ہی لیتے ہیں۔ آپ بھی ان کا ایک قطعہ ملاحظہ فرمائیے۔ سے

خالص غذا ہے نہ اصلی شراب ہے
خالص ہے حسن اور نہ خالص شباب
گھوڑے کی لید دھنیے میں بنئے ملائیں گے
وہ دن نہیں ہے دور جب ہم ہنہنائیں

ساغر خیامی کے نزدیک ان کے طنز و مزاح کا حدود اربعہ محض "ہنہنانے" تک ہی محدود ہے۔ مگر ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ ساغر خیامی صاحب جب آپ ہنہنائیں گے تو آپ کے گھر کی مستورات پر کیا بیتے گی۔ داد دیجئے ہمارے دور درشن کے خوش ذوق بلکہ باذوق حضرات کو جنھوں نے مشاعرے کے کچھ "انش" پیش کرتے وقت اس ہنہنانے والے مزاحیہ شاعر کا ہی کلام پیش کیا۔ اب جناب اختر آصف برہان پوری مائک پر تشریف لاتے ہیں اور لحن داؤد میں ارشاد ہوا ہے سے

غم اُٹھانا مشغلہ ہے کوئی لاچاری نہیں
اب یہ دشواری ہمارے حق میں دشواری نہیں

جب بھی ٹوٹا ہے وہی روتا ہے میرے حال پر
آپ ہی کہئے یہ رونا کیا اداکاری نہیں

میں جیئوں احسان اُٹھا دوں بھی اک کم ظرف کا
زندگی پیاری ہے لیکن اس قدر پیاری نہیں

آصف صاحب ہر شعر پر داد پاتے ہوئے بڑے اعتماد سے فرما رہے ہیں۔ سے

غیر ممکن ہے کسی کی خود ستائی کا علاج
اک فسادِ ذہن ہے یہ کوئی بیماری نہیں

کام تو کرنے سے ہوگا سوچنے سے فائدہ
شرط بیداری ہے آصف خواب بیداری نہیں

اب اعلان ہوا ہے کہ سردار جوگا سنگھ انور کلام عنایت کریں۔ سردار جوگا سنگھ انور کی شہرت پچھلے دو تین سالوں سے سن رہا تھا آج انھیں سننے کا موقع مل گیا۔ ذرا آپ بھی سنئے۔ سے

شہر پھیلی ہے میرے گھر کی ویرانی
میرے گھر رہتی دشت و صحرا کی ویرانی

ہم وفا کی راہوں میں دور تک اکیلے تھے
پھوٹ پھوٹ کر روئی رہگزر کی ویرانی

یاد صحرا تھی دشت میں ہے گھر کی یاد
وہ ایک لگی ہے دشت و صحرا کی ویرانی

جس کے رنگ و بو یار و شہر بن گیا ملبہ
عمر بھر نہ جائے گی اس نظر کی ویرانی

صاحب نے انور صاحب کی بہت تعریف فرمائی تھی۔ مگر غزل تو کوئی خاص اثر پیدا نہ کر سکی۔ آئیے ان کی دوسری بھی سن لیجئے۔ شاید سردار جوگا سنگھ انور کے بارے میں اناؤنسر صاحب نے فرمایا ہے وہ کس حد تک بھی ٹھیک ہے صاحب جمشید پور سے تشریف لائے ہیں کچھ عرصہ ہوا کہ پور میں فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا۔ ان دنوں تو انور صاحب مندرجہ بالا مطلع نے کچھ داد پائی ہو گی۔ مگر آج تو داد کے میں سامعین قطعاً خاموش ہیں۔ مطلع ہے۔ ؎

دھوکے لہو رنگ یہ منظر دیکھیں
تجربہ ہے کہ گھر اپنا جلا کر دیکھیں

آج ہم شہر کو ہم شہر ستم گر دیکھیں
یعنی احباب کی آنکھوں میں بھی خنجر دیکھیں

ہے آپ کے دریا سے گزرنے کا سوال
آنے گا قیادت کو پیمبر دیکھیں

ہاتھ جوم چکے چاند ستاروں کی جبیں
بے عمل ہاتھ کی ریکھا میں مقدر دیکھیں

شعر پر کہیں کہیں سے داد کی آوازیں آئی تھیں۔

تو اک عمر جلا پھر بھی اندھیرا ہی رہا
کی رات جلو گھر بھی جلا کر دیکھیں

دن کا صحرا تو ہمیں پیاس بھرے گا انور
رات آئے تو کوئی خواب سمندر دیکھیں

سردار جوگا سنگھ انور کی دونوں غزلیں آپ نے بھی ملاحظہ

کیجئے پسند آئیں؟ بھائی سچ پوچھے ہیں تو ان کا ترنم بھی پسند نہیں آیا۔ حالانکہ ان کے ترنم کی بھی بہت تعریف سُنی تھی۔

سردار صاحب کے بعد جناب بشیر بدر صاحب مائک پر تشریف لائے ہیں۔ یہ ہر مشاعرہ میں اپنی بیس سال پرانی غزل کو بھی تازہ بلکہ راستے میں کہی ہوئی بتلاتے ہیں تاہم یہ سو سال پرانی کہی ہوئی غزل بھی سنائیں گے۔ تو سننے والے داد دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ سنئے بشیر بدر اپنا منفرد مقام کس طرح قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ؎

سنوار نوک پلک ابروؤں میں خم کر دے
گرے پڑے ہوئے لفظوں کو محترم کر دے
غرور اس پہ بہت سجتا ہے مگر کہہ دو
اسی میں اس کا بھلا ہے غرور کم کر دے
یہاں لباس کی قیمت ہے آدمی کی نہیں
مجھے گلاس بڑے دے شراب کم کر دے

داد کا کچھ ٹھکانہ نہیں۔ ایک شعر سنئے ؎

نام ہم نے لکھا تھا آنکھوں میں
آنسوؤں نے مٹا دیا ہو گا

اب ارشاد ہوا ہے۔ ؎

ہم سفر ساتھ ساتھ چلتے ہیں وہ بے وفا راستہ بدلتے ہیں
کس کے آنسو چھپے ہیں پھولوں میں چومتا ہوں تو ہونٹ جلتے ہیں
اُس کی آنکھوں کو غور سے دیکھو مندروں میں چراغ جلتے ہیں

داد سے لدے پھندے بشیر بدر مائک سے ہٹے تو سامعین نے وسیم صاحب کو مجبور کر دیا ہے کہ بشیر بدر صاحب کو پھر مائک پر لائیں۔ جمہور کی خواہش پر ڈاکٹر بشیر بدر صاحب پھر مائک پر آئے ہیں اور اب کی بار اپنے مخصوص اور مسحور کن ترنم سے نغمہ سرا ہیں ؎

وہ مہکتی پلکوں کی اوٹ سے کوئی تارا چمکا تھا رات بھی
مری بند مٹھی نہ کھولئے کہ وہ نور ہے رات میں
میں تمام تارے اٹھا اٹھا کے غریب لوگوں میں بانٹ دوں
کبھی ایک رات وہ آسماں کا نظام دے میرے ہات میں

ابھی تمام تک میرے باغ میں کہیں کوئی پھول کھلا نہ تھا
مجھے خوشبوؤں میں بسا گیا تیرا پیار ایک ہی رات میں
کبھی سات رنگوں کا پھول ہوں کبھی دھوپ ہوں کبھی دھول ہوں
میں تمام کپڑے بدل چکا تیرے موسموں کی برات میں

ڈاکٹر بشیر بدر کے بعد ڈاکٹر شہریار صاحب سے وسیم صاحب نے کلام عنایت فرمانے کی گزارش کی ہے۔ سُنئے شہریار صاحب تحت میں فرما رہے ہیں ؎

بڑھا دے مری وحشتیں چاک پیراہن گریباں کر دے
کوئی ہے جو یہ زندگی کا سفر میرا آساں کر دے
مجھے نیند مت دے کہ میں خواب سے منحرف ہو گیا ہوں
مگر رات بھر جاگنے کے لئے کوئی ساماں کر دے
مرے دل کے اُجڑے مکاں کو مکینوں سے محروم رکھا
بہت ہو چکا اب کسی شخص کو اس میں مہماں کر دے
دکھائی نہ دی آج تک دیکھنے کو جہاں دیکھ ڈالا
کوئی شکل ایسی کہ جو آئینوں کو پشیماں کر دے

شہریار کے یہ اشعار اکثر و بیشتر مدعو شعرائے کرام کے دواوین پر بھاری ہیں۔ مگر واہ رے دلی کے سامعین اور اسٹیج پر تشریف فرما شعرائے کرام کہ چھوٹے مُنہ بھی داد نہ دی۔ اب ڈاکٹر بشیر بدر صاحب نے اناؤنسر والا مائک سنبھالتے ہوئے ایسے نپے تُلے انداز میں وسیم بریلوی کا تعارف کرایا ہے کہ تعارف وسیم صاحب کے کلام اور ترنم دونوں پر بھاری ہو گیا ہے۔ سُنئے ناظمِ مشاعرہ جناب وسیم بریلوی صاحب تحت میں فرما رہے ہیں ؎

سُلگتی آنکھوں سے عنوانِ شام لکھتا ہے
دیئے کی لَو سے کوئی تیرا نام لکھتا ہے
تُمھارے بارے میں کچھ سوچنے کا حق بھی نہیں
مگر تمھارے ہی بارے میں سوچتا ہوں میں

اس کے بعد ترنم سے غزل شروع کر رہے ہیں ؎

آتے آتے مرا نام سا رہ گیا — اُس کے ہونٹوں پہ کچھ کانپتا رہ گیا
رات مجرم تھی دامن بچا لے گئی — دن گواہوں کی صف میں کھڑا رہ گیا
وہ مرے سامنے ہی گیا اور میں — راستے کی طرح دیکھتا رہ گیا
جھوٹ والے کہیں سے کہیں بڑھ گئے
اور میں تھا کہ سچ بولتا رہ گیا
آندھیوں کے ارادے تو اچھے نہ تھے
یہ دیا کیسے جلتے ہوئے رہ گیا
اُس کو کاندھوں پہ لے جا رہے ہیں وسیم
اور وہ جینے کا حق مانگتا رہ گیا

وسیم صاحب مناسب داد پا کر پھر نظامت کرنے ہی لگے تھے کہ سامعین نے گیت سنانے کی پُر زور فرمائش کی لہٰذا وسیم صاحب نے گیت سُنانا شروع کیا ہے۔ ؎

تیری ایک نظر ہی مجھ کو دھوپ سے کرکری چھاؤں

گیت کا ایک نامکمل بند سُنئے ؎

تن کی تپتی ریت پہ جیسے پھوار گرے شبنم کی
کیسی لگیا . . . .
میرے اندر جو چھپا ہے نہ جانے کب جُڑ جاؤں
تیری ایک نظر ہی مجھ کو دھوپ سے کرکری چھاؤں

"جُڑ جاؤں" پر شاعری کسی صنعت، گیت کی ساری تاریخ انگشت بدنداں ہے۔

اب جناب راہی شہابی جے پوری مائک پر تشریف لائے اور ایک نظم "سخن وروں سے خطاب" سنائی ہے جس راہی صاحب نے جدید شعراء اور جدید شاعری کا مذاق اُڑایا ہے اور ترنم سے پڑھنے والے شعراء کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ جسے اکثر و بیشتر شعراء اور سامعین نے پسند نہیں فرمایا۔ راہی صاحب نے اپنی تقریر میں جس تلخی سے کام لیا ہے اس کے سبب وہ نہ تو داد پا سکے اور نہ ہی انھوں نے اپنی رائے کے مطابق اچھا اثر چھوڑا۔

سامعین کے ایک گوشہ سے کبھی کبھی مخالفانہ آوازیں سنائی دیتی ہیں اور ان حضرات کے بیٹ میں یہ مروڑ محض اس لئے اُٹھتا ہے کہ ڈاکٹر صلاح الدین صاحب اور جناب انور دہلوی صاحب اُردو اکاڈمی کے ممبران کیوں بن گئے؟

ان شور مچانے والوں کے آقا . . . . . کو ممبر نہیں بنایا گیا۔
اعلان ہوا ہے کہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کلام عنایت
فرما رہے ہیں۔ سُنئے ارشاد ہوا ہے ؎

اُنھیں کیا علم جو ہم کو یہاں سمجھانے آئے ہیں
کہ ہم دیر و حرم ہوتے ہوئے میخانے آئے ہیں
اگر ناصح ہیں آئیں لیکن یہ تو سمجھا دیں
سمجھنے آئے ہیں وہ یا ہمیں سمجھانے آئے ہیں
ہم جو رُوٹھے تو وہ خود ہم کو منانے آئے
یاد گزرے ہوئے ایسے بھی زمانے آئے

داد و ستائش اُس وقت اور بھی مزا دے جاتی ہے جب
آتش سیال کلام سُنانے والے کے معدے میں موجود ہو۔
لہٰذا کنور صاحب نہایت خوش گوار ماحول میں مائک سے
الگ ہوئے ہیں اور وسیم صاحب نے جناب اظہر عنایتی
رام پوری سے کلام سُنانے کی استدعا کی ہے۔ اظہر عنایتی
صاحب سے ایک عرصہ سے جان پہچان ہے اور ان کے
ترنم و کلام کی خاصی شہرت سُننے میں آتی رہی مگر انھیں
مشاعرہ میں سُننے کا موقع آج ملا ہے۔ واقعی ان کا ترنم
خوب ہے اشعار تو آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں مگر
ترنم کا آپ تصور ہی کر لیجیے۔ فرماتے ہیں ؎

گھر تو ہمارا شعلوں کے نرغے میں آگیا
لیکن تمام شہر اُجالے میں آگیا

یہ کھلی رہا ہے کوچۂ جاناں میں اپنا رنگ
آہستہ ہولی تو چاند دریچے میں آگیا

آندھی بھی پھیلنے کی حدوں سے گزر گئی
مجھ کو بھی لطف شمع جلانے میں آگیا

وہ مجھ سے تیز دھوپ میں تھا ہم سخن مگر
محسوس ہو رہا تھا کہ سائے میں آگیا

اُس کو بھی دشمنی پہ ندامت تھی آج
میں بھی . . . . . لئے ہوئے خیمے میں آگیا

اظہر عنایتی صاحب اچھی داد پاتے ہوئے اپنی جگہ تشریف
لے گئے تو وسیم صاحب نے آنند موہن گلزار زتشی سے
کلام سُنانے کی درخواست کی ہے گلزار صاحب اردو اکادمی
سے خاصے شاکی ہیں اور خصوصاً مشاعرہ کمیٹی کے ممبران نے جو
سلوک ان سے روا رکھا اُسے یہ منافقوں کا کردار سمجھتے
ہیں۔ سُنئے یہ اپنی شکایت دھڑلے سے نذرِ سامعین کر
رہے ہیں۔ ؎

اردو کا اور وطن کا اب پاس اُٹھ چکا ہے
تبلیغِ علم پھر بھی کرنا منافقوں میں
اخلاص کا نہیں ہے گلزار کوئی محرم
جینا منافقوں میں مرنا منافقوں میں

ایک تو کشمیری نژاد ہونے کے باعث ویسے ہی سُرخ و
سپید رنگ اُس پر غصے نے چہرے پر سُرخی کی کئی لہریں
پیدا کر دی ہیں۔ گلزار فرما رہے ہیں کہ گلدستۂ تہذیب بھی
نذر کر رہا ہوں۔ اشعار تو بہت ہیں مگر مقامی شعراء کے لئے
پانچ اشعار کی جو قید لگائی گئی ہے اس کی تعمیل کر رہا ہوں
؎ ۔گلدستۂ تہذیب وطن بن کے رہے ہیں

ہر دور میں ہم نازِ وطن بن کے رہے ہیں
مٹ مٹ کے اُبھرتی رہیں قسمت کی لکیریں
ہم وقت کے ماتھے پہ شکن بن کے رہے ہیں
قربان ہوئی رُوح کسی جسم پہ جب سے
ہم شعر میں خوشبوئے بدن بن کے رہے ہیں
گلزار میں ہیں تو خیر ہے ہیں اپنے مخالف
ہم شہر میں موضوعِ سخن بن کے رہے ہیں

اس شعر پر گلزار صاحب خوب خوب داد پاتے ہوئے
فرما رہے ہیں ؎

دیتے رہے منزل کا پتہ راہ روں کو
گلزار جو ہم سرو و شمن بن کے رہے ہیں

اب مائک پر تشریف لاتے ہیں ڈاکٹر شاعر اعظمی صاحب
سُنئے شاعر اعظمی صاحب بہت ہی اچھے ترنم سے
غزل شروع کر رہے ہیں ؎

وقت کی چھاؤں میں احساس کا تپتے رہنا
سائے سے بہتر ہے کڑی دھوپ میں جلتے رہنا
پھول ہی پھول اگر خواب میں آتے ہوں نظر
ایسے ہر خواب کی تعبیر سے ڈرتے رہنا
بات باقی ہے تمناؤں میں ہلچل ہے ابھی
شمع بجھ جائے تو اے دل مرے جلتے رہنا

اس شعر پر داد کے شور سے پتہ چلتا ہے کہ مشاعرہ ہو رہا ہے ساغر صاحب نے دو چار یہ شعر سنانے کے بعد فرما رہے ہیں ؎

کیسے طے ہوگی رہِ عمر سہارے کے بغیر
تم مجھے دور سے آواز ہی دیتے رہنا
موجِ طوفاں پہ بھروسہ تو بڑی بات رہی
وقت کہتا ہے کہ ساحل سے بھی ڈرتے رہنا

ساغر اعظمی صاحب داد میں شرابور مائک سے ہٹے تو سامعین نے پُرزور مطالبہ کیا ہے کہ ساغر صاحب سے ایک اور غزل سُنی جائے۔ آوازیں آرہی ہیں کشمیر کی وادی کشمیر کی وادی وسیم صاحب نے ساغر اعظمی سے کہا کہ آؤ بھائی کشمیر کی وادی سناؤ۔ ساغر صاحب پھر مائک پر آگئے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ آپ حضرات ایک بہت ہی پُرانی غزل کی فرمائش کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں تو اس غزل کو مشاعروں میں پڑھتے پڑھتے اس کی سلور جوبلی کبھی کی ہو چکی ہے تاہم آپ کا ارشاد ہے تو تعمیل کرتا ہوں فرماتے ہیں ؎

پھولوں سے بدن کے کانٹے ہیں زنداں میں
شیشے کے دروازے پتھر کی دوکانوں میں
کشمیر کی وادی میں بے پردہ جو نکلے ہو
کیا آگ لگاؤ گے برفیلی چٹانوں میں

اس شعر پہ داد کچھ داد کی طرح دی جا رہی ہے اور ساغر اعظمی یہ شعر دوبارہ سناتے ہوئے ۔ راگ پہاڑی میں۔
سامعین کے دل و دماغ پر یوں چھائے جا رہے ہیں ؎

آنے کو ہے پھر شاید طوفان نیا کوئی
سہمے ہوئے بیٹھے ہیں سب اپنے مکانوں میں

ساغر صاحب کہہ رہے ہیں کہ ایک شعر میری پسند کا سُن لیجئے نغمہ سرا ہیں ؎

بس ایک ہی ٹھوکر سے گر جائیں گی دیواریں
آہستہ ذرا چلئے شیشوں کے مکانوں میں
شہرت کی فضاؤں میں اتنا نہ اڑو۔ ساغر
پرواز نہ کھو جائے ان اونچی اڑانوں میں

داد پاتے ہوئے ساغر اعظمی صاحب مائک چھوڑ کر اپنی جگہ پر آگئے ہیں مگر سامعین ہیں کہ کسی دوسرے شاعر کو سننے کو تیار ہی نہیں ہیں مطالبہ ہو رہا ہے کہ ساغر اعظمی صاحب ایک گیت ضرور سنائیں۔ تاہم بڑی کشمکش کے بعد ساغر اعظمی صاحب کو پھر مائک پر آنے کے لئے مجبور کیا گیا اور ساغر صاحب نے ایک بھوجپوری گیت "ماٹی کی بندیا" سنا کر گلو خلاصی کرائی ہے

ساغر اعظمی صاحب نے مشاعرے کے ماحول کو جس مقام پر پہنچا دیا ہے اسے قائم رکھنا وسیم صاحب کو مشکل نظر آرہا ہے لہٰذا انھوں نے اس کا علاج یہ تجویز کیا ہے کہ جناب بوگس حیدرآبادی سے گزارش کی ہے کہ مائک پر تشریف لائیے۔ بوگس صاحب غالب کے کلام کی پیروڈی کرنے میں خاص ملکہ رکھتے ہیں۔ پہلا مصرع غالب کا ہوتا ہے جسے یہ تحت میں پڑھتے ہیں اور دوسرا مصرع ان کا ہوتا ہے جسے ترنم سے پڑھتے ہیں۔ پہلے ان سے تعارفی شعر سنئے۔ ؎

جب مجھے بے روزگاری نے نکمّا کر دیا
یار لوگوں نے لگا کر زور نیچر کر دیا

اس کے بعد ایک قطعہ ملاحظہ فرمائیے ؎

ایک لڑکے نے جھلا کے کہا ان سے
اُلو اُلو مجھے ہر وقت نہ ابا کہئے
آج نو سال کا بچہ نہیں ہوتا اُلو
میں تو بچہ ہوں مجھے اُلو کا پٹھا کہئے

اب بوگس اور غالب کی مشترکہ غزل سنئے ؎

دہ دُلہن ہماری بنتی جو اُسے کبھی پیار ہوتا
یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا

نہ ہُوا اقترار اپنا اسی غم میں مر گئے ہم
اگر اور جیتے رہتے وہی انتظار ہوتا

کئی بار ہیروئن کر کے فلم میں مر چکا ہوں
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

کوئی چاند کا مسافر وہیں جا کے مر ہی جاتا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

ہنسی اور داد کا ایک ریلا ہے کہ یوگس صاحب کو ایک اور غزل سُنانے کے لئے کہا گیا ہے۔ ارشاد ہُوا ہے ۔

چاپلوسی گر نہیں آتی ۔ ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
عقیدت کا ایک دن مقرر ہے ۔ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
کی ہے کالج میں گر لنے ہڑتال ۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی
اُن کو بچپن میں آتی تھی غیرت ۔ اب کسی بات پر نہیں آتی
روز غنڈوں کی خبریں چھپتی ہیں ۔ کچھ ہماری خبر نہیں آتی

اَب محترمہ دارا بانو وفا لکھنوی کو کلام سُنانے کی زحمت دی گئی ہے وفا صاحبہ مُلک کی اُردو شاعرات میں ایک قابلِ تعریف مقام رکھتی ہیں۔ اُنھوں نے دو غزلیں سُنائیں جن پر خوب خوب داد دی گئی۔ ان کی غزلوں کے مطلعے اور ایک شعر ہی پیشِ خدمت ہیں کیوں کہ انھوں نے مائک پر اس زاویئے پر کھڑے ہو کر کلام سُنایا کہ اشعار پوری طرح سُنے نہ جا سکے۔ پہلی غزل کا مطلع اور ایک شعر ۔

کنارا ڈوبنے کا دیکھتے ہیں جب بھی منظر ہم
ربڑ لے کے مِٹا دیتے ہیں نقشے سے سمندر ہم

لگا رکھی ہیں ہم نے دوربینیں اپنی آنکھوں سے
مگر پہچانتے ہیں اپنے چہرے صرف چھو کر ہم

دُوسری غزل کا مطلع ہے ۔

نکلنا خود سے ممکن ہے نا ممکن واپسی میری
مجھے گھیرے ہوئے ہے ہر طرف سے بے رُخی میری

اب اتفاق سے پاکستان سے آئے شاعر جناب احمد شریف مائک پر تشریف لائے ہیں۔ تحت میں فرما رہے ہیں ۔

دل کے لہو سے شب کو چراغاں کریں گے ہم
دُشوار کام ہے جسے آساں کریں گے ہم

جس حوصلے نے ہر شبِ تاریک کاٹ دی
اُس حوصلے کو زیست کا عنواں کریں گے ہم

بزمِ بُتاں میں عہدِ وفا کو نبھاہ کر
بُت خانے میں نمائشِ ایماں کریں گے ہم

اَب تو جنوں کو ساحل و منزل بنا چکے
اَب کیا علاجِ چاکِ گریباں کریں گے ہم

ہر شمعِ شہر گُل ہے تو پھر کیا ہُوا شریف
زخمِ دل و ... سے چراغاں کریں گے ہم

پاکستان کا اگر کوئی سندی شاعر بھی واگہ کی سرحد پار کر کے ہندوستان میں داخل ہوتا ہے تو اُسے سرزمینِ اقبال کا نمائندہ سمجھ کر اُس کی پذیرائی کی جاتی ہے مگر افسوس ہے کہ شریف صاحب پاکستان کی اُردو شاعری کی نمائندگی نہ فرما سکے اور داد کا ایک لفظ سُنے بغیر اپنی جگہ پر تشریف لے آئے ہیں۔ اَب جناب اخترؔ امروہوی مائک پر آئے ہیں اور تحت میں ارشاد ہوا ہے ۔

ہر ایک دوست سمجھا، کھرا کھلا سمجھا
زمانہ کیا تھا زمانے کو میں نے کیا سمجھا

رسول کب ہوں میں لیکن مجھے وہ دور ملا
کہ میرے جینے کو دُنیا نے معجزا سمجھا

زمانہ شعر ہی سمجھا کیا مگر اک شخص
غزل کے شعر کو اظہارِ مدعا سمجھا

بجا کہ جدتِ افکار ہو گراں دوست
غزل کے لہجے کو کیا شوخ کر برا سمجھا

دیکھئے اب ایک اچھا بھلا شاعر ترنم میں جھٹکے مارنے چلا ہے وہ اس طرح کہ ترنم کے باعث یہ ہوٹ ہو گئے حالانکہ تحت میں اپنے اچھے اشعار پر خاصی داد پا رہے تھے ان کی ترنم غزل کے بھی دو شعر سُن لیجئے ۔

دل میں عروج سلوک و استاں ہو جائے ہے

اہلِ دل کا قول ہے دل سے گماں ہو جائے ہے

ورنہ کون دیدہ و دل کی نگہبانی کرے

حادثہ پھر حادثہ ہے تا گہاں ہو جائے ہے

اب مائک پر تشریف لا رہے ہیں اُردو اکادمی دہلی کے مشاعرہ کمیٹی کے ممبر جناب رفعت سروش۔ فرما رہے ہیں چار مصرعے عرض ہیں۔ اگر رفعت سروش ایسے شاعر بھی رُباعی یا قطعہ کو چار مصرعے کہیں گے تو پھر مجھ ایسے غیر شاعر اپنی غیر شاعرانہ طبیعت کا بھرم کیسے رکھیں گے ــــ ان چار مصرعوں جن کو کم از کم پچیس سال سے سُنتے آ رہے ہیں کے بعد ایک ایسی غزل سُنانی شروع کی ہے جو غالباً انھوں نے محکمہ ریڈیو پر ملازم ہونے وقت کہی تھی اور ریٹائرڈ ہونے کے بعد بھی اسے ہی سُنا رہے ہیں مطلع سُن لیجئے۔ ــــ

یہ دُنیا ہے یہاں جینے کی مہلت چار دن کی ہے

لہو میں یہ روانی یہ حرارت چار دن کی ہے

رفعت سروش کے بعد مشاعرہ کمیٹی کے دوسرے محترم ممبر ڈاکٹر کامل قریشی صاحب مائک پر تشریف لائے ہیں۔ فرما رہے ہیں غالب کی زمین میں غزل پیشِ خدمت ہے اس اہتمام کے ساتھ کہ غالب کا کوئی بھی باندھا ہوا قافیہ ہم نے نہیں باندھا۔ مطلع پیشِ خدمت ہے ــــ

دیدہ و دل میں نہاں جانِ جاناں ہو گئیں

آپ کی یادیں مری خلوت کا ساماں ہو گئیں

ڈاکٹر کامل قریشی صاحب مناسب داد پاکر اپنی جگہ پر تشریف لے گئے تو وسیم صاحب نے نہایت احترام کے ساتھ محترمہ ذکیہ سُلطانہ نیر صاحبہ سے کلام عطا فرمانے کی درخواست کی ہے۔ محترمہ نیر صاحبہ بھی مشاعرہ کمیٹی کی معزز ممبر ہیں ان کا بھی صرف ایک ہی شعر حاضرِ خدمت ہے ــــ

ایسی راہ میں صبا تو فقط گردِ راہ ہے

بادِ خزاں بہار میں ہے رہنمائے دل

اب اعلان ہوا ہے کہ جناب فاروق بخشی صاحب مائک پر آ رہے ہیں۔ اس اعلان پر تمام شعرا اس لئے حیران ہوئے کہ اب تک یہ نام دُنیائے شاعری میں سُننے میں آیا ہے۔ کہا گیا کہ آپ غازی آباد سے آئے ہیں مگر کہا ہے کہ آپ فتح پوری مسجد کے اسکول میں ٹیچر ہیں کسی مشاعرہ تک انھیں کسی نشست میں بھی کسی شاعر نے نہ سُنا اور ایک ایسے شاعر کا یکا یک چھلانگ لگا کر لال قلعہ کے مشاعرہ میں مدعو ہونا شعراء کو عجیب سا لگ رہا اُردو اکادمی کی مشاعرہ کمیٹی کی اس نئی دریافت کا کلام ہے

ــــ یہ زمیں تھی نہ آسماں میرا

کیسے ملتا بھلا نشاں میرا

اس نوجوان کو مطلع پر داد ملی ہے اور ترنم بھی گوارہ ہے فاروق بخشی صاحب فرما رہے ہیں ــــ

عمر بھر ساتھ ساتھ چلتا ہے

آگ اس کی ہے اور دھواں میرا

وہ بھی دیوار دھوگئی بارش

نام اُس نے لکھا جہاں

بارشِ اشک دل بھی لے بیٹھی

کچی مٹی کا تھا مکاں میرا

ہر گرمی دُھوپ سے بچائے

ماں کا آنچل تھا سائباں

اس شعر پر بھی خاصی داد پاتے ہوئے فاروق میاں سُنا رہے ہیں ــــ

میں ہواؤں کا ہم سفر فاروق

یہ مکاں ہے نہ لامکاں میرا

اب جناب آغا امیر قزلباش صاحب اپنی دلربا اداؤں کے ساتھ مائک پر آئے ہیں۔ مشاعرے کی کارروائی لکھتے لکھتے میں اُکتا گیا ہوں تو کیا آپ پڑھتے پڑھتے کچھ تھکاوٹ نہ محسوس کر رہے ہوں گے۔ آئیے آغا امیر قزلباش کا کلام سُننے سے پہلے ایک لطیفہ سُن کر آپ بھی اور میں بھی تازہ دم ہو لیں۔ آج کل نواب خواجہ محمد شفیع صاحب پاکستان سے

تشریف لائے ہوئے ہیں۔ ایک مخصوص محفل میں فرمانے لگے کہ کئی سال ہوئے جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ لاہور (پاکستان) آئے تو آغا امیر قزلباش بھی اُن کے ساتھ تھے میری بیوی نے زنان خانے میں سے چلمن کی اوٹ سے دیکھا کہ کنور صاحب کے ساتھ خوب رو صفت صاحبزادے بھی تشریف فرما ہیں تو مجھے زنان خانے میں بُلا کر کہنے لگیں۔ ہائے اللہ کنور صاحب کو یہ شوق کب سے ہوا ہے۔ یہ لطیفہ کنور صاحب نے کچھ سال ہوئے تو سنایا تھا مگر اب کی بار خواجہ صاحب نے جس نمک مرچ کے ساتھ سنایا اُس کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ ہاں تو اب سُنئے آغا امیر قزلباش کو۔ اشعار یہاں پیش کروں گا۔ داد کے عالم کی اگر منظر کشی کی گئی تو پھر اشعار کا لطف جاتا رہے گا۔ فرماتے ہیں ؎

دیوتاؤں کو سفارش چاہیے
دھرتیاں پیاسی ہیں بارش چاہیے
منتظر ہے دیر سے ابرِ کرم
میرے ہونٹوں پر گزارش چاہیے

لوگ سرگرم سفر رہتے ہیں
ہم سمجھ دار ہیں گھر رہتے ہیں
قید خانوں کی زیارت کر لو
اب یہاں اہلِ نظر رہتے ہیں

ٹوٹتے رشتوں کا آئینہ عجب ہو جائے گا
ایک دن انسان کے نام ونسب ہو جائے گا
میرے اُس کے درمیاں حائل کئی کہسار ہیں
مجھ تک آتے بادل تشنہ لب ہو جائے گا
کوئی اُس جیسا نہیں ہے شہر کی اس بھیڑ میں
دیکھ لینا وہ بھی اک دن بے ادب ہو جائے گا
میں نے پوچھا تھا کبھی اُس کی خموشی کا سبب
تم کبھی نہ پوچھنا ورنہ غضب ہو جائے گا

امیر آغا قزلباش داد سے لدے پھندے مائک سے الگ ہوئے تو سامعین نے انھیں مزید سنانے کے لئے پُر زور مطالبہ کیا ہے۔ مگر آغا امیر قزلباش اپنی جگہ پر بیٹھ گئے ہیں مگر گوہر نوشاہی کی فرمائش پر آغا امیر مائک پر پھر آگئے ہیں اور ارشاد ہو رہا ہے ؎

جانے یہ کس کی بنائی ہوئی تصویریں ہیں
تاج سر پر ہیں مگر پاؤں میں زنجیریں ہیں

داد اس شعر کا حق ہے اور یہ حق اسے پورے پورے انصاف سے ملا ہے۔ آغا صاحب فرما رہے ہیں ؎

کیا مری سوچ تھی کیا سامنے آیا میرے
کیا میرے خواب تھے کیا خواب کی تعبیریں ہیں

اک پرندہ ابھی اُڑان میں ہے
تیر ہر شخص کی کمان میں ہے
جس کو دیکھو وہی ہے چپ چپ سا
جیسے ہر شخص امتحان میں ہے
زندگی سنگ دل سہی لیکن
آئینہ بھی اسی چٹان میں ہے

اب آغا امیر قزلباش جناب کیفؔ بھوپالی کی فرمائش پر غزل عطا فرما رہے ہیں۔ ؎

کچھ تو اپنی نشانیاں رکھ جا
ان کتابوں میں تتلیاں رکھ جا
لوگ تھک ہار کر نہ لوٹ آئیں
راستے میں کہانیاں رکھ جا
ان درختوں سے پھل نہیں گرتے
ان کے نزدیک آندھیاں رکھ جا
منتظر کوئی تو رہے مجھ کو
گھر کے باہر اداسیاں رکھ جا
ہو رہا ہے اگر جدا مجھ سے
میری آنکھوں پہ انگلیاں رکھ جا
آج طوفان بھی اکیلا ہے
تو بھی ساحل پہ کشتیاں رکھ جا

اب جناب خدا داد مونس جے پوری مائک پر تشریف لائے ہیں۔ یہ پہلے شاعر ہیں جو شاعرے میں ایک قومی نظم پڑھنے

اختتام مشاعرہ ہو رہے ہیں۔ نظم کا عنوان ہے "آزادی"۔ اتحاد علامہ ادیب" نظم یقیناً قابل تعریف ہے اور مونس صاحب نے اسے پڑھا بھی خوب انداز سے ہے اگر شاعر کو اپنے آپ پر اعتماد ہو تو ایسے مشاعروں میں قومی اور حب الوطنی سے لبریز کلام بھی داد لے ہی لیتا ہے گو سامعین میں ایسے بدبخت بھی موجود ہیں جو اس نظم کے دوران بکواس سے اپنے خاندان کا وطن دشمن ہونے کا اعلان کر رہے ہیں۔ ان کی پوری نظم ملاحظہ فرمایئے۔ ؎

اپنے ہاتھوں میں پھر یرا لئے آزادی کا
اتحاد وطن و قوم کا ہوتا ہے نقیب
ترجمان غم دل بخیہ گر چاک خیال
ایک انسان ہے دنیا جسے کہتی ہے ادیب
کیا عجب چیز ہے جادو سے بھرا اس کا قلم
جس کی گل کاریاں مشہور ہیں گلکاروں میں
موم کر دیتا ہے پتھر کو جو گرمی دے کر
روح کا نور جو بھر دیتا ہے انگاروں میں
ہو اگر ذکر بہار چمنستان وطن
ایک بیک ابر گہربار یہ بن جاتا ہے
کوئی دشمن ہو اگر بر سر پیکار اس سے
ایک چلتی ہوئی تلوار یہ بن جاتا ہے
اس کے احساس کی گرمی کا ٹھکانہ توبہ
جس سے ٹکرائیں تو لو دینے لگیں دل کے کنول
عشق صادق پہ جو ڈالے یہ نگاہ ممتاز
آن کی آن میں تعمیر ہوں سو تاج محل
مصلح قوم بھی ہے وقت کا نباض بھی ہے
یہ صحافی بھی ہے عالم بھی بڑا جید ہے
کشتی قوم کو طوفان سے بچانے والا
نام مونس ہے یہی اور یہی سرسید ہے
بن کے حسرت کبھی چکی کی مشقت جھیلی
جوش بن کر کبھی زنجیر کو توڑا اس نے
امتحاں گاہ کشش میں بالو کے دیئے لاکھ مگر
ہاتھ سے دامن امید نہ چھوڑا اس نے
اس نے ٹیگور کا اقبال کا دھارا جب روپ
ہر تمنا دل مغرب کی کچل کر رکھ دی
سامنے آیا جو آزاد و جواہر بن کر
اس نے تاریخ ہی مشرق کی بدل کر رکھ دی
اس نے بھر دی مئے گلرنگ وہ آزادی کی
اجنبی ہو گئے سب ساغر و مینائے وطن
کتنے ہی جاتے اندھیروں میں بھٹکنا ہوتا
یہ نہیں ہوتا اگر دیدۂ بینائے وطن
... آنے پہ یہی مرد مجاہد مونس
... و دولت ہی نہیں خون جگر دیتا ہے
دل میں احساس کے نشتر کا چبھونے والا
بجلیاں یادوں کے اقوام میں بھر دیتا ہے

اب جناب سردار جعفری مائک پر آ گئے ہیں اور اپنی پچاس سالہ پرانی نظم ہاتھوں کا ترانہ سنانے لگے تو سامعین نے بہ آواز بلند مطالبہ کیا ہے کہ تازہ کلام سنایئے ـــــ اس پر سردار جعفری صاحب فرمانے لگے کہ ۱۹۴۳ء کی کہی ہوئی نظم سنئے جو نہ ریڈیو پر آئی ہے اور نہ کہیں سنائی گئی ہے اور نہ ہی کہیں شائع ہوئی ہے۔ اس پر ایک آواز آتی ہے کہ اس نظم کی کب ولادت ہوئی تھی۔ اس پر سردار جعفری غضبناک ہو کر کہنے لگے اپنی والدہ سے پوچھئے۔ سنجیدہ طبقہ سردار جعفری صاحب سے ایسے جواب کی امید نہیں رکھتا تھا۔ اگر شعرا از خود ایسے مشاعروں میں ایسا کلام سنائیں جو عوام نے کئی بار نہ سنا ہو تو ایسی بدمزگی کا امکان نہ رہے بہرکیف سردار جعفری صاحب "ورق ناخواندہ" سنا رہے ہیں حالانکہ یہ بھی شائع شدہ اور کئی بار کا شائع شدہ کلام ہے۔ اب وسیم صاحب نے محترمہ بیگم ممتاز مرزا (پدم شری) کو نہایت عزت و احترام کے ساتھ کلام بلاغت نظام عطا فرمانے کی درخواست کی ہے۔ سنئے ممتاز صاحبہ غزل عطا فرما رہی ہیں ؎

سوادِ شام کے منظر بڑے سہانے لگے
اُس کے سارے پڑوسی دیئے جلانے لگے

چمن میں عہدِ بہاراں کا جشن ہے شاید
کہ بجلیوں کو نشیمن گلے لگانے لگے

زباں پہ حرفِ غزل، دل میں درد، آنکھ میں اشک
عجب نہیں مجھے اپنے پہ رشک آنے لگے

مری حیات کی تاریک و تیرہ راہوں میں
کسی کے نقشِ قدم روشنی دکھانے لگے

ہمیں بھی اپنی وفاؤں کی داد ملنے لگی
خوشا کہ سنگِ ملامت اِدھر بھی آنے لگے

شکستِ شوق کو عنوانِ آرزو کہیئے
بھلانا چاہا تو کچھ اور یاد آنے لگے

محترمہ ممتاز مرزا جس قدر شاعری میں ممتاز مقام رکھتی ہیں اُنھیں ویسی ہی داد بھی ملی۔ اب اعلان ہوا ہے کہ جناب کیف بھوپالی صاحب مائک پر تشریف لا رہے ہیں۔ کیف صاحب فرما رہے ہیں کہ اُنھوں نے پہلی بار لال قلعہ کے مشاعرہ میں شرکت کی ہے اور اس کی وجہ سے اُنھوں نے دلّی کا لال قلعہ بھی آج ہی دیکھا۔ کیف صاحب نے یہاں بھی اپنی وہی غزل سنانی شروع کی ہے جو وہ دہلی میں جب جب بھی کسی مشاعرہ میں بُلائے گئے تو یہی غزل سُنا چکے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا بجا ہے کہ وہ جہاں بھی کسی مشاعرے میں جاتے ہیں تو یہی غزل سُناتے ہیں۔ آپ بھی اس غزل کے کچھ اشعار سُن لیجیئے ؎

ہائے لوگوں کی کرم فرمائیاں
تہمتیں، بدنامیاں، رسوائیاں

زندگی شاید اسی کا نام ہے
دُوریاں، مجبوریاں، تنہائیاں

کیا یہی ہوتی ہے شامِ انتظار
آہٹیں، گھبراہٹیں، پرچھائیاں

زخمِ دل کے پھر ہرے کرنے لگیں
بدلیاں، برسات کی پُروائیاں

کیف پیدا کر سمندر کی طرح
وسعتیں، خاموشیاں، گہرائیاں

فلم شنکر حسن اور کچھ دیگر فلموں کے گیت کار جناب کیف بھوپالی سے سامعین نے ایک غزل اور سُنانے کی درخواست کی ہے سُنئے کیف صاحب اپنے مخصوص انداز میں غزل سُنا رہے ہیں ؎

کون آئے گا یہاں کوئی نہ آیا ہوگا
میرا دروازہ ہواؤں نے ہلایا ہوگا

گل سے لپٹی ہوئی تتلی کو گرا کر دیکھو
آندھیو تم نے درختوں کو گرایا ہوگا

دلِ ناداں نہ دھڑک اے دلِ ناداں دھڑک
کوئی خط لے کے پڑوسی کے گھر آیا ہوگا

اس گلستاں کی یہی ریت ہے اے شاخِ گلاب
تُو نے جس پھول کو پالا وہ پرایا ہوگا

کیف پردیس میں مت یاد کرو اپنا مکاں
اب کی بارش کو اسی بارش نے گرایا ہوگا

کیف صاحب کے بعد وسیم صاحب نے مُلک کے منفرد شاعر جناب نازش پرتاب گڑھی سے کلام عنایت فرمانے کی گزارش کی ہے نازش صاحب کا کردار ایک وطن پرست شاعر کا رہا ہے اور وہ ثابت قدمی سے اپنے نظریے کے اظہار کے لئے اپنی قومی نظموں سے اہلِ وطن کو وطن پرستی اور قومی یک جہتی کی تلقین کرتے رہے ہیں آج وہ نظم "جگاوا" پیش کر رہے ہیں۔ نازش صاحب کی طبیعت خراب ہے اس لئے اُنھوں نے صدرِ مشاعرہ سے اجازت چاہی ہے کہ اُن کی نظم دکیش کمار شکلا سُنا رہے ہیں دیکھا تو ایک دھان پان سا نو عمر دیہاتی لڑکا بھونگڑا الحن داؤ دکوان الفاظ کے اتار چڑھاؤ میں سمو رہا تھا

جاگ اُٹھو، جاگ اُٹھو، جاگ اُٹھو ساتھیو
جاگ اُٹھو
آنچلوں میں کوئی سرسراہٹ نہیں

—— رسمساہٹ نہیں
پائلیں ہیں مگر چھن چھناہٹ نہیں
کوئی آہٹ نہیں
پنگھٹوں پر کہیں گنگناہٹ نہیں
ہونٹ مُرجھا گئے
پھُول کُمہلا گئے
چہرۂ زندگانی دُھواں ہو گیا
ہر تبسّم سوگیا
اپنی غفلت کو دُور اب کرو ساتھیو
جاگ اُٹھو
ساتھیو!
جاگ اُٹھو، جاگ اُٹھو، جاگ اُٹھو ساتھیو
جاگ اُٹھو

داد کا شور ہے کہ لال قلعہ نے آج اس مشاعرہ میں اب تک نہ سنا تھا۔ دکیش کمار شکلا اپنے صاف ستھرے ترنم صحیح تلفظ اور الفاظ کے اتار چڑھاؤ سے ترنم سے پڑھنے والے شعراء کو بتا رہا ہے کہ ترنم کسے کہتے ہیں اور گیت کیسے پڑھا جاتا ہے سُنیئے شکلا جناب نازش پرتاب گڑھی کے گیت کو کس طرح زندہ جاوید کر رہا ہے ؎

ہر قدم پر ہر ایک سمت سے وار ہے
—— ہر طرف خار ہے
زندگی خواب میں، موت بیدار ہے
—— ہر شجر دار ہے
راستہ ہے کہ تلوار کی دھار ہے
دُور منزل سہی
دوست قاتل سہی
سر تمھارے مگر کس لئے جھک گئے
کیوں قدم رُک گئے
ہر چڑھائی پہ چڑھتے چلو ساتھیو
جاگ اُٹھو۔ ساتھیو!

جاگ اُٹھو، جاگ اُٹھو، جاگ اُٹھو ساتھیو
جاگ اُٹھو
سنسناہٹ میں ایک گیت ڈھل جائے گا
—— راگ بل جائے گا
تیز طوفان کا رُخ بدل جائے گا

نازش صاحب کا گیت اور شکلا کا ترنم نیز سامعین کی یہ تثلیث آج کے مشاعرہ میں حاصل مشاعرہ بن کر رہ گئی نازش صاحب سوچ رہے ہیں کہ اگر میں خود اس گیت کو تو داد واد تو دُور کی بات رہی شاید ہوٹنگ ہو جاتی تو اُن کے دماغ میں غالب کا یہ فرمان ؏
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
بار بار اُبھر کر آ رہا ہے اور وہ دل ہی دل میں اس مصرعے کو دُہرا رہے ہیں کہ ؏
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں خوش گلو کو میں
سُنیئے شکلا کلام نازش کو اپنے ترنم سے کس طرح سامعین کے دلوں میں اُتار رہا ہے۔

دار جل جائے گا
گرم ہو جاؤ لوہا پگھل جائے گا
لو بگل بج گیا
قافلہ سج گیا
راستے کوہساروں میں مل جائیں گے
پھُول کھِل جائیں گے
ایک گیت، ایک لَے میں ڈھلو ساتھیو!
جاگ اُٹھو ۔ ساتھیو
جاگ اُٹھو، جاگ اُٹھو، جاگ اُٹھو ساتھیو!
جاگ اُٹھو ۔
جام موجود ہے، سرخوشی ڈھونڈھ لو
—— روشنی ڈھونڈھ لو
ساز ہاتھوں میں ہے۔ راگنی ڈھونڈھ لو
—— تازگی ڈھونڈھ لو

موت کی گود میں زندگی ڈھونڈھ لو
—— رات کھو جائے گی
—— صبح ہو جائے گی
ملک پہ جو مرا وہ امر ہو گیا
—— روشنی ہو گیا
سر ہتھیلی پہ لے کر بڑھو ساتھیو!
—— جاگ اُٹھو —— ساتھیو!

شگلا کو گورنر صاحب نے تھپکی دی ہے اور اُس کے ترنم اور گیت کو بہترین انداز میں پیش کرنے پر آشیرواد دیا ہے۔ شگلا نے مشاعرہ کی فضا گیت اور ترنم میں سمو کر رکھ دی ہے اور یہاں وسیم صاحب نے غلط انتخاب فرما کر سعید شیرازی حیدرآبادی کو مائک پر آنے کی تکلیف دی ہے یہ مشکل سے دو شعر بھی نہ سُنا سکے تھے کہ ہوٹنگ ہو رہی ہے۔ آدمی سمجھدار ہیں فوراً ہی مائک چھوڑ کر اپنی جگہ آگئے ہیں ویسے ان کے حسب ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے

کیوں اُن کے ماتھے پر شکن ہے کیا وہ مجھے پہچان گئے ہیں
اپنا کہا منوانے والے۔ میرا کہنا مان گئے ہیں۔
وہ جو اچانک سامنے آئے۔ کتنوں کے ایمان گئے ہیں

اب جناب جگن ناتھ آزاد سے وسیم صاحب نے کلام عنایت فرمانے کی التجا کی ہے۔ آزاد صاحب نے اپنی مشہور مطبوعہ نظم جوش و فراق سُنائی ہے اور اچھی داد پائی۔ راقم تو گزشتہ برس لال قلعہ کے مشاعرہ میں موجود نہیں تھا مگر اسٹیج پر شعراء کا فرمان تھا کہ آزاد صاحب نے گزشتہ برس بھی لال قلعہ کے مشاعرہ میں یہی نظم سنائی تھی۔

اب حضرت فنا نظامی کانپوری تالیوں کی گونج میں مائک پر آئے ہیں اور ترنم میں اپنا ایک مشہور اور بہت پرانی غزل عنایت فرما رہے ہیں ؎

تُو سے لکھ کے مجھے اک کتاب دینا ہے
کہ قطرے قطرے کا مجھ کو حساب دینا ہے
مجھے تو جان بچانا ہے اک شرابی کی
اُسے کہیں سے بھی لا کر شراب دینا ہے
وہ گفتگو میں مخاطب تو تھا سبھی سے مگر
یہ جانتا تھا کہ مجھی کو جواب دینا ہے
بہار والو چمن کو نہ اس طرح روندو
تمھیں گلوں کا خزاں کا حساب دینا ہے
چمن اُجاڑ رہا ہے یہ کہہ کے اب گلچیں
ہر ایک شاخ کو تازہ گلاب دینا ہے
مدد کرو مری اے عاشقانِ پختہ شعور
کہ اک حسین کے خط کا جواب دینا ہے
تو بدگماں نہ ہو مجھ سے اے مری شبنم
تمھیں چراغ نہیں ماہتاب دینا ہے
فنا کچھ اس کے سوا کر نہ پائیں گے احباب
کہ ایک دن مجھے مٹی میں داب دینا ہے

فنا صاحب اچھی داد و ستائش سمیٹتے ہوئے مائک سے ہٹے تو وسیم صاحب جناب غلام ربانی صاحب تاباں کو کلام سُنانے کی زحمت دی ہے تاباں صاحب ایک پرانی غزل سُنا رہے ہیں ؎

چراغ بن کے جلے دل گلاب بن کے کھلے
شکوں کی آس کسے ہے ملے ملے نہ ملے
جنوں کی خیر ہو ہم کیا ہمارے دامن کیا
ہزار بار پھٹے ہیں ہزار بار سلے
ہوائے دشت بڑی خوشگوار ہوتی ہے
یہ اور بات ہے بیتا کوئی ملے نہ ملے
ہے یہ بھی اہلِ سیاست کا معجزہ تاباں
کسی کو نیند عطا ہو کسی کو خواب ملے

تاباں صاحب بہت اچھی داد پانے کے بعد اپنی جگہ تشریف لے گئے تو شہیر مچھلی شہری مائک پر تشریف لائے ہیں اور خلاف توقع متفرق اشعار سنانے کی بجائے غزل ارشاد فرما رہے ہیں ؎

گھر ہو کہاں حسنِ تمنا دکھائیے
سورج کی شاخ شاخ پہ شبنم اُگائیے

اب جرم بڑھ رہے ہیں تو کس کا قصور ہے
کس نے کہا تھا آپ سے زنداں سجائیے

ممکن ہے کل زبان و قلم پر ہوں بندشیں
آنکھوں کو گفتگو کا سلیقہ سکھائیے

داد ہے کہ یہ شعر اپنا حق وصول کر رہا ہے دو بار یہ شعر
سنانے کے بعد شبیر صاحب فرما رہے ہیں ـــ

ہوا لباس پہننے سے پیشتر
اپنا مزاج اُس کے مطابق بنائیے

کیا داد مل سکے گی یہ گونگوں کا شہر ہے
افسانۂ حیات یہاں مت سنائیے

ممکن تجربات کے باعث نظر شبیر
دشمن اگر نہیں ہے تو دشمن بنائیے

شبیر صاحب اور داد کا چولی دامن کا ساتھ ہے لہذا شبیر
صاحب ہر شعر پہ داد پاتے ہوئے مائک سے الگ ہوئے
ہیں۔ جناب راج نرائن صاحب راز مائک پر تشریف لائے
ہیں۔ اور غزل عطا فرما رہے ہیں ـــ

میں سنگلاخ زمینوں کے راز کہتا ہوں
میں آئینہ، بن کے چٹانوں کے بیچ گونجا ہوں

طلوعِ صبح کا منظر عجیب ہے کتنا
مرا خیال ہے میں پہلی بار جاگا ہوں

مرا وجود غنیمت ہے، سوچیے تو سہی
میں خشک ڈال کا پتہ ہرا ہرا سا ہوں

بجا کہ روز اندھیرا مجھے نگلتا ہے
میں روز اک نیا خورشید بن کے اُٹھتا ہوں

میں جانتا ہوں، کہ معیارِ ارتقا کی کیا صورت
میں آہ بن کے اُٹھا، ابر بن کے برسا ہوں

مجھے تلاش کریں گے، نئی رُتوں میں لوگ
میں گہری دھند میں لپٹا ہوا جزیرہ ہوں

بس اک سوال نے رکھا ہے مدتوں بے چین
میں کس کا روپ ہوں، میں راز کس کا ہوں

راز صاحب کو بہت اچھی داد ملی ہے۔ غالباً لال قلعہ
مشاعرہ میں راز بھی پہلی بار شریک ہوئے ہیں اب وسیم
نے جناب بیکل اتساہی سے کلام سنانے کی دعوت دی
ہے اور سامعین نے پُرزور تالیوں سے بیکل صاحب
استقبال کیا ہے۔ بیکل صاحب تحت میں غزل
کر رہے ہیں ـــ

تیری آئینہ گری میں جلوۂ ادراک تھا
نور تو نے بھر دیا تھا ورنہ میں تو خاک

آج ساحل پہ اُسی کی لاش لاوارث ملی
لوگ کہتے ہیں زمانے کا بڑا تیراک

بھاگتی سڑکیں نگلنا چاہتی تھیں وقت کو
وقت اک بچہ تھا لیکن کس قدر چالا

آج یہ جو اجنبی ہے دوستوں کی بزم میں
کل یہی تنہائی میں مجھ سے بہت بے

کوئلے کی کان میں یہ کون دب کر رہ گیا
کوئی ہیرا تھا مگر اُس کا کلیجہ چاک

اب ترنم سے ارشاد ہوا ہے ـــ

زندگی بہار ہو گئی ـــ حادثوں کی یار ہو گئی
کتنا غریب کی کلی ـــ بڑھ کے کاروبار ہو
دوستوں کا کارواں چلا ـــ دوستی غبار ہو
جب سے غم نے مول لے لیا ـــ یہ خوشی ادھار ہو

داد کی آوازوں میں بیکل صاحب اپنی جگہ پر آگئے ہیں مگر
کا مطالبہ ہے کہ انہیں پھر سے کلام سنانے کی درخواست
جائے لہذا وسیم صاحب نے بیکل صاحب سے استدعا کی
کہ وہ پھر مائک پہ تشریف لے آئیں۔ اب بیکل صاحب
ایک نظم استقبال سنائی ہے جس میں ہندی الفاظ کی
ہے اور نظم سنائی بھی تیز رفتاری سے جا رہی ہے لہذا
نقل کرنا ممکن نہ تھا۔ نظم کے بعد سامعین کی فرمائش پر

نے اپنا مشہور گیت جلا غزل سنا کر خوب داد پائی ہے
اب مشاعرے کا مقطع جناب حسرت جے پوری سے مائک پر آنے کی درخواست کی گئی ہے حسرت صاحب مائک پر تشریف لائے تو فرمانے لگے کہ میں گورنر صاحب ۔ ڈاکٹر صلاح الدین صاحب اور اردو اکاڈمی کے سکریٹری صاحب کا شکر گزار ہوں کہ مجھے پہلی بار اس مشاعرے میں بلایا گیا اور تو ساری حسرتیں پوری ہو چکی ہیں ایک حسرت یہ رہ گئی تھی آج یہ بھی پوری ہو گئی ۔ آواز آئی ہے (آمین) سُنئے حسرت صاحب کیا فرما رہے ہیں ؎

جگر میں درد لایا ہوں نظر میں پیار لایا ہوں
محبت کے حسیں دامن میں بھی ایک سایہ ہوں

محفل میں آج اُن کا اثر دیکھتے رہے
حق عاشقوں کی بھیڑ جدھر دیکھتے رہے

اُن سے ہر روز ملاقات ہوا کرتی ہے
کتنی رنگین مری بات ہوا کرتی ہے
اُن کی آنکھیں بھی محبت کی زباں رکھتی ہیں
بات کرتے بھی نہیں بات ہوا کرتی ہے

قطعہ کے بعد غزل شروع کی ہے ؎

عشق جب ایک طرف ہو تو سزا دیتا ہے
عشق جب دونوں طرف ہو تو مزا دیتا ہے
آگ میں آگ لگاتا ہے سلگتے دل کو
جب وہ ملتا ہے تو دامن سے ہوا دیتا ہے
اے نمک پاش تری سانولی صورت کی قسم
دل کا ہر زخم مجھے دل سے دُعا دیتا ہے
اپنے ماتھے پہ یہ بندیا کی جھلک رہنے دو
یہ ستارا مجھے منزل کا پتا دیتا ہے
مَیں کسی جام کا محتاج نہیں ہوں حسرتؔ
میرا ساقی مجھے آنکھوں سے پلا دیتا ہے

فلمی دُنیا کے شاعر جناب حسرت جے پوری کو اپنے کلام پر داد نہ ملنے پر پتہ چل گیا ہوگا کہ انھیں اب تک نال تلعہ کے مشاعرہ میں کیوں مدعو نہیں کیا گیا ہے ڈیڑھ بجے مشاعرہ کا پہلا دور ختم ہو گیا ہے ۔ اور اب غیر مائشی دور شروع ہو رہا ہے ۔ مشاعرہ کی رُوداد لکھتے لکھتے مَیں بھی تھک گیا ہوں ۔ لہٰذا اب مَیں بھی غیر مائشی دور سے لطف اندوز ہونگا دوسرا دور دو بج کر بیس منٹ تک چلا ۔ مشاعرہ بحیثیت مجموعی اچھا رہا جس پر اردو اکاڈمی کے سکریٹری شریف الحسن صاحب نقوی کو مبارکباد دی جا رہی ہے ۔

جناب وسیم بریلوی نے اکثر اوقات سامعین سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا کہ آپ حضرات نے اس شاعر کو برداشت کیا آپ کا شکریہ یعنی دوسرے الفاظ میں یہ اعلان کر رہے تھے کہ شاعر کو ہوٹنگ کیا جانا چاہیے تھا مگر آپ نے اسے بخش دیا ۔ ایک اناؤنسر کے لئے ایسا کہنا زیب نہیں دیتا ۔ اور پھر وسیم صاحب ایسے سلجھے ہوئے ناظم شاعر سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی ۔ عزیز وارثی صاحب مشاعرہ میں مدعو نہ ہونے کے باوجود اسٹیج پر آئے اور رندِ خراباتی کی معنوی تفسیر بن کر آئے اور کھلے بندوں رفعت سروش کو گالیاں دیتے رہے کہ انھیں مشاعرہ میں رفعت صاحب نے ہی مدعو ہونے نہ دیا نیز وہ دوسرے لفظوں میں عزیز وارثی صاحب نے اس طرح اسٹیج پر آ کر بلا اِل سے پکار پکار کر یہ ظاہر کیا کہ اُن کی حق تلفی کی گئی ہے مگر کسی طرح بھی عزیز صاحب کا یہ فعل قابلِ تعریف نہیں کہا جا سکتا ۔ ۔

ساغر نظامی کا انتقال

۔ ۲ فروری کی صبح کو جناب ساغر نظامی اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے ۔ تقریباً چھ، سات ماہ سے ساغر صاحب علیل تھے ڈاکٹروں نے انھیں ہڈیوں کے سرطان میں مبتلا بتایا تھا ساغر صاحب کا انتقال جہاں اردو کیلئے انتہائی نقصان دہ ہے وہاں ملک اور قوم نیز اُن کے خاندان کیلئے بھی اُن کی یہ دائمی جدائی تکلیف دہ ہے ہیں ساغر صاحب کے پسماندگان اور اُن کے جملہ سوگوار

ملک و قوم کی شاندار ترقی کیلئے

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی

کے

جدید بیس نکاتی پروگرام

کی کامیابی اور اسے عملی جامہ پہنانے میں

بمبئی مرکنٹائل کو آپریٹو بینک لمیٹڈ

پوری طرح مستعد ہے اور اپنی تمام تر خدمات وقف کر رہا ہے

بینک نے موجودہ قرضہ جات کی رقم کا ۴۰ فیصد سے زائد اس پروگرام کے تحت پسماندہ طبقوں کو فراہم کیا ہے

ہیڈ آفس ۷-۸ محمد علی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳
فون نمبر ۳۲۵۳۱۱-۴۵
دہلی برانچ ۲۶۵۵ نیتا جی سبھاش مارگ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
فون نمبر ۳۲۳۲۷۲ - ۲۶۸۲۶۶

سارے جہاں سے اچھا......

ڈاکٹر اودے سرن ارمان
(بلاروی)

ہمارے ہاں ریل گاڑی کے ڈبوں - موٹر بسوں اور
ینما ہالوں اور دیگر مخصوص مقامات پر لکھا ہوتا ہے نو سموکنگ
ر عام طور پر اس کی خلاف ورزی کی جاتی ہے اسی طرح
گلستان میں بھی فیری - کوچ - ٹرین - ٹیکسی اور جہازوں
نو اسموکنگ لکھا ہوتا ہے مگر کیا مجال ہے کہ کوئی بھولے سے
ں اس کی خلاف ورزی کرے -

لنڈن کا سائنس میوزیم اور موم کی مورتیاں دیکھ کر میں
ب لائن (زمین دوز ریل گاڑی) سے اپنے ہیڈ کوارٹر ہرد
ن داہل" لوٹ رہا تھا - اور میں اہل انگلستان کے ڈسپلن
ور "نو اسموکنگ" کی وارننگ پر عمل کرنے کے مقابلے میں
پنے ملک کے عوام کی ڈسپلن شکنی اور ضروری ہدایات کی
لاف ورزی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ گاڑی کی
تار کم ہوئی اور وہ ایک اسٹیشن پر رکی میں نے باہر جھانک
ر دیکھا تو یہ "ویمبلے" اسٹیشن تھا - گاڑی رکتے ہی
روازے اپنے آپ کھل گئے اور جن لوگوں کو سوار ہونا تھا
ر جن لوگوں کو اس اسٹیشن پر اترنا تھا نہایت خاموشی
ر مہذبانہ انداز میں گاڑی پر سوار ہوئے اور اترے - وقت
زرنے کے بعد دروازے خود بخود بند ہو گئے - اور گاڑی بغیر
سل دیئے چل پڑی - انگلستان کے لوگ شور اور ہلڑ بازی
طعاً پسند نہیں کرتے - یہاں تک کہ موٹر گاڑی چلانے
الے بھی ہارن کا شاذ و نادر ہی استعمال کرتے ہیں -

ویمبلے اسٹیشن سے سوار ہونے والوں میں سے ایک
ڑا میری سامنے والی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا - میں نے رنگین چشمے
سے ان پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی وہ دونوں مجھے دیکھ کر
سکرا رہے تھے میں بار بار انھیں کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا
یسے رنگین چشمے لگانے سے یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ جس

کو دل چاہے جی بھر کر دیکھا جا سکتا ہے اور جسے دیکھا جا رہا
ہے اسے گمان بھی نہیں ہوتا کہ اسے کوئی دیکھ رہا ہے -

یہ حسین جوڑا ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں مصروف
تھا - اور مجھے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا - انگریز لڑکی نے
اپنے دونوں گھٹنوں کو ٹکراتے ہوئے اپنے ساتھی سے کچھ کہا اور
دونوں اٹھ کر میرے پاس آ بیٹھے - میں نے ایک طرف کھسکتے
ہوئے انھیں آرام سے بیٹھنے کے لئے جگہ دی تو دونوں نے نہایت
شائستگی اور ملائمت کے ساتھ "تھینک یو" کہا - میں نے
مسکراہٹ سے ان کے "تھینکس" کا جواب دیا اور انگریز مرد
نے "ہیلو" کہتے ہوئے مجھ سے مصافحہ کیا - میں نے اندازہ لگایا
کہ یہ صاحب مجھ سے کچھ کہنا سننا چاہتے ہیں - اس کے بعد
لڑکی نے مجھ سے ہاتھ ملایا - نرم روئی سا ملائم ہاتھ زندگی میں
پہلی بار کسی دوسری عورت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا - ہماری اور
انگریزی تہذیب میں بہت بڑا فرق ہے - ہمارے یہاں بھی
عورت کو مرد کے برابر سمجھا جاتا ہے - اور عورت کو بڑا درجہ
دینے کی غرض سے رام سے پہلے سیتا جی کا نام لیتے ہیں اور بھگوان
کرشن کا نام لینے سے پہلے رادھا جی کا نام لیتے ہیں - یعنی جے
سیتا رام - جے رادھے کرشن وغیرہ - مگر یہ سب کچھ کھوکھلا نا
آشنا ہے اور جھنجھناتی جھانجھ کی طرح محض دکھاوا ہے اور
مصنوعی اعزاز بھی ہے اور جو مشرقی عورت کو صرف اور صرف
بیوقوف بنانے کے مترادف ہے - یہاں کا آدرش وار عمل کا
منہ دیکھتا ہے -

انگریز مرد نے بڑی بے تکلفی سے مخاطب ہوتے ہوئے
کہا آپ ہندوستانی معلوم ہوتے ہیں - میری شیروانی اور چوڑی
دار پائجامے پر نظریں جمائے اس کی بیوی آگے کو جھکی ہوئی
کسی قدر حیرانی سے دیکھ رہی تھی کہ میں اس سوال کا جواب کیں

طرح دیتا ہوں - یعنی میں انگریزی بول بھی سکتا ہوں یا نہیں۔ اور اگر [illegible] تو میرا تلفظ کیسا ہوگا - میں نے اُسے جنگل میں کے بجائے بھائی کہتے ہوئے انگریزی میں کہا کہ آپکا خیال بالکل صحیح ہے۔

آپ ہندوستان میں کہاں کے رہنے والے ہیں - یہ انگریز کا دوسرا سوال تھا - میں نے اختصار سے کام لیتے ہوئے کہا - دراصل میرا خیال تھا کہ اسے اگر میں تفصیل سے بھی بتاؤنگا تو یہ کیا سمجھ پائے گا - ہندوستان بہت بڑا ملک ہے اسے میں کہاں تک بتا رہوں گا - ہندوستان میں ایک صوبہ اتر پردیش ہے اس کے ضلع مراد آباد میں ایک تحصیل بلاری ہے مگر میں حیرت میں رہ گیا - جب اس انگریز مرد نے کہا کہ اوہ تب تو آپ ہندوستان کے مشہور مندر "تروپتی" کے قریب کے رہنے والے ہیں۔ میں نے کسی قدر تعجب سے دریافت کیا کہ کیا آپ نے ہندوستان دیکھا ہے ؟ "اوہ یس" کہتے ہوئے اُس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بتایا کہ ہم دونوں نے آپ کا ملک خوب گھوم پھر کر دیکھا ہے۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۴ء کے دن جب اندرا گاندھی کو ان کے کچھ ملازمین نے توڑ پھوڑ کرانے والے کچھ بیرونی دشمنوں سے روپیہ لے کر بی۔ بی۔ سی کے تاروں میں آگ لگا دی تھی تب ہم دونوں آگرہ کا تاج محل دیکھ رہے تھے یہ الفاظ سنتے ہی میرے دل کو دھکا لگا - کیونکہ میں یہ سب کچھ جانتا تھا مگر جس طرح ایک آنکھ والا اپنے آپ کو "کانا" کہلوانا پسند نہیں کرتا - لہذا میں نے اس خدشہ سے کہ بات سانپ سے اژدھے تک نہ پہنچنے پائے وگرنہ ہو سکتا تھا کہ وہ بعض ہندوستانیوں کی اپنے ملک سے غداری اور ہمارے ہاں کے کچھ بداخلاق لوگوں کے بارے میں نہ جانے کیا کچھ کہتا۔ موضوع سخن بدلتے ہوئے کہا کہ کیا آپ نے "تروپتی" کا مندر بھی دیکھا ہے اس نے کسی قدر حقارت سے کہا جی ہاں یکم جنوری کو ہم نے اس مندر کے درشن کرنے کے لئے پچیس ۲۵ پچیس ۲۵ روپے کے دو ٹکٹ خریدے تھے وہاں ہر شخص کو ٹکٹ لینا ضروری ہوتا ہے اور یہ سلسلہ نہ معلوم کب سے چل رہا ہے اور کب تک چلتا رہے گا - انگریز مرد نے انتہائی حیرت سے کہا کہ کہیں پورے ہندوستان میں کسی بھی عمارت یا میوزیم یا فورٹ کے دیکھنے کے لئے اس قدر مہنگا ٹکٹ نہیں خریدنا پڑا پھر بھی ہم نے پچیس روپے والے ٹکٹ کو بہت سستا سمجھا ہندوؤں کے بھگوان کے درشن ہو گئے اور پنڈے پجاریوں کی "بلند نظری" دیکھ لی - "ہندوؤں کے بھگوان" کہہ کر اس نے بُت پرستی - دقیانوسیت اور اندھے یقین اور برہمن پر جو زبردست چوٹ کی تھی جسے میں نے بڑی طرح محسوس کیا - ایک انگریز کا یہ تیکھا ریمارک اہل خرد و ہوش کے لئے ایک تازیانے سے کم نہیں تھا - یہ انگریز خاصا ذہین اور اچھی قابلیت کا مالک تھا - اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بتایا کہ جس روز ہم دونوں نے "تروپتی" کے درشن کئے ہمیں بتایا گیا تھا کہ اس روز بیس لاکھ روپے کی آمدنی مندر کو ہوئی - اگر مذہبی عقیدت مندی سے دیا گیا ٹکٹ کی صورت میں حاصل کیا گیا - یہ روپیہ قومی اور عوامی فلاح و بہبود پر لگایا جاتا تو آپ کے ملک کی کایا پلٹ جاتی جتنا اسلحہ امریکہ پاکستان کو دے رہا ہے اُس سے کہیں زیادہ اسلحہ صرف "تروپتی" مندر کی آمدنی سے خریدا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے وہاں محسوس کیا کہ آپ کا ملک مذہبی عقیدے سے ٹکر نہیں لے سکتا - یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنی بیوی کی طرف تصدیق طلب نظروں سے دیکھا اور سُرخ گلاب کی پنکھڑی سے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرتی ہوئی سر جھٹکتے ہوئے بولی - "آف کورس" آپ "لال قلعہ" اور "تاج محل" کیسے لگے - میں نے موضوع میں تبدیلی لانے کے لئے استفسارانہ لہجے میں کہا - انگریز نے رواں دواں انگریزی میں کہا - بہت اچھے لگے مگر یہ ملک میں زیادہ تر عوام پر غریبی کو مسلط دیکھ کر ان کے درد سے کراہتی ہوئی آواز زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ کلا کے یہ حسین و جمیل بے مثال نمونے عوام کی غریبی دور کرنے میں ہمیشہ ناکام رہے ہیں - اتنے غریب

میں اتنی گھماں اور شاندار عمارتیں سیاحوں کے لئے دلچسپی کا موجب تو ہو سکتی ہیں مگر ہندوستانی عوام کو ان سے کیا فائدہ پہونچا۔ سارے ملک میں مسجدوں محلوں۔ مقبروں کے علاوہ کہیں بھی ناالنسد ایسی کوئی بھی رفاہِ عام کی چیز تعمیر نہیں کروائی گئی۔ انگریزی حکومت نے دوسو سال میں آپ کے ملک میں کتنے پل سڑکیں اور راشٹرپتی بھون ایسی عمارتیں بنوائیں۔ میں نے انگریز کا ان باتوں کا جواب دینے میں کافی حد تک اپنے آپ کو قاصر پاتے ہوئے راہِ فرار اختیار کرنے کی غرض سے کہا کہ انگریزوں نے ہندوستان کو جس بری طرح سے لوٹا ہے اس کا تو آپ نے ذکر تک نہیں کیا۔ بس انگریزی حکومت کی تعریف ہی کرتے رہے ہیں اس پر بڑی بے تکلفی سے یہ انگریز بولا۔ کہ آپ یہ کیوں بھولتے ہیں کہ دنیا میں ازل سے لیکر ابد تک یہ قاعدہ جاری رہے گا کہ آقا غلام سے خراج وصول کرتا ہی رہے گا۔ اس حقیقت کے سامنے میں نے اپنے آپ کو لاجواب پایا تو میں نے ایک اور سوال داغا کہ۔ ہندوستان میں آپ کو کوئی ایسا واقعہ بھی درپیش آیا جسے آپ بھول نہ سکیں۔ انگریز نے بغیر کچھ سوچے کہا کہ چھوٹے موٹے واقعات تو کئی سامنے آئے مگر میں اس واقعہ کو نہیں بھول سکوں گا۔

چھ لپرسی سیکم میں ہم اپنے ایک دوست کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ سردی کا موسم تھا۔ رات کے ۹ بجے ہوں گے کہ ایک رکشہ والا پریشان حال شور مچا رہا تھا کہ مجھے بچاؤ مجھے بچاؤ۔ میرا دوست باہر سڑک پر گیا اور رکشہ پولر سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ تو اس نے بتایا کہ ایک شرابی نوجوان سے پیٹ رہا ہے اور اس کی جیب میں جو کچھ ہے وہ چھین لینا چاہتا ہے۔ ہم دونوں بھی باہر آگئے۔ رکشہ پولر سردی کی وجہ سے کانپ رہا تھا میرے دوست نے شرابی سے اس بدتمیزی اور چھینا جھپٹی کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے کہا میں نے رکشہ والے کو پچاس روپئے کا نوٹ دیا تھا کہ یہ اپنا کرایہ کاٹ کر باقی روپئے مجھے واپس کرے۔ مگر یہ اب پچاس روپئے کے نوٹ سے ہی منکر ہے یہ سنتے ہی رکشہ والے نے تنک کر کہا صاحب میرے پاس تو دوپہر سے اب تک کی کمائی صرف تین چار روپئے ہی ہے میری جیب میں پچاس کا نوٹ ضرور ہے مگر وہ تو بچوں کو خوش کرنے کے لئے میں نے پچیس پیسے میں بڑی چوبڑ سے خریدا ہے۔ بڑی چوبڑ پر میں نے جب سواری سے مزدوری لی تو اس شرابی نے بچوں کو رجھانے والا پچاس کا نوٹ جیب میں رکھتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا۔ جسے اصل کرنسی نوٹ سمجھ کر اس نے یہ پروگرام بنایا اور مجھے اتنی دور لا کر اندھیرے میں مار پیٹ کر رہا ہے اور بار بار میری جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب ہم سب اصلیت کو سمجھ چکے تھے لہٰذا میرے دوست نے شرابی نوجوان کو پھٹکار کر بھگا دیا اور رکشہ والا کچھ دیر بعد دوسری طرف روانہ ہو گیا۔ لوٹ کھسوٹ۔ ٹھگی، قتل اور رہزنی کی وارداتیں تو دنیا بھر میں ہوتی رہتی ہیں۔ غربت بھی ہر جگہ پائی جاتی ہے مگر ہندوستان جیسی بات کہیں بھی نہیں ہے۔

اس کے بعد انگریز نے مسکراتے ہوئے کہا اچھا اب آپ بتایئے کہ آپ نے انگلینڈ میں کیا کیا دیکھا ہے۔ میں نے بتایا کہ ساؤتھ ہیمپٹن۔ سی سائیٹ۔ ہیرو اسکول۔ ہائیڈ پارک، بکھنگم پیلیس۔ کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیاں، زووئوسلس ہاؤس۔ بوٹینکل گارڈن۔ سائنس میوزیم، موم کی مورتیاں لندن کی مسجد۔ ہرے راما ہرے کرشنا مندر۔ ونڈسر کیسل ویلس کے کچھ گاؤں اور ویکا نند مندر وغیرہ دیکھ چکا ہوں۔ بہت خوب۔ بہت خوب۔ کہتے ہوئے پھر اس نے پوچھا کہ بحیثیت مجموعی انگلینڈ آپ کو کیسا لگا۔ میں نے بے ساختہ کہا کہ بہت اچھا لگا۔ اس پر یہ انگریز کہنے لگا مگر آپ کو یہاں اپنے ایسی آب و ہوا نصیب نہیں ہوئی۔ طرح طرح کے پرندے اور چرندے کہیں نظر نہ آئے ہوں گے طرح طرح کے رنگ و نسل کے آدمی اور طرح طرح کے لباس نظر نہیں آئے ہوں گے ہزار ہا قسم کے پیڑ پودے جن کو انگلینڈ والوں نے دیکھا تک نہیں اور وہاں ہزاروں میلوں تک ہموار زمین ہے جبکہ یہاں دو بیگھہ زمین بھی ہموار نظر نہیں آتی۔ ہمارے یہاں چار ماہ تک ہی

ہریالی نظر آتی ہے اور سال کے باقی آٹھ ماہ اس قدر زیادہ سردی ہوتی ہے کہ سارا سبزہ ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ میرے ذہن میں ڈاکٹر اقبال کا یہ مصرعہ بار بار اُبھر رہا تھا۔ ؏

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

مگر میرے ہمسفر انگریز نے اپنی شریکِ حیات کی طرف دیکھتے ہوئے دُکھ بھرے لہجے میں کہا مائی ڈیر ڈاکٹر، انگلینڈ کے لوگ اچھے ہیں مگر ملک اچھا نہیں۔ تمھارا ملک اچھا مگر لوگ اچھے نہیں ہیں۔ اس پر میں نے لقمہ دیا کہ یہ سب کچھ انگریز کی غلامی کے باعث ہوا ہے۔

شاید میرے ہمسفر نے میری ناگواری کو محسوس کر لیا تھا لہٰذا وہ کہنے لگا کہ صرف ہندوستان ہی نہیں سارے ایشیا کا یہی حال ہے۔ جس ایشیا نے دید اور بائبل ایسے مذہبی صحیفے دیئے رام۔ کرشن۔ گوتم۔ مہابیر نانک۔ اور گاندھی دیئے اُسی ایشیا میں قتل و خون کا دَور دَورہ ہو۔ امن و امان خطرے میں ہو۔ اگر ہندوستان کے عوام اپنے ملک کو اپنا ملک سمجھنے لگیں اور محنت سے اپنی حالت بدلنے کی کوشش کریں تو آپ کا ملک یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ دُنیا کے ہر ملک سے کہیں آگے نکل جائے۔

آپ ٹھیک فرماتے ہیں یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے ملک کے تمام بلند پایہ اسلاف کو سلام کیا۔ میرا اسٹیشن آ گیا تھا لہٰذا میں اس خوبصورت جوڑے کو گڈ بائی۔ سی یو اگین کہتے ہوئے کمپارٹمنٹ کے دروازے کے قریب آ گیا ۔۔

نعت

یوسف ثانی سلیم
(بالی)

اِک نُور کی بارش ہے دن رات مدینے میں
مٹتے ہیں مقدر کے ظلمات مدینے میں

چل عرض کریں گے چل حالات مدینے میں
ہر اِک کی سنورتی ہے ہر بات مدینے میں

دیتے ہیں حساب اپنا لمحات مدینے میں
بنتے ہیں زمانوں کے حالات مدینے میں

ہر ایک جگہ پہ ہاں سُن دیکھ رہے ہیں آقا
اے کاش بُلا لیں تو کیا بات مدینے میں

مَولا کی رضا یہ ہے لازم ہے ادب لازم
حَد سے نہ گزر جائیں جذبات مدینے میں

ممکن ہی نہیں بھائی مایوس پھرے کوئی
ملتی ہے ہر اِک نعمت دن رات مدینے میں

سرکار عنایت ہو صدقے میں نواسوں کے
خود عرض کرے ثانی حالات مدینے میں

غزل :- ڈاکٹر ہاشمی ایڈوکیٹ رامپور

کچھ اور ہو نہ ہو مگر اس میں نہیں کلام
میرا ہر ایک شعر ہے انسانیت کے نام
اب آگیا ہے بادہ پرستی کا وہ مقام
دنیا کی گردشوں نے کیا ہے مجھے سلام
میں اپنے احترام کا خواہاں نہیں مگر
میرے خلوصِ دل کا کیا جائے احترام
جو خود شناس ہیں وہ کسی اور سے نہیں
خود اپنی ذات سے لیا کرتے ہیں انتقام
تعمیر سے زیادہ ضروری ہے - دوستو
جو گر رہی ہو ایسی عمارت کا انہدام
دنیا میں آ گئے ہیں تو مہماں کی طرح
دو چار دن کے واسطے کر لیجئے قیام
ہاشمی! اب ان کا ذہن بدلنے کے واسطے
ہندو سے کر سلام مسلماں سے رام رام

غزل :- عرفان بھرپوری

لمحہ لمحہ درد یوں بڑھتا رہا
چڑھتا جیسے پل بہ پل دریا رہا
بدنصیبی دیکھئے اس شخص کی
جو کنارے رہ کے بھی پیاسا رہا
خیر مقدم! آیئے اس کا کریں
جو سدا ہر حال میں تنہا رہا
ایک مٹی کے کھلونے کی طرح
میں ہمیشہ ٹوٹتا بنتا رہا
درد میرا شل گو ہر دوستو
جسم کے ہر کیس میں سجتا رہا
یوں تو رشتے ہیں کئی عرفان مگر
یاد بس انساں کا ایک رشتہ رہا

غزل :- زخمی حمایتی

رہِ حیات کڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ
مصیبتوں کی گھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ
یہ کیا ضرور کہ تاریکیاں ہوں
سحر سے آنکھ لڑی ہے ذرا ٹھہر
زمانہ مانے گا ہستی کی اس حقیقت کو
یہ موت سے بھی لڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ
تمام عمر کے شکوے گلے نہ رہ
یہ فیصلے کی گھڑی ہے ذرا ٹھہر
برسنے کو تو برستا ہے ابر بھی اے دوست
یہ آنسوؤں کی جھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ
ابھی حیات کو آیا نہیں شعور
اداس اداس گھڑی ہے ذرا
تمہارے ساتھ ابھی اور مجھ کو چلنا ہے
وفا کی راہ کڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ
حیات و موت کے پردے بھی اٹھ
سرہانے موت کھڑی ہے ذرا
تمہارے بعد پئے گا بھی کون اپنے زخمی
شرابِ شوق پڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

غزل :- پریم سوشیل درد

...ن بردوش مجسّم وہ خیالات میں تھے
سحر لوٹا تو ہم ہی حلقۂ ظلمات میں تھے

...رت مہر درخشندہ خیالات میں تھے
حادثے قید جو صدیوں سے حجابات میں تھے

...و سمجھا تھا زمانے نے مکمل لیکن
نقص صد قابلِ تردید مری ذات میں تھے

...رِ غم جوئے الم یاس کی محرابِ حسیں
کیسے خوش رنگ مناظر مرے باغات میں تھے

...رگی برف کے خاموش حصاروں میں رہی
تجربے تند ہواؤں کے اشارات میں تھے

...انے منزل سے لیا بڑھ کے خراجِ تحسین
ورنہ ہر گام پہ شب خون مری گھات میں تھے

آپ نے جن کے تقدس کی قسم کھائی تھی
تادمِ مرگ وہی پھول مرے ہاتھ میں تھے

قطعات :- ڈاکٹر نفتہ (کوار کشتر یونیورسٹی)

۱

پارسا متقی۔ نمازی ہے
مومن و شیخ و مردِ غازی ہے
اک زمانے کا پیشوا ہے وہ
پاس جس کے زمانہ سازی ہے

۲

ہم بھی مسرور و شاداں رہتے
ماہ و انجم کے درمیاں رہتے
ہم بھی ہوتے زمانہ ساز اگر
زندگانی میں کامراں ہوتے

۳

ایک نکتہ ہے کامیابی کا
کان میں تم اگر اسے ڈالو
دفن کر دو ضمیر کو اپنے
بندۂ خالق کو ذبح کر ڈالو

۴

ایک مدت کے بعد اے نفتہ
اس نتیجے پہ ہم تو پہنچے ہیں
بھید باطن کا جو نہیں دیتے
لوگ ایسے ہی سب سے اچھے ہیں

۵

کون سچا ہے کون جھوٹا ہے
سب کے باطن میں جھانکتا ہوں
جن کو پاسِ خودی نہیں نفتہ
ایسے لوگوں پہ تھوک دیتا ہوں

۶

اپنے عیبوں کو درگزر کرنا
ایک بھاری قصور ہے نفتہ
عیب جوئی، بہتر نہیں کوئی
اک دماغی فتور ہے نفتہ

غزل :- محسن ہاشمی (بلاری)

غمِ دوراں کے گیسو جن کو سلجھانے نہیں آتے
زمانے کی زباں پر اُن کے افسانے نہیں آتے

سرِ بزمِ ازل دیکھی تھیں اُن کی وہ بھری آنکھیں
مجھے اُس دن سے اب تک یاد میخانے نہیں آتے

حقیقی حسن میں جذبِ کشش ہی اور ہوتی ہے
جلاؤ لاکھ شمعیں دن میں پروانے نہیں آتے

جسارت ہو تو تکمیلِ طلب کی بات کر ناداں
گرفتِ شوق میں خود اُٹھ کے پیمانے نہیں آتے

کوئی مشکل نہیں بندِ نقابِ حسن کھل جانا
مگر یہ گتھیاں اپنا عقدہ دیوانے نہیں آتے

جنابِ شیخ دورِ اندیش ہیں ساقی نظر رکھنا
فقط یہ میکدے میں دل کو بہلانے نہیں آتے

ہماری زندگانی اس لئے خوشحال ہے محسن
کہ چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانے نہیں آتے

قومی فضاؤں کی نیرنگیوں میں، یکجہتی

توصیف علوی، آسی کیرانوی

رنگ پھولوں کے جُدا، صحنِ گلستاں ایک ہے
ہیں فضائیں نوع بنوع فصلِ بہاراں ایک ہے
مختلف جام و سبو مانا کہ ہیں رندوں کے پاس
ایک لیکن میکدہ ہے بزمِ رنداں ایک ہے
نام اربابِ جنوں کے گر علیحدہ ہیں تو کیا
ایک ہے ذوقِ جنوں چاک گریباں ایک ہے
دَیر اور کعبہ کی راہوں کی الگ سمتیں سہی
ایک ہے سجدوں کا محور رُوئے تاباں ایک ہے
ہیں اگرچہ مختلف ہر سو گرفتارانِ شوق
ایک ہے زلفوں کے خم، گیسوئے پیچاں ایک ہے
طالبانِ فکر کے انداز ہیں جدا ہے الگ
ایک ہے جہدِ طلب، صحنِ دبستاں ایک ہے
یوں تو پیارے ہیں جُدا ہیں اور پیکر ہیں جُدا
ایک ہے ہر روحِ قالب، جانِ جاناں ایک ہے
کون ہے کس طرح بسمل، یہ بھی فطرت کی بات
ایک ہے دل کی خلش، سینے میں پیکاں ایک ہے
دل کے گوشوں کو نہ دیکھو وہ علیحدہ ہی سہی
ایک ہے لیکن تڑپ، دنیائے ارماں ایک ہے
لو الگ انداز سے دیتا ہے گرچہ ہر چراغ
ایک ہے بزمِ طرب، شانِ چراغاں ایک ہے
ہم نے مانا ہر بشر کا ہے علیحدہ رنگ و روپ
ایک ہے نبضوں کی حرکت خونِ انساں ایک ہے
گرچہ رکھتا ہے الگ ہی [illegible] ہر ایک فرہاد و قیس
ایک ہے [illegible] وحشت، بیاباں ایک ہے
ہر طرف بکھرے ہوئے تارے ہیں مانا ہے [illegible]
ایک ہے ہر [illegible] ماہِ درخشاں ایک ہے
چاہے ہو روئے سخن، شیخ و برہمن کا جُدا
ایک لیکن درسِ "گیتا" درسِ "قرآں" ایک ہے
یوں تو ہے عاصیؔ جُدا، ہر ایک اہلِ فن کا رنگ
ایک دل کی دھڑکنیں ہیں سوزِ پنہاں ایک ہے

غزل :-

اُمِ ہانی
اقبال منزل۔ لکھنؤ

آج کا دستور بالکل عام ہے
نیک خو کو بد ہی کہنا کام ہے

جو صداقت پہ چلا مارا گیا
آج ابن الوقت کا ہی نام ہے

سچ اگر پوچھو تو ہے وہ کامیاب
آج کی دنیا میں جو ناکام ہے

کوئی دامانِ وفا کیسے بچا لے
کس قدر پُرخار راہِ عام ہے

حُسن کو دنیا کبھی کہتی نہیں
عشق چپ رہنے پہ بھی بدنام ہے

ہوش میں بیگانۂ ہوش و خرد
تاک میں پھر گردشِ ایام ہے

یاد ہے تیری کہ پھر ایک ایک نفس
سجدہ تیرا کہ صبح و شام ہے

راہ کی [illegible] سے مُنہ نہ پھیر
حادثہ بیٹھا ہوا ہر گام ہے

[illegible] سے چل اٹھا لے فائدہ
ہر سحر کا اس جہاں میں شام ہے

زندگی آماجگاہِ رنج و غم
موت ہی آرام کا پیغام ہے

دیکھو [illegible] زمانہ [illegible] کہیں
زندگی چھلکا ہوا اک جام ہے

(۳)

تضمین "(برکلامِ اقبال)"

کندن لال گرو بجر
(منڈی بیری والا)

دلیل کامراں ہے، شہیدِ جستجو رہنا
سمجھ کر داغِ دل میں شکلِ لالہ سرخرو رہنا
ہے تدبیرِ سکونِ دل، سدا سیماب خو رہنا
"دوا ہر دُکھ کی ہے مجروح تیغِ آرزو رہنا
علاجِ زخم ہے آزادِ احسانِ رفو رہنا"

نہ ٹھکانا ہم زباں اپنی، نہ کوئی ہمرازداں اپنا
سُنائیں کس کو اپنا حالِ دل، کہ درد نہاں اپنا
دیارِ غیر ہے اپنے لئے اب گلستاں اپنا
"بتائیں کیا سمجھ کر شاخِ گل پہ آشیاں اپنا
چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا"

عبادت حق تعالیٰ کی ہے، خدمت نوعِ انساں کی
ہے مسجودِ ملائک شان و عظمت نوعِ انساں کی
وقارِ آدمیت ہے، اخوت نوعِ انساں کی
"شرابِ روح پرور ہے محبت نوعِ انساں کی
سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام و سبو رہنا"

شمیمِ آسا، پریشاں فطرتِ طناز ہے میری
فضائے چرخ، جولاں گاہِ ترکِ ناز ہے میری
ہیں محرم ماہ و انجم، کہکشاں ہمراز ہے میری
شرابِ بیخودی سے تا فلک پرواز ہے میری
شکستِ رنگ سے سیکھا ہے میں نے بن کے بو رہنا

خودی یقیں سے ہو محکم، تو . . . . جلیل
خودی ہو فقر سے محکم، تو معرفت کی دلیل
خودی ہو عقل سے محکم، تو راہ کی قندیل
"خودی ہو علم سے محکم، تو غیرتِ جبریل
اگر ہو عشق سے محکم، تو صورِ اسرافیل"

غزل :- اختر شاہجہانپوری

وادیوں میں صد رنگی ہمدردیاں لیتے چلو
قحط ہے ان میں ہوا کا آندھیاں لیتے چلو

دوستی کی بزم ہو یا دشمنوں کی انجمن
اپنے چہرے پہ خلوصِ بیکراں لیتے چلو

خام ہے [illegible] رہروانِ شوق کا
وہ جو کہتے ہیں سفر میں سائباں لیتے چلو

دوستوں کی مہرباں نے جو بخشے غم تمہیں
کیوں سمجھتے ہو انہیں بارِ گراں لیتے چلو

اُس کے دل میں دردِ الفت کا جگانے کیلئے
عشق کے صحرا سے کچھ پرچھائیاں لیتے چلو

پھونک سکتا ہے ہوا کا شعلہ یہ سارا چمن
ہو سکے تو ساتھ جلتا آشیاں لیتے چلو

اختر اس مشینی دور میں سرد مہری کا سکوت
توڑنا چاہو تو کچھ سرگرمیاں لیتے چلو

غزل :- شیخ اشرفی (چھلونی)

گیت کوئی گنگناتی ہے وفا — دیکھئے کیا گل کھلاتی ہے وفا
رفتہ رفتہ رنگ لاتی ہے وفا — ہاتھ مشکل سے ملاتی ہے وفا
یاد جب ان کی دلاتی ہے وفا — خون کے آنسو رلاتی ہے وفا
ہاتھ پھر سرسوں جماتی ہے وفا — جھولا مشکل کو جھلاتی ہے وفا
آن پر جب اپنی آتی ہے وفا — جان کی بازی لگاتی ہے وفا
شوخ چہروں کو لجاتی ہے وفا — یاد جب وعدہ دلاتی ہے وفا
گھر بیاباں میں بساتی ہے وفا — اپنی ضد پر یوں کبھی آتی ہے وفا
بات پھر سنناتی ہے وفا — صبح ہوتے ہی بجھاتی ہے وفا
جب وفا کو آزماتی ہے وفا — تیغ گردن پر چلاتی ہے وفا

لیجئے وہ شیخ آئے دار پر
اب انھیں بھی آزماتی ہے وفا

غزل :- ڈاکٹر گوپال کرشن شفق
پٹیالہ

آتش غم سے مرا دل ہے کہ جلتا جائے ہے
زندگی کا روپ کس سانچے میں ڈھلتا جائے ہے

دور جو اعزہ کی کرم فرمائیاں ہم سے نہ پوچھ
وقت ہر لمحہ سے نفرت اگلتا جائے ہے

ہائے بہت ہیں وہ انگلی سی جوانانِ کہاں
ہر قدم پہ آدمی اب تو پھسلتا جائے ہے

اے یقین حسنِ دنیا اب تو لے اپنی خبر
میرے ہاتھوں سے ترا دامن نکلتا جائے ہے

کس قدر بے آسرا ہے آج کل کا آدمی
خود ہی گرتا جائے ہے خود ہی سنبھلتا جائے ہے

حسنِ خود بیں کی ستم انگیزیاں ہائے نہ پوچھ
عشق سے حاصل کفِ افسوس ملتا جائے ہے

پھول کی نازک ہے بجلیوں کی سی تڑپ
روپ کس کا لے شفق شعروں میں ڈھلتا جائے ہے

گھر جیسا

رام لعل

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوتی ہے۔
"جناب میں حاضر ہو سکتا ہوں؟"
"جی ہاں، تشریف لے آیئے۔"
جس شخص کی آواز میں نے سنی تھی وہ جانی پہچانی سی تھی اور یقیناً کسی بڑی عمر کے آدمی کی نہیں تھی۔ وہ کوئی بچہ ہوگا!
میرا اندازہ صحیح تھا۔ وہ بارہ سال کا کچھ بے ڈھنگا اور کچھ ــــ اپنی عمر کے مقابلے میں زیادہ ہی لمبا۔ ایک بچہ تھا جس نے اندر آ کر پہلے تو مجھے سلام کیا۔ پھر بیٹھنے کے لئے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔
"تشریف رکھئے صاحب زادے، کھڑے کیوں ہیں!"
"جی اچھا۔ بہت بہت شکریہ"
"آپ کی تعریف؟"
"جی مجھے ــــ آپ کے گھر میں مجھے مُن مُن کہتے ہیں، صرف مُن مُن!"
ہم دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑتے ہیں ــــ کیونکہ مُن مُن میرا بیٹا ہے بہت شرارتی ہے لیکن پڑھنے لکھنے میں بہت ہی ہوشیار۔ ہمارا آپس میں اکثر ہنسی مذاق چلتا ہے۔
"کہئے مُن مُن صاحب! فرمایئے۔ کیا حکم ہے؟"
"حضور آپ کی خدمت میں ایک سمسیا لے کر حاضر ہوا ہوں۔"
"سمسیا! کیسی سمسیا؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔
"ہوا یوں حضور، کہ جس وقت آپ آفس گئے ہوئے تھے میں آپ کی اجازت کے بغیر آپ کی لائبریری میں چلا آیا تھا۔ لیکن مجھے یاد ہے آپ نے مجھے اس بات کی اجازت دے رکھی ہے کہ میں آپ کی کتابوں کو نہ صرف چھو سکتا ہوں بلکہ جی چاہے تو پڑھ بھی سکتا ہوں۔"
"ہاں بشرطیکہ آپ کی کھوپڑی میں نئے خیالات کے لئے کوئی جگہ خالی ہو۔" مجھے ہنستا دیکھ کر مُن مُن بول اٹھا۔
"ڈیڈی، اس وقت مذاق بند۔ جو کچھ میں پوچھنا چاہتا ہوں اس کا جواب دیجئے۔"
"اوہ! معاف کیجئے۔" یہ کہہ کر میں سنبھل کر بیٹھ گیا
"فرمایئے، آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں!"
"میں یہ عرض کر رہا تھا ــــ"
ابھی مُن مُن نے اپنی بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ اس کی نظر اپنی ممی پر جا ٹکی جو ہم دونوں کے پیچھے چپکے سے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے بھی اس کی طرف حیران ہو کر دیکھا اور وہ پوچھنے لگی ــــ
"میں کہتی ہوں، یہ کیا ڈراما شروع کر رکھا ہے۔ باپ اور بیٹے نے، چلئے چلئے کھانے کی میز پر اب تشریف لے چلئے۔ میں کھانا ابھی لئے جا رہی ہوں۔ سمجھے!"
"ذرا رک جایئے ممی۔ یہ ڈراما ہرگز نہیں ہے ڈیڈی کے ساتھ میرا بہت ہی سیریس (SERIOUS) ڈائیلاگ ہو رہا ہے۔"
"کب تک رکی رہوں؟ سارا کچھ پکا پکایا ٹھنڈا ہو جائے گا۔" ہمارے مُن مُن کی ممی ذرا تیز ہو کر بولی۔
میں نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا ــــ "ہم آتے ہیں ــــ بس تھوڑی دیر میں۔ ذرا مُن مُن کی بات سن لو۔ کوئی خاص سمسیا ہے۔"
"یہ لڑکا تو خود ہی ایک سمسیا بنتا جا رہا ہے۔" یہ کہہ

وہ پاؤں پٹختی ہوئی کچن میں لوٹ گئی۔

میں نے مُن مُن سے کہا — "جی ہاں اب جلد [illegible] کھو ڈالیئے صاحبزادے آپ دیکھتے ہیں نا وقت بہت کم ہے"

"جی بہت بہتر۔ ابھی عرض کرتا ہوں۔ آپ کی ایک کتاب میں جو شاید سو سال پہلے کسی فرانسیسی نے لکھی تھی کہا گیا ہے کہ ہندوستانی پیدائشی طور پر ڈرپوک اور غلام ہیں۔ وہ انگریزوں کے ہمیشہ ہمیشہ غلام بنے رہیں گے۔"

"تو اس کی بات تو بالکل غلط ثابت ہوئی نا۔ ساری دُنیا نے دیکھ لیا کہ ہم نہ ڈرپوک تھے نہ ہی ہمیشہ غلام بنے رہنے کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ ہم نے اپنے مُلک کی آزادی کے لئے ایک بڑی امن طلب لڑائی لڑی۔ اور بالآخر آزاد ہو گئے۔ اب دُنیا کے سارے مُلک ہمارے مُلک کا نام بڑی عزت سے لیتے ہیں۔ اور ہمارے ساتھ دوستی بڑھانے کے خواہشمند رہتے ہیں۔"

مُن مُن کچھ سوچ کر بولا "جی ہاں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن اُس آدمی نے اپنی کتاب میں ایک اور بات بھی لکھی ہے جو مجھے بالکل اچھی نہیں لگی —"

"کونسی بات — وہ بھی تو سنوں" میں دل ہی دل میں بہت خوش بھی ہو رہا تھا کہ میرا بیٹا مُن مُن آٹھویں درجے کا اسٹوڈینٹ ہو کر بھی میری لائبریری میں رکھی ہوئی موٹی موٹی کتابیں بڑی دلچسپی سے پڑھنے لگا ہے۔

مُن مُن بولا — "اُس نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے لوگ ایک قوم نہیں ہیں۔ بلکہ بہت سی قومیں ہیں جیسے بنگالی، بہاری، مراٹھے، پنجابی وغیرہ وغیرہ — میں یہ جاننا چاہتا ہوں قوم کسے کہتے ہیں۔"

"دیکھیئے صاحبزادے، یہ تو آپ کو معلوم ہے نا کہ ہمارے ملک میں بہت سے دریا ہیں ستلج، چناب، نربدا، تراپتی، گنگا وغیرہ —"

"جی ہاں — جی ہاں — اور کرشنا، گوداوری وغیرہ بھی ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ سارے دریا کہاں جا کر گرتے ہیں۔" "جی ہاں — سمندر میں۔"

"شاباش — کسی بھی مُلک کی قوم ایک سمندر ہوتی ہے۔ صرف ہمارے ہی مُلک میں نہیں دُنیا کے ہر مُلک میں کئی کئی زبانیں بولنے والے گروہ ہوتے ہیں ان کے الگ الگ علاقے بھی ہوتے ہیں۔ لیکن وہ کوئی الگ قوم نہیں ہوتے۔ بلکہ دریاؤں اور ندی نالوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان سب کا بہاؤ اپنے سمندر کی طرف ہوتا ہے وہ سب مل کر ایک قوم بن جاتے ہیں۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ الگ الگ زبانیں بولتے ہیں یا الگ الگ قسم کے لباس پہنتے ہیں آپ نے بڑے بڑے باغ بھی دیکھے ہیں جہاں کئی رنگوں کے پھول ہوتے ہیں۔ کئی کئی کے" "جی ہاں، جی ہاں — دیکھے ہیں۔" مُن مُن خوش ہو کر بولا۔ "وہ سارے پھول ہوتے ہیں تو باغ بہت خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔"

"شاباش۔ قوم کا مطلب ایک خوبصورت باغ بھی ہو سکتا ہے۔"

اچانک مُن مُن کی ممی پھر نمودار ہو گئیں اُس کے ہاتھوں میں پلیٹیں تھیں۔ بولی — "میں کہتی ہوں باپ بیٹوں کا گٹ مٹان پھر کسی وقت کر لیجئے گا۔ پہلے کھا لیجئے — کھانا!"

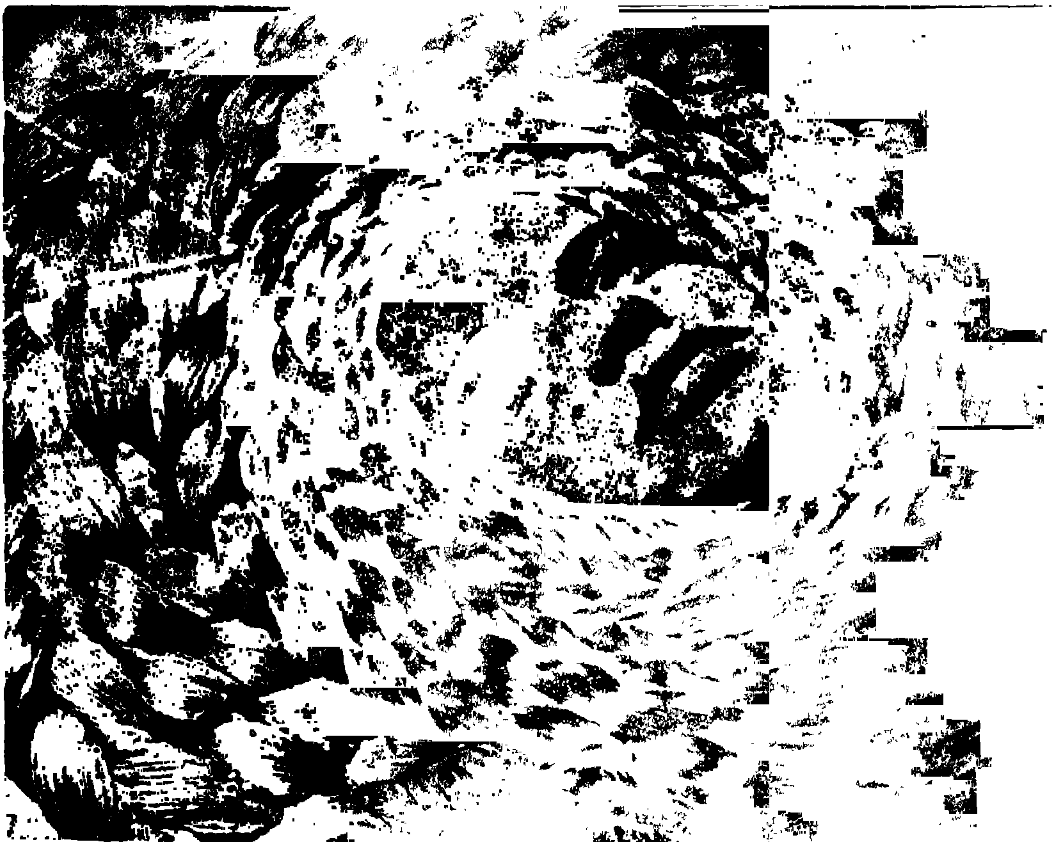
مُن مُن اور میں ہنس پڑے اور اپنی باتیں ادھوری چھوڑ کر کھانے کی میز پر جا بیٹھے۔

مُن مُن اپنی ممی سے کہنے لگا — "ممی میں سوچ رہا ہوں ہمارے گھر میں سب الگ الگ مزاج کے لوگ رہتے ہیں۔ ڈیڈی ہر وقت ہنستے رہتے ہیں۔ آپ کی ناک پر ہر دم غصہ رہتا ہے —"

"اور تم —؟" اُس کی ممی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ "تم نے بڑے فلاسفروں کی طرح کیوں ہر وقت سوچتے رہنے کی عادت ڈال لی ہے؟ بتاؤ۔"

"میں صرف یہ سوچتا ہوں۔ شاید اسی لئے ہمارے ایک گھر کہا جا سکتا ہے کیوں ڈیڈی؟!" ●●

THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002
Regd. wi the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57





ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ | رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۔ ۷ ۔ ۶۴۴/۵۷ | رجسٹرڈ نمبر ڈی ۔ ۳۷۰/DN

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ماہنامہ

ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں یا انساں پرست
فیاض گوالیاری

ایڈیٹر
سرور تونسوی

شانِ ہند نئی دہلی

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے
زرِ سالانہ ۲۴/- روپے

جلد نمبر ۴ | مارچ ۱۹۸۴ء | شمارہ نمبر ۵

سچی غزل

سرشار صدیقی

مجھے گر عشق کا ارمان ہوتا
تو گھر میں میر کا دیوان ہوتا

کسی تقریب کا سامان ہوتا
کہ ہمسایہ مرا مہمان ہوتا

تو پھر میں کس سے پاتا وصل کی داد
جو تو بھی کمسن و ناداں ہوتا

نہ ہوتے فاصلوں کے شہر میں ہم
تو پھر ملنا بہت آسان ہوتا

اگر سب لوگ ہوتے مجھ سے چھوٹے
تو میں سب سے بڑا انسان ہوتا

جسے بھی سونپ دیتے ہم خدائی
وہی فرعونِ بے سامان ہوتا

ہوئے لوح و قلم ایجاد ورنہ
ابھی تک آدمی حیوان ہوتا

جسے دل میں چھپائے پھر رہے ہیں
اگر لب پر وہی طوفان ہوتا

نہ اپنی ذات سے باہر نکلتے
نہ اپنی ذات کا عرفان ہوتا

قلوپطرہ اگر قاتل بنی ہوتی
تو سارا روم قبرستان ہوتا

تری محفل میں آ کر سوچتا ہوں
نہ آتا تو بہت نقصان ہوتا

خدا پر، آدمی پر، یا صنم پر
کسی پر تو ترا ایمان ہوتا

لہو سے ڈھالتے خورشید کوئی
تو شب پہ صبح کا امکان ہوتا

کبھی اپنے سامنے آئینہ رکھتا
پھر اپنے عکس پر قربان ہوتا

جو ملتی رزق کے دھندوں سے فرصت
تو لکھنے پڑھنے کا کچھ امکان ہوتا

جو میں سچی غزل لکھتا تو سرشار
وہی ہر شعر کا عنوان ہوتا

ودیا پرکاش سرور ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے لکھنؤ کے صفحات خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی اور سرورق پاکٹ بک پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ ۵، انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔


کھیتی کو زمین
رہنے کو مکان
بیس نکات کی
یہ ہے شان
davp 83/498

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

وزیر اعلیٰ راجستھان اور راجستھان اردو اکاڈمی

راجستھان اردو اکاڈمی کا وجود جنتا پارٹی کی حکومت کے دوران عمل میں آیا اور جناب بھیروں سنگھ شیخاوت وزیر اعلیٰ راجستھان نے ہر حالت میں کسی مسلمان کو ہی اردو اکاڈمی کا چیرمین بنانا چاہتے تھے ڈاکٹر محمد علی زیدی کو ٹٹولا گیا تو انھوں نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ میں نے ساری زندگی کانگریس کی ہمدردی میں گزاری ہے لہٰذا میں یہ اعزاز قبول نہیں کر سکتا مسلم لیگی اور جماعت اسلامی خیالات کے کچھ حضرات نے چیرمین شپ کے لئے دوڑ دھوپ کی مگر شیخاوت صاحب کی نظروں میں یہ لوگ نہ سما سکے۔ آخر کار ایڈیٹر نشانِ ہند، ڈاکٹر محمد علی زیدی اور دیگر کچھ حضرات نے شیخاوت صاحب کو مشورہ دیا کہ کسی نا اہل مسلمان کی بجائے اگر آچاریہ دھرمیندر ناتھ صاحب کو چیرمین مقرر کر دیا جائے تو یہ اس لئے بہتر ہوگا کہ آچاریہ جی فارسی اور دیگر کئی زبانوں کے ماہر ہیں نیز وہ اور ان کی اہلیہ محترمہ ڈاکٹر اچلا ارورہ صاحبہ ایم۔ ایل۔ اے مسلمانوں میں بے پناہ مقبولیت رکھتے ہیں۔ اس پر شیخاوت صاحب نے فرمایا کہ اگر شاہی امام صاحب جامع مسجد دہلی آچاریہ جی کے نام کی سفارش کریں تو انھیں یہ تجویز منظور ہوگی۔

لہٰذا شاہی امام صاحب جامع مسجد دہلی نے آچاریہ جی کی ادبی۔ علمی خدمات کے پیش نظر جی کھول کر سفارش کی مگر نہ معلوم شیخاوت کو اندر ہی اندر کون سا ڈر کھائے جا رہا تھا کہ وہ کسی مسلمان کو ہی چیرمین بنانا چاہتے تھے

چنانچہ انھوں نے راجستھان کے ایک "نیوز ڈیلب" قمرالیوبی صاحب کو چیرمین بنا دیا اور جب تک قمرالیوبی صاحب چیرمین رہے اردو اکاڈمی راجستھان کا وجود نہ ہونے کے برابر رہا۔ خدا خدا کر کے قمرالیوبی صاحب کی چیرمین شپ کا پیریڈ ختم ہوا تو تب تک جنتا پارٹی کی حکومت اپنی حماقتوں اور نااہلی کے باعث ملیامیٹ ہو چکی تھی اور اندرا کانگریس کے ہاتھوں میں عوام نے حکومت کی باگ ڈور تھما دی تھی اور کانگریس کی حکومت نے راجستھان اردو اکاڈمی کے چیرمین کے لئے ڈاکٹر محمد علی صاحب کو منتخب کیا۔ کیونکہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جسے نہ آج سے تین سال پہلے جھٹلایا جا سکتا تھا۔ اور نہ آج کوئی مائی کا لال جھٹلا سکتا ہے کہ راجستھان میں ڈاکٹر محمد علی زیدی کے سوا کوئی دوسری ہستی ایسی ہے ہی نہیں جسے اردو اکاڈمی کا چیرمین بنایا جاتا۔ گزشتہ تین سالوں میں ڈاکٹر محمد علی زیدی نے جن مشکل حالات میں اکاڈمی کو سنبھالا ہے وہ ان کی اعلیٰ انتظامی قابلیت اور ہر نجان مرنج پالیسی غیر متعصب ہونا قومی یکجہتی میں کامل یقین رکھنا اور علمی۔ ادبی سوجھ بوجھ کی آئینہ دار ہے ورنہ اکاڈمی کے ممبران میں ایسا عنصر موجود تھا جو مسلم لیگی اور جماعت اسلامی مزاج کا حامل ہے اور انھوں نے قدم قدم پر ڈاکٹر محمد علی زیدی کی راہ میں اڑچنیں پیدا کیں مگر ڈاکٹر محمد علی زیدی نے ایسی اڑچنوں کو اپنی حکمت عملی سے تہس نہس کر دیا۔ ان اردو دشمن ممبران نے اکاڈمی کے استحکام کو

دریم برہم کرنے کی کوشش اُس وقت کی جب ڈاکٹر محمد علی زیدی پاکستان تشریف لے گئے تھے۔ لہٰذا اُن کی عدم موجودگی میں یار لوگوں نے من مانی کی مگر ڈاکٹر محمد علی زیدی نے تمام سازشوں کو ناکام بنا دیا اور اردو اکاڈمی کو طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنا فرض نبھانے کے لئے مستعد رکھا۔

ڈاکٹر زیدی راجستھان یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر ہیں اور انھیں معقول تنخواہ ملتی ہے لہٰذا انھیں اکاڈمی سے کسی قسم کے مالی حصول کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی وہ فطری طور پر اس کے اہل ہیں کہ کسی قسم کی بددیانتی کر سکیں لہٰذا جو شخص خود دیانت داری اور ایمانداری کو ایمان کا درجہ دیتا ہو وہ دوسروں کو کب اجازت دے گا کہ وہ اردو اکاڈمی سے ناجائز مالی فائدہ اٹھائیں۔ اور مصیبت یہی ہے حکومت اردو کے لئے جن اداروں کی مالی اعانت کر رہی ہے اردو کے اکثر دانشور اور اردو کے کھوکھلے یہ سمجھتے ہیں کہ حکومت یہ روپیہ اُن کے لئے گلچھرے اُڑانے اور دادِ عیش دینے کے لئے صرف کر رہی ہے لہٰذا جب ڈاکٹر زیدی ایسا کوئی دیانت دار ادارے کا سربراہ اس سرکاری اعانت کو انتہائی دیانت داری حق و انصاف کو مدِ نظر رکھ کر خرچ کرتا ہے۔ تو بددیانت حضرات کے پیٹ میں درد شروع ہو جاتا ہے۔

اب اپریل [illegible] کے آخر میں ڈاکٹر محمد علی زیدی کی چیئرمین شپ کی میعاد ختم ہو رہی ہے اور یار لوگ بھاگم بھاگ کر رہے ہیں۔ کہ کسی طرح وہ خود یا اُن کے کسی ہم مشرب کو اردو اکاڈمی کا چیئرمین بنا دیا جائے تاکہ آنے والے تین سالوں میں وہ اپنی اور اپنے ہم مشرب حضرات کی من مانی مرادیں پوری کر سکیں اور راجستھان اردو اکاڈمی کو بھی قعرِ مذلت میں گرا دیں۔ اس ضمن میں ایک لطیفہ بھی سن لیجئے۔ ڈاکٹر فضل امام بھی اردو اکاڈمی کی چیئرمین شپ کے امیدوار ہیں کسی صاحب نے انھیں کہا کہ آپ تو راجستھان کے ہی نہیں ہیں تو کس طرح آپ راجستھان کی اردو اکاڈمی کے چیئرمین بن سکیں گے۔ جب کہ یہ حق کسی راجستھانی کا ہی ہو سکتا ہے۔ تو فضل امام صاحب فرمانے لگے میں تو راجستھانیوں کا باپ ہوں سوال کرنے والے نے پھر پوچھا کہ آپ راجستھانیوں کے باپ ہونے کا دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں۔ تو فضل امام صاحب کا جواب تھا کہ بھائی میرے دو تین بچے جے پور میں ہی پیدا ہوئے ہیں۔ لہٰذا جب میرے بچے راجستھان میں پیدا ہونے کے باعث راجستھانی ہیں اور میں اُن کا باپ ہوں تو میرا یہ دعویٰ حرف حرف صحیح ہے کہ میں راجستھانیوں کا باپ ہوں۔ ہم راجستھانیوں کو ڈاکٹر فضل امام صاحب کے اس استدلال پر مبارکباد دیتے ہیں۔

ہم راجستھان کے وزیر اعلیٰ جناب شیو چرن ماتھر سے مودبانہ گزارش کریں گے کہ وہ راجستھان اردو اکاڈمی کو تباہ ہونے سے بچائیں اور اس مرتبہ بھی اکاڈمی کے چیئرمین شپ کے لئے ڈاکٹر محمد علی زیدی صاحب کی میعاد میں توسیع فرما دیں کیوں کہ ہم چیلنج کرتے ہیں کہ اس وقت سارے راجستھان میں ڈاکٹر محمد علی زیدی سے بہتر اور موزوں کوئی دوسری ہستی موجود نہیں ہے جو راجستھان اردو اکاڈمی کی چیئرمین شپ کے فرائض صحیح طور پر ایمانداری۔ دیانتداری اور فرضِ منصبی سمجھ کر ادا کر سکے۔

ہمیں جناب شیو چرن ماتھر صاحب کی دُور رس نظروں اور اعلیٰ انتظامی قابلیت پر پورا پورا بھروسہ ہے کہ وہ راجستھان اردو اکاڈمی کو تباہ نہیں ہونے دیں گے۔ بلکہ اسے کامرانی کی راہ پر گامزن رکھنے کے لئے مناسب فیصلہ فرمائیں گے۔"

اردو اکاڈمیوں کو ذاتی مفاد رکھنے والے اردو دشمنوں سے بچاؤ۔

عمار رضوی صاحب کیلئے ایک لمحہ فکریہ؟

اتر پردیش اردو اکاڈمی کی طرف سے جس انعامی کمیٹی نے سال ۱۹۸۲ء کی مطبوعہ اردو کتابوں کے متعلق ۱۹۸۳ء میں انعامی فیصلہ کیا اس کے معزز ممبران کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں پروفیسر محمود الٰہی۔ پروفیسر حکم چند نیر۔ پروفیسر سید محمد عقیل۔ رام لعل۔ رشید حسن خاں۔ علی جواد زیدی اور پروفیسر شبیہ الحسن۔ پروفیسر محمود الٰہی اور پروفیسر حکم چند نیر نے کسی بھی کتاب کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار نہ فرمایا۔ ان کتابوں میں ایک کتاب "ہندی کے مسلمان شعراء" بھی شریک مقابلہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ رشید حسن خاں نے اس کتاب کو ... نکال کر علیحدہ رکھ دیا کہ اس کتاب کو شامل مقابلہ نہیں کیا جا سکتا اور کچھ وجہ انھوں نے بتائی اس کی تائید کچھ دوسرے مسلم ممبران نے بھی فرمائی اور جبکہ یہ کتاب اس سال کی شامل مقابلہ ہونے والی کتابوں میں سب سے اول مقام کی حامل تھی اسے محض اس لئے مقابلہ سے خارج کر دیا گیا کہ اسے ماہنامہ شانِ ہند نے شائع کیا تھا اور رشید حسن خاں سمجھتے ہیں کہ شانِ ہند اور اس کا ایڈیٹر انھیں ان کی مرضی کے مطابق عظیم محقق اور نقاد تسلیم نہیں کرتا۔ اس لئے انھوں نے اپنے خبث باطن کا مظاہرہ یوں کیا کہ اس کتاب کو مقابلہ سے باہر کر دیا

مگر اسی کتاب پر مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے دو ہزار روپیہ اور بہار اردو اکاڈمی نے اول انعام تین ہزار روپیہ دیئے جانے کا اعلان کیا۔ ظاہر ہے کہ مغربی بنگال اور بہار اردو اکاڈمیوں میں کتابوں پر انعامات کا فیصلہ کرنے والے معزز ممبران ایسے ہیں جو ملک بھر میں مستند ادیب تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اور پچھلے دنوں ہی اردو اکاڈمی دہلی نے "ہندی کے مسلمان شعراء" کو موضوع کے لحاظ سے ایک مستند اور بہترین حیثیت کی کتاب قرار دیتے ہوئے اس کے ناشر کو دو ہزار روپئے کا انعام دیا۔ جب ہر جگہ سے اس کتاب پر انعامات دیئے جانے کا اعلان ہوا ہے تو ہر ذی فہم اردو داں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہے کہ اتر پردیش اردو اکاڈمی نے اس کتاب پر حسب ذیل وجوہات کی بناء پر انعام نہیں دیا۔

۱۔ جن ممبران نے اس کتاب کو انعام کے قابل نہیں سمجھا ان کی ہندی دشمنی مسلمہ ہے۔ کیونکہ اس کتاب میں تین صدی کے قریب ہندی کے مسلمان شعراء کا تذکرہ مع کلام ہے لہٰذا ان ہندی دشمن حضرات کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ کہ اس کتاب کے ذریعہ اردو میں ہندی کی برتری کو اجاگر کیا گیا ہے۔

۲۔ چونکہ رشید حسن خاں ایڈیٹر شانِ ہند کے خلاف ہیں اس لئے انھوں نے ذاتی دشمنی کے تحت ایک ایسی کتاب کو انعام سے محروم کیا جو واقعی اس سال کی ایک بہترین کتاب تھی اس طرح ان حضرات نے اردو اکاڈمی اتر پردیش کی روایات کو نقصان پہنچایا۔

۳۔ چونکہ اس کتاب کا مصنف اور ناشر دونوں ہندو ہیں۔ لہٰذا اس کتاب کی مخالفت کرنے والے مسلمان ممبران نے کسی حد تک اپنے ہندو دشمن نظریہ کو تسکین دی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس قماش کے حضرات جو ہندی دشمنی ذاتی عناد یا کسی حد تک ہندو دشمنی اور قومی یکجہتی کے خلاف ہوں انھیں اتر پردیش اردو اکاڈمی کا کس طور بھی ممبر رہنا چاہئے۔؟ لہٰذا ہم آپ سے بھی یہ درخواست کرتے ہیں کہ یا تو آپ ان حضرات سے کہئے کہ وہ بتائیں کہ اس کتاب کے ساتھ نا انصافی کیوں کی گئی اور اگر وہ یہ بتانے سے معذور ہوں تو انھیں از خود اردو اکاڈمی کی ممبری سے استعفیٰ دے دینا چاہئے۔ اور اگر وہ ایسا کرنے کو بھی تیار نہ ہوں تو پھر آپکا یہ فرض بن جاتا ہے کہ ... اردو اکاڈمی کی ممبری سے خارج کر دیں تاکہ اکاڈمی کے ... پر وہ حرف نہ آ سکے جس کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے

بہ کوئے یار بہ انداز محرمانہ گزر

سرور تونسوی

۱۹۳۹ء میں ماہنامہ ایجوکیشنل گزٹ جالندھر کی ادارت میرے سپرد ہوئی۔ ان دنوں یہ ماہنامہ ایک اچھا تعلیمی اور ادبی پرچہ سمجھا جاتا تھا چار مسلم حضرات اس کے مشترکہ مالکان تھے مگر منیجنگ ڈائریکٹر عبدالرزاق صاحب تھے۔ جو قطعاً غیر ادبی اور کسی حد تک ماہنامے اور پریس کی انتظامی سوجھ بوجھ سے ناواقف تھے مگر تھے بڑے چاق و چوبند۔

ابھی مجھے ماہنامہ ایجوکیشنل گزٹ اور ایجوکیشنل پریس کی ذمہ داری سنبھالے چھ ماہ ہی ہوئے تھے کہ حضور نظام دکن کی سلور جوبلی منائے جانے کا اعلان ہوا اور مالکان نے یہ طے کیا کہ اس موقع پر ایجوکیشنل گزٹ کا نظام نمبر شائع کیا جائے اور اس کی تیاری کے لئے مجھے مناسب ہدایات دی گئیں۔ چنانچہ وقت مقررہ پر یہ نمبر شائع ہوا اور اسے حضور نظام کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے عبدالرزاق صاحب اور مجھے حیدرآباد دکن جانا تھا۔ لہٰذا ہم دونوں جالندھر سے دہلی آئے اور خواجہ حسن نظامی سے ملاقات کی۔ خواجہ صاحب کے بارے میں ہفتہ وار اخبار "ریاست" میں اکثر بہیر وارید۔ دیوان سنگھ مفتون کے اداریے میری نظر سے گزر چکے تھے لہٰذا میرے دماغ میں خواجہ صاحب کے بارے میں کوئی اچھی تصویر کندہ نہیں تھی۔ مگر جونہی خواجہ صاحب سے آمنا سامنا ہوا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دو تین اصحاب ان کے قریب بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے ایک صاحب کو خواجہ صاحب کچھ لکھوا رہے تھے چند منٹ بعد وہ دوسرے صاحب سے فرمانے لگے ہاں بھئی آپ کہاں تک پہنچے ہیں اس نے تحریر کا آخری فقرہ پڑھ کر سنایا

اور خواجہ صاحب نے انھیں بھی آگے لکھوانا شروع کیا۔ پہلے صاحب نے جو کچھ لکھا تھا وہ کاتب کے حوالے کر کے پھر آ کر اپنی جگہ بیٹھ گئے کوئی دس منٹ تک دوسرے صاحب کو کچھ لکھوانے کے بعد پھر پہلے صاحب کی طرف رجوع ہوئے اور جو کچھ وہ لکھ چکا تھا اس سے آگے مضمون لکھوانا شروع کر دیا۔ اور دوسرے صاحب کچھ خواجہ صاحب کے فرمودات لکھ چکے تھے مسوّدہ کاتب کو دینے چلے گئے۔ خواجہ صاحب ہم سے فرما رہے تھے کہ کچھ وقت انتظار کرنا ہوگا۔ پھر اطمینان سے باتیں ہوں گی۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد خواجہ صاحب توجہ ہماری طرف مبذول فرمائی تو ان سے ہم کلامی کا مجھے ہی حاصل رہا۔ کیونکہ عبدالرزاق صاحب جالندھر سے چلتے وقت ہی یہ فرما چکے تھے کہ سرور صاحب، اردو نہ تو اچھی طرح بول سکتا ہوں اور نہ ہی ادا کر سکتا ہوں۔ اس لئے جہاں کہیں کوئی ایسا موقع آئے تو آپ ہی بات چیت کریں۔ ہے اور اتفاق دیکھئے کہ پہلا واسطہ بات چیت کا پڑا تو وہ بھی خواجہ حسن نظامی کیسی ہستی جو ہمیں برسوں پڑھا سکتے تھے۔ تاہم خواجہ صاحب سے خوب باتیں ہوئیں۔ اور انھوں نے مہاراجہ سر کشن پرشاد وزیراعظم حیدرآباد (دکن) کے نام تعارفی خط دیا اور ساتھ ہی میرے وزٹنگ کارڈ پر اپنے قلم سے رقم فرمایا "موخطا خواجہ حسن نظامی" اور فرمایا کہ جونہی یہ ملاقاتی مہاراجہ بہادر کے یہاں پہنچے گا وہ آپ کو فوراً بلا لیں گے۔ کا مہینہ تھا شام ہو گئی تھی۔ خواجہ صاحب نے چائے بسکٹ سے نوازا اور فرمانے لگے میں بھی دلی جا رہا ہوں میرے ساتھ گاڑی میں چلئے۔ جامع مسجد چھوڑ دوں گا۔

دیوں نظام الدین بستی سے لے کر دلی گیٹ تک ایسی عمارات
نہیں ہوتی تھیں جہاں آجکل کاکا نگر۔ شنکر نگر اور جنگ پورہ
نیز پرگتی میدان وغیرہ ہیں یہاں جنگل ہی جنگل تھا اور ہری
سڑک کے دونوں جانب گھنے درخت اور جھاڑیاں
خاصہ ڈراؤنا ماحول بنائے ہوئے تھیں۔ خواجہ صاحب
کا موٹر خاصہ پرانا تھا مگر چلنے میں اچھا تھا۔ کوئی پندرہ
بیس منٹ میں خواجہ صاحب ہمیں جگت ٹاکیز کے پاس
اردو گھر لے آئے جہاں پر فرش اور دیوار کی ہر اینٹ پر
اردو بولو۔ اردو پڑھو۔ اردو لکھو۔ لکھا ہوا تھا۔ یہ
اردو گھر اب آناد ہند مسلم ہوٹل میں تبدیل ہو چکا ہے۔
خواجہ صاحب نے فرمایا کہ وہ دوسرے دن بھی دلی تشریف لائیں گے
اور اگر ہم لوگ ابھی دہلی میں رہیں تو اسی اردو گھر میں شام
کے تین بجے ملیں۔ عبدالرزاق صاحب تو فتح پوری کے ہوٹل
میں سوئے رہے اور میں وقت مقررہ پر خواجہ صاحب کی
خدمت میں حاضر ہوگیا۔ اور وہ مجھے اپنے ساتھ چاوڑی
بازار میں دلی پریس میں لے گئے جہاں "منادی" چھپتا تھا۔
"منادی" کی کتابت شدہ کاپیاں دلی پریس کے مالک کو
دیں اور سلسلہ طباعت کی اجرت پیشگی دیدی۔ فرمانے
لگے پیشگی اجرت دیدینے سے کام جلدی ہو جاتا ہے۔
چنانچہ میں نے بھی خواجہ صاحب کے اس اصول کو گرہ میں
باندھ لیا۔ اور اب تک پریس اور کاتبوں کو اجرت پیشگی
دیتا ہوں۔ مگر افسوس کہ اب نہ تو کاتب ہی وہ کاتب
رہے ہیں اور نہ پریس ہی وہ پریس رہے ہیں۔ اکثر
کاتب حضرات پیشگی اجرت لے کر دوسرا کام لے لیتے
ہیں اور سمجھتے ہیں کہ پہلے کام کی تو اجرت پیشگی مل ہی
چکی ہے وہ کام تو اپنے پاس ہی رہے گا دوسرا کام جو
ملتا ہے اسے بھی لے لو۔ اسی طرح پریس والوں کا
حال ہے۔ اول تو کوئی بھی پریس ہو وہ وعدے پر کام
کر کے نہیں دیتا۔ اور اب تو یہ حال ہے کہ اجرت خواہ
پیشگی دیجئے یا ساتھ چاہے بعد میں دیجئے مگر کام وعدے

پر ملنا محال ہی نہیں ناممکن ہے۔
جناب عزیز حسن بقائی ایڈیٹر "حریت" سے بھی خواجہ
صاحب نے ہی مجھے متعارف کرایا۔ اس ملاقات کا ذکر
خواجہ صاحب نے مارچ ۱۹۲۵ء کے "منادی" میں ان الفاظ
میں فرمایا۔ "آج تین بجے جالندھر کا ماہنامہ ایجوکیشنل گزٹ
کے مالک عبدالرزاق اور ایڈیٹر دیا پرکاش سرور تونسوی
ملاقات کے لئے خواجہ منزل آئے اس رسالے کی یہ ادا مجھے
پسند آئی کہ مالک مسلمان اور ایڈیٹر ہندو ہیں اور دونوں
خدمت اردو میں ایک دوسرے کے معاون ہیں" خواجہ صاحب
کی ایک نظر غلط انداز نے ہمارے دل و دماغ سے اُن خدشات
کو نکال دیا تھا جو "ریاست" کے مطالعہ کے باعث ہمارے
دل میں موجود تھے۔ حیدرآباد پہنچنے پر دوسرے دن مہاراجہ
بہادر سر کشن پرشاد شاد وزیر اعظم کے پرائیوٹ سکریٹری
کو جونہی وزٹنگ کارڈ دیا گیا تو اس نے چند منٹ بعد
ہی راقم کو مہاراجہ بہادر کے حضور میں پیش کر دیا اور انہوں
نے مجھے "ملبوس" پہننے وغیرہ کی پابندی سے بھی بری رکھا۔
کچھ سال بعد خواجہ حسن نظامی صاحب ملتان تشریف لائے
انہیں خاص طور پر ہندو مسلم اتحاد کو بڑھاوا دینے پر
تقریر کے لئے مدعو کیا گیا تھا بوہڑ دروازے کے باہر نالے کے
قریب سرکاری ہسپتال (اب اس ہسپتال کا نام غالباً
جناح ہسپتال ہے) سے ملحق باغ میں خواجہ صاحب نے
تقریر فرمائی ہزاروں سامعین کا مجمع تھا اور خواجہ صاحب
کی تقریر کے ایک ایک فقرے پر تالیوں کا سلسلہ شروع
ہو جاتا تھا۔ خواجہ صاحب نے جب یہ فرمایا کہ ویدوں
میں ہزاروں سال پہلے حضرت محمدؐ کی بعثت کی پیشین گوئی کی
گئی ہے اور اشلوکوں سے یہ پیشین گوئی سنسکرت زبان میں
سنائی تو تالیوں کا شور کئی منٹ تک جاری رہا۔ تقریر کے
بعد عوام نے خواجہ صاحب کو گھیر لیا۔ اور ہر کوئی ان سے
مصافحہ کرنا اور ان کے ہاتھ چومنا سعادت سمجھ رہا تھا
بڑی مشکل سے میں بھی ان تک پہنچ پایا تو دیکھتے ہی فرمانے

لگے میں تمھیں ملتان آنے کی خبر بھجوانا چاہتا تھا۔ مگر پروگرام اس قدر جلدی میں ترتیب دیا گیا کہ لاہور، منٹگمری اور دیگر مقامات پر کسی کو بھی اطلاع نہ دی جاسکی۔ مجھے یقیناً انتہائی خوشی ہوئی کہ خواجہ صاحب نے مجھے پہچان لیا۔ صاحب کا قیام نواب مرید حسین قریشی کے ہاں تھا۔

دوسرے دن صبح اُن کی خدمت میں حاضر ہوا اور کچھ دیر تک اُن کی گفتگو سنتا رہا جو وہ مخصوص حاضرین سے فرما رہے تھے پھر مجھ سے مخاطب ہوکر فرمانے لگے شانِ ہند میں تمھارے ادارتی شذرے کبھی کبھی پڑھتا ہوں تو خوشی ہوتی ہے کہ تمھیں صحافتی گُر معلوم ہیں۔

قسمت نے تقسیم وطن کے بعد خواجہ کی دلی میں پناہ گزین کی حالت میں لا پٹکا۔ اور سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر "ریاست" کے ہاں ہر روز کی حاضر باشی کے دوران اکثر و بیشتر خواجہ صاحب کا ذکر آتا رہتا۔ ان دنوں سردار صاحب اور خواجہ صاحب میں بول چال بھی بند تھا۔ سردار صاحب کی محفل میں بیٹھنے والوں کی خیریت اسی میں رہتی تھی کہ وہ سردار صاحب کی ہر بات پر صاد کہیں۔ ماسٹر امیر چند کھنہ اور کالی شونارائن بھٹناگر ایڈیٹر روزنامہ وطن اور مالک ملی پریس کہیں کہیں سردار صاحب سے اختلاف کرتے تو سردار صاحب آپے سے باہر ہو جانے لگے اور محفل معمول سے پہلے ہی برخاست ہو جاتی تھی اس لئے ہر کوئی محتاط رہتا تھا کہ سردار صاحب کی مخالفت نہ ہی کی جائے تو بہتر ہے تاکہ ہنسی خوشی کی محفل ناخوشگواری پر ختم نہ ہو۔ لہٰذا مجھ ایسے شرکاءِ محفل جن کے تعلقات سردار صاحب کے بیشتر اور مفروضہ مخالفوں سے بھی بہتر تھے وہ زیادہ تر سردار صاحب کے فرمودات سننے پر ہی اکتفا کرتے اور کسی قسم کی رائے زنی نہ کرتے۔

مہاتما گاندھی کی شہادت کے بعد بستی نظام الدینؒ میں کھلے بندوں آنا جانا شروع ہوا تو خادم نے بھی حضرت نظام الدین اولیاؒ اور حضرت امیر خسروؒ کے مزارات پر سرِ عقیدت جھکایا اور خواجہ حسن نظامی کی خدمت میں بھی حاضری دی۔ ملتان سے دلی پہنچنے تک کے حالات خواجہ صاحب نے سُنے تو حوصلہ بندھاتے ہوئے فرمانے لگے یہ سب کچھ ہمارے اعمال کا نتیجہ ہے اور جو کچھ ہوتا ہے اللہ کے حکم کے مطابق ہی ہوتا ہے لہٰذا صبر و شکر کے ساتھ خدا پر بھروسہ رکھتے ہوئے محنت کرو اللہ ضرور کامیابی دیگا۔

سردار صاحب کی سی۔ آئی۔ ڈی بھی غضب کی تھی۔ وہ اس کا خاص خیال رکھتے تھے کہ اُن کے احباب یا ملنے والوں میں کون کون اُن کے مخالف حضرات سے ملاقات کرتا ہے یا میل جول رکھتا ہے۔ ایک دن بھیا احسان الحق صاحب سردار صاحب کے ہاں تشریف لائے تو سردار صاحب نے اُن سے دریافت فرمایا سُنائیے خواجہ صاحب کا کیا حال چال ہے (بھیا احسان الحق صاحب کے تعلقات خواجہ صاحب سے بہت گہرے تھے اور سردار صاحب سے دیرینہ اور دوستانہ تعلقات تھے) بھیا احسان الحق فرمانے لگے کل اُن کی خدمت میں حاضری دی تھی تو آپ کی صحت کے بارے میں دریافت کر رہے تھے بے ساختہ میری زبان سے نکلا کہ ہاں سردار صاحب مجھ سے بھی انھوں نے آپ کی صحت کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ اس وقت تو سردار صاحب خاموش رہے مگر بھیا صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد میری جواب طلبی بلکہ تفتیش شروع ہوئی کہ تمھارے خواجہ صاحب سے کب کے تعلقات ہیں اور ملتان سے آنے کے بعد کتنی بار اُن سے ملاقات ہو چکی ہے اور اس سے پہلے یہ کیوں نہیں بتایا کہ خواجہ صاحب نے تم سے میری صحت کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے سردار صاحب کو جب یہ بتلایا کہ دادا سے میری نیاز مندی کا سلسلہ خواجہ صاحب سے وابستہ ہے تو انھیں حیرت تو نہیں ہوئی بلکہ افسوس ہوا کہ وہ اس سے بے خبر کیوں رہے تب سے سردار صاحب خواجہ صاحب کے بارے میں مجھ سے بھی کافی محتاط رہنے لگے۔ ●●

(جاری ہے)

گوشۂ عقیل صدیقی

بزمِ غالب کامٹی کا آٹھواں کُل ہند مشاعرہ

"خلیل انجم کامٹی"

بزمِ غالب کامٹی نہ صرف مہاراشٹر میں بلکہ پورے ہندوستان میں اپنی ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے جانی پہچانی جاتی ہے اس کے زیرِ اہتمام ہونے والے مشاعرے تاریخی حیثیت رکھتے ہیں بزمِ غالب کا آٹھواں کُل ہند مشاعرہ ۱۳ دسمبر ۱۹۹۳ء کی شب میں پوروال پارک کامٹی میں منعقد ہو رہا ہے اس مرتبہ مشاعرہ ٹکٹ سے ہو رہا ہے مشاعرہ گاہ کو خوبصورتی کے ساتھ سجایا گیا ہے روشنی کا اچھا خاصا انتظام ہے نشست کیلئے دریاں اور گدّے بچھا دیئے گئے ہیں اسٹیج کے دائیں طرف کچھ کرسیاں اور صوفے خصوصی مہمانوں اور اونچی ٹکٹ والوں کے لئے لگا دیئے گئے ہیں آج صبح ہی سے شہر میں کافی چہل پہل ہے ہر جگہ مشاعرہ ہی موضوعِ گفتگو بنا ہوا ہے مشاعرہ کے صدر ناگپور کے چیف جسٹس محمد مجیب الدین قاضی صاحب تشریف فرما ہیں ان کا استقبال گل پوشی سے کیا جا رہا ہے۔ بزمِ غالب کی جانب سے شائع کیئے گئے ... کا اجراء صدرِ محترم کے دستِ مبارک سے ہوا ہے اور سوینیر کے اجراء کے بعد صدرِ محترم اپنی صدارتی تقریر جچے تُلے انداز میں فرما رہے ہیں۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بج چکے ہیں۔ سامعین کی آمد جاری ہے صدرِ محترم اپنی تقریر ختم کر کے اپنی جگہ پر آ گئے ہیں اور اب نقیبِ مشاعرہ شمیم طارق صاحب کو آواز دی جا رہی ہے شمیم طارق بمبئی سے تشریف لائے ہیں۔ ایک اچھے ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ آپ ایک اچھے سیاسی نوجوان کارکن اور لیڈر ہیں ان کی تقریر کا موضوع مشاعرہ کی اہمیت پر خاص طور سے ... علی گڑھ کے مشہور شاعر یا "امراؤ جان" شہریار کے اس ... کا حوالہ دے رہے ہیں جو آج ہی ناگپور کے مشہور روزنامہ "دی ہتواد" میں شائع ہوا ہے شہریار بھی اسٹیج کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ اپنی تقریر ختم کرنے کے بعد شمیم طارق مشاعرہ کا آغاز کرنے کے لئے کامٹی کے جانے پہچانے شاعر خلش قادری کو آواز دے رہے ہیں خلش قادری مائک پر تشریف لا کر اپنی غزل کے کچھ شعر پیش کر رہے ہیں ان کا یہ شعر بہت پسند کیا گیا ؎

چہرہ مرا تھا سب کی نگاہوں کا آئینہ
یا دشتِ ہجر جب میں تمہاری نظر میں تھا

اب کامٹی ہی کے ایک کہنہ مشق شاعر عبدالرحمٰن راہی کو دعوتِ سخن دی گئی ہے راہی صاحب نے بڑے حوصلے کے ساتھ اپنی غزلوں کے متفرق اشعار سُنا کر داد حاصل کی ہے ان کے بعد ناگپور کے شاہد کبیر کو زحمت دی گئی ہے جدید شاعری کے ہمعلم برادروں میں جن شعراء کو مقبولیت حاصل ہے ان میں شاہد کبیر کا نام اہمیت کا حامل ہے ان کے دو شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

آتی ہوئی گھٹاؤں نے رستے بدل دیئے
اب بام پر وہ اپنے کھلے سر نہ آئے گا

کچھ تو رکھو کسی سے تعلق کے واسطے
یوں بے ثمر رہوگے تو پتھر نہ آئے گا

شاہد کبیر کامیاب لوٹ رہے ہیں اور ان کے اشعار پر تبصرہ فرماتے ہوئے نقیبِ مشاعرہ کامٹی ہی کے ایک اور جانے پہچانے شاعر ریاض احمد شمس کو آواز دے رہے ہیں۔ نام سنتے ہی ایک طرف سے کچھ ہنسنے کی آوازیں آنے لگیں۔ نقیبِ مشاعرہ نے برجستہ فرمایا کہ بھئی ہنسئے مت سورج کو بہت لمبا سفر طے کرنا پڑتا ہے

اور لیجئے وہ واقعی دور سے شمس صاحب اسٹیج کی طرف آتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ شمس نظم کے اچھے شاعر ہیں انھوں نے ایک مرصع نظم سنائی ہے اور سامعین سے داد بھی پائی ہے ـــ شمس کے بعد ناگپور کے اقبال توصیفی کو بلایا گیا ہے اقبال توصیفی صاحب مائک پر آئے مگر اپنے کلام سے سامعین کو متاثر نہیں کر پائے ـــ مشاعرہ سست رفتاری سے چل رہا ہے لوگ کروٹیں بدل رہے ہیں۔ لیجئے اب ڈاکٹر منشا الرحمٰن خاں منشا کو زحمت دی جا رہی ہے۔ منشا صاحب جب مائک پر تشریف لائے تو اسٹیج پر چائے کا دور چلنے لگا۔ منشا صاحب فرما رہے ہیں "سردی بہت ہے محفل کو گرمانے کی ضرورت ہے" اس پر کچھ سامعین کی طرف سے "واہ نانا" "واہ نانا" کی صدائیں بلند ہوئیں اور ماحول قہقہہ زار بن گیا۔ منشا صاحب سب کو نظر انداز کرتے ہوئے غزل ہاتھ اٹھا اٹھا کر اپنے مخصوص انداز میں پڑھ رہے ہیں۔ دو شعر آپ بھی سنئے ؎

جو گرمئ حیات کا دیتے نہیں پیام
اُن شاعروں کو بزمِ سخن سے نکال دو
جتنی متاعِ علم و یقیں اپنے پاس ہے
اُس میں سے کچھ زمانے کی جھولی میں ڈال دو

منشا صاحب کی یہ غزل گرچہ سنجیدہ ہے مگر ان کے پڑھنے کے انداز سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ غزل نہیں بلکہ ہزل پڑھ رہے ہیں۔ جب وہ مائک سے رخصت ہوئے تو ان کے مزاحیہ انداز سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نقیب مشاعرہ ایک لطیفہ سنا رہے ہیں۔ آپ بھی سماعت فرمائیے گا۔ جب پہلی بار جوش پاکستان سے دلی واپس آئے اور اپنے ہمعصروں میں بیٹھے تو کچھ ایسے لوگوں کا ذکر نکل پڑا جو جوش کے ساتھیوں میں سے تھے مگر انتقال فرما چکے تھے جوش صاحب جب کسی کے بارے میں دریافت فرماتے تو یہی جواب ملتا کہ صاحب کیا بتائیں بڑے اچھے آدمی تھے بیچارے اللہ کو پیارے ہوگئے جوش صاحب نے ایسے چار یا پانچ ہمعصروں کے بارے میں دریافت فرمایا مگر ناچار یہی جواب ملا احباب کے انتقال پر ملال کی خبر سن کر جوش نے بڑی سنجیدگی سے فرمایا کہ بھئی بات دراصل یہ ہے کہ جب تک اللہ میاں زندہ ہیں لوگ یونہی مرتے رہیں گے۔ اس لطیفے سے ماحول قہقہہ زار بن گیا ہے اور ایسے ماحول کا فائدہ اٹھا کر طنز و مزاح نگار شاعر استاد رام پوری کو زحمت دی گئی ہے۔ استاد رام پوری اپنی بھرپور شخصیت کے ساتھ مائک پر آکر فرما رہے ہیں ؎

ہمیں افلاس نے ایسی جگہ پہونچا دیا یارو
جہاں مہمان سی شے بھی بڑی محسوس ہوتی ہے
کسی بھی رات کوئی چور آجاتا ہے جب گھر میں
غریبی کی قسم شرمندگی محسوس ہوتی ہے

داد و تحسین اور قہقہوں کی ملی جلی آوازوں سے ماحول لالہ زار بن گیا ہے مگر استاد رام پوری کی سنجیدہ طبیعت پر اس کا کوئی اثر نہیں وہ بڑے اطمینان سے یکے بعد دیگرے قطعات سناتے چلے جا رہے ہیں اور سامعین کو ہنسا رہے ہیں آخر میں ایک نظم سنا کر اپنی جگہ واپس آگئے ہیں۔ نقیب مشاعرہ قہقہہ زار ماحول کو مزید قہقہہ زار بنانے کے لئے ایک اور مزاحیہ شاعر باہر محمد آبادی کو زحمت دے رہے ہیں باہر محمد آبادی اپنے پہلے قطعہ میں اس تجربہ کو پیش کر رہے ہیں جس سے انھیں کامٹی کے ریسٹ ہاؤس میں دوچار ہونا پڑا تھا۔ ان کی نظم "کامٹی کا ریسٹ ہاؤس" کچھ دل کا ٹیسٹ ہاؤس ہے باہر محمد آبادی بھی سامعین کو ہنسانے میں خاطر خواہ کامیاب ہوئے۔ ایسے ماحول میں اب جو بھی شاعر آتا قربانی کا بکرا ہی بنتا۔ مگر نقیب مشاعرہ کی جانثاری اور حوصلہ دیکھئے کہ وہ خود قربانی کا بکرا بننے کے لئے مائک پر آکھڑے ہوئے ہیں۔ لیکن انھوں

اپنے اچھے اشعار سے سامعین کے دلوں کو جیت لیا۔
ان کے چند شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

دل کی دھڑکن کو تمنا کی سہیلی کہیئے
رسم دنیا ہے کہ دنیا کو پہیلی کہیئے
ہمقدم دوست مرے ساتھ کی کھیلی کہیئے
گردشِ وقت کو بچپن کی سہیلی کہیئے
اس پہ ہے روح لکیروں کے سوا کچھ بھی نہیں
کرۂ ارض کو بیوہ کی ہتھیلی کہیئے
دل کا سناٹا بستی میں آنا کی آہٹ
ایک جوگن کو سرِ شام اکیلی کہیئے
روح بد گر دیکھنا ہو تو پھر روح کہاں
روح خوشبو ہے اسے بوٹے چنبیلی کہیئے

شمیم طارق نہایت کامیاب ہو کر مائک سے لوٹ کر اپنی جگہ آ کر فرما رہے ہیں کہ آپ نے میری آوارگی غزل کو پسند فرمایا۔ لیجئے اب آپ کے سامنے مشاعرے کی واحد مشاعرہ حنا تیموری کو زحمت غزل سرائی دے رہا ہوں —— حنا قبول شکل و صورت کی نوجوان شاعرہ ہیں اور مصر سے تشریف لائی ہیں۔ سامعین سنبھل کر بیٹھ گئے ہیں۔ ساری نگاہیں مائک پر ایستادہ اس نوجوان شاعرہ کی طرف ہیں۔ حنا تیموری بڑے حوصلے کے ساتھ اچھے ترنم میں مطلع سنا رہی ہیں ؎

ضد ہے تو خیر میں گلشن سے نکل جاؤں گی
میں نئے گل جتنے سنوار رہے ہیں گھل جاؤں گی

آواز میں بلا کا سحر ہے سامعین ہمہ تن گوش ہو کر سن رہے ہیں کہیں کہیں سے "واہ وا" کی آوازیں بھی آ رہی ہیں۔ حنا تیموری ماحول کا جائزہ لے کر پھر مخاطب ہیں ؎

بیش کو کم کا نہیں ہوتا ہے محبت میں سوال
تم ذرا ہنس کے بھی دیکھو تو بہل جاؤں گی
تم کو لازم ہے بچاؤ کا طریقہ سوچو
میں تو گہوارۂ طوفاں میں بھی پل جاؤں گی

پنڈال نعرۂ تحسین و آفریں سے گونجنے لگا —— ایک تو آواز کا جادو دوسرے شعر کی سادگی اور سونے پر سہاگہ پڑھنے والا خود مجسّم غزل —— بھلا داد کیوں نہ ملتی؟ داد و تحسین کا شور کم ہوا تو حنا فرما رہی ہیں ؎

اپنے مقصود پہ اٹل ہوں میں پہاڑوں کی طرح
میں بھی کیا آپ کا دل ہوں جو بدل جاؤں گی

اس وقت مشاعرہ شباب پر ہے حالانکہ وہ شعرائے کرام جن کے لئے سامعین نے ٹکٹ خریدے ہیں۔ ابھی مائک پر نہیں آئے ہیں۔ حنا تیموری اپنی غزل ختم کر کے نہایت کامیاب ہو کر مائک سے رخصت ہو رہی ہیں تو شہر اکولہ کے شاعر غنی اعجاز کو زحمت دی گئی ہے۔ غنی اعجاز کا نام سنتے ہی لوگ ادھر ادھر سے اٹھ کر ضروریات کے لئے باہر جا رہے ہیں جس کی وجہ سے مشاعرہ میں کچھ بدمزگی پیدا ہو رہی ہے حنا تیموری نے جو تاثر چھوڑا تھا اس کا طلسم بکھر ٹوٹ کر رہ گیا ضرورت اس بات کی تھی کہ کسی ایسے شاعر کو پیش کیا جاتا جو اس تاثر کو برقرار رکھتا۔ بہر حال باوجود حسبِ توقع غنی اعجاز سامعین کو متاثر نہیں کر سکے۔ اب محترم شمیم مظفرادی کو نہایت ادب و احترام کے ساتھ مائک پر آنے کی درخواست کی گئی ہے۔ شمیم صاحب ایک عرصہ سے اردو ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں بڑے مخلص اور ادب نواز شخصیت کے مالک ہیں حالات پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں عمر کی ساٹھ سے زیادہ بہاریں دیکھ چکے ہیں مگر آواز میں وہی مٹھاس اور لچک ہے۔ بڑے انہماک سے مترنم آواز میں فرما رہے ہیں ؎

کس کو امید ہے کہ راہ مل جائے گی
منزلیں سخت ہیں ہم سفر اجنبی
ہم بھی انجان ہیں تم بھی انجان ہو
راستے پُر خطر رہبر اجنبی

سامعین پھر اپنی بیداری اور خوش گواری کا اظہار کر رہے ہیں اور شمیم صاحب اپنے مخصوص لب و لہجہ میں فرما رہے ہیں ؎

تمام دور ٹوٹ گئے برسات میں اور روش اک نئی ہوگی حالات میں
بد حواسی کے عالم میں لوٹے اگر تو لگنے لگے گا سبھی اپنا گھر اجنبی

شمیم صاحب نے اپنی مرصع غزل مترنم آواز میں سنا کر شاعرے کو دوبارہ زندگی دیدی ہے غزل ختم کر کے واپس ہوئے تو نقیب شاعرہ بمبئی سے تشریف لائے ہوئے جدید شاعری کے معتبر شاعر ممتاز راشد کو انھیں کے ایک خوبصورت شعر سے متعارف کراتے ہوئے آواز دے رہے ہیں ؎

ایک مصرع ہے زندگی میری
آپ چاہیں تو شعر ہو جائے

مگر ممتاز راشد سے جو توقعات وابستہ تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں۔ تاہم کامٹی کے اہلِ ذوق سامعین خاموشی کے ساتھ انھیں برداشت کر رہے ہیں ان کا ایک قطعہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

درد کی حد سے گزرنا تو ابھی باقی ہے
ٹوٹ کر بکھرنا تو ابھی باقی ہے
پاس آ کر مرا دکھ درد بٹانے والے
مجھ سے کترا کے گزرنا تو ابھی باقی ہے

اب ندا فاضلی جنھوں نے کچھ فلمی گیت بھی لکھے ہیں مائک پر تشریف فرما ہیں جدید شاعری کی باگ ڈور جن شعراء کے ہاتھوں میں ہے ان میں ندا فاضلی بہت مقبول و ممتاز ہیں لوگ پھر سنبھل کر بیٹھ گئے ہیں ندا فاضلی بھی تحت میں پڑھتے ہیں مگر پڑھنے کا انداز بہت اچھا ہے۔ فرما رہے ہیں ؎

سفر میں دھوپ تو ہوگی جو چل سکو تو چلو
سبھی ہیں بھیڑ میں تم بھی نکل سکو تو چلو
یہاں کسی کو کوئی راستہ نہیں دیتا
مجھے گرا کے اگر تم سنبھل سکو تو چلو

کچھ لوگ داد دے رہے ہیں اور کچھ لوگ ناگواری کا اظہار کر رہے ہیں تاہم ندا فاضلی کامیاب ہیں اور دوسری غزل بھی پیش کر رہے ہیں ؎

بات کم کیجئے ذہانت کو چھپاتے رہئے
یہ نیا شہر ہے کچھ دوست بناتے رہئے
دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجئے رشتہ
دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہئے

غزل کے بعد سامعین کے اصرار پر ایک نظم سنا رہے ہیں جو انھوں نے اپنے والد محترم کے انتقال سے متاثر ہو کر کہی ہے۔ ندا فاضلی کے بعد نئے لب و لہجہ کے شاعر آغا امیر قزلباش کا اسم گرامی پکارا گیا ہے امیر قزلباش کی شاعری میں تازگی بھی ہے اور زندگی بھی۔ امیر قزلباش مائک پر رونق افروز ہو کر اپنی تقریر اور حاضر جوابی سے سامعین کو محظوظ فرما رہے ہیں بہرحال ایک دو شعر سنا کر ایک غزل سنا رہے ہیں آپ کی ضیافتِ طبع کے لئے چند شعر پیش ہیں۔ ؎

وہ سر پھری ہوا تھی سنبھلنا پڑا مجھے
میں آخری چراغ تھا جلنا پڑا مجھے
کچھ دور تک تو جیسے کوئی میرے ساتھ تھا
پھر اپنے ساتھ آپ ہی چلنا پڑا مجھے

دفعتاً ایک آواز آتی ہے کہ صاحب! مزہ نہیں آرہا ہے" امیر قزلباش کے منہ سے بے ساختہ نکلا "صاحب مزہ تو مجھے بھی نہیں آرہا ہے کیوں کہ میں کچھ اور دیکھتا ہوں" سامعین کچھ اور دیکھنے کا مطلب سمجھ گئے ہیں کیونکہ امیر قزلباش کی ایک بیک خواتین سامعین کی طرف

اُڑ گئی تھیں اس لئے سامعین بے اختیار ہنسنے لگے ہیں۔ امیر قزلباش اشعار سُناتے چلے جا رہے ہیں اور داد تحسین سے مشاعرہ گاہ کی چھت اُڑی جا رہی ہے مشاعرہ میں پھر سے زندگی آ گئی ہے۔ امیر قزلباش سامعین کے موڈ کو سمجھ گئے ہیں اور جو اشعار سُنا رہے ہیں چند اشعار جو میں نوٹ کر سکا آپ کی خدمت میں حاضر کر رہا ہوں ؎

تیرے چہرے پہ کسی اور کی صورت ہوگی
آئینہ دیکھنے والے تجھے حیرت ہوگی

نیند ٹوٹے گی خدا جانے اچانک کس کی
جانے کس شخص کو ہم میں سے بشارت ہوگی

مرے جنوں کا نتیجہ ضرور نکلے گا
اسی سیاہ سمندر سے نور نکلے گا

اسی کا شہر وہی مدعی وہی منصف
ہمیں یقیں تھا ہمارا قصور نکلے گا

اک پرندہ ابھی اُڑان میں ہے
تیر ہر شخص کی کمان میں ہے

جس کو دیکھو وہی ہے چپ چپ سا
جیسے ہر شخص امتحان میں ہے

بادل ہو تو برسو کبھی بے آب زمیں پر
خوشبو ہو اگر تم تو بکھر کیوں نہیں جاتے

جب ڈوب ہی جانے کا یقیں ہے تو نہ جانے
یہ لوگ سفینے سے اُتر کیوں نہیں جاتے

تم راہ میں چپ چاپ کھڑے ہو تو گئے ہو
کس کس کو بتاؤ گے کہ گھر کیوں نہیں جاتے

امیر قزلباش شعر سُناتے سُناتے تھک گئے ہیں مگر سامعین داد دیتے دیتے نہیں تھکے غزلوں کے اشعار کی مقبولیت کے بعد امیر قزلباش ایک نظم پیش کر رہے ہیں جس کا عنوان "کمانی" ہے نظم میں کمانی کا ایک خاص رنگ ہے۔ غرض امیر قزلباش بہت کامیاب ہو کر مائک سے رخصت ہو رہے ہیں اور نقیب مشاعرہ جو دورانِ نظامت کبھی کبھی شعر بھی سُنا یا کرتے تھے فرما رہے ہیں کہ میں اب آپ کو شعر نہیں سُناؤں گا۔ اگر اب اشعار سُنانے کی ضرورت پڑی تو میں امیر قزلباش سے درخواست کروں گا وہ میری نمائندگی کریں گے۔ اب مختصر سے تعارف کے بعد علی گڑھ سے تشریف لائے شاعر شہریار کو زحمت دی جا رہی ہے شہریار فلموں سے بھی وابستہ ہیں مشہور فلم "امراؤ جان" کی غزلیں انھیں کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں شہریار مائک پر آ کر فرما رہے ہیں ؎

سبھی کو غم ہے سمندر کے خشک ہونے کا
کہ کھیل ختم ہوا کشتیاں ڈبونے کا۔

شہریار کے پڑھنے کا انداز عجیب سا ہے۔ وہ مائک کے سامنے اٹینشن کی پوزیشن پر کھڑے ہیں جو سامعین کو کچھ ناگوار سا گزر رہا ہے اشعار بھی ایسے سُنا رہے ہیں کہ جن میں نہ لطافت ہے نہ حسن زیبائش ہے۔ جو لوگ شہریار سے کچھ امیدیں رکھتے تھے پڑھ کے مایوس ہو کر ایک دوسرے کو تک رہے ہیں۔ آپ بھی شہریار کے کچھ شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

کاغذ کی کشتیاں بھی بہت کام آئیں گی
جس دن ہمارے شہر میں سیلاب آئے گا

ان کے پیچھے نہ چلو ان کی تمنا نہ کرو
سائے پھر سائے ہیں کچھ دیر میں ڈھل جائیں گے

یہ کیا ہوا کہ طبیعت سنبھلتی جاتی ہے
ترے بغیر بھی یہ رات ڈھلتی جاتی ہے

جی ہاں! اس وقت رات کے دو بجنے والے ہیں مشاعرہ نشیب و فراز کی منزلوں سے گزر رہا ہے۔ بارش کی ہلکی ہلکی پھوار پہلے ہی شروع ہو گئی تھی اور شامیانے چھن چھن کر سامعین کو مزید سردی کا احساس

دلا رہی ہیں۔ مگر سامعین اپنی جگہ اٹل ہیں اور بیکل
ہیں ایک ایسے شاعر کو سننے کے لئے جس کی آواز
جس کا انداز بیان اور جس کی شاعرانہ شخصیت
شعر وادب کی انجمن میں ایک مقام رکھتی ہے۔
بڑے احترام وادب کے ساتھ محترم بیکل اتساہی کو
دعوت سخن دی جا رہی ہے۔ بیکل اتساہی ۱۹۵۲ء
سے مشاعرے پڑھ رہے ہیں۔ جگر۔ جوش۔ فراق اور
شکیل جیسے اساتذہ کے ساتھ مشاعرہ پڑھنے والا
یہ شاعر آج نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں
اپنی عظمت کا سکہ جما چکا ہے۔ آج شام میری جب
ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے آج کے شاعروں
کی اہمیت پر تبصرہ فرماتے ہوئے کہا کہ اب مشاعرے
نہیں ہوتے بلکہ گانے والوں کا مقابلہ ہوتا ہے۔
تاہم انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ شہر کامٹی
میں سامعین بہت صاف ستھرا ادبی و شعری ذوق
رکھتے ہیں اور شعراء کی صحیح قدر کرتے ہیں ——
بیکل اتساہی اپنی وضع قطع سے ہی شاعر معلوم
ہوتے ہیں۔ مائک پر آکر سامعین کو پہلے اپنے
روز مرہ کے مشاغل سے آشنا فرما رہے ہیں پھر
تحت میں متفرق اشعار سنا کر خوب داد وصول
کر رہے ہیں مشاعرے کا آخری شاعر مائک پر ہے
لوگ بڑی دلچسپی اور ذوق شوق سے بیکل اتساہی
کا کلام سن رہے ہیں۔ اور محظوظ ہو رہے ہیں۔
پھر سامعین کے اصرار پر ایک نظم ترنم سے سنا رہے ہیں۔
رات اپنے سفر کے آخری مرحلے میں ہے اور بیکل اتساہی
کی مدھر آواز " آواز مری گیسوئے شب کھول رہا ہے "
والے مصرع کی یاد دلا رہی ہے۔ سامعین چاہتے ہیں
کہ وقت کی رفتار تھم جائے اور بیکل اتساہی مائک پہ
جمے رہیں لیکن وقت کے ساتھ چلنے والا یہ
بین الاقوامی شاعر بھلا کب تک ٹھہر رہتا۔ میں بھی

ان کی دل نواز شاعری اور مدھر آواز میں اتنا کھو گیا
کچھ نوٹ ہی نہ کر سکا۔ اس طرح مشاعرہ کا یہ پہلا دور
ختم ہوا۔ آدھ گھنٹہ بعد مشاعرے کا دوسرا دور شروع
ہوا۔ سامعین کی تعداد تقریباً اتنی ہی ہے جو ابتدا میں
تھی۔ دوسرے دور میں سامعین کی فرمائش پر انہی
شعرا کو پیش کیا گیا جو پہلے دور میں پسند کئے گئے تھے
جناب تیموری، شمیم شہزادی۔ استاد رامپوری۔
ماہر محمد آبادی۔ ندا فاضلی۔ انیس قزلباش اور بیکل
اتساہی نے دوسرے دور میں بھی سامعین کو محظوظ کیا
دوسرا دور پہلے دور کے مقابلے میں اچھا ثابت ہوا
اس طرح صبح کے چار بجے یہ مشاعرہ اختتام کو پہنچا
اراکین بزم غالب جناب سید قمر الزماں نادر
نظیر رشیدی۔ عباس صادق اور جمیل حمیدی وغیرہ
مبارک باد کے مستحق ہیں جنھوں نے اس مشاعرے
کے شایان شان اہتمام وانتظام کے لئے مسلسل
کئی روز تک دوڑ دھوپ کی۔

غزل

زخمی حصاری

کس کو حاصل عیش کے ساماں
کس کے دل کے نکلے ارماں

تھے جو سر کھجر بجتا چار ج
بن بیٹھے وہ آج ہمہ داں

بے شرمی سی بے شرمی ہے
تار تار ہے شرم کا داماں

گھر کے اندھیرے روز فزوں تر
محفل میں ہے جشنِ چراغاں

یہ پہچان بھی اب نہیں ہم کو
کون ہے انساں کون ہے حیواں

دورِ گرانی حد سے گزرا
خونِ انساں پھر بھی ارزاں

ایسی ہوائیں کب آئیں گی
صحرا ہو گا رشکِ گلستاں

آدم کو تم ہیچ نہ سمجھو
آدم سے ہے عظمتِ یزداں

روزِ ازل سے مشہور ہے زخمی
دنیا ہے دو دن کی مہماں

غزل

ڈاکٹر شمیم قدوائی (بارہ بنکوی)

یارب نظامِ زیست میں ایسے خلل پڑے
رونے سے ہے سکوں نہ ہنسنے سے کل پڑے

حالت پہ میری اُن کے جو آنسو نکل پڑے
دل کو نہ تھا لگاؤ۔ تو پھر کیوں اُبل پڑے

منزل کا کچھ خیال۔ نہ کچھ کارواں کی فکر
دیوانے اپنا دھن میں بہر حال چل پڑے

مجھ پر جفائیں کیں یہ نوازش ہے آپ کی
سن کر چراغ پا ہوئے مجھ سے بدل پڑے

بے چارگی سے میری یہ ارمان بر محل
معصوم دل کو اپنا سمجھ کر مچل پڑے

میرا رقیب حسن تغافل کسی کا ہے
اتنی سی بات میں نے کہی وہ اچھل پڑے

ہم سرگزشت اپنی بتائیں شمیم کیا
پوچھا کسی نے حال تو آنسو نکل پڑے

لاجواب

ڈاکٹر اودے سری ارمان
(بلاری)

مکرم علی شاہ کی مسجد اور ٹھاکروں کا مندر یوں تو الگ الگ گلی میں واقع تھے لیکن شام کو ترچھے سورج کی دھوپ آدھے مندر اور مسجد میناروں اور گنبد پر کچھ اس طرح پڑتی تھی کہ ان کے سائے سے ہر مندر سے ملحقہ خالی قطعۂ زمین پر آگی ہوئی گھاس پر "اللہ" کا طغرہ بنے دکھائی دیتے ہیں شام کو جب بھی مندر کے قریب سے گزرتا اس سائے کو ضرور دیکھتا تھا گاؤں کے کئی مسلمانوں کو بھی میں نے یہ سایہ دکھایا تھا اس قدرتی کرشمے کو دیکھتا خدا کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاتا۔ بارہا میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر اس سائے میں قوت گویائی ہوتی تو یہ ضرور ببانگ بلند کہتا کہ ہر عبادت گاہ میں معبود ایک ہی ہے میں اکثر اس سائے کو بڑے غور سے دیکھتا رہتا تو ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے یہ کتبہ زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہو کہ "اللہ" کے لئے صرف مسجد اور بھگوان کے لئے صرف مندر ہی مسکن نہیں بلکہ اللہ یا بھگوان ہر جگہ موجود ہے۔ میں ان ہی خیالوں میں گم تھا کہ اللہ اور بھگوان ایک ہیں اور یہ کتبہ ہمیں رہتی دنیا تک مل جل کر رہنے کا درس دیتا رہے گا۔ کہ اتنے میں کسی نے پیچھے سے کہا "پنڈت جی نمستے" میں نے مڑ کر دیکھا تو چیت رام پاس ہی ہاتھ باندھے کھڑا تھا "جیتے رہو بھائی بھگوان تم کو بنائے رکھے۔ کہاں جا رہے ہو باپ بیٹے؟" میں نے کہا۔ پنڈت جی آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میرے ہاں کوئی بچہ زندہ نہیں رہتا تھا ایک دن میرا بھائی کہنے لگی چیت رام اب کی بار تم ٹھاکروں والے مندر میں بول دینا کہ لڑکا ہوگا تو سات سال کا ہونے پر اس کا منڈن اسی مندر میں کراؤں گا اور اس کا نام بھی اسی وقت رکھا جائے گا بھگوان نے چاہا تو آپ کا بچہ زندہ سلامت رہے گا اور آپ کے خاندان کا نام چلے گا۔ پنڈت جی کبھی کبھی چھوٹے لوگ بھی بڑے کام کی بات کہہ جاتے ہیں۔ میں نے ایسا ہی کیا اور بھگوان کی مہربانی سے میرا لڑکا اب سات سال کا ہو گیا ہے چیت رام نے بچے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ اور اب میں پنڈت چنتامنی سے اس کا نام کرن سنسکار کراؤں گا اور وہیں اس کا مونڈن سنسکار بھی ہو جائے گا یہ بتاشے پرساد بانٹنے کو لے لئے ہیں۔ "مبارک ہو چیت رام تم نے بہت اچھا کیا جو لوگ بھگوان کے سہارے رہتے ہیں ان کی ہر آرزو پوری ہوتی ہے مگر یہ ضروری ہے کہ عقیدت اور اعتقاد پختہ ہو۔ وہ تو ہے ہی پنڈت جی - یہ کہتے ہوئے اور بتاشوں کی ٹوکری بغل میں سنبھالتے ہوئے چیت رام مندر کے اندر چلا گیا۔ پنڈت چنتامنی نے بچے کے دونوں سنسکار رو دھی پورک سمپن کرائے اور لڑکے کا نام رام پرکاش رکھا۔ اب یہ ٹوکری اٹھاؤ اور میں جہاں جہاں کہوں دو دو بتاشے رکھتے جانا۔"

پنڈت جی نے کہا "بہت اچھا" کہتے ہوئے خوش خوش چیت رام اور اس کا بیٹا پنڈت جی کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ آج رام پرکاش بہت ہی خوش تھا۔ آج وہ اس بھگوان کو پرساد کھلانے جا رہا تھا جس کو اس کا باپ کھیت جوتتے بوتے اور کاٹتے اور اناج گھر میں لاتے نیز کھاتے پیتے اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے یاد کیا کرتا تھا۔ آج وہ اس بھگوان کے درشن کرے گا۔ جو بڑی شکتی والا ہے۔ جب کھیت لہلہاتے وقت آسمان میں بجلی چمکتی تھی۔ بادل گرجتے تھے تو چیت رام کہا کرتا تھا بھگوان چاہے بارش ہو جائے۔ اولے نہ پڑیں۔ یہ سن کر رام پرکاش کہتا تھا "کیا بھگوان اولے پڑنے سے روک سکتا ہے؟" "کیوں نہیں بیٹا۔ جو بھگوان پرہلاد کی رکشا کر سکتا ہے دہکتی آگ میں کمہار کے آوے میں ہانڈی میں رکھے بلی کے بچوں کو بچا سکتا ہے وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا۔" وہ کہتا

"کہاں ہے پتا جی؟" — "وہ مندروں میں رہتا ہے بیٹا۔"
"تو پھر وہ سب کے پاس مندو کو کیسے پہنچ جاتا ہے"
"جیسے سورج لہر لہر اور ذرے ذرے میں دکھائی دیتا ہے"
چیت رام اپنے بیٹے کو یہ سب کچھ ذہن نشین کراتا رہا تھا جس سے اُس کے دل و دماغ میں یہ خواہش مچلتی رہتی تھی کہ وہ بھگوان کے درشن کرنے کے لئے مندر میں جائے۔ مگر اُس کا باپ کسان تھا۔ اور کسان کی زندگی بہت مصروفیت کی ہوتی ہے۔ اس بیچارے کے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ وہ مندر میں جا سکے اُس کا مندر اور عبادت خانہ اُس کے کھیت اور کھلیان تھا۔ آج ٹھیک سات سال بعد وہ مندر آیا تھا وہ بھی کسی خاص مقصد کے لئے۔ جب کہ وہ آج سے سات سال پہلے بھی کسی بہانے ہی سے اس مندر میں آیا تھا۔ "میرے پیچھے پیچھے آؤ" پنڈت جی نے کہا اور وہ دونوں کمرے مندر میں پنڈت جی کے ساتھ ہی داخل ہو گئے
"دو بتاشے درگا ماتا کو ارپت کر دو" پیار کے ساتھ پنڈت جی نے رام پرکاش سے کہا۔ چیت رام نے بتاشوں کی ٹوکری رام پرکاش کی طرف جھکا دی اور اُس نے دو بتاشے اُٹھا کر رکھ دیئے رام پرکاش نے نیچے سے اوپر تک بغور دیکھا درگا ماتا خوبصورت شیر پر سوار تھیں اور اُن کے کئی ہاتھ تھے وہ ایسے دیکھ رہا تھا جیسے کہ اب تک میں بچے ہر چیز کو متحیر نظروں سے دیکھتے ہیں۔ پنڈت جی نے آگے بڑھتے کہا "آؤ بیٹا ادھر آؤ دو بتاشے یہاں بھی رکھ دو"
یہ سنتے ہی رام پرکاش چونکا اور پنڈت جی کے حکم کی تعمیل کرنے اُن کی طرف مڑا مگر وہ بار بار درگا ماتا کی مورتی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ مورتی بتاشے اٹھا کر کیسے کھاتی ہے۔ مگر اُس کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی پنڈت جی کے بڑھنے پر اُس نے وہ بتاشے اُٹھا کر ایک دوسری مورتی پر چڑھائے۔ وہ اس مورتی کو دیکھ کر سہم گیا اور کچھ پیچھے ہٹ گیا۔ پنڈت جی اُس کے من کی بات سمجھ گئے اور بولے "بیٹا یہ کالی ماتا ہے" کالی ماتا؟

رام پرکاش نے دل ہی دل میں پنڈت جی کا جملہ دہرایا اور مورتی کو سر سے پیر تک دیکھا۔ نیلا رنگ تھا اس کے بھی کئی ہاتھ ایک ہاتھ میں تازہ کٹا ہوا انسانی سر تھا۔ دوسرے میں خون سے لت پت چھرا سا تھا۔ ایک ہاتھ میں آگ کا شعلہ تھا ایک میں سنکھ تو ایک میں مالا تھی چہرہ کالا اور منہ سے لمبی زبان باہر نکلی ہوئی ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے لوہار کی بھٹی سے باہر نکلتا ہوا آگ کا شعلہ کالی ماں ایک آدمی کی لاش پر کھڑی تھی اور گلے میں کھوپڑیوں کی مالا پڑی تھی۔ دیکھتے دیکھتے رام پرکاش نے ہونٹ بسورے جیسے کہ اُس نے اندر ہی اندر اُس کو ماں ماننے سے انکار کیا ہو ماں کی شکل و صورت کا تصور تو ہر بچے کے ذہن میں بڑا خوبصورت ہوتا ہے لہٰذا وہ نفرت سے منہ پھیر کر آگے بڑھ گیا۔
"دو بتاشے یہاں بھی چڑھا دے بیٹا"۔ رام پرکاش نے دو بتاشے وہاں بھی رکھ دیئے۔ پنڈت جی کہنے لگے "بیٹا ہنومان جی کی مورتی ہے" رام پرکاش نے دیکھا کہ یہ مورتی ایک بندر کی تھی۔ جس کے ایک ہاتھ پر تربوز کی طرح کچھ رکھا ہوا تھا۔ اور دوسرے میں گدا تھی اس کے سر پر مکٹ بھی تھا دُم تو بہت ہی لمبی تھی اور یہ لنگوٹ بھی باندھے ہوئے تھا اور شائستہ معلوم پڑتا تھا۔
"جلدی آگے بڑھو بیٹے ابھی تو ہمیں بہت کام کرنے ہیں"۔ پنڈت جی نے کہا۔ اس پر چیت رام بولا "پنڈت جی یہ پہلی ہی بار مندر میں درشن کرنے آیا ہے پھر نہ جانے کب ایسا موقع ہاتھ آئے جی بھر کر دیکھ لینے دیجئے آپ تو ان کو روز دیکھتے ہیں۔ اس لئے آپ کا تو جی بھرا ہے"
چیت رام نے اپنے دل کی بات بیٹے کے بہانے ظاہر کی یہ سن کر اس طرح ہنسے کہ اُن کی ڈھیلی ڈھالی دھوتی تربوز طرح چکنی توند پر سے کچھ نیچے کھسک گئی اور انھوں دھوتی کی پھینٹ کسی۔ "دو بتاشے یہاں بھی رکھ بیٹا" پنڈت جی نے نرمی سے کہا اور اُس نے جلد دو بتاشے نکال کر رکھ دیئے وہ اس مورتی کو اوپر

نیچے تک دیکھ کر ہنس پڑا۔ پنڈت جی رام پرکاش کے ہنسنے کی وجہ سمجھ گئے۔ اور بولے "بیٹے یہ گنیش جی ہیں شیو جی کے بیٹے" رام پرکاش سوچ رہا تھا کہ اچھا خاصہ تنومند گول مٹول جسم اور اس پر ہاتھی کا سر چوہے کی سواری۔ توند پنڈت جی کی توند سے بھی دوگنی۔ سامنے لڈوؤں کا ڈھیر کیلوں کے انبار دیکھ کر بولا "پنڈت جی ان کا بیاہ کبھی ہوا تھا؟" "ہاں بیٹے بیاہ کیوں نہیں ہوتا" "تو ان کی بہو جی ان کی بولی کیسے سمجھتی ہوں گی؟" "بیٹا" یہ بولتے آدمی ہی کی طرح تھے" پنڈت جی نے کہا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آنے پر بھی رام پرکاش تیز معلم کے سامنے کند ذہن طالب علم کی طرح خاموش رہا اور آگے بڑھ گیا۔ "لو بیٹے دو بتاشے یہاں بھی رکھ دو یہ بھی شیو جی یعنی گنیش جی کے پتا" "گنیش جی کے پتا" دو بتاشے رکھتے ہوئے رام پرکاش نے دل ہی دل میں کہا" باپ کالا اور بیٹا گورا۔ باپ کا سر خوبصورت آدمی جیسا اور بیٹے کا سر ہاتھی کا طرفہ تب کے جسم پر ناگ لہرا رہے ہیں باگھ کی کھال لپیٹے ہوئے آدی باسی معلوم ہوتے ہیں اور بیٹا ایک دم سدھرا ہوا۔ ابھی وہ کچھ پوچھنے کے لئے ہونٹ کھولنے ہی والا تھا کہ پنڈت جی کہنے لگے "بیٹا یہاں بھی چڑھا دے دو بتاشے" رام پرکاش نے دو بتاشے وہاں بھی چڑھا دیئے "یہ تو بیل ہے" رام پرکاش نے زور سے کہا۔ "بیٹے بیل نہیں نادیا ہے شیو جی کی سواری" پنڈت جی نے سمجھایا۔ مگر اس کا دل مطمئن نہ ہوا اور وہ چپ چاپ دل ہی دل میں کہتا رہا "لگتا تو بیل ہی جیسا ہے بالکل چھکے بیل جیسا مگر اسے نادیا کیوں کہتے ہیں ہو سکتا ہے یہ کسی کسان سے زبردستی چھین لائے ہوں اس نے مرضی سے نہ دیا ہو اس لئے اس کا نام نادیا پڑ گیا ہو" وہ سوچ ہی رہا تھا کہ پنڈت جی بولے "اب یہ بتاشوں کی ٹوکری اس چوکی پر رکھ دو تھوڑے سے بتاشے تم بھی گھر بانٹنے کے لئے لے جاؤ تمہارا کام پورا ہو گیا۔ اب جا سکتے ہو" جوں ہی باپ بیٹے مندر سے باہر نکلے تو گلی میں ایک بھوکی پیاسی بھینس رمبھائی

رام پرکاش کہنے لگا۔ "پتا جی جلدی چلو اپنے چالو تو بھی اسی طرح رسجھا رہے ہوں گے" "ہاں بیٹا تو ٹھیک کہتا ہے" "پتا جی پنڈت جی نے ہمیں تو تھوڑے ہی سے بتاشے دیئے" "بیٹے پرساد تو بانٹنے ہی کو ہوتا ہے گھر لے جانے کو تھوڑے ہی ہوتا ہے جو دیئے ہیں یہی بہت ہیں" چیت رام کی بات پر رام پرکاش منہ کا تھوک نگل کر چپ ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ پھر بولا "پتا جی جس بھگوان کو آپ گھڑی گھڑی یاد کیا کرتے تھے ان میں سے وہ بھگوان کون سا تھا؟" رام پرکاش یہی سوال مندر میں ہی پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر مورتیوں پر بتاشے چڑھاتے وقت بھول جاتا تھا۔ چیت رام یہ سوال سن کر لاجواب ہو گیا اور انٹرویو میں پوچھے گئے مشکل سوال کا معقول جواب ڈھونڈنے میں قاصر و مجبور کینڈیڈیٹ کی طرح سٹپٹا رہا تھا۔ کہ اچانک کرم علی شاہ کی مسجد سے اذان کی آواز آئی "اللہ اکبر اللہ اکبر" "پتا جی یہ کیا کہہ رہا ہے؟" رام پرکاش نے اپنے پہلے سوال کا جواب سننے بغیر ہی دوسرا سوال کر دیا۔ "بیٹے یہ بھگوان کو یاد کر رہا ہے" خواب سے بیدار ہوئے شخص کی طرح چیت رام نے چونک کر کہا۔

"اسی بھگوان کو جس کو آپ گھڑی گھڑی یاد کیا کرتے ہیں!" "ہاں بیٹے" سر سے بوجھ اترے ہوئے مزدور کی طرح چین کی سانس لیتے ہوئے چیت رام نے جواب دیا۔۔۔

چلتا پھرتا بازار

دلی میں چلتا پھرتا بازار مقبول ہو رہا ہے اپنی بسیں موٹر گاڑیوں کے ساتھ یہ بازار روزانہ استعمال میں آنے والی چیزیں ان ساٹھ کالونیوں میں فروخت کرتا ہے جہاں کے رہنے والے ان چیزوں کو خریدنے کی قوت خرید نہیں رکھتے ہیں یہ اسکیم ۱۲ ہفتے پہلے شروع کی گئی تھی۔ اس اسکیم کے تحت اب تک ۱۶۸ لاکھ ۵۰ ہزار روپئے کی چیزیں فروخت کی جا چکی ہیں۔ چلتے پھرتے بازار میں کئی طرح کی چیزیں فروخت کی جاتی ہیں جیسے دالیں (چار قسم کی) چینی، کپڑا، کاپیاں، بناسپتی گھی، صابن، سرسوں کا تیل، ایپ سیڈ تیل، پیاز اور آلو۔ چائے۔ دالیں اور چینی پلاسٹک کے پیکٹوں میں فروخت کی جاتی ہیں اور بناسپتی گھی خاص طور پر تیار کئے گئے ایک کلو والے پلاسٹک پیک میں فروخت کیا جاتا ہے صاف کیا ہوا درآمد کیا ایپ سیڈ تیل اور پامولین چھوٹے پیکٹوں میں فروخت کرنے کا بندوبست کیا گیا ہے اس اسکیم کو جس قدر مقبولیت حاصل ہو رہی ہے اور کم قوت خرید رکھنے والے خریداروں کو اس سے جس قدر فائدہ حاصل ہو رہا ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے دہلی انتظامیہ نے لوگوں کے فائدے کے لئے اس اسکیم میں اور توسیع کرنے کا فیصلہ کیا ہے چلتے پھرتے بازار کے لئے جلد ہی کچھ اور موٹر گاڑیوں کا انتظام کیا جائے گا۔ تاکہ کمزور خریداروں کے۔ یہ چلتا پھرتا بازار ان کے علاقوں کا اپنا بازار بن سکے۔ آہستہ آہستہ یہ چلتا پھرتا بازار سرکاری کالونیوں میں بھی پہنچ جائے گا۔

الف سے آم

رتن سنگھ

میرے لئے امام دین کا تصور ایک بہت لمبے نہایت اونچے بلکہ سب سے لمبے سب سے اونچے شخص کا تصور ہے۔ تین سال کی عمر میں ان کے پاس کھڑے ہو کر ان کے چہرے کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے مجھے اپنی گردن پوری طرح اوپر کی طرف اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنا پڑا تھا جہاں ان کی سفید پگڑی کا طرہ فضا میں لہراتا ہوا دکھائی دے رہا تھا اور جب ان کی انگلی تھامے ہوئے میں سکول کی طرف جا رہا تھا تو مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ان کی تمام اونچائی اور بلندی میرے ننھے سے جسم میں تحلیل ہو رہی ہو۔ منتقل ہو رہی ہو تبھی تو میں اپنے آپ کو اونچا اونچا سا محسوس کر رہا تھا میرے پاؤں زمین پر پڑ ہی نہیں رہے تھے۔ اور جب انھوں نے مجھے علم و دانش کا پہلا درس دیا۔ الف سے آم تو میں نے الف سے آم کا ورد کرتے ہوئے یوں محسوس کیا جیسے میرا ننھا سا قد بڑا ہو کر اسکول میں لگے ہوئے آم جتنا بڑا ہو گیا ہو۔ بڑا سا آم۔ اونچا سا۔ جس پر ڈھیروں بڑے بڑے اور میٹھے آم لگتے تھے اور جس کے پتوں کی سرسراہٹ میں گیتوں کی رس گونج تھی۔

جب مجھے الف سے آم یاد ہو گیا تو مولوی امام دین نے بتایا کہ جس الف سے آم ہوتا ہے اسی الف سے اللہ ہوتا ہے اللہ جو آسمان پر رہتا ہے اور اسی لمحے میرا قد زمین سے اٹھ کر آسمان کو چھونے لگا۔ پہلے پہل دن اپنے ننھے سے قدموں اپنے دروازے پر آیا تو مجھے احساس ہوا کہ میرا آسمان جتنا لمبا وجود گھر کے اس ننھے سے گھر کے اندر کیسے جا سکے گا۔ ہی تبھی میں نے دیکھا کہ وہ دروازہ جھک کر مجھے سلام کر رہا تھا اس کی تعظیم

سے متاثر ہو کر میں نے بھی اپنی بلندی کو سمیٹا تختی گھماتا ہوا گھر کے آنگن میں داخل ہو گیا۔

مولوی امام دین قد کا لمبا تو تھا ہی لیکن جب وہ جماعت میں کھڑے ہو کر درس دیتا تھا کہ سچ کیا ہے کتنا بڑا ہے ایمانداری اور محنت کی کیا قیمت ہے۔ تب اس کا قد بہت لمبا اونچا ہو جاتا تھا اور میں سمجھا کرتا تھا کہ کوئی آواز ہے جو آسمان سے آ رہی ہے۔ کوئی پیغام ہے جو زمین پر اتر رہا ہے اور یہ آواز سنتے سنتے یہ پیغام سنتے سنتے میرا قد بڑا ہونے لگا۔ پہلے میں اپنے بڑے بھائی سے لمبا ہو گیا۔ پھر اپنی ماں سے لمبا ہو گیا اور جب میں اپنے باپ سے بھی لمبا ہو گیا تو میرے گھر کا دروازہ جھک کر مجھے خوش آمدید کہنے لگا مجھے بھی اس میں سے گزرتے ہوئے سر جھکانے میں ایک فخر محسوس ہوتا تھا۔

ایک شام اپنے لمبے قد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جب میں اپنے آم کے پیڑ سے توڑ توڑ کر رس بھرے آم کھا رہا تھا تو ایک اونچی سی ٹہنی سے آم توڑنے کے لئے مجھے اوپر کی طرف کودنا پڑا۔ جب میرا جسم ہوا میں معلق تھا تب وہاں سے آسمان بہت ہی قریب سا لگا۔ جہاں مولوی امام دین کا طرہ لہرا رہا تھا۔ ستاروں کی طرح چمک رہا تھا اس کا چہرہ نور میں نہایا ہوا تھا اور ہونٹ یوں ہل رہے تھے جیسے ستاروں کو سچائی کا درس دے رہے ہوں۔ اس درس کو سننے کے لئے میں بھی آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگا۔ اور جب میں واپس لوٹا تو میری پگڑی میں بہت سے ستارے جگمگا رہے تھے اور میرا چہرہ ان کے نور کی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

اس شام کو جب میں گھر میں داخل ہوا تو زندگی

میں پہلی بار ایک تلخ حقیقت کا سامنا ہوا۔ اس دن میرے بڑے بھائی کو ایک بڑی نوکری مل جانے کی چٹھی آئی تھی گھر کی دیواروں کی اینٹیں بھی اس خوشی کے موقع پر مسکرا رہی تھیں۔ بار بار بہانے بہانے بڑے بھائی صاحب کے پاس جا کر کھڑا ہوتا تھا تو مجھے محسوس ہوتا تھا جیسے ان کے بڑا آدمی ہو جانے پر میں بھی بڑا ہو گیا ہوں میرا قد اور بھی لمبا ہو گیا ہے اور میری پگڑی پر اور بھی ستارے ٹانک دیئے گئے ہیں۔ لیکن اسی وقت میرے بڑے بھائی نے ہاتھ مار کر میری پگڑی گرا دی اور کہا "اسے ابھی تک پگڑی باندھنی بھی نہیں آئی" اس دن انھوں نے مجھے اپنے ساتھ باہر لے جانے سے بھی انکار کر دیا۔ تو مجھے لگا جیسے میرا قد چھوٹا ہو گیا ہو۔ میرا وجود گھٹنا شروع ہو گیا ہو۔

بھائی کے گھر سے چلے جانے کے بعد میں کتنی دیر اپنے گھر سے باہر گلی میں ٹہلتا رہا۔ وہاں ٹہلتے ٹہلتے جب میں اپنے گھر کے دروازے پر آیا تھا تو مجھے محسوس ہوا کہ اب گھر کا دروازہ میرے لئے پہلے کی طرح تنگ نہیں رہا ہے اور وہ بہت اونچا ہو گیا ہے۔ میرے قد سے کہیں زیادہ اونچا۔ تبھی میں نے اپنے ارد گرد گلی کے مکانوں کی طرف دیکھا تو احساس ہوا کہ سب کے سب مکان پہلے کی نسبت بہت اونچے ہو گئے ہیں قیصر کا مکان بنواری کے گھر کا چھجہ ہرنام کے گھر کی باہری دیوار سبھی کے سبھی اتنے اونچے ہو گئے ہیں کہ میں خود کو ان کے سامنے بونا محسوس کرنے لگا۔

بونا ہو جانے کے احساس سے نجات حاصل کرنے کے لئے اپنے آم کے پیڑ پر چڑھ کر اس کی سب سے اوپری شاخ پر بیٹھ کر میں کتنی دیر دور آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ لیکن وہاں نہ تو امام دین کی پگڑی کا طرہ تھا نہ کوئی چاند نہ ستارے نہ سورج پتہ نہیں آسمان کو کیا خلا سا پیدا ہو گیا تھا۔ اس رات میں گھر میں آ کر بہت دیر جاگتا رہا اور اپنے قد کو اونچا اٹھانے کی ترکیبیں سوچتا رہا۔ آخر میری آنکھوں کے سامنے مولوی امام دین کا لمبا قد آیا۔ آسمان کی بلندیوں سے چھوتا ہوا ان کی پگڑی کا طرہ چمکا۔ ستاروں کو دسترس دیتے ہوئے ان کے ہونٹ ہلے اور مجھے ایک راستہ دکھا گئے۔

اگلے دن صبح ہی میں اپنے مختصر جسم پر سچ کے کپڑے پہن کر نکل کھڑا ہوا اور تب سے بڑی ایمانداری سے زندگی کی ڈگر پر بڑی ثابت قدمی سے چل رہا ہوں وہ دن اور آج کا دن میرے قد میں اضافہ تو کیا ہوتا دن بدن عمر کی طرح گھٹتا ہی چلا جا رہا ہے۔

اس بیچ ہرنام چوتھے درجے سے آگے نہیں بڑھ پایا۔ اور جو مولوی امام دین کی لمبائی کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ بلیک کے روپئے سے شہر کا رئیس اعظم بن گیا ہے اور اس نے اپنے مکان کو اتنا اونچا کر لیا ہے کہ اس کے سائے تلے چلتے ہوئے مجھے لگتا ہے جیسے میں پاتال میں پہنچ گیا ہوں۔ جہاں زندگی کا کوئی وجود نہیں۔ اور قیصر کے تو کیا کہنے۔ مار دھاڑ میں وہ بچپن ہی سے دھاکڑ تھا۔ کوئی کہتا ہے سونے کا دھندا کرتا ہے مجھے نہیں معلوم میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس نے اتنا عالیشان مکان بنوا لیا ہے کہ اس پر کسی محل کا گمان ہوتا ہے اور اس محل تک پہنچنے کے لئے جو اس نے پھاٹک بنوایا ہے اس کے دونوں طرف دو بڑی بڑی مچھلیاں بنائی گئی ہیں پتہ نہیں ان مچھلیوں کو دیکھ کر مجھے کیوں ڈر لگتا ہے رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ کہیں یہ مچھلیاں مجھے یا میرے مکان کو نہ نگل لیں۔ اسی لئے قیصر کے گھر کے سامنے سے بہت محتاط ہو کر گزرتا ہوں اور اس کے برعکس جب قیصر ادھر سے گزرتا ہے تو وہ پھاٹک جھک کر اسے سلام کرتا ہے۔ مچھلیاں تعظیم بجا لاتی ہیں۔ ان کے اپنے گھر کا پھاٹک تو انھیں سلام کرے گا ہی نا

نے بڑے بڑے سائنسدانوں بڑے بڑے عالموں کو بھی ان مجسمہ ہنر نام اور فیض کے سامنے سر جھکاتے دیکھا ہے۔ اور تو اور جب یہ دونوں کسی بڑے سرکاری دفتر میں جاتے ہیں تو ان دفتروں کی عالیشان عمارتیں بھی جھک کر ان کی تعظیم بجالاتی ہیں اور ہنر نام اور فیض کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا ہے۔

اس عرصے میں میرا قد چھوٹا ہوتے ہوتے ذرّے کی طرح مختصر ہو گیا ہے۔ اس حالت میں ایک دن میں مولوی امام دین کی قبر پر بھی گیا تھا۔ لیکن بہت کوشش کے باوجود اس کا کوئی نشان نہیں ملا۔ البتہ فیض کے ابا کی پختہ قبر ضرور دکھائی پڑی تھی۔

اب رات کے سناٹے میں دور آسمان کی طرف اداسی کے عالم میں گھور رہا ہوں اس امید کے ساتھ کہ شاید کوئی ستارہ کوئی چاند کوئی سورج یا مولوی امام دین کی پگڑی کا طرّہ چمکے۔ لیکن عجیب خلا پیدا ہو گیا ہے۔ آسمان کوری تختی کی طرح خالی ہے۔

ایک دفعہ پھر مولوی امام دین کی قبر تلاش کرنے کے لئے جاتا ہوں۔ اگر مل جائے تو اٹھا کر کہوں آسمان کی کوری تختی پر ایک بار پھر نہ درس لکھ دو۔ الف سے آم ہو سکتا ہے چاند یا ستاروں یا سورج کی روشنی میں کوئی اس پرانے درس کو پھر پڑھنا چاہے تو پڑھ لے۔

لیکن۔ لیکن مولوی امام دین کی قبر مجھے مل بھی گئی اور وہ موت کی گہری نیند سے جاگ بھی گیا اس نے آسمان کی کوری تختی پر الف سے آم لکھ بھی دیا تو کیا ہوگا۔؟ اسے پڑھے گا کون۔؟ اسے پڑھائے گا کون۔؟

جواب طلب امور کے لئے جوابی خط بھجوایئے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ مینجر شانِ ہند۔

غزل

زاہد الاحسانی
جھنجھورلوہاری مظفر نگر

اپنے غم پر وہ آپ رو لے ہے
دامن اشکوں سے خود بھگو لے ہے

مجھ کو شرما کے دیکھنے والے
کیوں محبت کا راز کھولے ہے

پھر کوئی تازہ غم نہ دے ظالم
آج خوش ہو کے مجھ سے بولے ہے

دوستوں کے چلن نے دل توڑا
ایک نشتر ہر اک چبھو لے ہے

تو کھری بات جب کہے زاہد
سننے والا بھی دل ٹٹولے ہے

بیان برائے ملکیت

فارم نمبر ۴ دیکھو رول نمبر ۸
ماہنامہ شانِ ہند۔ دہلی۔
۱۔ مقام اشاعت: فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی نمبر ۱۱۰۰۰۲ ۲۔ نوعیت اشاعت۔ ماہنامہ
۳۔ نام پرنٹر پبلشر۔ ودیا پرکاش سرور۔ ہیے
۴۔ قومیت۔ ہندوستانی
۵۔ پتہ۔ فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی، ۱۱۰۰۰۲
۶۔ نام ایڈیٹر۔ ودیا پرکاش سرور
قومیت۔ ہندوستانی
پتہ۔ فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
۷۔ مالک کا نام۔ ودیا پرکاش سرور
میں ودیا پرکاش سرور ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر ماہنامہ شانِ ہند فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ تصدیق کرتا ہوں کہ جو اطلاعات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ ودیا پرکاش سرور

ہولی

بیدل سرحدی
ا ۔ ٹرم لائن کنگز وے کیمپ دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۹

ناچے جھوم کے لہراتے مستی میں رنگ اڑانے
ہولی ہے ہولی ہے گاتے البیلے مستانے
کالے پیلے نیلے سرخ گلابی کپڑے پہنے
ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اپنے اور بیگانے

اجلے کپڑوں پر وہ اک رنگین پچکاری چھوٹی
بوتل سے بوتل ٹکرائی ہے بس توبہ ٹوٹی
ہولی ہے ہولی ہے گاتی مستانوں کی ٹولی
یاروں میں گھوم رہا ہے پی کر شنکر بوٹی

فضا میں مستیاں رنگینیاں پھر لوٹ آئی ہیں
مرے محبوب ہولی آ گئی ہے رنگ سے کھیلیں
ترے ہاتھوں میں پچکاری مرے ہاتھوں میں ساغر ہو
شراب و شعر کے دن ہیں رباب و چنگ سے کھیلیں

شراب آلود ہیں لب اور خمار آلود ہیں آنکھیں
لٹیں آوارہ سی ہیں رنگ میں بھیگی ہوئی چولی
شفق کی جلوہ گری قوس قزح کی دلکشی لے کر
جوانی کھیلتی پھرتی ہے سو سو رنگ سے ہولی

یادوں کی گھٹائیں لے کے کبھی برسائیں
اور یوں دل سے کبھی آنکھ مچولی کھیلیں
جیسے رنگوں بھری پچکاریاں ہاتھوں میں لئے
کرشن کے ساتھ حسیں گوپیاں ہولی کھیلیں

آج سینے میں چمکتے ہیں کچھ اس طرح سے گھاؤ
جیسے روشن ہوں ہر اک موڑ پہ ہولی کے الاؤ

غزل

اختر اندوری [illegible] (جھالاوہ)

فکر معاش رہتی ہے دن رات ان دنوں
کس درجہ منتشر ہیں خیالات ان دنوں
بیزار زندگی سے نظر آ رہا تھا وہ
جس شخص سے ہوئی ہے ملاقات ان دنوں
مرکز بنے ہوئے تھے جو فصل بہار کا
صحرا سے کم نہیں وہ مقامات ان دنوں
سڑکوں پہ آ کے بس گئے محلات کے مکیں
آسودہ حال ہیں یہی ننگ ذات ان دنوں
یہ کیا ستم ہے کچے مکانوں کی پشت پر
تعمیر لوگ کرتے ہیں محلات ان دنوں
سیلاب کھیل رہا ہے تشدد کا جیت کر
اونچائی پر بنے ہوئے مکانات ان دنوں
ہوتے ہیں قید امن کے دیوانے رات دن
خالی نہیں ہے کوئی حوالات ان دنوں
آنسو بھرے ہوئے ہیں زمانے کی آنکھ میں
ہم سے نہ چھیڑے جائیں گے نغمات ان دنوں
بے خوف دوڑتا ہے خلاؤں کے دوش پر
انساں دکھا رہا ہے کمالات ان دنوں
پہچاننا بجوڑ کا دشوار ہو گیا
شاعر وہ دے رہے ہیں رجحانات ان دنوں
احباب نے بھلا دیا شاید مجھے اختر
آئے نہیں خطوں کے جوابات ان دنوں

دل پہ ڈالو نہ اگر تیرگی غم کے گھٹا
خون میں ڈوبی ہوئی امیدوں کی سسکی بھی نہ اٹھا

ہر جسم سے اک قوس قزح لپٹی ہوئی ہے
گلکاری و سفر کشی رنگ کے دن ہیں
ہولی تری تاریخ نے دہرا دیا خود کو
یہ امن کے دن خاتمہ جنگ کے دن ہیں

اجین کے چند قدیم شعراء

از ـــــ محمد خالد عابدی آل انڈیا ریڈیو اندور

امیر الدین امیر اجینی: ـ کاشف الہاشمی اجینی
امیر الدین امیر اجینی کے مجموعۂ کلام "شانِ غم" میں ان کے
حالات زندگی پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔
"حضرت امیر علم و ادب کے گہوارے اجین میں
۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم کچھ گھر پر
اور کچھ مکتب میں حاصل کی۔ تیرہ چودہ برس کی
عمر سے فکر معاش میں مبتلا ہو گئے اور تجارت کو
اپنا وسیلہ معاش بنایا جو مختلف صورتیں اختیار
کرتا رہا۔ اب درمیانی حیثیت کے کاشتکار ہیں"
امیر الدین امیر کم عمر میں ہی شعر کہنے لگے تھے سید کرامت
البشر سے تلمذ حاصل ہے ... گویا قریشی اور جناب
شیر الدین صاحب عارض منوری کی تحریک و ترغیب
آپ نے "بزم ادب" کے ماہانہ مشاعروں میں شرکت شروع
... رفتہ رفتہ آپ شاد دل دنیا میں ایک انفرادی مقام حاصل کر لیا۔
... محمد قیصر، گویا قریشی اور امیر کی بدولت ہی ۱۹۲۹ء اور
۱۹۵۰ء کے مابین بیشتر بے مثال کل ہند مشاعروں کا
انعقاد عمل میں آیا۔
امیر الدین امیر نہایت وضع دار و خوددار انسان واقع ہوئے
... بیشتر والیانِ ریاست سے ان کے خوشگوار تعلقات رہنے کے
باوجود وہ ذاتی طور پر فیض نہیں اٹھا سکے چنانچہ وہ اقتصادی
... پانے پر کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس تلخ احساس کو انھوں نے یوں
محسوس کیا ہے۔ ؎

سارے میکدے والے ہیں امیر متوالے
لطفِ زندگی کھویا تم نے پارسا ہو کر

فنکار کا آئینہ اس کی تخلیقات ہی ہوا کرتی ہیں۔ لیکن
امیر الدین کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا۔ اجین کے ایک شاعر قمر
نے نہایت محنت و مشقت سے ان کا مجموعہ کلام ترتیب دیا تھا
لیکن وہ مسودہ چوری ہو گیا۔ انھیں اس نقصان کا افسوس تو رہا۔
لیکن انھوں نے دوبارہ اپنی یادداشت سے "شانِ غم" مجموعہ
ترتیب دیا اور شائع کیا۔ ؎

امیر اپنی دولت یہی شاعری ہے یہی اپنا سرمایۂ زندگی ہے
جسے لوٹ سکتے نہیں یہ لٹیرے مرے دل میں محفوظ ہے وہ خزانہ

کاشف الہاشمی اجینی نے امیر الدین امیر کے کلام پر تبصرہ
کرتے ہوئے لکھا ہے کہ
"انھوں نے جملہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے اور
نہایت کامیاب رہے ہیں وہ زبان کے شاعر ہیں اور
زبان کے شاعر کی خصوصیات ان کے یہاں بدرجہ
اتم پائی جاتی ہیں بامحاورہ اور سلیس انداز بیان اور
نہایت شگفتہ لہجے میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے
میں ان کو کمال حاصل ہے ان کے یہاں فلسفۂ اخلاق
و تصوف، وعظ و نصیحت، عجز و انکسار، بے ثباتی
دنیا، سیاست و مذہب، حسن و عشق، رندی و سرمستی
مئے و مینا اور طنز و تعریض کے مضامین بڑے لطیف
پیرائے اور دلکش انداز میں پائے جاتے ہیں وہ سماج
کی ضروریات کو شعر کے سانچے میں ڈھالنے کی پوری
صلاحیت رکھتے ہیں ان کے کلام کا سوز و اثر حیات
و کائنات کی صحیح عکاسی کرتا ہے مومن کی طرح
اپنے تخلص سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے بڑے کام کی
باتیں کہی ہیں"
امیر الدین امیر کا دوسرا مجموعہ "نغمۂ ناگری" "شیرا کے موتی" کے

نام سے شائع ہو چکا ہے اردو زبان و ادب کی خدمت کے اعتراف میں مدھیہ پردیش حکومت آپ کو اعزازی طور پر وظیفہ بھی پیش کرتی ہے۔

نمونۂ کلام

(سلام)

تلے ہوئے تھے عدو ہر طرف جفا کے لئے
خزاں کے جھونکے تھے گلزار فاطمہ کے لئے
سکینہ کہتی تھیں کیوں ہم نے ذکر آب کیا
ہماری پیاس قضا بن گئی چچا کے لئے
جناب حر نے کہا بخش دو قصور آقا
تڑپ رہی ہیں خطائیں مری عطا کے لئے
ستم تو شبیر خدا پر بھی ڈھائے تھے لیکن
وہ ابتدا کے لئے تھے یہ انتہا کے لئے
حسینؑ کس طرح کرتے یزید کی بیعت
نہ تھے وہ ہاتھ کسی دست ناسزا کے لئے
امیر مٹتے ہیں ہر روز مٹنے والے مگر
کوئی خودی کے لئے اور کوئی خدا کے لئے

(غزل)

ہے جب سے شان رحمت باری نگاہ میں
کچھ اور دیکھتا ہوں میں فرد گناہ میں
ہر چیز تیرا جلوہ ہے الفت کی راہ میں
جی چاہتا ہے سب کو چھپا لوں نگاہ میں
مجرم بنا کے لائے گی محشر میں زندگی
تکمیل عشق ہوگی تری بارگاہ میں
دیکھی گئیں نہ حسن سے بربادیاں مری
گھبرا کے لے لیا مجھے اپنی پناہ میں
اے برق آشیانے کی پرواہ نہیں مجھے
اب گھر بنا لیا ہے کسی کی نگاہ میں
اب مجھ کو مال و زر کی تمنا نہیں امیر
سب کچھ لٹا چکا ہوں محبت کی راہ میں

عزیز محمد قیصر :-

سلطان احمد صدیقی نے عزیز محمد قیصر اجینی کے تعارف میں مجھے لکھا ہے کہ "عزیز محمد قیصر اجین کے ایک جاگیردار گھرانے میں ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ بہت ناز و نعم سے پرورش پائی ابتدائی تعلیم گھر پر مولویوں سے اور بعد میں اسکول میں حاصل کی۔ پندرہ، سولہ سال کی عمر میں سید کرامت علی بشر سے شاعری میں شرف تلمذ حاصل کیا۔ عزیز محمد قیصر ایک شاعر سے زیادہ شاعر نواز، ادب دوست واقع ہوئے تھے آپ کے خلوص و اخلاق سے "قیصر منزل" علم و ادب کا مرکز بن گئی تھی۔ استاد محترم سید کرامت علی بشر کے ایما سے آپ نے اجین سے ۱۹۳۰ء میں "آفتاب" رسالہ جاری کیا۔ اجین میں اردو کا پریس نہ ہونے کی صورت میں آگرہ سے چھپ کر اور "قیصر منزل" سے شائع ہوتا تھا۔"

عزیز محمد قیصر نے اولاد کی خواہش میں تین شادیاں کی تھیں، لیکن ایک سے بھی صاحب اولاد نہ ہو سکے۔ آخر ش ۱۹۶۷ء میں عین چاند رات (رمضان المبارک) کو ریڈیو درست کرتے ہوئے بجلی کا کرنٹ لگنے سے حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوا۔ عزیز محمد قیصر کے انتقال کے بعد تینوں زوجات نے مکانات کی فروختگی میں اُن کا تمام ذخیرۂ کتب و رسائل بھی ردی میں فروخت کر دیا۔

نمونۂ کلام

ذرا ہم بھی دیکھیں چھپیں گے کہاں تک انھیں رخ سے پردہ اٹھانا پڑے گا
سلامت ہے ذوق نظارہ تو اک دن نظر کا کرشمہ دکھانا پڑے گا
نگاہوں کی بیتابیاں مطمئن ہیں مذاق نظر کا یہی فیصلہ ہے
محبت سے مجبور ہو کر کسی دن انھیں خود ہی پردہ اٹھانا پڑے گا
اگر وہ یہی چاہتے ہیں تو ہم دم شکایت نہ آئے گی ہرگز زباں پر
وفاؤں کی عزت بچانے کی خاطر ہمیں جان پر کھیل جانا پڑے گا
وفا شناسوں کی دنیا میں رہ رہ کر نگاہ کرم کا تصور غلط ہے
یہاں کا تو دستور اے دل یہی ہے ستم سہہ کے بھی مسکرانا پڑے گا
غرور و تکبر سے بچ کر چلو گے تو دنیا کی عظمت قدم چوم لے گی
تمھیں شرح روحی کی راہوں میں قیصر غرور خودی کو مٹانا پڑے گا

سلطان محمود

سلطان محمود :- آپ محلہ مرزا واڑی اجین میں سنہ ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے۔ ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۲۲ء سے ہوا۔ جبکہ آپ مادھو کالج میں زیر تعلیم تھے ابتدا میں لاہور کے ایک انگریزی ہفت روزہ "نائٹ" میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر انگریزی مضمون نویسی کے مقابلے میں اول انعام حاصل کیا تھا منشی تاج محمد تاج اجینی۔ مولوی محمد مہدی رتبہ۔ حکیم عبدالفضل۔ حکیم وصی الدین۔ حکیم مرزا عبدالرحیم بیگ ٹونکی۔ مولانا محمود الحسن فروغ دہلوی۔ سید کرامت علی بشر۔ استاد عظیم اور ماسٹر پیر بھولا لال اشہر صاحبان ایسے اساتذہ سے آپ نے اردو فارسی اور شعر و سخن کا درس حاصل کیا تھا۔

"آفتاب مالوہ اجین" میں اکثر مضامین نظم و نثر شائع ہوتے رہے ہیں۔ آجکل آپ کراچی (پاکستان) میں ہیں اپنی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ماہنامہ "دورِ جدید کراچی" میں اکثر نظم و نثر اور ضروریات کے تحت مضامین وغیرہ لکھتے ہیں آپ نے اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شاعری کی ہے ۱۹۷۹ء میں اول عمرہ اور دوبارہ حج کی سعادت حاصل کی ہے۔ آپ نے حج سے متعلق مضامین اور نعت شریف بھی لکھی ہیں۔

سلطان محمود خود جذبات سے سرشار ہو کر ذہنی آسودگی کے لئے شعر کہتے ہیں ان کی نگاہ میں شاعری کسی ماحول سے متاثر ہو کر جذبات کو ایسے الفاظ کا جامہ پہنا دینا ہے جو سننے والے پر بھی وہی اثر کرے جو خود میں موجود ہے۔

اجین کے ارود دوست سلطان احمد صدیقی آپ کے ان شاگردوں میں سے ایک ہیں۔ آپ ہی کے ذریعہ سلطان محمود صاحب کا نمونہ کلام تبرکاً حاصل ہوا ہے۔

یوں کھڑا ہوں روضۂ والا کے سامنے
جیسے کوئی غلام ہو آقا کے سامنے
عصیاں کا بار شرم سے گردن جھکی ہوئی ہے
جھولی لئے فقیر ہے داتا کے سامنے
شہا جنوں مجھے یہیں رہنا ہے عمر بھر
اب آ گیا ہوں گنبدِ خضریٰ کے سامنے
محمود کی دعا ہے یہی مجھ سے اے خدا
مدفن ہو میرا روضۂ والا کے سامنے

ہے وجودِ دنیا سے ہم پہ احسانِ رسول
اہلِ دنیا نے انہی سے پائے فرمانِ رسول
ٹھوکروں میں ہیں فقیروں کے شہنشاہوں کے تاج
کج کلاہی خم ہے پیشِ خانقہستانِ رسول
لفظ اقراء نے عطا کی آپ کو حق کی زباں
ہے تو فرمانِ خدا لیکن ہے فرمانِ رسول
کیوں شفاعت سے رہوں محروم اے محمود میں
روزِ محشر سایہ گستر جب ہو دامانِ رسول

محمد عمر غوری مہر

محمد عمر غوری مہر :- آپ سنہ ۱۹۰۹ء میں اجین میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی۔ حکیم عبدالرحیم ٹونکی سے علم طب حاصل کیا حکیم عبدالرحیم ٹونکی کے ساتھ ہی مطب میں عملی تجربہ حاصل کیا۔ آپ نے کچھ عرصہ راجستھان میں بھی طبابت کی۔ آپ اجین میں ہی مقیم ہیں۔ سید کرامت علی بشر نے آپ کا یہ مقطع سن کر ہی آپ کا تخلص مہر تجویز کیا تھا۔

مہر فرما کر مجھے مقطع عنایت کیجئے
آج آیا ہے عمر انعام پانے کے لئے

سلطان احمد صدیقی نے آپ کی مختصر سوانح میں کچھ لکھا ہے کہ:

"مہر کہنہ مشق استاد ہیں، قطعہ۔ رباعی۔ نظم غزل۔ سلام۔ مرثیے۔ نعت۔ منقبت۔ سب ہی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر غزل زیادہ کہتے ہیں۔ آپ کا کلام تصوف، عشق حسن، حقیقی عشقِ مجازی سے پر ہے۔ زبان و بیان پر قدرت ہے سلاست روانی پائی جاتی ہے بہت پرگو ہیں اور استادوں کی طرح سب قوافی

نظم کر دیتے ہیں۔ آپ کا کلام مُلک کے مقتدر
رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔

نمونۂ کلام

کعبۂ دل پر کیا تحریر بت خانے کا نام
اس لئے بدنام ہے دُنیا میں دیوانے کا نام
پیشتر ہی سمجھ لیتے اگر انجامِ عشق
کوئے قاتل میں نہ لیتے بھول کر جانے کا نام
عشقِ لیلیٰ میں اکیلا قیس ہی بدنام تھا
اس زمانے میں ہوا ہر ایک دیوانے کا نام
ہم کو ملتا ہے غمِ فرقت میں جامِ زندگی
لوگ لیتے ہیں غمِ فرقت میں مرجانے کا نام
صحبتِ بزمِ ادب نے مہر کو چمکا دیا
اس لئے روشن ہوا ناکام دیوانے کا نام

کون ہے جس کو تری ذات کا اقرار نہیں
تیری ہستی سے تو کافر کو بھی انکار نہیں
سخت دشوار ہے منزل پہ پہونچنا اُن کا
نوجوانوں کا کوئی قافلہ سالار نہیں
زندگی موت سے بدتر ہے جہاں میں اس کی
جس کا دُنیا میں نمایاں کوئی کردار نہیں
ہم نے کثرت میں بھی دیکھی ہے تری یکتائی
تیری وحدت میں ذرا شرکتِ اغیار نہیں

غزلیات

بلا انتخاب — عبدالستار عاصی، و بھوری کویت

خود کو یوں دُور کون کرتا ہے
دل جگر چُور کون کرتا ہے
رخِ روشن پہ زلف بکھرا کر
شب دیجور کون کرتا ہے
دل جلا قافلے میں ہے کوئی
راہ پُر نور کون کرتا ہے
کس نے دیدی اذان انا الحق کی
خود کو منصور کون کرتا ہے
زہد و تقویٰ عبادتیں زاہد
باعثِ حور کون کرتا ہے
غم کو ہنس کر گلے لگایا ہے
کس کو مجبور کون کرتا ہے
کس نے اُلٹی نقابِ رخ عاصی
شعلۂ طور کون کرتا ہے

مقبول آلولوی بانس بریلی

پہلے تو التفات کا جادو جگا دیجئے
پھر جا کے التجا سے نگاہیں ملائیے
اپنی تجلیات کا جوہر دکھائیے
گلزارِ آرزو میں نئے گل کھلائیے
تم آئے رُو برُو تو نظر سے نظر ملی
اب وحدتِ خیال سے دو دل ملائیے
اب دل مرا نہیں ہے یہ گھر آپ ہی کا ہے
اتنا تو سوچ لیجئے پھر بھول جائیے
غم میرے واسطے ہیں خوشی آپ کے لئے
ہر زخمِ دل کو دیکھئے اور مسکرائیے
مقبول بات ایسی جو سب کو قبول ہو
لفظوں کی بانسری میں دلوں کو سنائیے

قیامت

— کلام حیدری —

خاندان غریب تھا اس کے سرپرست ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر تھے اسّی روپئے ماہوار تنخواہ ملتی تھی اور خاندان اس گرانی اور افراطِ زر کے زمانہ میں اپنا وقت کاٹ رہا تھا خاندان کیلئے ضروری تھا کہ ان ہی اسّی روپیوں میں وہ اپنا پیٹ بھرے اور اپنے خاندانی وقار کو بھی قائم رکھے اسی لئے خاندان کے خاندانی مکان کے دروازہ پر ایک پردے کا لٹکنا اور باہر چند کرسیوں کا پڑا رہنا ضروری تصور کیا جاتا تھا اور شام کی شام وہاں پر بیٹھک ہونی ضروری تھی بیٹھک میں چائے کا دور بھی ہمیشہ سے مختلف شکلوں میں چلتا آیا تھا اس لئے یہ بھی ایک لازمی اور ناقابلِ احتراز جزو تھا یہی ہوتا آیا تھا اس لئے یہی ہوتا رہنا ضروری تھا اور ایسا ہو رہا تھا۔

خاندان کی سفید پوشی آج کی چیز تو تھی نہیں، اوپر سے صاف رہنا..... چاہے اندرون حویلی صبح و شام کھانے کی فکر لاحق ہو مثل مشہور ہے — "کیا کھایا کون دیکھتا ہے مگر کیا اور کیسا پہنا ہر کوئی دیکھتا ہے" ہر کسی کے دیکھنے کے لئے سفید پوشی لازمی تھی اور جسے کوئی نہیں دیکھتا اس کے لئے کیا ہے خاندان اپنے خیال میں سفید پوشی نباہ رہا تھا۔ دروازے پر پردہ لٹکتا رہتا اندر کون دیکھتا ہے —— ہاں باہری دروازے پر پردے کا ہونا ضروری تھا جو سب کی نگاہوں سے ٹکراتا۔ اس پردے کی بھی ایک تاریخ ہے۔ پہلے خاندان کافی امیر تھا لیکن اِدھر تین پشتوں سے برابر نیچے ہی چلا آرہا تھا۔ دوسرے مکانات نیلام ہو چکے تھے اور اب یہ اکلوتا مکان اُن کے پاس رہ گیا تھا پہلے مکان کے باہری دروازے پر سلک کے پردے لہراتے تھے سلک کے بعد — اب اس پشت نے دروازے پر مارکین کا پردہ لٹکانا شروع کر دیا تھا۔ پردے کا مفہوم اور کچھ ہو یا نہ ہو مگر یہ ضرور تھا کہ مکان کی اندرونی بے رونقی اور مفلسی پر پردہ پڑا رہتا —

خاندان کے سرپرست اپنی گرتی ہوئی حالت کو سنبھالا دینے کی کوشش میں دبلے ہوئے جا رہے تھے انھوں نے اپنی غربت کو دور کرنے کی انتہائی کوشش کی تھی۔ اور اب بھی امید کا سہارا انھوں نے نہیں چھوڑا تھا —— انھوں نے پانچ سال تک مسلسل "ڈربی" کا ٹکٹ لیا کہ شاید ان کے خدا کو رحم آجائے اور "ڈربی" کا پہلا انعام انھیں مل جائے۔ جس روز ٹکٹ خریدا جاتا اسی روز سے والدہ صاحبہ اور بوڑھی نانی اماں ختم پڑھنا شروع کر دیتیں۔ ساتھ ہی میری بھی شامت آجاتی !

"بھلا کیا برکت ہوگی اس گھر میں — لڑکی ! خدا کو یاد کیا ؟" والدہ صاحبہ تلقین کرتیں۔

"نا — بابا — نا — سچ مچ قیامت نزدیک آگئی ہے۔ لڑکیاں تو اب بڑوں کا کہا مانتی ہی نہیں۔ بوڑھی نانی اماں پوپلی آوازیں منمنانے لگتیں۔ اور میں اس خیال سے کہ اس قیامت کو کچھ دنوں کے لئے روک کر رکھا جائے۔ تین وقت کی نماز شروع کر دیتی۔ اس لئے کہ دیگر دو وقتوں کی نماز بذاتِ خود قیامت سے کم نہ تھی۔ صبح ہی صبح اٹھنا — اُف ! اللہ کتنا مزہ آتا ہے صبح کو سونے میں اور عشاء کی نماز — اونہہ تو عجیب وقت ہے۔ مغرب کے بعد کوئی کتاب یا رسالہ پڑھنے بیٹھو تو نو ضرور بج جاتے ہیں اور پھر یکبارگی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پیٹ میں آگ لگ گئی ہو۔ پھر تو کوئی چیز بھاتی ہی نہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ بندگانِ خدا — یادِ خدا میں کھانا کیسے بھول جاتے ہوں گے۔ ہوگی کوئی روحانی بات اور روحانیت کے بارے میں سوچتے — جیسے پھر پیٹ میں چوہے کودنے لگتے ہوں — لاحول ولا قوۃ۔ یعنی جب روحانیت

کے متعلق سوچا بھی تو بھوک لگنے لگتی اور کھانا کھا کر تو بس یہی جی چاہتا کہ اب پلنگ پر لیٹ کر سو ہی جاؤں اور نماز؟ واللہ کیا بدتمیزی ہے نیند کی!

لیکن والدہ صاحبہ اور نانی اماں کو تو ابھی قیامت کو بہت کافی دنوں کے لئے روک رکھنا تھا۔ بڑوں کا حکم پانچ وقت کی نماز کا —— اور میں پڑھنے لگی تین وقتوں کی بھلا اس طرح کہیں قیامت رُک سکتی ہے زیادہ دن تک؟

"اری چڑیل —— آخرت میں کیا جواب دے گی۔؟ دو وقت کی نماز کھا جاتی ہے مُردار —— !" والدہ صاحبہ قیامت کے نزدیک آنے کے خوف سے چنگھاڑتیں۔

"کرن پھوٹنے سے پہلے تو اُٹھا ہی نہیں جاتا ان لڑکیوں سے۔!" نانی اماں نے معمول کے مطابق لڑکیوں کے پورے طبقہ کو سمیٹ لیا۔

"تو —— ہاں —— میں اس ڈر سے کہ کہیں واقعی قیامت نزدیک نہ آجائے۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھنے کی کوشش کرتی پھر پتہ نہیں نیند کو کیا ہوتا ہے فجر کی نماز تو روز قضا ہی پڑھنی پڑتی ہے۔ "ڈربی" کا نتیجہ نکلنے کا دن جیسے جیسے قریب ہوتا جاتا نانی اماں اور والدہ صاحبہ کے وظیفے اور بھی طویل ہوتے جاتے —— ۔ نماز میں بڑی بڑی سورتیں پڑھی جاتیں اور صبح کو بادام کے دانے کھٹ کھٹ پڑھے جاتے اور ختم پڑھتے پڑھتے بادام . دانے جلنے ہو جاتے اور مجھے پانچ وقت ، نماز پڑھنے کی تاکید دن میں دس بار کی جاتی اور ہر بار نانی اماں قیامت کے نزدیک آنے کی گھنٹی بجا دیتیں۔ اور میں اس بلا سے بچنے کے لئے محافظتی دیواروں کے پیچھے دبک جاتی۔ محافظتی دیواریں —— ؟ رکوع، سجدے، تلاوت اور وظیفے! وظیفے ہوتے رہے ختم پڑھا جاتا رہا اور "ڈربی" کے نتیجہ کا دن قریب آتا گیا۔ نماز کی طرف سے میری بے توجہی یا بے حسی سے نالاں ہو کر نانی اماں لڑکیوں کے طبقہ کو گالیاں دیتی رہیں۔ اور "ڈربی" کا نتیجہ نکل گیا۔ خاندان کی غربت بدستور قائم رہی اور خاندان کے مکان کی دیواریں بدستور سرگوشیوں میں مشغول ہو گئیں —— جیسے جیسے گھر کی فضا میں یہ سرگوشیاں گھل گئی ہوں۔ دیوار و در سے نکلتی ہوئی یہ آوازیں ہر شخص سُن سکتا تھا اور کوئی بھی نہیں سُن سکتا تھا۔ خاندان کا ہر فرد ایک عجیب پُراسرار طور پر خاموش تھا۔ والد صاحب روز اسکول جاتے۔ میں روز نکمی پڑھتی رہتی۔ والدہ صاحبہ روز اپنے کام میں مشغول رہتیں۔ یہ سب کچھ تھا مگر مکان میں اُلجھی اُلجھی خاموشی ایک ڈراؤنا قسم کا سکوت اور پُراسرار سرگوشیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ نانی اماں کے وظیفے مختصر ہو گئے، والد صاحب کے وظیفوں میں وہ گرمی نہ رہی بادام کے دانے ایک تھیلی میں بند کر کے نماز کی چوکی کے ایک کونے میں رکھ دیئے گئے۔ اور میری نمازیں بند ہو گئیں —— نہ والدہ صاحبہ نے نماز پڑھنے پر کوئی تبصرہ کیا اور نہ پڑھنے کی تاکید —— اور نانی اماں کی گالیاں بھی بند ہو گئیں۔ اب قیامت کے نزدیک آنے کا خوف شاید نانی اماں کے ذہن سے دور ہو گیا تھا۔ آئی ہوئی قیامت کہیں رُک گئی تھی —— یا شاید —— بھلا یہ کیا قیامت سے کچھ کم تھا —— ڈربی کا انعام نہ ملا —— کتنی عظیم ٹریجڈی گویا خاندان پر قیامت ہی ٹوٹ پڑی تھی۔ شاید وہ قیامت جس کے نزدیک آنے کا خوف نانی اماں کو پہلے تھا وہ اس قیامت سے چھوٹی ہوگی جب ہی تو بڑی قیامت آگے چھوٹی قیامت کی نزدیکی کا خیال دماغ سے نکل گیا —— ؟ اور پانچ سال سے یہی ہوتا آرہا تھا۔ ڈربی کا نتیجہ اپنی جگہ پر مستقل تھا ہر بار تھیلی سے بادام کے دانے نکلتے اور ختم پڑھنا شروع ہو جاتا۔ وظیفے شروع ہوتے۔ طویل ہوتے طویل تر ہوتے، پھر ختم —— ابتدا —— کلائمکس اور اختتام بھی، ہر بار تین وقتوں کی نماز سے شروع کر کے پانچ وقتوں کی نماز پڑھنے لگتی۔ جس میں ایک وقت کی قضا پڑھتی اور قیامت کے نزدیک آنے کا خیال ہر بار ڈراتا اور ہر بار چھوٹی قیامت بڑی قیامت سے شکست کھا کر بھاگ جاتی۔!

ڈربی کی طرف سے مستقل مایوسی، خاندان کو ابھی تک غریب رکھنے پر اصرار کر رہی تھی۔ ڈربی کے نتیجہ سے پہلے تو خیر ایک اُمید رہتی۔ ایک آس۔ ایک آشا —— وہ آشا جو جھول

تتلیاں دیا کرتی ہے اور خاندان پانچ سال تک ان جھوٹی تتلیوں کے پالنے میں جھوٹا رہا۔ اور ڈربی کا نتیجہ گویا ایک قینچی تھا جو یکایک پالنے کا ریشمی ڈوریوں کو کاٹ دیتی اور خاندان ایکدم سے آشاؤں اور اُمیدوں کے آسمان سے معاشی بدحالی اور بحران کی زمین پر آ رہتا۔

اور مکان کی دیواریں سرگوشیوں میں مشغول ہو جاتیں۔ "پلیسہ پلیسہ" فضا میں یہ آوازیں گھل مل گئی تھیں خاندان کا ہر فرد خاموش ہو جاتا اور پرچھائیں پرچھائیں کرتا ہوا ایک عجیب عجیب سا سکوت مکان پر طاری ہو جاتا۔ والد صاحب روز اسکول جاتے اور آتے۔ والدہ صاحبہ بدستور گھر کے کاموں میں مشغول ہو جاتیں۔ مگر ایک خاموش متکلم مکان میں گھر گھیر کرتا رہتا — "پلیسہ پلیسہ —" ایک خاموشی تھی ایک ڈراؤنی سی یاس سارے گھر پر طاری ہو جاتی ایک عجیب الجھی سلجھی خاموشی اور —

اور مثل مشہور ہے کہ ایک در بند، ستر در کھلے — اس لئے ایک ڈربی ہی کا سہارا کیوں۔ ؟ "اللہ کے دربار میں دیر ہے اندھیر نہیں" والد صاحب اور والدہ صاحبہ دونوں کو اس پر یقین تھا۔ اس پر ان کا ایمان تھا پھر وہ تھک ہار کر کیوں بیٹھ جاتے — ؟ اور اگر یہ سب نہ بھی ہو تو آخرت میں جنت تو تھی ہی — بھلا ان سے جنت کیونکر چھن سکتی تھی۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ ان کے لئے اس کے دربار میں اندھیر نہیں ہو سکتا۔

والد صاحب نے رینجرس کے ٹکٹ لئے — جب ٹکٹ لیا گیا تو — پھر وہی وظیفے، نمازیں — سجدے — اور بادام کے دانوں پر ختم پڑھا جانے لگا۔

میں تو تھک گئی اللہ — ہزار بار اس کو دھنکی سے نماز پڑھنے کو کہا۔ مگر جیسے یہ تو پتھر ہے پتھر، جونک لگتی ہی نہیں —" والدہ صاحبہ کی تلقین میں ایک بے پایاں اُمید جھلک تھی۔ ایک ایسی اُمید جس میں ماضی کی جھنجھلاہٹ بھی گھلی ہوئی تھی۔ لپٹی ہوئی، گھٹی ہوئی روح کی کسک !

اور میں ڈر گئی — کہ پھر ہٹلری بمباری نہ شروع ہو جائے قیامت کے نزدیک آنے کا خوف — اس بار میں نے پہلی ہی مرتبہ پانچوں وقت کی نماز شروع کر دی — یہاں تک کہ صبح کی نماز بھی قضا نہ ہونے دی۔

نمازیں لمبی ہوتی گئیں۔ وظیفے میں گرمی آ گئی — بادام کے دانے ہاتھوں میں پھسلنے لگے۔

مگر اللہ کے دربار میں اب بھی دیر تھی، اندھیر تو خیر ہو ہی نہیں سکتا، گھر میں پھر وہی الجھی سلجھی خاموشیوں کے پھندوں نے اپنے پر پھیلا دیئے۔ پُراسرار سائے لمبے اور گہرے ہو گئے خاموشیوں کی پرچھائیوں کے اندر جیسے گویائی بیٹھی تھی۔ پلیسہ پلیسہ — کھسر پھسر — سرگوشیاں — اور ایک بار پھر خاندان پر قیامت ٹوٹ پڑی — آفتاب سوا نیزے پر آ گیا۔ زمین اور پہاڑ روئی کے گالوں کی مانند ہوا میں اڑنے لگے اور پھر آشا کے پالنے کی ریشمیں ڈوریوں کو نراشا کی قینچی نے کاٹ دیا اور خاندان دھم سے زمین پر آ گرا۔

اللہ کے دربار میں دیر ہو رہی تھی مگر اندھیر کا شبہ نہ تھا۔ ذرا سا شبہ ایمان کو کفر سے بدل سکتا تھا اور خاندان کو دنیا کے علاوہ عاقبت کی فکر بھی تھی اس لئے وہ شبہ کر کے عاقبت کیوں خراب کرتا۔

اور دیمک چاٹتے ہوئے خاندان کے سرپرست نے دقیانوسی بنیادوں پر کھڑی ہوئی اس جھنجھری دیوار کو سہارا دینے کے لئے ڈربی اور رینجرس کے بعد آخری داؤ کھیلا۔ اور ایک رات وہ آئی جو بڑی خوبصورت، بڑی حسین اور انتہائی تاباں رات تھی۔ وہ رات جس میں تمام تر خوشبوئیں اور تابانیاں حل ہو گئیں تھیں۔ وہ رات جو جگنوؤں کی افشاں سے اپنی مانگ سنوار کر آئی تھی۔ وہ رات جس پر سورج کی کنواری کرنیں نثار تھیں۔ وہ رات اس خاندان کے سرپرست کے لئے مسرتوں اور خوشیوں کے پھول لائی تھی۔ بڑے ہی جشن کی رات خاندان کو بڑی کوششوں اور جانفشانیوں کے بعد ایک ایسا تاریخی داماد ملا تھا جو ان کے لئے رینجرس

کے انعام سے کم نہ تھا۔ ہزاروں کی جائداد کا تنہا مالک —— آج کی رات خاندان میں ایک تاریخی داماد آرہا تھا —— داماد —— جو اپنے دامن میں اشرفیاں لے کر آیا تھا۔ جن کی جھنکار میں مکان کی خاموشیاں کھو گئی تھیں۔ جن کی چمک کے آگے پُراسرار سائے سرک گئے تھے۔ وہ خاموش تکلم گیتوں اور شہنائیوں کی آواز میں گم ہو گیا تھا۔ خاندان مطمئن تھا کہ آخر وہی ہوا جس پر اس کا ایمان تھا۔ اللہ کے دربار میں اندھیر نہیں ہے نہ اور واقعی اب خاندان کے دلدّر دور ہو گئے تھے۔ خاندان کی اکلوتی کنواری کو ایک پیرِ طریقت مولوی کی سرد آغوش میں منجمد ہو جانے کے لئے ڈال دیا گیا۔

پیشانی پر سلوٹیں قدرتی طور پر اُگی ہوئی چھتری اُگی مونچھیں سفید داڑھی کے اندر سے جھانکتے ہوئے بھیانک قہقہے۔ شرعی پائجامہ لمبا کرتا۔ گول ٹوپی —— سیدھے ہو کر کھڑے ہونے کی کوشش ناتوانی کی چغلی کھا رہی تھی —— والد صاحب ؟ والد صاحب کی عمر کے ضرور تھے مگر یہ والد صاحب نہیں تھا۔ یہ میرے سرتاج تھے جوانی کے سر پر بڑھاپے کا تاج۔ سرخ جوڑے کے اوپر کفن —— کس قدر حسین۔ کتنا خوبصورت —— آہاہاہا!

والد صاحب کا ایمان صحیح ثابت ہوا۔ اللہ نے آخر اپنے دربار سے ایک برگزیدہ ضعیف مولوی والد صاحب کے لئے بھیج ہی دیا —— اس نعمت کے ساتھ جس کے لیے والدہ صاحبہ نے نمازیں پڑھی تھیں۔ وظیفے ہوتے تھے اور منتیں مانی جاتی تھیں —— اب دُنیا بھی سنور گئی تھی اور آخرت تو بنی ہوئی تھی ہی —— ! اور میں —— ؟ میں اب نزدیک آنے والی قیامت سے بالکل نہیں ڈرتی۔ مجھے قیامت سے ذرا بھی خوف نہیں معلوم ہوتا —— میں چاہتی ہوں کہ وہ قیامت نزدیک سے نزدیک تر آجائے۔ آفتاب ابھی اسی وقت سوا نیزے پر آجائے اور زمین اور پہاڑ روئی کے گالوں کی مانند ہوا میں اُڑنے لگیں۔

میری خوشیاں رخصت ہو گئیں —— ؟ نہیں میرے کانوں میں سونے کی بالیاں ہیں۔ میری ناک میں نتھ ہے سر پہ میرے مانگ میں سیندور ہے۔ پیشانی پر جھمکا ہے۔ ہاتھوں میں چوڑیاں ہیں۔ پاؤں میں مہندی ہے اور میں سہاگن ہوں —— سہاگن کتنا حسین کتنا خوبصورت اور کتنا رومینٹک لفظ —— ! شاید میں غلط سوچتی ہوں کہ میں جوانی کی آگ میں جلتی جلتی راکھ ہو جاؤں۔ پھر سرشاری کی جھانجھ بجاتی قزلوک اور آکاش پر اپنی جلی ہوئی راکھ کی ایک چادر سی بچھا دوں —— تمام پرانے عقیدوں، روایتوں، تہذیب اور سماج کی ہزاروں سال پرانی گلی سڑی لاشوں کی چتا بناؤں اور اس کے لپکتے شعلوں میں مولویوں۔ مُلّاؤں، پنڈتوں اور رشیوں کو لے کر کود پڑوں —— ؟

آم کے آم گٹھلیوں کے دام

(رام لعل نابھوی)

آم کے آم گٹھلیوں کے دام ایک ضرب المثل ہے
پر شاید کس دن۔ کس وقت۔ کس تاریخ کو وجود میں آگئی۔
اس کا محل و قوع کیا ہے؟ یہ کسی آم کے بیوپاری کی ایجاد
ہے یا کسی آم کے رسیا کی۔ اس کہاوت کے پیدا کرنے میں
کس کس کا ہاتھ ہے؟ اسے پیدا کرنے کا مدعا کیا ہے؟
اس کا ارتقا کیسے ہوا کہ زبان زد ہو گیا؟ آئندہ ترقی کے
کیا کیا امکانات ہیں؟ یہ جاننے کے لئے ہم نے سب سے
پہلے لغت کا سہارا لیا۔ شاید ہی دنیا کی کوئی لغت ہو جو
ہمارے پاس نہ ہو اور شاید ہی کوئی لغت ہو جو ہم نے
چھان پھٹک کر نہ دیکھی ہو۔ لیکن کچھ پتہ نہ چل سکا۔
علماء سے ملے۔ ڈاکٹروں سے ملے، اِدھر اُدھر کی
باتیں تو وہ سناتے رہے لیکن جواب نہ ملا۔ کچھ نے فرمائش
کی۔ کچھ نے فہمائش کی کہ جب ریسرچ مکمل ہو جائے
تو نتیجہ بتانا۔ اتنا پتہ نہیں تھا کہ آم میں گٹھلی چھپی ہوتی
ہے اور گٹھلی میں آم۔

سب سے پہلے ہم نے آم کے بیوپاریوں کی طرف
رجوع کیا۔ ملیح آباد کا نام ہم نے سن رکھا تھا وہاں
آموں کے باغات ہیں۔ یہ بھی پڑھ رکھا تھا۔ یہ بھی پتہ
تھا کہ حضرت جوش جہاں اپنی شاعری کے لئے مشہور
ہیں وہاں ملیح آباد کے آموں کے باغات کی وجہ سے بھی
پہچانے جاتے ہیں۔ بلکہ ہم نے تو یہ بھی پڑھ رکھا تھا کہ
پنڈت ہری چند اختر انھیں اپنے مخصوص انداز میں ملیح آبا
دی ہیڈ مالی بھی کہہ دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ہم نے ہیڈ مالی
باغات ملیح آباد کے مختصر پتے پر مفصل خط لکھا تاکہ مثل
کی وجہ تسمیہ کا پتہ مل جائے۔ خط ٹھکانے پر پہنچ گیا
جواب بھی ملا ہمیں محسوس ہوا کہ ہمارا کام بن گیا۔ اس وقت
ہماری خوشی کا یہ عالم تھا کہ ہمیں وہ چھت جس کے نیچے
ہم بیٹھے تھے جھومتی نظر آ رہی تھی۔ بہر حال سنبھلے خط
پڑھا۔ جواب صرف ایک سطر میں تھا کیا تھا۔ وہ آپ بھی
سن لیجئے۔ لکھا تھا "میاں ہم آم بیچتے ہیں کہاوتیں نہیں"
بھلا ہم میدان سے بھاگنے والے کہاں۔ ٹیلیویژن کے ایک نمائندہ
کے پاس جا کر اپنی تکلیف بیان کی۔ وہ مسکرا کر کہنے لگے۔
"کل ایک مجرا گروپ آ رہا ہے فلاں تھیٹر میں شام کو پہنچ
جانا۔ تمہیں جواب مل جائے گا" بڑے کرب سے وقت گزارا
اور ٹھیک وقت پر تھیٹر پہنچے دس روپے کا ٹکٹ لیا اور
نمائندہ صاحب کو ڈھونڈنے لگے۔ وہ تو نہیں ملے البتہ
پریس گیلری مل گئی۔ مڑ کر دیکھا تو نمائندہ صاحب اپنی بیوی اور
نصف درجن بچوں کے ساتھ تشریف لا رہے تھے۔
انھیں دیکھ کر اور پا کر ہماری باچھیں کھل گئیں۔ ملتے ہی
اپنا سوال دہرایا جواب ملا۔ "انٹرول کے وقت یہیں رہنا
اور ہر بات کا جائزہ لینا۔ اختتام شو کے بعد مجھے پھر ملنا"
لوگ ناچ دیکھ رہے تھے۔ گانا سن رہے تھے، تالیاں
پیٹ رہے تھے، جھوم رہے تھے۔ ہماری نظریں اور کان بھی
ادھر تھے مگر ہم انتظار کر رہے تھے۔ انٹرول کا۔ انٹرول
میں ہم وہاں سب جائزہ لیتے رہے شو پھر شروع ہوا۔
ختم ہونے پر ہم نمائندہ صاحب کی طرف لپکے۔ انھوں
نے ہمارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "دیکھو میاں گاڑی
ہم کو لے کر آئی۔ اب ہمیں گھر چھوڑ کر آئے گی۔ شو کا پاس
پوری فیملی کا گھر پہونچا۔ شفقت دیکھا۔ عزت الگ ملی
لذت الگ۔ اسے کہتے ہیں "آم کے آم گٹھلیوں کے دام"
سرا ہمارے ہاتھ میں آ چکا تھا۔ ہم نے اپنا ریسرچ جاری
رکھی۔ اچانک ہمیں ایک پروفیسر صاحب کا خیال آیا
جو سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ ٹیوشن پڑھاتے تھے
اور کتب پر تبصرے بھی لکھتے تھے ہم نے سوچا کہ شاید

ان سے کچھ سُراغ ملے۔ ان سے ملنے چلے گئے۔ معلوم ہوا کہ ٹیوشن پڑھانے گئے ہیں۔ رات ۹ بجے کے قریب ہی مل سکیں گے۔ اب کون گھر واپس جاتا اور پھر آتا۔ چنانچہ ہم ادھر اُدھر گھوم آئے۔ اور یہ سوچ کر کہ نو بجے کا وقت نہ نکل جائے۔ مکان کے باہر دھونی لگا دی۔ وقت پر دستک دی۔ ایک کرخت آواز آئی "کون ہے"۔ ہم نے کہا "ایک طالب علم"۔ اتنا سننا تھا کہ دروازہ کھٹ سے کھلا شاید پروفیسر صاحب نے سوچا کہ ایک ٹیوشن اور ہاتھ آئی۔ لیکن ایک بڑھے کھوسٹ کو سامنے دیکھ کر کہا۔

"میاں کیا کام ہے"۔ ہم نے فوراً کہا "ایک کہاوت کا مطلب سمجھنے کی ضرورت پڑ گئی ہے"۔ غالباً انھوں نے کسی بھی موضوع پر ریسرچ نہیں کی تھی۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ ریسرچ کے بندے ان سے مدد لینے کے لئے آنے شروع ہو گئے ہیں۔ انھوں نے پہلے یہیں چائے پلائی۔ پھر ہم سے سوال کیا۔ "آپ کو تکلیف کیا ہے"؟ ہم نے اپنا مدعا بیان کیا۔ اسی اثنا میں ہماری نظر میز پر رکھی کتابوں پر گئی۔ پاس ہی ایک کتاب ہم کھلی دیکھ چکے تھے جس پر پروفیسر صاحب تبصرہ لکھ رہے تھے یہاں بھی پھر ہمارے ہاتھ آ گیا تھا۔ ہم نے یہ سوال بھی داغ دیا۔ "سنا ہے آپ تبصرے لکھتے ہیں آپ کو اس سے کیا ملتا ہے"۔ جواب ملا "معاوضہ"۔ "اور . . . . ."

ہم نے بات کاٹ کر کہا۔ "کتاب بھی تو ملتی ہوگی" کہنے لگے "ہاں"۔ ہم نے کہا۔ "پھر تو جواب مل گیا، یعنی آم کے آم گٹھلیوں کے دام"۔ پروفیسر صاحب پہلے کچھ جھینپے۔ پھر سنبھلے۔ ہمارے دیکھ کر کہ ریسرچ اس طرح کی جاتی ہے۔ ہمارا شکریہ ادا کیا۔ قصّہ مختصر ریسرچ کے بعد ہم اپنا تھیسس مکمل کرنے کی اسکیم بناتے رہے۔ اتفاقیہ ہم اپنے ایک دوست شاعر کے گھر پہنچے وہاں ایک صاحب بیٹھے تھے۔ پہلا تعارف کرایا گیا۔ جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ یہ صاحب بھی شاعری کرتے ہیں ہم نے کلام سنانے

کی درخواست کی۔ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ استاد کے شاگرد ہیں۔ غزل شروع ہوئی۔ شعر میں تو کیا ہر مصرع میں ان کے استاد کا رنگ تھا۔ آخر ایک شعر میں انھوں نے ایک لفظ اس طرح پڑھا کہ بندھا تو صحیح تھا لیکن تلفظ غلط تھا۔ "پھر پڑھئے"۔

"انھوں نے پھر پڑھا۔ پھر تلفظ غلط"

"دوبارہ سوچ کر احتیاط سے پڑھئے"

استاد شاعر بھانپ گئے اور بھانڈا پھوٹنے کے ڈر سے شاگرد کو کہنے لگے "ابھی ٹھہرو۔ ہم کچھ ضروری بات کریں گے اور پھر سنیں گے"۔

ہم نے استاد شاعر کو کسی کتاب کو ڈھونڈنے کے کام میں لگا دیا اور لپک کر شاگرد کی بیاض کو دیکھنے، پڑھنے اور سونگھنے کو پہنچ گئے۔ دیکھا تو سبھی اشعار بیاض میں لکھے ہوئے تھے۔ استاد شاعر سب نظارہ دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے شاگرد کو چلتا کیا۔

ہم نے پوچھا۔ "یہ تو غزل مکمل آپ نے لکھ کر دی۔ اور وہ لفظ . . . آپ کو تو معقول معاوضہ بھی پہنچ دیتے ہیں۔ پھر یہ حرکت کیوں۔ آپ تو ادب پر ظلم کر رہے ہیں"۔

"ہاں میاں کوئی رسالہ پچاس روپے سے زائد نہیں دیتا میری آمدنی کا ذریعہ یہی ہے۔ چالیس روپے انھوں نے نقد دیئے۔ مشاعروں میں سنائیں گے جملہ حقوق میرے پاس محفوظ ہیں۔ کچھ مناسب تبدیلی کر کے اور مقطع بدل کر چھپوا دوں گا۔" ہم نے کہا تو یوں کہئے "آم کے آم گٹھلیوں کے دام"۔ ایک قہقہہ پھوٹا۔

ایک واقعہ سُنئے۔ نسیم ممتاز سعید (مضمون نگار) جو گیا وہ اور شوکت تھانوی دیال سنگھ کالج لاہور کے دروازے کے پاس ایک آئس کریم بنانے والے سے آئس کریم کھایا کرتے تھے۔ انھوں نے ایک روز آئس کریم والے سے کہا۔ بھئی آم کی آئس کریم کیوں نہیں بناتے لیکن وہ ٹالتا رہا۔ غالباً اس لئے کہ آموں کا سیزن شروع ابھی

ترقی اردو بیورو کی تازہ ترین مطبوعات

1	کلیات میر	مرتبہ ظل عباس عباسی	62.00 روپے
2	ہندوستان میں مسلم حکومت کی اساس	اے بی ایم حبیب اللہ / مترجم مسعود الحق	25.00 روپے
3	تاریخ قدیم ہندی فلسفہ	شو نرائن شاد ماخذ	30.00 روپے
4	بین الاقوامی معاشیات	ڈاکٹر لیاقت خان	35.00 روپے
5	نسل اور نسلی امتیاز	محمد عبدالقادر عمادی	08.50 روپے
6	سرطان کیا ہے ؟	محمد برہان حسین	07.00 روپے
7	اودھ پنچ	اطہر پرویز	07.00 روپے
8	بابر نامہ	محمد قاسم صدیقی	04.00 روپے
9	حالی	مرتبہ صالحہ عابد حسین	04.50 روپے
10	ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا حیات اور کارنامے	کبیر احمد جائسی	12.00 روپے
11	خواجہ میر درد	ڈاکٹر محمد ظہیر احمد صدیقی	04.50 روپے
12	اکبر الہ آبادی	صغرا مہدی	04.50 روپے
13	بچوں کے حالی	صالحہ عابد حسین	03.75 روپے
14	فضائی اور خلائی اڑان	شاداں پرویز	03.25 روپے
15	الو کی کہانیاں	محمد قاسم صدیقی	02.25 روپے
16	کٹھ پتلی ایک تماشہ	سطوت رسول	07.00 روپے
17	ہمالیہ کے بنجارے	مترجم کمال احمد صدیقی	06.50 روپے
18	پریم چند کی کہانیاں	مرتب جوگیندر پال	10.00 روپے
19	یونانی ادویۂ مفردہ (تیسرا ایڈیشن)	حکیم سید صفی الدین علی	07.50 روپے
20	تشریح الاحشا (حصہ دوم)	ڈاکٹر و حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی	19.50 روپے

کتب اور دیگر معلومات کے لئے لکھیں

شعبہ فروخت و نمائش ترقی اردو بیورو

ویسٹ بلاک ۸ ، آر۔ کے۔ پورم ۔ نئی دہلی [illegible]

DAVP – 511(115)/85

جائزے

کریمی الاحسانی

کیا قدر و منزلت تھی یہ غالب سے پوچھئے
جس کو بڑے خلوص سے سقا بُوریا کہا
شاید کسی فقیر کے آنے کی تھی خبر
اور لطف یہ کہ گھر میں کوئی بوریا نہ تھا

پہلے بھی اس گلی سے گزرتا نہ تھا کوئی
بھولے سے جو گیا وہی بے آبرو ہوا
کتے کے پالنے سے نرے مصلحت شناس
اچھا ہوا محلہ فقیروں سے بچ گیا

شدتِ افلاس و محرومی کے عالم میں غریب
شکوۂ تقدیر تک بھی لب پہ لا سکتا نہیں
یوں اگر فاقہ کی زد میں کوئی آجائے امیر
وہ یقیناً جانے کب تک مسکرا سکتا نہیں

ایک محنت کش شکستہ جھونپڑی میں خوش ہے
رات بھر دیکھا کئے آرام سے خواب حسیں
اور اک بوجھل تجوری ہے کا ٹتا ہے ذہن کی رات
جیسے اک مدقوق ساری رات سو سکتا نہیں

جنوری کا دوسرا ہفتہ ہے سردی پُر شباب
ایسے عالم میں الاؤ پر ہیں یوں کچھ خستہ حال
ایک ٹولی رہزنوں کی دور جنگل میں کہیں
چپکے چپکے بانٹتی ہو جس طرح چوری کا مال

ایسے عالم میں دوستو کیسے
حرفِ مطلب زباں پہ آتا ہے
اک گداگر کو دیکھ کر زردار
دفعتاً بوکھلا سا جاتا ہے

مصلحت کا گوند ہونٹوں پر لگا کر جانے کیوں
دیکھ کر جبر و ستم خاموش رہتے ہیں امیر
جیسے شب میں ڈاکوؤں کے خوف سے گاؤں کے لوگ
خامشی کے بہرے رہ جاتے ہیں بیچارے اسیر

ڈاکٹر کے۔ کے رشی کوروکشیتر یونیورسٹی

تم جو کہتے ہو مرا تم سے تقاضا کیا ہے
ہوں میں حیران کہ تم نے بھی سوچا کیا ہے
کیا کہیں آپ سے ہم آپ کا وعدہ کیا ہے
یہ اگر ایک حقیقت ہے تو دھوکا کیا ہے
کس لئے کرتے ہو یوں ترکِ وفا کی باتیں
دل سے بھی پوچھ کے دیکھو کہ ارادہ کیا ہے
عشق کے سامنے جھکتے ہیں سبھی چھوٹے بڑے
حسن کیا شے ہے خدا کیا ہے فرشتہ کیا ہے
آج پھرتے ہیں چھپائے ہوئے پُرنم آنکھیں
کل جو کہتے تھے نہیں عشق میں ہوتا کیا ہے
زندگی کے لئے کچھ یہ بھی ضروری ہیں بہت
ٹھیک ہے یہ بھی کہ خوابوں کا بھروسا کیا ہے
پھیر لیتے ہیں نظر وقت پڑے یوں تو رشی
دوست پھر دوست ہیں ان لوگوں سے شکوہ کیا ہے

قطعہ

کینہ ہے دلوں میں تو نگاہوں میں ہے نفرت
نایاب مروت ہے تو پامال محبت
ملتا ہوں کسی سے بھی تو ہوتا ہوں میں حیراں
اس دور میں کیا ہو گئی انسان کی فطرت

غزل — اخلاق سہسوانی

جنون و ہوش کے ہر امتحاں سے گزرے ہیں
تمھیں پکار کیا ہے جہاں سے گزرے ہیں
ہمارے عزم کی دے داد اے غمِ دوراں
ہزار بار ترے درمیاں سے گزرے ہیں
یہ کیوں فضاؤں پہ رعنائیاں سی طاری ہیں
ابھی ابھی وہ یقیناً یہاں سے گزرے ہیں
شبِ فراق کی یہ تلخیاں معاذ اللہ!
ابھی سحر کے نظارے گراں سے گزرے ہیں
یہ بامِ خلد ہے یہ نقشِ کوچۂ جاناں
خبر نہیں کہ ابھی ہم کہاں سے گزرے ہیں
غمِ فراق سے آگے ملیں گے اور بھی غم
ابھی تو ہم فقط اک امتحاں سے گزرے ہیں
کسی کی وجہِ خلاف کا غم نہیں اخلاق
یہ غم ہے عشق میں ہم بھی کہاں سے گزرے ہیں

باقی صفحہ ۲۰ کا

آم کے آم گٹھلیوں کے دام

اور وہ خاصے منچلے تھے ایک دن آئس کریم کھا کر واقعی بہت لطف آیا۔ اس سے پوچھا کہ اس میں خاص بات کیا ہے تو بولا "آج میں نے اس میں بہت سے آم گرے ہیں۔ مطلب یہ کہ ڈالے ہیں یا گرائے ہیں۔ شوکت صاحب برجستہ بولے "نظامی صاحب! آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام کی مثل کا مفہوم دراصل آج سمجھ میں آیا۔" شوکت صاحب کو اس کا فقرہ بہت پسند آیا اور سچ پوچھئے تو آئس کریم سے زیادہ وہ اس اصطلاح سے لطف اندوز ہوئے۔۔

تضمین (بر کلام اقبال)

کندن لعل گردھر (بری والا منڈی)

تجھے بخشا وقارِ "اشرف المخلوق" خالق نے
جلالِ حکمت دیا، پھر اس انداز میں جس کے
قضا و قدر جھک جائیں تری تدبیر کے آگے
"خودی کو کر بلند اتنا، کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے"
کھلا اٹھے گا یہ ویرانہ بھی اک دن فصلِ یزداں سے
عجب ہو گا نظارا اس کی بہارِ باغِ رضواں سے
ابھی محروم ہے گو رحمتِ ابرِ بہاراں سے
"نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی"
جنونِ فرقہ داری نے بنا نفرت کی ڈالی ہے
نشیمن ہے ترا جس پہ تہِ تیشہ وہ ڈالی ہے
عمل کا وقت ہے لیکن، تو محوِ خوش خیالی ہے
"وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں"
تعصب نے سمِ آلودہ کیا انسان ذہنوں کو
سکھایا اس نے خوئے ابلیس کی آدم کے بیٹوں کو
نزاعِ کفر و ایماں نے کیا تاراج ملکوں کو
"اجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو
مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے"

اظہارِ خیال

جناب روشن پٹیالوی

"تبسم" (دوسرا ایڈیشن) مصنف جناب رام لعل نابھوی

زیر نظر کتاب مشہور مزاح نگار جناب رام لعل نابھوی کے بیس طنزیہ و مزاحیہ خاکوں پر مشتمل ہے کتاب کے مضامین سے متعلق اظہار خیال سے قبل اگر مصنف کی شخصیت۔ رجحانات۔ اور نقطۂ نظر سے متعلق معلومات بہم پہنچائی جائیں تو ان کے طرز نگارش اور مضامین کے صحیح مفہوم کو سمجھنا زیادہ آسان ہو جائے گا۔

شری رام لعل نابھوی کو میں بہت مدت سے جانتا ہوں اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ انقلابی اور باغیانہ ذہن اور قلندرانہ مزاج لے کر اس دنیا میں آئے۔ اسی لئے ان کی طبیعت میں فکر و عمل کا ایک پرجوش امتزاج موجود ہے ان کے نزدیک زندگی ایک جہد مسلسل سے عبارت ہے وہ خواہشات اور مقاصد کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے حصولِ مقصد کا ولولہ ہی وہ ترنگ ہے جو زندگی کو گرم نفس برق پا اور شعلہ بار بنائے ہوئے ہے انسان ایک خواہش کی تکمیل سے فارغ نہیں ہوتا کہ نئے مقاصد چشمک زنی کرنے لگتے ہیں۔ زندگی اپنی ماہیت میں مقصد کوش ہے یہی ذوق کام جوئی ہے۔ جس نے انسان کو بے ہمتی کی درماندگی سے امید و طلب کی رفعتوں تک پہنچا دیا ہے جس دل میں مقصد کی کشش اور ولولوں کی شورش نہیں اسے پتھر کا ایک بے حس ٹکڑا ہی سمجھا جانا چاہئے۔ بے ہمتی اور جمود کی زندگی انسان کو خاکستر میں تبدیل کر دیتی ہے ہماری کام جوئیوں کا دائرہ جس قدر وسیع ہوگا اسی قدر زندگی کا نغمہ خوش آہنگ اور بلند ہوتا جائے گا زندگی کی مقصد کوشیوں ہی سے جنبش و حرکت کے چشمے پھوٹتے ہیں

بغیر مقصد کی تڑپ کے نہ تو زندگی کا عمل جاری رہ سکتا ہے اور نہ ہی فطرت اپنے مقصد تک پہنچ سکتی ہے۔ برگساں نے زندگی کو آتشبار برق پا سے تشبیہہ دی ہے جو آسودگی کی تلاش میں رواں دواں ہے یہ مشہور دانشور زندگی کی مسلسل جنبش و روانی کی توجیہہ یہ کرتا ہے کہ وہ اپنی ماہیت میں ہی سرتاپا تغیر اور متنوع ہے۔ موجودات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو جنبش و حرکت کے اس کائنات گیر رقص بے تاباں میں حصہ نہ لے رہا ہو۔ مولانا آزاد زندگی کی سیمابی سے متعلق لکھتے ہیں کہ زندگی اپنی ماہیت ہی سے محو کام جوئی ہے۔ جناب رام لعل کی زندگی مسلسل جد و جہد و عمل کا ہی دوسرا نام سمجھئے۔

شری رام لعل حد سے زیادہ زندہ دل آدمی ہیں مزاح ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ مگر زیادہ سے زیادہ سنجیدہ اور خشک سے خشک مباحث و معاملات کے لئے بھی ان کا ذہن ویسا ہی حاضر رہتا ہے جیسا مذاق اور مزاح کے لئے ایک ہی وقت میں مذاق بھی کر سکتے ہیں اور سنجیدہ گفتگو بھی۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ان کی سنجیدہ گفتگو میں بھی ظرافت کی لطیف چاشنی موجود ہوتی ہے

ادب کی جملہ اصناف میں طنز و مزاح سب سے مشکل صنف ہے اور انشائیہ مشکل ترین کیونکہ مزاحیہ۔ طنزیہ اور انشائیہ مضمون لکھتے وقت اگر مصنف سے معمولی سی بھی لغزش ہو جائے تو سارا لطف جاتا رہتا ہے اسی دقت پسندی کی وجہ سے بہت کم ادیب اس سلسلے میں طبع آزمائی کی جسارت کرتے ہیں صرف وہی ادیب اس میدان میں قدم رکھتے ہیں جن کی طبیعتوں میں قدرت نے یہ مادہ ودیعت کیا ہو اور یہ صلاحیت پیدا کی ہو۔ جناب رام لعل کو قدرت نے طنز و مزاح نویسی کا جو ہر عطا کیا انھوں نے

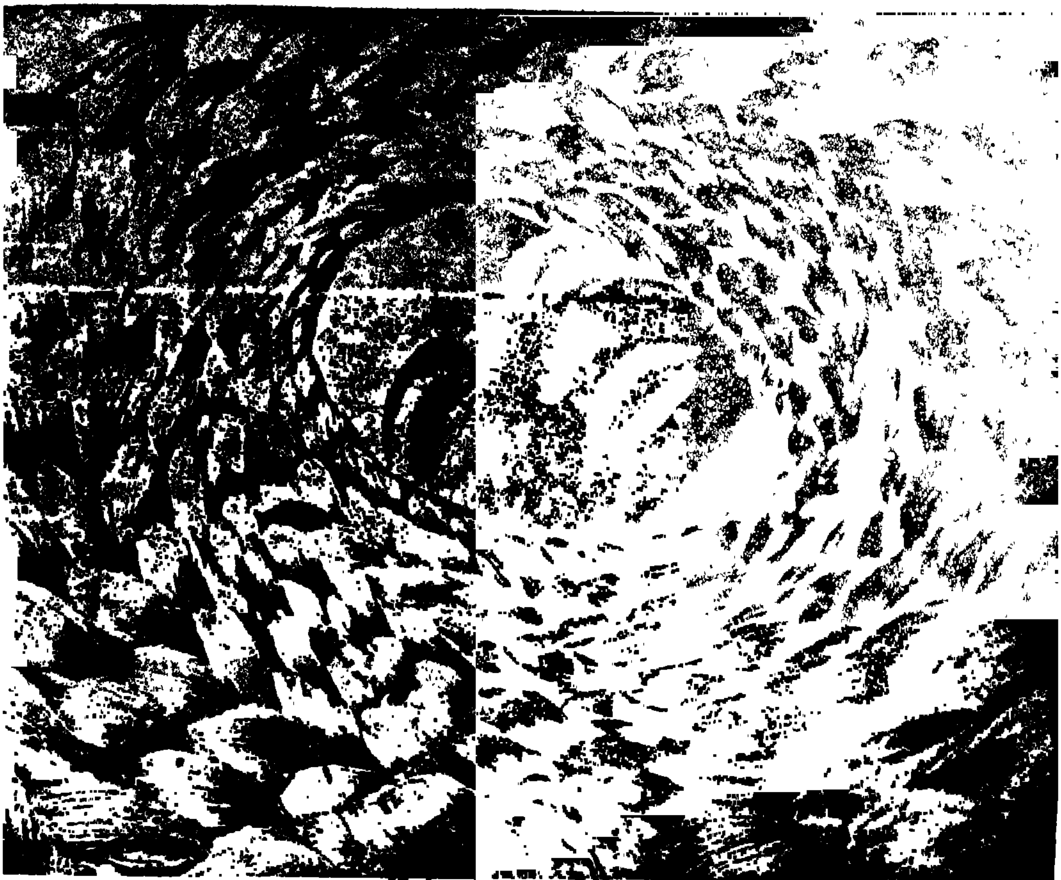
جملہ علوم و فنون کا گہرا مطالعہ کیا۔ دورانِ ملازمت انھوں نے دفتری کام سے فارغ ہو کر اپنے قیمتی وقت کو ضائع نہیں کیا۔ کتابیں ہی کتابیں اور دن رات ان کا مطالعہ بھی ان کی زندگی کا محبوب ترین مشغلہ رہا۔ ذہانت و فطانت کے علاوہ ان کی یادداشت بھی بہت تیز ہے۔ ہزاروں اشعار ان کی نوک زباں پر ہیں اس لئے لکھتے وقت وہ اپنے مضامین میں باموقع اشعار کا حوالہ دے کر جو مرصع کاری کرتے ہیں وہ ان جیسے بالغ نظر ادیب کا ہی حصہ ہے عصری درجحانات اور روزمرہ کی زندگی کے حقائق کو اپنے مضامین میں انھوں نے اس فنکارانہ چابک دستی سے سمویا ہے کہ انھیں پڑھ کر صحیح ذوق رکھنے والا انسان وجد کرنے لگتا ہے انھوں نے اپنے جذبے کی تڑپ اور شدتِ احساس کی بڑی خوبی سے ترجمانی کی ہے جگہ جگہ اپنے مضامین میں جوشِ بیان اور الفاظ کی تکرار سے ایسی رنگینی اور تاثر پیدا کر دیتے ہیں کہ بایدوشاید والی بات ہے۔ ان کے مضامین میں مشاہدات اور تجربات کی گہرائی اور گیرائی ہے اور اس پر طرہ یہ کہ غور و فکر کی شاہراہوں اور پرکشش رنگینیوں سے افادیت کا پہلو بھی جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔

آپ طوالت پسند نہیں۔ لمبے مضامین پڑھنے سے قاری کی طبیعت اکتا جاتی ہے اس لئے وہ اس کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ کم سے کم الفاظ میں مطلب کی بات کہہ دی جائے کسی مضمون کی خوبی اور دلچسپی کی سب سے زیادہ قابلِ یقین کسوٹی یہ ہے کہ جب کوئی شخص اسے پڑھنے لگے تو ختم کئے بغیر اسے چھوڑ نہ سکے۔ وہ مضمون نویس کی طرزِ نگارش کی خوبیوں میں محو ہو کر رہ جائے۔ جناب رام لعل کے یہ مزاحیہ خاکے اس کسوٹی پر پورے اُترتے ہیں معمولی موضوعات مثلاً "چکر" "لفافہ" وغیرہ کو اس خوبی سے سمجھایا ہے کہ خواہ مخواہ داد دینے کو طبیعت چاہتی ہے اردو ادب کی بہت سی توقعات اس بلند قامت ادیب سے وابستہ ہیں "تبسم" ان کی پہلی تصنیف ہے اُمید ہے وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں منہمک ہونگے اور اُن کی آنے والی تصانیف بہتر سے بہتر مزاحیہ ادب پیش کر کے اصحابِ ذوق کی توقعات کو پورا کریں گی۔

میں اُن کی اس تصنیف کی ہمہ پہلو کامیابی کا دل سے خواہاں ہوں۔ اُمید ہے کہ باذوق اصحاب اس ذہین اور صاحبِ طرز مزاح نگار کی اس تصنیف کو ہر پہلو سے پسند فرمائیں گے۔ آخر میں یہ اظہارِ خیال اس فقرے پر ختم کرتا ہوں کہ ان کا ذہن مرصع اور بلند ہے اور قلم پرسوز نالہ کار۔ جنوں پیشہ اور دل نواز۔

"تبسم" دفترِ شانِ ہند سے دستیاب ہے۔ قیمت ۲۰/=

Phone [illegible] Regd. No. D-(C) N) [illegible]
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002
Regd. with Registar of Newspaper at R.N. No. 644/57







ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ | رجسٹرار آف نیوز پیپر فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۴۴۴/۵۷ | رجسٹرڈ نمبر دہلی ۳۲۰/DN

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرہ وطن سے ہے نیا حق مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
نیاحق گوالیاری

ماہنامہ

شانِ ہند
نئی دہلی

ایڈیٹر سرور تونسوی

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے
زرسالانہ ۲۴/= روپے

جلد نمبر ۴۵ | اپریل ۱۹۸۴ء | شمارہ نمبر

- تاریخِ عالم کی سب سے بڑی ناانصافیاں جنگ کے میدانوں کے بعد عدالت کے ایوانوں میں ہوئی ہیں۔ (ابوالکلام آزاد)
- ایک ہوشیار قیدی سب سے پہلے جیل میں وہاں کی آب و ہوا۔ افسروں کی سرشت، سپرنٹنڈنٹ کی خُو بُو، جیلر کی طبیعت، سپرنٹنڈنٹ سے اُس کے تعلقات عام افسروں اور ملازموں کے مزاج و رجحان میڈیکل اسٹاف کی ذہنیت، عام قیدیوں کے طور و طریق وغیرہ سے متعلق معلومات حاصل کرتا پھر اپنے لئے قید بسر کرنے کا طریق سوچتا ہے۔ (شورش کاشمیری)
- غریب قوانین کی چکی میں پس جاتے ہیں لیکن امیر قانون پر حکومت کرتے ہیں۔ (گولڈ سمتھ)
- نوعِ انسان کی تاریخ صبر و شکیب کے اس انتظار میں ہے کہ وہ انسان کامران ہے جس کی خودی مجروح ہو چکی ہے۔ (ٹیگور)
- پیغمبرانِ عالم کو اُن کی زندگی میں اتنے پیروکار نہیں ملے جتنے مسٹر گاندھی کو اُن کی زندگی میں پیروکار ملے تھے۔ ("جدید سیاست کے نورتن" میں مسٹر جی۔ ایم سید)
- جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں اللہ انہیں شکست نہیں دیتا۔
- طاقت جب عقل و دانش کو پس پشت ڈال کر اپنی ذات پر بھروسہ کرنے لگتی ہے تو اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ (ڈاکٹر اقبال)
- طاقت کے کان بہرے ہوتے ہیں۔

[illegible] سرور عابد پرنٹر پبلشر نے ... خواجہ پریس ... جامع مسجد دہلی ... سرور تونسوی ...

ہماری چند اہم مطبوعات

سرمایۂ بلاغت :- ابوالبلاغت رتن پنڈوروی کی دوسری فکرانگیز اور دور رس مطالعہ کا نچوڑ ابوالبلاغت پہ بھرپور جامع اور مکمل کتاب علم البیان اور اس کی جملہ انواع و اقسام علم بدیع اصناف سخن غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، قطعہ، رباعی، شہر آشوب، تاریخ گوئی، ریختی، واسوخت، مستزاد، فرد، مسمط، نظم معرا اور آزاد نظم، سانیٹ، گیت، دوہا، ہجو، شہر آشوب، منظوم ڈرامہ وغیرہ نیز اقسام نثر و فصاحت و بلاغت عیوب کلام یعنی تنافر الفاظ ضعف تالیف ابتذال تعقید غرابت مخالف قیاس لغوی اور اس کی بعض قسمیں تنافر کلمات تعقید کراہت سمع و تکرار اخلال و حشو تقدیم و تاخیر بھرتی کے زائد لفظوں حشو و لحنت و عدم تقابل خرابی بعد شعر نادرست و ناموزوں تعقیب الفاظ بعد سقوط ... و مبالغہ نقص روانی حروف علت کا گرانا شتر گربہ شکست ناروا ضمیر بے قافیہ تقابل ردیفین وغیرہ اور محاسن کلام اوزان کی وضاحت علم عروض ارکان بحریں زحافات اور ان کی وضاحت ارکان عشرہ فروعات مستعملہ اوزان و بحور تقطیع تشریح بحور ردیف و قافیہ وغیرہ پر مفصل مکمل اور مدلل اظہار خیال بلاشبہ دنیائے علم و ادب اسے ہمیشہ یاد رکھنا چاہے گا۔

قیمت = /۴۰

فن تاریخ گوئی :- تاریخ گوئی کا فن خال خال شعراء تک ہی محدود ہے اس فن پر ابوالبلاغت رتن پنڈوروی کی بھرپور جامع اور مکمل کتاب بلاشبہ شعراء کے لئے یہ کتاب ایک نعمت سے کم نہیں فن شعر کے قدر دانوں کے لئے ایک گراں بہا تحفہ۔ قیمت = /۱۵

نادیدہ :- جوگیندر پال کا نیا ناول
قیمت = /۵۰

سپنے :- سرزمین راجستھان کے قابل ذکر شاعر جناب چندن بھارتی جن کے کئی مجموعے ہائے کلام شائع ہو کر دنیائے شاعری سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں حال ہی میں ادارہ شانِ ہند نے چندن صاحب کے تازہ ترین کلام کا مجموعہ سپنے شائع کیا ہے جو دیکھنے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے صنف نازک نے چندن صاحب کے کلام کو بے حد پسند کیا ہے ۲۵۶ صفحات پر پھیلا ہوا چندن صاحب کا یہ مجموعہ کلام بہترین انداز میں چھاپا گیا ہے۔ قیمت۔ بیس روپئے۔

آوازِ دل :- اردو کے عیسائی شعراء میں جوزیف نجیب ایک جانا پہچانا نام ہے۔ حال ہی میں ادارہ شانِ ہند نے نجیب صاحب کا مجموعہ کلام آوازِ دل شائع کیا ہے۔ یہ مجموعہ آپ کی ذاتی لائبریری کی یقیناً ایک بہترین اضافہ ہوگا۔ قیمت - پندرہ روپئے -

---

شمعِ فروزاں :- جناب آتش بہاولپوری کا یہ مجموعہ کلام ادارہ شانِ ہند کے اہتمام میں چھپ کر شائع ہوا ہے اس مجموعے کی اشاعت کے لئے حکومت بہار نے مالی امداد فرمائی ہے جو اس امر کا ثبوت ہے کہ آتش بہاولپوری کا یہ مجموعہ شعری اصناف کا ایک اچھا گلدستہ ہے۔ قیمت - اٹھارہ روپئے -

---

دفتر شانِ ہند فلیٹ ۴ انصاری مارکیٹ دریا گنج۔ نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲

بُلبُل چہ گُفت؟ گُل چہ شُنید؟ وصبا چہ کرد؟

اُردو اکادمیوں کی نادر شاہی :-

ہر اُردو اکادمی کسی بھی کتاب کو انعامی مقابلے میں شامل کرتے وقت کتاب کے مصنف سے یہ حلفیہ بیان لیتی ہے کہ اگر مجھے اس کتاب پر انعام دیا جائے گا تو میں کسی دوسری اُردو اکادمی سے اس کتاب پر کوئی انعام حاصل نہیں کروں گا۔ اور کہ اس وقت تک مجھے اس کتاب پر کسی سرکاری یا غیر سرکاری ادارے سے کوئی انعام نہیں ملا۔

کیا کسی بھی اُردو اکادمی کے ذمہ دار ارکان اس پابندی کے جواز میں کوئی معقول وجہ دے سکتے ہیں؟ کہ اگر کسی کتاب پر کوئی اُردو اکادمی انعام دیتی ہے تو کونسی اخلاقی یا قانونی اڑچن ایسی ہے کہ اس کتاب کو کوئی دوسری اکادمی یا کوئی ادارہ انعام دے تو مصنف کو یہ انعام وصول نہیں کرنا چاہئے ___؟ اور اس سے پہلے انعام دینے والی اکادمی کو کیا نقصان پہونچے گا ___؟

ظاہر ہے کہ ایسی کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ اس شرط کو قائم رکھا جائے اور یہ پابندی محض ایک دوسری اکادمی نے دیکھا دیکھی عائد کر رکھی ہے محض اپنی اہمیت جتانے کی خاطر یہ نادر شاہی حکم جاری کر رکھا ہے ہمارے خیال میں اُردو اکادمیوں کو از خود اس ناجائز پابندی کو ترک کر دینا چاہئے یا پھر کچھ مصنفین کو مشترکہ طور پر ہائی کورٹ میں اس پابندی کے خلاف رٹ داخل کرنی چاہئے۔ تاکہ قانونی طور پر اس نادر شاہی کا خاتمہ کیا جا سکے۔

اس ضمن میں جناب نازش پرتاب گڑھی (مرحوم) کا واقعہ جو آنجہانی پردیش اُردو اکادمی کی تنگ دلانہ روش اور اُن سے توہین آمیز سلوک کا آئینہ دار ہے دُنیائے اُردو کے لئے قابلِ شرم ہے) مرحوم نازش پرتاب گڑھی نے ۲۸ مارچ ۱۹۸۴ء کو بلرام پور ہسپتال لکھنؤ سے بسترِ مرگ سے جو مراسلہ نامہ مدیر شانِ ہند کو اتر پردیش اُردو اکادمی کی کارگزاریوں کے بارے میں لکھا ہے وہ ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں اتر پردیش، اُردو اکادمی کے جواب کے لئے شانِ ہند کے صفحات حاضر ہیں۔

مکرمی جناب مدیر صاحب ماہنامہ شانِ ہند دہلی

آداب۔

اتر پردیش اُردو اکادمی کی کارگزاریوں کی بیشتر مثالیں میں کسی دوسرے موقع پر پیش کروں گا۔ فی الوقت ایک ہی کارنامے کی تفصیل آپ کے موقر ماہنامے کے ذریعہ اُردو دوست حضرات تک پیش کر رہا ہوں۔

"چرخِ وطن کے مہر و ماہ" کے عنوان سے ہندوستان کی عظیم ترین شخصیتوں کے بارے میں نظمیں لکھنے کا ایک سلسلہ میں نے شروع کیا تھا جو ۱۹۸۲ء کے آخر میں مکمل ہوا اور اسی وقت میں نے مذکورہ مسودہ اُردو اکادمی میں اس گزارش کے ساتھ پیش کیا کہ اس کتاب کو اکادمی شائع کر دے مسودہ کی پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ یہ تمام ملک کی عظیم شخصیتوں کی معتبر اور منظوم سوانح عمری پر مشتمل ہے ایسی کوئی دوسری کتاب اُردو میں ابھی تک شائع نہیں ہوئی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مذکورہ مسودہ کی نظموں کا تعلق زندگی کے کسی ایک ہی شعبے سے تعلق رکھنے والی شخصیتوں سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس مسودہ میں غیر منقسم ہندوستان کی کم و بیش سبھی عظیم اور اہم ترین سیاسی اور ادبی شخصیتوں پر نظمیں موجود تھیں اس پہلو سے بھی یہ مسودہ اُردو نظم کی

نہیں نثر میں بھی پہلا اور منفرد مسودہ ہے جسے پڑھنے کے بعد نہ صرف طالب علم بلکہ عوام الناس بھی اپنے ملک کے مذہبی سیاسی اور ادبی شخصیتوں کے بارے میں تمام ضروری معلومات حاصل کر سکیں اور انھیں مذہبی، سیاسی اور ادبی تاریخ کی الگ الگ کتابیں پڑھنے کی چنداں ضرورت باقی نہ رہے گی یعنی یہ مسودہ شائع ہونے کے بعد اردو داں طبقے کی بیک وقت تین ضرورتیں پوری کر سکے گا۔

اتر پردیش اردو اکادمی نے گزشتہ سال مطبوعات کے لئے جو منصوبہ بنایا تھا اس میں سب سے اہم منصوبہ یہ تھا کہ جنگ آزادی سے متعلق لٹریچر کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے میرے مذکورہ بالا مسودے کی نظموں کا تین چوتھائی حصہ جنگ آزادی کے جانباز رہنماؤں اور سرفروش مجاہدوں سے متعلق ہے پھر یہ کہ جہاد آزادی کے مشہور و معروف سربراہوں کے ساتھ ساتھ میں نے بہت سے ایسے جیالوں اور شہیدوں کے بارے میں بھی نظمیں لکھ کر اپنے مسودے میں شامل کی ہیں جن کے کارناموں کو کیا ناموں تک سے ہماری نئی نسل بے خبر و بیگانہ ہے اور جن کا ذکر اب تک کسی اخبار، کسی رسالے یا کسی تقریر میں نہیں کیا جاتا مثال کے طور پر پہلی جنگ آزادی کا سپہ سالار جنرل بخت خاں اودھ کی سلطنت کا غیر متزلزل وفادار راجہ جگنو سنگھ ہندوستان کی جلاوطن حکومت کے صدر راجہ مہندر سنگھ وزیر اعظم ڈاکٹر برکت اللہ اور وزیر خارجہ مولانا عبید اللہ سندھی۔ آزاد ہند فوج کے اصل بانی مسٹر راس بہاری بوس اور دیگر وغیرہ یعنی میرا مسودہ اردو اکادمی کے اہم ترین منصوبے کے عین مطابق ہے۔

یوں بھی کے محکمہ قومی یک جہتی کے ماتحت ہونے کی بنا پر اردو اکادمی کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ وہ ایسے لٹریچر کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کرے جو ملک میں قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کو زیادہ سے زیادہ فروغ دے اور میرے مسودے کی ہر نظم اس فرض کو بحسن و خوبی ادا کرتی ہے مذہبی شخصیتوں پر نظمیں لکھتے ہوئے میں نے خصوصیت کے ساتھ اس امر کو ملحوظ خاطر رکھا ہے کہ وطن عزیز کے مقدس مذہبی رہنماؤں کے اس درس و پیام اور رشد و ہدایت کو پوری طرح اجاگر کروں جس سے انسانیت، انسان دوستی، حق و صداقت، عزم و ارادہ، حب الوطنی، باہمی میل جول اور بھائی چارہ کی نورانی مشعلیں فروزاں ہوتی رہی ہیں تاکہ مذہب و سیاست کے نام نہاد ٹھیکیداروں کی پھیلائی ہوئی شکوک و شبہات کی تاریکیاں دور ہو سکیں اور ہر قسم کی غلط فہمیوں کا خاطر خواہ ازالہ ہو سکے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اپنی ابتدائے شاعری ہی سے میں اس مشن پر مسلسل کام کرتا آرہا ہوں۔

مذکورہ بالا تمام خصوصیتوں اور انفرادیوں کا حامل ہونے کے باوجود اتر پردیش کی اردو اکادمی نے میرا مسودہ شائع کرنے سے انکار کر دیا اور اکادمی کے اراکین اور دوسرے با اثر حضرات کے کئے ہوئے شعراء کے انتخابات شائع کرنے میں مصروف ہے جو اعلیٰ ادبی ذوق رکھنے والے ایک مختصر و محدود حلقے ہی کے کام آئیں گے یا پھر لکھنؤ کا دستر خوان قسم کی کتابیں شائع کرتی ہے ظاہر ہے کہ بھوک کے مارے ہندوستان کے لئے اس قسم کی کتابیں شائع کرنا نہ صرف فضول بلکہ پیسوں کا زیاں بھی ہے بات دراصل یوں ہے کہ اتر پردیش اردو اکادمی پر ان دنوں چند نااہل اور قطعی غیر ادبی قسم کے لوگ حاوی ہیں جن کے سامنے اکادمی کے چیئرمین اور صدر تک اپنے آپ کو مجبور محض تصور کرتے ہیں اور وہ حضرات ایک طرف تو اپنے احباب کو نوازتے رہتے ہیں دوسری طرف جن ادیبوں اور شاعروں سے انھیں ذاتی بغض و عناد ہے ان کے لئے قدم قدم پر مشکلیں اور رکاوٹیں پیدا کرتے رہتے ہیں۔

ابھی حال ہی میں جوش سیمینار و مشاعرے پر ہماری اردو اکادمی نے کم و بیش ایک لاکھ روپے صرف کئے ہیں مذکورہ سیمینار اور مشاعرے میں کیا کچھ ہوا ہے اکادمی کے ایک معزز رکن نے اپنے ذاتی مفاد اور احباب نوازی کے

لئے قوم کے پیسے کس بے دردی کے ساتھ پانی کی طرح بہائے ہیں اس کی تفصیل آئندہ قسط میں درج کروں گا۔

آخر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ اکادمی کی طرف سے مطبوعات پر انعام حاصل کرنے کے لئے جو کتابیں داخل کی جاتی ہیں اُن کے ساتھ ایک یہ اقرار نامہ بھی داخل کرنا پڑتا ہے کہ اگر اکادمی نے میری کتاب پر انعام دیدیا تو پھر اس کتاب پر کسی بھی دوسرے سرکاری یا غیر سرکاری ادارے سے کسی قسم کا کوئی انعام حاصل نہ کروں گا۔ اس شرط اور اقرار کو غیر آئینی سمجھتے ہوئے میں نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی میرے اس "جرم" کی سزا دینے کے لئے اکادمی کے تمام حضرات نے میرے خلاف محاذ قائم کر لیا ہے اور مجھے ہر طرح زک پہنچانے اور ذلیل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ مگر میرے اعتراض کا صحیح جواب دینے اور مذکورہ اقرار نامے کو درست اور آئینی ثابت کرنے کی کوشش بالکل نہیں کرتے۔

نازش پرتاب گڈھی

۲۸ مارچ ۸۴ء

نازش جو مر گیا ہے تو اردو اداس ہے

مرحوم سردار پٹیل کے سکریٹری اور سابق وزیر اعظم ہند مرارجی ڈیسائی کے پرسنل سکریٹری (مرحوم وی شنکر آئی۔ سی۔ ایس) ایک مرتبہ فرمانے لگے۔ سرور صاحب آج میں ایک ایسے مسلمان سے ملا ہوں جس میں مذہبی تعصب قطعاً نہ تھا۔ اور میرے لئے یہ حیران کن بات ہے کہ کوئی مسلمان مذہبی تعصب سے بالاتر ہو۔ وی شنکر جیسے زیرک اور تجربہ کار آئی سی ایس کی زبان سے ایسے الفاظ سن کر راقم الحروف نے دریافت کیا کہ آپ کس کی تعریف فرما رہے ہیں فرمانے لگے "نازش پرتاب گڈھی" عرض کیا کہ چونکہ آپ خود پرتاب گڈھ کے رہنے والے ہیں اس لئے ہم وطن کی تعریف فرما رہے ہیں۔ وی شنکر نے انتہائی سنجیدگی سے فرمایا نہیں، سرور صاحب ایسا ہرگز نہیں میں نے تو زندگی میں نازش صاحب کو آج پہلی مرتبہ دیکھا ہے اور پرتاب گڈھ گئے ہوئے مجھے چالیس سال سے زائد عرصہ ہو گیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نازش صاحب مذہبی تعصب سے بالاتر تھے۔ حب الوطنی اُن کی رگ رگ میں بھری ہوئی تھی۔ تقسیم ملک کے بعد نازش نے اپنی شاعری سے ملک کی جو خدمت کی ہے اُس کی مثال موجودہ دور کے کسی مسلمان شاعر میں ملنا مشکل ہے۔ اس انقلابی شاعر نے کس مپرسی کے عالم میں زندگی گزاری حکومت نے بہر طور کیا کہ ان کا علاج سرکاری خرچ پر کرا دیا مگر انھیں کسی اعزاز سے نہ نوازا۔ اتر پردیش اردو اکادمی ہو یا کوئی دوسرا ادارہ اُس کے مسلمان کارکنان کسی بھی ایسے مسلمان فن کار کو نوازنا گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں جو وطن پرست یا مذہبی جنون سے بالاتر ہو۔ اور نازش پرتاپ گڈھی میں یہ دونوں خامیاں تھیں۔ حال ہی میں اتر پردیش اردو اکادمی نے تراسی ہزار روپئے کی گرانقدر رقم برباد کر کے ایک مشاعرہ لکھنؤ میں کرایا۔ جس میں کہا جاتا ہے کہ کم از کم پچاس شعراء کو مدعو کیا گیا۔ جن میں اردو اکادمی کے ممبران میں سے ستائیس شعراء مدعو تھے۔ مگر اتر پردیش تو کیا ملک بھر کے واحد قوم پرست۔ وطن پرست اور مذہبی تعصب سے بالاتر مسلمان شاعر نازش پرتاب گڈھی کو نہ مدعو کیا گیا تاکہ لندن سے آئے ہوئے افتخار عارف اور احمد فراز ایسے پاکستانی نثرا و شعراء یہ اثر نہ لے سکیں کہ ہندوستان میں بھی کوئی مسلمان شاعر ایسا ہے جو اپنے وطن کو دنیا کے تمام ممالک سے اچھا سمجھتا ہے اور جو حب الوطنی میں اپنی مثال آپ ہے لکھنؤ سے پرتاب گڈھ کوئی ایسا دور بھی نہیں تھا کہ نازش صاحب کو مدعو کرنے میں کسی بڑی رقم کا صرف ہوتا۔ مگر ہمارے قومی ہیرو یہ تو کر سکتے

ہیں کہ افتخار عارف صاحب اور احمد فراز کو لندن کے آمد و رفت کے اخراجات ہوائی جہاز کے طور پر بارہ بارہ ہزار روپئے ادا کر دیئے جبکہ یہ دونوں حضرات دہلی کلاتھ ملز کے مشاعرہ میں تشریف لائے تھے اور محض دہلی سے لکھنؤ گئے تھے۔ مگر نازش صاحب کے لئے ان کے پاس دو چار سو روپئے کی بھی گنجائش نہ تھی۔

نازش صاحب انتقال سے کچھ روز پہلے دہلی میں تھے اور لکھنؤ روانہ ہونے سے ایک روز پیشتر محترمہ یاد کے ہمراہ دفتر شان ہند میں تشریف لائے تھے۔ وہ اکثر و بیشتر اردو اکادمی کے سلوک سے شاکی ضرور تھے مگر انھیں اس کا افسوس قطعاً نہ تھا۔ لکھنؤ پہنچتے ہی وہ علیل ہو گئے اور بلرام پور ہسپتال میں داخل ہو گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ع

ڈرا دیا رہِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی لاج

ایمانداری تو یہ ہے کہ نازش ایسے شریف النفس اور محب وطن شاعر دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں مرنا تو ایک روز ہر کسی کو ہے مگر تمام عمر خودداری، وطن دوستی شرافت اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی راہ پر گامزن رہتے ہوئے موت کو لبیک کہنا خدا کا کرم ہے۔

یہ اردو کی بدقسمتی ہے کہ نازش ایسا انقلابی شاعر اس جہان سے اردو کے ناخداؤں کی ناقدری کی شکایت کرتا ہوا رخصت ہوا ہے۔

خواجہ عبدالغفور کا انتقال

مہاراشٹر اردو اکادمی کے سکریٹری اور ریاست کے سابق چیف سکریٹری خواجہ عبدالغفور کا ۱۳/۲۶ اپریل کو لونا والا اور بمبئی کے درمیان ٹرین میں سفر کرتے ہوئے انتقال ہو گیا مرحوم نے اردو کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ یقیناً قابل تحسین ہیں افسوس ہے کہ اردو کا ایک محافظ چل بسا۔

اردو اکادمی کا ناکام جشن طنز و ظرافت

۲۴ جون ۱۹۸۳ء شاعر لال قلعہ سے لے کر ۳۰ مارچ ۱۹۸۴ء تک دلی اردو اکادمی نے مختلف تقریبات منعقد کر کے اپنی زندگی کا ثبوت دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دلی اردو اکادمی کی طرف سے منعقد ہونے والی تقریبات کامیاب رہیں۔ مگر مالی سال ۸۴-۱۹۸۳ء کی آخری تقریب جشن طنز و مزاح کلیتاً ناکام رہا یہ تقریب ۳۰ مارچ ۱۹۸۴ء کو سپرو ہاؤس میں منائی گئی اور اس تقریب میں عالیجناب صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ صاحب مہمان خصوصی کی حیثیت سے تشریف لائے۔

ہمیں افسوس ہے کہ اس تقریب میں جو پہلا انشائیہ پڑھا گیا اس کا عنوان تھا "کوڈان" جو حیدرآباد کے ایک پی سی ایس نے پڑھا اس انشائیہ میں جلسہ کے صدر اور مہمان خصوصی کا جو مضحکہ اڑایا گیا تھا وہ یقیناً صدر جمہوریہ ہند کی توہین کا مرتکب تھا کیونکہ اس وقت صدر جمہوریہ ہند مہمان خصوصی کی حیثیت سے ہی تشریف لائے تھے انشائیہ پڑھنے والے صاحب ایک ذمہ دار افسر ہوتے ہوئے یہ اندازہ بھی نہ لگا سکے کہ انھیں اس تقریب میں یہ انشائیہ "کوڈان" پڑھنا چاہئے یا نہ۔ اس کے علاوہ جس قدر بھی انشائیے پڑھے گئے وہ ماتمی انداز لئے ہوئے تھے طنز و مزاح دور دور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک سردار صاحب نے ایسے لطیفے سنائے جو ان کی پیدائش سے پہلے بھی عوام نے سن رکھے تھے اور ان لطائف کو لطائف کہنا بھی ان لطیفوں کی توہین تھی مزاحیہ شعراء کو اگر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر گائیڈ کرتے تو وہ بھی صفر تھے۔ اور ایسے بھی وہ صفر ہی رہے۔ اردو اکادمی نے اپنی کمیٹی کے ایماء پر ملک کے بڑے بڑے نامور مزاح اور طنز نگاروں کو مدعو کیا۔ مگر نہ تو اردو اکادمی کے ارکان اور نہ ہی متعلقہ کمیٹی کے ممبران یہ جانتے تھے کہ یہ سب حضرات محض کاغذی شیر ہیں جو محض اپنی

...زیر ہونے کے بل بوتے پر طنز و مزاح نگار تسلیم کئے جاتے ہیں
تقریری طور پر یہ کچھ بھی نہیں۔ ہم نے پہلے بھی لکھا تھا
اردو اکادمی کی مختلف کمیٹیوں کے ممبران کو چاہئے
کہ اپنے آپ کو ہمہ داں نہ سمجھیں بلکہ ہر معاملہ کے
ماہر حضرات کو مشورہ کے لئے کمیٹی کی میٹنگ میں
مدعو کر لیا کریں جو انھیں مفید مشورے دے سکیں کہ کون
فنکار کامیاب رہے گا اور کونسا نہیں ـــــ مگر یہ
ممبران غالباً اس میں اپنی سبکی سمجھتے ہیں اور جس کا
نتیجہ ہے کہ اس جشن طنز و مزاح پر کئی ہزار روپے
خرچ ہو گئے اور تقریب ٹھس ہو کر رہ گئی۔

کہاوت ہے کہ جس کا انجام اچھا اس کا سب اچھا۔
دہلی اردو اکادمی کی گزشتہ سال کی اس تقریب
کی ناکامی نے اکادمی کی دیگر تقریبات کی کامیابیوں
پر بھی پانی پھیر دیا۔ لہٰذا اب یہ بھی کہا جانا چاہئے کہ
جس کا انجام برا اس کا سب برا۔

بہر منفعت

گیتا صرف ہندوؤں کی کتاب نہیں بلکہ تمام اقوام
عالم کی کتاب ہے کیونکہ یہ مشعل ہدایت ہے
تمام زمانوں اور ہر ہستی انسانی پر صداقت، حسن و
محبت اور ہر جذبۂ پستی و پست ہمتی پر ایک غیر فانی
مثالی اور بے مثال تشخص ہے۔ جو ارجن کی معرفت
ہر فرد، ہر جماعت، ہر قوم، ہر ملک، ہر مذہب
پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ گیتا کی عظمت و فضیلت کا
اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ خود بھگوان
اس کی نسبت یوں ارشاد فرماتے ہیں۔

۱۔ جو شخص اس گیتا شاستر کو میرے بھگتوں میں پھیلائے
گا بلا شبہ مجھ کو پراپت ہوگا
۲۔ جو شخص میرے بھگتوں میں گیتا کا اپدیش کریگا
اس سے بڑھ کر اور کوئی میرا دل پسند کام کرنے والا
نہ ہوگا۔ اور نہ اس سے بڑھ کر پرتھوی پر میرا کوئی پیارا
نہیں ہوگا۔

۳۔ ہے ارجن! جو شخص اس دھرم میں ہم دونوں
کے سمواد روپی گیتا شاستر کا نیتو پاٹھ کرے گا تو میں
یہ سمجھوں گا کہ اس نے گیان یگیہ دوارا میرا پوجن کیا ہے۔

۴۔ جو پُرش شردھا پوروک اس گیتا شاستر کو سنے
گا وہ بھی پاپوں سے مکت ہو کر اُتم کرم کرنے والوں
کے شریشٹ لوکوں کو پراپت ہوگا۔

اسی اہمیت و فضیلت کا کرشمہ ہے کہ دنیا بھر
کی زبانوں میں گیتا کے تراجم ہو چکے ہیں۔ گیتا کا فارسی
منظوم ترجمہ علامہ فیضی کے قلم سے نکلا ہوا "آہنگ سرمدی"
کے نام سے مشہور رہا ہے۔ اردو میں گیتا کے متعدد تراجم
ہو چکے ہیں۔

چنانچہ ڈاکٹر محمد عزیز نے اپنی کتاب "اسلام کے علاوہ
مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ" میں گیتا کے اٹھارہ
اردو تراجم کی نشاندہی کی ہے ان کے نزدیک گیان
پرکاش مصنفہ منشی کنہیا لال عرف الکھ دھاری گیتا
کا پہلا اردو ترجمہ ہے جو ۱۸۶۳ء میں گیان پریس
اکبرآباد میں چھپا۔ سخاوت مرزا نے گیتا کے ایک ترجمے
کی نشاندہی کی ہے۔ جس کا نام "کرشن گیتا" "ارجن
گیتا" بتایا ہے سید متین نے گیارہویں صدی ہجری میں
دکنی میں ترجمہ کیا ہے۔ گمان غالب ہے کہ سید متین کی گیتا
اور گیان پرکاش سن طبع ۱۸۷۳ء کے درمیانی وقفہ
میں بھی گیتا کے تراجم ہوئے ہوں گے ویسے جن تراجم
گیتا کا علم ہو سکا ان کی تعداد چوبیس (۲۴) ہے
ایسے عالم میں گیتا کے مزید ترجمے کی ضرورت محسوس نہیں
ہوتی۔ مگر میری درخواست پر ابوالبلاغت حضرت
رتن پنڈوروی نے مندرجہ ذیل اوصاف کو مدنظر رکھتے
ہوئے گیتا کا منظوم ترجمہ فرمایا ہے کہ ہر اُدھیائے کا ہر
شلوک نہایت آسان الفاظ میں رواں دواں ہو اور ہر

پڑھنے والے کو ہر شلوک کا اصل مطلب بار خود سمجھ میں آتا جائے۔ قبلہ رتن صاحب نے واقعی یہ مدعا ہر گام پر پیشِ نظر رکھا کہ اشلوک کی وضاحت کا حق کما حقہٗ ادا ہو جائے اس مدعا کے زیرِ اثر اشعار کا تعین نہیں کیا گیا۔ اشلوک کی پوری تشریح جتنے اشعار میں ہوئی اتنے ہی کہے گئے ہیں۔ بعض جگہ صرف ایک شعر ہی رہا۔ بعض مواقع پر دو شعر کہیں جگہ ایک اشلوک کے لئے تین اور بعض پیچیدہ مقامات پر چار اشعار بھی کہے گئے ہیں اور ایک دو جگہ ایک اشلوک پانچ شعروں میں بالتوضیح سما گیا ہے۔

"سرِ مغفرت" گیتا کا ایسا منظوم ترجمہ ہے جس میں اردو کی کس مپرسی پر نظر کرتے ہوئے حتی الامکان فارسیت سے پرہیز کیا گیا ہے نہایت سیدھے سادھے الفاظ میں بات ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض جگہ فارسی الفاظ کے بغیر کام نہ چل سکا۔

"سرِ مغفرت" ایسا ترجمہ ہے جو سنسکرت نسخہ مطبوعہ شریمد بھگوت گیتا پریس گورکھپور سے کیا گیا ہے۔

سرِ مغفرت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ترجمہ شروع کرنے سے پہلے وید وں اپنشدوں، برہمن گرنتھوں نیز دوسرے دھارمک گرنتھوں سے منتخب کر کے چند ایسے امور کا اضافہ کر دیا ہے جو گیتا کے مطالب سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ اور انسانی معلومات کا دائرہ وسیع کرتے ہیں۔ سرِ مغفرت کو شائع ہوئے ابھی ایک ماہ ہوا ہے اور ایک صد سے زائد خطوط ہمارے پاس ایسے علم دوست اور مذہب پرست نیز عالموں اور دانشوروں کے موصول ہوئے ہیں جنھوں نے "سرِ مغفرت" کو گیتا کا ایک ایسا بہترین منظوم ترجمہ قرار دیا ہے کہ جس سے واقعی گیتا کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے اور اکثر و بیشتر پڑھنے والوں نے "سرِ مغفرت" کو اردو زبان میں شائع شدہ گیتا کے منظوم ترجموں میں اولیں حیثیت کا حامل قرار دیا ہے اور شانِ ہند کی اس پیش کش کو اس لئے مستحسن گردانا ہے

کرتا جبکہ مذہب کو غلط انداز میں پیش کر کے فرقہ واری کو تقویت دی جا رہی ہے "سرِ مغفرت" کے ذریعہ شریمد بھگوت گیتا کی اصل روح کو پیش کیا گیا ہے کہ شریمد بھگوت گیتا زندگی کے جملہ مسائل کا بہترین، کامیاب اور لاجواب حل پیش کرتی ہے فلسفۂ حیات کی مکمل و مشرح تفسیر بالحقیقت گیتا ہی ہے "سرِ مغفرت" کو آپ پڑھتے وقت یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ "ویدانت" کے سلسلے میں گیتا اپنا جواب آپ ہے اور تصوف کی اسلامی تشریح اس سے الگ نہیں ہے"

گوشۂ عقیل صدیقی

مشاعرہ میلہ چھڑیاں کیرانہ

کریمی الاحسانی

۱۹۸۳ء میں بوجہ علالت مشاعروں سے دور ہی رہا آج بھی کچھ حالت ایسی ہی ہے لیکن یہ سوچ کر کہ اس بہانہ احباب سے ملاقات بھی ہو جائے گی کیا خبر کل کیا ہو اس مشاعرہ میں شرکت کر رہا ہوں آپ کا کریمی الاحسانی آپ سے مخاطب ہے یہ کیرانہ (مظفر نگر) ہے

۲۵ مارچ ۱۹۸۴ء کی شب ہے میلے میں ایک بڑا اور وسیع پنڈال ہے۔ گیارہ بج چکے ہیں اور پنڈال میں سامعین اور حاضرین کی سرگوشیاں ہی نہیں بلکہ احتجاجی شور و غل اس اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ اب مشاعرہ شروع کرا دیا جائے مجوزہ صدر صاحب ابھی تشریف نہیں لائے ہیں لہذا مظفر زیدی کیرانوی عارضی طور پر صدارت کے لئے حکیم سید ذیشان مظفر نگری کا اسم گرامی پیش کر رہے ہیں اور نظامت کے لئے نور جہاں ثروت کو زحمت دے رہے ہیں جس پر تالیوں سے ان کا خیر مقدم کیا جا رہا ہے چونکہ یہ مشاعرہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی یاد میں منعقد ہوتا ہے خواجہ غریب نواز علیہ الرحمتہ نے کیرانہ میں تین دن قیام فرمایا تھا ان کی یاد میں یہ میلہ اور مشاعرہ ہوتا ہے اس مشاعرہ کا آغاز ہمیشہ ہی نعت شریف سے ہوتا ہے لہذا الحاج شمیم جے پوری نعت شریف پیش کر رہے ہیں۔

پھر اسی طرح میں آج مدینے میں آ گیا
جیسے مدینہ خود مرے سینے میں آ گیا
میں اپنے گھر سے چل کے آج مدینے میں آ گیا
طوفان سے نکل کے سفینے میں آ گیا
دیوانہ صحنِ کعبہ میں بے اختیار تھا
طیبہ کی حد میں آ کے قرینے میں آ گیا
مدت سے دفن تھا جو گناہوں کی خاک میں
وہ آج رحمتوں کے خزینے میں آ گیا
ایسی پلائی ساقیٔ بیت الحرم نے آج
زمزم کا رنگ میرے پسینے میں آ گیا

نعت شریف بڑے خشوع و خضوع سے سنی گئی اور پھر سنا شمیم صاحب کا تھا سماں باندھ دیا اب ثروت صاحبہ اس رنگ کو دو آتشہ کرنے کے لئے راغب عالم مظفر نگری کو دعوتِ سخن دے رہی ہیں۔ عالم صاحب یوں نغمگی کا مظاہرہ کرتے چلے ہیں۔

آ جا کہ یہ منزل بڑی دشوار لگے ہے
اک شب کا بھی مہمان ترا بیمار لگے ہے
یہ کون سی منزل ہے تباعشق کی جاناں
جس پھول کو چھوتا ہوں وہی خار لگے ہے
وہ مجھ سے خفا ہوئے مجھے کوئی گلہ ہو
ہر حال میں کمبخت و نادار لگے ہے
سجدے میں کروں کس کو پڑھوں کس کی نماز میں
جس در پہ بھی جاؤں وہ درِ یار لگے ہے
اس شہر میں اک تم ہی مسلماں نہیں عالم
واعظ بھی کسی بت کا پرستار لگے ہے

عالم صاحب مشاعرہ کا آغاز کچھ اس طرح کر گئے تالیوں کے شور میں جا رہے ہیں کہ پنڈال بھی انگڑائیاں سی لے رہا ہے اور اس عالم میں ڈاکٹر معوض علی میوحسن کیرانوی ایک طویل نظم ترنم کے ساتھ سنا کر پلٹ آئے اور حافظ شریعت اللہ بھی رواں دواں سنا کر چلتے بنے اب رنگِ محفل بدلنے کے لئے کوثر زیدی کیرانوی محفل کا

جائزہ لے کر غزل سرا ہیں ؎

وہ ہستیاں کہ جن کا نپ اٹھیں جو عادلیاں بھی تھیں
یہ اور بات چھپ کر وہی قاتلوں میں تھیں

مطلع پر پنڈال میں دوسرے مصرعے پر کچھ ابال سا آیا ہے تھوڑے سکوت کے بعد ارشاد ہوا ہے ؎

مشکل ہیں میرے خلوص کے قابل تو [illegible]
بغض و حسد کی پھر بھی خراشیں دلوں پہ [illegible]

پھر آہ اور واہ نے ہنگامہ کا روپ دھار لیا ہے اور آپ اسی اعتماد کے ساتھ سنا رہے ہیں ؎

قول و عمل میں فاصلے [illegible] جھلکتے
ہمدردیاں ہمارے لئے قاتلوں میں تھیں

دوسرے مصرعے نے پھر پنڈال کو اڑانے کی کوشش کی ہے اور کوثر صاحب تحمل سے کام لے کر چپ چاپ پلٹ آئے اور ایک وقفہ ایک اور، ایک اور کا نعرہ بلند کرتے ہیں ادھر ماجد صدیقی دریابادی غزل سرا ہیں ؎

جس چمن کے مہکتے پھول ہیں ہم
اس چمن ہی میں کیوں ملول ہیں ہم

کیا غرض ہم کو اب زمانے سے
آپ کے راستے کی دھول ہیں ہم

آپ دیکھیں تو دل کی آنکھوں سے
محسن اخلاق کے اصول ہیں ہم

ماجد صاحب محفل کو گرما کر داد سمیٹے اپنی جگہ آ رہے ہیں یہ الگ بات کہ یہ غزل ان کی عمر سے کہیں بڑی ہے لیجئے اب ایک اور منفرد لب و لہجہ کے مترنم شاعر طاہر فراز غزل پیش کر رہے ہیں ؎

آپ نے جو یہ شوخ پرندہ پالا ہے
کیا یہ میرے مستقبل کا رکھوالا ہے
آہٹ سی محسوس ہوئی ہے آنکھوں کو
شاید کوئی آنسو آنے والا ہے

چاند نے جب سے اٹھایا ہے شاخوں کو
پیڑ کے نیچے بے ترتیب اجالا ہے
سانسوں کی رفتار بتاتی ہے طاہر
جانے والا لمحہ آنے والا ہے

طاہر صاحب تالیوں کی جھنکار میں کامراں پلٹ رہے [illegible] اسمٰعیل انجم کچھولوی فرما رہے ہیں ؎

ذروں کو مہر و ماہ بنائے ہوئے تو ہیں
وہ بزم کائنات پہ چھائے ہوئے تو ہیں
ہو یا نہ ہو قبول کوئی سجدۂ نیاز
سر اُن کے آستاں پہ جھکائے ہوئے تو ہیں
دامن بچا بچا کے کہاں تک چلے کوئی
گو ہیں ہزار خار چھپائے ہوئے تو ہیں

انجم صاحب مناسب داد وصول کئے جا رہے ہیں اور سلیم گھنتولوی اپنے مخصوص شاہانہ لحن ترنم سے نواز رہے ہیں ؎

ہمارا کس جگہ ماتم نہیں ہے
تمہاری آنکھ پھر بھی نم نہیں ہے
کوئی ساتھی کوئی ہمدم نہیں ہے
مگر خود اعتمادی کم نہیں ہے

اس شعر پر شاعرانہ داد دی جا رہی ہے اور آپ چیخ رہے ہیں ؎

شریفوں کے چلن اپنانے والو
شرافت کی سزا بھی کم نہیں ہے
نقیب شہر سے پوچھو تو لوگو
تری آواز میں کیوں دم نہیں ہے

پھر داد کا ایک دھماکہ ہوا ہے اور یہ شعر نورجہاں ثروت کی نذر کر رہے ہیں ؎

خدا شیطان سے محفوظ رکھے

اور لوگ تالیوں اور قہقہوں پر اتر آئے ہیں پنڈال میں ایک عجب نظارہ ہے اور سلیم صاحب فرما رہے ہیں ؎

مگر ان میں بھی کچھ کم نہیں ہے

اثر بازی کا وہی عالم ہے سلیم صاحب چلتے بنے اور اب آفتاب لکھنوی یوں کرتب دکھانے چلے ہیں ؎

وہ مجھ سے ہنس کے جو بولے تو مجھ کو پیار آیا
پھر اس کے بعد کئی روز تک بخار آیا
سوال یہ ہے بڑھاپے میں اب کہاں جائیں
ہر ایک شخص یہ کہتا ہے بھائی ٹل جاؤ
میں ان کے گھر پہ جو پہنچا تو ان کی ماں نے کہا
تمہاری عمر زیادہ ہے گھر سے ٹل جاؤ

آفتاب صاحب اور نہ جانے کیا کیا پینترے بازی اور رنگو کاری دکھا کر محفل کو قہقہہ زار بنا کر چپ چاپ کھسک آئے ہیں اور ڈاکٹر نرید وشسٹ مختلف اشعار سنا رہے ہیں ؎

وقتِ رخصت ہو گیا ساحل اداس
کشتیاں سب لوٹ کر آتی نہیں

دوست ہی بنیاد کے پتھر اٹھا لے جائیں گے
اس نگر میں آپ بھی اک گھر بنا کر دیکھئے

وہ اپنی دھن میں آپ گزرتی چلی گئی
کتنے دیئے بجھے ہیں ہوا کو خبر نہیں

اب زمانہ دیکھ ہی لے گا ہمارے گھر کا حال
راہگزر بھی آ گئے دیوار گر جانے کے بعد

شسٹ صاحب کو سنا بھی جا رہا اور داد و تحسین سے ازا بھی جا رہا ہے۔ دیکھا تو جلیل علوی کیرانوی باہر لا م آکر فرما رہے ہیں ؎

نزدیک دور دوست ہیں یہ مجھ کو یقین ہے
بیتاب جو سجدوں کے لئے میری جبیں ہے

داد اس مطلع کا حق ہے لہٰذا خوب خوب داد دی جا رہی ہے ارشاد ہوا ہے ؎

وہ حسنِ فسوں ساز مرے دل میں مکیں ہے
اب میری نگاہوں میں ہر اک چیز حسیں ہے

جلیل صاحب بھی بغل پیما تر آئے اور پلٹ رہے ہیں تالیوں کی جھنکار میں مظفر رزمی آکر غزل سنا رہے ہیں ؎

ہر ایک شخص تری چاہ کے گمان میں تھا
نہ جانے کونسا جادو تری زبان میں تھا
بلند و پست ہماری نظر میں کچھ بھی نہیں
زمیں پہ بھی وہی ہے جو آسمان میں تھا
پناہ اس کو میں دیتا تو کس طرح دیتا
حضور خود میں کسی اور کے مکان میں تھا
جو آج امارات کا ہے سوداگر
یہ کل کی بات کہ ٹوٹے ہوئے مکان میں تھا
مری خموش مزاجی جواب کیا دیتی
سوال پوچھنے والا خود امتحان میں تھا

رزمی صاحب کو جن حضرات نے سنا ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ مشاعرہ لوٹ لیتے ہیں لہٰذا یہاں بھی یہی عالم ہوا۔ اب اس کشمکش کے عالم میں میرا نام آیا ہے تعمیلِ حکم میں عرض کرتا ہوں ؎

استادِ محترم یہ گزارش ہے آپ سے
بارود رکھ دیجئے تختِ سیاہ پر
زیرِ بحث درسِ شانِ عطا کو دیکھئے
گولہ کوئی گرے نہ کہیں درس گاہ پر

جنوری کا دوسرا ہفتہ ہے سردی کا ہے شباب
ایسے عالم میں اتنا کچھ ہے [illegible] حال
ایک ٹولی ریزرون کی دور جنگل [illegible]
[illegible] جس طرح [illegible] حال

یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ کیرانہ میں ہر شاعر کو سنا جا

کسی کا مذاق تک نہیں اُڑایا جاتا ہے۔ آپ نے پھر ایک غزل
تمنا جمالی سے سُننے ترنم سے تو میں لطف اندوز ہو چکا ہوں

شبِ غم کی تیرگی سے کبھی تنگ آ کے روئے
کبھی دن کی روشنی میں غمِ دل چھپا کے روئے
اُنھیں یہ خبر بھی کب تھی کہ جلے گی ساری بستی
مرا گھر جلانے والے مرا گھر جلا کے روئے
نہ خزاں ہی مستقل ہے نہ بہار جاوداں ہے
کبھی روکے مسکرائے کبھی مسکرا کے روئے
یہ ثبوت کم نہیں ہے کہ اُنھیں بھی ہے محبت
وہ تڑپ کے اے تمنا مجھے کیوں رُلا کے روئے

تمنا صاحب محفل کو گرما کر واد سمیٹے اپنی جگہ آرہے ہیں
اور اب ایک اور منفرد غزل گو شاعر افتخار امام آرہے
ہیں تالیاں شباب پر ہیں اور آپ عطا کر رہے ہیں

اُبھرتے ڈوبتے لمحے تمام حیرت کے
میں خواب سوچتا رہتا ہوں اپنی ہجرت کے

سلسلہ در سلسلہ تقسیم کا
تیز ہے اتنا کہ سب بٹ جائیں گے

اچھا ہوا جو آپ نے وعدے بھلا دیئے
ہم نے بھی اپنے نام کے سب خط جلا دیئے

داد و تحسین کا عالم کچھ اور بھی ہے اور آپ اسی اعتماد
سے فرما رہے ہیں

آنکھوں میں انتظار کی شمعیں دھواں دھواں
لمحوں نے درد و غم کے سمندر بنا دیئے

افتخار صاحب تالیوں کی جھنکار میں کامراں پلٹ رہے
ہیں ایک اور ایک اور کے ہنگامے نے پھر آپ کو مختلف
اشعار سنانے پر مجبور کیا ارشاد ہوا ہے

اس میں کوئی شکوہ و شکایت نہ گلہ ہے
یہ بھی کوئی خط ہے کہ محبت سے بھرا ہے

لمحہ لمحہ مرا سراپا ہے جس نے تو نے مرا کال سنبھالی۔
جی رہے ہیں کہ کچھ نہیں ممکن
زندگی اب تو ایک گالی ہے

غم سے اس کا عجیب رشتہ ہے
ایک لڑکی جو بھولی بھالی ہے

پھر افتخار صاحب تالیوں کی جھنکار میں اپنی جگہ آرہے
ہیں اور اسی طرح تالیوں کے شور و غل میں راحت اندوری
آگئے ہیں فرمائش کا بھی ایک ہنگامہ اور شور و غل ہے
آپ سُنا رہے ہیں شعر کرتے ہوئے گرج اور برس رہے ہیں

اندھیری شب ہے تو اس میں خطائیں کس کی ہیں
چراغ میرا ہے لیکن ہوائیں کس کی ہیں
یہ کس نے موت کے پیروں میں ڈال دی زنجیر
یہ میرے نام پہ اتنی دعائیں کس کی ہیں

یہ سانحہ تو گزرنے والا تھا۔ میں بچ بھی جاتا تو اک روز مر
مرا نصیب ہے میرے ہاتھ کٹ گئے ورنہ
میں تیری مانگ میں سیندور بھرنے والا

دھوکا دیئے پہ ہونے لگا آفتاب کا
ذکرِ شراب میں بھی نشہ ہے شراب کا

میں پربتوں سے لڑتا رہا اور چند لوگ
گیلی زمین کھود کے فرہاد ہو گئے

راحت صاحب خوب خوب گرج برس کر تالیوں کے
ہنگامہ شور میں جا رہے ہیں اور اس نزاکت سے نبٹنے
کے لئے نور جہاں ثروت تالیوں کی جھنکار میں آ کر ترنم
سے فرما رہی ہیں

جی چاہتا ہے پھر کوئی پیکر تراشئے
فن کا تقاضا خموش ہے پتھر تراشئے

دریچے جو ہیں مکان چھتیں اُن کی نیچی ہیں
رہنا ہے ان میں آپ کو تو سر تراشئے

درد کا شور کم ہوا تو ارشاد ہوتا ہے —

بھلا رہے کتنے مگر یہ معاملہ کب تھا
اسے نہ یاد کریں اتنا حوصلہ کب تھا
ہر اک دور میں سچ بولے سنگسار ہوئے
ہمارے حق میں زمانے کا فیصلہ کب تھا

صدارت صاحبہ داد کی جھولیاں بھرے اپنا جگر آکر
ہمت سخن دے رہی ہیں شمیم جے پوری کو شمیم صاحب
تمام سُن کر تالیاں گونج اُٹھی ہیں اور فرمائشوں کا
تانتا ہی سلسلہ ہے لیکن شمیم صاحب اس ہنگامہ سے
بے نیاز غزل سرا ہیں —

اوروں کے غم مہلت دیں تو اپنا غم بھی یاد آئے
گردشِ دوراں سے چھوٹیں تو کوئے صنم بھی یاد آئے
اُن کو ہماری یاد آئے تو طرزِ ستم بھی یاد آئے
لیکن ہم اس بات پہ خوش ہیں آج تو ہم بھی یاد آئے
ساقی کی جنبشِ لب سے سب کی توبہ ٹوٹ گئی
میخانے میں آج تو ہم کو شیخِ حرم بھی یاد آئے

شمیم صاحب دو غزلیں اور سنا کر پنڈال کو معطر
کر کے مشاعرہ میں جان ڈال کر پلٹ رہے ہیں اب
اس امتحان گاہ میں مشیر جھنجھانوی آکر حسبِ عادت
سنجیدگی سے عطا کر رہے ہیں —

زخم در پردہ ہمارے جسم پہ آئے بہت
زندگی نے پھول کہہ کر سنگ برسائے بہت
کیسے کیسے زاویوں سے روشنی ڈالی گئی
دوستوں سے بات کہہ کر ہم تو پچھتائے بہت
اب مرے گھر سے کوئی دیوار ملتی ہی نہیں
تھا اسی بستی میں کل تک میرے ہمسائے بہت
رفتہ رفتہ بے لباس اپنی عادت بن گئی
اجنبی ماحول میں پہلے تو گھبرائے بہت

مشیر صاحب داد و تحسین پا کر اپنی جگہ آ رہے ہیں۔ دو بج کر چالیس منٹ پر پہلا دور ختم ہوا۔ ساتھ ہی دوسرے دور میں شعرائے کرام کو خوب خوب تقریباً ساڑھے چار بجے تک سنا گیا۔ اگر فجر کی اذان اور نماز کا وقت نہ ہو تو یہ مشاعرہ یقیناً نہ جانے کب تک چلے۔!

گزشتہ سال سلسلہ ہوا امتیاز مشاعرہ۔ امسال بھی کچھ ایسے ہی حالات بن رہے تھے لیکن مظفر رزمی۔ کوثر زیدی۔ شمیم علوی ایڈوکیٹ اور صغیر مینائی نے ذرا ہمت کی اور اس مشاعرہ کو اہلِ قصبہ اور ادب نواز حضرات کو سنوا ہی دیا۔ اچھا اب اجازت دیجئے میں بھی دل کا مریض ہوں آرام کروں گا اور ساتھ دعا کی درخواست بھی کروں گا۔ ع

بیت گیا وقت نہیں سمجھوں کہ پھر ابھی نہ سکوں

تذکرہ شعرائے اجین

محمد خالد عابدی اندور

غوث محمد غوث اجینی

غوث محمد غوث اجینی:- آپ سنہ ۱۹۱۱ء میں اجین میں پیدا ہوئے سنہ ۱۹۲۵ء سے شعر و سخن میں دلچسپی پیدا ہوئی جب شعر کہنے لگے تو پہلی غزل استاد عظیم کو دکھائی جب استاد عظیم رحلت فرما گئے تو سید کرامت علی بشر سے سلسلۂ تلمذ قائم کیا۔ بشر مرحوم کے بعد عبدالغفور گویا فرنگی اجینی سے مشورہ سخن جاری رکھا بقول سلطان احمد صدیقی "آپ نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر آپ غزل کے شاعر ہیں تحت میں پڑھتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں بزم محمودیہ اور بزم ادب میں سکریٹری نشر و اشاعت کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں سلاست و روانی آپ کے کلام کا خاص جوہر ہے۔"

اجین کی بیشتر بزموں نے آپ کی ادبی خدمات کے اعتراف میں مدھیہ پردیش سرکار سے اپیل کی تھی کہ وہ غوث محمد غوث اجینی کا وظیفہ مقرر کرے۔ چنانچہ روزنامہ آفتاب جدید بھوپال (حضرت غوث اجینی کو سرکاری امداد و پنشن پر مبارک باد- ۸ ستمبر سنہ ۱۹۸۱ء ص ۴) میں خبر دیکھنے کا اتفاق ہوا کہ جناب غوث اجینی کی پچاس سالہ اردو زبان و ادب کی خدمات کے اعتراف میں حکومت مدھیہ پردیش نے موصوف کو دو ہزار روپے امداد اور دو سو روپئے ماہوار پنشن منظور فرمائی ہے۔ نمونۂ کلام سے

کرے گا کون فریاد و فغاں جب ہم نہیں ہوں گے
ستم ڈھائے گا کس پر آسماں جب ہم نہیں ہوں گے

لئے بیٹھے ہیں ہم دل میں ابھی تک راز کی باتیں
تمھارا کون ہوگا رازداں جب ہم نہیں ہوں گے

ہر اک موقع پہ ہم اہل خرد کا ساتھ دیتے تھے
بہت پچھتائے گا ہندوستاں جب ہم نہیں ہوں گے

ہمارے دم قدم سے ہے ترا آباد میخانہ
اڑے گی خاک اے پیر مغاں جب ہم نہیں ہوں گے

اشاروں پر تمھارے اپنی ہستی کو مٹایا ہے
وفا کا کون دیگا امتحاں جب ہم نہیں ہوں گے

ابھی ہم رہنمائی کر رہے ہیں بڑھ کے منزل کا
بھٹکتا ہی رہے گا کارواں جب ہم نہیں ہوں گے

ہمیں نے آج تک محفوظ رکھا غنچہ و گل کو
رہے گا کون اس کا پاسباں جب ہم نہیں ہوں گے

ہمیں نے اس کو شہرت دی سارے زمانے میں
بہت پچھتائے گی اردو زباں جب ہم نہیں ہوں گے

گل ہزاروں ہیں باغباں تنہا
کیا کرے نظم گلستاں تنہا

بجھ گئے میری آہ کے شعلے
آسماں پر گیا دھواں تنہا

میری بدقسمتی ارے توبہ
دشمنوں کے ہوں درمیاں تنہا

بجھ گئے خود جلا کے پروانہ
شمع دیتی رہی دھواں تنہا

اب کہاں درس حضرت گویا
میں پھروں گا کہاں کہاں تنہا

سانپ کی دو زبان ہوتی ہے
غوث کے منہ میں ہے زباں تنہا

ریاض احمد جوہر

ریاض احمد جوہر:- آپ سنہ ۱۹۱۲ء میں اجین میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد اجین کے مشہور وکلا

میں شمار کئے جاتے تھے۔ ریاض احمد کو پندرہ سولہ سال کی عمر سے شاعری کا شوق ہوا تو اُستاد سید کرامت علی بشر کے سایۂ تلمذ میں پہنچے۔ اُستاد نے جوہر تخلص تجویز کیا۔ اپنی غزل کے مقطع میں اُنھوں اس رشتۂ تلمذ پر فخر کیا ہے

خوبیٔ قسمت سے جوہر مل گئے حضرت بشر
مدتوں سے تھی مجھے اُستادِ کامل کی تلاش

آپ کا کلام آفتاب، مالوہ انجمن، کے علاوہ ہندوستان کے دیگر رسائل میں بھی نکلتا تھا۔ جوہر نے یوں تو سب ہی اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی تھی لیکن نظم نگاری کی طرف اُنھوں نے خصوصی توجہ کی ہے سُلطان احمد صدیقی نے اُن کے مختصر تعارف اور خدمات میں لکھا ہے کہ۔

"آپ کی نظموں میں محاکات۔ تشبیہ و استعارہ، سلاست صفائی صحت زبان اور فصاحت کا خاص خیال رہتا تھا۔ حضرت جوہر کا شمار بشر کے بہترین شاگردوں میں کیا جاتا تھا ۱۹۴۷ء میں تقسیم وطن کے بعد پاکستان چلے گئے کراچی میں آپ کے صاحبزادہ اچھے عہدہ پر ملازم تھے ۱۹۶۰ء میں مختصر علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ جوہر صاحب نے اپنے مجموعۂ کلام کو ترتیب دیا تھا لیکن افسوس کہ آپ کی زندگی میں وہ شائع نہ ہو سکا" نمونۂ کلام سے

صبح کا پُر کیف منظر

فضائے دہر سے جب ظلمتِ شب کے قدم اُکھڑے
نظر آئے سپیدیٔ سحر کے ضوفشاں جلوے
زمیں پر روشنی خورشید عالم تاب کی پھیلی
ہر اک شئے عالم ارکاں میں خواب ناز سے جاگی
نمایاں ہو گئے ہر جا مسرت بخش نظارے
کھلے ہر شاخ پر گلشن چمن میں زر بکف غنچے
پروئے جاتے ہیں سب قطراتِ شبنم جذب پھولوں میں
بہاریں باغ جھولا جھولتی پھرتی تھیں جھولوں میں
چمن میں غنچہ و گل کے شگفتہ ہو گئے چہرے
لگے اٹھکھیلیاں کرنے نسیمِ سرد کے جھونکے
مسرت سے جھکی ہر شاخ نخل نو رسیدہ کی
عجب انداز سے ہے رقص میں ہر لہر شیرا کی
یہاں تو سبزہ خوابیدہ جاگا صحنِ گلشن میں
وہاں بلبل نے انگڑائیاں لیں اپنے نشیمن میں
اِدھر تو ناز سے ہنس کر کہا کچھ غنچہ و گل نے
اُدھر گایا خوشی میں نغمۂ پُر کیف بلبل نے
کھلے ہیں جا بجا میخانۂ فطرت کے دروازے
پئے جاتے ہیں ساغر بادہ ہائے عیش و عشرت کے
خمارِ خواب چشمِ نیم وا سے جب ہوا رخصت
ہوئے معروف مردم اپنے کاموں میں بصد حسرت
کرن مشرق سے جب ظاہر ہوئی خورشید خاور کی
کھینچی تصویر جوہر صبح کے پُر کیف منظر کی

اس طرح پہلو میں تھی اُن کو مرے دل کی تلاش
جیسے ہو گم کردہ منزل کو منزل کی تلاش
رہنمائے منزل اُلفت ہے خود وحشت مری
کیوں کروں بے فائدہ میں خضرِ کامل کی تلاش
دیکھنا یہ ہے کہ کس کی جستجو ہو کامیاب
یار کو ہے فکر خنجر مجھ کو قاتل کی تلاش
اپنے دل میں ڈھونڈلے ہے شوق نظارہ اگر
کیوں ہے اے مجنوں تجھے لیلیٰ کے محمل کی تلاش
آئینہ کو دیکھتے ہی محو حیرت ہو گئے
مدتوں سے تھی اُنھیں مدِ مقابل کی تلاش
خوبیٔ قسمت سے جوہر مل گئے حضرت بشر
مدتوں سے تھی مجھے اُستادِ کامل کی تلاش

تارا چرن رستوگی

اوزانِ رُباعی۔

اردو عروض کا معرضِ وجود میں آنا بالعموم نیز بالخصوص شعرِ فارسی میں مروجہ عروض کا مرہونِ منت ہے رُباعی نگاری بھی فارسی کے زیرِ سایہ پروان چڑھی، نتیجتہً اردو رُباعی نے فارسی میں مستعمل اوزانِ رُباعی کو گلے لگایا۔ اصطلاحاً، رُباعی ایسی صنفِ شاعری ہے جس کے چار مصرعوں میں ایک مکمل مضمون پیش کیا جاتا ہے پہلے دوسرے مصرعے میں قافیہ لانا ضروری سمجھا جاتا ہے تیسرے مصرعے میں اگر قافیہ نہ بھی ہو تو کوئی حرج نہیں محمود شیرانی نے لکھا ہے کہ۔

"قدیم الایام میں ایران میں ایک خاص قسم کی نظم جس کو چہار بیتی کہا جاتا تھا۔ رائج تھی۔ اس کے اوزان عربی اوزان سے غالباً مستخرج نہیں بلکہ ایران زاد اور مقامی معلوم ہوتے ہیں قدما ہزج کے ذیل میں ان کا شمار کرتے ہیں تعداد میں وہ چار شعر ہوتے تھے اور چاروں شعروں میں قافیہ لانا ضروری سمجھا جاتا تھا متاخرین نے اس میں یہ ترمیم کی کہ اس کے وزن مربع کو مثمن قرار دیا جس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ ان چار ابیات کی تعداد دو شعروں میں محدود ہو گئی۔ ...... چوں کہ ہزج عربی میں مربع الارکان آتی ہے، اس بنا پر اس کو رباعی کہنے لگے، یہ صحیح نہیں کیونکہ عربی میں بہ ایک بحر تو نہیں ہے جو مربع آتی ہے اس میں تو اکثر بحریں مربع استعمال ہوتی ہیں پھر ہزج کی کیا خصوصیت رہی۔ اس کے علاوہ رُباعی کی ابتدا فارسی سے ہوتی ہے نہ کہ عربی سے اس لئے اس کا نام رکھنے میں عربی خوانوں نے چہار بیتی کی تقلید کی ہے......"

(تنقید شعر العجم)

ملحوظ رہے کہ عربی خوانوں نے ترانہ، چہار بیتی یا دو بیتی کا عربی نام "رُباعی" رکھ لیا۔ فارسی حوالہ جات بھی ملاحظہ ہوں۔

۱۔ "بہ آنکہ وزنِ رُباعی کہ آں را دو بیتی و ترانہ نیز گویند بحرِ ہزج بروں آمد و آں را عجم پیدا کردہ اند و بر بیت و چہار نوع آوردہ" (عروضِ سیفی ۸۹۶ھ، ص ۸۹۶)

۲۔ "باید دانست کہ رُباعی را شعرائے عجم اختراع نمودہ اند و آں را ترانہ و دو بیتی نیز نامند" (حدائق البلاغت لاہور، ۱۹۲۰، ص ۱۱۴)

۳۔ "...... و رُباعی از مخترعات اہلِ عجم است بہ ہزج اختصاص می دارد" (شجرۃ العروض از اسیر نول کشور پریس، ۱۸۷۳ء، ص ۵۶)

۴۔ "...... رباعی نوع خاصی از شعر است کہ ایرانیان اختراع (کردہ) اند" (رباعیات خیام نیشاپوری مؤلفہ فروغی و غنی، تہران، ۱۳۲۱ھ)

۵۔ "...... کہ رباعی از مخترعات فصحائے عجم است (رسالہ در عروض و قوافی از مولوی شمس الدین محمد فقیر، قلمی نسخہ کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ)۔

۶۔ "...... وزنِ رُباعی کہ آں را دو بیتی و ترانہ نیز گویند از بحرِ ہزج بیروں می آید و آں را عجم پیدا کردہ" (رسالہ در عروض، عبداللہ ضیاء الدین الخوزی و اسمٰعیل حجم کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ)

اردو ادیبوں نے بھی صنفِ رُباعی کو فارسی نژاد بتایا ہے۔

۱۔ "عرب میں رُباعی کا دستور نہ تھا۔ شعرائے عجم نے یہ وزن ہزج میں سے نکالی" (بحر الفصاحت نجم...

نولکشور پریس، ۱۹۲۶ء)

۲- "رباعی فارسی ادب کی پیداوار ہے" (جدید اُردو شاعری مصنف عبدالقادر سروری ۱۹۳۲ء)

۳- "رباعی کا ایک وزن ہے۔ عرب میں دستور نہ تھا سوائے عجم کے کہ یہ بحر ہزج میں سے نکالا ہے" مفعول مفاعلن فعولن" مسدس اخرب مقبوض مقصور اس وزن پر فعلن بڑھا دیا ہے۔ مفعول مفاعلن فعولن فعلن۔ زحافات اس میں بعض کے نزدیک ۱۸ ہیں اور بعض کے نزدیک ۲۴ ہیں . . . ." (نکاتِ غالب۔ مرتبہ نظامی بدایونی ۱۹۵۹ء، ص ۲۸)

۴۔ تلوک چند محروم کے مجموعہ رباعیات میں اقبال نے دیباچہ میں رباعی کی بابت اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے لکھا ہے کہ فارسی شاعری میں رباعی بہت پرانی چیز ہے عروضیوں نے تو اس کی بحر کو عربی اوزان سے نکالا ہے لیکن جدید تحقیقات نے یہ عقیدہ پیدا کر دیا ہے کہ رباعی کا وزن اسلامی زمانے سے پہلے کا ہے . . . . یہ مسلم ہے کہ رباعی خالص ایرانی چیز ہے وہ ایران ہی میں پیدا ہوئی اور وہیں اس نے پرورش پائی۔ اس کا نام اگرچہ عربی ہے لیکن یہ نام اسے بہت بعد کے زمانے میں دیا گیا"

اقبال کی رائے خاصی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ کلام اقبال میں ایسی رباعیاں بھی ملتی ہیں جو رباعی کے مروجہ اوزان پر نہیں کہی گئیں ملاحظہ ہو۔

خرد کی تنگ دامانی سے فریاد
تجلی کی فراوانی سے فریاد
گوارا ہے اسے نظارۂ غیر
نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے
— ارمغانِ حجاز

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دست تو کار نادر آید
گنا ہے ہم اگر باشد ثواب است
— پیامِ مشرق

اقبال کے یہاں ایسی رباعیاں بھی ملتی ہیں جو رباعی کے اوزان پر پوری اترتی ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ "مفاعیلن مفاعیلن فعولن" پر کہی گئی (محولہ بالا) کو رباعیات کے تحت رکھا؟ غالباً اقبال کو یہ معلوم تھا کہ اوزانِ رباعی کی جکڑ بندیاں "الہی گفت و دیوانہ باو گر د" کے تحت ہی آتی ہیں،

حلقۂ شوق میں وہ جراتِ اندیشہ کہاں
آہ محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق

محکومی و تقلید اور زوالِ تحقیق کی وجہ سے رباعی کے اوزان کو پتھر کی لکیر سمجھ لیا گیا۔ عروضیات کو صحیفۂ آسمانی سمجھنے والے جو کچھ بھی کہیں۔ حصارِ کم نظری و عدم کارآگہی میں بند بنجم خود مابہ بن عروض بے سبب است، وقدیے کو آیت و حدیث سمجھتے ہوئے رباعی کے صرف ۲۴ اوزان بتلاتے ہیں بحر ہزج کے دائرۂ اخرم جس کا پہلا رکن مفعولن ہے اور دائرہ اخرب جس کا پہلا رکن مفعول ہوتا ہے دونوں کے اشتراک سے بحر الغنی کے نزدیک ۲۴۲۴۹ شکلیں اوزان نمودار ہوتے ہیں طوالت اور اوزانی خرافات سے بچنے کا ایک گر یہ بتایا جاتا ہے کہ رباعی کا پہلا رکن مفعولن یا مفعول اور آخری رکن فع / فاع / فعلن / فعول میں سے کوئی ایک ہوگا۔ درمیانی دو ارکان مفعولن، مفاعلن، مفاعیل، مفعول، فاعلن سے لئے جا سکتے ہیں۔ چاروں مصرعے ایک وزن میں نہ ہوں تو کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا۔ ملحوظ رہے سبب بے سبب است، و قصے بے ذوند است والبتہ بحر کے فقرا اس گر کو نادرست سمجھتے ہیں۔

کا رُباعی سے متعلق اوزان افق درج ذیل ۲۴ اوزان تک محیط رہتا ہے۔

دائرہ اخرم

مفعول	مفاعلن	مفاعیلن	فاع
"	مفاعیل	"	"
"	"	مفاعیل	فعل
"	مفاعیلن	مفعول	فاع
مفعول	مفاعلن	مفاعیلن	فع
"	مفاعیل		
"	مفاعیلن	مفعول	فعول
"	"	مفعولن	فع
"	"	مفعول	فعل
"	مفاعیل	مفاعیل	فعول
"	مفاعلن	"	فعول
"	"	"	فعل

دائرہ اخرب

مفعولن	فاعلن	مفاعیلن	فاع
"	مفعول	"	"
"	فاعلن	مفاعیل	فعل
"	مفعولن	مفعولن	فاع
"	"	"	فع
"	فاعلن	مفاعیلن	فاع
"	مفعول	مفاعیل	فعول
"	"	مفاعیلن	فع
"	مفعولن	مفعول	فعل
"	مفعول	مفاعیل	فعل
"	فاعلن	"	فعول
"	مفعولن	مفعول	فعل

چاروں مصرعے درج بالا اوزان میں سے کہے جا سکتے ہیں بعض عروض داں یہ بھی کہتے ہیں کہ تینوں یا چاروں ہم قافیہ ہوں تو انھیں رباعی کہنا درست نہیں۔ لیکن عہدِ حاضر میں ان سب پر عائد کردہ پابندی عملاً اُٹھ چکی ہے۔ مزید برآں نیز بزعم خود عروض داں اکثر و بیشتر ایسے شعر کہتے نہیں دیکھے گئے۔

عالمی عروضیات سے واقف کار ادبا اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ مرورِ ایام سے شکست و تعمیر کا سلسلہ چلتا رہتا ہے شعر ہیئتیں بھی مستثنیٰ نہیں رہ سکتیں۔ تعمیر کے بعد تخریب اور تخریب کے بعد تشکیلِ جدید کائنات کا اصول ہے۔ مثال کے طور پر قطعہ کو لیجئے روایت یہ تھی کہ قطعہ کو ہیئت اور معنی کے اعتبار قصیدہ یا غزل مسلسل خیال کیا جاتا تھا۔ قصیدہ اور غزل میں مطلع کا ہونا لازمی ہے جو قطعہ میں عموماً نہیں آتا۔ لیکن آج کل دو اشعار پر مشتمل قطعے کہے جاتے ہیں۔ اور ان کا معنوی رتبہ، نیز دروبست رباعیات سے مختلف نہیں ہوتا رباعی و قطعہ کے درمیان سرحد معنوی اعتبار سے معدوم ہوتی چلی جا رہی ہے قطعہ نگاری اور رباعی نگاری کے مابین معنوی سطح پر تمام تر فرق مٹ چکے ہیں۔

رباعی سے متعلق ایک سوال یہ اٹھتا ہے کہ چونکہ یہ صنعت فارسی نژاد ہے اور فارسی و سنسکرت دونوں زبانیں ایک ہی لسانیاتی خاندان سے واسطہ رکھتی ہیں۔ لہٰذا ایرانی فارسی یعنی ژند اور ویدک زبان جس سے بہت بعد سنسکرت کا ارتقا ہوا دونوں کے عروضیاتی نظام پر نظر ڈالنا ضروری ہے یا نہیں۔ یہ سوال معمولی سوال نہیں ہے کیونکہ اس کو حل کرنے کے لئے ویدک زبان اور ژند کی عروضیاتی تنظیم کو تاریخی ادوار و بیاتی تناظر میں دیکھنا ہوگا جو ظاہر ہے نہایت مشکل کام ہے دونوں زبانوں کے عروض کا گہرا مطالعہ اور دونوں کے ادبیات کا مرحلہ وار عمیق مطالعہ نہایت ضروری ہے قیاس یہ ہے کہ سنسکرت کا

چھند "رولا" रोला جس میں چار بیتی شلوک نظم کئے جاتے تھے ژند میں بھی مروج تھا۔ زرتشت کے مذہبی صحیفہ اوستا کے یشت جو یشتن مصدر سے مستخرج ہیں چار بیتی ہیں۔ یشت اور شلوک "رولا" چھند میں نظم کئے جاتے رہے اور ان میں ورن اور ماتراؤں کی تعداد ۲۴ اوزان سے کہیں زیادہ ہوتی ہے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رُباعی پہلے رولائی کہی جاتی ہوگی ر۔ل۔ب۔ب۔ ل یعنی ی۔ ر ل۔ ب۔ چونکہ ہم مخرج حرف ہیں اور ان میں صوتیاتی قربت ہے "رولائی" سے "روبائی" اور مسلم عہد اقتدار میں "روبائی" کا معرب ہو کر عربی شکل "رباعی" تک پہونچنا سمجھ میں آتا ہے الغرض "رولا" اور "روبائی" تک بحث کو پیش نظر رکھتے ہوئے ژند اور ویدک عروضیات سے مخاطب ہونا جوئے شیر لانے سے کم مشکل کام نہیں ہے۔ رولا چھند ملحوظ رہے کہ متر نم تنظیم شعر (लयात्मक छंद) کہلاتا ہے یعنی ایسا چھند جو ماتراؤں (मात्राओं) اور ورنوں (वर्णों) کی تعداد پر منحصر نہ ہو کر ترنم پر تکیہ کرتا ہے شلوک (چار بیتی) بالعموم اسی چھند میں نظم کئے جاتے تھے یہی وجہ ہے کہ بابا طاہر کی رباعیاں ماثی سے متعلق ۲۴ اوزان یا محذوفات سے پیدا شدہ ان سے زائد تعداد اوزان کے تحت نہیں ہیں۔ اقبال کا یہ اجتہاد کہ انھوں نے رباعیاں ایسے اوزان پر بھی کہی ہیں جو رباعی کے اوزان نہیں ہیں۔ درخور اعتنا ہے امید کہ اردو اور فارسی ادبیات کے ماہرین میرے معروضات پر توجہ فرمائیں گے۔ رباعی کے اوزان کا سوال ہنوز جواب کا طالب ہے۔"

غزل

ڈاکٹر ایس۔ پی نفنة
(کوروکشیتر)

کُن کی آواز آرہی ہے ابھی
مجھ میں شاید کوئی کمی ہے ابھی

نادرِ وقت ہو چکا رخصت
دل کی دلی میں کھلبلی ہے ابھی

الفاظ ان لبوں پہ نہیں آئے
آدمی پھر بھی آدمی ہے ابھی

دل سے امید کیوں اٹھا لوں کیا
شمع یہ بجھ بجھ کے بھی جلی ہے ابھی

کتنے جسموں سے ایک پرچھائیں
آ کے خود ہی مجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی

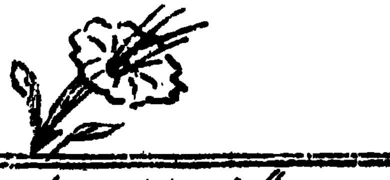
آندھیاں غم کی تھم گئیں لیکن
شکل انساں اڑی اڑی ہے ابھی

نہ وہ عیسیٰ نہ وہ صلیب مگر
زیست میدانِ کلوری ہے ابھی [1]

آپ اپنے کو جیتنے والا
کون ایسا جیالا شخص ہے ابھی؟

جسم نفتة میں سر بہ سر زندہ
عہدِ ماضی کا جبر تر رہ ہی ہے ابھی

[1] میدانِ کلوری وہ میدان ہے جہاں حضرت عیسیٰ کو مصلوب کیا گیا تھا۔



ڈاکٹر ایم اے وحید لیس قربان
سہارنپور

کسانوں کا شاعر جوزف انور

اردو کے شعراء کی تعداد بے شمار ہے کچھ شعراء نے اپنے لئے ایک مخصوص رنگ چن لیا اور اس ایک رنگ میں اس قدر لکھا کہ وہ اسی نام سے منسوب ہو گئے مثلاً شاعرِ خمریات۔ شاعرِ نغمہ و شباب۔ شاعرِ ملت۔ شاعرِ قوم شاعرِ مزدور۔ شاعرِ وطن۔ امام یاسیات اور کیا کچھ لیکن اب تک ایسا شاعر نظر نہیں آیا جس نے اپنی شاعری کو محض گاؤں اور گاؤں کے لوگوں کے لئے وقف کر دیا ہو۔ اور ایسے صحیح معنوں میں گاؤں والوں کا شاعر کہا جا سکے۔ حالانکہ سرکاری اور نیم سرکاری ایجنسیوں کی جانب سے گاؤں والوں کے سدھار اور فلاح و بہبود کے بارے میں بہت کچھ کہا جا رہا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نثر میں منشی پریم چند اور ان کے رفقاء کار نے اس جانب پوری توجہ دی اور انھوں نے گاؤں کی زندگی پر بہت کچھ لکھا اور خوب لکھا۔

شکر ہے کہ اب میدان سخن میں ایک ایسا شاعر ابھرا ہے جس کو بلا پس و پیش گاؤں والوں کا شاعر کہا جا سکتا ہے اس شاعر کا نام ہے جوزف انور اجیر کے مسیحی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ اہلِ قلم ہیں۔ نہ صرف شاعر ہیں بلکہ نثر کے میدان میں بھی اشہب قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں دو سال ہوئے جب ان کے افسانوں کا مجموعہ سستا دیونا گری میں شائع ہوا اور اہلِ ادب نے اسے سراہا۔ تعجب تو یہ ہے کہ جوزف انور شہر میں پیدا ہوا شہر میں پرورش پائی شہر میں تعلیم حاصل کی شہر میں ملازمت اختیار کی یعنی وہ ریلوے میں گارڈ ہے۔ ظاہر ہے کہ گارڈ کا قیام شہر یا کم از کم ریلوے جنکشن پر تو ہوگا ہی۔

دوسری بات یہ کہ گارڈ کے پیر میں چکر ہوتا ہے وہ تو ریل گاڑی کے ساتھ ساتھ خود بھی دوڑتا ہے۔ اسے وہ سکون اور دلی اطمینان و یکسوئی کہاں جو ایک شاعر یا قلمکار کے لئے ضروری ہے اس کی زندگی تو ریل کی گھڑگھڑاہٹ انجن کی سیٹی شائیں شائیں اور پلیٹ فارم کے ماحول میں گزرتی ہے۔ شاعری کے لئے علاوہ دیگر باتوں کے دو چیزیں اہم ہیں مشاہدہ اور تخیل۔ شاعر کا مشاہدہ وسیع ہونا چاہئے پہلے وہ کسی چیز کا مشاہدہ کرتا ہے تب اس مشاہدہ پر تخیل کے گھوڑے دوڑاتا ہے۔ یہی چیز شاعر کو غیر شاعر سے ممتاز کرتی ہے مشاہدہ تو ہر شخص کرتا ہے لیکن شاعر جس چیز کا مشاہدہ کرتا ہے گہری نظر سے کرتا ہے۔ پھر اس پر غور و خوض کرتا ہے تخیل اسے کہیں سے کہیں پہونچا دیتا ہے قطرہ سمندر اور ذرہ میں بیابان نظر آنے لگتا ہے وہ ایک پھول تو دیکھتا ہے اور اس کا تخیل اس سے کہلوا دیتا ہے کہ؎

اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری

کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں یا پھر؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

یہ باتیں غیر شاعر کی نظر۔ دماغ اور تخیل میں کب آ سکتی ہیں گویا ان سب کا اصل مشاہدہ ہے۔ مشاہدے سے تخیل جنم لیتا ہے۔ جوزف انور کے قطعات دیکھ کر سمجھ میں نہیں آتا کہ جو ہیں گھنٹے بھاگ دوڑ میں رہنے والے اس شخص کو کب اور کیسے اتنا وقت اور موقع نصیب ہوا کہ اس نے گاؤں کا ماحول، گاؤں کی زندگی۔ وہاں کی غربت، مفلسی۔ ان کے احساسات و جذبات نوجوان دلوں کی دھڑکنیں منہ پنگھٹ وغیرہ کا اس قدر گہرا مشاہدہ کر لیا۔ اس کے قطعات پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایسے فنکار کے قلم سے نکلے

ہیں۔ جو خود دیہات میں رہا ہے وہاں کی غربت کا مزہ اُٹھا چکا ہے۔ گاؤں کے پنگھٹ سے لطف اندوز ہوا ہے۔ وہاں کی جوان لڑکیوں کے ارمانوں کا خون ہوتے دیکھ چکا ہے۔ کھیتوں میں کھڑے ہو کر بانسری بجا چکا ہے۔ بوڑھے اور بوڑھیوں کے دل میں جھانک چکا ہے۔ غرض کون سی بات ہے جس پر اس کی نظر نہیں پڑی۔

دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ وہ گاؤں کی باتیں گاؤں والوں کی زبان ہی میں کرتا ہے ان کے الفاظ ان ہی کے محاورات۔ ان ہی کی ترکیبیں۔ ان کی عورتوں کے لب و لہجہ غرضکہ وہ ان کے ساتھ ایسا گھلا ملا معلوم ہوتا ہے گویا ساری عمر ان ہی کے ساتھ گزاری ہو۔

قطع نظر تمام محاسنِ شاعری اچھے شعر کے متعلق میرا نظریہ ہے کہ اچھا شعر وہ جس سے سامع محظوظ ہو۔ روح پر ایک کیفیت طاری ہو جائے اور سامعین کے منہ سے بے ساختہ واہ نکل پڑے اس روشنی میں الوش کے کچھ قطعات سماعت فرمایئے۔ میں چونکہ ہندی پنگل (عروض) سے واقف نہیں اس لئے اس کے ہندی فن کو نظر انداز کرکے اس کی برمحل زبان و دلکش اندازِ بیان اور جدت کی ترجمانی سے محظوظ ہوتا ہوں اور آپ کو بھی اس میں شریک کرتا ہوں۔

اس کی تازہ ترین تصنیف بگڈنڈیاں (ہندی رسم الخط) حال ہی میں شائع ہوئی ہے اس کا آغاز اس شعر سے ہوا ہے۔ ؎

کوئی برگد کے تنے سے یوں لپٹ کر رو دیا
آج بھی تیرا وہاں نام لکھا ہو جیسے

گاؤں کا کسان صدیوں سے ہر سال فصل کا انتظار کرتا چلا آرہا ہے ہر سال اچھی فصل ہونے کی اُمید پر طرح طرح کے منصوبے باندھتا ہے گھر والوں کو ڈھارس دیتا رہتا ہے لیکن فصل تیار ہونے پر تمام فصل مہاجنوں کے یہاں قرضیا لگان کی ادائیگی میں نکل جاتی ہے وہ پھر ویسے کا ویسا ہی تہی دست اگلی فصل کی اُمید لگا کر بیٹھ رہتا ہے اس کے آبا و اجداد کے وقت سے یہی ہوتا چلا آرہا ہے ؎

صدیاں لگی تھیں جن کو بنانے خیال میں
پیڑوں تلے وہ کس نے گھروندے کچل دیئے
کھودی ذرا جو ذہن سے ماضی کی سرزمیں
خوابوں کے کتنے دفن شکستہ محل ملے

جمی دار کے سہر کارے آئے تھے
بھول ہوئی کچھ ایسی اب کی نپٹ لگان
ہمرا تو سب خون پسینہ ایک ہوا
بنیا کو بھی سمجھ لیا کھیتوں کا دھان

دو بیگھے دس بسوہ کیسے کھیت ہوئے
ہم کیا جانیں سب مایا ہے بھگون کی
لیکھ کا لکھا ہوتا تو کچھ کرتے بھی
یہ تو خود لکھی ہے نہیا جھا جن کی

ترڈکے سے جو ہل جوتیں گے تو لوٹیں گے رات پڑے
اب کی برس تو بچھوا کو بھی دھانی چنریا لا دیں گے
کل تک چھا چھم بلوتی دیکھو چھپر تک جا پہونچی ہے
ہریا کے سنگ سرسوں کے بھی پیلے ہاتھ کرا دیں گے

لیکن یہ حسرت پوری نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے اس انداز میں کہ گھر کا سب کچھ جہیز کی نذر ہو جاتا ہے۔

کھیتوں کی آنکھیں بھی دیکھو بھر آئیں
جانے کتنی دیر سے رہٹ روتا ہے
دیکھو تو سیا کون کنویں پر بیٹھا ہے
یادوں کی جوڑی کو کس نے جوتا ہے

اُوپر کے قطعات میں ہریا کے سنگ سرسوں کے ہاتھ پیلے کرانا اور یادوں کی جوڑی کی ترکیبیں کس قد

حسین اور دلآویز ہیں۔ سبحان اللہ۔

جہیز کے ناقابلِ بیان اثرات کی کتنے پیارے انداز میں ان مصرعوں میں عکاسی کی ہے ایک ایک لفظ سے غریب کسان کے دل کا درد و کرب پھوٹا پڑ رہا ہے ؎

ایک رات ہی میں دونوں کو کھا بیٹھی
جانے ایسی کونسی تھی وہ ڈائن ہائے
بیٹی کا کیا دھن ہی پرایا تھا لیکن
کیسے کھلونوں میں اپنی چتکبری گائے

جب بھی اپنے گاؤں سے کوئی لوٹ ہے خالی بارات
دوجے دن ہی اک چتا مرگھٹ پہ جلتی دیکھی ہے
بیٹی زندہ ہو کر مُردہ جہیز ہو یا کریا کرم
بیلوں کی جوڑی تو وہ ہر حال میں لیکر ٹلتی ہے

گاؤں کی لڑکیاں محنتی اور جفاکش ہوتی ہیں اس لئے نہایت صحت مند و تندرست و توانا ہوتی ہیں اب ان کو شوہر بھی اسی مناسبت سے ملنا چاہیے۔ اس بات کو کتنے خوبصورت طنز سے ادا کیا گیا ہے ؎

نظر بچا کر بھیڑ ریوڑ سے بھاگ گئی
پھر سلمہ کی اماں طعنہ مارے گی
جب سلمہ کی بکری تیرے بس کی نہیں
تجھ سے میری سلمیٰ کیسے سنبھلے گی

اب ذرا گاؤں کے یہ مناظر دیکھئے۔ ساون میں ہر طرف پیڑوں پر جھولے پڑ جاتے ہیں۔ لڑکیاں ہلکی ہلکی پھوار میں برسات کا لطف لیتی ہیں پینگیں بڑھتی ہیں اور سریلی آواز میں گانے گاتی ہیں۔ یہاں انور کی تشبیہات سے لطف لیجئے۔ ؎

ہم نے سینوں سے بھی اڑتے ہوئے آنچل دیکھے
ہم نے جوہڑ میں بھی کھلتے کنول دیکھے ہیں
شاخِ نازک پہ پڑے دیکھے ہیں جھولے ہم نے
پات سے پات تلک جھولتے پھل دیکھے ہیں

یہی ساون کا مہینہ اُن جوان دُلہنوں کے لئے سوہانِ روح بن جاتا ہے جن کے سیّاں (شوہر) دور پردیس میں روزی کمانے کے لئے گئے ہوئے ہیں ان درد و جدائی میں تڑپنے والوں کے جذبات کی تصویر ملاحظہ ہو اور اس حقیقت اور زبان و لہجہ کی داد دیجئے ؎

چھت کی کھپریلیں تک رو دیں پھر ہر جائی ساون پر
بوند بوند اگنی جل سے پھر لگا جھلنے سارا بن
پھر برگد پیر کس بیری نے چھوڑ دیئے زہریلے ناگ
پتہ پتہ ڈس لینے کو پھیلائے بیٹھا ہے پھن

چپ بھی رہ کاگا میرے
تو مت کر کائیں کائیں
تیرا مُنہ میٹھا کر دوں
ہاں وہ گھر تو آئیں

دوسرا دلکش اور من موہ لینے والا مقام ہوتا ہے پنگھٹ اس پھر پور طنز میں آپ کو نوجوان عاشقوں کے شکستہ ارمانوں کا خون جھلکتا نظر آئے گا ؎

کتنی یادوں کا مدفن ہے
کچھ تو بتا اے گاؤں کے پنگھٹ
کتنوں کے ارماں لے ڈوبا
کتنوں کے کھولے ہیں گھونگھٹ

اسی پنگھٹ کا ایک منظر یہ بھی ملاحظہ ہو اور اس انداز پہ قربان جائیے ؎

پانی مانگا تھا پردیسی نے لیکن
جانے کیا گھونگھٹ میں پگلا تکتا تھا
گاگر گاگر بھی پی کر کھڑا رہا
شاید جنم جنم کا پیاسا لگتا تھا

ان معصوم سرتاپا قیامت دوشیزاؤں کا سراپا بھی دیکھ لیجئے ؎

سانسوں کی شدت تو دیکھو

ٹوٹ گئی انگیا کی ڈوری
رہٹ، کھیت، جمنی، چوپالیں
بھری جوانی کے سو ھوڑ

کس کس کو تھامے پنہارن
گاگر تھکے آنچل ڈھلکے
دونوں میں لبریز جوانی
ایک کو پکڑے تو ایک چھلکے

جب یہی گوری ندی پر نہانے جاتی ہے تو گھر والوں کے دل میں کیسے کیسے وسوسے پیدا ہوتے ہیں ؂

کرشن کنھیا نے بھی کیا کیا کھیل رچے
ہم تو جب سوچے ہیں لجا آوے ہے
گوردھن گردھاری اس کی رکھیو لاج
گوری کہو، ندیا پہ نہانے جاوے ہے

شہر کے لوگ گاؤں والوں کو نرا بدھو سمجھتے ہیں بعض اوباش و عیاش قسم کے لوگ وہاں تفریح کی تلاش میں پہنچ جاتے ہیں لیکن گاؤں میں ابھی قدیم تہذیب زندہ ہے شرم، حیا، لاج، عزت سب کچھ ہے وہ جان دیکر بھی اپنی عزت کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان جذبات کی تصویر کشی سماعت فرمائیے ؂

شہر سے بھی آپہونچے ہیں چھیل چھبیلے بابو لوگ
پھر شاید کچھ گاؤں کی لاجوردھری میں گرجائیں گی
پھر شاید کچھ سسک کر دے بیٹھیں گی اپنی جان
پھر شاید کچھ کالی ماں کے مندر پر چڑھ جائیں گی

رجّی کی تو سب گائیں مرکھنی ہیں
بھولے سے مت دینا بالو ان کو چھیڑ
کہتے ہیں جلاد ہیں اس کے بابا بھی
پاس نہیں آنگن کے بھی پیپل کا پیڑ

یہ نہ سمجھئے کہ یہ لڑکیاں جذبات سے خالی ہیں ان کے جذبات کتنے شدید ہیں ؂

دیکھ سکھی اس سمت نہ جئیو دیکھ وہ ڈائن ندیا ہے
رات اماوس کو اکثر وہ کہتے ہیں لیتی ہے بھوگ

دل کی پیڑا پھر سکھی کے سپنے جب دکھلاتی ہے
ایک ذرا سی بات بھی بڑھ کر حق بن جاتی ہے سنجوگ

آخر میں ان کے مقابلے پر شہر کی لڑکی کی یہ تصویر دیکھئے اور مجھے رخصت ہونے دیجئے ؂

سر پہ آنچل نہ تن پہ کچھ سادھن
ہم نے دیکھی ہے شہر کی لڑکی
جیسے بابا کے گھونسلے سے دبی
ایک سوکھے ببول کی ٹہنی

غزل

احمد حسین شمس۔ کشن گنج
(بہار)

دل کو اور اک مصیبت نئی مل گئی
آپ کیا مل گئے بے خودی مل گئی

سانس اکھڑی، نہ کچھ شانتی مل گئی
ہم جہاں کھو گئے آگہی مل گئی

بحث ہوتی رہی بود و نابود پر
بحر سے چپکے چپکے ندی مل گئی

پاؤں تم نے جہاں رکھ دیئے اُس جگہ
قدسیوں کو جھلک طور کی مل گئی

عرش کو میں چلا تھا مگر کیا کروں
اتفاقاً تمھاری گلی مل گئی

لامکاں کا سفر اور تاریک شب
یاد آئی تری روشنی مل گئی

آپ نے ڈوبتی نبض کو چھو لیا
شمس کو اک نئی زندگی مل گئی

انتظار حسین

واپسی

"سو ہے سنگھیو! تب بدھ دیو جی نے آنکھیں
یا اور کہا کہ "ہے بھکشوؤ! یہ پہلی بار نہیں ہوا۔
آگے بھی ہو چکا ہے۔" بھکشو یہ سن کے سوچ
ہ گئے۔ پوچھا کہ "ہے تتھاگت ایسا پہلے کب
ہوا تھا۔؟"

تب بدھ دیو جی نے ایک جاتک سنائی جو اس
رح ہے کہ بنارس کے سندر نگر کے باہر ایک مرگھٹ
تھا جہاں بہت سے کُتے رہتے تھے ان میں ایک کُتا
گرو تھا۔ سب کُتے اس گرو کا بہت آدر کرتے
تھے۔ ایک دن کی بات ہے کہ بنارس کا راجا اپنے رتھ
میں بیٹھ کے سیر کو نکلا۔ دن بھر سیر کرنے کے بعد شام کو
لوٹا۔ چاکروں نے رتھ کا سامان باہر پڑا چھوڑ دیا۔ رات
کو ورشا ہوئی تو سارا سامان بھیگ گیا اس سامان
میں رتھ کے گدے بھی تھے جن پر چمڑا منڈھا ہوا تھا یہ
سب بھیگ گیا۔ راج محل کے کُتوں نے چمڑے کو گیلا
پا کے دانتوں سے کاٹا اور کھا گئے۔

دوسرے دن راجہ تک بات پہنچی کہ کُتے رتھ کے
گدّوں کا چمڑا کھا گئے۔ راجہ نے تاؤ کھایا اور منادی
کرا دی کہ کُتے جہاں دکھائی دیں انھیں مار ڈالو۔ بس
پھر کیا تھا، بنارس نگری کے کُتے مارے جانے لگے۔
تب وہ کُتے جو شمشان گھاٹ میں جا کے
پناہ لیا کرتے تھے۔ جب مرنے کٹنے لگے تو اپنے گرو کے
پاس جا کے اپنی بپتا سنائی اور دہائی دی کہ ہے گرو
یہ کیا انیائے ہے کہ راج محل کے پاپ کرتے ہیں
اور ہم شمشان گھاٹ کے باسی مارے جاتے ہیں۔ گرو نے یہ بات سن راج محل کی راہ لی

راجہ کے چاکروں نے اُسے بہت دھتکارا مگر اُس نے
ایک نہ سنی اور سیدھا راجہ کے سامنے پہنچا اور کہا کہ "ہے
نشش جاتی کے راجہ! کُتوں نے تیرا کیا بگاڑا ہے کہ تو ان
کی جانوں کا بیری ہو گیا ہے۔"

"انھوں نے میری رتھ کے گدّے کاٹ ڈالے اور ان کا
سارا چمڑا چبا گئے سو میں نے ڈونڈی پٹوا دی کہ نگر میں
جو کُتا دکھائی دے اسے مار ڈالو۔"

"ہے راجہ! کیا یہ حکم راج محل کے کُتوں پر بھی لاگو
ہوتا ہے۔؟"

"نہیں، وہ میرے شرن میں ہیں۔"

"کیسا انیائے ہے کہ اپرادھی راجہ کے شرن میں ہیں
اور نردوشی مارے جاتے ہیں۔"

"لے کُتے! تو نے یہ کیسے جانا کہ یہ راج محل کے کُتوں
کا کیا دھرا ہے؟" "مہاراج! ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، اپنے
کُتوں کو دودھ میں گھی اور گھاس ملا کے پلاؤ اور پھر تماشا
دیکھو۔" راجہ نے فوراً دودھ میں گھی اور گھاس ملا کے
اپنے کُتوں کو پلایا۔ جو کُتا وہ دودھ پیتا، ابکائی لیتا اور
چمڑے کے ٹکڑے اگل دیتا۔ تب راجہ نے شمشان گھاٹ کے
کُتوں کو معافی دی۔ کُتوں کے گرو کو اچھا موقع ہاتھ آیا۔
اُس نے راجہ کو بھلائی کی شکشا دی۔ راجہ نے کُتے کی شکشا
کو گرہ میں باندھا اور اسے اپنا راج منتری بنا لیا۔

اور ہے بھکشوؤ! اس شکشا کا اثر ایک لاکھ برس
تک رہا۔ لاکھ برس بعد راجاؤں کے چلن پھر ویسے ہی
ہو گئے جیسے پہلے تھے۔

بدھ دیو جی جاتک سنا کے چپ ہوئے۔ پھر بولے کہ
"ہے بھکشوؤ! وہ کُتا میں تھا۔"

"تم ؟" سب بھکشو ویدیہ نے چکرا کے پوچھا۔
"ہاں جی! وہ راجہ انند تھا۔ کشتوں کا گرو میں تھا۔ شمشان گھاٹ کے دوسرے کتے تم تھے۔"

"ہم کتے ؟"
"ہاں تم۔ تم نے اپنے کرموں کے کارن آگے چل کے آدمی کا جنم لیا ـــــ پھر میرے سنگھی بنے۔"
"اور راج محل کے کتے ؟"
"وہ… وہ ابھی تک کتے ہیں۔"

اگر سین کی یہ جاتک کتھا سن کے سب بھکشو اچنبھے میں پڑ گئے اور وچار کرنے لگے۔ دیر بعد گوویدیہ نے لمبا ٹھنڈا سانس لیا۔ اور کہا کہ "وہ کیا مشکل سمے تھا کہ ہم شمشان گھاٹ کے کتے تھے۔ اور تتھاگت ہمارے سنگ تھے۔ ہمارے ہی کارن تو انھوں نے یہ جنم لیا تھا انھوں نے کیسی جوت جگائی تھی کہ کتے بھی آدمی بن گئے تھے۔ اور اب کہ ہم آدمی کے جنم میں ہیں۔ آدمی آدمی نہیں رہے باہر سے آدمی دکھائی پڑتے ہیں۔ پر اندر سے……"
"اگر سین! تو نے کیسے جانا کہ آگے بھی ایسا ہو چکا ہے"
"مترو! میں نے تتھاگت سے ایسا ہی سنا ہے"
اور اگر سین ایک جاتک سنانے لگا کہ اس طرح ہے،

یہ اس بیتے سمے کی بات ہے۔ جب بنارس کے راج سنگھاسن پر راجہ جنندا براجمان تھا اور راج محل میں تیار کھڑے لوچن کہ ابھی بدھ ستو تھے، راج کمار کے روپ میں براجتے تھے۔ روپ انوپ صورت چندرما ایسی۔ اس کارن انھیں سب محل کے اندر باہر ادیس تکھ کہتے تھے۔ پتا نے انھیں تینوں وید پڑھوا دیئے اور ساری ودیا پڑھا ڈالی۔ پھر جب ساتواں برس لگا تھا کہ جنندا نے پران چھوڑے۔ بیکنٹھ کو سدھارا راج سنگھاسن پر اب ادیس تکھ کو بیٹھنا تھا۔ پر بہت سے درباریوں کی نیت میں کھوٹ آگیا۔ انھوں نے کہا کہ راج کمار جی بالی عمر کے ہیں۔ راج کے کام کیسے کریں گے۔ درباریوں میں کچھ لوگ بھی تھے وہ کہتے تھے کہ راج کمار نے ساتوں ودیائیں پڑھی ہیں پرجا کے چہیتے ہیں۔ راج کرنے کے لئے اور کیا چاہئے۔ کھوٹی نیت والوں نے کہا کہ اچھا یہ بات ہے تو ابھی پرکھ کئے لیتے ہیں۔ دودھ کا دودھ۔ پانی کا پانی ہوا جاتا ہے وہ ایک بندر کو شال دوشالے اوڑھا کر اور دو ٹانگوں پر چلا کر ادیس تکھ کے سامنے لائے اور کہا کہ ہے راج کمار! یہ بہت ودوان آدمی ہیں۔ راج کاریہ میں تمھاری بہت سہایتا کریں گے۔ تم انھیں اپنے منتری منڈل میں لے لو۔ بدھ ستو جی نے اسے سر سے پیر تک دیکھا اور کہا کہ مترو! یہ مانس نہیں ہے۔ منش ہے جسے آدمیوں کی سہایتا چاہئے۔ جہاں بندر منتری بن جائیں وہاں اس کے سوا کیا ہوگا کہ پرجا دکھی ہوگی، راج چوپٹ ہو جائے گا۔
کھوٹی نیت والے اپنا منہ لے کے چلے گئے۔ پھر دوسرے تیسرے دن وہ پھر آئے آدمیوں کے بھیس میں پگڑی دستار بندھوا کر لائے اور کہا کہ ہے راج کمار یہ تمھارے پتا کے راج میں نیایک تھا۔ جا بنھی کھوٹ اس کے نیائے کا چرچا تھا تم بھی اسے نیایک بناؤ۔ اور پرجا اور سے مجھنت ہو جاؤ۔"

بدھ ستو جی نے ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھا۔ تاڑ گئے یہ آدمی نہیں۔ بولے کہ مترو کہیں بندر بھی نیایک ہوئے ہیں۔
بس اس کے ساتھ کھوٹوں کا پول کھل گیا اور بدھ ستو جی سنگھاسن پہ بیٹھ کے راج کرنے لگے۔ انھوں نے بڑے سکھ کے ساتھ راج کیا اور پرجا کو بھلائی کی شکشا دی۔ اس سکشا کا لاکھ برس تک اثر رہا۔ لاکھ برس تک لوگوں نے آدمی اور بندر کے انتر کو یاد رکھا۔ اور امن چین سے رہے۔
اگر سین جاتک سنا کر چپ ہو گیا۔ دوسرے بھکشو بھی کہ دھیان سے جاتک سن رہے تھے چپ بیٹھے رہے پھر گوویدیہ نے سر اٹھایا اور بولا کہ "ہے اگر سین! اب لاکھ برس پورے ہو چکے ہیں" اگر سین نے جواب دیا کہ

"گیانی! تو دیکھتا نہیں کہ دُنیا کی کیا دشا ہو گئی ہے اور لوگ کیسے مُورکھ ہو گئے ہیں۔ پھر بھی تو پوچھتا ہے کہ کیا کہ برس پورے ہو گئے ہیں۔

گووند بولا۔ "پربھو! ہم پلٹ نہ چلیں۔؟"

"کہاں؟"

"بنارس کے شمشان گھاٹ میں۔"

اگرسین نے اسے گھور کر دیکھا۔ کہا "مورکھ! ہم نے لکھ برس تک جنم جنم کے کشٹ کھینچے ہیں تب کہیں لوٹ پیٹ کے آدمی بنے ہیں تو پھر ہمیں تیسرے جنم میں لے جانا چاہتا ہے۔"

"ہم آدمی تو بن گئے پر . . . . . ." وہ کچھ کہنے لگا تھا مگر پھر رُک گیا اور اپنا سر کا کر دیر تک ایک بات بھی نہ کی۔ پر اُس کے اندر ایک کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ رہ رہ کے وہ سوچتا کہ لاکھ برس بیت گئے ان لاکھ برسوں میں میں نے کتنے جنم لیے اور کتنے کشٹ کھینچے۔ انت میں آدمی کا جنم لیا۔ پر اس جنم میں یہ سوچتے سوچتے وہ دُکھی ہو گیا۔

بیاکل تن اور دُکھی آتما کے ساتھ وہ دیر تک آنکھیں مُوندے گم سُم بیٹھا رہا۔ اس سمے کے جنم کے دھیان نے اسے بہت دُکھی اور بیاکل کر دیا تھا دھیرے دھیرے اس کا دھیان پچھلے جنموں کی اور گیا دھیرے دھیرے اسے لگا کہ لاکھ برس سامنے آ کر کھڑے ہو گئے ہیں اپنے ان گنت جنموں کے سنگ دھیان ہی دھیان میں وہ اُلٹے پاؤں چلنے لگا۔ ——

اس جنم سے پچھلے جنم میں، پچھلے جنم سے اور پچھلے جنم میں —— پھر اور پچھلے جنم میں ——

دھیان ہی دھیان میں اس نے سارے پچھلے جنم بیت گئے اور اس نے دیکھا کہ وہ بنارس کے مرگھٹ کی چوکھٹ پہ کھڑا ہے۔ وہ چونک پڑا ——

گووند نے آنکھیں کھولیں، ادھر ادھر دیکھا۔ سب بھکشو دھیان میں گم بیٹھے تھے۔ اگرسین پر اس نے آنکھیں مُوندے دھیان ساگر میں ڈوبا تھا۔ اس گیان کی اسے دُنیا بہت اُجاڑ دکھائی دی۔ بنارس کا مہا شمشان اپنے باسیوں سمیت اس کی آنکھوں میں پھر رہا تھا جیسے مرگھٹ کا باسی مرگھٹ سے دُور باس سنسار میں آن جنمے ہوں۔ اس کے اندر ایک لہر اُٹھی اور وہ اپنا گیروا بانا اوڑھے یا تر سنبھال اُٹھ کھڑا ہوا۔

اگرسین نے آنکھیں کھول کے اسے دیکھا۔ "بھکشو! کدھر جانے کے دھیان میں ہے؟"

"بنارس کے مرگھٹ کی اور۔"

"بنارس کے مرگھٹ کی اور؟"

"ہاں بنارس کے مرگھٹ کی اور۔"

اور وہ پیچھے دیکھے بنا جلدی جلدی چلا اور بھکشوؤں کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ ●●

بابِ انتقاد

آنگن (مع مقدمہ) خدیجہ مستور کا پیشِ نظر ناول پاکستان میں کئی سال پیشتر شائع ہوا تھا اور وہاں کے بڑے ادبی انعامات حاصل کرنے کے علاوہ اس ناول نے اردو دنیا میں بھی خاص گونج پیدا کی تھی۔ ہم ہندوستان کے اردو والوں کو موڈرن پبلشنگ ہاؤس کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے اس عمدہ ناول کو مقدمے کے ساتھ نہایت خوش سلیقگی سے شائع کر دیا ہے۔ مقدمہ ڈاکٹر اسلم آزاد نے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔

غالب کے گنجینۂ معنی کی طرح اس ناول میں بھی کئی جہان آباد ہیں ہر چند کہ زمانی اعتبار سے ناول کا کینوس تقسیم ہند سے پندرہ بیس سال پہلے اور چار پانچ سال بعد تک کا احاطہ کرتا ہے لیکن اس کم و بیش ربع صدی کی داستان میں بھی تین چار نسلوں کی ٹھاٹھیں مارتی وسیع زندگی کوزے میں دریا کی طرح سمٹ آئی ہے زوال آمادہ جاگیردارانہ نظام، جدوجہد آزادی کے پر تاثیر رقع، ہندو مسلم اتحاد و فرقہ وارانہ فسادات، داستانِ حسن و عشق، مختلف طبقات کی آویزشیں، اگلی پچھلی نسلوں کے درمیان جنم لیتی خلیجیں، انسانی فطرت کے روشن اور تاریک پہلو، الغرض اس ربع صدی کی جس کا ذکر اوپر کیا گیا، ایسی سچی تصویر اس ناول میں ابھر کر سامنے آتی ہے کہ اس کی مثال کسی دوسرے ناول سے نہیں دی جا سکتی۔ میرے خیال کے مطابق جدیدیت کے اثرات فکشن، خصوصاً افسانے پہ شفق انداز میں رونما ہوئے ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسی دوران اردو میں کئی عمدہ ناول بھی وجود میں آئے ہیں۔ تیزی کے ساتھ بدلتی زندگی کے خارج اور باطن کی ایسی زندہ تصویر پیش کرنا خدیجہ مستور کا وہ کارنامہ ہے جسے تاریخ ادب ہمیشہ یاد رکھے گی بلاشبہ "آنگن" اردو کے پانچ سات بڑے ناولوں میں سے ایک ہے۔

۳۶۸ صفحات کی آفسٹ پر چھپی ہوئی اس کتاب کی قیمت تیس روپئے یقیناً مناسب ہے۔

ناشر موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ ۹۔ گولا مارکیٹ دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ دفتر شاعرِ ہند سے بھی یہ کتاب دستیاب ہے۔

وقت کا سورج ساحر شیوی کا کلام اردو کے اکثر رسائل میں نظر آتا رہتا ہے لیکن پیش نظر کتاب کے مندرجات سے یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ یہ موصوف کی دوسری شعری پیشکش ہے کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے کئی اشعار نے دامن تھام تھام لیا، مثلاً:

کچھ سبق ملے شاید دیکھیے ذرا اس کو
موت کے اندھیرے کا یہ بھی ایک منظر ہے

نگاہیں اس کی طرف اٹھ رہی ہیں محفل میں
ہے دیدہ زیب بہت آج پیرہن اس کا

میٹھا اس تلخیٔ دوراں میں گھولتا ہی نہیں
جو میں نے پالا ہے طوطا وہ بولتا ہی نہیں

مارا وہ زوردار طمانچہ نصیب نے
اس کے نقوش چہرے پہ میرے ابھر گئے

ناچنے والی چھوڑے بیٹھی تھی
سارا کوٹھا ناچ رہا تھا

کیا گزر جائے گی اس پر کیا پتہ
ساتھ میرے جب تجھے دیکھے گا وہ

جس شاعر نے ایسے اشعار کہے ہوں اس کا مستقبل روشن ہونا چاہیے میری رائے میں ساحر شیوپوری یکسوئی کے ساتھ شعر کہتے رہیں اور غزلوں کے مصرعہ ہائے ثانی پر بطورِ خاص چار چھ بار غور کر لیا کریں تو ان کا ادبی مستقبل یقیناً محفوظ ہے زیرِ مطالعہ کتاب میں غزلوں کے ساتھ ساتھ نظمیں، قطعات، رباعیات بھی شامل ہیں نظموں میں "وقت کی آنکھیں" "ادھورا کی کہانی" اور "سگریٹ" جیسی نظمیں متوجہ کرتی ہیں۔ کتاب کا ظاہری گیٹ اپ اور طباعت معیاری اور دیدہ زیب ہے۔ ناشر موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ دفتر شانِ ہند سے بھی یہ کتاب مل سکتی ہے۔

غزل

جناب یاسر چغتائی
احمد پور شرقیہ (پاکستان)

لگی ہیں راہِ سفر میں ملامتیں کتنی
تھکا ہے ملاں ہوں مگر سر پہ ہیں چھتیں کتنی

چلے گئے ہیں تو دل میں خلش سی رہتی ہے
وہ لوگ جن سے رہی ہیں عداوتیں کتنی

ہزار راستوں میں خود کو میں نے بانٹ دیا
ہر ایک سانس نے جھیلیں مسافتیں کتنی

فریبِ دوستی کھاتا رہا ہوں ہنس ہنس کر
اٹھائیں کرب کے عالم میں راحتیں کتنی

تمام عمر گزار دی ہے جس نے جن کے لیے
دھری ہیں یاسر انھوں نے ہی تہمتیں کتنی

راجستھان اردو اکاڈمی کی سالِ رواں کی کارکردگی

۱- آغاز و ابتدائی دور سنہ ۱۹۷۹ء

اردو اکاڈمی کی تشکیل ۱۲ فروری سنہ ۱۹۷۹ء میں عمل میں آئی اور ریاستی حکومت نے اکاڈمی کی ایڈہاک جنرل باڈی اور ایڈہاک مینجنگ بورڈ کا اعلان کیا۔ الحاج حافظ محمد ایوب خاں صاحب قمر واحدی کو اس کا چیرمین نامزد کیا گیا۔ ان کے بعد پہلی مرتبہ دستورالعمل کے مطابق ۶ مئی سنہ ۱۹۸۱ء کو ڈاکٹر محمد علی زیدی ایسوشیئٹ پروفیسر اور صدر شعبہ اردو و فارسی راجستھان یونیورسٹی کو اکاڈمی کا چیرمین مقرر کیا گیا۔ اور جنرل کونسل کے اراکین نامزد کئے گئے۔ ۲۰ مئی سنہ ۱۹۸۱ء کو اکاڈمی کے عہدیداران مجلس عاملہ اور مالیاتی کمیٹی کے اراکین کا انتخاب عمل میں آیا۔ اکاڈمی کی چار سالہ کارکردگی (مارچ سنہ ۱۹۷۹ء، مارچ سنہ ۱۹۸۳ء) اجمالی خاکہ ایک کتابچہ کی شکل میں شائع کیا جا چکا ہے۔

۲- اکاڈمی دفتر کے موجودہ اسٹاف کی پوزیشن حسب ذیل ہے۔

۱-	سکریٹری۔	ایک
۲-	اکاؤنٹنٹ۔	ایک
۳-	انگریزی اسٹینوگرافر۔	ایک
۴-	یو۔ ڈی۔ سی۔	ایک
۵-	اردو کلرک۔ کم ٹائپسٹ۔	ایک
۶-	ایل۔ ڈی۔ سی۔	ایک
۷-	چپراسی	تین

۳- سالِ رواں ۸۴-۱۹۸۳ء میں تعلیمی ادبی سرگرمی و کارکردگی۔

۱- ۲۳ نومبر سنہ ۱۹۸۳ء کو مبلغ ۲۰۰/- روپے کی مالی امداد مہارانی کالج جے پور کو تاریخ اردو پر ایک جلسہ منعقد کرنے کے لیے فراہم کی گئی۔

۲- مورخہ ۲۹-۱۱-۸۳ کو قومی یک جہتی کے سلسلے میں رو ندر منچ جے پور میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت عالیجناب احمد بخش سندھی وزیر قانون و اوقاف راجستھان سرکار نے کی جلسہ میں عزت مآب عالیجناب شیو چرن ماتھر وزیر اعلیٰ راجستھان و راجستھان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جناب پی۔ بنرجی مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ چیرمین راجستھان اردو اکاڈمی ڈاکٹر محمد علی زیدی نے خیر مقدمی تقریر کی۔

۳- مورخہ ۵-۱۲-۸۳ کو مرکز اطلاعات جے پور میں ایک عام جلسہ میں جناب جوش ملیح آبادی اور تحریک آزادی پر منعقد کیا گیا۔ جس میں پروفیسر گوپی چند نارنگ صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے مقالہ پڑھا جلسہ کے صدارتی فرائض ڈاکٹر محمد علی زیدی چیرمین راجستھان اردو اکاڈمی نے ادا کئے۔

۴- مورخہ ۲۳ جنوری سنہ ۱۹۸۴ء جلسہ "سیرت پاک" بمقام مسلم مسافر خانہ جے پور منعقد کیا گیا۔ عالیجناب احمد بخش سندھی صاحب وزیر قانون و اوقاف راجستھان سرکار مہمان خصوصی تھے اور ڈاکٹر محمد علی زیدی نے صدارت اور نظامت کے فرائض جناب عبدالحئی شمیم نے انجام دیئے۔ اس جلسہ میں لکھنؤ کے مشہور و معروف مقررین مولانا کلب صادق و مولانا محمد اسلم ندوی صاحب نے اپنی پر مغز و شیریں تقاریر سے جلسے کو کامیاب بنایا اور سامعین سے داد تحسین حاصل کی تقاریر میں حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر نہایت بہترین طریقہ

روشنی ڈالی گئی۔

۵۔ راجستھان ادبی سنگم جے پور کو قومی یک جہتی پر ایک مشاعرہ بتاریخ ۲۴-۳-۸۴ کو منعقد کرنے کے سلسلے میں مالی امداد دی گئی۔ اس کی صدارت چیئرمین راجستھان اردو اکادمی ڈاکٹر محمد علی زیدی نے کی۔

۶۔ راجستھان کلامندر کوٹہ کو ایک کل ہند اہسلا سمیلن و مشاعرہ منعقد کرنے کے لئے مبلغ =/۳۰۰۰ روپے کی مالی امداد دی گئی۔

۷۔ انجمن ترقی اردو ہند بیکانیر کو مشاعرہ منعقد کرنے کے لئے مبلغ =/۳۰۰۰ روپے کی مالی امداد فراہم کی گئی۔

۸۔ انجمن ترقی اردو ہند اودے پور کو قومی یک جہتی میں اردو ادب کا حصہ پر کل ہند سیمینار اور کل ہند مشاعرہ منعقد کرنے کے لئے پندرہ ہزار روپے دیئے گئے۔ اس میں کل خرچ تقریباً پینتالیس ہزار روپئے ہونے کی امید ہے۔

۴۔ غریب و مستحق شعراء و ادبا و اُن کے افراد خاندان کو مالی امداد۔

۱۔ سالِ رواں میں اکادمی کی طرف سے چھ بیمار شعراء کو علاج معالجہ کے لئے مالی امداد دی گئی۔

۲۔ اس کے علاوہ سولہ شاعروں اور پانچ بیواؤں کو جو مشہور شاعروں کی بیوائیں ہیں علی الترتیب =/۱۲۰۰ روپئے (=/۱۰۰ روپیہ ماہانہ) اور =/۶۰۰ روپیے بیواؤں کو (=/۵۰ روپئے فی ماہ) مالی امداد عطا کی گئی۔

۵۔ تعلیمی وظائف۔

۱۔ سیکنڈری و ہائر سیکنڈری اور یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم طلباء/ طالبات کو بحساب =/۵۰۰ روپئے سالانہ تعلیمی وظائف تقسیم کئے گئے۔

۲۔ غریب و مستحق طلباء میں بلا قیمت کتابوں کی تقسیم۔

۱۔ سالِ رواں میں درجہ اول سے درجہ پنجم تک کے راجستھان کے مختلف اسکولوں کے طلباء/ طالبات کو مبلغ دو ہزار روپئے کی کتابیں مفت بطورِ عطیہ فراہم کی گئیں۔ اور مزید دو ہزار روپئے کی کتابیں خریدی گئی ہیں۔

۷۔ اردو اسکول لائبریریوں کو امداد۔

سالِ رواں میں اردو زبان کی ۵۸ کتابیں خرید کر مسلم گرلز اسکول لائبریری جے پور کو مفت فراہم کی گئیں۔

۸۔ اردو اکادمی کی مجلس عاملہ کے ذریعہ مختلف شعبوں میں کام پورا کرنے کے لئے آٹھ کمیٹیاں نامزد کی گئی ہیں جو اپنے اپنے متعلقہ شعبوں کے کام کی دیکھ بھال کر رہی ہیں

(i) سہ ماہی جریدہ نخلستان سے متعلق ادارہ۔

(ii) مالی امداد تعلیمی وظائف وغیرہ سے متعلق کمیٹی۔

(iii) اردو زبان و ادب سے متعلق کام کرنے والی انجمنوں سے رابطہ قائم کرنے والی کمیٹی۔

(iv) اکادمی کے رکن خورشید کمالوی کے چودہ نکات پر غور و خوض کرنے کے لئے کمیٹی۔

(v) تعلیمی وظائف کے سلسلے میں قواعد و ضوابط مرتب کرنے کے لئے کمیٹی۔

(vi) اردو تعلیم سے متعلق مختلف مسائل کے حل کرنے کے لئے کمیٹی۔

(vii) ریسرچ فیلوشپ سے متعلق ذیلی کمیٹی۔

(viii) کتابت اسکول میں داخلہ لینے کے متعلق عرضیوں کی جانچ پڑتال اور انٹرویو کے لئے ذیلی کمیٹی۔

۹۔ راجستھان اردو اکادمی ایک سہ ماہی جریدہ نخلستان شائع کرتی ہے جس کے لئے ایک ایڈیٹوریل بورڈ مقرر کیا گیا ہے اب تک کل تیرہ جلدیں اپریل ۱۹۸۴ء تک شائع ہو چکی ہیں۔ اس جریدے کا زرِ سالانہ مبلغ =/۱۰ روپیہ ہے

۱۰۔ اکادمی لائبریری میں فی الوقت مجموعی طور پر کل ۵۰۷۵ کتابیں موجود ہیں اور اس کے علاوہ اردو، ہندی و انگریزی کے مختلف رسائل ماہنامے وغیرہ آتے ہیں۔

۱۱۔ راجیہ پاٹھیہ پستک منڈل جے پور سے رابطہ

قائم کرکے پہلی کلاس سے پانچویں کلاس تک کی اردو کورس کی کتابیں حاصل کرلی گئی ہیں۔

۱۲۔ جامعہ اردو کے ابتدائی، ادیب، ادیب ماہر اور کامل کے پورے نصاب منگوا لئے گئے ہیں تاکہ مستحقین کو مفت دیئے جاسکیں۔

۱۳۔ سال ۸۲-۱۹۸۱ء کے لئے دو شاعروں جناب شمیم جے پوری و مخمور سعیدی کو اعزازات عطا کئے گئے اور سال ۸۳-۱۹۸۲ء کے لئے اعلان جلد ہی کیا جانے والا ہے معیاری کتابوں پر انعام کا اعلان سال ۸۳-۱۹۸۲ء کے لئے معیاری کتابوں کا انعام جناب مدیر علی زیدی اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو راجستھان یونیورسٹی جے پور کی کتاب "فکری عادتیں" پر دیا گیا اور ۸۴-۸۳ کے لئے جناب محمد عثمان عارف نقشبندی یونین ڈپٹی منسٹر گورنمنٹ آف انڈیا کو ان کی تصنیف "نورِ زندگی" پر دیا گیا۔"

غزل

احمد علی شاہ مخمور
احمد پور شرقیہ (پاکستان)

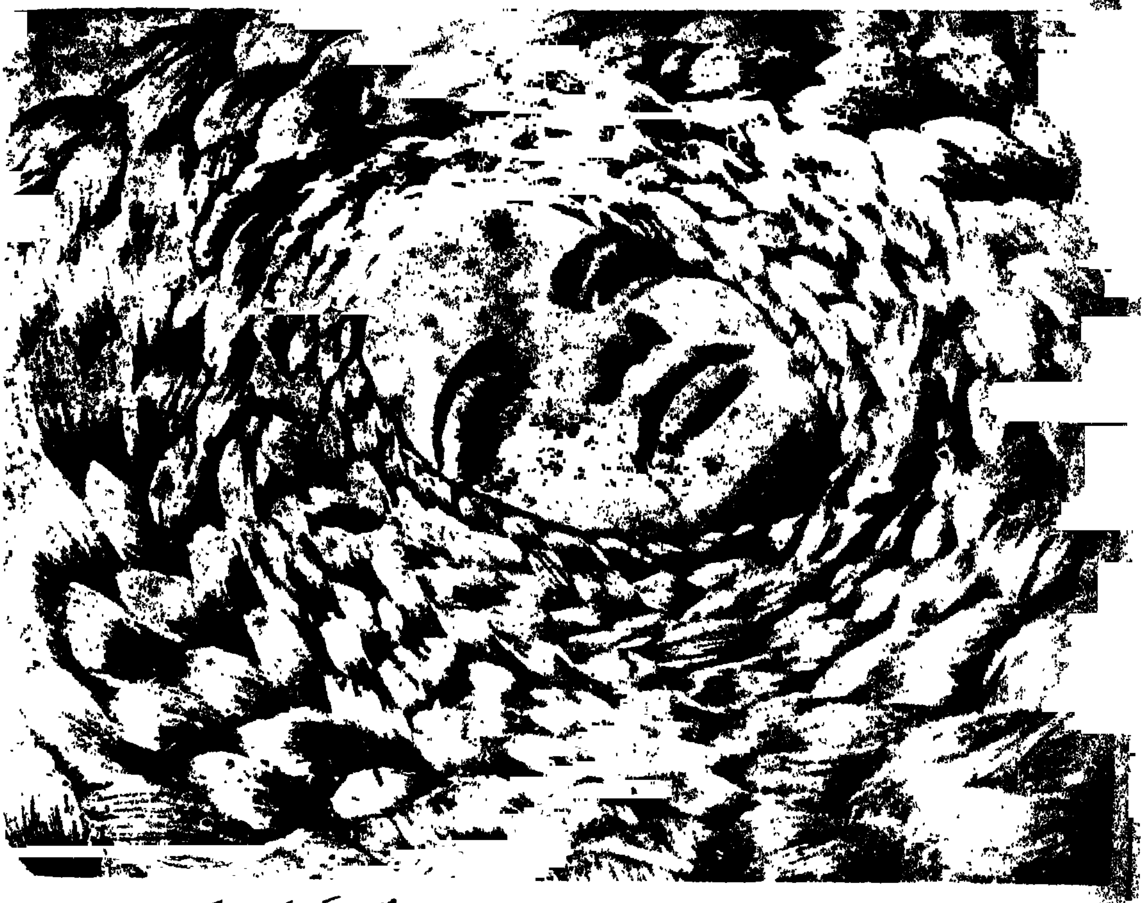
تنہائی میں پیارا سا خط لکھوں میں آپ کے نام
کیا اس کا جواب دیں گے چھوڑ کے اپنے سارے کام
اس دنیا میں رہنا ہے تو سنبھل سنبھل کر رکھ قدم
بغل میں چھری لیئے ہوئے منہ میں بولیں رام رام
آپ کے بغیر کیسے کٹتے ہیں یہ رات دن
تھک کے چور چور ہوئے چل کے دو چار گام
چھوڑ جائیں آپ کو یہ ہم سے ہو سکتا نہیں
بھول جائیں آپ کو چھوڑ و یہ خیالِ خام
آپ کی مخمور آنکھوں میں بھری ہے کتنی مے
مے کشوں کے واسطے کافی ہیں دو آنکھوں کے جام

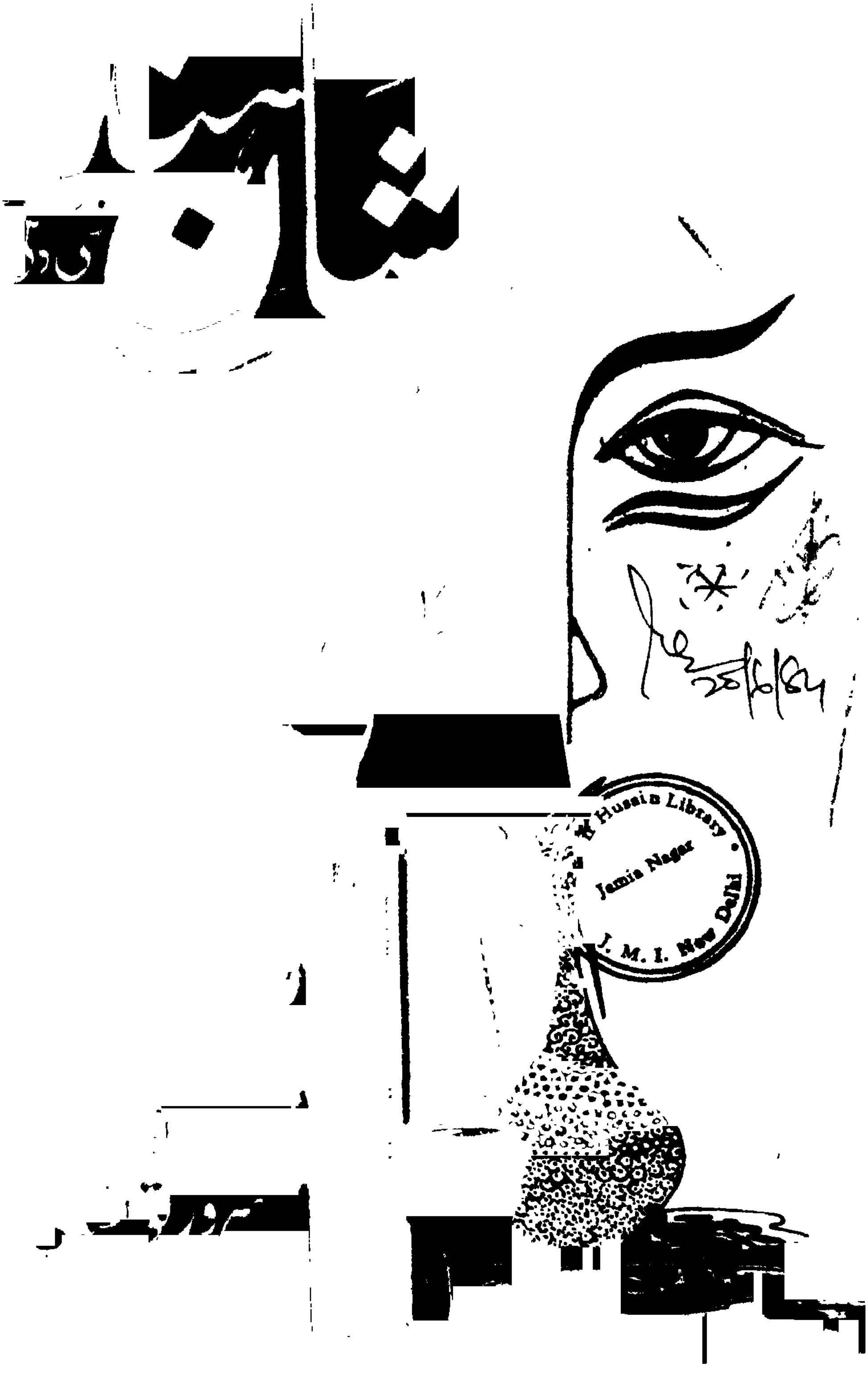
غزل

اخلاقؔ سہسوانی

کیا جانئے کن حدوں میں شبِ انتظار ہے
اب ان کی یاد بھی تو مرے دل پہ بار ہے
صیاد انھیں گلے سے لگالے، کہ ہر اسیر
پروردۂ نشاطِ دسِ نوبہار ہے
اب کیا کروں میں اپنے دلِ سادہ لوح کو
وہ جھوٹ کہہ رہے ہیں مجھے اعتبار ہے
ایجاد اور کیجئے کوئی نیا ستم!
اب تو شبِ الم میں بھی دل کو قرار ہے
بیٹھا ہوں دل کے داغ منور کئے ہوئے
کتنی حسین میری شبِ انتظار ہے
کہنے گئے تھے درد کا افسانہ ہم، مگر
صرف اتنا کہہ سکے کہ "ہمیں تم سے پیار ہے"
گل اشکبار ہے یہاں تو شبنم ہے اشکبار
شاید اسی کا نام ہی فصلِ بہار ہے
خاموش ہے مجھے غرور تمہاری جفاؤں پہ
ورنہ شبِ الم میں مجھے کیوں قرار ہے
ہے دل میں درد، آنکھ میں آنسو لبوں پہ آہ
اخلاقؔ آج میرے غموں پر بہار ہے

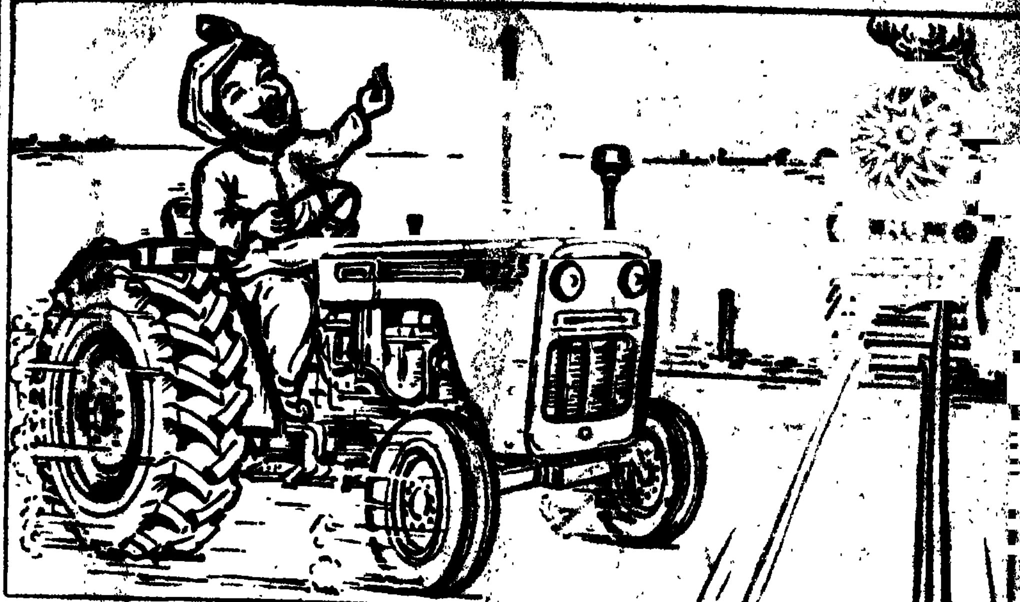
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110006
Regd with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57





خطرہ

(بغیر ملازم کے لیول کراسنگ)



ٹھہریئے

دیکھیے کہ
راستہ پار کرنے سے پہلے
کوئی گاڑی تو نہیں آرہی ہے

ناردرن ریلوے

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ | رجسٹرار آف نیوز پیپر فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۵۷/۴۴۶ | رجسٹرڈ نمبر ڈی ۲۷۰/DN

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
داسن پرست ہوں نہ گرجا پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن سے ہے نیازؔ مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
نیاز حق گوالیاری

ماہنامہ شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر
سرورؔ تونسوی

قیمت فی پرچہ ۲/۵۰ روپئے
زر سالانہ ۲۴/= روپئے

جلد نمبر ۴۵ | مئی ۱۹۸۴ء | شمارہ نمبر ۵

نہ جا اُس کے تحمل پر کہ بے ڈھب ہے گرفت اُس کی
ڈر اُس کی دیر گیری سے کہ ہے سخت انتقام اُس کا

- جن لوگوں کے ہاتھوں میں طاقت کی عنان ہوتی اور دماغوں میں اختیارات کا غرور، اُن کے لئے اس دُنیا میں سامانِ عبرت تو بہت ہے لیکن عبرت نہیں پکڑتے وہ خُدا کے خوف کو متروکاتِ سخن میں شمار کرتے اور تاریخ کے تازیانوں کو اپنے کھوکھلے قہقہوں میں اُڑا کر مطمئن ہوتے ہیں۔
- کسی شخص کو گالی دینا یا اُس پر اتہام باندھنا مجرمانہ فعل ہے لیکن چور کو عملاً چور نہ کہنا اور جانے بوجھے رہزنوں کے چہرے چھپانا بجائے خود ایک جرم ہے۔
- افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اہلِ علم اور اہلِ قلم میں منافقت کا مرض سرایت کر گیا ہے وہ زہر کو زہر نہیں کہہ رہے اور نہ انہیں زہر کا احساس ہے۔
- حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے فرمایا ہے شریف سے اُس وقت ڈرو جب وہ مصیبت میں ہو اور کمینے سے اُس وقت بچو جب وہ اقتدار میں ہو۔
- شریف سے کون ڈرتا ہے لوگوں نے خُدا سے ڈرنا چھوڑ دیا ہے اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کی بداعمالیوں سے ناراض ہو جاتا ہے تو اس پر ظالموں کو مسلط کر دیتا ہے۔
- مولانا ظفر علی مرحوم کا ایک شعر۔

بخشش سکتی ہو اسیری مری جن کو خوشیاں
للہ الحمد کہ میں نے انہیں خورسند کیا

پبلشر سرورؔ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے لیتھو کے صفحات خواجہ پرجیٹ سے ... جامع مسجد دہلی اور سرورق بائیلیٹ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند نبیت ۵۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

ڈاکٹر عمار رضوی کے نام کھلا خط

آپ کی توجہ بذریعہ خط اور اداریہ شذرہ میں مبذول کرائی گئی تھی کہ ۱۹۸۳ء کی مطبوعہ اردو کتابوں پر انعامی فیصلہ کرنے والی اتر پردیش اردو اکاڈمی کی کمیٹی کے بعض متعصب مسلمان ممبران نے ابوالبلاغت حضرت رتن پنڈوروی کی مایۂ ناز اور قابلِ قدر تصنیف "ہندی کے مسلمان شعرا" کو محض اس لئے انعام نہ دیا کہ اسے دفتر شانِ ہند نے شائع کیا ہے اور شانِ ہند نیز اس کے مدیر سے رشید حسن خاں صاحب کو اس لئے چڑھ ہے کہ یہ دونوں انہیں محقق اور نقاد تسلیم نہیں کرتے بلکہ ایک حد تک پڑھا لکھا دیہاتی سمجھتے ہیں۔ اس کمیٹی کے دو ممبران پروفیسر محمود الٰہی صاحب اور ڈاکٹر حکم چند نیّر نے کسی بھی کتاب پر رائے نہ دی (جیسا کہ انہوں نے خود بتایا) رام لعل صاحب اس کتاب کو انعام دیئے جانے کے حق میں تھے مگر ایک ممبر کی رائے پر کسی کتاب کو انعام نہیں دیا جا سکتا۔ پروفیسر شبیہ الحسن صاحب اور پروفیسر سید محمد عقیل نے رشید حسن خاں صاحب کی ہم نوائی کی۔ رہے جناب علی جواد زیدی تو وہ اس وقت اکاڈمی کے پریذیڈنٹ تھے اور اکاڈمی کے خلاف شانِ ہند لکھتا رہا۔

اتر پردیش اردو اکاڈمی سے متعلق جن حقائق پر شانِ ہند میں لکھا گیا۔ اس سے کسی کو اتفاق ہو یا نہ ہو مگر یہ وجہ کسی بہتر اور حق دار کتاب کو انعام سے محروم رکھنے کے لئے جواز کا درجہ نہیں رکھتی اور نہ ہی کسی کتاب کو اس بے جواز انعام سے محروم کیا جا سکتا ہے کہ انعامی کمیٹی کے کسی ممبر کو اس کتاب کے ناشر سے پرخاش ہے

لہٰذا انہوں نے مذکورہ کتاب کو اتر پردیش اردو اکاڈمی کی انعامی کمیٹی کے متعصب ممبران کی ذاتی پرخاش کے باعث انعام سے محروم رکھنا جہاں اخلاقی طور پر گناہ ہے وہاں قانونی طور پر بھی یہ امر قابلِ مواخذہ ہے کہ کسی حق دار کا حق کیوں مارا گیا۔ اس کتاب کا مصنف اور ناشر دونوں اتر پردیش کے باشندے نہیں ہیں یعنی یہ دونوں کسی طور پر بھی اتر پردیش کی حکومت کو ٹیکس ادا نہیں کرتے اور انہیں اس معاملہ کو قانون کے حوالے کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ اس اخلاقی بددیانتی کے پیشِ نظر چاہئے تو یہ تھا کہ جب اس ناانصافی کے خلاف آواز بلند کی گئی تو ان حضرات کو اتر پردیش اردو اکاڈمی کی ممبری وغیرہ سے الگ ہو جانا چاہئے تھا۔ اور اگر ان حضرات میں ایسی اخلاقی جرأت کا فقدان تھا تو آپ کو چاہئے تھا کہ انہیں اکاڈمی کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیتے کیوں کہ ایسے جانب دار اور ذاتی پرخاش کے باعث کسی کتاب کے ساتھ ناانصافی کرنے والے دانشوروں (حالانکہ ایسی صلاحیت رکھنے والوں کو دانشور کہنا دانشوری کی توہین ہے) کو اردو اکاڈمی کی کوئی ذمہ داری سونپنا مناسب نہیں ہے اس سے پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ اس کتاب پر مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے دو ہزار روپیہ بہار اردو اکاڈمی نے تین ہزار روپے انعام دیا اور دہلی اردو اکاڈمی نے اس کتاب کے ناشر کو دو ہزار روپیہ انعام دیا اور یہ ایسے حقائق ہیں کہ جن کی موجودگی میں اتر پردیش اردو اکاڈمی کی طرف سے اس کتاب کو نظر انداز کر دینے پر ملک کا ہر غیر جانب دار اردو داں لعنت ہی بھیج سکتا ہے۔ آپ چاہیں تو اس کتاب کو ملک

کے چند ایسے قابل اور نامور ادیبوں کو (جنھیں آپ خود تجویز فرمائیں) بھجوایا جا سکتا ہے جو اسے پڑھنے کے بعد یہ فیصلہ صادر کر سکیں کہ اس کتاب کو اتر پردیش اردو اکاڈمی کو نظر انداز کرنے میں حق بجانب تھی یا نہیں۔ ان حالات کے پیش نظر ہم یہ کھلا خط آپ کے نام شائع کر رہے ہیں کہ آپ ملک کی نمائندہ جماعت کانگریس (آئی) کے ایک لیڈر ہیں اس لیے آپ کسی رعایت کے بغیر اس سلسلہ میں خود ہی فیصلہ صادر فرمائیں کہ اس کتاب کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے یا نہیں۔ آپ کا فیصلہ ہمیں قابل قبول ہوگا۔ امید ہے کہ آپ اس کھلے خط پر حسب سابق خاموشی اختیار نہیں فرمائیں گے۔

مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی

ہندوستان ٹائمز نئی دہلی کی اشاعت ۳۱ مئی ۸۴ء کے صفحہ سوا پر اختشام قریشی صاحب نے مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی سے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھنے کے بعد یہ سوچنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ حکومت مدھیہ پردیش عمداً یہ اردو اکاڈمی کے ارکان کے ہاتھوں برباد کرانے پر تلی ہوئی ہے اور مدھیہ پردیش کے چیف منسٹر شری ارجن سنگھ محض ووٹوں کے حصول کے لئے چند لاکھ روپئے کے لقمے ہاکے تر مدھیہ پردیش کے چند واجبی پڑھے لکھے مسلمانوں کی طرف فراخ دلی سے نقل تابش صاحب سکریٹری مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی کے ہاتھوں پھنکوا رہے ہیں اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ وزیر اعلیٰ مدھیہ پردیش ان دھاندلیوں کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا رہے جو فضل تابش صاحب سکریٹری مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی سے منسوب کی جاتی ہیں ہم شان ہند کے آئندہ شمارہ میں اختشام قریشی صاحب کے ان انگریزی فرمودات کا اردو ترجمہ شائع کر رہے ہیں تاکہ اردو داں حضرات کو معلوم ہو سکے کہ انعام بازی ... سے متعلق انگریزی اخبارات میں کیا شائع ہو رہا ہے۔

دلی اردو اکاڈمی

دلی اردو اکاڈمی نے اپنے بجٹ ۸۴-۱۹۸۳ء میں دلی کے منتخب پچیس ۲۵ سینئر سیکنڈری اسکولوں کی لائبریریوں کے لئے انتہائی مختلف کتابوں کی پچیس پچیس جلدوں کی خریداری کی تاکہ ان اسکولوں کے طالب علم ان کتابوں سے فیض یاب ہوں۔

اردو اکاڈمی کا یہ اقدام واقعی قابل تعریف ہے مگر اس ضمن میں اگر کتابوں کا انتخاب کرتے وقت حسب ذیل ضروری باتوں کو ذہن میں رکھا جاتا تو مزید اچھا ہوتا۔

۱۔ ایسی کتابوں کے انتخاب کو ترجیح دی جاتی جو مطالعہ کرنے والوں میں قومی یک جہتی کے جذبہ کو ابھارنے کی موجب ہوتیں۔

۲۔ تمام مذاہب سے واقفیت بہم پہنچانے والی کتابوں کو بھی اس فہرست میں رکھا جاتا تاکہ طلبا انھیں پڑھنے کے بعد یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے کہ کوئی مذہب بھی دوسرے مذہب کے بارے میں نفرت کرنی واجب نہیں ہے اور مختلف مذاہب کی کتابوں کے مطالعہ سے طلبا کو یہ بھی پتہ چلتا کہ خدا ایک ہے، ہاں اس کو یاد کرنے کے طریقے الگ الگ ہیں مگر مرکز ایک ہی ہے۔

۳۔ جب یہ کتابیں محض اردو پڑھنے والے طلبا کے لئے ہی فراہم کی جا رہی تھیں تو پھر اس فہرست میں ان کتب کو بھی رکھنا ضروری تھا جن کے مطالعہ سے طالب علموں کو اردو صرف و نحو فصاحت و بلاغت اور دیگر ضروری امور کا علم ہو سکتا۔

۴۔ ایسی کتابوں کو اس فہرست میں شامل کرنا از حد ضروری تھا جو طالب علموں کا کردار بلند کرنے میں مددگار ہوتیں تاکہ بچوں میں اخلاق، تہذیب اور سماجی شعور بخوبی پیدا ہو سکتا۔

۵ - دلی کے ایسے نامور صحافیوں، ادیبوں اور شاعروں کی تصانیف کو اس فہرست میں شامل کرنا ضروری تھا جن کا یا تو انتقال ہوچکا ہے یا پھر وہ اب زندگی کی آخری منزل میں ہیں اور ایسی کتابوں کو تو لازمی خریدا جانا چاہئے تھا جو نایاب ہو رہی ہیں یا نایاب ہو چکی ہیں تاکہ ان لائبریریوں میں یہ کتابیں محفوظ ہو جائیں۔ مثلاً سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر "ریاست" (مرحوم) کی تصانیف ناقابلِ فراموش اور جذباتِ مشرق وغیرہ۔ مگر کیا ستم ظریفی ہے کہ اکثر کتابیں جو خریدی گئی ہیں وہ گورنمنٹ سینیئر سیکنڈری اسکولوں کے طلباء کی نسبت اس قسم کی ہیں کہ جیسے کسی اسلامیہ اسکول کے طلبہ کے لئے خریدی گئی ہوں۔ یہاں اس سلسلے میں سنی اور شیعہ دونوں مسلمان فرقوں کو شکایت کا موقع نہیں دیا گیا۔ اور کچھ کتابیں ایسی ہیں کہ انہیں یہ بیچارے طالب علم تو کیا ان کے استاد بھی صحیح طور پر پڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہوں گے بلکہ کچھ کتابوں کے ناموں کی صحت بھی نہ بتا سکیں گے۔ حیرت تو یہ ہے کہ ایسے نامور مصنفین کی تصانیف خریدی گئی ہیں۔ جنھوں نے ابھی ادبی دنیا میں قدم رکھا ہی ہے اور فہرست بنانے والوں نے مکتبہ جامعہ کی سرپرستی اپنا ایمان سمجھا ہے اور مکتبہ جامعہ کے بعد ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کو خوب خوب نوازا گیا ہے۔ جن کتابوں پر انعام دیا گیا ہے ان کی بیشتر کو فہرست میں رکھا گیا ہے مگر نہ معلوم ظفر ادیب صاحب کی [illegible] کالی داس گپتا رضا تحقیق و تالیف کی [illegible] کو اس فہرست میں کیوں شامل نہیں کیا۔ اسی طرح مکتبہ شانِ ہند کی دو مطبوعات "ہند کے مسلمان شعراء" اور "مان سروور" کو [illegible] کی بہترین اور معیاری کتابیں تسلیم کر کے انعام دیا گیا مگر ان کتابوں کو بھی فہرست میں شریک نہیں کیا۔

اس سلسلے میں ہم اردو اکادمی کے سکریٹری جناب [illegible] صاحب سے گزارش کریں گے۔ (اکادمی کے ممبران سے تو ہم کچھ کہنے کے مجاز نہیں ہیں) کہ وہ دلی اردو اکادمی کو دوسری اردو اکادمیوں سے بہتر رکھنے کی کوشش فرمائیں۔ اور جب بھی اکادمی کا کوئی ممبر اپنے فرائض ادائیگی میں ثابت قدم نہیں رہتا تو آپ کو چاہئے کہ ایسے ممبران کو ان کا فرض یاد دلائیں۔ ہم یہ بھی چاہیں گے کہ اردو اکادمی عوام میں پھیلی ہوئی اس افواہ کے بارے میں بھی اپنی پوزیشن صاف کرے کہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کے مالک خان صاحب کو اکادمی کی مختلف تقاریب کی تصاویر لینے کے سلسلے میں تیس ہزار کے قریب روپیہ ادا کیا گیا ہے کیونکہ قریب قریب ہر تقریب میں لی گئی سیکڑوں تصاویر کے رنگین البم بنوائے گئے ہیں۔ اور اگر اس قسم کی دیگر افواہیں بھی کسی حد تک ٹھیک ہیں تو پھر یہ کہنے میں باک نہیں کہ عوام کا یہ کہنا بجا ہے کہ اردو اکادمی دلی کے پاس سوائے تقاریب منعقد کرانے کے اور کوئی پروگرام نہیں ہے اور سرکار سے حاصل کیا ہوا عوام کے ٹیکسوں کا لاکھوں روپیہ محض ذاتی دکھاوے پر صرف کیا جا رہا ہے۔

امید ہے کہ اردو اکادمی کے سکریٹری صاحب اخراجات کی تفصیل سے عوام کو بذریعہ اخبارات آگاہ فرمائیں گے تاکہ پتہ چل سکے کہ عوام کا روپیہ اکادمی کے ہاتھوں میں بطور امانت محفوظ ہے یا نہیں۔

جے پور کا حلالی بچہ

شانِ ہند کے آئندہ شمارہ میں جے پور کے ایک البیلے حلالی بچے کا اصل خط جو اس نے ایڈیٹر شانِ ہند کو گالیوں اور دھمکیوں سے بھرپور لکھا ہے مع جواب کے شائع کیا جائے گا یہ شمارہ بھی جے پور کے اردو دوستوں کے لئے ایک یادگاری حیثیت رکھے گا اس لئے اسے حاصل کرنے کے لئے ایجنٹ اخبارات مسکین بک ڈپو کے یہاں اپنا پرچہ محفوظ کرا لیجئے۔

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر "ریاست" میں جہاں اور کئی خوبیاں تھیں وہاں اُن کی اس صفت کو اولین حیثیت حاصل تھی کہ انھیں اپنے احباب، بہی خواہوں، دوستوں ہمدردوں کا ہر وقت خیال رہتا تھا اگر خدانخواستہ ان کا کوئی دوست یا ہمدرد کسی مصیبت یا مشکل میں پھنس جاتا تو سردار صاحب کی نیند اُڑ جاتی تھی اور وہ ہر وقت اپنے دل و دماغ کو صرف اسی دھن میں مصروف رکھتے کہ اُن کا یہ دوست یا ہمدرد اس مصیبت یا مشکل سے کس طرح نجات پا سکتا ہے۔

مظفر نگر کے ایک شعبدہ باز مولانا نے بیسویں صدی کی بندیا کے بارے میں کسی اخبار میں مراسلہ شائع کرایا جس کے جواب میں میں نے خوشتر گرامی صاحب، مالک و ایڈیٹر بیسویں صدی کی حمایت میں اس مراسلہ کا جواب شانِ ہند میں دیا اور مولانا کی شعبدہ بازیوں کی اسلامی اور اخلاقی بدکرداری کے ساتھ ساتھ انھیں جھوٹا اور فریبی کو بھی ثابت کرتے کرتے اپنی عادت کے مطابق ایسی زبان کا استعمال کیا جو تعزیراتِ ہند کی رو سے قابلِ مواخذہ تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس شعبدہ باز مولوی نے مظفر نگر کی عدالت میں ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا۔

میرے نزدیک ازالہ حیثیت عرفی کے مقدمہ کی اہمیت کچھ اہم اس لئے نہیں تھی کہ مقدمہ کرنے والے کو اپنی عزت اور توقیر کو ثابت کرنا ہوتا ہے اور مدعا علیہ کو یہ قانونی حق حاصل ہے کہ وہ مدعی کے آباؤ اجداد کی ذات تک کو اپنی فضائل مع رسوائی کے ساتھ ملحوظ رکھتے ہوئے اس کی خاندانی عزت و وقار پر بکھیر کر بیزار کرتے اور سماجی نیز دلیل کے ساتھ یہ ثابت کرے کہ مدعی اُس عزت و وقار کا مالک ہے ہی نہیں جس کا تحفظ وہ چاہتا ہے۔

میں نے بیماری، مقدمہ بازی اور عشق میں کبھی کنجوسی نہیں کی کیونکہ ان تینوں مدات میں جس نے بھی کنجوسی کی وہ یقیناً نقصان میں رہا مظفر نگر کے بہترین فوجداری وکیل کی خدمات حاصل کی گئیں دلی سے میرے دوست وکیل گیان جی (جو آجکل لندن میں وکالت کرتے ہیں) ہر پیشی پر میرے ساتھ مظفر نگر جاتے کرم الاحسانی اور دیگر احباب بھی ہم سفر رہتے۔ مقدمہ کسی آنریری مجسٹریٹ کی عدالت میں زیرِ سماعت تھا جو بارہ بجے سے پہلے عدالت میں تشریف ہی نہیں لاتے تھے مظفر نگر کچہری سے ملحق ایک صاف ستھرا ریسٹورنٹ تھا کچہری کے احاطہ میں داخل ہونے سے پہلے اس ریسٹورنٹ میں دوپہر کے کھانے کا آرڈر دیا جاتا اور جب تک مقدمہ کی پیشی نہ ہوتی مظفر نگر والے وکیل صاحب کے چیمبر میں خوب گپ شپ رہتی مظفر نگر کے شعرائے کرام خصوصاً حضرت الم مظفر نگری (مرحوم) ہر پیشی پر عدالت میں تشریف لاتے اور کچھ دوسرے وکلاء حضرات کو بھی اس مقدمے سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی لہٰذا وکیل صاحب کے چیمبر میں اچھا خاصا جمگھٹا رہتا اور مقدمہ کی پیشی پکنک پارٹی کے طور پر گزر جاتی۔

مقدمہ کی جب تین سے زیادہ پیشیاں ہو چکیں، تو مجسٹریٹ نے حکم دیا کہ مدعا علیہ اپنی صفائی کے گواہان کی فہرست داخل کرے اور اگلی پیشی پر تمام گواہان کو پیش کرنے کے لئے چاہے تو دستی سمن عدالت سے لے لے میں نے اپنے گواہان کی فہرست میں سردار دیوان

مفتون ایڈیٹر "ریاست" مولانا عبدالباقی صاحب مدیر
روزنامہ "پیام" جناب گوپی ناتھ صاحب امن اور دہلی
کے ایک ایجنٹ اخبارات کے اسمائے گرامی رکھے
تاریخ مقررہ پر میں اپنے گواہان کے ساتھ جب عدالت
میں پیش ہوا تو فہرست گواہان پر ایک نظر ڈالتے ہوئے
مجسٹریٹ فرمانے لگے گواہوں میں تو بڑے بڑے ہوئے
نام نظر آرہے ہیں ہمارے وکیل نے سب سے پہلے
ایجنٹ اخبارات کی گواہی کو مناسب سمجھا کیونکہ مدعی
نے اپنے ابتدائی بیان میں کہہ چکا تھا کہ میں نے شانِ ہند
کا وہ شمارہ جس میں اس کی مبینہ بے عزتی کی گئی ہے۔
جامع مسجد دہلی کے ایجنٹ اخبارات سے خریدا تھا اور وہ
اسی ایجنٹ سے ہی تمام ایسے رسائل وغیرہ خریدتا ہے۔
جن میں مضمون کے بارے میں کچھ لکھا جاتا ہے اسی لئے
ہمارے وکیل نے مدعی کے اس بیان کی تصدیق ضروری سمجھی
چنانچہ ایجنٹ اخبارات نے مدعی کی تمام باتوں کی تردید
کی کہ یہ ہر ماہ شانِ ہند مجھ سے خریدتے ہیں اور یہ شمارہ
بھی مجھ سے ہی خریدا تھا جس شمارہ میں کہ ان کی بے عزتی
کئے جانے کی انھیں شکایت ہے اس کے بعد سردار
دیوان سنگھ مفتون گواہی کے لئے جب کمرۂ عدالت
میں جب داخل ہوئے تو کچھ دیر تک عدالت میں موجود
سب حضرات اور مجسٹریٹ صاحب انھیں دیکھتے رہے
سردار صاحب کی گواہی شروع ہوئی تو سردار صاحب نے
میرے وکیل کے سوال کو درگزر کرتے ہوئے عدالت سے
مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ میرے خیال میں معزز عدالت
کو مدعی کے اس بیان کے بعد کہ اس نے شانِ ہند کا
یہ متنازعہ شمارہ دہلی میں خود خریدا تھا اس مقدمہ
کی سماعت نہیں کرنی چاہئے تھی کیونکہ مدعی کی بے عزتی
اگر شانِ ہند میں کی گئی ہے تو اسے مدعی نے دہلی میں
خرید کر پڑھا لہذا اس مقدمہ کی سماعت مظفر نگر
کی بجائے دہلی کی عدالت میں ہونی چاہئے اور مدعی کو
مقدمہ دہلی میں دائر کرنا چاہئے تھا کیوں کہ مظفر نگر میں
ایڈیٹر شانِ ہند کی نسبت مدعی نے خود اپنی بے عزتی کی
لہذا میرے خیال میں یہ سماعت غیر قانونی ہو رہی ہے
اس پر عدالت کا عملہ خصوصاً مجسٹریٹ صاحب ایک دوسرے
کا منہ دیکھنے لگے اور مجسٹریٹ صاحب نے خاص رعونت
کے ساتھ فرمایا کہ یہ فیصلہ کرنا ہمارا کام ہے کہ ہم اس
مقدمہ کی سماعت کر سکتے ہیں یا نہیں گواہ صفائی گواہ کو
کا کوئی اختیار نہیں ہے اس پر سردار دیوان سنگھ مفتون
بھی جلال میں آگئے اور کہنے لگے کہ شاید معزز عدالت
بھول رہی ہے اس امر کا فیصلہ اب اس کے اختیار میں
نہیں ہے بلکہ سیشن کورٹ کے اختیار میں ہے اب صورت
حال خاصی دلچسپ ہو گئی تھی مجسٹریٹ فرما رہے تھے
میں آج ہی تمام گواہیاں لینے کے بعد دو دن بعد بحث
کی تاریخ دینا چاہتا ہوں اور بحث سننے کے بعد اسی
روز فیصلہ دینا چاہتا ہوں اور آپ لوگ کہہ رہے
ہیں کہ یہ عدالت اس مقدمہ کو سننے کی مجاز نہیں
ہے اتنے میں میرے وکیل نے درخواست لکھ کر معزز
مجسٹریٹ کے سامنے رکھ دی کہ مدعی کے اس بیان
کے بعد آپ مقدمہ کی سماعت نہیں کر سکتے کیونکہ
یہ معاملہ دہلی عدالت سے تعلق رکھتا ہے مجسٹریٹ
صاحب نے وہ درخواست مسترد کر دی اور وکیل صاحب
نے دوسری درخواست عدالت کے سامنے رکھ دی
کہ ہم آپ کے اس آرڈر کے خلاف سیشن کورٹ
میں ریویژن کر رہے ہیں چنانچہ مجسٹریٹ صاحب
کو مجبوراً سماعت ملتوی کرنی پڑی کمرۂ عدالت
سے باہر نکلے تو مولانا معمرباز کے وکیل نے مدعی
[illegible] شروع کرنا ہے پہلے میری سابقہ فیس کا
حساب کر دو تو میں سیشن کورٹ میں ریویژن کی پیروی
کروں گا مولانا معمرباز قریباً ایک ڈیڑھ سال تک
عدالت کا طواف کر کے تھک گئے [illegible] تو

…اری رازداری کے ساتھ سردار دیوان سنگھ مفتون کو الگ لے جاکر کہنے لگے کہ سردار صاحب ہر پیشی پر اتنا خرچ کرتے ہیں۔ اگر آپ ان سے میرے وکیل کی بقایا فیس کا ڈیڑھ سو روپیہ دلوادیں تو میں مقدمہ واپس لے لیتا ہوں سردار صاحب نے میری لاعلمی میں ہی مولانا معمہ باز سے کہا کہ جائیے آپ مقدمہ واپس لینے کی درخواست لکھوا لائیے اور عدالت میں پیش کرکے مقدمہ ختم کرا دیجئے ڈیڑھ سو روپئے آپ کو میں ابھی دلوا دوں گا۔ مولانا معمہ باز اپنے وکیل سے سرگوشی کرتے ہوئے درخواست لکھوانے چلے گئے۔ اور سردار دیوان سنگھ مفتون نے کمرۂ عدالت میں جاکر مجسٹریٹ صاحب سے گزارش کی اگر یہ مقدمہ مدعی واپس لے لے تو عدالت کو تو کوئی اعتراض نہیں ہے مجسٹریٹ صاحب فرمانے لگے کہ اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے چنانچہ دس پندرہ منٹ بعد مولانا معمہ باز ہندی میں لکھی ہوئی درخواست معہ اپنے وکیل کے لے کر عدالت کے کمرہ میں داخل ہوئے اور مدعی کے وکیل نے درخواست مجسٹریٹ صاحب کے سامنے رکھی اور مجسٹریٹ صاحب نے درخواست منظور فرماتے ہوئے اہلمد سے کہا مولانا صاحب آپ نے اچھا کیا ورنہ یہ مقدمہ نہ معلوم تمہارے لئے کتنی مشکلات پیدا کرتا کمرۂ عدالت سے باہر نکلتے ہی سردار صاحب نے اپنے کوٹ کی جیب سے سو سو روپئے کے دو نوٹ نکالے اور مولانا معمہ باز کو دیتے ہوئے فرمایا کہ ڈیڑھ سو روپئے تو آپ اپنے وکیل کی بقایا فیس ادا کیجئے اور باقی پچاس روپئے اپنی ضروریات کیلئے سردار صاحب نے یہ روپیہ مجھ سے چھپا کر دیا راستے میں فرمانے لگے کہ سردار صاحب مجھے دراصل معلوم ہو چکا تھا کہ اس پر مجسٹریٹ پر سنگھ ای اصحاب سے اثر ڈلوایا گیا تھا کہ ایڈیٹر شانِ ہند کو سزا ضرور دی جائے اس لئے میں چاہتا تھا کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ اس لئے میں نے اس مقدمہ کو ہی ختم کرادیا۔ اور اس باعزت انداز میں کہ جس میں مدعی ہر طرح سے ہار گیا۔

غزل

سینیر پرکاش شرما آشفتہ
(گوردو بحشیتیر)

عجیب شے ہے تجسس کی کارفرمائی
تعینات کی حد سے نظر گزر آئی
ہر ایک شخص تھا اپنا جہاں تماشائی
حیات ایسی منازل سے بھی گزر آئی
اسی کو کہتے ہیں بے شک مقامِ یکتائی
زباں پہ بات جو آئی وہ پھر اتر آئی
نہ روپ ہی کوئی اُس کا نہ شکل ہی اُسکی
ازل سے ہے مجھے جس شخص سے شناسائی
مجھی سے میری حقیقت کو جاننے والو!
بحر کو بھی نہیں معلوم اپنی گہرائی
جلا کے رکھ دیا جس نے نشیمنِ دل کو
ہے اسی کے حسن کا کوندا کہ برق لہرائی
تصورِ عشق نظر آئیں گے جہاں تو
اگر [illegible] شریکِ بینائی
ہر اک خیال ہے میرا وسیع دلا خود
ہر ایک بات میں میری رموزِ گہرائی
تمہوکی تو ہیں لے کر وہ خاک سے اٹھا
گیا نہ تحمِ کلاب کر کبھی ذوقِ پیدائی
ہوا نہ سرد کبھی سوزِ دل ہواؤں سے
ہمارے کام جو سیلاب آئی تو چشمِ تر آئی
جنونِ شوق نے کھولے ہیں پیہم کے در پُر نور
جنونِ شوق کی اللہ رے کار فرمائی
ہے مقابلۂ آشفتہ یہ فاتحانہ غزل
فسونِ ظلمتِ اوہام توڑ کر آئی

گوشۂ عقیل صدیقی

مشاعرہ گھانا کھنڈی

کریم الاحسانی

گھانا کھنڈی (سہارن پور) تک جانے کے لئے راستہ ناہموار ہے سڑک سے دور یہ گاؤں ہے ڈاکٹر لیلین صاحب وہاں تک جانے کے لئے سواری کا انتظام کرا دیتے ہیں اگر کوئی شاعر دیر سے آتا ہے تو اسے تقریباً ۲½ کلومیٹر پیدل ہی یہ راستہ ناپنا پڑتا ہے۔ مدعو شعراء کی اکثریت وقت مقررہ پر گاؤں پہونچ گئی ہے دوپہر کا کھانا جو کہ پُر تکلف تھا کھا کر اسکول کا رُخ کیا یہ مشاعرہ اسی اسکول کے میدان میں ہو رہا ہے حدِ نظر تک ہرے بھرے لہلہاتے کھیتوں کا ایک دلکش۔ روح افزا اور جاذب نظر منظر دعوتِ نظارگی دے رہا ہے شامیانہ کے سایہ میں سامعین اور ادب نواز حضرات جمع ہوئے ہیں۔ اسٹیج پر شعرائے کرام نظر آ رہے ہیں! تین بج چکے ہیں اور مجوزہ صدر قاضی رشید مسعود ایم۔پی صاحب کو علاقہ کے لوگوں نے اپنی شکایات اور تکالیف سنانے میں دیر کر دی ہے ایم پی صاحب سی قدر تاخیر سے پہنچے ہیں محمد احمد ساحل (یکم اپریل ۸۴ء آپ یکم اپریل کا نام سن کر مسکرائے تو نہیں—؟) صدارت کے لئے قاضی رشید مسعود ایم پی کا اسم گرامی پیش کر رہے ہیں جن پر تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں ایم۔پی صاحب اسٹیج پر رونق افروز ہو گئے ہیں اور ساتھ ہی نظامت کے لئے نواز خاں نواز دیوبندی کو زحمت دے رہے ہیں کہ مشاعرہ چلائیں پھر صدر محترم سے چند کلمات کے لئے التماس کی جا رہی ہے صدر صاحب فرما رہے ہیں۔

بزرگو۔ دوستو۔ نوجوانو۔ اس دور میں جبکہ اردو کے نام پر دو لوگوں کی تجارت یا اس کے نام پہلیک جنگ کی تیاری ہو رہی ہے اور اردو کا بل اسمبلی میں پیش کیا ہوا ہے اس کا حشر اور فیصلہ معلوم — اردو ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت ہے اردو اس ملک میں قوت برداشت کی زبان ہے —— تالیاں —— کچھ اردو کی نجات اور کچھ مخالفت پر لگے ہوئے ہیں۔ بل آنے سے پہلے میں سمجھ رہا تھا کہ دیر آید درست آید لیکن اب بیان کر خاک شدہ کسی بھی اردو درخواست کے ساتھ ہندی میں وہی درخواست چسپاں کرنے کا اعلان ہوا ہے یہ شرط کتنی مضحکہ خیز ہے اس طرح اُلجھانے سے کیا فائدہ ہے اور آپ تالیوں کی جھنکار میں دیر سے آنے کی معذرت کر کے اپنی جگہ آ رہے ہیں۔ نواز دیوبندی نعت شریف سے مشاعرہ کا افتتاح کر رہے ہیں

اب نیند ہے نہ بیداری سرکارِ دو عالم سبحانا
یہ کیا عالم طاری ہے سرکارِ دو عالم سیدنا
ہم ایسا قصہ رکیوں کر لیں محشر میں نہ جانے کیا ہوگا
جب آپ کی ذمہ داری ہے سرکارِ دو عالم سیدنا

نواز صاحب محفل کو گرما کر لوٹ رہے ہیں پھر مشرف سہارنپوری ایک طویل استقبالیہ منظوم سنا رہے ہیں دو ایک بند سنیئے

آکے عزت میرے قصبہ کی بڑھانے والے
شکریہ تیرا ادا کرتے ہیں گھنڈے والے

اے کہ اربابِ سیاست میں ہے ممتاز بہت
رہنمائی پہ تری آج ہمیں ناز بھی ہے
رہنمائی کی نئی شان دکھانے والے

تو مری فکر ہے اب پیار کی ۲ تیسرا نغمہ

قوم کا درد تری روح کی پہنائی میں
قوم کی بگڑی ہوئی بات بنانے والے

شرف صاحب داد وصول کئے چلے جاتے ہیں اور ظہیر عباسی غزل سرا ہیں ؎

ہر نقشِ محبت کو مٹا کیوں نہیں دیتے
اک بار ہی جی بھر کے سزا کیوں نہیں دیتے
گر آپ کی نظروں میں خطاوار ہوں میں ہی
پھر مجھ کو سرِ دار چڑھا کیوں نہیں دیتے
طوفاں و تلاطم سے اگر ساز نہیں تو
کشتی کو کنارے سے لگا کیوں نہیں دیتے

ظہیر صاحب بھی داد لے کر اپنی جگہ آ بیٹھے ہیں اور نسیم شمائلی سہارنپوری غزل پیش کر رہے ہیں ؎

کون دل پر شامِ غم چھایا رہا کیسے کہیں
کچھ مسافر کا راز اے بادِ صبا کیسے کہیں
عشق میں ہر جیب و دامن داری خدا ہی ٹھہری تو ہم
کس کو اچھا کہہ دیا اس کو برا کیسے کہیں

سب شعرا بھی داد دینے پر مجبور ہیں ورنہ خوش گپیوں میں مصروف تھے اور آپ شغل کو گرما رہے ہیں ؎

جس کو منزل کا پتہ ہے اور نہ اپنی خبر ہو
ایسے گمراہوں کو رہبر کیسے کہیں

تو خدا کا نا خدا بھی یہ حقیقت ہے تو پھر
تیرے بندوں کو خدا ہم اے خدا کیسے کہیں

نسیم صاحب داد سمیٹے مائک سے جدا ہو رہے ہیں اور عبدالقادر وفا فرما رہے ہیں ؎

کیا منزلِ ترقی کا اردو نشاں نہیں
اردو تو رہنما ہے مگر کارواں نہیں

اردو کی روشنی ہے ہر سمت جابجا
وہ کونسی جگہ ہے جہاں ضو فشاں نہیں

واہ واہ کا ہلکا سا شور ہوا ہے اور آپ سنا رہے ہیں ؎ - اپنے قلم کے دام لگاتے ہیں آپ بھی

شاعر ہمارے دور کے کتنے عجیب ہیں۔

وفا صاحب داد لئے جا رہے ہیں اور انور سہارنپوری فرما رہے ہیں ؎

داد بے جا ہے تم مجھ کو نواز دو تو سہی
میرے جذبات کس طرح ابھار دو تو سہی
مری تقدیر بگڑتی ہے بگڑ جانے دو
اپنی بکھری ہوئی زلفوں کو سنوار دو تو سہی

انور صاحب ہنسی مذاق میں بھی کیوں کہ وہ جیتے ہیں اب انور بن گئے یار لوگ اسی رنگ میں سننا چاہتے تھے اور سیف اللہ خالد غزل چھیڑ رہے ہیں ؎

کچھ سوچ کے لپٹے ہیں یہ کانٹے ترے دامن سے
کانٹے ہی سہی لیکن منسوب ہیں گلشن سے
وہ عشق نہیں کامل جو وصل کا طالب ہو
وہ حسن مکمل ہے جو چھپ گیا چلمن سے

خالد صاحب بھی داد سمیٹے چلتے ہیں اور حسرت گنگوہی فرما رہے ہیں ؎

گردشِ خوں میں ہے رازِ زندگی پنہاں یہاں
خون کے قطرہ دل میں جنبش ہے نبضِ حیات

کچھ صیاد نے قفس کو مرے وسعتیں تو دی
لیکن جبھی سے اس کی نگاہ سخت گیر ہے

حسرت صاحب ایک طویل نظم سنا کر داد وصول کئے جا رہے ہیں اور اسلام انجم متانت سے فرما رہے ہیں ؎

بدلے جو نظامِ عالم کو وہ فہم و فراست آج کہاں
دیکھیں جو ہزاروں پردوں میں وہ اہلِ بصیرت آج کہاں
رجحان نئے ہر بات نئی یہ دورِ ترقی خوب سہی
جو روک لے سیلِ باطل کو وہ خوں میں حرارت آج کہاں
کس طرح کوئی ہونٹوں کو سئے اس کرب و بلا میں کیسے جئے
انساں کا لہو انساں ہی پئے جینے کی حلاوت آج کہاں

انجم صاحب خوب خوب داد حاصل کئے کامران پلٹ

رہے ہیں اور اب محفل کا رنگ بدلنے کے لئے نواز دیوبندی
آگئے ہیں فرمائشوں کو شنی ان شنی کرتے ہوئے غزل سرا
ہیں ؎

جہاں سجدے ہیں اس جا در نہیں ہے
ہر اک جا تو خدا کا گھر نہیں ہے
مرا رونا نہ رونا ہے برابر
اگر دامن تمہارا تر نہیں ہے
ہمارا عکس کیوں ہو آئینہ میں
ہمارے ہاتھ میں پتھر نہیں ہے

نواز صاحب محفل کو گرما کر داد و تحسین لوٹتے اپنی جگہ آکر
زحمتِ سخن دے رہے ہیں ظہیر اسعدی کو۔ ظہیر صاحب
فرما رہے ہیں ؎

تبصرہ آپکا سچ ہے لیکن
آئینہ خود بھی تو دیکھا ہوگا
داد لوگوں نے دغا کی پائی
یہ تو افسانہ پرانا ہوگا
گردِ ایام اڑا کر دیکھو
اپنے چہروں سے بھی دھوکا ہوگا

ظہیر صاحب داد لوٹتے مائک سے جدا ہو رہے ہیں اور
اور اس رنگ کو دو آتشہ کرنے کے لئے سکندر حیات
غزل الاپ رہے ہیں ؎

اتنا ڈھونڈا ہے تجھ کو راہوں میں
آبلے پڑ گئے نگاہوں میں ۔ ۔ ۔

دوسرے مصرعے پر شاعرانہ داد دی جا رہی ہے اور
حیات صاحب لہک رہے ہیں ؎

ذمہ داری کا تاج ہے سر پر
ہم بھی ہیں گھر کے بادشاہوں میں
یہ مرے عہد کی امانت ہیں
یہ جو بیٹھے ہیں خانقاہوں میں
قتل جس نے کیا ہے انساں کو

آج شامل ہے بے گناہوں میں

حیات صاحب گیت کی فرمائش کو شنی ان شنی کرکے
داد و تحسین لوٹتے مائک سے کھسک رہے ہیں اسی اثنا
میں حضرت احسان دانش کا ایک مطلع یاد آیا ہے سنیئے ؎

جب سے وہ ہیں مری نگاہوں میں
پھول ہنستے ہیں شاہراہوں میں

دیکھا تو واصف نظامی اپنے ترنم کے یوں جوہر دکھا رہے
ہیں ؎

وہ ہم ہیں جو بڑھتی ہوئی ظلمتوں میں
لئے روشنی کا علم جا رہے ہیں
ذرا دیکھئے ان کی منزل کہاں ہے
کہاں اب یہ اہلِ حرم جا رہے ہیں
ہے کیا بزم کا رنگ ہم سے نہ پوچھو
کہ ہم ان کی محفل میں کم جا رہے ہیں

واصف صاحب خوب خوب داد سمیٹے چلتے بنے اور
کاشف سہارنپوری حسب عادت رواں دواں
سنا کر ریل آتی ہے ریل جاتی ہے کے مصداق جا
رہے ہیں اور ایک نوعمر بچو نگڑ اشکیل رومانی نرنی رنگاتی
غزل سنا کر اس کا ستیاناس کر رہا ہے سنیئے ؎

درد و غم کی شدت سے اشک جب نکلتے ہیں
رات کے اندھیرے میں کچھ چراغ جلتے ہیں

حیرت ہے کہ ساحل صاحب نے اب اس مقام پر ایسے
نوعمر لڑکے سے کیوں پڑھوا دیا جبکہ مشاعرہ اب عروج پر اور
مقام پر ہے لیکن اس شوق کا کیا علاج آیئے اب مجھ سے
سے بھی دو قطعے سنیئے ؎

ایسے عالم میں دوستو کیسے
حرفِ مطلب زباں پہ آتا ہے
جب گداگر کو دیکھ کر زردار
دفعتاً لڑکھڑا سا جاتا ہے

کیا قدر و منزلت تھی یہ غالب سے پوچھئے
جس کو بڑے خلوص سے تھا بوریا کہا
شاید کسی فقیر کے آنے کی تھی خبر
اور لطف یہ کہ گھر میں کوئی بوریا نہ تھا

لیجئے اب ایک شگفتہ غزل ساحل سہارنپوری سے سنیئے ؎

کمان کھنچ گئی اب تیر چلنے والا ہے
ذرا سی دیر میں نقشہ بدلنے والا ہے

مطلع تو علی نور۔ ترنم شعلہ سا لپک رہا ہے اس پہ پُر لطافت یہ کہ مخلص اور سادہ ماحول داد لفظ مروج سے سوا ہے کئی بار دہرا کر محفل کو گرما رہے ہیں ؎

حدودِ ضبط سے باہر نکلنے والا ہے
سنبھال خود کو سیاہی اگلنے والا ہے
ہر اک شگون نے جیتا اسے پسند نہیں
ضرور پھر وہ کوئی چال چلنے والا ہے

پھر داد نے ہنگامے کا روپ دھار لیا ہے اور آپ یوں سحر کاری کر رہے ہیں ؎

وہ رکھ رکھاؤ میں رکھتا تھا کہ بدحواس مگر
وہ انگلیوں کے اشاروں پہ چلنے والا ہے
یہ دور ختم ہوا تو زمانے کی ریت ہے ساحل
کہاں ممکن ہے کوئی ہاتھ ملنے والا ہے

ساحل صاحب تالیوں کی جھنکار میں فرمائشوں کو نظر انداز کر کے چپ چاپ چلے گئے اور داد دیجئے نواز صاحب کو کہ انہوں نے اس عالم میں کسی ایسے ویسے شاعر کو قربانی کا بکرا بننے سے بچا لیا اور ریاض جونپوری کو دعوتِ نغمگی دی ہے ریاض صاحب غزل سرا ہیں ؎

بات پرسوں بر سر پیمان ہے
بات جیسا ہی روانی ہے
ہر جنم سے اس کا کیا رشتہ
وہ فرشتہ تو آسمانی ہے
کیوں اتاروں بدن سے گردِ سفر
یہ وفاؤں کی شیروانی ہے
سیپ دریا میں بھی رہی پیاسی
کتنی خوددار زندگانی ہے

ریاض صاحب بھی کامراں پلٹ رہے ہیں اور تالیوں کی جھنکار میں مشہور مترنم شاعر عزیز نہٹوری آ کر فرمائش پر توجہ نہ کرتے ہوئے فرما رہے ہیں ؎

وہ اتنا ڈر چکا ہے تقاضوں کی چیخ سے
کتنا بلاؤ گھر سے نکل کر نہ آئے گا

داد کا سابقہ ریکارڈ بھی جھوم رہا ہے اور آپ غزل سے سحر کاری کرنے چلے ہیں ؎

آج تو تیرے لئے اشک بہاتا ہو گا
کل وہی شخص ترے خون کا پیاسا ہو گا
مجھ سے مرے دل برباد کی حالت پوچھ
تو نے مرجھایا ہوا پھول تو دیکھا ہو گا۔
ہنس کے ہر رنج و مصیبت کو سہا ہے ہم نے
اس توقع پہ کہ کل آج سے اچھا ہو گا۔

اب داد دینے والے بھی بے حال سے ہو چلے ہیں اور آپ جھوم رہے ہیں ؎

تیرگی شبِ ہجراں سے ہراساں کیوں ہو
حد سے بڑھنے دو اندھیروں کو اجالا ہو گا
یہ مہ و مہر یہ تارے یہ شگفتہ چہرے
جس کے جلووں کا یہ عالم ہے وہ کیسا ہو گا

لیجئے داد تالیوں سے دی جا رہی ہے اور آپ تالیوں کی جھنکار میں ایک اور، ایک اور کے شور میں شاداں پلٹ رہے ہیں اور سلیم کھتولوی حسب عادت گرج اور برس رہے ہیں ؎

ہمارا کس جگہ ماتم نہیں ہے
تمہاری آنکھ پھر بھی نم نہیں ہے

دں ساتھی کوئی ہمدم نہیں ہے
ر خود اعتمادی کم نہیں ہے
ے مصرعہ پر شاعرانہ داد دی جا رہی ہے اور آپ
ہے ہیں ہے
ریفوں کا چلن اپنانے والو
شرافت کی سزا بھی کم نہیں
احب داد تو ہر حال میں وصول کر ہی لیتے ہیں لہٰذا
ین لوٹے مائک سے کھسک رہے ہیں اور اب
الوی صاحب آ کر عطا کر رہے ہیں ہے
رخ سے پردوں کو نصیب کے اٹھا کر دیکھو
لم کیا ہے حدِ انصاف پہ آ کر دیکھو
ر کے دل کا دکھانا تو کوئی بات نہیں
پنے دل میں بھی کوئی تیر چبھا کر دیکھو
تی صاحب کچھ تو بخل سے کام لے رہے اور کچھ
کی نزاکت کا بھی احساس ہے لہٰذا آپ دو
قطعے سنا کر مائک سے جدا ہو رہے ہیں اور مشاعر
روع ہو کر ۶ بجے شام ختم ہو رہا ہے۔
اکٹر یٰسین صاحب اور ان کے رفقاء کار لائق
ین ہیں کہ ایک پسماندہ اور خالص دیہاتی ماحول
اعرہ کرا دیتے ہیں اور آنے والوں کی خاطر مدارات
خوب کرتے ہیں حالانکہ وقت بہت ہی ملتا ہے
اراکین مشاعرہ خصوصاً ڈاکٹر صاحب تواضع میں
سر نہیں چھوڑتے ۔"

رنگِ دوراں

توصیف علوی عاصم
(کیرانوی)

رقص میں چار سو بجلیاں بجلیاں — آگ ہی آگ ہے آشیاں آشیاں
ہیں بہاریں فصلِ گُل ہے کدھر — ڈھونڈتا ہوں یہی گلستاں گلستاں
منزلوں کے نشاں خود چمکتے ہیں پھر — زخم دل ہوں اگر خوں فشاں خوں فشاں
وہ فسانے زبانوں پہ آ ہی گئے — جن کو رکھا گیا رازداں رازداں
آج شاید کہ کوئی نیا گُل کھلے — پھر وہ نظریں ہوئیں مہرباں مہرباں
جتنے بھی زندگی کے ہیں اُلٹے ورق — ایک ہی غم بنا داستاں داستاں
جن سے سیکھا ہے دُنیا نے طرزِ سخن — آج کیوں ہیں وہی بے زباں بے زباں
لُٹنے والوں کو آواز تک بھی نہ دی — یوں تو ہر سمت تھے پاسباں پاسباں
کس لئے ہے یہ تفریقِ دیر و حرم — ایک ہی جلوہ ہے آستاں آستاں
ہم نے ہی میکدہ کو دیا خونِ دل — ہم سے ہی ساقی ہے بدگماں بدگماں
جن کے ہاتھوں میں پرچم تھے قانون کے — ان کے دامن ملے خوں چکاں خوں چکاں
پھول لے کر بھی دُنیا نہیں مطمئن — ہم نے کانٹے لئے شادماں شادماں
ساز رہبر کا گر راہزن سے نہیں — کیوں یہ لُٹتے ہیں پھر کارواں کارواں
ہم نے مانا کہ صبح تمنا ہے یہ — پھر اندھیرے ہیں کیوں درمیاں درمیاں

جرم عاصمؔ کے بے انتہا ہی سہی
رحمتیں بھی تو ہیں بیکراں بیکراں

حضرت نازش حیدری دہلوی کا انتقال

حضرت نازش حیدری دہلوی کراچی میں ۱۷ فروری ۱۹۸۴ء کو انتقال کر گئے جس کی اطلاع اُن کی صاحبزادی نے جناب سلام ساگری صاحب کو اپنے حسب ذیل خط میں دی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ دنیائے اردو کا ایک اور نامور شاعر اس دنیائے فانی سے چلا گیا۔ ہندوستان میں نازش مرحوم کے سیکڑوں اُستاد بھائی اور شاگرد موجود ہیں لہٰذا ان کی اطلاع کے لئے ہم عزیزی نادرہ زاہد (صاحبزادی نازش حیدری دہلوی) کا وہ خط شائع کر رہے ہیں جو موصوفہ نے جناب سلام ساگری صاحب کو لکھا ہے۔

(ادارہ)

کراچی ۱۴-۴-۸۴

محترم سلام بھائی آداب۔

عرصہ ہوا آپ کا خط (جس میں آپ نے اپنے پاسپورٹ بن جانے اور کراچی آنے کے ارادہ کا اظہار کیا تھا) والد صاحب یعنی حضرت نازش حیدری دہلوی کے نام سے ملا۔ میرے ابا جی یعنی آپ کے اُستاد حضرت نازش صاحب حیدری دہلوی ۱۰ فروری تحریر خط کے وقت بقید حیات تھے لیکن ہائے سو رخ ۱۷ فروری ۱۹۸۴ء بروز جمعہ ۳ بجے دن میں وہ ہم سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہو گئے انا للہ۔۔۔ بس ابا جی چلے گئے خاموشی کے ساتھ سوتے سوتے چلے گئے بہت سارے دُکھ، محرومیاں اور یادیں لیکر چلے گئے ہم اُنہیں اور ان کا خیال بھول نہیں سکتے۔ میں بیان نہیں کر سکتی کہ ابا جی مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ہر لمحہ آپکو کس قدر یاد کیا بیماری کے دوران بیسیوں شعر آپ کی یاد میں لکھتے رہے جو ان کی وفات کے بعد ہمیں اُن کے تکیہ اور بستر کے نیچے سے دستیاب ہوئے، ان ہی اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابا جی مرحوم کو آپ سے بے پناہ محبت تھی اور آپ کا شدید انتظار بھی تھا۔

ایک بار نہ جانے خواب دیکھا یا کیا ہوا کہ ابا جی آپ کو لینے کے لئے اسٹیشن پہنچ گئے اور گھنٹوں اسٹیشن پر رہ کر ہر گاڑی دیکھتے رہے اور پھر شام کو گھر آکر خوب روئے کہ میرا سلام پاکستان آکر واپس چلا گیا چونکہ اسے لینے کے واسطے کوئی صبح سے اسٹیشن نہیں گیا تھا چنانچہ اس نے (آپ نے) ہمیں (ابا جی کو) تلاش کیا ہوگا۔ جب کوئی نہیں ملا تو وہ واپس انڈیا چلا گیا۔ ہم لوگ ابا جی کو سمجھا کر تھک گئے مگر وہ یہی کہتے رہے کہ نہیں وہ آیا تھا۔ اگر میں اسٹیشن جانے میں دیر نہ کرتا تو سلام واپس نہ جاتا۔

کراچی، لاہور، پنڈی اور کوئٹہ مڈل ایسٹ میں ابا جی کی موت پر تعزیتی شاعرے ہوئے اور اخبارات میں روئداد بھی شائع ہوئی ہیں۔ میں چند اخبارات کی کٹنگ (تراشے) آپ کے پاس بھیج رہی ہوں ابا جی کی صحت مندی کے زمانے کی تصاویر بھی اور ایک وہ تصویر بھی جس میں ابا جی اور امی جان میرے بچوں کے ساتھ بیٹھے ہیں یہ ان کی بیماری کے دوران کی ہے۔ آپ کو ان کی بیماری کی اطلاع دینے کا یہاں کسی کو ہوش ہی نہیں رہا۔ وہ پچھلے چھ ماہ سے اتنے شدید بیمار تھے کہ بستر پر بیٹھ بھی نہیں سکتے، بے یار و مددگار نہ کسی دوست شناسا کا خط آتا۔ نہ کوئی اُن سے ملنے آتا۔ بس تنہائی اور احباب کی بے اعتنائی کے غم میں گھُلتے چلے گئے۔ اور آخر کار اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ کاش آپ آجاتے، خیر خدا کو جو منظور تھا وہ ہو کر رہا۔ اب سوائے ایصالِ ثواب کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

ابا جی کی یاد میں جو شاعرے ہوئے ان میں پڑھے جانے والے اشعار میں سے چند شعر نقل کر رہی ہوں اور ساتھ ہی اُن کا مطبوعہ دیوان "صدیوں کا سفر" کی دو جلدیں بھی بھیج رہی ہوں یعنی جتنا کچھ میرے پاس ہے وہ بھی حاجی عبدالوہاب صاحب کے ہاتھوں آپ

کے پاس بھیج رہی ہوں اور یہ بھی اطلاع دے رہی ہوں کہ اُردو شعر و ادب کی خدمت کے صلہ میں پاکستان گورنمنٹ سے جو ابا کو وظیفہ ملتا تھا وہ اب امی جان کو ملنے لگا ہے ماہِ رواں یعنی اپریل سنہ ۱۹۸۴ء سے

یعنی صدیوں میں نظر آیا تھا ⁂ کر کے صدیوں کا سفر آیا تھا
کم تر ہنوں کے بھی گھر آیا تھا ⁂ وہ شہنشاہِ سخن ہوتے ہوئے
دل نازش کو شاد کرنا تھا ⁂ دَم تو بھرنے لگے ہو نازش کا
زندگی میں بھی یاد کرنا تھا ⁂ مر چکا ہے تو یاد کرتے ہو

(سیّد معراج جامی)

اب یہاں جانشینی کا مسئلہ درپیش ہے ابا جی کے تمام شاگرد خود غرض تھے چھ ماہ کی بیماری کے دوران کسی نے بھی ابا جی کی خدمت یا مزاج پرسی تک نہیں کی۔ اس لئے ہمارا دل گوارا نہیں کرتا کہ یہاں کسی کو بھی ابا جی کا جانشین بنائیں۔ ہاں اگر آپ اصلاح سے فارغ ہو چکے تھے اور پاکستان آسکے تو ہم آپ کو جانشین بنا دیں، آپ اپنا مکمل پتہ ضرور بھیجئے۔ آخری یہ ایک بات کہہ دوں کہ نہ صرف صحافیوں میں محترم جناب وقار پر کاش سرور تونسوی، گوپی ناتھ امن لکھنوی، خوشتر گرامی اور لبِ دہلوی ابا جی کے گہرے دوست تھے بلکہ ان بزرگ حضرات کے علاوہ اور بھی درجنوں صحافی، سیکڑوں شاعر اور ادیب ہزار زبان ادب سے دلچسپی رکھنے والے ہزاروں افراد ہندوستان میں ابا جی کے دوست اور پرستار ہیں اس لئے میں چاہتی ہوں کہ انڈیا میں رہنے والے، ابا جی کے تمام احباب کو ابا جی کی رحلت کی اطلاع ہو جائے کیونکہ آپ کی طرح وہ سب ہی لوگ ان کے سانحۂ ارتحال سے بے خبر ہوں گے۔ باقی خیریت ہے بھابی صاحبہ کو آداب بچوں کو دعا پیار۔ آپ اپنے مکمل پتہ کے ساتھ مجھے خط کا جواب ضرور دیجئے گا، میں بے چینی سے منتظر رہوں گی۔

آپ کی بہن
ناصرہ زاہد۔ کراچی (پاکستان)

غزل

حضرت نازش حیدری دہلوی (مرحوم)

کیا ہوئی گرامیٔ بازار خبر تو لاؤ ⁂ طالبانِ لب و رخسار خبر تو لاؤ
کہیں مقتل ہی میری زندگی کا شوق نہ ہو ⁂ کس کی پائل کی ہے جھنکار خبر تو لاؤ
مجھ سے آگے جو ہیں بڑھتے نہیں کیوں انکے قدم ⁂ کون ہے قافلہ سالار خبر تو لاؤ
رنجیدہ محفل ہر شخص نظر آتا ہے ⁂ سر پہ احساں ہے کہ تلوار خبر تو لاؤ
کون پہنچا ہے یقیناً سرِ معراجِ حیات ⁂ کون رقصاں ہے سرِ دار خبر تو لاؤ
دوستو دیکھو کہاں تھم گئے وقت کے قدم ⁂ کون ہے رات کے اُس پار خبر تو لاؤ

ہر بت سنگ تغافل ہمیں نازش تو نہیں
یا کوئی اور ہے فنکار خبر تو لاؤ

مرسلہ
سلام ساگری

میلی گٹھری کا بوجھ

رتن سنگھ

اس کے بوڑھے چہرے کی جھریاں موہنجوداڑو کے پتھروں پر کندہ ان تحریروں سے ملتی جلتی ہیں جن کے حروف کی الجھن تک کوئی واضح پہچان نہیں ہو سکی۔ اور ان جھریوں کے نقش آثارِ قدیمہ کی کھدائیوں کی طرح اس قدر بے ترتیب اور گہرے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اس بوڑھے کے چہرے پر بہت سی دراڑیں پڑ گئی ہوں اور ہر لمحہ یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ یہ شکستہ عمارت اب ٹوٹی کہ اب ٹوٹی۔ اس پر پریشانی یہ ہے کہ وہ بوڑھا ہر وقت اپنے لاغر جسم پر ایک میلی کچیلی بڑی سی گٹھری اٹھائے رہتا ہے۔ جس کے بوجھ کی وجہ سے اس کی بوڑھی کمر دوہری ہوئی رہتی ہے اور اس کے لئے ایک ایک قدم اٹھانا صدیوں کے فاصلے کو پاٹنے والی بات ہوتی ہے۔

اتنا بوجھ [illegible] پر لادے ہوئے [illegible] ایک [illegible] ہو جائے تب بھی کوئی بات نہیں لیکن اسے [illegible] گاؤں گاؤں گھاٹ گھاٹ گھومتے [illegible] زندگی کے اس سفر پر چلتے چلتے اس کے [illegible] کی ایڑیوں میں بڑی بڑی بوائیاں [illegible] ہیں جن سے ہر وقت لہو رستا رہتا ہے اور اس کے بوڑھے وجود پر [illegible] گرد و غبار اس قدر جم گئی ہے کہ قریب سے دیکھنے پر بھی اس کی زندگی کے اصلی نقش نظروں سے اوجھل ہی رہتے ہیں

اس سال وہ ہماری گلی میں اس وقت نمودار ہوا جب محلے میں ایک بارات آنے والی تھی۔ ہماری گلی باہری سڑک تک روشنیوں سے جگمگا رہی تھی ہر ایک نظر بار بار بارات کے انتظار میں گلی کے اس سرے کی طرف اٹھ جاتی تھی اس لئے جیسے ہی وہ بوڑھا اپنی جھکی ہوئی کمر لئے اور سر پر بھاری سی گٹھری اٹھائے نمودار ہوا۔ لڑکیوں کے جھنڈ میں ایک زوردار قہقہہ ابھرا کہ لو بھائی دولہا میاں تو آ گئے بارات کہاں رہ گئی۔ تبھی ہم سب نے اسے دیکھا۔

وہ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا جتنا قریب آتا گیا اتنا ہی مضحکہ خیز بنتا گیا۔ اس کے جھکے ہوئے وجود پر بھی گٹھری کو دیکھ کر ایسا گمان ہوتا تھا جیسے وہ ایک سوال کی صورت سب کے پاس آ رہا ہو سب جاننا چاہتے تھے۔ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کیوں آیا ہے؟ کس کے پاس آیا ہے؟ اور نہ معلوم کتنے سوال لوگوں کے ذہنوں میں اٹھ رہے تھے جب وہ اور قریب آیا تو اس کی گٹھری [illegible] پر باہر کی جانب الگ سے بندھے ہوئے [illegible] اپنے طرز کے جوتے کو دیکھ کر لڑکوں کی ٹولی میں سے [illegible] نے کہا۔ بابا جی جوتے گٹھری میں باندھ کر رکھ لو۔ اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا تو اسی ٹولی [illegible] ایک لڑکے نے فقرہ کسا بابا خود بھی گٹھری میں بندھ کر بیٹھ جاؤ۔ اتنا بوجھ اٹھائے کیوں پریشان ہو رہے ہو۔؟

بابا گٹھری میں بندھ کر بیٹھ گیا تو اسے اٹھائے گا کون؟ ان میں سے کسی نے سوال کر دیا۔

مجھے جس دن یہ گٹھری اٹھانے کو ملی۔ میں اسے دریا میں پھینک آؤں گا۔

"دریا میں پھینکنے کے لئے بھی تو تمہیں اس گٹھری کو سر پر اٹھانا ہوگا۔"
"اور سر پر اٹھانے سے تمہاری کمر دہری ہو جائے گی"
"اور تم بوڑھے ہو جاؤ گے۔"
"چہرے پر شکنوں کا جال پڑ جائے گا۔"
"اور پاؤں میں بوائیاں پھوٹ پڑیں گی جن سے لہو رس رہا ہوگا۔"

بوڑھا صاحب کے سامنے سے رینگتا ہوا آگے بڑھا تو ایک بزرگ نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا اور لوگوں کو ہٹاتے ہوئے بوڑھے کے لئے راستہ بنانے لگا۔ بوڑھے نے دکان کے ایک کونے میں پہنچ کر گٹھری کو زمین پر گرا دیا اور خود کو سیدھا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن [illegible] کے بوجھ سے جب ایک [illegible] کمر دہری ہو جائے تو پھر سیدھی نہیں ہوا کرتی۔

بوڑھا [illegible] زمین پر [illegible] بیٹھنے کے لئے [illegible] گیا [illegible] کے [illegible] اٹھنے [illegible] لوگ [illegible] جمع ہو [illegible] کوئی [illegible] کے [illegible] بوڑھے نے ہاتھ کے اشارے سے پانی کو [illegible] کے لئے اس طرح اشارہ کیا جیسے وہ پانی اسے [illegible] کرے گا۔ لیکن پانی دیکھ کر اس کے سوکھے ہونٹوں کی پیاس [illegible] آنکھیں [illegible] ہو گئیں۔ [illegible] سے گٹھری [illegible] انہیں کھولنے لگا۔ [illegible] ایک رسی اور [illegible] ہم لوگوں کی طرف دیکھا۔ جیسے پوچھنا چاہتا ہو کہ کنواں کہاں ہے؟

[illegible] طرح اس نے ہم لوگوں کا بنا ہوا کھانا بھی نہ [illegible] اینٹوں کے سہارے چولہا بنا کر کافی رات [illegible] وہ اپنے لئے کھانا بناتا رہا جس کی سوکھی روٹیاں [illegible] نے دی [illegible] رات اس نے [illegible] اپنے [illegible] کے سہارے گزار دی۔

اگلی صبح جب میاں والے گھر سے دور جانے لگا اس وقت ہم نے دیکھا بوڑھے نے ایک کونے میں اپنے ارد گرد [illegible] زمین پر کھینچ لی تھی تاکہ [illegible] ان لکیروں کی حدود کے اندر اس نے پانی [illegible] رکھا تھا۔ تین اینٹوں کے چولہے پر [illegible] رکھا تھا۔ اور وہ [illegible] ایک دھوتی باندھے کسی [illegible] [illegible] اس کی [illegible] خالی کشکول یوں جھانک رہا [illegible] [illegible] [illegible] ایک [illegible] تعویذ [illegible] ہم نے [illegible] اس گٹھری میں اور کیا کچھ ہے لیکن اس وقت [illegible] کے پاس [illegible] ہو گیا تھا۔ [illegible] سے باہر آ رہی تھی۔ [illegible] سب لوگ۔ [illegible] بوڑھے کو [illegible] کی طرف [illegible] جب تک ہم [illegible] روانہ کرتے [illegible] بوڑھا [illegible] جانے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا سارا سامان اپنی گٹھری میں باندھ لیا تھا۔ اس کا [illegible] طرح [illegible] گٹھر اسے [illegible] ہم [illegible] وقت [illegible] اٹھا [illegible]

[illegible] نے گٹھری اٹھوانے سے پہلے بوڑھے کے [illegible] کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "[illegible] نہیں لیتے ننگے پاؤں چلتے چلتے [illegible] سے لہو رس رہا ہے"

"یہ پرانے وقتوں کی نشانی ہے" جیسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بوڑھا نہیں بلکہ پرانی صدیاں بول رہی تھیں "[illegible] یہ مجھے بہت عزیز ہے" یہ کہتے ہوئے بوڑھے نے گٹھری پر ہاتھ رکھ دیئے جیسے کہہ رہا ہو [illegible]

اُٹھوادو۔

"ہم سب نے مل کر اس گٹھری کو اٹھانا چاہا تو وہ اٹھوائی نہیں جا رہی تھی۔

"ارے یہ تو بہت بھاری ہے۔ یہ بوڑھا اسے کیسے اٹھائے پھرتا ہے" کسی نے کہا۔

اتنے میں ... کچھ لوگوں کے ساتھ ادھر آتا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر ... کہا۔ ہمارا ایک ہی لڑکی کی شادی نے بیچارے کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ یہ بیچارہ بوڑھا ہو گیا ہے۔

ان پرانے رسموں رواجوں اور فضول بے جا خرچوں نے ہم سب کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ تبھی تو ہم سے یہ گٹھری اٹھائی نہیں جا رہی ہے"

جب ہم سب نے مل کر بڑی مشکل تمام اس گٹھری کو ان بوڑھے کے سر پر رکھا تو ایک لڑکے نے بوڑھے کو کہا۔

"بابا اب ہمارے گاؤں میں ... آ کر ہم سے دوبارہ نہیں اٹھوانا چاہتے۔ انہیں سے بتائے دیتے ہیں۔"

بوڑھا اپنی سیلی گٹھری اٹھائے آنکھوں میں نمی لیے ... کسی پگڈنڈی پر چل دیا تھا ... راستے اس کی گٹھری ... تھا"

غلط فہمی

احمد علی شاہ مخمور
(احمد پور شرقیہ)

انور اکثر رات کو گھر دیر سے لوٹتا۔ رات کے ایک دو بجے واپس آنا اس کا معمول تھا۔ والدہ اس کے انتظار میں اس کی واپسی تک جاگتی رہتی۔ اکثر وہ پوچھتی بیٹا اتنی رات گئے تک کہاں رہے روزانہ اتنی دیر کہاں رہتے ہو۔ تو وہ مسکرا کر کہتا۔ امی آپ فکر نہ کیا کریں میں بچہ تو نہیں ہوں جو گھر کا راستہ بھول جاؤں گا کیا آپ سمجھتی ہیں کہ میں بے راہ روی کا شکار ہوں زندگی کچھ حاصل کرنے کا نام ہے۔ رات گئے تک میں دوستوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ میں ان سے کچھ حاصل کرتا ہوں۔ وہ مجھ سے کچھ حاصل کرتے ہیں۔ مختلف موضوعات پر بحث و مباحثہ ہوتا رہتا ہے۔ ہم کیرم کھیلتے ہیں۔ وی۔ سی۔ آر پر اچھی اور معیاری فلمیں دیکھتے ہیں۔ ٹی۔ وی دیکھتے ہیں۔ تفریح سے اچھا وقت گزر جاتا ہے۔ اس کی والدہ کیا کہتی۔ بس صرف اتنا کہتی۔ بیٹے تفریح [illegible] کیا کم ہے۔ رات کو عشاء کی نماز کے بعد گھر لوٹ آیا کرو۔ تو مجھے کتنا سکون ملے۔ اگر جاگنے کا شوق ہے تو رات کو نفل پڑھ لیا کرو۔ درود شریف پڑھ لیا کرو۔ انور مسکرا دیتا اور کہتا۔ دین۔ دنیا۔ میل۔ ملاپ۔ زندگی کے دھوپ چھاؤں۔ رات دن سبھی انسانوں کے لیے ہیں یہ گھر کی چہار دیواری اس میں مقید رہنا صرف عورت کا کام ہے آپ گھر کی ملکہ ہیں۔ آپ گھر کی زینت ہیں۔ آپ کے دم سے گھر میں رونق ہے۔ ماں کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ اس نے پیار سے انور کی طرف دیکھا سوچا کہ بیٹا خود اپنے کمرے میں چلا گیا وہ گہری سوچوں میں غرق تھی انور کا والد دلاور شیر چونکا اور کہا کیا سوچ رہی ہو۔ تمہارا بیٹا دیر سے آتا اور دیر سے آتا رہے گا۔ میں نے بہت جتن کئے کہ رات کو باہر نہ جائے مگر صاحب بہادر کے گھوڑے پر سوار رہتے ہیں کس سے مس نہیں ہوتے۔ انور کی ماں نے خواب ناک لہجے میں کہا دلاور شیر تم سچ کہتے ہو۔ بے لگام گھوڑا کسی کی نہیں مانتا۔ اسے لگام ڈالنی پڑے گی۔ دلاور شیر مجھے تمہاری جوانی یاد ہے تم کتنے سرکش تھے تمہاری خون خاں اور ڈیل ڈول مجھے اچھی لگی۔ وہ تیور۔ وہ بانکپن وہ سوچ کا انداز سب کچھ تمہاری طرح۔ اب وہ تمہاری اکڑ فوں کہاں گئی۔ دلاور شیر مسکرایا اور کہا تمہارا ستارہ مجھ پر حاوی ہو گیا۔ ہم تو تمہاری سیاہ زلفوں اور خمار آلود آنکھوں میں ایسے گم ہو گئے کہ اپنی ہستی مٹا بیٹھے میری روح تمہاری روح میں سما گئی۔ دلاور شیر بیگم یہی سوچ رہی تھی۔ مرد کی لگام عورت ہے کیوں نہ اس کا بیاہ کر دیں۔ دلاور شیر نے بھرپور قہقہہ لگایا اور بلند آواز میں انور کو پکارا۔ انور دوڑ کر آیا جب اس کو اس قدر خوشگوار موڈ میں دیکھا تو حیرت میں مبتلا ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ رات کو دیر سے آنے کی وجہ سے اسے ڈانٹ پڑے گی۔ دلاور شیر نے کہا بیٹے بیٹھو۔ تم سے کچھ مشورہ لینا ہے دیکھو تمہاری امی تمہارے متعلق کیا سوچ رہی ہیں۔ انور نے کہا یہی کہ میں گھر دیر سے آتا ہوں مجھے گھر جلد لوٹ آنا چاہیئے۔ دیکھئے ابو! میں دنیا کے ساتھ ساتھ چلنا ہے۔۔ اس دنیا میں کچھ حاصل کرنا ہے۔ دلاور شیر نے انور کی بات کاٹ دی اور کہا بیٹے تمہاری سوچ بھی درست ہے اور تمہاری امی کی سوچ بھی درست ہے دونوں کے سوچنے کا انداز اپنے اپنے طور پر ٹھیک ہی ہے۔ مگر میں نے دیر سے آنے کا شکوہ تو نہیں کیا۔ ایک مشورہ لینا تھا۔ اس لیے ابھی اسی وقت ہی بلا لیا اور اسی وقت تمہارا

فیصلہ بھی سُننا چاہتے ہیں۔ اَبّو! فیصلے کا اختیار تو آپ کو ہے دلاور شبیر خوش ہو گیا اور کہا تو بس بات بن گئی۔ دیکھو بیٹے ہم تمھیں خوش دیکھنا چاہتے ہیں تمھاری ہر خوشی ہماری خوشی ہے۔ اس گھر کو خوشیوں کا گہوارہ بنا لو۔ اس گھر کے آنگن میں خوشیوں کے پھول مہکیں پھولوں کی سی شادابی تمھارے چہرے پر رقصاں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم تمھاری شادی نائلہ سے کرنا چاہتے ہیں انور نے کہا آپ کا ہر فیصلہ مجھے منظور ہے۔ نائلہ ہر زاویئے سے اچھی لڑکی ہے نائلہ کی سوجھ بوجھ اس کے سوچنے کا انداز اس کا خاندان اس کی شکل و صورت آبا حضور - جی چاہتا ہے آپ کے ہاتھ چوم لوں۔ مگر ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ میں ابھی زیر تعلیم ہوں۔ پہلے تعلیم مکمل کر لوں اچھی سی ملازمت کے بعد یہ قدم اٹھایا جائے گا۔ روحی بولی بیٹے تمھیں کس چیز کی کمی ہے ملازمت میں تمھیں کیا تنخواہ ملے گی۔ اپنی زمین کا کاروبار سنبھالو۔ ٹریکٹر۔ ٹیوب ویل۔ باغ کی نگہداشت زمین کی دیکھ بھال یہ سب کون کرے گا تم ملازمت پر چلے گئے تو ان چیزوں کا کیا بنے گا۔ دلاور شبیر بولا۔ آج کے لوگوں کے سوچنے کا انداز تو ٹھیک ہے اگر دیہات کے لوگ دیہاتوں میں نہ رہیں تو شہری بھوکے مر جائیں۔ اگر شہر کے لوگ فیکٹریاں کارخانے نہ چلائیں تو دیہات کا مال کہاں جائے۔ دیہات اور شہر دونوں ایک دوسرے کی ضرورت ہیں مگر مسئلہ تمھاری سمجھ کا ہے شادی کر لو پھر تعلیم بھی جاری رکھنا۔ اس میں ہم رکاوٹ تو نہیں بن رہے۔ جی چاہے تو ملازمت بھی کر لینا۔ مگر فی الحال بات کا ایجنڈہ تمھاری شادی ہے۔ انور بولا۔ ٹھیک ہے اَبّو جیسے آپ کی مرضی۔ دلاور شبیر بولا شاباش بیٹے۔ اب جاؤ سو جاؤ۔ انور چلا گیا تو دلاور شبیر بولا۔ روحی اب بہت جلد نائلہ کے والدین سے ملیں اور بات پکی ہو جائے۔ چند دنوں میں بات پکی ہو گئی۔ گھر میں خوب رونق ہو گئی۔ شادی کے دن قریب آ رہے تھے کہ ایک روز انور اپنی کار لے کر گیا اور پھر واپس نہ لوٹا ساری رات اس کا انتظار ہوتا رہا۔ مگر وہ نہ جانے کہاں چلا گیا تھا دوسرے روز تمام گھر والے پریشان رہے مگر انور نہ جانے کہاں تھا روحی کی تو حالت عجیب تھی۔ دلاور شبیر نڈھال ہو رہا تھا۔ دلاور شبیر کبھی غصے میں سرخ ہو جاتا اور کہتا آ جانے دو ایک مرتبہ اسے بتلا دوں گا اور کبھی غم سے نڈھال ہو جاتا۔ تین چار دن کے بعد تو ان حالت غیر ہونے لگی۔ اخبار میں ایک خبر تھی کہ چند میل کے فاصلے پہ ایک کار اور بس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے یہ سن کر تو ان کی بری حالت ہو گئی۔ فوراً وہاں پہنچے سڑک کے کنارے بس اور کار موجود تھی زخمیوں کو ہسپتال پہنچا دیا گیا تھا یہ کار ان کی نہ تھی پھر بھی وہ ہسپتال گئے تمام زخمیوں کی عیادت کی۔ مگر ان کا بیٹا کہیں نظر نہ آیا۔ مایوس واپس لوٹے وہ گھر جس میں خوشیاں ہی خوشیاں رقصاں تھیں ہر فرد کا چہرہ خوشیوں سے مہک رہا تھا۔ اب ہر شخص کے چہرے پر مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ گھر کی فضا اُداس اُداس دکھائی دے رہی تھی۔ انتظار کی ایک ایک گھڑی طویل سے طویل تر ہو گئی تھی وہ پریشان تھے حیران تھے کہ گیا تو کہاں گیا۔ کیا اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ وہ رات کو دیر سے آنے کا عادی تھا۔ مگر وہ آج تک گھر سے غائب نہیں ہوا تھا۔ اگر کبھی وہ ایک دو روز کے لیے جاتا تھا تو بتلا کر جاتا تھا۔ اس انداز سے جانا پریشانی کی وجہ تھی کبھی اس نے یہ بھی نہیں بتلایا تھا کہ شادی اس کی مرضی کے خلاف ہو رہی ہے۔ اس لیے سیدھے سادے انداز میں والدین کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کر دیا تھا پھر کیا وجہ ہو سکتی تھی سوچوں کی گتھیاں جوں جوں سلجھانے کی کوشش کرتے توں توں پریشانیوں کی الجھنیں بڑھتی جاتیں۔ ان کے سوچنے کی صلاحیتیں سلب ہو کر رہ گئی تھیں وہ زیادہ پریشان اس لیے بھی تھے کہ شادی کے دن قریب

سے قریب تر آ رہے تھے۔ اگر دلہن والوں کو پتہ چلا کہ انور گھر سے کہیں غائب ہو گیا ہے تو ہم کیا جواب دیں گے سوائے پشیمانی اور ندامت کے ہم کیا کریں گے۔ وہ یہی سوچ رہے تھے کہ باہر کچھ آوازیں بلند ہوئیں۔ شور بڑھتا گیا پھر تو کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ دلاور شبیر باہر نکلا دیکھا تو کچھ آدمی دنگا فساد کر رہے ہیں۔ ان کی لڑائی مار پیٹ دیکھنے کے لیے لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ پولیس آ گئی اور مجمع منتشر ہو گیا۔ پولیس دونوں پارٹیوں کو پکڑ کر لے گئی۔ پتہ چلا کہ دو بچے آپس میں لڑ پڑے تھے ان بچوں کی وجہ سے ان کی مائیں آپس میں لڑ پڑیں پھر بات مردوں تک پہنچی اور نوبت تھانے تک پہنچی۔ آگے شاید عدالتوں کے چکر کاٹنے پڑیں۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ تھانیدار صاحب نے ان کی صلح کرا دی تھی دونوں سے تحریر لے لی تھی کہ آئندہ وہ آپس میں نہیں لڑیں گے۔ ان دونوں کو دیکھ کر دلاور شبیر اور روحی اور پریشان ہو گئے کہ کہیں اس کی کسی سے لڑائی نہ ہو گئی ہو۔ نہ جانے وہ کس حال میں ہوگا۔ ابھی وہ نہ جانے کیا کیا سوچ رہے تھے کہ ایک اعلان سنائی دیا۔ دور سے اسپیکر کی آواز آ رہی تھی۔ اتنا پتہ چلا کہ کوئی گم ہو گیا ہے۔ جب دلاور شبیر کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ وہ بھاگ کر باہر گیا۔ کچھ دیر بعد مایوس لوٹا۔ اس کی مایوسی [illegible] تیز ہو رہی تھی۔ دلاور شبیر خود [illegible] تھا روحی نے [illegible] آواز میں پوچھا یہ اعلان کیا تھا۔ دلاور شبیر اس سوال پر چونکا اور مدھم آواز میں کہا کوئی بچہ کل سے گم ہے اس کی گمشدگی کا اعلان کر رہے تھے کہ کسی کو ملے تو اطلاع دیں۔ روحی سسک پڑی نہ جانے کس کا لخت جگر ہوگا نہ جانے کہاں ہوگا۔ شاید کسی نے اغوا کر لیا ہو نہ جانے [illegible] ہمیں بھی ملتا ہو۔ ہر آنے والا حادثہ

انھیں اپنے بیٹے کا حادثہ دکھائی دیتا۔ آخرکار بات پھیلتی چلی گئی۔ ان کے عزیز و اقارب میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بنانے لگے۔ مختلف قسم کی قیاس آرائیاں شروع ہو گئیں کوئی کچھ کہتا اور کوئی کچھ۔ انھیں اندیشہ تھا کہ اب یہ بات لڑکی والوں کے کانوں تک بھی پہنچ جائے گی۔ وہ کیا کہیں گے۔ وہ کیا سوچیں گے۔ رشتے کا کیا بنے گا۔ نائیلہ جیسی لڑکی ساری زندگی تلاش کریں تو نہیں ملے گی۔ خدا نہ کرے اگر انور کو کچھ ہو گیا تو ہم زندہ درگور ہو جائیں گے۔ ہماری امیدیں ہماری خوشیاں۔ ہماری امنگیں۔ سب انور سے وابستہ ہیں۔ دلاور شبیر اور روحی دونوں سسکیاں بھرنے لگے۔ پھر تو ملنے جلنے والوں اور رشتہ داروں کا تانتا بندھ گیا۔ جو آتا وہ انور کے بارے میں پوچھتا وہ اپنی لاعلمی اور بے بسی کے علاوہ کر ہی کیا سکتے تھے آخرکار یہ بات لڑکی والوں تک بھی جا پہنچی کہ انور گھر سے کار لے کر نہ جانے کہاں چلا گیا ہے۔ نزاکت صاحب سخت برہم ہو گئے۔ نائیلہ کے کانوں تک بھی یہ آواز جا پہنچی۔ وہ کہہ تو کچھ نہ سکی مگر اپنے کمرے میں چپکے چپکے آنسو بہانے لگی۔ نزاکت صاحب نے اسی وقت بیگم کو تیار کیا۔ اور دلاور کے یہاں آ دھمکے۔ وہ تو غم سے پہلے ہی نڈھال تھے دلاور شبیر نے نزاکت صاحب کو گلے لگا لیا دونوں کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ دونوں کی حالت عجیب تھی۔ دلاور شبیر نے کہا تشریف رکھیے نزاکت صاحب صوفے پر بیٹھ گئے۔ ان کی بیگم بھی ساتھ بیٹھ گئیں۔ دونوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ بات کا آغاز کیسے کریں نزاکت صاحب نے بات شروع کی ہماری طرف سے تیاری مکمل ہے یہ دیکھیے شادی کے کارڈ بھی چھپوا لیے ہیں شادی کے بارہ روز باقی

دور دراز کے رشتہ داروں کو بھی اطلاع چند روز پہلے دی جانی چاہئے۔ مگر یہ کارڈ ہم کیسے تقسیم کریں۔ ہم نے جو سُنا کہ انور گھر سے غائب ہے ایسی صورت میں ہمیں تو کچھ سمجھ نہیں آتا۔ کیا کریں۔ نزاکت صاحب نے دلاور شیر کی دُکھتی رگ کو چھیڑ دیا تھا اس کے دل کے تار جھنجھنا اُٹھے وہ دھیمی اور رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ انور سمجھ دار قسم کا لڑکا ہے یہ اقدام ہماری سمجھ سے بالاتر ہے ہماری طرف سے بھی مکمل تیاری ہے۔ نائیلہ اسے پسند ہے آپ کے گھرانے سے منسلک ہو کر وہ فخر محسوس کرتا تھا اور ہم اپنی خوش نصیبی پر نازاں ہیں۔ اتنے میں باہر سے گھنٹی بجی۔ ملازم نے آکر اطلاع دی کہ آپکی زمینوں کا مختیار خاص بھیرو آیا ہے دلاور شیر نے اسے اندر بلوا لیا۔ اس نے آتے ہی جھک کر سلام کیا پاؤں چھوئے اور ایک روپئے دلاور شیر کے سامنے میز پر پھیلا دیئے اور خود قالین پر نیچے بیٹھ گیا۔ سُنا کہ بھیرو کیسے ہو۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا حضور آپ کی مہربانیوں سے اچھا زندگی بسر کر رہا ہوں۔ پھر دلاور شیر نے کہا یہ پیسے کیسے ہیں۔ تو بھیرو نے کہا حضور۔ انور صاحب چند روز قبل اپنی کار پر تشریف لائے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ کچھ پیسے ضرورت ہیں کھیتی کی جو بیوپاری اس وقت موجود تھا سودا اسی وقت طے ہو گیا دس ہزار روپئے اس نے ایڈوانس دیا۔ وہ انور صاحب لے کر چلے گئے۔ پھر کارخانہ میں چلی گئی ہے آج چیک کیش ہوا ہے۔ یہ ایک لاکھ روپیہ تھا اور سیدھا میں آپ کے پاس چلا آیا۔ کہ شادی قریب ہے ممکن ہے پیسوں کی ضرورت ہو۔ آدمیوں کی کام کاج کے لئے ضرورت پڑے تو آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔ دلاور شیر اور نزاکت صاحب بھیرو کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے دلاور شیر نے کہا۔ بھیرو۔ انور دس ہزار روپئے لے گیا ہے۔ اور ابھی تک واپس نہیں لوٹا۔ ہم سب سخت پریشان ہیں کیا وہ کچھ بتلا کر گیا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ بھیرو نے کہا نہیں حضور۔ اس نے بتلایا تو کچھ نہیں تھا۔ بس کہہ گئے تھے بیوپاری سے پیسے جلد لے کر آنا۔ اپنی شادی کی خبر سُنا کر بہت خوش تھے دلاور شیر نے کہا کیا اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ بھیرو نے کہا نہیں سرکار وہ اکیلے تھے۔ کیوں حضور کیا ہوا۔ دلاور شیر نے کہا وہ دس ہزار روپیہ لے کر گیا اور ابھی تک گھر نہیں لوٹا معلوم نہیں کیا ہوا کوئی حادثہ پیش نہ آیا ہو۔ اسے فوراً گھر آجانا چاہئے تھا۔ کیا جاتے وقت اس نے کچھ کہا تھا۔ بھیرو نے کہا بس اتنا سرکار کہ پیسے جلد پہنچانا میری شادی کے چند روز باقی ہیں ٹھیک ہے بھیرو تم باہر ڈیرے میں بیٹھو۔ ہمیں کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ نزاکت صاحب بولے کچھ سمجھ میں نہیں آتا دلاور شیر نے کہا سمجھ تو ہمیں بھی نہیں آتی۔ نزاکت صاحب نے کہا۔ اب اس کا کوئی حل تلاش کیا جائے۔ یا تو شادی کی تاریخ بڑھا دی جائے۔ کیونکہ ابھی کارڈ تقسیم نہیں ہوئے۔ انور کے آنے تک انتظار کیا جائے۔ مگر قریبی رشتہ داروں کو تو پتہ ہے کہ یہ تاریخ مقرر ہو چکی ہے بہت رسوائی ہوگی۔ دلاور شیر نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ آپ کا ہر ارشاد بجا۔ ہم تو شرم کے مارے پانی پانی ہو رہے ہیں۔ ہماری سوچیں مفلوج ہو کر رہ گئی ہیں ہم جس کو زبان دیں جان چلی جائے مگر زبان کا پاس رہے آج اس قدر بے بس ہیں۔ سوچ رہے ہیں اپنی زبان کو نبھائیں۔ ہم تو اپنی جان سے بھی زبان کو زیادہ فوقیت دیتے تھے۔ ہمارا جی چاہتا۔ جان چلی جاتی مگر زبان کا پاس رہتا تو ہم اپنی جان بھی قربان کر دیتے۔ خیر۔ ہم اپنی بیٹی نائیلہ کو کیا جواب دیں گے ہم بے بس ہیں ... نہیں ہمارا بیٹا کس حال میں ہو گا کہاں ہو گا گھر آنے والا ... ہمارے دل میں ہلچل مچا دی ہے۔ اتنے میں ملازم ہانپتا کانپتا آیا اور کہا حضور کچھ سُنا آپ نے چند میل کے فاصلے پر ایک کار کو چند آدمیوں نے روک لیا اور اسے لوٹ لیا۔ چند راہی ادھر سے گزر رہے تھے کہ وہ نقاب پوش بھاگ گئے انھوں نے

کار والے کو زخمی کر دیا۔ نقدی اور گھڑی چھین کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ چند آدمیوں نے زخمی کو ہسپتال پہونچا یا۔ دلاور شیر اور نزاکت صاحب بے قرار ہو گئے دونوں تیار ہو گئے۔ روحی اور نائیلہ کی والدہ کی سسکیاں نکل گئیں وہ نڈھال ہو رہی تھیں دلاور شیر نے کہا آپ گھبرائیے نہیں۔ ہم ابھی خبر لیکر واپس آتے ہیں۔ نزاکت صاحب اور دلاور شیر وہاں پہونچے۔ جہاں واردات ہوئی تھی ابھی تک لوگ وہاں موجود تھے۔ وہ تفصیلات بتا رہے تھے کار والا یہ موجود نہیں تھا۔ تو معلوم ہوا کہ زخمی کو سرکاری کار میں ہسپتال لے گئے ہیں۔ ان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ ٹانگیں کانپ رہی تھیں زبان ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی وہ فوراً ہسپتال پہنچے زخمی کو دیکھا وہ کوئی پردیسی تھا۔ اچھا کھاتے پیتے گھرانے کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ زخم کچھ زیادہ شدید نہ تھے زخمی نے بتلایا کہ وہ کار پہ جا رہا تھا کہ چند آدمیوں نے کار کو روکا کار کے آگے رکاوٹ کھڑی کر دی۔ کار رکتے ہی انھوں نے تلاشی لی۔ جو کچھ میرے پاس تھا لوٹ کر فرار ہو گئے اور جاتے ہوئے ایک نے لاٹھی سے حملہ کر دیا۔ وہاں کے چند باشندے پہونچ گئے ورنہ نہ جانے کیا ہو جاتا۔ بس صاحب انسان کی زندگی ہو تو یہ حادثات کچھ نہیں بگاڑ سکتے اگر وقت آجائے تو انسان چلتے پھرتے ڈھیر ہو جائے

اُدھر دلاور شیر کے گھر کے سامنے بہت سے آدمی اکٹھے ہو گئے تھے۔ انور اپنی کار پہ واپس لوٹ آیا تھا۔ ملازم نے اندر اطلاع دی کہ انور صاحب آگئے ہیں روحی اور نائیلہ کی والدہ تڑپ کر اٹھیں ابھی تک انور باہر تھا لوگوں کا ہجوم تھا وہ ہر شخص کو تسلی دے رہا تھا مگر لوگ اس سے تفصیلات پوچھ رہے تھے اور ایسے بیتاب رہے تھے جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے ملے

ہوں۔ روحی اور نائیلہ کی والدہ کی حالت عجیب تھی آخر کار انور اندر آیا تو روحی اُس سے چمٹ کر رونے لگی۔ بیٹے تجھے کہاں زخم آئے ہیں۔ ڈاکوؤں نے تجھے کیا مارا پیٹا۔ تمھیں ہسپتال سے چھٹی مل گئی۔ کہاں کہاں مرہم پٹی کی۔ انور نے کہا امی میں تو بالکل ٹھیک ہوں میں تو نائیلہ کے لئے بہت پیارا سا پیاری چیز یں خریدنے شہر چلا گیا تھا پھر بڑے شہر کی بڑی باتیں۔ ایک چیز خریدی تو دوسری خریدنے کو جی چاہا۔ ایک جگہ کی سیر کی تو دوسری جگہ کا پروگرام بن گیا۔ پرانے دوست مل گئے آنے ہی نہیں دیتے تھے۔ روحی بولی نہیں بیٹے۔ سامان تو تمھارے پاس ہے نہیں تجھے مارا پیٹا گیا ہے۔ ہائے ہائے تمھارا تو سر سوجا ہوا ہے تمھاری ٹانگیں۔ ارے ان کو کیا ہوا۔ یہ پتلی ہو گئی ہیں۔ ارے نہیں امی سر کو تیل نہیں لگایا۔ سر پھولا ہوا نہیں بال ایسے بنے ہوئے ہیں۔ ٹانگیں پتلی نہیں ہوئیں۔ ٹیڈی پتلون پہنی ہوئی ہے۔ نہیں بیٹے تمھارا سامان چھین لیا گیا ہے تم ہسپتال سے آ رہے ہو۔ انور نے کہا امی سامان تو سارا کار میں رکھا ہے کار سے اترتے ہی لوگ اتنے اکٹھے ہو گئے تھے کہ سامان اٹھانے کا ہوش ہی نہیں رہا۔ روحی نے کہا ہائے ہائے بیٹے تمھاری قمیض پہ ڈنڈوں کے نشان ہیں میرے بچے کو شاید بہت پیٹا گیا ہے۔ انور کھلکھلا اٹھا اور بولا امی لمبے سفر سے لوٹ رہا ہوں کار کی سیٹ سے پیچھے چپکی رہی پیچھے آنا رہا۔ یہی سیٹ کے نشانات ہو گئے۔ آپ کہتی ہیں یہ ڈنڈوں کی مار کے نشان ہیں میں بالکل بخیریت ہوں نائیلہ کے لئے بہت سی چیزیں لایا ہوں آپ دیکھیں گی تو دنگ رہ جائیں گی۔

دلاور شیر اور نزاکت صاحب ہسپتال سے واپس لوٹے ان کی حالت غیر تھی۔ نزاکت صاحب کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ دلاور شیر نہایت غمگین تھا اسے اس کا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ تانگہ آہستہ آہستہ گھر کے قریب آ رہا تھا۔ اور ان کے دل کی عجیب حالت تھی

یوں گم سُم وہیں اپنی سوچوں میں غرق تھے۔ سوچ رہے تھے گھر جائیں گے تو کیا کہیں گے انور کہاں ہے۔ انور نہیں ملا۔ کے سامنے دیکھ بعد تانگہ آیا تو انھیں اپنے گھر کے سامنے آدمیوں کا ہجوم دکھائی دیا۔ ان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں خدا خیر کرے اتنے لوگ اکٹھے ہیں کوئی خاص بات تھی۔ تانگے کے گھوڑے کی ہر ٹاپ ان کے دل میں ہتھوڑے برسا رہی تھی گھوڑے کی ٹپ ٹوپ ٹپ ٹوپ کے ساتھ ان کا دل دھک دھک دھک دھک کر رہا تھا انھیں کار دکھائی دی۔ مگر انور کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ لوگوں کے ہجوم میں ان کی نگاہیں انور کی تلاش میں تھیں ایک ایک چہرے پہ انھوں نے نگاہ دوڑائی سب شناسا چہرے تھے ملنے جلنے والے مگر انور کہیں نہیں تھا۔ ان کا دل چاہا کہ تانگہ واپس موڑ لیں۔ اب کوئی خبر سننے کی ان میں سکت نہیں تھی۔ خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو وہ جیتے جی مر جائیں گے مگر وہ کوچوان [illegible] لے تانگہ آہستہ آہستہ گھر کے قریب پہونچ گیا۔ تانگہ سے اُترنے کی ان میں سکت نہیں تھی ان کے چہرے لٹکے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے سب وہ سب ملنے جلنے والے تانگے کی طرف بڑھے ان کا دل چاہتا تھا کہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ کانوں پر سیسہ انڈیل لیں۔ سب نے دلاور شبیر اور نزاکت صاحب کو گھیر لیا۔ سب صاحبان کچھ سننے کے منتظر تھے مگر دلاور شبیر کچھ کہنے سننے کے موڈ میں نہ تھے۔ آخر کار ایک صاحب بول پڑے۔ ارے صاحب یہ منہ لٹکائے ہوئے ہیں۔ انور صاحب آگئے ہیں وہ گھر کے اندر گئے ہیں یہ سن کر تو یہ جان کر خوشی ہوئی مگر آپ ہیں کہ ابھی تک رنجیدہ ہیں دونوں کے چہرے مسرت سے دمک اٹھے دلاور شبیر بولا سچ انور آگیا ہے۔ میرا بیٹا آگیا ہے خیریت سے ہے سب صاحبان ہنس پڑے۔ ابی صاحب عجیب بات ہے۔ ان کی خیریت آپ سے پوچھ رہے ہیں [illegible] کے کہنے آئے تھے [illegible]

اچھا اچھا میں ابھی جاتا ہوں۔ آپ صاحبان کو ابھی سب معلوم ہو جائے گا۔ دلاور شبیر اور نزاکت صاحب گھر گئے انور کو انھوں نے سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا پھر اس کے بازوؤں ہاتھوں اور بدن کو چھوا۔ ارے تم صحیح سالم ہو۔ سچ سچ انور ہو۔ کہاں چلے گئے تھے۔ سب کو پریشان کیا۔ تو انور نے بتلایا کہ پھر سو بابا سے دس ہزار روپے لے کر لاہور چلا گیا تھا۔ دلہن کے لئے ایسی ایسی چیزیں خریدی ہیں کہ آپ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔ پرانے دوست مل گئے تھے۔ ان کے اصرار پر مزید رکنا پڑا۔ عجائب گھر۔ چڑیا گھر۔ شالامار باغ۔ مقبرہ جہانگیر۔ نہ جانے وہ کہاں کہاں مجھے سیر کرواتے رہے خوشی کا موقع تھا ہم بھی کچھ انکار نہ کر سکے۔ جو شاپنگ کی ہے۔ وہ سامان باہر کار میں رکھا ہے۔ ارے بیٹے وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ بغیر اطلاع دیئے چلے گئے۔ تمھیں کیا معلوم ہمیں کتنی پریشانی ہوئی۔ تمھیں کہاں کہاں ہم تلاش کرتے رہے ہیں۔ نزاکت صاحب کی پریشانی تو ہم سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ انور بولا واقعی مجھے بتلا کر جانا چاہئے تھا۔ دلاور شبیر مسکرا دیا اور کہا اچھا خیر جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ آئندہ احتیاط۔ انور نے کہا آئیے باہر چلیں کار سے سامان اٹھا لائیں۔ سب صاحبان باہر چلے گئے۔ ابھی تک لوگ موجود تھے۔ دلاور شبیر نے کہا صاحبان آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے زحمت فرمائی دراصل انور دلہن کا سامان لینے لاہور چلا گیا تھا ہمیں اطلاع تک نہ دی جس کی وجہ سے ہم بھی پریشان ہوئے۔ آپ کو بھی پریشانی ہوئی۔ سب صاحبان نے کہا مبارکباد اب مٹھائی کب کھلوا رہے ہیں۔ دلاور شبیر نے کہا مٹھائی بہت شادی پہ سب کسر پوری ہو جائے گی انور کی خوشیاں ہی تو ہماری خوشیاں ہیں سب صاحبان نے انور کی آمد کی مبارکباد دی اور خوشی خوشی واپس چلے گئے ڈرائیور اور ملازم نے کار سے سارا سامان اتارا اب نزاکت صاحب [illegible] دلاور شبیر اور وہ بھی بہت خوش تھے

تیز فروسن خاموش فطرت الا ایک شاعر — حیات ہاشمی

محمد نقی خاں اختر اندوری (جھابوہ)

مالوہ ہندوستان کا ایک ایسا خطہ ہے جس میں دھار، مانڈو، اندور، اور اجین جیسے تاریخی اور صنعتی شہر آباد ہیں کہیں دور دور تک باغات کا سلسلہ ہے تو کہیں لہلہاتے ہوئے ہرے بھرے کھیتوں کا۔ کہیں اونچے اونچے فلک بوس پہاڑوں کی قطاریں ہیں تو کہیں گنگناتے ہوئے آبشار۔ غرض جس قدر لوگ شامِ اودھ اور صبحِ بنارس کو جانتے ہیں شبِ مالوہ کی خصوصیت اور انفرادیت سے بھی آشنا ہیں۔ چنبل۔ سپرا۔ نربدا۔ اور ماہی جیسی ہندوستان کی عظیم ندیاں بھی اسی دامن میں جاری و ساری ہیں جو گلشنِ مالوہ کو سرسبز و شاداب کئے ہوئے ہیں۔ اکسانی ہیں یہاں کی سلکوں بھری فضائیں شاعر کو شعر گوئی کے لئے۔ مجبور کرتی ہیں معنی کو ساتا گھٹانے پہ۔ ہندی کا مشہور کوی کالیداس کا جنم بھی مالوہ کی اسی دھرتی پر ہوا تھا۔ میرا احمد منیر منظر اندوری باسط اجینی۔ شاداں اندوری رمضان علی شوکت رتلامی۔ بیدل گلشن آبادی، رونق اندوری۔ نشتر اندوری۔ ساغر چشتی اجینی۔ احسان الحق احسان رتلامی۔ گویا قریشی۔ عطا صدیقی۔ شگفتہ یہ باکمال اور ممتاز شعراء بھی سرزمینِ مالوہ ہی کی دین تھے۔ آج بھی اس کا دامن اردو کے نامور شعرائے کرام سے خالی نہیں۔ بے شمار مایۂ ناز شعراء کرام اس کے دامن کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ مالوہ کے انھیں ممتاز شعراء کے ساتھ ایک نام اور بھی آتا ہے اور وہ نام ہے حیات ہاشمی سردارپوری سردارپور دھار ضلع کا ایک ایسا چھوٹا سا قصبہ ہے جو شعر و ادب کے نام پر ایک چٹیل میدان کے سوا کچھ بھی نہیں جہاں کے باشندے شاعر اور قوافی تک میں کوئی تمیز نہیں رکھتے۔ حیات ہاشمی نے تیس برس ایسے مقام پر رہ کر ادب کی

جو خدمت کی ہے وہ قابلِ داد و ستائش ہے حال ہی میں آپ کا شعری مجموعہ "لمحات" شائع ہوا ہے اور مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی نے آپ کی کتاب "لمحات" پر ۲ ہزار روپے کے انعام سے آپکو نوازا ہے حیات ہاشمی ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان بھی ہیں۔ ایک سچے اور اچھے فنکار میں جو خوبیاں ہونا چاہئیں وہ سب آپ میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ کمال احمد صدیقی صاحب لکھتے ہیں "اس بات سے خوشی ہوئی کہ حیات صاحب ایک کھلا ہوا ذہن رکھتے ہیں اور ہر موضوع پر نہ صرف بندھے روئیے سے گریز کرتے ہیں۔ بلکہ اپنی آزاد روش کا اعلان کرنے میں بھی ان کو باک نہیں" "لمحات" کے مقدمہ کے طور پر انھوں نے اپنا نظریہ چار مصرعوں میں بیان کیا ہے

بحر ہو اوزان یا ایطا ہو یا کچھ اور ہو
زنگ خوردہ ہیکلوں کو توڑتا جاتا ہوں میں
متہمد ہوں اجتہادانہ نگارش میں حیاتؔ
اپنے نقادوں کا حصہ چھوڑتا جاتا ہوں میں

ہر اچھا شاعر سچا شاعر عہد آفریں شاعر اس طرح سوچتا رہا ہے۔ حیات صاحب زندگی اور زندگی کے مسائل کا گہرا شعور رکھتے ہیں اور بڑے سلیقے سے انھوں نے کہیں براہِ راست بات کی ہے تو کہیں رمز و کنایہ اور استعارہ کا استعمال کیا ہے۔ اور اپنی بات اس طرح پیش کی کہ کہیں بھی ترسیل کو زک نہیں پہنچی۔

"محمود سعیدی لکھتے ہیں"

حیات صاحب کے بیشتر اشعار کی اساس ان کے ذاتی تجربات و مشاہدات پر قائم ہے اور انھوں نے اپنا

اثرات وکیفیات کو شعر کا جامہ پہنایا ہے جس سے وہ ؤ دگزرتے رہے ہیں لیکن اپنی ادبی اور شعری روایت سے واقفیت نے انھیں اظہار کا وہ سلیقہ بخشا ہے کہ وہ اپی آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر پیش کر سکتے ہیں۔ وہ نامانوس الفاظ و تراکیب سے دانستہ اجتناب برتتے ہیں۔ اور ایسا پیرایۂ اظہار اختیار کرتے ہیں جس میں تازگی تو ہے لیکن اجنبیت نہیں اس لئے مجھے اُمید ہے کہ ان کا کلام ان لوگوں کو پسند آئے گا۔ جو شاعری میں تازہ کاری کے جویا ہیں۔ ان لوگوں کو بھی مایوس نہیں کرے گا۔ جو شاعری کے مانوس وار ورائج اسالیب کے دلدادہ ہیں انور کمال حسینی لکھتے ہیں"

حیات ہاشمی ایک غزل گو شاعر ہیں جن کی مشقِ سخن گزشتہ تیس برس سے جاری ہے۔ "لمحات" آپ کے منفرد اشعار اور منتخب غزلوں کا مجموعہ ہے اس انتخاب میں شامل زیادہ تر اشعار براہِ راست دل پر اثر کرتے ہیں اثر پذیری کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ وہ بڑی سے بڑی بات اور زندگی کی کڑی سے کڑی حقیقت کو بڑے سادے انداز میں کہہ گزرتے ہیں اور ہمارے صوبے کے ہونہار شاعر "عزیز اندوری" لکھتے ہیں

"تیز ذہن خاموش فطرت والا ایک شاعر
حیات ہاشمی"

حیات ہاشمی ہمارے صوبے کے ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی تمام تر ادبی اور شعری صلاحیتوں کو اس ذہنی کرتب بازی اور سیاسی بازیگری سے بچائے رکھا جو ناقص اور بے ترتیب اذہان کے لئے ادب و شعر کے "اعلیٰ" مسند پر براجمان ہو جانے کا اہم وسیلہ بن جاتی ہے۔ مجھے معلوم ہے حیات صاحب نے اپنی فطرت کی وجہ سے کبھی اپنی چابک دامانی کا شکوہ نہیں کیا۔ بلکہ انھیں اوروں کے گریبان سینے میں ہی لطف آتا رہا۔ حیات صاحب کے اس رویہ پر مجھے ذرا بھی حیرت نہیں ہوتی کیونکہ ایک اچھا فنکار اپنے فن کو کسی قسم کے پروپیگنڈے کے سہارے آگے بڑھانے کا قائل نہیں ہوتا۔ اور اسی لئے حیات صاحب نے چھوٹی چھوٹی جگہوں پر وہ کر اپنی ادبی زندگی کے ۲۵ سال گزار دیئے وہ کبھی بڑے ادبی جلسے یا توڑ جوڑ کے سہارے منعقد ہونے والے کسی مشاعرہ میں ہنگامہ آرائی کرتے نظر نہیں آئے۔ حیات صاحب کی طرح آج بھی کتنے ہی فنکار ہمارے صوبے میں موجود ہیں جو فن شعر و ادب میں طاق کے باوجود اہلِ نظر کے تساہل سے طاقِ نسیاں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

مندرجہ اشعار آپ کی فنکارانہ صلاحیت اور شاعرانہ شخصیت کا آئینہ ہیں۔ ؎

تھک گیا تو پھینک آیا مقبرے میں
زندگی کا بوجھ کبھی بیکار ہی تھا

عصمتیں نیلام ہوتی ہیں رہیں
آدمی پہلے بھی سا ہو کار ہی تھا

چمن میں ڈھونڈ رہے ہیں اسے چمن والے
وہ ایک پھول جو شرمندۂ بہار ہوا

گناہگار کو نفرت سے دیکھنے والے
یہ دیکھئے کہ کوئی کیوں گناہ گار ہوا

غمِ حیات سے گھبرا کے مرنے والوں کو
ہمیں دکھاؤ ہماری مثال دو یارو

لہو لہان بدن خون سے سنے چہرے
مجھے بتائیں کے میں کس کے گھر سے گزرا ہوا

حیات سخت بہت سخت ہے مقامِ غزل
میں شہرِ شعر کے زیر و زبر سے گزرا ہوں

طلسمِ شیشہ گری ہے فصیلِ شہرِ وفا
جو اس کے سائے میں آیا وہ سنگسار ہوا

ظلم پرور وہ کوئی کوئی ستم آسودہ
آپ کے شہر میں ڈھونڈے سے ستمگر نہ ملا

شہر کی گلیوں کے پتھر آگئے ہیں ہاتھ میں
آدمی اک دوسرے کا آئینہ ہونے لگا

زندگی جس کی امانت ہے اُسے لوٹا دو
کون کاٹے گا اسے تیغِ مسلسل کی طرح

آپ سے بھی پیمبری نہ ہوئی
مٹ گئے ہم بھی اُمتوں کی طرح

دادِ اُلفت کے لئے دل نہیں ڈھونڈے جاتے
یہ تو قدرت کا اشارہ ہے جدھر ہو جائے

حشر کیا ہوگا الٰہی میرے ارمانوں کا
یہ وہ اُمت ہے جسے کوئی پیمبر نہ ملا

خدا خدا ہے زبردست طاقتوں کا غرور
بلا کی قوت برداشت زیردست میں ہے

خدا کے واسطے آنکھوں سے پونچھ لے آنسو
رہے گا کون ٹپکتے ہوئے مکانوں میں

اخبار میں ملتی ہے سدا خون کی سُرخی
اوراقِ سبکدوش کا غم دیکھ رہے ہو

اب اس انداز سے تعمیرِ چمن ہوتی ہے
پھول کیا پھولوں کی خوشبو بھی حصاروں میں رہے

ایک مضبوط ارادوں کی عمارت ہے حیات
ریت کا گھر تو نہیں ہے کہ کھنڈر ہو جائے

دیارِ غیر میں ایک یادگار مشاعرہ

نوشابہ علی سکوٹو (نائجیریا)

اہلِ دل دُنیا کو جوئے شیر کا نذرانہ پیش کرتے ہیں اہلِ فن سونا لیزا کے تبسم کو ابدیت بخشتے ہیں اہلِ جمال تاج محل کا خواب دیکھتے ہیں اور اہلِ نظر ان نگارشات کو اپنی سانسوں اور دھڑکنوں میں بسا کر انسانی تاریخ میں کبھی نہ بھولنے والا مقام دیتے ہیں یہ چار صفات جب ایک مقام پر یکجا ہو جائیں تو قدرت کے ... شاہکار وجود میں آتے ہیں جنھیں کوئی وادیٔ کشمیر کہتا ہے کوئی پیرزادے کی جانفشانی کوئی سنگم کا دلفریب منظر۔ انھی صفات کا اجتماع ایک شام سکوٹو شہر کے ایک وسیع و عریض ہال میں ہوا۔

سکوٹو شمالی نائجیریا میں اس مقام پر واقع ہے جہاں صحرائے اعظم صحارا آخری ہچکی لیتا ہے یہ شہر جو سال کے ۹ ماہ تک بے برگ و باراں رہتا ہے اس شام یارانِ ادب اور گلہائے سخن کا منظر تھا سکوٹو شہر کے وہ رہنے والے جو اقبال اور ٹیگور کے دیش سے آئے تھے آج ایک مشاعرہ ترتیب دے رہے تھے جس میں نائجیریا بھر سے آئے ہوئے شعراء شرکت کر رہے تھے دلی کی گلیوں اور لکھنؤ کی حویلیوں میں جوان ہونے والی دوشیزہ! کا سنگھار اس کے شیدائی نائجیریا میں بھی کر رہے تھے۔

ٹھیک نو بجے کے قریب مشاعرہ گاہ میں آئی پہلا تاثر تو یہ تھا کہ کچھ سر پھرے کہکشاں کو زمین پر اتار لائے ہیں لیکن ایسا نہیں تھا اصل میں کچھ دیوانوں نے آسمان کو سر پہ اٹھا لیا تھا مشاعرہ گاہ کی تزئین و آرائش بیان سے باہر ہے اسٹیج کی ترتیب نہ صرف نظر و دل کی تسکین کا سامان تھی بلکہ منتظمین کے مذاقِ سلیم کی ترجمان بھی پس منظر میں غالب فیض کے خاکے محراب اور پردے، شفاف چادر اور گاؤ تکیے تھوڑی دیر کے لئے محسوس ہوتا تھا ہم لال قلعہ میں بیٹھے ہیں اور بس ظلِ سبحانی بہادر شاہ ظفر برآمد ہونے والے ہیں۔ باادب با ملاحظہ ہوشیار دس بجے ... تک ہال بھر چکا تھا۔ بلکہ جگہ ناکافی محسوس ہونے لگی تھی۔ لیکن پھر سردی کی لہر آئی لوگ ایک دوسرے سے مل جل کر سمٹنے لگے۔ دل کچھ زیادہ قریب ہوئے تو وسعتیں اور بڑھیں میں نے ہال میں ایک گوشہ میں نشست بنائی اور سامعین کا جائزہ لیا۔ ہر مذہب و ملت کے لوگ موجود تھے خاص طور سے شہر کی ساری ہندوستانی و پاکستانی کمیونٹی امڈ آئی تھی۔ مجھے لگا جیسے گنگا کی موجیں سندھ کے ساحل کو چوم رہی ہوں یا بنارس کی صبح نے لاہور کی شام کو گلے لگا لیا ہو۔

دس بجے جناب صدر تشریف لائے یہ تھے سفیرِ پاکستان مسٹر اکرم ذکی ان کے ساتھ تھا آسمانِ ادب کا ایک درخشندہ ستارہ احمد فراز جو صبح ہی لندن سے مشاعرہ میں شرکت کی غرض سے آئے تھے۔ مشاعرہ کا افتتاح ہندوستانی ہائی کمشنر کو کرنا تھا لیکن وہ اپنی مصروفیات کے باعث تشریف نہ لا سکے انھوں نے اپنی معذرت اور نیک خواہشات کا اظہار بذریعہ مشاعرہ کے نام ایک خط میں کر دیا تھا۔ مشاعرہ کی نظامت علی صاحب کے سپرد تھی وہ جس انداز سے مشاعرہ کنڈکٹ کرتے ہیں اور شعراء کی تعریف و تعارف کرتے ہیں اس سے وہی لطف اندوز ہو سکتے ہیں جو انھیں سن رہے ہوں۔

سامعین کی بیقراری بڑھ رہی تھی اور انتظار کی گھڑیاں اضطراب کے سمندر سے ہم آغوش ہو رہی تھیں لہٰذا مشاعرہ شروع کیا گیا صاحبِ صدر اسٹیج پر آئے اس کے بعد

انھوں نے مہمانِ خصوصی احمد فراز سے اسٹیج پر آنے کی منظوم درخواست کی۔ فراز تالیوں کے شور میں اسٹیج پر آئے پھر ناظم مشاعرہ نے مختصراً اردو زبان کی ہمہ گیری اور اس میں پوشیدہ اخوت، محبت اور انسان دوستی کے جذبہ پر روشنی ڈالی۔

سب سے پہلے سکوٹو کے وزارت معاش منصوبہ بندی کے افسر سے مشاعرہ کا افتتاح کرانا مجھے معنی خیز معلوم ہوا لیکن آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گئی۔ یہ مشاعرہ طرحی تھا پہلی طرح عقوداؔ کا مصرعہ تھا۔ ؎

ہر ایک بات کی آخر انتہا بھی ہے

دوسرا مصرعہ فیض کا تھا ؎

گل کھلے جاتے ہیں وہ سایۂ در تو دیکھو

سلیم اللہ خاں نے سوداؔ کے مصرعہ پر اپنی غزل پڑھی ؎

ستم شعار ہے وہ اس کو ادا بھی ہے
بہت حسیں ہے دلبر ہے دلربا بھی ہے
وہ التفات کریں یا جفا کریں مجھ پر
زہے نصیب مرا درد لا دوا بھی ہے

ان کے بعد یعقوب شیخ تشریف لائے ؎

دل کھنچا جائے ہے یہ کیا ہے اثر تو دیکھو
سر جھکا جائے ہے یہ کیا ہے نور تو دیکھو
خوشبو بکھیرتی ہیں ہر چار سو اس گھر کا طواف
گل کھلے جاتے ہیں وہ سایۂ در تو دیکھو

یعقوب شیخ کے بعد مولوی محمد بیر فقیر تشریف لائے ایک سنجیدہ غزل پیش کی لیکن سامعین ابھی سنجیدگی کے موڈ میں نہیں تھے عمر صاحب کی غزل میری کشکول سماعت میں بھی نہ آسکی

اب مسیح احمد مسیحا کی باری تھی مسیحا یوں تو علم الکیمیا کے استاد ہیں لیکن غزل پوری علم طبعیات کا سبق دے رہی تھی نئے انداز کی غزل تھی کافی سراہی گئی ؎

مریض کا لب ادراک و آگہی کے لئے
محض جنوں ہی نہیں عشق اک دوا بھی ہے
چمکتے چاند پہ جانے کی سب کو خواہش تھی
کسی نے یہ بھی نہ سوچا وہاں خلا بھی ہے

جب مسیحا اپنا کلام ختم کر چکے تو محفل کے رنگ میں تھوڑی تبدیلی آئی۔ آواز دی گئی غلام اختر علی صاحب کو غلام اختر خاں کی مزاحیہ شاعری بہت سے دلوں کے زخموں کا مداوا ہے آپ بھی لطف اندوز ہوں ؎

کر لی گیا ڈائٹنگ کر کر کے فکر تو دیکھو
گیارہ گز کا ہے کمر بند کمر تو دیکھو
اس کو گر گٹ جو کہا ہے کوئی غلطی کی ہے
کیسے بدلے ہے صبح شام کلر تو دیکھو
بے رخی کا نہ دو الزام کہ مجبور ہے وہ
میرے محبوب کی تم بھینگی نظر تو دیکھو

محفل کی زعفران زار بنا کر غلام اختر خاں چلے گئے تو محمد سلیم صاحب تشریف لائے سلیم صاحب یوں تو خوشہ گندم اور دانہ جو کی آبیاری کے ماہر ہیں لیکن یہ غزل انھوں نے خونِ جگر سے سینچی تھی۔ فرمایا ؎

نگاہِ ناز میں شوخی بھی ہے حیا بھی ہے
کسی زبانِ محبت کا مدعا بھی ہے
چلا کے تیرِ نظر پوچھتے ہیں بسمل سے
جو ہم نے تیر چلایا ہے وہ لگا بھی ہے
وہ بات بات پہ کہتے ہیں چھوڑ دو الفت
بھلا بتاؤ تو کوئی یہ کر سکا بھی ہے

شمشیر خاں جب جب اسٹیج پر آئے تو محفل شباب پر آچکی تھی انھوں نے بڑے اعتماد سے اپنی غزل شروع کی اور سامعین سے اپنے اعتماد اور کلام دونوں کی داد وصول کی۔ خاص طور سے ان کے یہ اشعار سامعین کو عرصہ تک یاد رہیں گے ؎

امید و بیم کے عالم میں یہ ہوا بھی ہے
چراغ دل کا بجھا بھی اور جلا بھی ہے
بتاؤ لوگو کہ قاتل کو کیسے پہچانا
لہو کے رنگ میں کیا سرخیِ حنا بھی ہے

ابو نوری صاحب آئے غزل گھر بھول آئے تھے دو اشعار یاد تھے انہی کو سنا کر سامعین کو محظوظ کیا ؎

جانب دار مرا عزمِ سفر دیکھو
بن گئی ایک نئی راہ گذر تو دیکھو

[م]ولوی کے بعد نہال صدیقی صاحب تشریف لائے جو بظاہر [نڈھ]ال بھی معلوم ہو رہے تھے۔ حالانکہ خوش مزاجی ان کا [عن]صر ہے انھوں نے کہا ؎

چمن پہ برق گری ہے مگر خدا جانے
اسے ہمارے نشیمن کا کچھ پتا بھی ہے

ہمارے سامنے دار و رسن کی بات نہ کر
جنوں میں حد سے گزرنے کا حوصلہ بھی ہے

[ج]عفر رضا جعفری کے کلام اور ترنم دونوں نے خوب داد [و]صول کی کلام ملاحظہ ہو ؎

اب کے یہ فصلِ بہاراں کا اثر تو دیکھو
میرے زخموں پہ ہے پھولوں کی نظر تو دیکھو

آنسوؤں کو مرے اللہ سلامت رکھے
بن کے سمندر ہے مرا دستِ نگر تو دیکھو

گھر کے آنگن میں کبھی چاندنی بن کر اترو
کیسے کرتا ہے کوئی شب کی سحر تو دیکھو

[جع]فری صاحب کے بعد ایک بار پھر رنگِ محفل بدلا۔ [ح]سن عباد صاحب تشریف لائے۔

یہ پوچھتے کیا ہو کہ ڈوبی کہاں دل کی کشتی
آرسی میں ذرا چشموں کے بھنور تو دیکھو

شیخ جی تم پہ دعا پڑھ کے جو دم کرتے ہیں
ان کی نیت نہ سہی ان کی نظر تو دیکھو

سر پہ پالش ملی جوتوں پہ لگایا ہے خضاب
اضطرابِ شبِ وعدہ کا اثر تو دیکھو

[ا]ب ایک دوسرے شہر سے آئے ہوئے مہمان شاعر کی باری [ت]ھی۔ اب تک سارے شعراء اسکول ہی سے تعلق رکھتے تھے [یہ] تھے سید احمد نقوی۔ ان کا ٹونک جیسی مردم خیز زمین سے [تع]لق ہے مگر اب پاکستان میں مقیم ہیں ؎

ہم بھی بدنام ہوئے مومن و غالب کی طرح
مخبرِ ہم پیشگیٔ اہلِ ہنر تو دیکھو

شعر بھی کہتا ہوں روزی کی مشقت بھی ہے
مجھ اسیرِ غمِ دوراں کا جگر تو دیکھو

اس کے بعد شعیب قریشی کو دعوتِ سخن دی گئی یہ بھی مہمان تھے ؎

خدا کی ذات سے دنیا کی ابتداء بھی ہے
اسی کے نام سے دنیا کی انتہا بھی ہے

اب مائیکروفون صاحبِ صدر کے ہاتھ میں تھا انھوں نے بہت خوبصورت اور دلنشیں انداز میں ناظمِ مشاعرہ علمی صاحب کو کلام سنانے کی دعوت دی۔ آپ بھی چند اشعار سن لیں ؎

لہو حصارِ بدن میں خموش رہتا ہے
حصارِ ظلم میں آئے تو بولتا بھی ہے

مرے وجود کو پرچھائیوں سے مت ناپو
ڈھلی ہے دھوپ تو سایہ مرا بڑھا بھی ہے

وہ تیشہ ہو گیا منسوب جوئے شیر سے جو
کبھی کبھی سرِ خسرو پہ ٹوٹتا بھی ہے

غزل کے خاتمہ پر نظامت کے فرائض پھر انھوں نے سنبھالے اور انجم اقبال کو بلایا۔ انجم اقبال کا ترنم مشاعرہ پر چھا جاتا ہے۔ وہ جب تک پڑھتے رہتے ہیں سامعین ہمہ تن گوش رہتے ہیں ابھی تک وہ ایک گوشہ میں بکھرے مشاعرہ کی نظم سنبھال رہے تھے نام سنا تو جلدی جلدی اسٹیج پر آئے بعد میں معلوم ہوا کہ پوری نظم سے انھیں کی غزل غائب ہے ؎

اگرچہ آپ سے دل طالبِ وفا بھی ہے
عزیز دل کو مگر آپ کی جفا بھی ہے

جو اجنبی سا ملا راہِ زیست میں اکثر
بہت قریب سے وہ ہم کو جانتا بھی ہے

اس کے بعد محمود احمد راز کو دعوتِ سخن دی گئی احمد علیگ یونیورسٹی میں معاشیات کے لیکچرر ہیں اسی شعبہ سے

علی گڑھ میں بھی متعلق تھے۔ راز صاحب سے سکوٹو والوں کا پہلا تعارف تھا لیکن ان کی پختہ غزل اور دلکش ترنم کا اثر بہت دیرپا تھا ؎

تمہیں کبھی رہِ الفت میں یہ ہوا بھی ہے
کہ تم قریب ہو گو اور فاصلہ بھی ہے
شبِ فراق جو تاریک ہے تو کیا غم ہے
کہ میرے دل میں چراغوں کا سلسلہ بھی ہے
بھٹک رہا تھا خم و پیچ راہِ ہستی میں
جو مڑ کے دیکھا تو ہمراہ قافلہ بھی ہے

اب مخمور سیما خاں تشریف لائیں سیما خاں کا ترنم جادوئی اثر رکھتا ہے اور کلام میں غضب کی معنی آفرینی ہے ؎

پھر بری نظروں کو الزامِ نظارہ دینا
پہلے آئینے میں خود اپنی نظر تو دیکھو
دیکھو ایسے تو نہ دیکھو کہ زمانہ دیکھے
اک نظر دیکھنے والوں کی نظر تو دیکھو

اچھی غزل اور عمدہ ترنم کے بعد اسٹیج پر آنے والے شاعر کے لئے بڑی آزمائش کا لمحہ ہوتا ہے لہٰذا جب احمد نقوی کو دعوتِ سخن دی گئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ نقوی صاحب کی ادائیگی کا بھی ایک منفرد انداز ہے اور کلام کا بھی اپنا مقام۔ یہی وجہ ہے کہ سیما خاں کے جادو کے بعد ان کا جادو بھی سر چڑھ کر بولا ؎

موم کے ڈھلتے پگھلتے ہوئے گھر تو دیکھو
آؤ فنکار کے خوابوں کا نگر تو دیکھو
رنگِ تعمیر میں اشعار میں، تصویروں میں
عکسِ محرومیِ اربابِ ہنر تو دیکھو
تم جسے ڈھونڈ رہے ہو وہی تعمیر ہوں میں
اپنے خوابوں کے کھنڈروں سے ادھر تو دیکھو

اب محمد علی صدیقی مضطر تشریف لائے مضطر صاحب کا شمار یہاں کے استادوں میں ہوتا ہے ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں ؎

اتنے مایوس ہو کیوں گردشِ حالات سے تم
ڈوبتی رات طلوعِ سحر تو دیکھو
قافلے یادوں کے گزرے ہیں انھی راہوں سے
میری آنکھوں میں جمی گردِ سفر تو دیکھو
ناشکیبائی کی دوزخ سے کبھی گزرو تو
کیسے ہوتی ہے شبِ غم کی سحر تو دیکھو

مضطر صاحب کے بعد محمد یاسین کو آواز دی گئی ہمارے یہ مہمان شاعر ایک بینک کے منیجر ہیں اور کاروبارِ سود و زیاں سے بخوبی واقف۔ لیکن ان کو دعوت دے کر منتظمینِ مشاعرہ نے کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کیا تھا فکر انگیز غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کسی کے فکر و عمل میں تضاد ممکن ہے
جو سجدہ ریز ہے دیکھو تو پارسا بھی ہے
کہیں فریبِ نظر ہے کہیں طلسمِ خیال
یہی فریب تو جینے کا آسرا بھی ہے
تمھارے لطف و کرم کی حسین دنیا میں
کہیں کہیں کوئی پردۂ جفا بھی ہے

محمد یاسین صاحب رخصت ہوئے تو اعظمی صاحب آئے سکوٹو یونیورسٹی میں عربی کے استاد ہیں اور اسی مشکل سے دوچار ہیں جس سے غالب تھے یعنی گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل لیکن غالب ہی کی مانند اپنے تمام ساتھیوں میں سب سے بلند قد۔ ان کا کہنے کا الگ اور منفرد انداز ہے ترنم سے پڑھتے ہیں تو مجروح سلطان پوری یاد آجاتے ہیں ؎

وہ ذات جو کہ تصور سے ماورا بھی ہے
میں اس کا عکس ہوں وہ میرا آئینہ بھی ہے
کچھ اور دیر جلائے رہو لہو کے چراغ
بڑی سیاہ رات مخالف بہت ہوا بھی ہے
گزر کے سایۂ دار و رسن سے آ تو گئے
مگر ابھی قدِ گیسو کا سلسلہ بھی ہے
گراں نہ ہو تو کبھی اعظمی سے مل لیجے
وہ دل گرفتہ سہی آدمی بھلا بھی ہے

اب شمعِ محفل جس کے سامنے آئی وہ شمع صدیقی تھیں اگر ان کی شاعری کو صرف ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو ان کا تخلص کافی ہوگا۔۔ دھیما دھیمے دھیرے پگھلنا دہی خاموشی لیکن روشنی کے ساتھ یہ وہ شمع ہے جو پروانوں کو جلانے کے لئے انھیں روشنی بخشنے کے لئے جلتی ہے ؎

گھر یہ شامِ الم آہ سحر تو دیکھو
ہم نے کس حال میں کی عمر بسر تو دیکھو
ایک اک چہرے پہ ہے حسنِ جہاں سوز کا عکس
آئینہ دیکھو ذرا آئینہ گر تو دیکھو
مرتے جیتے ہوئے ہر روز ہی دیکھا خود کو
تم سے شکوہ نہ کیا ظرفِ نظر تو دیکھو

مولانا فضل الرحمٰن افضل تشریف لائے جو کالی کٹ یونیورسٹی میں اسلامیات کے اُستاد ہیں۔ مولانا کا ترنم فنا نظامی کی یاد دلاتا ہے لیکن مولانا فضل الرحمٰن فنا سے زیادہ جری اور ہر ایک شعر کے ساتھ سامعین کو ساتھ لیکر چلتے ہیں ؎

عشق درد بھی ہے درد آشنا بھی ہے
کبھی یہ سوز کبھی ساز بے نوا بھی ہے
کبھی سنا ہے کہ ایسا کہیں ہوا بھی ہے
چراغِ دل کبھی طوفان سے بجھا بھی ہے
زباں کو دل کو نظر کو اسیر کرتے ہیں
ستم تو یہ ہے کہ کہتے ہیں کچھ کہا بھی ہے
ہمارے عزم کا ہوگا یہ امتحاں کب تک
ہر ایک بات کی آخر کو انتہا بھی ہے

ڈاکٹر مطلوب صدیقی کو آواز دی گئی ڈاکٹر صاحب کی غزل کسی بھی مشاعرہ کی کامیابی کی ضمانت ہے بالخصوص طور سے اگر وہ مزاحیہ رنگ میں ہو تو قیامت ہے غزل جھوم اس لئے پڑھتے ہیں کہ زیادہ دیر بغیر ہنسے رہ نہیں سکتے۔ ان کی غزل ؎

شب پرستوں کی دعاؤں کا اثر تو دیکھو
ملگجی شام ہے بے نورِ سحر تو دیکھو
کیا کوئی ہاتھ نہیں سنگ اُٹھانے والا
کیسے آباد ہیں شیشوں کے نگر تو دیکھو
کیسے چپکایا ہے ہر تار گریباں خوں سے
دستِ قاتل کا انوکھا یہ ہنر تو دیکھو

ڈاکٹر مطلوب صدیقی کے بعد عبد الرحیم خاں طاہر اسٹیج پر آئے۔ اُستاد قمر جلالوی کے شاگرد ہیں۔ انہی کے رنگ میں کہتے ہیں انہی کے انداز میں پڑھتے ہیں ؎

بات ابرو کی گرہ تیر نظر تو دیکھو
عالمِ ہوش و خرد زیر و زبر تو دیکھو
ذرہ ذرہ مری وحشت کی گواہی دیگا
دو قدم چل کے ذرا راہ گزر تو دیکھو
یہ بھی کیا کم ہے کہ ماتھے پہ شکن آئی ہے
باد و باراں نہ سہی برق و شرر تو دیکھو

اب ایک مہمان شاعر وصی احمد رضوی کی باری آئی ؎

جنونِ عشق کی غفلت شعاریاں توبہ
نمازِ عشق ادا بھی ہے اور قضا بھی ہے
حرم کی کشمکش جادۂ وفا کو میرا سلام
احد بھی بدر بھی میدانِ کربلا بھی ہے

وصی احمد رضوی کے بعد ایک اور مہمان شاعر پیر و فیروز زیدی کو زحمت دی گئی ہے ؎

نشاطِ زیست کی ہے انتہا سکوتِ عدم
مرے وجود کی گرمی مری سزا بھی ہے
میانِ دیر و حرم فاصلہ بہت ہے مگر
برائے بیر سہی درمیاں خدا بھی ہے

اب مہمانِ خصوصی کی باری تھی۔ احمد فراز تالیوں کے بے پناہ شور میں مائک کے سامنے آئے۔ ایک دلنواز مسکراہٹ۔ نظریں جھکی ہوئی۔ سر اُٹھا ہوا۔ عاجز انکساری۔ شرافت اور انسانیت کا مجسمہ۔ غزل خود کی ؎

یہ دل کہ تجھ کو بظاہر بھلا چکا بھی ہے
کبھی کبھی ترے بارے میں سوچتا بھی ہے
فراز شہرِ غزل میں قدم سنبھل کے
اسی دیار میں سودا شکستہ پا بھی ہے

وہی ہیں کہ جنھیں تیغ دیا زمانے نے
یہی ہیں جنھیں جینے کا حوصلہ بھی ہے
غنیم کو مگر اس کا نہیں تھا اندازہ
فراز گو تن تنہا ہے قافلہ بھی ہے

فراز اپنی طرحی غزل ختم کر چکے تو اور غزل کا مطالبہ ہوا۔ لیکن مشاعرے کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھوں نے معذرت کی اور ساری غزلیں دوسری نشست کے لئے اٹھا رکھیں۔

اب صاحبِ صدر مسٹر اکرام ذکی سے کلام سنانے کی درخواست کی گئی۔ سفیر محترم ایک کہنہ مشق شاعر تو ہیں ہی برجستہ شعر کہنے میں بھی کمال رکھتے ہیں۔ پڑھنے کا انداز بھی والہانہ ہے ؎

ہم بھی مشتاق ذرا ایک نظر تو دیکھو
ہر طرف دیکھتے ہو کاش ادھر کو دیکھو
ظلم کی رات سے ڈرنے کا سماں بیت گیا
شب کے سینے سے جو پھوٹی ہے سحر تو دیکھو
کٹ تو سکتا ہے مگر جھک نہیں سکتا یہ کبھی
تیغ میں دیکھ رہا ہوں مرا سر تو دیکھو
جان دے کر تری دنیا سے ذکی جاتا ہے
ہاتھ خالی ہیں مرے رختِ سفر تو دیکھو

صاحبِ صدر کی غزل کے بعد پہلی نشست کا اختتام ہوا۔ اب کچھ تلاوتِ کلام و نعت کی باری تھی چالیس منٹ بعد دوسری نشست جو غیر طرحی تھی شروع ہوئی۔ اس نشست میں تمام شعراء احمد فراز کے حق میں دست بردار ہو گئے اب فراز تھا اور سامعین پھر یہ سلسلہ صبح تک چلتا رہا ۔

سراب

(باقی صفحہ ۱۴۱ کا)

پھر اگر ہر وقت شفیق سلیم کا ہی دم بھرنے لگا۔ ابھی چند ہی دن گزرے تھے کہ یکایک ٹیلی گرام نے سب ہوش اڑا دیئے شفیق کے والد کی طبیعت سخت ہو گئی تھی لہذا فوری طور پر اسے اپنے وطن جانا ضروری تھا اور وہ پہلی ہی ٹرین سے اپنے وطن روانہ ہو گیا۔

سلیم کا شفیق کے یہاں آنا جانا بدستور جاری رہا ویسے بھی اب وہ بچوں کا چہیتا "انکل" بن گیا تھا رات تک بچوں کو کہانیاں سنانا - پہیلیاں بجھانا کبھی نسرین کو بھی طرح طرح کے لطائف سنا کر خوش کرنا اس کا روز مرہ بن چکا تھا - ایک شام کو موسم - گھنگھور گھٹا بجلیوں کی چمک اور بادلوں کی گرج کے ساتھ نے موسم کو رومانی بنا دیا تھا تھوڑی ہی دیر میں بارش طوفان میں بدل گئی جس کی وجہ سے چرند پرند بھی موسم کی اس تبدیلی کی وجہ سے پریشان و خوف زدہ تھے ہر گلی ہر کوچے میں ہو کا عالم بپا تھا طوفانِ باد و باراں تھا کہ تھمنے ہی نہ لے رہا تھا۔

شفیق پہلے تو بھونچکا رہ گیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد اپنے جسم میں ایک تازگی سی محسوس کی اور فرطِ مسرت سے نسرین کو چوم لیا ۔

بوئے پیرہن

ڈاکٹر اُودے سرن اروساں
(بلاری)

اُس روز میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا جب بھگوان نے نو لڑکیوں کے بعد لڑکے کا منہ دکھایا۔ اس کی پیدائش کے وقت کون سے ستارے کن کن مقام پر تھے۔ پنڈت جی کے پاس یہ پوچھنے کے لئے جب میں گیا تو پنڈت جی کے مکان کے پچھواڑے یہ دیکھ کر رک گیا کہ پنڈت جی کی بیٹی کلپنا نظر جھکائے چپ چاپ کھڑی تھی اور کرم جو ہمارے گاؤں کی بوڑھی مہترانی کا جوان کماؤ پوت تھا اور ابھی ابھی لام پر سے واپس آیا تھا۔ اُس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ کلپنا اور کرم کی بچپن کی دوستی اُس وقت سے تھی جب گاؤں کے بیسک اسکول میں وہ دونوں ایک ہی جماعت کے طالب علم تھے اور میں اس اسکول میں پڑھاتا تھا۔ یوں میں تو اب بھی اُسی اسکول میں پڑھاتا ہوں پھر جب کلپنا کا داخلہ شہر کے بڑے کالج میں ہو گیا تو مجھے ایک انجانی خوشی کا احساس ہوا تھا۔ پتہ نہیں کیوں شاید اس لئے کہ گاؤں میں پہلی بار کسی لڑکی نے کالج کی چہار دیواری میں قدم رکھا تھا لیکن میرا یہ اس مسرت کا احساس نہیں کر سکتا تھا کیونکہ گاؤں کے اکثر لوگ اس روایت شکنی پر برانگیختہ تھے۔

ہاں مجھے یاد ہے اس سے زیادہ خوشی مجھے اس وقت ہوئی تھی جب کرم کو میں نے کالج میں داخل کرایا تھا۔ اس بات کی خبر سوائے میرے اور کسی کو نہ تھی کہ اس بوڑھی مہترانی کو بھی نہیں جس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے اور ہر ایک سے اپنے نالائق بیٹے کی کرتوت بیان کرتی رہتی تھی کہ وہ سرکش آوارہ نکلا۔ حالانکہ اس کی کرتوت یہ تھی کہ اس نے بڑے بھائی کے ساتھ جا کر میلا اُٹھانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ گھر سے تین چار روز تک غائب رہا تھا حالانکہ ان تین چار دنوں تک میں بھی گاؤں میں نہیں تھا۔ لیکن کسی کو مجھ پر شک بھی نہ ہوا تھا کیوں کہ یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق میرا اپنا کیا دھرا تھا۔ کرم میرے ایما پر ہی گاؤں سے باہر گیا تھا اور طے شدہ پروگرام کے مطابق جگہ پر وہ مجھے مل گیا تھا اور اس طرح وہ کلپنا کے کالج میں ہی داخل ہو گیا تھا۔ اور وقت گزرتا رہا اور کالج کے زمانۂ تعلیم میں ہی ان دونوں کے دلی جذبات عمر کے ساتھ ساتھ محبت میں بدل چکے تھے۔ کلپنا نے ایم۔ اے کیا اور کرم نے بھی ایم۔ اے تک کلپنا کا ساتھ نبھایا۔ دونوں ہی کالج میں امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ کرم نے ایم۔ اے کے بعد فوج میں ملازمت کر لی تھی اور اپنی قابلیت اور اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر وہ بڑا افسر بن چکا تھا۔

کلپنا نے ریسرچ کے لئے درخواست دی اور پھر نہ صرف یہ کہ وہ درخواست منظور کر لی گئی تھی بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری بھی مل گئی پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے بی۔ ایڈ کیا تھا اور پھر ایم۔ ا[illegible] یہ سب کچھ ہوا [illegible] سے سر اٹھا۔ اگرچہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو [illegible] گاؤں کے باسی خلاف تھے اور روایت شکن واقعات کی آمد کے منتظر۔

گاؤں کے ان بزرگ جہاں دیدہ لوگوں کا خیال تھا کہ تعلیم نسواں معاشرے کی پُرسکون زندگی کو درہم برہم کر دیتی ہے اور یہ کوئی اچھی بات نہ تھی۔ بہرحال آپ [illegible]

یہ بتاتا چلوں کہ کلپنا اور کرم کی خاموش محبت کا پتہ
گاؤں میں کسی کو بھی نہیں تھا حتیٰ کہ وہ دونوں بھولے
بھالے ذہن بھی جذبات محبت سے سرشار ہونے
کے باوجود اپنے اس پریم سے ناآشنا تھے۔
ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ جب میں لڑکیوں کے بعد
جنم لینے والے اپنے لڑکے کے بارے میں پانچال رکھوانے
پنڈت جی کے ہاں گیا تھا تو کلپنا اور کرم کو دیکھ کر ٹھٹک
گیا تھا۔ اس وقت کرم اپنی فوجی وردی میں ایک بوڑھی مہترانی
ماں کا بیٹا قطعاً نہیں لگتا تھا بلکہ آپ یقین کیجیے کہ
میں اس کی افسرانہ وجاہت سے مرعوب ہوگیا اور کلپنا بھی
تو اب ننھی منی گڑیا نہیں رہ گئی تھی جسے کل میں خود کالج میں
داخل کرا کر آیا تھا۔ جوانی کی دہلیز وہ کبھی کی پھلانگ چکی
تھی۔ مگر اب بھی وہ ایسی دوشیزہ تھی جو کسی بھی جوان
دل کی توجہ کا مرکز بن سکتی تھی۔ پتہ نہیں کب تک میں
اسی ادھیڑ بن میں کھڑا رہتا کہ کرم نے میرے پاؤں چھو کر
نمسکار کیا۔ آشیرواد دے کر جو پلٹا تو کلپنا وہاں نہیں
تھی۔ پھر تھوڑی دیر بعد پنڈت بدری ناتھ ڈیوڑھی میں
لاٹھی ٹیکتے نکلے تھے۔ میں نے انہیں نمستے کی۔ انہوں نے
مجھے دعا تو دی لیکن ان کی آواز فضا کو اداس اور بوجھل
بنا دینے کے لئے کافی تھی اور نہ اب ان کے لبوں سے وہ
شگفتگی اور مسکان بھی غائب ہو چکی تھی جو اس بزرگ
کی خصوصیت تھی۔ اگر آپ نے پہلے کبھی پنڈت بدری ناتھ
کو دیکھا ہوتا تو شاید اب اس حالت میں آپ انہیں پہچان
بھی نہ پاتے۔ یہ وہی پنڈت بدری ناتھ تھے جو چلتے تھے
تو مردانہ وجاہت جیسے ان پر نثار ہوا کرتی تھی بات
کرتے تھے تو دل باغ باغ ہو جاتا مسکراتے تو اپنی
شفقت کا نقش لوح دل پر ثبت کر جاتے۔ ان کے
کھانسنے کی آواز سے میں چونکا اور میں نے اپنی آمد کا
مقصد بیان کیا تو ان کے مرجھائے ہوئے لبوں میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔
مسکراہٹ کی کوئی نمود ابھری اور غائب ہو گئی

جنم درست کی۔ پوتھی نکالی زائچہ دیکھا مبارک گھڑی بتا
دی۔ گیارہ دن بعد نام کرن سنسکار کی تاریخ مقرر کی اور میں
گھر چلا آیا۔ اس دن کوشش کے باوجود پنڈت جی سے
کوئی بات چیت نہ ہو سکی تھی جس کی وجہ سے دل میں ایک
غبار سا تھا۔ نام رکھوانے کا دن آیا تو پھر پنڈت جی کے
پاس گیا۔ انہیں زار و قطار روتے دیکھ کر حیران ہو تو
گیا۔ اس دن اس شفیق بزرگ نے میری نمستے کا جواب
بھی نہیں دیا۔ میری آہٹ سے چونکا بھی نہیں میں پنڈت جی
کے پاس بیٹھ گیا اور ان کے دکھ کا کارن پوچھا تو بس اتنا
ہی بولے۔ بیٹے! کلپنا غائب ہے وہ تو شاید کچھ اور بھی
چاہتے تھے لیکن آنسوؤں کی جھڑی میں آواز گلوگیر ہو
میں کانپ بھی تو گیا۔ کہاں کلپنا اور کرم ......
اور اس کے آگے میں کچھ بھی سوچ نہیں سکا۔ اس وقت
میں اپنے آپ کو بہت بڑا پاپی تصور کر رہا تھا جو کچھ بھی
اثر تھا ہوا اور سب کچھ میری وجہ سے ہوا۔ جیا لال کہتا
نے خود کو تسلی بھی دی کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں
جو کچھ بھی ہوا بھگوان کی مرضی سے ہوا۔ لیکن ایک چبھتا
سا خیال تھا کہ بس کیا بتاؤں کیا حالت ہوگئی تھی میری
بھی اس وقت لیکن صاحب اس بوڑھے برہمن کی حالت
مجھ سے نہ دیکھی گئی اور میں انہیں سمجھانے لگا۔ پنڈت جی
آپ فکر نہ کریں وہ کہیں غائب نہیں ہوئی۔ بلکہ کسی رشتہ دار
میں گئی ہوگی۔ آپ کو اس کی شادی کی فکر دامن گیر
اس لئے آپ کی پریشانی شاید اسی سے۔ دیکھیں زمانہ آج
لڑکیاں خود کما کر اپنی شادیاں کرنے لگی ہیں وہ ماں باپ
پر بوجھ بننا نہیں چاہتیں۔ جلدی میں ہوگی جو آپ کو
آگاہ نہیں کر پائی۔ واپسی میں بتا دے گی وہ بہت سمجھدار
ہے۔ ایسی لڑکیاں دھوکا نہیں کھاتی ہیں۔ یہ سن کر
پنڈت جی بولے۔ یہ بات تو سوچ دور تک گئی
ہے کرم بھی تو اسی وقت سے غائب ہے مجھ کو دھرم
ایمان کچھ بھی جانتے ہیں یہ کہہ کر وہ تو چپ ہو گئے

وہ پھر سسک سسک کر رونے لگے جس بات کو میں دل میں چھپائے بیٹھا تھا وہ ان کو معلوم ہو چکی تھی اب میں نے ان کو دوسری طرح سمجھایا" پنڈت جی ایشور کی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوتا ہے تو اسے بھی ایسے ہی سمجھ لیجئے اور رونا دھونا چھوڑ کر کیدار ناتھ کی طرف دھیان دیجئے اس کی شادی کیجئے اور نوکری لگوا دیجئے یہ سنتے ہی وہ بولے" بیٹا دھن کی کمی سے نوکری تو پہلے ہی نہیں لگ پا رہی تھی۔ کلپنا کے کرتوت دیکھ کر کوئی برہمن اپنی بیٹی بھی نہیں دیگا۔" پنڈت جی کی بات اپنی جگہ ٹھیک تھی مگر میں نے سمجھانے کے لئے ایک جملہ اور لگایا" پنڈت جی آپ پریشان نہ ہوں اس نے ایسا کچھ نہیں کیا ہوگا۔ پریشان حال آدمی سو باتیں سوچ لیتا ہے مگر سب صحیح تھوڑے ہی ہو جاتی ہیں" میں یہی سمجھاتا رہا مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوا وہ برابر روتے رہے اور میں انھیں روتا ہی چھوڑ آیا۔ تین سال بیت گئے کلپنا کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ کلپنا کی شادی کی چنتا میں پنڈت جی پہلے ہی گھل گھل کر آدھے ہو گئے تھے اس واقعہ نے تو جیسے ان کی زندگی کی آشا ہی ان سے چھین لی تھی اور یہ تو ہونا ہی تھا۔ بہت ہی بے وقت کے ساتھ ساتھ پنڈت جی بھی پرلوک سدھار گئے۔ اب اگر کوئی ان کا نام لیوا رہ گیا تھا تو وہ تھا پنڈت جی کا لڑکا کیدار ناتھ اس عرصہ میں معلوم ہوا کہ پنڈت بدری ناتھ جی سورگ واسی ہوئے۔ بلکہ بوڑھی مہترانی بھی اپنے جوان کماؤ پوت سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ وہ کام پر ایسا گیا کہ واپس لوٹا ہی نہیں مہترانی تار پڑھوانے تو میرے ہی پاس آئی تھی اس کا افسوس مجھے ضرور ہوا تھا لیکن اب تمام تر فکر مجھے کلپنا کی تھی میں نے اس کو کہاں کہاں نہیں تلاش کیا۔ کیدار ناتھ بھی بی اے تعلیم پوری کر چکا تھا اور بے روزگار رہتا اس کی ملازمت کے لئے بھی میں نے ہر ممکن کوشش کی۔

اس روز بھی ایک ماسٹر لوگ کے سلسلے میں میں کیدار ناتھ کے ساتھ گیا۔ دہلی بھی ہمارے لئے نیا شہر تھا۔ جب ہم دفتر کے سامنے رکشہ سے اترے اور رکشہ والے کو ایک روپیہ مزدوری کا دینے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو پتہ چلا کہ جیب تو ریل گاڑی میں ہی صاف کر دی گئی تھی۔ گھبراہٹ میں ہر جیب کی میں نے تلاشی لے ڈالی اندر کی جیب میں ایک اکنی ہاتھ لگی اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ کل زادِ راہ میرے ہی پاس تھا کیدار ناتھ بیچارے کے پاس تو ایک پیسہ بھی نہ تھا میں نے مجبوری جتاتے ہوئے رکشہ والے سے آٹھ آنے ہی لینے کی گزارش کی مگر اب اسے کیا کہیئے کہ جیب کٹنے کو وہ ایک بہانہ ہی سمجھ رہا تھا کم مزدوری دینے کا پھر جیسا کہ دستور ہے بات بڑھی اور کچھ راہ گیر اور رکشہ والے جمع ہو گئے اور معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کرنے لگے مگر رکشہ والا ہمدردوں کی کمی بیشی دیکھ کر اور اکڑ گیا دیوالی کے دن تھے شہر میں کہیں جھگڑا فساد نہ ہو اس کوشش میں پولیس ادھر ادھر گھوم رہی تھی اتفاق سے ایک اہم معاملہ سمجھتے ہوئے پولیس جیپ ادھر بھی آ نکلی یہ ڈپٹی ایس۔پی کی تھی۔ جو ایک خاتون تھیں وہ باہر نکلیں رکشہ والے کو آٹھ آنے اپنے پاس سے دیئے اور مجھے اور کیدار ناتھ کو اپنے ساتھ بنگلے پر لے گئیں۔ کیدار ناتھ تو نادم اور شرمندہ سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا لیکن اس اثنا میں میں نے اس لیڈی پولیس افسر کو پہچان لیا تھا یہ اور کوئی نہیں کلپنا ہی تھی بنگلے پر پہنچ کر اس نے مجھے نمسکار کیا میں نے بھی آشیرواد دیا میرا دل بھر آیا اور بے اختیار ہو کر رو پڑا میرے رونے کی آواز نے کیدار ناتھ کو جیسے یک دم چونکا دیا۔ اب جو اس نے کلپنا کی طرف دیکھا تو جیسے یک لخت چیخ پڑا۔ پھر نفرت سے منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ اور قریب تھا کہ بھاگ جائے۔ میں نے اسے سختی سے پکڑ لیا اور کہا کیدار ناتھ بالکل مت گھبراؤ۔ مدت بعد بچھڑی ہوئی بہن ملی ہے اس بیچاری سے اگر کوئی غلطی ہو گئی تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم

اس سے نفرت کرنے لگو۔ بہتا سے مل کر اس کا حال تو معلوم کیا ہوتا۔

کیدار ناتھ اور کلپنا بھی رو پڑے پھر میتا نے سکون کی سانس لی اور کہا "یہ دھرتی لیلا بھی کیسی عجیب ہے وہ کس طرح بچھڑے ہوؤں کو ملا دیتا ہے" کلپنا سے میتا نے پوچھا "تم نے جو ترقی کی ہے بلا شبہ وہ قابلِ داد ہے لیکن تم نے جس طرح اپنے خاندان کے ناموس کو شکست کیا یہ شرم کی بات ہے" وہ بولی "شرم شرم تو جہیز کے لالچی ڈبل رول ادا کرنے والے سماج کے ان دوغلے کردار والوں کو آنی چاہیئے جن کی وجہ سے ماں باپ تنگ دستی کی چکی میں پستے ہیں اور لڑکیاں زندگی بھر مجبوری کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی دوزخ کی زندگی جیتی ہیں یا خودکشی کر بیٹھتی ہیں کیا ایسی لڑکیوں کا مقدر یہی ہے کیا عقل کا دیا ان میں نہیں ہے"۔

کلپنا کی باتیں سن کر کیدار ناتھ بہت سوچ سمجھ کر بولا۔ ہاں۔ تم ٹھیک ہی کہتی ہو کلپنا۔ مگر تمھارے دل نے کیسے اس کو قبول کر لیا۔ اپنے شریکِ حیات چننے کے معاملے میں تم نے فضول کے رسم و رواج کو ہی نہیں توڑا۔ بلکہ آزادانہ روش کو اپنا کر پتاجی کو ایک بہت بڑے صدمے سے دوچار کیا۔ وہ تنک کر بولی "میں تمھارا اشارہ سمجھ گئی سارے سنسار کو ایک کٹمب بتانے والے رشیوں نے جب ہندو سماج کو چار حصوں میں تقسیم کیا تھا تب ہم سب ایک ہی تھے آپس میں اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے تھے پھر آج پھر اکھٹا کی بھاونا کو بل دے لیا برا ہے کیا ایک ہو کر جینا ٹھیک نہیں ہے۔ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کلپنا نے کہا میں نے کرم کو اپنا جیون ساتھی نہیں بنایا کرم نے جو احسانات مجھ پر کیئے ان کا بدلہ میں شاید اس جنم میں نہیں چکا سکتی۔ آج میری جو پوزیشن ہے وہ کرم کی ذات کی کوششوں کی رہین منت ہے ہماری محبت دنیاوی آلائشوں سے پاک تھی ہماری محبت بھائی بہن کے رشتے کا ایک مقدس اور خوشنما بندھن تھی یہ تنگ نظر سماج شاید اسے کبھی گوارا نہ کرتا۔ لہٰذا میں نے نہ صرف ان فرسودہ روایات سے فرار حاصل کیا بلکہ سماج کے ان دوغلے کردار والوں اور کھوکھلے آدرش والوں سے کھلی بغاوت کی" یہ کہہ کر وہ قدرے خاموش ہوئی۔ پھر بولی میں کسی بینک میں اپنی واقفیت کا استعمال کر کے تم کو کوئی اچھی ملازمت دلوا دوں گی۔ اور جلد ہی کوئی ذردار برہمن اپنی حسین لڑکی تمھارے ساتھ بیاہ دے گا اور وہ مکان جو کو بیچ کر میری شادی کی جانے والی تھی ایک شاندار کوٹھی میں تبدیل ہو جائے گا۔

کیدار ناتھ کے چہرے کی مسکراہٹ شاید کہتی کہ وہ بہن کی ہر بات سے متفق ہو گیا تھا۔

غزل

نصیر افسر
رانچی

زمیں ہے آسماں اوڑھے جو خشک و تر میں رہتے ہیں
گری دیوار ہوتی ہے وہ ٹوٹے گھر میں رہتے ہیں

ہر اک ہستی کو یہ دنیا عموماً بھول جاتی ہے
غبارِ کارواں جیسا جو پال و پر میں رہتے ہیں

محبت کی زباں سمجھے ہوس کی آگ سے بچ کر
تعداد دو چار ایسے بھی زمانے بھر میں رہتے ہیں

زمیں ہے تنگ، فلک ہے دور، ایسے میں کہاں جائیں
ہمارا حوصلہ دیکھو ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں

ہماری بد نصیبی کے اثاثہ ہیں جنیں والو
یہ قطرے اشک کے اثر جو چشمِ تر میں رہتے ہیں

سراب

محمد مبین نغمہ کھام گانوی
([illegible])

عورت صرف عورت ہی نہیں بلکہ قدرت کا ایک ایسا
طیہ ہے جس کے بغیر انسانی زندگی نامکمل ہی نہیں بلکہ بے
لف ہے عورت ازل سے لیکر آج تک ایک معمہ رہی ہے
ے کوئی بھی حل نہ کر سکا کہیں وفا بن کر خود کو مٹایا تو کبھی
پیار دائرۂ خلوص اتنا وسیع کیا کہ ساری کائنات اس میں
ہو جائے، کبھی بے وفائی پر اتر آئی تو مرد الامان و
لحفیظ پکار اٹھا۔ یہی عورت ممتا بن کر دعاؤں کا خزانہ
ٹاتی ہے تو بہن کے روپ میں خلوص کے اُفق پر چار چاند
اتی ہوئی بھائیوں کا سر ہمیشہ کے لئے بلند کر دیا اور عورت
ا شریکِ حیات بن کر غموں کے صحراؤں میں نشاط بن کر
ودار ہوئی تو کہیں ممتا کے نام پر کلنک۔

جب سے شفیق نے اپنی نسبندی کروائی تھی اسے ہر وقت
ھتا دا سا رہتا۔ مرتا کیا نہ کرتا تین بچوں کا باپ پھر نوکری
سوال سرکاری ملازمت میں بھی اب ایک نسبندی کا
بن دینا لازمی جو تھا۔ شفیق کی خوبصورت شریکِ حیات
رین شفیق کے لئے قدرت کی طرف سے نادر و نایاب تحفہ تھی
رین جو سراپا حسن و جمال۔ بوٹا سا قد۔ امور خانہ داری
ں مہارت رکھنے والی تین بچوں کی ماں بن جانے پر بھی
یا لگتا تھا کہ ابھی اس کی شادی کو دو چار ماہ ہی ہوئے
وں گے۔ آج نسرین جب بچوں کو سکول پہنچا کر گھر لوٹ
رہی تھی کہ اچانک راہ میں اس کی ملاقات اپنے طالب علمی
زمانے کے ایک شناسا سلیم سے ہوگئی۔ چند دن ہی ہوئے
سلیم کا اسی گاؤں میں پرائمری مدرسہ میں تبادلہ ہوا تھا
بھلا ایسے عالم میں سلیم نسرین اور اس کے بچوں کو چھوڑ کر
پنے گھر کیسے جا سکتا تھا بچے سلیم کی باہوں میں لپٹے لپٹے نیند کی
غوش میں چلے گئے نسرین اور سلیم اب آنکھوں آنکھوں میں

بات کر رہے تھے سلیم چاہتے ہوئے بھی گھر نہ جا سکتا تھا۔
اور نسرین ایسے طوفان میں اسے اپنے گھر جانے کو کہنے کے باوجود
کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ آخر کار تنہائی میں شیطان نے اپنا تیر چلا
ہی دیا اور چند ہی لمحوں بعد نسرین اور سلیم شیطانیت رقصاں
کے جنگل میں گرفتار ہو چکے تھے۔ کچھ دیر بعد طوفان ختم گیا
اور ہر طرف سناٹا اور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مگر نسرین بجائے
ندامت کے اپنے آپ میں اک تازگی محسوس کر رہی تھی کیونکہ
ایک مدت کے بعد اسے مضبوط باہوں میں پناہ ملی تھی نسرین
سمجھتی تھی کہ شفیق نے جب سے آپریشن کروایا ہے وہ ایک
طرح سے احساسِ کمتری میں مبتلا تھا وطن میں شفیق کے
والد کی علالت نے طول پکڑ لیا تھا لہٰذا وہ دو مہینے کے بعد
جب واپس آیا تو نسرین نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ اس
کا خیر مقدم کیا۔ آج دونوں میاں بیوی بہت ہی خوش تھے
اور پھر شفیق نے اپنے والد کی شفایابی کی خوشخبری بھی سنائی
تھی نسرین کا گرمجوشانہ رویہ دیکھ کر شفیق بہت خوش تھا
وہ کبھی خوش خوشی وطن کی باتیں سنا رہا تھا کہ قطع کلامی
کی معافی چاہتے ہوئے نسرین کہہ اٹھی۔ سنو جی آپ کو وہ بات
تو یاد ہوگی کہ کالو میاں نے نس بندی کروائی تھی مگر پھر بھی
اُن کے یہاں بچے کی پیدائش ہوئی تھی۔ کچھ سوچتے ہوئے
شفیق کہہ اٹھا۔ ہاں اچھی طرح یاد ہے بس کچھ ایسا ہی واقعہ
اپنے ساتھ بھی پیش آیا ہے۔

سلیم شرافت کا پیکر تو مسکراہٹوں کا گلدستہ اور جسمانی
طور سے مضبوط تھا اور اس کی مردانہ وجاہت کسی بھی لڑکی
یا عورت کو اپنی طرف متوجہ کر سکتی تھی۔ نسرین نے سلیم کو
شام کو چائے پر مدعو کر کے اپنے شوہر سے اس کا مختصر سا
تعارف کرایا سلیم نے پہلی ہی ملاقات میں شفیق پر ایسا اثر

([illegible])

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ

(رجسٹرڈ ہیڈ آفس ۷۸ محمد علی روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳)

دہلی برانچ، دریا گنج نئی دہلی

اعلان بسلسلۂ حج ۱۹۸۴ء

ہم بہ مسرت یہ اعلان کرتے ہیں کہ امسال بفضلِ تعالیٰ حج کمیٹی نے حجاج کرام کی سہولت کے لئے زرِ مبادلہ (فارن ایکسچینج) جاری کرنے کی خدمت انجام دینے کے لئے بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ کو منتخب کیا ہے۔

جن حجاجِ کرام کی درخواستیں حج کمیٹی کی جانب سے منظور کردی گئی ہیں، اُن حضرات سے گزارش ہے کہ وہ ہندوستانی رقم، مبلغ -/12395 روپئے (جو کہ سعودی ریال چار ہزار کے برابر ہے) کا ڈرافٹ ہماری کسی بھی برانچ یا کوئی بھی شیڈولڈ بینک سے لے آئیں جو بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ اکاؤنٹ (حاجی کا نام) کے حق میں ہو اور دہلی، بمبئی یا مدراس میں جاری کیا گیا ہو۔

نوٹ :- دہلی سے بذریعہ ہوائی جہاز جانے والے زائرین حج سے گزارش ہے کہ وہ برائے سہولت اپنے ڈرافٹ صرف دہلی پر ہی جاری کرائیں۔

Regd with the Registrar of Newspaper at R. No. 649/57





[illegible]

ماہنامہ

شانِ ہند دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

جلد [illegible]

• اردو دانشوروں کا [illegible] موضوع پر [illegible] ہے۔

• عمرؓ سے سوال کیا گیا کہ [illegible] کوشش اور [illegible] اعتراف درست ہے لیکن اس میں حیات [illegible] شامل کیا ہے

• عمرؓ نے ایک عورت کی اس شکایت پر کہ اس کی گود [illegible] ہے وہ اس کے بیٹے سے تعلقات [illegible] شوہر کی یادگار ہے بیٹے کو دُرّوں سے پٹوایا جس سے وہ ہلاک ہو گیا [illegible] نے استعجاب کا اظہار کیا فرمایا پہلا فعل امیر المومنین کا [illegible] دوسرا فعل ایک باپ کا ہے کہ شفقت پیدا [illegible] نہیں سکتی۔

• ابو شحمہ [illegible] حضرت عمرؓ کے [illegible] بیٹے [illegible] سے دونوں بھائیوں کو [illegible] ایسا ہی کیا۔ حضرت عمرؓ کو علم ہوا [illegible] سے پوچھا [illegible] ہیں یا [illegible] حضرت عمرؓ نے اصل اور [illegible]

• جب کوئی حکومت یا [illegible] دل سے نکل جائے تو اسے اقتدار سے فوراً الگ ہو جانا چاہیے [illegible]

(۱) پرکاش سرور تونسوی [illegible] مسجد دہلی
اور سرورق [illegible] شائع کیا

ہمارے چند اہم مطبوعات

خزینۂ بلاغت :- ابوالبلاغت رتن [illegible] مصنف و مترجم سو کتب کا مجموعہ اور دو درجن مطالعہ کا نچوڑ بلاغت پر بھرپور جامع اور مکمل کتاب علم البیان صنائع و بدائع کی جملہ انواع و اقسام علم عروض اصناف سخن غزل قصیدہ مرثیہ مثنوی قطعہ رباعی سہرا [illegible] ریختی واسوخت مستزاد [illegible] قدیم و [illegible] نظم [illegible] دنظم ساہیت سنگیت۔ دوہا [illegible] ڈرامہ وغیرہ، ہر اقسام شعر [illegible] فصاحت و بلاغت عیوب کلام تعقید فتح فک اضافت تنافر تنافر لفظی تنافر قرأت مخالف قیاس [illegible] اور واقعی ہیں جیسے تناقض و تنافر کلمات [illegible] کلمات سنج [illegible] خلالہ و سرقہ [illegible] [illegible] پہلے [illegible] نظر [illegible] حشو و ضعف و عدم [illegible] [illegible] بندش کا [illegible] سنا [illegible] التعقیب [illegible] سقوط [illegible] ہے و ساتقص [illegible] عروض ملت کا [illegible] سقطر [illegible] شکست ناروا [illegible] [illegible] [illegible] محاسن کلام اور ان [illegible] علم عروض [illegible] ارکان بحریں زحافات اور [illegible] امکان عشو فرومات مستعملہ اوزان [illegible] تقطیع [illegible] [illegible] و قافیہ وغیرہ پر مفصل و مکمل اور مدلل اظہار خیال بلاشبہ دنیائے علم و ادب میں اسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

قیمت ۴۰/-

فن تاریخ گوئی :- فن تاریخ گوئی کا فن خالص [illegible] [illegible] فن [illegible] بلاغت [illegible] [illegible] کی [illegible] جامع اور مکمل کارنامہ [illegible] کے لئے ایک گرانبہا تحفہ۔ قیمت ۱۵/-

---

نادرہ :- جوگیندر پال کا نیا ناول

قیمت - ۵/-

سپنے :- سرزمین راجستھان کے قابل ذکر شاعر جناب چندن بھارتی جن کے کئی مجموعے شائع ہو کر دنیائے شاعری سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں حال ہی میں ادارہ شان ہند نے چندن صاحب کے تازہ ترین کلام کا مجموعہ "سپنے" شائع کیا ہے دیکھئے اور پڑھئے جو تعلق رکھتا ہے صنف نازک۔ چندن صاحب کے کلام کو ہے حیرت [illegible] ۲۵۶ پر چھپا ہوا چندن صاحب کا یہ مجموعہ کلام بہترین انداز میں پیش کیا گیا ہے قیمت - بیس روپے

آواز دل :- اردو کے مہمان شعراء میں لیس خفیف ایک جانا پہچانا نام ہے حال ہی میں ادارہ شان ہند نے خفیف صاحب کا مجموعہ کلام "آواز دل" شائع کیا ہے یہ مجموعہ آپ کی ذاتی لائبریری میں یقیناً ایک بہترین اضافہ ہوگا قیمت پندرہ روپے

شمع فروزاں :- جناب آتش صاحب بہاولپوری کا یہ مجموعہ کلام ادارہ شان ہند کے اہتمام میں چھپ کر شائع ہوا ہے اس مجموعے کی اشاعت کے لئے حکومت ہریانہ نے مالی امداد فرمائی ہے جو اس کا ثبوت ہے کہ آتش بہاولپوری کا یہ مجموعہ احنان کا ایک اچھا گلدستہ ہے قیمت اٹھارہ

دفتر شان ہند پبلیکیشنز ۵ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۲ ۱۱۰۰۰۲

یہ ہجر کی فضا ہے کہ ... چپ کر دو؟

غالب ایوارڈز۔

ہم ہندوستانیوں کی سرشت میں یہ وصف ہو چکا ہے کہ ہر معاملے میں ہم اپنے کنبے بھائی بھتیجوں اعزہ عزیز و اقارب اور ملنے جلنے والوں کو دوسروں پر ترجیح دیتے ہیں خواہ اس سے کسی دوسرے حق دار کا حق مارا جائے یا کسی اہل کمال کی بجائے نااہل کو نوازا جاتا ہو۔ یہ بدعت ایوارڈز کا فیصلہ کرنے والے اکثر اصحاب میں بھی پائی جاتی ہے جس کے نتیجہ میں اکثر ایوارڈز میں اصل حقداروں کی حق تلفی صاف صاف دکھائی دیتی ہے بے شک عوام اس حق تلفی کا کوئی نوٹس نہیں لے سکتے مگر وہ دل ہی دل میں اس ناانصافی پر احتجاج کرتے ہیں اور انعامی فیصلہ کرنے والوں کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے۔

مثال کے طور پر اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کی انعامی کمیٹی نے ۱۹۸۳ء میں اردو کی مطبوعات پر جو کہ ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی تھیں انعامی فیصلہ کرتے وقت جہاں معمولی سی معمولی کتابوں کو انعام دیا وہاں ایک یادگاری اور قابل قدر کتاب ہندوستان کے مسلمان شعراء کو محض اس لئے انعام سے محروم رکھا کہ انعامی کمیٹی کا ایک ممبر رشید حسن خاں اس کتاب کے ناشر سے ناخوش تھا اور رشید حسن خاں نے پروفیسر سید محمد عقیل، پروفیسر شبیہ الحسن کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ پروفیسر محمود الٰہی، پروفیسر حکم چند نیر کا کہنا ہے کہ انھوں نے کسی ایک کتاب پر بھی انعام دیئے جانے کی سفارش نہیں کی [illegible] صاحب اس کتاب پر انعام دیئے جانے کے حق میں تھے۔ مگر رشید حسن خاں [illegible]

[illegible] کے مقابلے میں [illegible] صاحب کی کچھ [illegible] کی جو [illegible] کے ممبر تھے [illegible] دالان پاکستان کے [illegible] کے سلسلے میں شعر کتاب [illegible] اس کتاب کو انعامی قرار دینے [illegible] لعنت سمجھتے ہیں مگر [illegible] انعامات [illegible] اور لکھنے والوں کا انصاف [illegible] نہیں ہوگا۔ اسی طرح ایوارڈ کا فیصلہ کرتے وقت اکثر ناانصافی کی جاتی ہے اور حق داروں کی حق تلفی کر کے انھیں ذہنی تکلیف پہنچائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ساہتیہ اکادمی کے انعامات بھی بعض اوقات حق داروں کو نہیں ملتے کیونکہ ساہتیہ اکادمی کے ایوارڈ دینے [illegible] یہی اصول ہے کہ انعامی فیصلہ کرنے والے اپنے آپ کو ہر حال میں بے گناہ سمجھتے ہیں۔ غالب ایوارڈ کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی ہے [illegible] انعامات [illegible] لوگوں کو دیئے جاتے ہیں مگر ۱۴ جولائی ۱۹۸۴ء کو ایوان غالب میں جو غالب ایوارڈز دیئے گئے ان میں [illegible] غالب انعام برائے اردو طنز و مزاح کے بارے میں ادبی حلقوں میں چہ میگوئیاں کی جا رہی ہیں [illegible] کو دیئے جانے میں انعامی فیصلہ کرنے والوں نے یقیناً غلط فیصلہ کیا ہے۔

ہمارے [illegible] پاکستان کا [illegible] اردو داں طبقہ جو طنز و مزاح ایسی لطیف شے سے واقف [illegible] وہ ایک زبان ہو کر [illegible] کا اولین طنز و مزاح نگار جناب [illegible] جناب مجتبیٰ حسین کا مقام [illegible]

کا اظہار فرما کر یہ ثابت کیا ہے کہ انہوں نے یہ فیصلہ کسی دباؤ اور مجبوری کے تحت کیا ہے اور یا پھر حکومت کے اس اشارے کی تعمیل کی گئی ہے کہ پھر معاملات جوں کا تعلق اندو سے ہوا سے چاہئے کہ زیادہ سے زیادہ غیر مسلم حضرات کو نوازے بے شک کسی ایسا میں حقدار غیر مسلم کی حق تلفی ہی کیوں نہ ہوتی ہو کیونکہ حکومت کو مسلمانوں کے ووٹ اپنے محفوظ کرنے میں محض نمائندگی کے طور پر کسی ایک آدھ غیر مسلم کو ایوارڈ دے کر سمجھ لیا ہے کہ ان کی آبرو بچائی جاتی ہے۔ بہرحال تنسیما صاحب کی جو حق تلفی کی گئی ہے ہم اس کے خلاف ہیں اور چاہتے ہیں کہ غالب ایوارڈ کا فیصلہ کرنے والے حضرات اپنے دامن میں جھانکیں اور اگر انہیں اس غلطی کا احساس ہو تو بہادر کرم آئندہ حق دار انصاف کا ساتھ دیں خدا ان کا ساتھ دے گا۔

اثر پرویش

ہے کوئی جواب دینے والا؟

اردو اکادمی نے مشاعرہ پر تقریباً اسی ہزار روپے صرف کیا اس مشاعرہ کو سننے والوں کی تعداد پندرہ ہزار سے زائد تھی یعنی مشاعرہ سننے کے لئے اتر پردیش اردو اکادمی کو مشاعرہ کے سامعین پر ہر فرد واحد پر اوسطاً چھ روپئے خرچ کرنا پڑا۔

۲ اردو اکادمی دلی نے رفعت سروش صاحب کا بیلے ایوان غالب میں پیش کیا جس کا معاوضہ تقریباً بیس ہزار روپیہ ادا کیا گیا اور بیلے کو دیکھنے والے حضرات کی تعداد مشکل سے ۲۵ کے قریب تھی کیونکہ گورنر صاحب کی تقریر کے بعد سامعین کا مجمع تقریباً آن واحد میں چھٹ گیا تھا یعنی اردو اکادمی دلی نے یہ بیلے دکھانے پر ہر سامع کے لئے ایک ہزار روپیہ برباد کیا۔

۳ اردو اکادمی دلی نے پچھلے دنوں کتابوں کی رسم اجرا تقسیم انعامات وغیرہ تقاریب کا انعقاد کیا ان سب تقاریب اور مشاعرہ لال قلعہ کی جو تصاویر لی گئی تھیں ان پر جو بے دریغ روپیہ خرچ کیا گیا اس کی تفصیل یہ ہے کہ رنگین تصاویر کے بہترین قیمتی البم بنوائے گئے اور یہ البم لفٹیننٹ گورنر۔ چیف ایگزیکیو کونسلر، ایگزیکیو آفیسر کو پیش کئے گئے اور ایک ایک البم اکادمی کے دفتر میں بطور یادگار رکھا گیا ان تصاویر پر جو اخراجات ہوئے وہ کئی ہزار روپے ہیں۔

۴ دلی اردو اکادمی نے ہر تقریب اور مشاعرہ لال قلعہ کے موقع پر پھول اور پھولوں کے گلدستے خریدنے پر جو روپیہ برباد کیا ہے اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں محض سپرو ہاؤس میں جب راشٹر صاحب کو جشن طنز و ظرافت میں مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا گیا تو کئی ہزار روپیہ کا بل محض گلدستوں کی قیمت کا ادا کرنا پڑا اور نتیجہ یہ ہوا کہ نریندر لوتھر صاحب نے جو انشائیہ پڑھا اس کا عنوان تھا "گلدستہ" جو کہ کئی دفعہ اخبارات اور رسائل میں چھپ چکا۔ اور اس انشائیہ میں تقاریب کے صدور اور مہمانان خصوصی کا مذاق خاطے توہین آمیز انداز میں اڑایا تھا اور جناب سکریٹری صاحب بار بار اعلان فرما رہے تھے کہ راشٹرپتی صاحب آج کے اس جشن کے مہمان خصوصی ہیں۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ راشٹرپتی صاحب نے اسے اپنی توہین سمجھا اور جلسے سے جلد اٹھ کر چلے گئے۔ کیا کوئی مائی کا لعل بتا سکتا ہے کہ ان سب تقاریب یا مشاعروں سے اردو کو کیا تقویت ملی؟

یہ زر کثیر جو محض ہوا میں اڑ جانے والی داد اور فضول کے بیلے وغیرہ اور پھولوں کی خریداری تصاویر پر برباد کیا گیا اس کا مصرف کسی ایسے انداز میں نہیں ہو سکتا تھا جس سے واقعی اردو کو تقویت ملتی۔ اردو اکادمی ہوتی۔ پھولوں، تصاویر

بیلے اور دوسری فضول کی تقاریب پر کثیر اخراجات
ن تفصیل سے عوام کو واقفیت بہم پہنچانے سے گریز
ر رہا ہے۔

کیا عوام ان فضول خرچیوں کے خلاف آواز
لند کریں گے اور اردو اکاڈمیوں کی ان ذہنی عیاشیوں کو
ختم کرنے میں اپنا فرض ادا نہیں کریں گے۔ اگر آپ
سمجھتے ہیں کہ حکومت ان فضول خرچیوں اور ذہنی
عیاشیوں کے خلاف کوئی نوٹس لے گی تو یہ آپ کی بھول
ہے حکومت تو ایسے اداروں پر روپیہ برباد ہی اس
لئے کر رہی ہے کہ کسی طرح مسلمان حضرات کو اردو
کے نام پر بے وقوف بنایا جائے اور ان کے ووٹوں
محفوظ رکھا جائے ہمارے چیف ایگزیکیٹو کونسلر
ور شری کلا سند سجا رنگی جی ہر تقریب میں بڑے
فخر سے کہا کرتے ہیں کہ اردو اکاڈمی بڑا اچھا کام کر
رہی ہے کیا یہ دونوں حضرات مندرجہ بالا فضول
خرچیوں کے بارے میں وضاحت فرمائیں گے کہ ان
سے اردو کی کیا ترقی ہوئی؟

تعزیتی جلسہ :- جناب ظفر ادیب کے
انتقال پُر ملال پر ۱۳ جولائی کو اردو گھر میں دلی کی
مختلف ادبی انجمنوں اور انجمن ترقی اردو (ہند) کی
جانب سے ایک تعزیتی جلسہ زیر صدارت ماہر
لسانیات عالیجناب مالک رام صاحب منعقد ہوا
جس میں ہر مکتبۂ خیال کے اردو دانشوروں کے
علاوہ سفارت خانہ پاکستان کے پریس منسٹر جناب
حسن عسکری صاحب نے بھی شرکت فرمائی۔
پہلا موقع ہے کہ کسی اردو دانشور کے انتقال
پر ایسے ادیبوں، شعرا اور ان کے عقیدت مندوں
نے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا ہو اور مرحوم
کی علمی، ادبی، صحافتی خدمات کو سراہا ہو۔

ایڈیٹر شانِ ہند نے اس موقع پر کہا کہ ظفر صاحب سے
میرے برادرانہ تعلقات نصف صدی سے تھے اور ان
کے مجھ پر کئی احسانات بھی ہیں ملتان میں میں ان کا
کرایہ دار بھی رہا اور انھیں دہلی میں کرایہ دار کی حیثیت
سے کس مپرسی کے عالم میں موت کے منہ میں جاتے ہوئے
بھی دیکھا محض زبانی طور پر ظفر صاحب کی تعریف کرنے
اور ان کی ادبی خدمات کو سراہنے سے ان کے قابل رحم
پس ماندگان کو کوئی راحت نہیں مل سکے گی اس لئے
عملی طور پر بھی اس وقت ظفر صاحب کی بیوہ اور
ان کی دو یتیم بچیوں کی خدمت کرنی چاہئے (ظفر صاحب
کی تین لڑکیاں شادی شدہ ہیں) لہٰذا ایڈیٹر شانِ ہند
نے چند ایسی تجاویز پیش کیں جن سے مرحوم کے لواحقین
کے آنسو عملی طور پر پونچھے جاسکتے تھے جملہ حاضرین اور
مقررین نے ان تجاویز کو پسند فرمایا اور وعدہ فرمایا کہ
وہ ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں
گے ایڈیٹر شانِ ہند نے دلی اردو اکاڈمی کی ایوارڈ
و مالی امداد کمیٹی کے صدر جناب انور دہلوی ممبر
میٹروپالیٹن کونسل کی تعریف کی کہ وہ مرحوم ظفر ادیب
کے پس ماندگان کے لئے اپنے خصوصی اختیارات سے ہر
ممکن مدد کرنے کی سعی فرما رہے ہیں۔

علالت :- راقم الحروف پچھلے دنوں علیل رہا
جس کی وجہ سے جون ۱۹۸۳ء کا شانِ ہند دیر سے
حاضر خدمت کیا جا رہا ہے ماہ رمضان میں دفتر کے
ساتھی وطن تشریف لے گئے اور ۸ جولائی کو واپس
لوٹے ان مجبوریوں کے باعث شانِ ہند کا وقت مقررہ
پر شائع ہونا ناممکن تھا۔ اُمید ہے کہ قارئین کرام
معاف فرمائیں گے۔ اسی وجہ سے یہ شمارہ کم
صفحات پر شائع ہو رہا ہے۔

بہ کوئے یار بہ انداز محرمانہ گزر

[illegible]

دوسری جنگ عظیم شروع ہوتے ہی مجھے [illegible]
جالندھر سے اپنے وطن تونسہ شریف ضلع ڈیرہ غازی خان
واپس آنا پڑا مگر حالات کا تقاضا تھا کہ میں کم
سے کم یا دہ دور رہوں۔ ان دنوں میں رسالہ ایجوکیشنل گزٹ
جالندھر کی ایڈیٹری بھی ترک کر کے اپنا ماہنامہ حشر جاری کیا
تھا جو جالندھر چھوڑنے کے بعد ماہنامہ حشر کی اشاعت
بند ہو گئی۔

جو شخص ایک گھنٹہ بھی بیکار نہ رہ سکتا ہو اُسے
اگر مسلسل بیکاری کا سامنا کرنا پڑے تو یا تو وہ بیمار
پڑ جائے گا یا کوئی نہ کوئی مشغلہ اختیار کرے گا۔ چنانچہ
میں نے [illegible] الدین سے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ
میرے لئے جو بھی کام تجویز کر رہے ہیں وہ میرے بس کے
باہر ہیں مثلاً کرانہ کی دوکان وغیرہ۔ علاقہ تونسہ شریف کے
گدی نشین خواجگان اور ان کے صاحبزادگان سے
میرے تعلقات بڑے نیازمندانہ تھے اور مجھے خواجہ غلام
نظام الدین صاحب اور خواجہ حافظ [illegible] الدین صاحب
جو ان گدی نشینوں کے ہاں بڑا عزت کا مقام حاصل
تھا۔ وہاں ایک اللہ نور خان (جو انگریزی ڈپٹی کمشنری
پر ملازم رہ چکے تھے) اس علاقے کے ایک مشہور شاعر
تھے اور مجھے وہ اپنا کلام سنا کر یوں سمجھتے تھے جیسے انہیں
شاعر ہونے کی سند مل گئی ہو۔ [illegible] کے رئیس [illegible]
خان تنگوانی اور سردار محمد خان تنگوانی دونوں مجھے اپنا
مشیر خاص سمجھتے تھے حالانکہ دونوں حضرات میں جانی
دشمنی تھی۔ فیض محمد خان تنگوانی مجھے دیکھنے سندھ کے
[illegible] شہر اکثر [illegible] چلے جاتے [illegible]
صاحبزادگان [illegible] کے [illegible]

[illegible] (خان) [illegible] کے ساتھ
رہتیں اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندو کسی مسلمان
کے ہاں پانی تک نہیں پیتا تھا۔ ادھر میرا معاملہ یہ تھا
کہ دو پہر کا کھانا فیض محمد خان تنگوانی کے ہاں ہے تو رات
کا سردار محمد خان تنگوانی کے ہاں۔ تونسہ شریف میں صاحب
زادگان کئی کئی دن تک مجھے اپنے ہاں ٹھہرائے رکھتے
اور کاروں میں [illegible] لئے جاتے۔

میرے سسرال والے ہندو [illegible] اس پر سخت اعتراض
تھا کہ میں مسلمانوں کے ہاں کھانا پینا [illegible]
میں ہر ہندو یہی سمجھتا تھا کہ مسلمان صرف گائے یا بھینس
ہی کا گوشت کھاتا ہے مگر انھیں کیا خبر تھی کہ ان کا یہ
لالچی ہندو ہر روز مرغ، تیتر، بٹیر اور مچھلی سے [illegible]
ہے۔ ان دنوں بکرا ایک روپے کے تین، تیتر ایک روپے
کے تین چار، مرغ تین چار آنے میں۔ دنبے کا گوشت
آٹھ آنے کا سیر اور بکرے کا گوشت چھ آنے سیر
تھا۔ دیسی مرغی کا انڈا ایک پیسے کے دو ملتے تھے
دیسی گھی بارہ آنے سیر تھا۔ بے شک جنگ کے باعث
اشیاء کے نرخ کسی حد تک بڑھنے شروع ہو گئے تھے
مگر [illegible] تھا۔ مجھے ہندو [illegible]
کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ [illegible] اپنا مسکن بنانا
چاہئے اور وہاں سے ایک ہفت روزہ جاری کیا جائے
[illegible] کی بہترین کتابیں شائع کی جائیں تو وہ زمانہ
بہت [illegible] تھا۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہو [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible] سے پہلے [illegible]

[illegible]

[illegible] دو سو روپے کا انتظام کیا اور مکان جانے کی تیاری
شروع کر دی۔ مرحوم احسان دانش نے [illegible] ایک
یہ فرمایا تھا کہ [illegible] صاحب ظفر ادیب ملتان
[illegible] ان کے شاگرد رشید ہیں اگر کسی ملتان کے
شخص کو کام کرنے دو ظفر ادیب صاحب سے مل لینا
دوسرے حوالے دے دینا۔ [illegible] کا نام لے کر [illegible]
آخر میں ملتان [illegible] ظفر ادیب
سے ملا اس وقت ظفر صاحب [illegible] تھے۔ [illegible]
[illegible] عندیہ ظاہر کیا تو کہا [illegible] نہیں کچھ
[illegible] میرے ساتھ رہیے [illegible] مکان ہے جب کاروبار
شروع کر لو گے تو مکان کا بھی انتظام ہو جائے گا۔

دوسرے دن میں ملتان کے اخبار نویسوں سے ملا۔ لالہ
[illegible] کرشن [illegible] وکیل۔ ایڈیٹر اقبال۔ جناب [illegible] ولی
صاحب۔ ایڈیٹر سدرد۔ خلیق ملتانی اور ظفر حیدری
[illegible] حضرات سے بات چیت کی اور بتایا کہ میں ملتان
سے ایک ہفت روزہ شائع کرنا چاہتا ہوں۔ ظفر حیدری
ایڈیٹر طوفان فرمانے لگے نام "نشان ہند" ٹھیک رہے گا
[illegible] درخواست
[illegible] پولیس [illegible] کچھ دن
[illegible] تاہم [illegible]
[illegible] انگریز [illegible] جب
[illegible] تو فرمانے لگے دیکھو حکومت
کے خلاف [illegible]
ہے۔ ظفر ادیب [illegible]
[illegible] ملتان کے [illegible]
[illegible] ظفر صاحب کے والد

[illegible] ملتان [illegible]
اور ظفر ادیب [illegible]
[illegible] دیوان [illegible]
[illegible] روز [illegible]
اور ان کے [illegible] ایک مکان [illegible]
بڑی بڑی کوٹھیاں بھی تھیں۔ جناب [illegible]
جب محکمہ پولیس ملتان میں تھے تو ظفر صاحب [illegible]
میں [illegible] کرایہ دار [illegible] ظفر صاحب نے [illegible]
[illegible] سکا۔ ہفت روزہ نشان ہند جاری [illegible]
ملتان کے اخبارات محض مقامی افسروں کی خوشامد
تعریف کو [illegible] مسلک بنائے ہوئے تھے [illegible]
[illegible] سچائی اور بے [illegible] اور [illegible] کردار [illegible]
افسران کی کارستانیوں کو [illegible] پر لانا [illegible]
نشان ہند [illegible] بے باکی اور [illegible] جانبداری کے باعث
مقبول تو ہوا مگر میرے دشمنوں میں بھی روز بروز [illegible]
ہونا شروع ہو گیا [illegible]
الیکشن میں ایک انگریز [illegible]
کی داستان نشان ہند میں شائع ہوئی تو ملتان چھاؤنی
کے پولیس اسٹیشن کے انچارج [illegible]
سے اس ٹھیکیدار نے مجھ پر جسمانی حملہ کرایا جس کی
رپورٹ اس انگریز [illegible] نے [illegible]
کر دیا۔ اسی روز پنڈت جیون لال [illegible]
[illegible] عدالت [illegible] آنریری مجسٹریٹ [illegible]
[illegible] فریق مخالف [illegible] ٹھیکیدار [illegible]
مقدمہ دائر کر چکے تھے پنڈت جیون لال صاحب نے
مجھے اپنی کوٹھی پر بلایا اور فرمانے لگے دیکھو [illegible]
ٹھیکیدار [illegible] کی طرح [illegible] پولیس [illegible]
[illegible] انگریز [illegible] ٹھیکیدار کی حمایت میں
[illegible] عدالت میں [illegible]
[illegible] مقدمات کے فیصلے تک تم الیکشن کے [illegible]

نہیں لکھو گے۔ ایک ہفتے کی بات ہے الیکشن ختم ہونے
پر سب مقدمات داخل دفتر ہو جائیں گے۔ ظفر ادیب
(ملک حسین قیصر ہوشیارپوری) (مرحوم) استاد فخر امروہوی
(مرحوم) ہم سب کا ایک گٹھ تھا۔ ہم نے فیصلہ کیا
کہ دیوان چند ٹھیکیدار کو جس طرح بھی ہو ضرور ناکام
بنانا ہے اور اس کے مخالف جو کہ ان کے حقیقی بھائی
تھے اور بہت [illegible] تھے انھیں کامیاب کرانا
ہے چنانچہ ہم نے گھر گھر جا کر ووٹروں کو سمجھایا کہ جو
شخص [illegible] ایک ایڈیٹر پر حملہ کرا سکتا ہے
وہ [illegible] کیا سمجھے گا۔ چنانچہ لالہ دیوان چند
ٹھیکیدار کو یہ جو ہمارا حملہ تھا مہنگا ثابت ہوا
کہ وہ الیکشن میں ہار گئے اور جو صاحب جیتے انھوں
نے ہمارے گھروں میں آ کر ہمیں ہار پہنائے۔

بقول لالہ بالکشن تبرہ ایڈووکیٹ ایڈیٹر اقبال
اخبار "شان ہند" ان دنوں ملتان کا ریاست بن چکا تھا
اور [illegible] وطن نے سرکاری افسران اور سیاسی
لیڈروں کے دم بتے لئے کہ ہر سرکاری دفتر میں ایڈیٹر
شان ہند کا بول بالا ہوا اور ہر افسر چاہتا تھا کہ کسی نہ
کسی طرح ایڈیٹر شان ہند کو اپنے ساتھ رکھا جائے چنانچہ
مجھے [illegible] کے لئے ظفر ادیب صاحب کے ہاں سفارشیں
آتی تھیں مگر ظفر ادیب نے میرے کام میں کبھی دخل نہ دیا
اب میں ظفر ادیب صاحب کے مکان کے سامنے حکیم
محمد [illegible] الدین خان صاحب کا کرایہ دار تھا اور لوگوں نے
حکیم صاحب کے ہاں سفارشیں پہنچانی شروع کر دیں
اردو اخبارات کے ایڈیٹر صاحبان جب ملتے ہیں تو
ایک دوسرے کی خوب تعریفیں کرتے ہیں مگر کسی بھی
کامیاب اخبار کے بارے میں دل میں بغض رکھتے ہیں۔
اور اس کی ترقی و مقبولیت سے جلتے ہیں سوائے لالہ
بالکشن تبرہ ایڈووکیٹ کے ملتان کے اکثر مدیر
اخبارات شان ہند اور مجھ سے حسد اور بغض

رکھتے تھے میونسپل پلاننگ آفس، سول سیکرٹریٹ وغیرہ
محکموں کے سرکاری اشتہارات شان ہند کو باقاعدگی
سے ملتے تھے دہلی کا [illegible] نے اپنے
آفس کو کھولا۔ ملتان میں شان ہند میں ڈی۔ سی۔ ایم
کے [illegible] جات اور [illegible] کے اشتہارات [illegible]
[illegible] چند ہی دنوں میں ایک [illegible] کو [illegible]
کی وساطت سے دہلی کا [illegible] کا اشتہار شان ہند میں
شائع ہونا شروع ہو گیا اور مہینے [illegible] اور مشہور فرموں
مثلاً جے۔ بی۔ منگھا رام اور [illegible] کمپنی وغیرہ
کے بھی اشتہار [illegible] اور یہ سب کچھ ملتان کے
[illegible] لیڈروں کے لئے سوہان روح تھا۔

ملتان کے سرکاری زنانہ ہسپتال کی دو نرسوں نے
لیڈروں کو اور [illegible] کو چیلے بنا رکھا تھا۔ ہسپتال میں
[illegible] کرانے والی غریب عورتوں کو لالچ دے کر یہ برے
راستے پر لگا کر اپنا کاروبار چلا رہی تھیں کچھ [illegible]
مستورات ان نرسوں کی [illegible] کا ذکر کرتی [illegible]
علاج [illegible] نہ رکھتے تھے [illegible] افسران حتیٰ کہ
کمیٹی ملتان کے پریذیڈنٹ امرت لال [illegible] تک
ان نرسوں کے مرہون منت تھے۔ اور کوئی بھی
ان کا کچھ بگاڑ نہ سکتا تھا۔ ملتان میونسپل کمیٹی [illegible]
میونسپل کمیٹی کے ایک رکن ڈاکٹر حامد (غالباً ان کا
نام تھا) زنانہ ہسپتال کے سامنے والی گلی میں رہتے
تھے ان نرسوں میں ایک نرس اسی محلے کے ایک
نوجوان پر بری نظر [illegible] تھی اور وہ دائیوں کے ذریعے
[illegible] قائم کئے ہوئے تھی۔ ڈاکٹر حامد کے [illegible]
اس نرس کا ایک محبت نامہ [illegible] کسی طرح
اور وہ یہ خط لے کر سیدھے میرے پاس آئے اور
فرمانے لگے کہ یہ خط اسی نرس کا لکھا ہوا ہے [illegible]
میرے اچھے دوست تھے اور انتہائی درجہ کے [illegible]
لہٰذا میں نے اس خط کا بلاک بنوا کر شان ہند میں

کیا اور ان نرسوں کے بارے میں جو کچھ سُنا تھا وہ سب کچھ ضمنی طور پر شائع کر دیا۔ میونسپل کمیٹی کے افسران خصوصاً محکمہ صحت میں ہل چل مچ گئی اور نرسوں نے مجھ پر ڈورے ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر میں نے اس اسکینڈل کو اس طرح سے بے نقاب کیا کہ لالہ امرت لال ہاشمی پریسیڈینٹ میونسپل کمیٹی اور دیگر افسران محکمہ صحت کو فوری طور پر ان دونوں نرسوں کو ملازمت سے علیحدہ کرنا پڑا اور ان سے سرکاری کوارٹر خالی کرا لئے گئے دونوں نرسیں ملتان میں اس قدر بدنام ہو چکی تھیں کہ وہ اپنے اپنے گاؤں کو واپس چلی گئیں۔

ظفر ادیب میرے مخالفوں کی لن ترانیوں کو سُنتے تھے اور مسکرا کر چپ رہ جاتے تھے اُن دنوں جانی واکر ریڈ لیبل وسکی کا ادھا آٹھ روپئے بارہ آنے کا ملتا تھا اتوار کو ظفر ادیب ایک ادھا منگاتے اور بدھ کے دن میں غلام حسین قیصر بیئر پیتے تھے اُن دنوں آٹھ آنے کی بوتل بیئر ملتی تھی غلام حسین قیصر چار بوتل بیئر پینے کے لیے کہتے کہ اب شعر سُنانے کا موڈ بنا ہے کوئی بھی شاعر لاہور سے کراچی جائے یا کراچی سے لاہور واپس جائے تو وہ ملتان چھاؤنی میں ظفر ادیب کا شرف مہمانی ضرور بخشتا تھا۔ اختر رضوانی (مرحوم) تو کم و بیش وہیں پڑے رہتے تھے افضل پشاوری (مرحوم) ملتان چھاؤنی میں گورا فوج کے لانڈری کنٹریکٹر تھے روپیہ ان کے پاس وافر تھا اُن دنوں انھیں آتا جاتا کچھ نہیں تھا۔ نارش حیدری (مرحوم) دہلی سے انھیں غزلیں بذریعہ وی پی بھجوایا کرتے تھے کیونکہ ان کے پاس پیسہ فالتو تھا اس لئے شرابی حضرات خصوصاً طوائفوں کا گانا سُننے کے رسیا افضل صاحب کو ہر وقت گھیرے رہتے تھے افضل صاحب ہر روز حرم دروازہ کے باہر طوائفوں کا گانا سُننے جاتے تھے ایک کشمیری قالین فروش اپنا چرب زبانی سے افضل صاحب کو اپنے چنگل میں پھنسائے

ہوئے تھے۔ اور افضل صاحب اپنے آپ کو شاعر ثابت کرانے کے لئے اکثر مشاعرے وغیرہ کراتے چنانچہ سب سے پہلے میں نے دھوبی گھاٹ کا مشاعرہ لکھا جو کہ محض خیالی تھا مگر اس خیالی روداد کو ایسے دلچسپ انداز میں لکھا کہ افضل صاحب اور ان کے حواری بظاہر تو دانت پیس کر رہ جاتے مگر رات کو تنہائی میں لحاف میں بیٹھ کر اسے پڑھتے اور اپنی حیثیت کو محسوس کرتے تو ندامت سے پانی پانی ہو جاتے دھوبی گھاٹ کا مشاعرہ ایسا مشہور ہوا کہ اُس زمانے میں لاہور بہاولپور اور دیگر کئی مقامات سے شائع ہونے والے اخبارات نے اسے چھاپا اور اسے ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ میں نے مشاعروں کی روداد لکھنا ہی اپنا لیا۔

ظفر ادیب دھوبی گھاٹ کے مشاعرہ سے ایسے خوش ہوئے کہ اُنھوں نے ایک دعوت کا انتظام کیا اور اسی دعوت میں اُستاد غنچہ امروہوی نے افضل پشاوری اور اُن کے حواریوں کو مدعو کر کے دونوں فریقوں کی صلح کرا دی اور افضل صاحب نے تحریری طور پر اعلان کیا کہ زیادتی اُن کی ہی تھی۔ اس کے بعد افضل پشاوری ہمارے دوست بن گئے اور اُن کے دم آخر تک یہ دوستی قائم رہی۔

ظفر ادیب جیسا شریف، خلیق، مرنجاں مرنج غیرت دار اور مخلص دوست ملنا مشکل ہے ظفر ادیب نے جس لگن اور خاموشی کے ساتھ اردو کی خدمت کی اس کا عشر عشیر بھی بڑے سے بڑے اردو دانشور نہیں کر سکے۔

پاکستان بننے کے بعد ظفر ادیب بھی دہلی چلے آئے ملتان والی جائیداد کے کلیم وغیرہ ان کے چچا اور دوسرے لوگوں نے کئے اور مستفاد اُٹھائے۔ ظفر ادیب نے کوئی کلیم نہیں کیا اور اخبارات میں مترجم کی ملازمت کر کے اور ٹیوشن پڑھا کر اپنی گزر اوقات کی۔ بچوں

ترقی اُردو دلی شاخ کے دفتر کو سالہا سال تک سنبھالا
ظفر ادیب کا ایک ہی لڑکا تھا جو بارہ ہندو راؤ
والے مکان کی چھت سے پتنگ اُڑاتا ہوا [illegible]
پر گرا اور جاں بحق ہو گیا اس صدمہ جانکاہ پر بھی
ظفر ادیب نے اُف تک نہ کی اور خدا کی مرضی پر [illegible]
رہا تقسیم ملک کے بعد ظفر ادیب نے کیا کیا [illegible]
جھیلیں یار لوگ ان کا مذاق اُڑاتے تھے مگر اس بندہ
خدا نے کبھی کسی کا بُرا نہیں مانا اور اپنی دھن میں اردو
کی خدمت کرتا رہا اور اس وقت ایک درجن سے
زائد ان کی تصنیفات اور تالیفات اُردو ادب میں
اضافہ کئے ہوئے ہیں۔ جب یہ بارہ ہندو راؤ والے
مکان میں کرایہ دار تھے تو انھیں کالا بخار ہوا مگر
ان کے مربی لالہ نانک چند نے اس وقت بھی اُن کی
مشکل کو حل کیا اور زرِ کثیر صرف کرکے بذریعہ ہوائی جہاز
کلکتہ سے کالا بخار کے انجکشنوں کا کورس منگا یا جن
کے لگانے سے ظفر ادیب کو پھر سے زندگی ملی۔
ظفر ادیب کے مجھ پر جو احسانات ہیں میں
اُنھیں کبھی نہیں بھولا۔ مجھے وہ بھی زمانہ یاد ہے
جب میں اُن کا کرایہ دار تھا اور وہ بھی دن یاد ہیں
جب وہ خود دہلی میں کرایہ دار بنے مگر اس شخص کے
ماتھے پر کبھی مایوسی کی لکیر نہیں دیکھی اندر ہی اندر
انھیں دق چاٹتا رہا۔ اور اس شخص نے کبھی کسی
سے نہ کہا کہ میرے پاس اس موذی مرض کے لئے پیسے
نہیں ہیں اور بڑا کوشش سے اس موذی مرض کے چنگل
میں جکڑا جاتا رہا اور آخر کار ۳۰ جون ۱۹۸۳ء کی
رات کے ساڑھے آٹھ بجے اروِن ہسپتال کے وارڈ
بند اور بستر پر لا ہی اپنی جان اس مالک کے حوالے
کر دی جو تمام عالم کے انسانوں اور ہر ذی روح کی
جان کا مالک ہے۔

ظفر ادیب ۱۷ سال سے اُردو بازار جامع مسجد

کی پچھلی گلی میں مقیم تھے اس محلہ میں صرف یہی ایک
ہندو فیملی رہتی تھی جامع مسجد پر کئی بار کرفیو لگا۔
ہندو مسلم تعلقات میں کچھ وقت کے لئے دراڑ بھی
آئی مگر ظفر ادیب کو کسی مسلمان نے کبھی گزند
پہنچانے بارے میں سوچا بھی نہیں۔ محلہ کے مسلمان
مرد۔ عورتیں حیران تھے کہ ایسا خاموش طبع اور مخلص
و شریف شخص کبھی اس زمانہ میں دیکھنے میں آسکتا ہے
مجھ سے ظفر ادیب کے تعلقات بھائیوں کے سے
تھے ہر مشکل اور آڑے وقت میں انھوں نے مجھ سے
ضرور مشورہ کیا۔ کسی لڑکی کی شادی کا موقع آیا تو غریب
خانہ پر تشریف لائے اور رازدارانہ انداز اپنی حالت
کا اظہار کر گئے۔ لدھیانہ والے پلاٹ کا معاملہ درپیش
آیا تو سر پیٹتا پر جانے سے پہلے مجھ سے مشورہ کرنے اور
بہت سی مشورہ پر انھوں نے پنجاب کے موجودہ
حالات (آج سے چھ ماہ پہلے جو حالات تھے) کے پیش
نظر اس پلاٹ کا اس پلاٹ جو کچھ بھی مل سکا۔
[illegible] کے ساتھ لے کر واپس آگئے۔ موت سے
دس روز پہلے کمزوری اور نقاہت کے باعث بول
نہیں سکتے تھے۔ مگر آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی تھی
اندازہ آنکھوں کے اشاروں سے ہی اپنے دل کا حال
سمجھا دیتے تھے میں نے ایک دن کہا [illegible]
چھوڑ دیا اور اٹھایا [illegible] تو مسکرائی [illegible]
سر ہلاتے ہوئے اشارہ کیا کہ ایسا [illegible]
دو دن پہلے ہسپتال میں ڈاکٹر نے بتایا کہ [illegible]
[illegible] پیشاب نہیں آ رہا جلدی [illegible]
دفتر [illegible] ہسپتال کے باں [illegible]
آیا اور ڈاکٹر نے نلکی لگائی اور پیشاب [illegible]
[illegible] کے کچھ آثار نظر آنے لگے تھے مگر
[illegible] اپنے کمرے میں کہہ دیا تھا کہ [illegible] صاحب [illegible]
تین دن سے زیادہ نہ چل سکیں گے انھیں آپ [illegible]

لے جایئے مگر جب تک ہسپتال تب تک آس والا
معاملہ سامنے رہا اور انھیں ہسپتال میں رکھا گیا میں
ہسپتال سے واپس آنے لگا تو آنکھوں کے اشارے
سے کاغذ پنسل طلب کیا نہ معلوم کانپتے ہاتھوں سے
کیسے لکھا گیا جی کو خط لکھ دیا تھا میں نے انھیں
بتایا کہ چھ دن ہو گئے جناب کالی داس گپتا رضا اور
جناب راجیندر کرشن صاحب کو خط لکھ دیئے تھے
اسی رات فلو کے باعث شدت کا بخار آیا تیسرے
دن صبح چھ بجے ظفر ادیب کی صاحبزادی سودیش
آئی اور روتے ہوئے کہنے لگی چاچا جی ڈیڈی رات
کو چل بسے اتوار کے باعث دفاتر بند تھے کسی کو فون
نہ کیا جا سکا تاہم میں بخار کی حالت میں ہی شمشان بھومی
پہنچا۔ جناب انور دہلوی ممبر میٹرو پالیٹن کونسل معہ
ایک ساتھی کے شمشان بھومی پہنچے کیونکہ ظفر ادیب
صاحب کا جسدِ خاکی ایمبولنس کے ذریعہ شمشان
بھومی لے جانا تھا اس لئے جنازے میں شرکت کرنے
والے حضرات کچھ تو ظفر ادیب کے گھر سے یہاں شمشان
بھومی پہنچے اور اکثر حضرات براہ راست وہاں پہنچے
جناب مالک رام صاحب - جناب خلیق انجم صاحب
جناب اندر سروپ دت نادان - جناب ضامن مراد آبادی
لالہ نانک چند، مسٹر گوبند سہائے اور ڈاکٹر و بشیر ظفر
صاحب کے عزیز و اقارب اور احباب کے سامنے ظفر
ادیب کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ رہے نام اللہ کا۔
ظفر صاحب کی ادبی خدمات کو سراہا گیا۔ چنانچہ
حکومت ہند سے انھیں سوا دو صد روپیہ ماہانہ ادبی
پنشن ملتی تھی ضرورت ہے کہ اب یہ پنشن ان کی بیوہ کے
نام منتقل کرائی جائے اس سلسلے میں تمام اردو دانش
وروں کا فرض ہے کہ اُن کا ایک وفد مسز شیلا کول
[illegible] منسٹر صاحبہ کی خدمت میں پیش کرا [illegible] سلسلے میں
[illegible] داشت پیش کرے کہ اردو اکادمی [illegible]

تصانیف پر انعامات دیئے پچھلے سال کی اردو اکادمی
ظفر ادیب صاحب کی تصنیف کالی داس گپتا رضا
اور شاعر [illegible] دو ہزار روپیے کا انعام دیا اور ایک سال
کے لئے تین صد روپیہ ماہوار ادبی پنشن بھی دی علاوہ
کے زمانہ میں جناب انور دہلوی نے اپنے اختیار خصوصی
سے پانچ صد روپیہ فوری طور پر ان کے علاج کے لئے
اردو اکادمی سے منظور کرائے مگر گورنر صاحب کے
دستخطوں میں تاخیر کے باعث یہ چیک ظفر صاحب
انتقال کے بعد ملا چونکہ ظفر صاحب کے علاج مو
میں ان کی بیوہ کو مقروض ہونا پڑا لہٰذا انور دہلوی
نے اردو اکادمی کو لکھا ہے کہ یہ رقم ان کی بیوہ
دی جائے گو اردو اکادمی اس سال شعرا اور ادبا
کو ادبی پنشن دینے کا فیصلہ کر چکی ہے مگر انور دہلوی
صاحب نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ اپنے خصوصی اختیار
سے ظفر ادیب صاحب کی بیوہ کے لئے ایک سال کے
کے لئے تین صد روپیہ ماہوار کی منظوری دے دیں گے
اس وقت ظفر ادیب کی تین کتابیں زیر طبع ابیاتِ عشقیہ
[illegible] مرزا غالب کے فارسی کلام پر سیر
بحث اور کالی داس گپتا رضا اور غالبیات [illegible]
یہ پروگرام پس پشت ڈال دیا گیا ہے ظفر ادیب
بیوہ اور دو بیٹیاں اب گھر کی ویرانی کو سینے سے لگائے
ہوئے ہیں ایک بیٹا بیمار ہے۔ مکان کرائے کا ہے
ظفر ادیب کے بہی خواہ اس غیرت دار ادیب
کے انتقال کے بعد اس کی بیوہ اور یتیم بچوں کی گزراوقات
کے لئے اپنی عزت کو بروئے کار لائیں گے؟
انجمن ترقی اردو بہار ہر سال تین ہندو ادیبوں
کو تین تین ہزار روپیہ کے انعامات دیتی ہے جیسا کہ
رضوان احمد صاحب ایڈیٹر عظیم آباد ایکسپریس پٹنہ
اس سلسلے میں ظفر ادیب [illegible]
[illegible] سے نوازنے کی کوشش کریں گے [illegible]

ھندوستان ٹائمز کا کل ھند مشاعرہ

:- شمس تبریزی :-

راجدھانی میں ہر سال اگرچہ بہت مشاعرے ہوتے ہیں لیکن بہت زیادہ سردی نہیں ہے اور خاص طور پر جب اس وقت بھی جب ایک طرف گرمی اپنی تمام قیامت خیزی سامانیوں کے ساتھ ہمارے شانہ بشانہ ہو اور دوسری طرف رمضان کا مہینہ جس میں شعراء کی شرکت اور سامعین کی حاضری دونوں کا خوف رہتا ہے لیکن گزشتہ دنوں ہندوستان ٹائمز گروپ کی جانب سے جس کل ہند مشاعرے کا اہتمام کیا گیا ۔ وہ ان دونوں باتوں سے قطع نظر مثالی حیثیت رکھتا ہے باوجود گرمی اور روزوں کے شعراء نے بھی شرکت کی اور سامعین نے بھی گرمجوشی کا اظہار کیا اور مشاعرے میں شرکت کی ۔

ملنکر آڈیٹوریم میں مشاعرہ شروع ہونے کا وقت ۸ بجے تھا جو حسب روایت تاخیر سے ہندوستان میں اسے بروقت کہا جاتا ہے یعنی پونے آٹھ بجے شروع ہوا تمام شعرائے کرام چند ایک کو چھوڑ کر جن کے نام کا اعلان کر دیا گیا تھا ۔ ڈائس پر تھے اور سامعین جوق در جوق ہال میں بیٹھنے کی جگہ تلاش کر رہے تھے جو کم و بیش بھر چکی تھی ۔ بہر حال مشاعرے کے کنوینر راجندر اوستھی نے مختصر تعارف کے بعد جس میں اکثر جگہ زبان کی لغزشیں ہوئیں اور سامعین نے داد تحسین سے بھی نوازا ۔ (ان میں بالخصوص شعراء کے ناموں کا غلط تلفظ اور ان کی صحیح ادائیگی نہ ہونا شامل ہے) شعراء کو پار پہنچانے اور وزیر اطلاعات و نشریات مسٹر ایچ کے ایل بھگت نے اپنا مختصر تقریر میں اردو مشاعروں کو بولیوں کے قریب کیا ۔ جیسے میں رواں کو سراہا ۔ اور

اور امید ظاہر کی جس طرح وہ اس سے قبل قومی یک جہتی کے فروغ کے لئے کلام کہتے رہے ہیں ۔ اور اپنے خیالات پیش کرتے رہے ہیں ۔ اسی طرح آئندہ بھی کرتے رہیں گے تقریر کے آخر میں انہوں نے اپنے دوست شاعر یزدانی جالندھری کی ایک رباعی پڑھی ۔

گر ہے شوق نمود تو نشوونما سیکھو
دریا میں ڈوب کر ابھرنا سیکھو
کیوں موت کے خوف سے مرے جاتے ہو تم
گر ہے جینے کی تمنا تو مرنا سیکھو

بعد ازاں مشاعرے کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر بشیر بدر کو سونپتے ہوئے مشاعرہ شروع کرنے کی درخواست کی گئی ۔ بشیر بدر نے صدر مشاعرہ علی سردار جعفری کی اجازت سے مشاعرہ کا [illegible] عمدہ آغاز کیا اور اس مشاعرے کی اہمیت پر روشنی ڈالی جس میں نوجوان ابھرتے ہوئے شعراء کے علاوہ (ایک دو شاعرات کو چھوڑ کر) تقریباً ایک ہی عمر کے شعراء اور شاعرات جمع ہو گئے تھے اس لئے اس مشاعرے کو ہندوستان کے چند بڑے مشاعروں میں گردانتے ہوئے ایک تاریخی مشاعرہ قرار دیا اور مختصر تعارف کے بعد جبلپور سے آئی ہوئی ہندی کی شاعرہ جو اردو میں بھی اپنا مقام بنا رہی ہیں ۔ دعوت کلام دی جن کا نام پونم تھا ۔ پونم نے قومی یک جہتی پر چند شعر سنانے کے بعد ایک غزل پیش کی جس کے چند شعر آپ کی خدمت میں معروف ہیں ۔

اتنے ہم دیپ جلانے میں
گھر کو بھی جلا بیٹھے دیوالی منانے میں
یہ دور تو گزرا ہے بس ان کو منانے میں
[illegible] اگلے زمانے میں

نیا ہنسن کے مترنم آواز میں غزل پڑھنے کے بعد ہر بلی گڑھ
م امروہہ کے شاعر سکندر صدیقی کو بلایا گیا جنھوں نے
معین کو اپنی جانب مبذول کرنے کی کوشش کی تو می
تا ہر چند قطعہ پڑھنے کے بعد جو غزل پڑھی اس کے دو
ملاحظہ ہوں ؎

کسی کی یاد آئی ہے وہ بھی اتنی رات گئے
کھوئی ہوئی اک شے پائی ہے وہ بھی اتنی رات گئے
غنچہ آہستہ کھلنا ٹوٹ نہ جائے خواب اپنا
مشکل سے جو نیند آئی ہے وہ بھی اتنی رات گئے

اب باری تھی دہلی کے ہی ایک شاعر [illegible] کی
وہ اس طرح گویا ہوئے ؎

کے زخموں کو مہک درد کو راحت دی ہے
ے خوابوں نے ہر اک شے کو حقیقت دی ہے
عمر بھر زہر پیا تیرے لبوں کو چھو کر
ہم نے چھوٹی سی خوشی کی بڑی قیمت دی ہے

اشعار کے بعد طنز و مزاح کے شاعر ساغر خیامی کو زحمت
دی گئی ہے اور ساغر خیامی نے محفل کو زعفران زار
؎

بغیر سوئی کے کرتا شرٹ نہیں سکتا
بغیر آب کے پودا پنپ نہیں سکتا
مرا خیال ہے غزلوں میں رنگ پیدا کر
یہ [illegible] کتابوں میں چھپ نہیں سکتا

ساغر خیامی کے کامیاب شعروں کے بعد مقامی شاعرہ
بلہ بانو نے چند متفرق اشعار کے بعد ایک پیاری غزل پیش
جسے اس سے قبل بھی وہ راجدھانی کے متعدد مشاعروں
پڑھ چکی تھیں پھر کلام و شعر آپ کے لیے ؎

اک خلش سی ذہن و دل کو رات دن تڑپاتی ہے
راستوں کی بھیڑ میں جب زندگی کھو جاتی ہے
لمحہ لمحہ [illegible] دل کی بڑھتی جاتی ہے
جب مرا ماضی مجھے اس حال میں یاد آتی ہے

اب باری تھی کشمیر سے آئے ہوئے حکیم منظور کی۔ کامیاب
غزل پڑھی چند شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

شفق بدن بے قرار ہے [illegible] سے
گھٹا [illegible] اپنے دل کی نوازشوں سے
زمیں جب تک نہ اپنا حصہ ادا کرے گی
گلاب کھلتے نہیں ہوا کی سفارشوں سے

حکیم منظور کے بعد پاکستان (کراچی) سے آئی ہوئی مہمان
شاعرہ عشرت آفرین کو دعوت کلام دی گئی عشرت آفرین
کے اشعار نے سامعین میں ایک نئی روح پھونکی انھوں
نے کئی غزلیں پیش کیں اور داد و تحسین حاصل کی چند شعر
آپ کی خدمت میں ؎

ایک چراغ جلا رکھنا
دھیان مسافر کا رکھنا
چھلکی پھر منزل کا خواب
بھائی پھر آشا رکھنا
جس نے ہم کو آنگن آنگن بانٹ دیا
اب تو اس دیوار کا ڈھانا دیکھے گا

عشرت آفرین کے کامیاب اشعار کے بعد وزیر مملکت عثمان
عارف نقش بندی کو دعوت کلام دی گئی انھوں نے جو اشعار
پڑھے ان میں سے دو آپ کے لیے ؎

آرام روزگار میں گم تھا تو کیا ہوا
آیا ترا خیال مجھے ڈھونڈتا ہوا
صحرا کی پیاس کوئی بجھائے تو بات ہے
بادل سمندروں پہ جو برسا تو کیا ہوا

اب مزاح کے شاعر ہلال سیوہاروی کی باری تھی انھوں نے
لیڈروں کی زبوں حالی اور موقع پرستی پر چوٹ کی ؎

دکھشن بھارت میں قائم ہو گیا [illegible] شامل
اب یہیں [illegible] اس کا اٹھانا چاہیے
لائے بھاجپا [illegible] کو اگلی جمع کے خلاف
بابا جی کے واسطے [illegible] کو لانا چاہیے

ہلال سیوہاروی کے بعد اب بلایا گیا کمار پاشی کو ان کی غزل کے دو شعر ملاحظہ کریں ؎

صرف قصہ ہے یہ کہانی ہے
کس نے صحرا کی خاک چھانی ہے
میرا بچپن چھپا ہے گلیوں میں
میکدے میں مری جوانی ہے

اب صاحبِ صدر نے ناظم مشاعرہ کا تعارف کراتے ہوئے ان کی اہلیہ کے انتقال پر افسوس کا اظہار کیا اور یہ شعر پڑھتے ہوئے بشیر بدر کو مائک پر دعوت دی ؎

یہ شخص جو مسکرا رہا ہے
کیا غم ہے جس کو چھپا رہا ہے

بشیر بدر نے چند متفرق اشعار کے بعد ایک پرانی غزل سنائی جو نئے شعر پڑھے ان میں سے چند آپ کے لئے ؎

کبھی برسات میں شاداب بیلیں سوکھ جاتی ہیں
ہرے پیڑوں کے گرنے کا کوئی موسم نہیں ہوتا
بہت سے لوگ اس کو اس طرح محفوظ رکھتے ہیں
کوئی بارش ہو یہ کاغذ ذرا بھی نم نہیں ہوتا۔

اب نام لیا گیا جگن ناتھ آزاد کا انھوں نے جوش و فراق کی موت سے متاثر ہو کر لکھی تھی اس نظم کو پڑھا جسے متعدد بار وہ راجدھانی کے مشاعروں میں پڑھ چکے تھے۔ اب باری تھی امیر آغا قزلباش کی انھوں نے جو شعر پڑھے ان میں سے دو آپ کی خدمت میں ؎

لوگ سرگرم سفر رہتے ہیں
ہم سمجھدار ہیں گھر رہتے ہیں
قید خانوں کی زیارت کر لو
اب یہاں اہل نظر رہتے ہیں

اب نام لیا گیا ہیکل آتشاہی کا۔ انھوں نے قومی ایکتا پر پہلے ایک نظم اور پھر بعد میں غزل سنائی قومی یکجہتی پر قطعہ ملاحظہ ہو ؎

کوئی بتائے یہ فرقہ پرستوں کا گناہ کس نے کیا
ہمارے پیار کے گھر کو تباہ کس نے کیا
وہاں نہ ہم تھے نہ تم تھے نہ اور کوئی تھا
تو پھر یہ شیشے کا چہرہ سیاہ کس نے کیا

اب نام پکارا گیا راج نرائن راز کا انھوں نے ایک نظم بعنوان "نیات رنگوں کی" پڑھی۔ اور پھر غزل پیش کی دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

کیا بات تھی کہ جو بھی سنا ان سنا ہوا
دل کے نگر میں شور تھا کیسا مچا ہوا
تم چھپ گئے تھے جسم کی دیوار کے پرے
اک شخص پھر رہا تھا تمھیں ڈھونڈتا ہوا

راج نرائن راز کی غزل کے بعد حسن نعیم کو زحمتِ کلام دی گئی اور انھوں نے شعر پڑھے ؎

سانس لیتے ہیں ہر آہوں جینے والے چند ہیں
سب دریچے آرزو کے بزدلوں پر بند ہیں
کچھ اصولوں کا تھا نشہ کچھ مقدس خواب تھے
ہر زمانے میں شہادت کے یہی اسباب تھے

اب صاحبِ صدر علی سردار جعفری کو دعوتِ کلام دی گئی۔ انھوں نے کافی عرصہ بعد دو نئی نظمیں سامعین کے سامنے پیش کیں جن کے عنوان "جبین تر" اور "میرا سفر" تھے صاحبِ صدر کے بعد مشاعرہ کے مقطع کے طور پر بزرگ شاعر پروفیسر جگن ناتھ آزاد؟؟ کے نام کا اعلان کیا گیا اور انھوں نے اپنی اور غالب کی مشترکہ غزل پیش کی ؎

وہ دلہن ہماری بنتی جو اسے بھی پیار ہوتا
یہ نہ ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
نہ تھا انتظار اپنا اسی غم میں مر گئے ہم
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
کئی بار ہجر و ہی کر بیٹھے غم میں مر چکا ہوں
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

شاعرے کا پہلا دور تقریباً گیارہ بجے ختم ہو گیا۔ دوسرا دور بھی بہت مزے کے ساتھ رات دو بجے تک جاری رہا۔ تازہ اور نئے کلام سے سامعین خوب محظوظ ہوتے رہے

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

تذکرہ شعرائے اُجین

محمد خالد عابدی
اندور

سید مُدثر علی مُدثر

سید مُدثر علی مُدثر :- ۱۹۱۲ء میں آپ کی ولادت اُجین میں ہوئی۔ آپ کے والد ماجد سید منور علی اُجینی کے قابلِ ذکر نثر نگاروں میں شمار کیے جاتے تھے مدثر علی مرحوم کا ننھیال ناصر نظر فراق سے ملتا ہے چنانچہ علمی و ادبی ذوق آپ کو ورثے میں ملا۔ سید مدثر علی مدثر، سید منور علی کے تیسرے صاحبزادہ تھے آپ کے دیگر بھائیوں میں سید مبصر علی، سید مبشر علی سید مدبر علی، سید ناصر علی اور سید افسر علی ہیں۔ سلطان احمد صدیقی نے آپ کے تعارف میں لکھا ہے کہ "دوسری جنگِ عظیم میں فوج میں خدمات انجام دیں۔ جنگ کے اختتام کے بعد ملٹری اسکول میں ماسٹر ہو گئے منتظمین سے اختلاف کی بنا پر استعفیٰ دے دیا اور سیٹھی منڈی گر بن کیل میں مدرسہ قائم کیا۔ تعلیم بالغان کی طرف خصوصی توجہ تھی۔ بیلوں میں کام کرنے والے مزدور، کاریگر، معمار اور دوسرے غریب لوگوں کو اردو، ہندی، اور انگریزی کی تعلیم دیتے تھے اجین میں انجمن ترقی اردو کی شاخ اور جامعہ اردو علی گڑھ کا سینٹر آپ کی کوششوں سے قائم ہوا۔ اسی طرح راشٹر بھاشا سمیتی وردھا کے امتحانات کی تیاری بھی کراتے تھے آپ کا ذریعۂ معاش ٹیوشن تھا۔ تاہم کبھی کبھی غریب طلباء کی فیس خود ہی ادا کر دیا کرتے تھے۔ آپ نے طلباء کے لئے مفید مضامین لکھے جو وقتاً فوقتاً جامعہ اردو علی گڑھ کے رسالے میں شائع ہوئے اپنے طلباء اور احباب کی مدد کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے ایک شاگرد فخر الدین باغی کے کسی کام کی سفارش کے لئے بھوپال گئے وہاں انھیں دل کا دورہ پڑا۔ ۴۴ سال کی عمر میں ۱۹۵۶ء میں انتقال فرمایا۔ پسماندگان میں ایک بیوہ چار لڑکے اور دو لڑکیاں جو آجکل علی گڑھ میں مقیم ہیں۔

نمونہ کلام :-

فردوس میں قیام نہ تھا کچھ گراں مجھے
لے آیا یہ نصیب کہاں سے کہاں مجھے

منزل دکھا رہے ہیں خود اپنا نشاں مجھے
کیوں ڈھونڈھتی ہے گردِ پسِ کارواں مجھے

سجدے کے در نیاز پہ کرتا ہوں روز و شب
کعبہ سے بڑھ گیا ہے ترا آستاں مجھے

آتا ہے روز دل کی تسلی کے واسطے
تیرا خیال ہی تو ہے آرام جاں مجھے

پہلے تھے میری جان کو صیاد و باغباں
اب اور تو ڈراتی ہے برقِ طپاں مجھے

پابندیاں خیال پہ میرے نہ لگ سکیں
بیٹھی نظر قفس میں رہا آشیاں مجھے

تغیر و انقلاب زمانے میں ہے مدام
دکھلا رہی ہے رنگ بہار و خزاں مجھے

حبِ وطن ہے ملکِ سلیماں سے بیش تر
دل جان سے عزیز ہے ہندوستاں مجھے

خدمت کے واسطے کی مدثرنے عمر وقف
شاباش کہہ رہی ہے خود اردو زباں مجھے

آلِ حسن ساقی

آلِ حسن ساقی :- آپ اُجین میں ۱۹۱۵ء میں منشی عبدالرحمٰن کے یہاں پیدا ہوئے تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ کو شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا اُجین میں ا

شاعرانہ تھا۔ چنانچہ سولہ سترہ سال کی عمر سے ہی آپ شعر کہنے لگے۔ جب آپ نے شاعری شروع کی اُس زمانہ میں ساحر چشتی اجمیری کا شمار تقریباً اساتذہ میں ہونے لگا تھا۔ آپ نے ساحر چشتی اجمیری کو ہی اپنا اُستاد منتخب کیا۔ آپ اکثر اُستاد کے ہمراہ "بزمِ ادب" کے مشاعروں میں شرکت کرنے لگے آپ کے معاصرین عبدالرشید، عزیز محمد قیصر، امیرالدین امیرؔ، امیر علی شبنم عبدالرحیم حسرتؔ قریشی، مرزا محمد ظفر اور محمد عبدالغفور گویا قریشی وغیرہ ہم تھے۔

آپ نے غزل، نظم، نعت، سلام، قطعہ، رباعی منقبت اور تضمین وغیرہ خوب لکھی ہیں لیکن غزل پر آپ نے خصوصی توجہ صرف کی ہے آپ کا بیشتر کلام تو ضائع ہو گیا بزمِ رنگین کے نام سے ایک مجموعہ کلام اور ترتیب دیا ہے۔ آپ کے کلام میں سادگی اور سلاست اور روانی پائی جاتی ہے مومن کی طرح آپ بھی اپنے تخلص ساقی سے پورا پورا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

نمونۂ کلام :-

کس درجہ جنوں خیز ہے دیوانے کا عالم
کلیوں کا تبسم بھی گوارا نہیں ہوتا

خود کو پہچان لیا جس نے وہی انسان ہے
اپنی ہستی کا سمجھنا ہے بڑے کام کی بات

زمانہ بدلا کہ آپ بدلے مجھے کچھ اس کی خبر نہیں ہے
شباب آتے ہی کیا ہوا یہ نظر ہی اب وہ نظر نہیں ہے

زندگی کا فلسفہ جس وقت سمجھا جائے ہے
سامنے آنکھوں کے اک پردہ سا چھا جاتا ہے

چل رہی ہے زندگی میں اس طرح کی کشمکش
وقت سے مجھ کو اور مجھ سے وقت بگڑا جاتا ہے

پہنچ کو سوسا نہیں ملتا دلِ گم کردہ منزل کا
خدا جانے کہاں جا کر لٹا ہے کاروانِ دل کا

ہواؤں میں یہ کیسا شور ہے یہ بجلیاں ہر سو
یہ کس نے کر دیا ہے چاک دامانِ وطن ساقی

بنے بیٹھے رہیں آ جائے گا دورِ وطن کب تک
اجازت ہو تو ہم بھی باندھ لیں سر سے کفن ساقی

کبھو سندیں سہارا ارباب مقل ملا کر
تقدیر سو طرح سے بن کر بگڑ گئی ہے

یہ یکی کو بازار زندگی سے یہ کس کو کیا بار
تم دامن تھا کر دو اور ہم ادھر تھا جاتے ہیں

غزل

فیروز ظفر بدایونی

مجھ پہ کچھ دن سے اگر ان کی عنایت کم ہے
اس کا مطلب یہ نہیں اُن کو محبت کم ہے

سب کو شکوہ ہے غمِ تیز تسلسل کا مگر
کون کہتا نہیں پرواز کی طاقت کم ہے

تو لیقیں کر مرے رونے کا سبب کچھ بھی نہیں
کیا کروں دوست مجھے رونے کی عادت کم ہے

عہدِ فردا کا یقیں ہے ترے لیکن اب دوست
مجھ کو محسوس کرو غمِ زیست کی شدت کم ہے

صحبتِ خار میں بھی خندگیِ گل نہ گئی
اُن سے تو پھول میں احساسِ نزاکت کم ہے

کس ہوس کار نے ڈالی ہے نظر گلشن پر
رنگ کلیوں میں ہے کم پھول میں نکہت کم ہے

لاج رکھ لی مرے پھیلے ہوئے دامن کی ظفرؔ
کون کہتا ہے مرے اشکوں کی قیمت کم ہے

گوشۂ خلیل صدیقی

خلیل انجم ہاشمی

بزمِ ادب آرڈیننس فیکٹری امباجھری ناگپور کا

گیارھواں سالانہ کل ہند مشاعرہ

آج مارچ ۱۹۸۴ء کی ۱۳ تاریخ ہے آرڈیننس
یکٹری امباجھری ناگپور کا ہال بقعۂ نور بنا ہوا ہے سامعین
ے ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے ہال کے دائیں اور بائیں طرف کرسیاں
بچھائی گئی ہیں اور درمیانی حصہ میں اسٹیج سے لے کر
ل کے آخری کنارے تک تار پولین بچھادی گئی ہے
سب معمول ہال کے بائیں طرف کرسیوں کی چار قطاریں
چھوڑ کر باقی حصہ میں لگائی گئی کرسیوں پر خواتین بیٹھی
وئی ہیں۔ آج خواتین سامعین کی بھی اچھی خاصی تعداد
ہے جن میں بہت سی خواتین کامٹی اور ناگپور سے بھی تشریف
لائی ہوئی ہیں۔ ہال وقت سے پہلے ہی بھرا بھرا سا لگ
رہا ہے ایسا منظر مشاعروں میں بہت کم دیکھنے میں آتا ہے
مقررہ وقت سے پہلے ہی سامعین اپنی اپنی نشستوں
پر بیٹھ جاتے ہیں۔ دراصل آرڈیننس فیکٹری امباجھری کے
مشاعرے ہمیشہ وقت پر شروع ہوتے ہیں یہاں ایک
بات قابلِ ذکر ہے کہ مشاعرے کے دعوت نامے پر یہ
نوٹ درج ہوتا ہے کہ سامعین مشاعرہ کے مقررہ
وقت سے پندرہ منٹ پہلے اپنی نشستوں پر بیٹھ
جائیں — لیکن آج کچھ اور ہی نظر آرہا ہے مشاعرے
کا وقت دس بجے شب دیا گیا ہے مہمان خصوصی
صدر مشاعرہ اور دوسرے مہمان تشریف لا چکے ہیں مگر
ابھی تک شعرائے کرام اسٹیج پر نظر نہیں آرہے ہیں بزم
ادب کے ایڈیشنل سکریٹری جناب جمیل افسر اسٹیج کے
مائک سے وقفہ وقفہ سے یہ اعلان کر رہے ہیں: خواتین
و حضرات! شعرائے کرام تشریف لا چکے ہیں اور جلد ہی

مشاعرے کی کارروائی شروع کی جائے گی۔ آواز پورے
ہال میں گونج رہی ہے اور سامعین نہایت صبر و ضبط
کے ساتھ جمیل افسر صاحب کے اعلان پر خاموشی اختیار
کئے مشاعرے کی کارروائی کا انتظار کر رہے ہیں۔ جمیل افسر
بیرونی شعرائے کرام کے ناموں کا بھی اعلان وقتاً فوقتاً
کر رہے ہیں اور سامعین اپنے محبوب شعرائے کرام کے
ناموں کے اعلان سے مطمئن اور کچھ بے چین بھی نظر آرہے
ہیں — لیجئے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوگئیں۔
بیرونی شعرائے کرام یکے بعد دیگرے اسٹیج پر آرہے ہیں
مشاعرے کے مہمان خصوصی محترم ایم۔ کے ناتھ جنرل منیجر
آرڈیننس فیکٹری امباجھری ناگپور اور صدر مشاعرہ ڈاکٹر
ایم۔ پی سریواستو صاحب سے درخواست کی جارہی
ہے کہ وہ اسٹیج پر تشریف لے آئیں۔ دونوں صاحبان
اسٹیج پر تشریف لے آئے ہیں اور مشاعرے کی کارروائی
شروع کی جارہی ہے

یہ بزم ادب کا گیارھواں کل ہند مشاعرہ ہے بزم
ادب کے مشاعرے یوم جمہوریہ کی تقریب کے سلسلے میں
۲۵ جنوری کی شب میں منعقد کئے جاتے ہیں مگر چند ناساز
حالات کے پیش نظر گزشتہ سال کی طرح اس سال
بھی مشاعرہ وقت پر نہیں ہوا۔ لیکن شاعرے کی روایت
کے مطابق آج بھی چند ایسے شعرائے کرام کو پیش کیا جارہا
ہے جو اس علاقہ میں پہلی بار متعارف ہو رہے ہیں ان
میں انیس بستوی اور کمل ساگر کے قابل ذکر نام ہیں۔
مشاعرے کے نقیب ہیں جناب ثقلین حیدر۔ مشاعرہ

تقریباً پون گھنٹہ دیر سے شروع ہو رہا ہے مہمان خصوصی محترم ..... کے ناظم وقت کے بڑے پابند ہیں اپنی افتتاحی تقریر میں وقت کی اہمیت پر بڑی موثر باتیں پیش کر رہے ہیں۔ اب صدر مشاعرہ ڈاکٹر ایم پی سریواستو صاحب کو صدارتی تقریر کے لئے زحمت دی جا رہی ہے ڈاکٹر سریواستو ناگپور کے بڑے کامیاب صنعت کار ہیں۔ آپ مینگنیز اینڈ سٹیل ایسوسی ایشن کے چیرمین ہیں اور اس کے علاوہ مختلف سوشل اور سماجی تنظیموں سے وابستہ ہیں مائک پر آکر بڑی سلجھی ہوئی تقریر کر رہے ہیں جسے سامعین بڑی توجہ اور دلچسپی سے سن رہے ہیں اور سلسلۂ سخن بزم ادب خوش ہیں کہ شاعرے کی صدارت کے لئے جو انتخاب کیا گیا ہے وہ نہایت مناسب ہے لیجئے اب نہایت ادب و احترام کے ساتھ ثقلین حیدر صاحب کو ان کے مختصر سے تعارف کے بعد مائک پر آنے کی دعوت دی جا رہی ہے حالانکہ یہاں ثقلین صاحب کے تعارف کی ضرورت نہیں تھی جیسا کہ مظہر امام صاحب فرماتے ہیں ؎

آپ کو میرے تعارف کی ضرورت کیا ہے
میں وہی ہوں کہ جسے آپ نے چاہا تھا کبھی

مشاعرہ تاخیر سے شروع ہوا جس کی ذمہ داری ثقلین حیدر اپنے سر پہ لیتے ہوئے فرما رہے ہیں۔ —

میں آج ہی صبح مالیگاؤں کے مشاعرے سے واپس ہو رہا تھا جب ٹرین وردھا اسٹیشن پر پہونچی تو میں پانی کے لئے اترا وہاں ایک شناسا نظر آ گئے ان سے باتوں میں اتنا مصروف ہو گیا کہ ٹرین چھوٹ گئی وہ تو اچھا ہوا کہ میرے ہمراہ راہی بستوی اور اختر سمعٹ بھی تھے جن کی بدولت میرا سامان مجھ سے پہلے پہونچا اور وہ کھٹ پٹ بس کے ذریعہ آنا پڑا جس کی وجہ سے مجھے یہاں پہنچنے میں دیر ہو گئی۔

ثقلین حیدر مشاعرے کے آغاز کے لئے بحیثیت جانے پہچانے شاعر تابش حلیمی کو آواز دے رہے ساتھ ہی ان سے درخواست بھی کر رہے ہیں کہ وہ اپنی نظم "اے وطن اے وطن" سنائیں تاکہ یوم کی یاد تازہ ہو جائے کہ یہ مشاعرہ اسی موقع کے لئے کیا جا رہا ہے تابش حلیمی اپنے مخصوص انداز کو نظم مترنم آواز میں سنا رہے ہیں اور سامعین ہمہ تن گوش ہو کر داد دے رہے ہیں اور پوری داد بھی دے رہے ہیں یہ مشاعرے کی بہت ہی اچھا ہوا ہے تابش حلیمی کی نظم ترانہ ہے مگر اچھا اثر چھوڑ رہی ہے۔ تابش حلیمی ختم کر کے مائک سے نہایت خاموشی سے لوٹ رہے ہیں اب آرڈیننس فیکٹری امبا جھری کے نوجوان سلیم درانی سلیم کو دعوت غزل سرائی دی گئی ان کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

ہم نے جب بات کھری کی تو برا مان گئے
کھوٹے سکے بھی چلاتے ہیں چلانے والے
ہم تو شاعر ہیں زمانے کو سبق دیتے ہیں
ہم تو پیغام محبت ہیں لٹانے والے

سلیم صاحب کامیاب لوٹ رہے ہیں۔

اب کامٹی کے ظہیر حیدری صاحب مائک پر ہیں۔ ظہیر حیدری تحت میں پڑھتے ہیں مگر خوب ہیں۔ ان کی شاعری جدید و قدیم شاعری کا سنگم ہے غزل کا مطلع پیش کر رہے ہیں ؎

بڑھنے نہ دے حیات کی الجھن سمیٹ لے
اے دوست خواہشات کا دامن سمیٹ لے

ظہیر حیدری بڑے اعتماد کے ساتھ شعر پڑھ رہے ہیں اور داد وصول کر رہے ہیں ان کے چند شعر سماعت فرمائیں ؎

پنگھٹ کی سونی راہ سے پیپل کی چھاؤں تک
بکھرا ہے دل کا ٹوٹ کے درپن سمیٹ لے

ظاہر نہ ہو کہیں تری بے چینیوں کا راز
چہرے سے اضطراب کی چلمن سمیٹ لے
ڈھلنے لگی ہے شام نہ آئے گا اب کوئی
اپنی اداس آنکھوں میں ساون سمیٹ لے

...ہر حیدر کی داد و تحسین کے چند پھول اپنے دامن میں سمیٹے مائک ...ے کامیاب لوٹ رہے ہیں۔ اور اب بزم ادب کے جوائنٹ ...سکریٹری جناب ونود کمار دیپ صاحب کو آواز دی گئی ...ہے۔ دیپ صاحب کا شمار بزم ادب کے ان اراکین میں ...ہوتا ہے جنھوں نے بزم ادب کی ترویج و ترقی کی خاطر ...ی سے بڑی قربانیاں دی ہیں آپ اچھے شاعر ہیں اور ...ائی بھی دیپ صاحب مائک پر آ کر ایک نظم سنا رہے ...ہیں جس کا عنوان ہے "اردو" نظم کے کچھ شعر آپ بھی سنئے ...یا خوب کہا ہے ؎

یہ تہذیب کی اک عبارت ہے اردو
کہ جانِ وطن شانِ ملت ہے اردو
زباں پر نہیں ہے کسی ایک کا حق
یہ اہلِ سخن کی وراثت ہے اردو
ہمیں دیپ بخشی گئی دل کی دھڑکن
ہمارے لئے اک عنایت ہے اردو

اس کے بعد دیپ صاحب نے ترنم میں ایک گیت سنایا ...جو پنجاب کے موجودہ حالات سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے ...اب ترنم الحر[illegible] کو آواز دی گئی ہے۔ محترم تعلیق حیدر ...جو کچھ بھی خاکسار کے بارے میں فرمایا خاکسار اس کا ...اہل نہیں ہے۔ یہ ان کی حوصلہ افزائی ہے بہرحال مائک ...پر آ کر صدرِ محترم کی اجازت لے کر ایک غزل بترنم آواز ...مع سامعین کی نذر کر رہا ہوں آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

مجھے زندگی دینے والے مرے سامنے تو آئیں
یہاں کتنے پارسا ہیں ذرا نام تو بتائیں
تھے امیرِ شہر جتنے وہ امیرِ قوم ٹھہرے
تھے غریب شہر جتنے [illegible] سزا بھی

یہ وفا کی رہگزر ہے یہ مقام پر خطر ہے
جنھیں خوف جان و دل ہے مرے ساتھ وہ نہ آئیں
مرے گھر کی مفلسی کا کہیں پڑ نہ جائے سایہ
مرے دوستوں سے کہہ دو کہیں اور آئیں جائیں

ہال گرچہ بھرا ہوا ہے پھر بھی اہلِ ذوق کی آمد میں کمی نہیں ہو رہی ہے اب کاشمک کے مزاحیہ شاعر نصرت ولی کو آواز دی جا رہی ہے نصرت ولی اس علاقہ میں مزاحیہ شاعری میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ نصرت ولی کے مائک پہ آتے ہی سامعین کے چہروں پر مسکراہٹ چھا گئی ہے نصرت ولی ماحول کا جائزہ لے کر فرما رہے ہیں ؎

میں بیکار تھا بتا دیا تھا بہانہ مجھے
کیا خطا میری تھی جو لے آئے ہو تھانہ مجھے

سامعین کے بے تحاشہ ہنسنے کی آوازیں کم ہوئیں تو فرماتے ہیں ؎

غیر کو چاندی کے ساغر میں عطا کر کے شراب
تو نے پیتل کا دیا ہے اس لئے پیمانہ مجھے
آ رہے تھے تم مجھے دیکھنا عادت پرانی ہے مری
پر تیرے ڈیڈی نے سمجھا بھونکتا کتا مجھے

پورا ہال قہقہہ زار بنا ہوا ہے اور نصرت ولی بڑے اطمینان کے ساتھ پڑھتے چلے جا رہے ہیں مقطع میں اپنے عشق کا دعویٰ پیش کر رہے ہیں، آپ بھی سنئے ؎

اپنی معشوقہ کی خاطر ساری دنیا چھوڑ دی
میں وہی نصرت ولی ہوں تم نے پہچانا مجھے

نصرت ولی مقطع پیش کر کے واپس ہونا چاہتے تھے مگر ہر طرف سے "ایک اور" "ایک اور" کی آوازوں نے ان کے پیر میں بیڑی ڈال دی۔ دوسری غزل سنا رہے ہیں۔ چند شعر آپ بھی سنئے ؎

بن ٹھن کے آئے حسن دکھا کر چلے گئے
گھنگھرو وہ میرے دل کا بجا کر چلے گئے

آنسو بہائے یاد میں اُن کی کچھ دَرد
وہ لیے ہے دعا کر چلے گئے
جب جی بہلا تو خاطر ہی لوگوں نے خوب کی
ہم کو لوگ کے پاس رُلا کر چلے گئے

ہال قہقہہ زار بن گیا ہے نقیب شاعرہ ماحول کا فائدہ اٹھا کر ایک طویل لیکن بہت خوبصورت اور موزوں قطعہ سنا رہے ہیں اور بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ماحول کو کسی قدر سنجیدہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں اور جب انھوں نے محسوس کیا کہ ماحول سازگار ہوگیا ہے تو بستی ل (مدھیہ پردیش) آئے ہوئے شاعر کمل ساگرے کو آواز دی گئی ہے کمل ساگرے اس علاقہ میں پہلی بار تشریف لائے ہیں اس لئے سامعین انھیں بڑی توجہ کے ساتھ دیکھ رہے ہیں کمل ساگرے ہندی کے شاعر ہیں اور گیت لکھتے ہیں مائک پر آکر بلند آواز سے گیت کا ٹکڑا پیش کر رہے ہیں ان کا ترنم نہایت پیارا ہے گیت کے ٹکڑے ہی سے وہ ماحول پر چھا سے گئے ہیں ان کے گیت کا ٹکڑا دیکھئے ؎

سہمی سہمی رات ہے درد بھری شام
لکھ رہا ہوں زندگی آنسوؤں کے نام

اپنے گیت کے ذریعہ کمل ساگرے حالاتِ حاضرہ کی تصویر پیش کر رہے ہیں لوگ ان کے گیت سے بہت محظوظ ہو رہے ہیں گیت کے دو بند ملاحظہ فرمائیں ؎

سونے کی گوریا لے ودیش ڈال
چندا کی روٹی نٹ ہاتھ کے مکان
لوٹی جوانی ڈھونڈتی ہے کام
لکھ رہا ہوں زندگی آنسوؤں کے نام
رانیاں سسکتی ہیں بلکھا لوں کے ساتھ
روشنیاں جاگتی ہیں پائلوں کے ساتھ
بکتے ہیں گھونگھٹ چاقوؤں کے دام
لکھ رہا ہوں زندگی آنسوؤں کے نام

کمل ساگرے ایک اور گیت پیش کرنے کے بعد کا سیاں لوٹ رہے ہیں — اب ناگپور کے نوجوان شاعر ظہیر عالم کو زحمت دی جا رہی ہے ظہیر عالم غزل کے شاعر ہیں خوش گلو بھی۔ لیکن مائک پر آکر کچھ گھبرا سے گئے ان کی آواز ان کا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ بہرحال ظہیر عالم کے حصے میں کوئی خاص کامیابی نہیں آئی — آج دن میں کافی گرمی تھی مگر شام میں اچانک زور دار ہوائیں چلنی شروع ہوگئیں اور کچھ بارش کے چھینٹے بھی پڑے تھے اس وقت رات کا ایک بجا چاہتا ہے ... کا دامن نم ناک ہو رہا ہے اور نقیب مشاعرہ راہی بستوی جو پہلی مرتبہ اس علاقہ میں تشریف لائے ہیں کو دعوتِ سخن دی ہے۔ سلسلہ کلام کا ... سب کی نگاہیں راہی پر لگی ہوئی ہیں جو مائک پر آکر ماحول کا جائزہ فرما رہے ہیں ؎

اپنا الفت کا وہ دیکھیں گے تماشہ کیسے
جانے والے کا نکلے گا جنازہ کیسے
میں تو راہی ہوں اکیلا ہی چلا جاؤں گا
عمر گزرے گی بھلا آپ کی تنہا کیسے

راہی بستوی بڑی بلند آواز سے شعر پڑھ رہے ہیں اور چند اور اشعار سنانے کے بعد راہی بستوی ایک گیت پیش کر رہے ہیں گیت کا ٹکڑا ہے ؎

نینا بڑے بے ایمان
پنگھٹ اکیلی مت جیو رے گجریا

گیت کا بند ملاحظہ فرمائیں ؎

آنچل ڈھلکے کا جڑ چھلکے۔ انگن انگ دکھلا
تن کے پیچھے دامن کے سنگ دا۔ کوئی دیکھ نہ پا
بہت نہ جائے کہیں بالی عمریا
نینا بڑے بے ایمان

سامعین راہی بستوی کے گیت سے خوب محظوظ ہو رہے ہیں اور ماحول "اس عزت ناہید کی پہچان ہے ریپیٹ" والا بن گیا ہے۔ راہی بستوی نے سماں باندھ دیا ہے اور راہی بستوی کو مائک سے ہٹنے نہیں دیا جا رہا ہے انھیں مسلسل پڑھایا جا رہا ہے۔ بہرحال راہی بستوی پڑھتے پڑھتے تھک گئے تو یہ وعدہ کر کے اپنا پیچھا چھڑالیا کہ کچھ دیر دم لینے دیجیے — اب نہایت احترام و ادب کے ساتھ اختر آصف کو زحمتِ سخن دی جا رہی ہے۔ اختر آصف جتنے اچھے شاعر ہیں اتنے ہی اچھے انسان بھی۔ شانِ ہند (فروری ۱۹۸۳ء) میں ۲۴ر جنوری ۱۹۸۳ء کو منعقدہ لال قلعہ کے تاریخی مشاعرہ کی شائع شدہ تفصیلی روداد میں محترم سرور تونسوی صاحب نے اختر آصف کی شاعری سے متعلق جو تاثر پیش کیا تھا وہ واقعی حقیقت پر مبنی ہے شاعر اور شاعری سے متعلق دوٹوک فیصلے دینے میں مدیر "شانِ ہند" محترم سرور تونسوی صاحب اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اختر آصف کی شاعری اور شخصیت دونوں قابلِ احترام ہیں۔

اختر آصف مائک پر تشریف فرما ہیں اور اپنے مخصوص ترنم میں غزل سے نواز رہے ہیں باذوق سامعین انھیں برابر داد دیے چلے جا رہے ہیں۔ اختر آصف کی غزل کے چند شعر آپ کی ضیافتِ طبع کے لیے حاضر کیے جاتے ہیں ؎

غم اٹھانا مشغلہ ہے کوئی لاچاری نہیں
اب یہ دشواری ہمارے حق میں دشواری نہیں
میں اٹھاؤں بارِ احساں وہ بھی اک کم ظرف کا!
زندگی پیاری ہے لیکن اس قدر پیاری نہیں
اب نہیں [illegible] جاہلی حکم ہے سرکار کا
اس [illegible] کو ہاں سمجھے ہے سرکاری نہیں

آصف صاحب غزل ختم کر کے رخصت ہونا ہی چاہتے تھے کہ پھر وہی "ایک اور" "ایک اور" کی صدائیں گونجنے لگیں۔ آصف صاحب پھر اسی انداز سے اپنی آواز اور خوش گلوئی کا جادو جگا رہے ہیں جو اشعار میں نوٹ کر سکا انھیں آپ کے لیے حاضر کر رہا ہوں ؎

دھیان کے وقت اگر سامنے پتھر آئے
ایک جوگی یہی سمجھے گا کہ شنکر آئے
ہو چٹانوں کا اگر دل تو مرے ساتھ چلو
یہ بھی ممکن ہے کہ رستے میں سمندر آئے
نعرۂ امن کا جس سمت سے شور اٹھتا تھا
آج اسی سمت سے پتھر مری محبت پہ آئے
ایک معصوم کبوتر پہ جھپٹتے ہوئے باز
بس اسی طرح کے سپنے مجھے اکثر آئے

اختر آصف نہایت کامیاب ہو کر لوٹ رہے ہیں۔ نقیبِ مشاعرہ ان کے اشعار دہرا رہے ہیں اور ساتھ ہی تبصرہ بھی فرما رہے ہیں۔ اب مشاعرہ کا آخری شاعر یعنی مقطع بچا ہوا ہے۔ یہ شاعر ہے پاگل عادل آبادی۔ پاگل عادل آبادی طنز و مزاح میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کے تین شعری مجموعے ان کے پاگل پن کا واضح ثبوت ہیں۔ ہنسی ہنسی میں ایسی بات کہہ جاتے ہیں جو نشتر کا کام کر جاتی ہے۔ پاگل عادل آبادی مائک پر آ کر ماحول کا جائزہ لے رہے ہیں کچھ فرمائشوں کی آوازیں بھی آ رہی ہیں مگر فرمائشوں کو نظرانداز کر کے فرما رہے ہیں ؎

پھاڑ کر میرا کفن آدھا ادھر آدھا ادھر
رکھ دیا اس نے رہن آدھا ادھر آدھا ادھر

ماحول پھر قہقہہ زار بن رہا ہے۔ ماحول کا فائدہ اٹھا کر پاگل صاحب پھر عطا کر رہے ہیں ؎

بیچ میں سے مانگ دلبر نے نکالی اس طرح
لگ گیا جیسے چمن آدھا ادھر آدھا ادھر

اب وہ شعر سنئے جو ایٹم بم ثابت ہوا۔ مگر حقیقت سے بہت قریب ہے آپ بھی سنئے اور اس کی سچائی پر غور

لیڈروں کا بس چلے تو بول کر گاندھی کی جے
بانٹ لیں گے زمیں بھی آدھا ادھر آدھا ادھر

غزل کا مقطع تو بہت ثابت ہوا۔ بات بھی سچ ہے
کی ہے اس مقطع کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے
یہی بات ایک سنجیدہ شاعر بھی مشکل سے کہہ سکے گا۔

نام پہ مذہب کے پاگل دھرم کی بنیاد پر
بٹ گیا میرا وطن آدھا ادھر آدھا ادھر

سامعین کے بے حد اصرار پہ پاگل عادل آبادی اپنی دوسری غزل بھی پیش کر رہے ہیں اور سامعین کو ہنسا رہے ہیں پاگل عادل آبادی بھی نہایت کامیاب لوٹ رہے ہیں۔

اس طرح مشاعرہ کا پہلا دور نہایت کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ رات کے دو بج چکے ہیں ہال اس وقت بھی سامعین سے بھرا ہوا ہے نصف گھنٹہ کا وقفہ دیا گیا ہے اور مشاعرہ کا دوسرا دور ڈھائی بجے شروع ہوا۔ دوسرا دور مشاعرہ کے پہلے دور سے زیادہ کامیاب رہا۔ یہیں اساتذہ [illegible] بیرونی شعرائے کرام کو بھی زیادہ مواقع دیئے گئے۔ اور حسب توقع راہی بستوی مشاعرے کے سب سے کامیاب شاعر رہے اور گزشتہ چند برسوں کے مقابلہ میں آج کا یہ گیارھواں مشاعرہ نہایت کامیاب رہا۔ تعجب کی بات تو یہ رہی کہ اس مشاعرے میں کوئی شاعرہ شریک نہیں ہوئی۔ نسیم نکہت دکھا مشرا اور سنیہہ خان سینا کا بڑا انتظار رہا مگر شرکت نہ کر سکیں۔

اس مشاعرے کے اہتمام کے لئے صدر بزم ادب جناب سعید مقبول صاحب۔ نائب صدر الیس۔ آر خان ونود کمار دیپ۔ رئیس نا [illegible]۔ جمیل اختر۔ حامد اللہ خاں، عبدالقیوم انصاری۔ ابرار حسین، اقتدار احمد، جمیل احمد وغیرہ ہم مبارکباد کے مستحق ہیں [illegible] مشاعرہ [illegible] نہایت کامیاب رہا۔

غزل — حیات ہاشمی

چاندنی کے جھرمٹ میں، روشنی ستاروں کی
شہر ہے تو اچھا ہے بستیاں مزاروں کی

خشک پتیاں کہہ کر ہم نے جب سے پھینکا ہے
دربدر بھٹکتی ہیں پتیاں بہاروں کی

پھل کہاں؟ درختوں سے چھن گئے ہیں سایہ تک
پتھروں سے جڑتی ہیں قسمتیں بچاروں کی

کون ان کا وارث ہے؟ کون بھی خبر شاید
بے شناخت لاشیں ہیں زندگی کے ماروں کی

اپنا پہلی فرصت میں تم بھی مجھ کو پڑھ لیجے
عمر کتنی ہوتی ہے آخر اشتہاروں کی

کھڑکھڑا کے آواز ہی کیا انھیں جگائیں گی
یہ جو اکے سوئے ہیں نیند بے شماروں کی

بچ گئے تو بیچ لیتے، بیچ بھی کیسے سکتے تھے
نام تھا غریبوں کا، سازشیں تھیں [illegible] کی

دفتروں کے راشیدہ کاغذات تم دیکھو
ہم تو دیکھ آئے ہیں مشکل کاشتکاروں کی

جب حیات شعروں میں ان کا نام آتا ہے
جمع ہونے لگتی ہے بھیڑ استعاروں کی

(باقی صفحہ [illegible] کا)

بات کا بھی ذکر کرنا ضروری ہے کہ سامعین نے کبھی [illegible] سوچ سمجھ کر [illegible] شعرائے کلام کو سن کر اور [illegible] نظر ہونے اور شاعری میں ان کی [illegible] دلچسپی کا اظہار تھی۔ اگر اسی طرح کے مشاعرے کیے جاتے رہے تو بلا مبالغہ یہ اپنی کھوئی روایت واپس لانے [illegible] کامیاب اور عوام کی دلچسپی کے باعث ہوں گے کہ

پتھر کی زبان

احمد یوسف

قدموں تلے پتھر نے [illegible] دنیا نے کہا ——— "کوئی دم میں دیوزاد آنے ہی ہوں گے ——— وہ تمہاری قربانی [illegible] پڑے گا کہ میرا سینہ پھٹ جائے گا اور آسمان ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔ گرد و غبار خون کے دریا میں بہہ جائیں گے ——"

تب ہی میں اپنے بچوں سے کہوں گی کہ وہ اپنی اپنی قبروں میں چھپ جائیں ——"

"کل بھی یہی ہوا تھا ——— [illegible] عروج پہ پہنچ کر منہ کے بل گرتی ہیں ——"

"بس اب دیوزاد آنے ہی ہوں گے ——— [illegible] سلسلہ جاگ رہی ہوں اور اب [illegible] کر سونا چاہتی ہوں کیونکہ نیند اور [illegible] سے پھوٹے بے حال سے ہو گئے ہیں۔

بس جیسے ہی دم [illegible] کہیں سے آ پہنچا [illegible] گے اور پھر سے شروع ہو جائے گا ——

[illegible] کے دیوزاد آنے ہی ہوں گے۔

سنگی محافظوں نے اپنے سینے اس کی کمر سے اس کنارے تک پھیلا رکھے ہیں جن پر [illegible] سیکڑوں اور ہزاروں قلعوں کے محفوظ کر دیے [illegible] سو [illegible] "آمر [illegible] تو مار [illegible]" کے بعد ایک بڑا سوالیہ نشان بنا دیتی ہیں، لیکن ایک [illegible] سی خوشی [illegible] انداز میں [illegible] ہے اور اسے ایک [illegible] سے پل میں بدل جاتی ہے۔

[illegible] ایک دوسری [illegible] کا [illegible] قبضہ کرتی ہوئی [illegible] شہر کی [illegible] پہنچ جاتی ہے ——— قلعوں میں

سرخ صحیفے دبے ہیں آنکھیں [illegible] کے [illegible] دلوں کو باہر کھینچ لاتا ہے جہاں [illegible] اپنا کام [illegible] ہاتھوں میں [illegible] صبح کا نقیب [illegible] الجھے بالوں والے [illegible] کے [illegible] میں [illegible] ہوا آسمان [illegible] کی [illegible] ہو گئی ہے اور اب یہ اُن کی تلاش میں ہیں اور وہ ان کی تلاش میں ہیں۔

"سلسلہ [illegible] ——— [illegible] سے اب تک اور وہ بلند و بالا [illegible] زمیں جہاں آنکھیں اگر [illegible] تک کا سفر کرتی ہیں تو ٹوپیاں فٹ پاتھ پر آ رہی [illegible] لیکن ان کے سلسلے میں پناہ بھی ملتی ہے اور [illegible] ایک سلیم کے اقبال زریں [illegible] ہیں [illegible] آہن کی دیواریں [illegible] بن سکتی ہیں ——— [illegible] ایک [illegible] آدمی کے روز و شب ———"

کہنے والے کہتے ہیں کہ جہاں آدمی کے ایک [illegible] سے [illegible] دلوں میں بے اطمینانی کے سانپ رینگتے ہیں وہاں ایک بڑے حصے کے دلوں میں شادمانی کے نقارے بجتے رہتے ہیں ——— دوسرا [illegible] یہ ہے کہ ایک چھوٹا سا حصہ اگر سرخوشی کے عالم میں جھوم رہا ہے تو ایک بڑا حصہ کرب اور آلام کی وادیوں میں آ گیا ہے ———

[illegible] بس ایک [illegible] ——— [illegible] ایک ——— [illegible] کے [illegible] میرے [illegible] ——— سارا زور میرے [illegible] آواز [illegible] کیا [illegible] مجھ جیسے خیالوں والے [illegible] کا ایک [illegible]

دلوں میں ایک گم کردہ تاریخ کے چند اوراق پریشان

سروں پر پڑے کی گئی ہیں ———

جیسے جا تو اس کی زبان کہہ رہا ہے خاسد ہو رہے

جاتے وہ تب ہی ایک جیسے صورتیں [illegible] بھاگتی۔

گھنٹے بجاتے ——— میرا گھر، میرا گھر کرتے

ہوئے رواں دواں ہیں ———

دو قدم اور ———

اس کی پلیٹ پر ایک تھیلا بندھا ہے جس میں

[illegible] کوکا کولا اور بیئر کی ٹھنڈی بوتلیں سجی ہیں۔

[illegible] وہ کسی قدر سے اوپر کو اٹھتی ہے اس کے

[illegible] گوشت میں کتنے ہی رنگ صف بہ صف

[illegible] ہیں اس کی چھاتی تنی اس کے سینے پر جھکے ہیں

اور اس کے [illegible] پچھلے جوتے خاموشی سے سفر کر رہے

ہیں۔

وہ چکنی آنکھوں سے جا رہا ہے اور دیکھتا ہے۔

تب [illegible] کرتا ہوا اس کا نعرہ جھکتا ہوا "آتا" [illegible]

[illegible] واقعات اور "خواب بھوکے ہیں" کے درس

[illegible] ہے۔

بالآخر وہ سیٹیاں بجا کر اور اونچی خلیجوں کو دیکھ کر

سے آنکھ کر یاں کرتا ہوا ایک طرف کو روانہ ہو جاتا ہے

اور آگے ———

سینما کے پوسٹر ———

مخصوص کمزوریوں کے علاج ———

دوا تین پیچھے

ایک جوان [illegible] آگئے، ایک جوان مسافر

[illegible] کے جگر کو [illegible] ہوا ایک سائیکل دیکھ

[illegible] ایک نوجوان نے سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑا

[illegible] کے بیچ کھڑے اور نہایت ہی [illegible]

[illegible] خشک [illegible] روند ڈالے [illegible] کر کھڑا

——— [illegible] کر دے یا نکل بھاگے تعلق [illegible]

یہ جھک جھک دیکھتا اس نے ایک اور شخص کو

سے قریب [illegible] پیشاب کر رہا ہے ———

(باقی صفحہ ۱۷ کا) ———

کچھ ادبی یادیں ملتان زمرمانہ گنگا

غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ہر سال جس غالب ایوارڈ

دیتا ہے ظفر ادیب نے غالب پر جو کام کیا ہے وہ

کسی بھی غالب پرست سے پوشیدہ نہیں ہے۔ کیا

محترمہ علیمہ حمد صاحبہ اور محمد شفیع قریشی

صاحب اس سلسلے میں سنجیدگی سے سوچنے کی تکلیف

فرمائیں گے کہ کیا آئندہ سال کے غالب ایوارڈ دوں

میں سے ایک غالب ایوارڈ ظفر ادیب کو بعطا

دیا جائے اور ان کی اردو اور غالبیات سے متعلق

خدمات کو تسلیم کیا جائے۔؟

Bed Tea بیڈ ٹی

• چائے رکھی ہے ......
چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے ......
ابھی چائے پانی ہوتی جا رہی ہے ......
چائے بنا کر سرہانے رکھنے کے بعد بھی جب تک
چار پانچ مرتبہ آواز نہ لگائی جائے صاحب کی آنکھ
ہی نہیں کھلتی
اس گھر میں سبھی کے اپنے ہی طور طریقے ہیں؛

• ثمن نازک مزاج تھیں باپ سے بھی چار قدم
آگے ہے طبیعت ناساز ہونے کا بہانہ بنا کر بستر
پر پڑے رہنا اس نے اپنا دستور بنا لیا ہے باپ کی
لاڈلی بیٹی ہے نہ ......

• بیٹا کا موڈ ہو تو صبح سویرے اٹھ کر جھٹ
پٹ سارے کام کر دے گا ورنہ بچھو کو دانستہ رُلا
کر بستر چھوڑنے کے لئے راستہ ہموار کر لے گی ...

• اپنا الّو سیدھا کرنے میں سبھی ماہر ہیں گھر میں
بس بیٹا ہی فولاد کی بنی ہیں [illegible] سب کے
حلق میں چائے نہ انڈیلی جائے کوئی بستر چھوڑنے
کا نام بھی نہیں لیتا ......

• مشکل تو یہ ہے کہ بستر پر چائے پینے کے بعد
بھی صاحب کو دفتر جانے کے لئے تیار ہونے میں
کم از کم ڈھائی تین گھنٹے درکار ہیں۔ لیٹرین جانا
برش کرنا، شیو بنانا، نہانا۔ نئی نویلی دلہنوں
کی طرح آئینے سے گفتگو کرتے ہوئے میک اپ
کرنا۔ اور پھر پوجا کا ڈھونگ رچا کر کرشن
بھگوان کی تصویر کے سامنے مہاتماؤں کی طرح
سمادھی لگا کر بیٹھ جانا ......

• راتوں کو پڑھنے لکھنے سے جو [illegible]
یہ کہتے نہیں ......

• بیٹا کے سسرال والے [illegible]
[illegible] ہیں۔ ان سے [illegible]

• ثمن سیانی ہو چلی ہے اس کی شادی کے [illegible]
میں کسی سے [illegible] نہیں ......

• گھریلو مشکلات اور خانگی معاملات سے انہیں
کوئی واسطہ نہیں۔ پھر پوجا پاٹھ کا ناٹک آخر
کس لئے ہے کرشن بھگوان سے اس پکی عمر میں [illegible]
[illegible] سکھیوں کی [illegible] کے لئے ہی [illegible]
کرتے ہوں گے!

• پوجا سے اٹھنے کے بعد ان کو ناشتہ تیار چاہئے
ناشتہ کر لینے کے بعد کپڑے بدلیں گے اور ایک بار
پھر دولہا بنے آئینے میں مختلف زاویوں سے اپنی
صورت کا جائزہ لیں گے تب کہیں بیگ اٹھا کر
دفتر کے لئے گھر سے قدم باہر رکھیں گے ......

• صبح چائے دینے سے پہلے [illegible] کا پیغام
معمولی ہیر پھیر کے ساتھ ٹیپ ریکارڈ کی صورت میں
مجھے روزانہ سننا پڑتا ہے۔ جب وہ [illegible]
ہوتے ہیں تو اس کے [illegible]
طرح چبھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ایک [illegible] ہے
کہ ٹیپ [illegible]
[illegible]
آخر دیوالی [illegible] ہے میں سوچنے لگتا ہوں کہ
[illegible]
رنگ تو اور ہی ہیں!

مسکراہٹ کے ساتھ انسان کے شعور میں شگفتہ مزاجی
سنجیدگی کا آنا لوگ کہتے ہیں ایک فطری عمل ہے مگر
اس کا اطلاق میرے بارے میں بالکل نہیں ہوا۔ اس کے
الٹ میرے شعور میں پختگی کی بجائے ناسمجھی اور مزاج میں
سنجیدگی کی بجائے چڑچڑا پن کیوں آتا جا رہا ہے؟؟
کھانے کھلانے پر وہ مجھے بھدی بلکہ تحسین گا کیوں
یہ آوازیں نہیں رہا دل سے کیوں کام لیتا ہے؟؟؟
● مجھے یہ شب سست ہے ... مجھے یہ جبر
سہنا ہے ... مجھے یہ زہر پینا ہے ......
اس مسئلے کا کوئی حل نہیں
● میرا اس اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے
اداس ہو کر بکھرے دن میں سمیٹ کر پیش کر دینے
کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی تو نہیں ... مگر جب ضبط
کی حد سے زیادہ ہو جاتا ہے تو میں اسے کاغذ پر
بکھیر دیتی ہوں۔ س

سب کو اپنے اپنے دکھ ہیں سب کو اپنی اپنی
پڑی ہے
اے دل غمگین تیری کہانی کون سنے گا کس کو سنائیں
(فراق)

● آپ ان سے کہا جائے کہ مضمون ختم ہو جانے
کے بعد کوئی ملنی طاقت مجھے یہ سمجھاتی ہوں محسوس
ہوتا ہے!
مجھے تیری بہوں آواز دیتی ہے ... مجھے
آپ کا احسان مند ہونا چاہئے۔ کیونکہ آپ
نے مجھے صبر کی دولت بخشی ہے ... مجھ
میں ہر حال میں جینے کی صلاحیت پیدا کی ہے..
... آپ نے مجھے غصے پر قابو پانے کی تربیت
دی ہے

غزل

شہاب اشرف

سوچ کر خوش تھا کہ میں تنہا نہیں
مڑ کے دیکھا تو کوئی اپنا نہیں

کیوں اٹھی خوشبو کسی خاک دل سے آج
جب کوئی بادل یہاں برسا نہیں

پھونک ڈالا ہے اپنے ہی احساس نے
زندگی تجھ سے کوئی شکوہ نہیں

لاش سے ملتی ہو جیسے کوئی لاش
جب محبت سے بدن جلتا نہیں

دامن سبزہ نے کیا کیا ڈھک لیا
اب یہاں انبار لاشوں کا نہیں

مسکرا کر یہ کہا ظالم نے سلام
پھول بھی اس ناز سے کھلتا نہیں

اس کو دیکھو اس کی باتیں تو سنو
وہ برے جی کو یونہی بھاتا نہیں

نیند آجاتی تھی جن کی چھاؤں میں
ان درختوں پر کوئی پتا نہیں

بن بیاہی جیسے بیٹی گھر میں ہو
جانے کیوں دل کو قرار آتا نہیں

کس سے پوچھوں حال میں اس یار کا
جو گیا وہ لوٹ کر آیا نہیں

مات کھائی ہے تو اپنے آپ سے
ہم زمانے سے کبھی ہارا نہیں

سب کو اپنی جان پیاری ہے شہاب
کوئی قاتل کو برا کہتا نہیں

غزل — فیروز ظفر بدایونی

زندگی زخم پہ زخم کھاتی رہی
زخم کھاتی رہی مسکراتی رہی

حال دل میں سناتا رہا اور وہ
اپنے آنچل کا کونا چباتی رہی

گھر سے باہر آ جانا تھا لیکن یہاں
رات بھی رات کے بعد آتی رہی

وہ کبھی پہونچے وہیں روشنی تھی جہاں
روشنی روشنی میں نہاتی رہی

بعد ترک تعلق بھی اک عمر تک
یاد پہلی ملاقات آتی رہی

حسن محلوں کے زینوں میں گم ہو گیا
عاشقی ریت کے گھر بناتی رہی

ایک بچہ بلکتا رہا بھوک سے
اور ماں لوریاں بھی سناتی رہی

ان کی زلفوں کے سائے میں جب تک رہے
زندگی خوشبوؤں میں نہاتی رہی

میں اور جشن بتاں دل اور انکی طلب
اک خلش تھی کہیں کب کی جاتی رہی

اے ظفر خود کبھی شکوہ کی تھی جو نظر
وہ نظر مجھ پہ تہمت لگاتی رہی

غزل

ڈی۔ اے۔ یٰسین قربان (سہارنپور)

کتنا بے درد آدمی ہے ابھی
دوستی میں بھی دشمنی ہے ابھی

یوں بھی بیٹھے رہو مرے آگے
ایک تازہ غزل چھڑی ہے ابھی

آپ آئیں تو زندگی آ جائے
دل کی بستی نئی نئی ہے ابھی

خون حسرت سے رنگ داماں ہے
دل کی دنیا بہت سجی ہے ابھی

ٹھہر جاؤ بڑا اندھیرا ہے
اور کھڑکی بھی کھلی کھڑی ہے ابھی

کتنے پردے اٹھائے ہیں لیکن
ایک دیوار سی کھڑی ہے ابھی

خود کو بھی آج تک نہیں سمجھا
کتنا لاعلم آدمی ہے ابھی

کب سے قربان پڑے ہیں قدموں میں
پھر بھی دنیا یہ اجنبی ہے ابھی

ملاوٹی شاہ بلت

"ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے"
[illegible] جمہوریت سے [illegible] کریں
[illegible] کس [illegible] کی صورت
[illegible] مہربان [illegible]
[illegible]
[illegible] ہے ؟
"[illegible] دل بندے کدھر جائیں ؟
[illegible] شرافت کی سزا پائیں
[illegible]
حکومت کرنا [illegible] اس دور میں پوری نہیں ہوتی
[illegible] آمدورفت کر [illegible] جائیں ؟
[illegible] ہم لوگ جو سوسائٹی کی
[illegible] ہیں
شرافت نے [illegible] دل بنا ڈالا
جو [illegible] امن کے قانون کے پابند ہیں
انصاف، نیکی، راستی، اخلاص کی
[illegible] قدروں کے رکھوالے
[illegible] جمہوریت کی شعبدہ بازی
[illegible] کی [illegible] فتنہ پردازی
[illegible] سیاست [illegible]
ہماری فکر کس کو ہے ؟
[illegible] کس کو بتلائیں ؟
[illegible] ہے ؟
[illegible] ہے ؟ [illegible] ہے ؟
[illegible]
دوسروں کو روند کر آگے نکل جائے
[illegible]

غزل

عبداللطیف خان اجمل
([illegible])

کس کو سناؤں حال کوئی رازداں نہیں
جو درد دل میں ہے وہ کسی پر عیاں نہیں
جل کر شب فراق محبت کی آگ میں
وہ لذتیں ملی ہیں کہ جن کا بیاں نہیں
ہم چل پڑے ہیں عشق کی دشوار راہ پر
منزل کا آہ حد نظر تک نشاں نہیں
دشمن ہوا ہے بخت، مخالف ہے آسماں
نامہرباں بہت ہیں کوئی مہرباں نہیں
کچھ مصلحت سے [illegible] کے ساتھ
پروانے سوچتے ہیں کہ منہ میں زباں نہیں
اجمل تلاش یار میں پھرتا ہوں در بہ در
ملتی نہیں خبر وہ کہاں ہے کہاں نہیں

[illegible]
[illegible] آسیبوں نے گھیر لیا
[illegible] نہیں کوئی
کہاں سے روشنی ڈھونڈیں ؟
کہاں سے حوصلہ مانگیں ؟
ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

صحرا

محمد یٰسین نغمہ کھام گاؤنی
(سورت)

مرد صرف عورت ہی نہیں بلکہ قدرت کا ایک ایسا عطیہ ہے جس کے بغیر انسانی زندگی نامکمل ہی نہیں بے لطف ہے۔ عورت ازل سے لیکر آج تک ایک ایسا معمہ رہی ہے جسے کوئی بھی حل نہ کر سکا۔ کہیں دنیا نے کر خود کو مٹا دیا تو کہیں اپنا دائرہ خلوص اتنا وسیع کیا کہ ساری کائنات اس میں سمٹ جائے کہیں بے وفائی پر اتر آئی مرد کا دامن داغدار کیا گیا تھا۔ کبھی عورت جسمانی کمزوریوں کا خزانہ لٹاتی ہے تو بہن کے روپ خلوص کے افق پر چار چاند لگاتی ہوئی بھائیوں کا سر ہمیشہ کے لئے بلند کر دیا اور عورت ہی شریک حیات بن کر مردوں کے صحراؤں میں نشاط بن کر نمودار ہوئی تو کہیں مامتا کے نام پر کلنک۔

جب سے شفیق نے اپنی نس بندی کروائی تھی سے ہر وقت کھویا کھویا سا رہتا۔ مرتا کیا نہ کرتا تین بچوں کا باپ پھر نوکری کا سوال سرکاری ملازمت میں بھی اب ایک نس بندی کا کیس دینا لازمی جو تھا۔ شفیق کی خوبصورت شریک حیات نسرین شفیق کے لئے قدرت کی طرف سے نادر و نایاب تحفہ تھی نسرین جو سراپا حسن و جمال، بوٹا سا قد، امور خانہ داری میں مہارت رکھنے والی تین بچوں کی ماں بن جانے پر بھی ایسا لگتا تھا کہ ابھی اس کی شادی کو دو چار ماہ ہی ہوئے ہوں گے۔ آج نسرین جب بچوں کو اسکول پہنچا کر گھر لوٹ رہی تھی کہ اچانک راہ میں اس کی ملاقات اپنے طالب علمی کے زمانے کے ایک شناسا سلیم سے ہو گئی چند دنوں بعد ہوئے کہ سلیم کا اسی گاؤں میں تبادلہ کسی سلسلے میں تبادلہ ہوا تھا۔ سلیم شرافت کا پیکر ... [illegible] ... جسمانی

طور سے مضبوط تھا اور اس کی مردانہ وجاہت کسی بھی عورت کو اپنی طرف متوجہ کر سکتی تھی۔ نسرین نے سلیم کو شام کو چائے پر مدعو کر کے اپنے شوہر سے اس کا تعارف کرایا سلیم نے پہلی ہی ملاقات میں شفیق پر ایسا اثر چھوڑا کہ ہر وقت شفیق سلیم کا ہی دم بھرنے لگا۔ ابھی چند ہی دن گزرے تھے کہ ایک ٹیلی گرام نے سب کے ہوش اڑا دیئے شفیق کے والد کی طبیعت سخت خراب ہو گئی تھی لہٰذا فوری طور پر اسے اپنے وطن جانا ضروری تھا اور وہ پہلی ہی ٹرین سے وطن روانہ ہو گیا۔ سلیم کا شفیق کے یہاں آنا جانا بدستور جاری رہا ویسے بھی اب وہ بچوں کا چہیتا "انکل" بن گیا تھا رات رات تک بچوں کو کہانیاں سناتا۔ پہیلیاں بجھاتا تو کبھی نسرین کو بھی طرح طرح کے لطائف سنا کر مسرور کرنا اس کا روز مرہ بن چکا تھا۔ ایک شام اچانک یکایک کروٹ بدلی بجلیوں کی چمک اور بادلوں کی گرج کے ساتھ بارش نے موسم کو بڑا سہانا بنا دیا تھا تھوڑی دیر میں بارش طوفان میں بدل گئی جس کی وجہ سے چرند پرند بھی موسم کی اس ہولناک تبدیلی کی وجہ سے پریشان و خوف زدہ ہو گئے ... [illegible] ... کا عالم تھا۔ طوفان باد و باراں تھا کہ تھمنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا پھر بھلا ایسے عالم میں سلیم نسرین اور اس کے بچوں کو چھوڑ کر اپنے گھر کیسے جا سکتا تھا۔ بچے سلیم کی باتوں میں لگے نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ نسرین ... [illegible] ... آنکھوں میں باتیں کر رہے تھے سلیم چاہتے ہوئے بھی گھر نہ جا سکا تھا اور نسرین ایسے طوفان میں اسے اپنے گھر جانے کو کہتے ہوئے ... [illegible] ... جذبات کی شدت ... [illegible]

بہر نسرین ... سلیم شفا سینٹ کے چنگل میں گرفتار ہو چکے تھے۔ پھر وہ ... طوفان تھم گیا اور ہر طرف سناٹا اور اندھیرا چھا گیا ہوا تھا۔ مگر نسرین ... نے نقاہت کے ... میں ایک ... نکل ... گزر رہی تھی ... کے سہارے مضبوط بانہوں میں پناہ لی تھی۔ نسرین ... تھی کہ شفیق نے جب سے آپریشن کروایا ہے تو ... طرح سے احساسِ کمتری میں مبتلا تھا وطن میں شفیق کے والد کی علالت نے طول پکڑ لیا تھا لہٰذا وہ دو مہینے کے بعد جب واپس آیا تو نسرین نے ... گرمجوشی کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا آج دونوں میاں بیوی بہت ہی خوش تھے اور پھر شفیق نے اپنے والد کی شفایابی کی خوشخبری بھی سنائی تھی نسرین کا گرمجوشانہ رویہ دیکھ کر شفیق بہت خوش تھا وہ بھی خوش خوش وطن کی باتیں سنا رہا تھا کہ قطع کلامی کی معافی چاہتے ہوئے نسرین کہہ اٹھی۔ سنو جی آپ کو وہ بات تو یاد ہوگی کہ کالو میاں نے نس بندی کروائی تھی مگر پھر بھی ان کے یہاں بچے کی پیدائش ہوئی تھی ... سوچتے ہوئے شفیق کہہ اٹھا۔ ہاں اچھی طرح یاد ہے لیکن پھر ایسا ہی واقعہ اپنے ساتھ بھی پیش آیا ہے۔ شفیق پہلے تو ہکا بکا رہ گیا مگر تھوڑی ہی دیر میں اس نے اپنے جسم میں ایک تازگی سی محسوس کی اور فرطِ مسرت سے نسرین کو چوم لیا۔"

غزل

محمد نقی منصور قمر اندوری
جھابوہ (ایم۔پی)

چلو کہیں بھی چلیں قلبِ ناتواں لے کر
چمن میں کون رہے درد آشیاں لے کر

جہاں جہاں بھی گئے ... لے کر
زمانہ سامنے آیا ہے شوخیاں لے کر

نہ جانے کس کا نشیمن جلا ہے گلشن میں
گزر رہی تھی ہوا دوش پر دھواں لے کر

غزل کا دائرہ ... تو کیوں سمجھتے
یہ مکین ہے کہاں وسعتِ جہاں لے کے

فسانے عشق و وفا کے حیات پاتے ہیں
مری کتاب محبت کی سرخیاں لے کر

اٹھائے کیسے آخر کوئی امن کا پرچم
کھڑے ہیں لوگ تشدد کی برچھیاں لے کر

افسر الشعراء حکیم فتح محمد خاں صاحب جے پوری کا انتقال

جے پور۔ ۱۲ جولائی — آج چھ بجے شام جے پور کی باغ و بہار ہستی افسر الشعراء حکیم فتح محمد خاں صاحب کا انتقال ہوگیا خدا انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور متعلقین کے پسماندگان اور ... شاگردوں کو صبر عطا فرمائے یاد رہے کہ آپ ... ہندوستان اور ملک بھر کے مشہور شعراء، ادباء اور دانشوروں نے افسر الشعراء کی شاگردی ... طور پر قبول کی تھی مرحوم نے اپنی ... یادگاریں چھوڑی ہیں۔

(ادارہ)

پیغامِ عمل

احمد رضا
جمشید پوری

خوابیدہ آرزو کو جگاؤ تو بات ہے
اُمید کے چراغ جلاؤ تو بات ہے
رنگ تمھارے جذبۂ صادق کے ہے خلاف
پتھر کو راستے سے ہٹاؤ تو بات ہے
گر روشنی میں شمع جلائی تو کیا کیا
تاریکیوں میں شمع جلاؤ تو بات ہے
چلتے ہوؤں کو ساتھ چلایا تو کیا کیا
بیٹھے ہوؤں کو ساتھ چلاؤ تو بات ہے
افسردہ روح جھوم اُٹھے جس کی تان پر
وہ گیت دل کے ساز پہ گاؤ تو بات ہے
جن کو تمھاری بات کے سننے سے ہو گریز
اُس کو بھی اپنی بات سناؤ تو بات ہے
یہ کیا کیا کہ دل کو جدا دل سے کر دیا
بکھرے ہوئے دلوں کو ملاؤ تو بات ہے
دُنیا کو تم منا کے کبھی پاؤ گے اس سے کیا
روٹھے ہوئے خدا کو مناؤ تو بات ہے

چندن بھارتی

ٹونک (راجستھان) میں جناب چندن بھارتی کا وجود مبارک ہے جو ٹونک کی یادگار "بہار ادبی" کو زندہ رکھے ہوئے ہیں حال ہی میں چندن صاحب کا مجموعہ شاعری "گلزارِ چندن" شائع ہوا ہے پہلی فرصت میں منگا کر شاعری کی اس صنف کا بہترین نمونہ ملاحظہ فرمائیں قیمت [illegible] روپئے

[illegible] ۱۸۰۰

غزل

نقوی احمد پوری

میرے سامنے میرے صحن میں چمک رہی ہے چاندنی
کسی کے انگ انگ سے ڈھلک رہی ہے چاندنی
تھمی تھمی فضاؤں کو معطّل معطّل ہواؤں کو
سُنا سُنا کے لوریاں تھپک رہی ہے چاندنی
کسی سے آس کو پیار ہے کسی کا انتظار ہے
جو آدھے کھلے کواڑ میں سسک رہی ہے چاندنی
کلی کلی پہ رنگ ہے نگوں میں [illegible] ترنگ ہے
سنہری بال کھول کر مہک رہی ہے چاندنی
جو دیکھتا ہوں مڑ کے میں بکھر رہا ہوں جھوم کے میں
پکڑ کے میرا ہاتھ پھر چھنک رہی ہے چاندنی
وہ فاصلے سمٹ گئے دکھوں کے ابر چھٹ گئے
میرے لبوں کی پیاس پر چھلک رہی ہے چاندنی
سکوتِ شب کی لہر میں سیاہیوں کے شہر میں
کچھ ایسے گھر بھی ہیں جہاں چھنک رہی ہے چاندنی
گلوں کی شکر اجنبی ہوا کی سرسراہٹوں میں
لطیف جسم کی طرح تھرک رہی ہے چاندنی
وہ کون محوِ خواب ہے کھِلا ہوا گلاب ہے
کہ جس کے در پہ اپنا سر پٹک رہی ہے چاندنی
سحر کا کیف ہے فزوں مگر میں کیوں نہ رو پڑوں
چھٹے ہیں میرے جب سے تم سسک رہی ہے چاندنی
یہ کوئی زندہ لاش ہے جسے غمِ معاش ہے
بجھے بجھے سے پاس میں بھٹک رہی ہے چاندنی
تجھے وہ نقوی حزیں ملا ہے جا بجا کہیں
تیرے تو لفظ لفظ سے جھلک رہی ہے چاندنی

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ

رجسٹرڈ ہیڈ آفس ۷۸، محمد علی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

دہلی برانچ، دریا گنج نئی دہلی

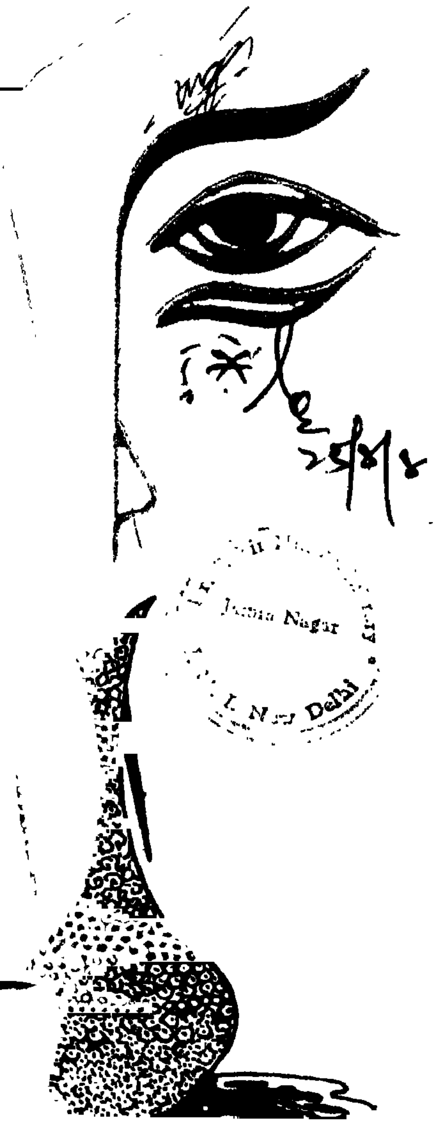
اعلان بسلسلۂ حج ۱۹۸۴ء

ہم بہ مسرت یہ اعلان کرتے ہیں کہ امسال بفضلِ تعالیٰ حج کمیٹی نے حجاج کرام کی سہولت کے لئے زرمبادلہ (فارن ایکسچینج) جاری کرنے کی خدمت انجام دینے کے لئے بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ کو منتخب کیا ہے۔

جن حجاجِ کرام کی درخواستیں حج کمیٹی کی جانب سے منظور کردی گئی ہیں، ان حضرات سے گزارش ہے کہ وہ ہندوستانی رقم مبلغ =/12395 روپئے (جو کہ سعودی ریال چار ہزار کے برابر ہے) کا ڈرافٹ ہماری کسی بھی برانچ یا کوئی بھی شیڈولڈ بینک سے لے آئیں جو بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ اکاؤنٹ (حاجی) کا نام کے حق میں ہو اور دہلی، بمبئی یا مدراس میں جاری کیا گیا ہو۔

نوٹ:- دہلی سے بذریعہ ہوائی جہاز جانے والے زائرین حج سے گزارش ہے کہ وہ برائے سہولت اپنا ڈرافٹ صرف دہلی پر جاری کرائیں۔

JUNE 1984 Phone : 271462 Regd. No.D-(DN) 370
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110001
Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644 57



سرور تونسوی

Kafeel Ahmed

ٹیلیفون نمبر [illegible] رجسٹرڈ آف نیوز پیپرز فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۴۴۴/۵۷ | رجسٹرڈ نمبر ڈی [illegible]

بنتِ پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں ہر ذرۂ وطن ہے مجھ کو پیار
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں یعنی وطن پرست ہوں انسان پرست ہوں
فیاض گوالیاری

نئی دہلی
شانِ ہند

ایڈیٹر
سعد توصوی

جلد نمبر ۴۵ | جولائی ۱۹۸۴ء | شمارہ نمبر ۷

● جب ملتان کی اولڈ سنٹرل جیل میں سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست حکومت پنجاب کے سلسلے میں سیاسی قیدی کی حیثیت میں مقید تھے۔ تو لالہ گنیش داس اسسٹنٹ جیلر کی وساطت سے میں سردار صاحب سے ملاقات کے لیے اولڈ سنٹرل جیل کے اندر گیا تو جیل کی وحشت ناکی سے میرا جسم کانپ اٹھا۔ اس کی دیواروں سے خوف ٹپکتا تھا۔ اس کے تالوں پر (بقول آغا شورش کاشمیری) چڑیل کے پستان ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ اور اس کی سلاخوں سے دہشت ٹپکتی تھی۔ سپرنٹنڈنٹ خدا کو بھی اپنا نائب سمجھ رہا تھا۔

میں نے سردار صاحب سے کہا کہ سردار صاحب آپ ایسا حسن پرست ایسی ویران اور وحشت ناک چار دیواری میں کیسے رہ رہا ہے تو سردار صاحب نے اپنے روایتی قہقہے سے اس وحشت ناک فضا میں کسی قدر خوشگواری پیدا کرتے ہوئے فرمایا۔

سعد صاحب جس طرح طوائف کسی ضرورت مند کی جنسی خواہش پوری کرتے وقت یہ تصور کر لیتی ہے کہ وہ رفع حاجت کے لیے پاخانے میں بیٹھی ہے۔ اسی طرح ہم لوگ بھی اس عذاب کو یہ سمجھ کر جھیل رہے ہیں کہ انگریزی راج کی میت کو دفنانے کے لیے کچھ وقت قبرستان میں گزارنا ہی پڑتا ہے۔

● جو شخص موسم اور ہوا کی طرح بدل جانے کا عادی ہو۔ اس سے "وفا" کی امید رکھنا یا اسے معتمد سمجھنا حماقت ہے ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے کہ ہمارے ہاں لیڈران بالخصوص [illegible] کرام کی اکثریت ان دونوں "اوصاف" کی حامل ہے
(سعد توصوی)

ڈیا پر نٹر پبلشر سعد توصوی نے [illegible] پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند [illegible] انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ صبا چہ کرد؟

ناطقہ سر بہ گریباں ہے ....

● حکومت ہند کے ایک بہت ہی مشہور وزیر کو اُن کے ایک دوست نے فون کیا تو وزیر موصوف کے پی اے نے جواباً کہا کہ صاحب تو میٹنگ میں ہے آپ نے جو کچھ کہنا ہو مجھے کہیں، اُن سے کہہ دوں گا۔ اخبار نویس نے کہا کہ بھائی مجھے اُن ہی سے بات کرنی ہے۔ اس پر پی۔ اے صاحب فرمانے لگے کہ اُن میں اور ہم میں کوئی فرق نہیں ہے آپ بے تکلف جو کہنا چاہیں کہہ دیجئے آپ کا پیغام منسٹر صاحب تک پہنچ جائے گا۔ اخبار نویس نے ملائمت سے کہا کہ میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ مجھے صرف اُن سے ہی کچھ کہنا ہے۔ تو پی۔ اے صاحب نے نہایت بے تکلفی سے فرمایا کہ بھائی اگر نوٹ وغیرہ دینے کا قصہ ہے تو بے فکر ہو کر مجھے دیجئے یہ کام بھی میرے ہی ذریعہ ہوتا ہے اُن کی امانت اُن تک پہنچ جائے گی۔ اخبار نویس یہ جواب سن کر حیرت زدہ رہ گئے اور اُن کی زبان سے صرف یہی نکلا کہ آپ میرا نام اور فون نمبر لکھ لیجیے ذرا جب بھی آپ کو موقع ملے منسٹر صاحب کو بتا دیجئے کہ اگر وہ مجھ سے بات کرنا چاہیں گے تو خود ہی فون کر لیں گے۔ بہرحال پی۔ اے صاحب کو پتہ چلا کہ فون کرنے والے فلاں صاحب ہیں اور فلاں مشہور زمانہ رسالے کے ایڈیٹر ہیں۔

● ایک مشہور تجارتی بازار کے بیوپاری اپنے علاقہ کے انکم ٹیکس آفیسر کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ ان بیوپاریوں کا کہنا ہے کہ ایسا اچھا انکم ٹیکس آفیسر انھوں نے آج تک نہیں دیکھا۔ ایک بیوپاری سے دریافت کرنے پر ان انکم ٹیکس آفیسر کی مقبولیت اور تعریف کا جو سبب بتایا وہ اس بیوپاری کے الفاظ میں یوں تھا کہ

"جب بھی تاریخ مقررہ پر حساب کتاب کی جانچ پڑتال کرانے اکاؤنٹس کی کتابیں لے جاتے ہیں تو انکم ٹیکس آفیسر صاحب بڑی خندہ پیشانی سے استقبال کرتے ہیں فوراً چپراسی سے چائے منگاتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ حساب کتاب کی بکس لے آئے ہیں آپ۔ اُمید ہے کہ بکس کے ساتھ لفافہ بھی لانا نہیں بھولے ہوں گے۔ پہلے ہمارا لفافہ پیش کیجیے اس کے بعد آپ کے حساب کتاب کے رجسٹر دیکھے جائیں گے ہو سکتا ہے کہ حساب کی بکس دیکھنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اور اگر لفافہ نہیں لائے تو اپنی کتابیں وغیرہ اٹھا کر چلتے بنئے اور جس روز آپ لفافہ لا سکتے ہوں وہ تاریخ لے لیجیے۔"

بیوپاری نے انتہائی خوشی سے بتایا کہ صاحب ہم بیوپاریوں کے لیے تو یہ انکم ٹیکس آفیسر دیوتا ہے۔ لفافہ دیا اور ریٹرن میں جو کچھ ہم ریٹرن دیتے ہیں وہی دو چار روپے کی کمی بیشی سے تسلیم کر لی جاتی ہے۔

● ایک محترمہ جو ناگفتہ بہ ہیں انھیں ہندی وغیرہ میں لکھنے کا شوق ہے اور اُردو میں بھی غلط سلط ایک چند کا لکھا کرتی رہتی ہیں حالانکہ اُردو کی الف۔ بے بھی نہیں جانتی ہیں۔ دلّی دوردرشن کے ایک بڑے افسر کے ہاں دفتر میں گئیں۔ ایک تو لڑکی پھر ایم اے پڑھنے کی وجہ سے انگریزی بھی فرفر بولنے والی۔ اس پہ حسین و جمیل وہ ایک بڑے افسر کی بجائے چاہتی تو کسی وزیر سے بھی ملاقات کر سکتی تھی۔ اس محترمہ نے دوردرشن کے اس بڑے افسر سے کہا کہ مجھے اُردو میں بھی لکھنے کا شوق ہے اور میں ہندی سے پنجابی

اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری بھی یہاں سے زیادہ ریشن کے پروگراموں
میں حصہ لینے کا موقع ملنا چاہئے۔ اس پر افسر مذکور نے
بڑی شان بے نیازی سے فرمایا آپ شاعرہ ہیں تو ہم پر
کوئی شعر سنائیے۔ تب ہم آپ کو شاعرہ مانیں گے۔ لڑکی دو
منٹ خاموش رہی اور پھر ایک شعر سنایا۔ پہلے مصرعہ کا مطلب
یہ تھا کہ جب سے آپ کو دیکھا ہے ہم اپنے آپ کو بھول گئے
ہیں اور دوسرا مصرعہ تھا کہ آپ بے شک بھول جائیں ہم
تو بھول نہیں سکتے ہیں۔

یہ شعر سنتے ہی افسر مذکور نے لڑکی کی طرف سے "گگلی"
کو [illegible] سمجھا اور فوراً ایک دوسرے افسر کو بلا کر حکم دیا کہ
انھیں اردو پروگرام "بزم" میں فوراً لیا جائے اور ان کے
اشعار کی ریکارڈنگ کر لی جائے۔ چنانچہ دوسرے ہی دن
افسر مذکور کے اس حکم کی تعمیل ہو گئی اور ان محترمہ کے غلط
سلط اور بے وزن اشعار کی ریکارڈنگ ہو گئی۔

● آکاش وانی کے وودھ بھارتی پروگرام سے ہر رات
مین دس بجے ایک مستقل عورت کی احتجاجی آواز سنائی
دیتی ہے "ہاں ہاں میں پکار پکار کر کہوں گی کہ تم مرد نہیں
ہو" سنا ہے کہ آکاش وانی کے ایک افسر کی کم عمر بچی نے
اپنے باپ سے پوچھا "پاپا اگر کوئی مرد نہیں ہے تو اس
عورت کو کیا تکلیف ہے جو یہ چیخ چیخ کر ریڈیو سننے والوں
کو بتا رہی ہے" اس بچی کو کیا معلوم کہ آکاش وانی اور دوردرشن
نے ہر گھر میں کیسا ماحول پیدا کرنے میں جو کردار ادا
کیا ہے وہ دنیا بھر کی طوائفیں بھی ادا نہ کر سکتی تھیں۔

● سیلز ٹیکس انسپکٹر [illegible] کے چپراسی نے راہ
چلتے ایک دیہاتی سے دریافت کیا کہ جو سامان تم خرید کر
بازار سے لا رہے ہو اس کا کیش میمو دکھائیے۔ دیہاتی
نے سادگی سے کہا کہ دوکاندار نے جو سامان کی قیمت مانگی
وہ میں نے ادا کر دی اور سامان لے لیا۔ مجھے کیش میمو
وغیرہ کا کچھ علم نہیں ہے کہ یہ کیا ہوتا ہے۔ لیکن چپراسی
نے [illegible]
[illegible] 73 نے
یہ سامان کس دوکان سے خریدا ہے۔ [illegible]
ساتھ ہو لیا اور جس دوکان سے سامان خریدا تھا فوراً
ان دونوں ...... کے ہمراہ پہنچا۔ دوکاندار نے [illegible]
ڈر سے کہا اسے جانے [illegible]
[illegible] انسپکٹر نے دوکاندار سے دریافت کیا کہ اس شخص نے
آپ کی دوکان سے یہ سامان خریدا۔۔۔ دوکاندار نے
انکار کر دیا۔ اب دیہاتی سے چپراسی نے کہا کہ [illegible]
تم پر مقدمہ قائم ہوگا اور سزا ہوگی۔ اس پر دیہاتی نے [illegible]
کہا کہ میں نے اسی دوکاندار سے یہ چیزیں خریدی ہیں [illegible]
[illegible] انسپکٹر سے کہا کہ اسے [illegible]
[illegible] اس کا جرمانہ بنا لیجئے۔ چنانچہ انسپکٹر اور
چپراسی نے دیہاتی کو جرمانہ بنانے کے لیے اسی دوکاندار
کے دفتر میں لے گیا پتہ چلا کہ انسپکٹر اور چپراسی نے
شراب کی بوتل اور مرغے کی قیمت لے کر اس دیہاتی کو چھوڑ
دیا۔ کہا جاتا ہے کہ دہلی کے کاروباری علاقوں میں [illegible]
ایسے مذبح موجود ہیں جہاں اس قسم کے مرغے ہر روز [illegible]
تعداد میں ذبح ہوتے ہیں۔

غالب ایوارڈز

شاعر ہند کی گزشتہ اشاعت میں غالب ایوارڈز عنوان
کے تحت ادارتی شذرہ سے متعلق ہمیں کئی خطوط موصول
ہوئے ہیں کہ ہم نے جناب مجتبیٰ حسین صاحب کے مقابلہ
میں جناب [illegible] صاحب کی حمایت صرف اس لیے کی
کہ وہ ہندو ہیں۔ [illegible] مذہبی تعصب [illegible]
وہی لگا سکتا ہے جو خود [illegible] تعصب کا [illegible]
[illegible] بار بار ایسے مواقع آئے کہ ہم نے کسی [illegible]
کسی ہندوستانی کی حمایت کی اور [illegible]
آزاد ہندوستان میں بہ تحقیق مذہب و ملت ہر [illegible]
[illegible] کے حقوق رکھتا ہے اور [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] مسلمان کی حق تلفی کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے مگر ہم اس بلیک میلنگ کا شکار ہونا بھی پسند نہیں کرتے کہ ہم کسی غیر ہندو کے حقوق کی پامالی پر اس لیے خاموش رہیں کہ ایک ہندو کی حیثیت سے اگر کسی بہتر ہندو کی حمایت کریں گے تو مسلمانوں کی نظروں میں فرقہ پرست کہلائیں گے۔ خدا کا احسان ہے کہ شان ہند کے مسلمان قارئین کرام کی اکثریت مذہبی تعصب سے نفرت کرتی ہے اور وہ ہر حق بات کو سننا اور پڑھنا پسند کرتی ہے۔

غالب ایوارڈز کا فیصلہ کرنے والی کمیٹی پر کسی قسم کا شک کیے بغیر ہم یہ کہنے میں جھجکاہٹ محسوس نہیں کرتے کہ عوام کا نظریہ اس کمیٹی کے بارے میں کچھ اچھا نہیں۔ علاوہ ازیں کہنے کو تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جناب خلیق احمد نظامی کا اردو ادب میں کونسا ایسا مقام ہے کہ انھیں غالب ایوارڈ سے نوازا جائے۔ وہ تاریخ کے پروفیسر ہیں انھیں اردو ادب سے کیا لینا دینا۔ ان کے مقابلے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی اردو خدمات اور اردو ادب میں اُن کے مقام کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا کیونکہ وہ بھی ایک ہندو ہیں۔ اور ایک ایسا ادارہ جس پر اسلامی چھاپ لگی ہو وہ ہندوؤں کی اردو خدمات کا اعتراف کرنے کے لیے کیسے ممکن ہو سکتا ہے بے شک یہ ادارہ ایوارڈز کے لیے سرمایہ کی فراہمی ہندو سرمایہ داروں سے ہی کیوں نہ کرتا ہو فکر تونسوی کے بارے میں جس کا دل چاہے ملک کے بہترین اردو نقادوں کو خطوط لکھ کر دریافت کرے کہ طنز و مزاح میں موجودہ دور میں ہمارے ملک میں اولین حیثیت کسے حاصل ہے۔

ہم اس قسم کے خطوط لکھنے والوں سے مودبانہ گزارش کریں گے کہ وہ خط لکھنے سے پہلے معاملہ کی اہمیت اور اصلیت کا اندازہ کر لیا کریں۔

فیوزڈ بلب

وہ بلب جو روشنی دینے کے قابل نہ رہے اُسے فیوزڈ بلب کہا جاتا ہے چنانچہ وہ شخص [illegible] فیوزڈ بلب کہہ دیا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح نہ تو تحقیر کا پہلو لیے ہوئے ہے اور نہ ہی اس کو کسی کی تحقیر کرنے یا کسی کا تمسخر اڑانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے بلکہ کسی کے بارے میں یہ کہہ دینا کہ وہ فیوزڈ بلب ہے اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ وہ شخص ریٹائرڈ لائف گزار رہا ہے اور کسی [illegible] فرض کو نبھانے کی سکت نہیں رکھتا۔

شان ہند کی کسی گزشتہ اشاعت میں مولوی قمرالدین صاحب ایوبی جے پوری کے بارے میں یہ لکھا گیا تھا کہ اُردو اکادمی راجستھان کے چیرمین کی حیثیت سے اُن کی خدمات ایک فیوزڈ بلب کے طور پر رہی ہیں۔ چنانچہ مولوی قمرالدین صاحب ایوبی جے پوری کے شاگردوں اور ان کے مداحوں نے اسے برا منایا اور ہمیں گالیوں اور دھمکیوں سے بھرپور خطوط لکھے (ویسے ایسے خطوط لکھنا جے پور کے بعض جاہل اور غیر مہذب حضرات کا محبوب مشغلہ ہے کیونکہ انھیں تعلیم ہی ایسی ملی ہے) اس سلسلے میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ مولوی قمرالدین صاحب ایوبی کی قابلیت، اہمیت، شرافت اور اُن کی سادگی اور سادہ لوحی کا ہمیں اعتراف ہے۔ مگر ایک بدزبان ایوبی کا یہ کہنا کہ مولوی قمرالدین صاحب ایوبی نے ایڈیٹر شان ہند ایسے ہزاروں کو اُردو پڑھا دیا۔ اس بارے میں ہمیں اپنی کم علمی کا اعتراف ہے اور ہم نے ہمیشہ ہی اپنے آپ کو ایک طالب علم سمجھا اور اس میں بھی عزت افزائی سمجھتے ہیں کہ مولانا قمرالدین ایوبی جے پوری ہم جیسے ایڈیٹروں کو اُردو پڑھاتے رہے۔ مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ مولانا موصوف نہ تو اپنے فرزند ارجمند اور نہ ہی اپنے شاگرد کو اُردو پڑھا سکے۔ آپ پر چونکہ قانونی کارروائی کی جا چکی ہے اس لیے آپ کے بارے میں تو اب قانونی فیصلہ ہی بہتر رہے گا۔ ہاں شان ہند کی آئندہ اشاعت میں مولانا قمرالدین صاحب ایوبی جے پوری کے فرزند ارجمند فرید ایوبی کی اُردو دانی کا مظاہرہ ہم پیش کریں گے تاکہ یہ ثابت ہو سکے جو مولانا اپنے بیٹے کو اُردو نہ پڑھا سکے وہ ہم جیسے ایڈیٹروں [illegible]

تو کیا ڈھول پیٹے جاتے رہے ہونگے۔

راجدھانی میں محکمہ ڈاک کی بدانتظامی

راجدھانی میں محکمہ ڈاک اور ٹیلی فون کی ایسی بری حالت اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی جتنی جناب وی۔ این گیڈگل وزیر مواصلات کے عہد میں ہے۔ پارلیمنٹ میں گیڈگل صاحب محکمہ ڈاک اور ٹیلی فون میں بہتری کی لمبی چوڑی تو فیتیں کرتے ہیں مگر دراصل حالت کیا ہے وہ کسی بھی ٹیلی فون رکھنے والے سے پوچھئے کیا غضب ہے کہ ڈاک خانہ انصاری روڈ میں رجسٹرڈ اور وی۔ پی پیکٹوں کی بکنگ پونے دو بجے دوپہر کو ہی بند کر دی جاتی ہے۔ اس لیے کہ پیکٹوں اور پارسلوں کے بیگ لے جانے والی گاڑی دو بجے آتی ہے۔ اور شام کو جو گاڑی آتی ہے وہ ڈاک خانہ جامع مسجد اور دریا گنج سے پیکٹوں اور پارسلوں کے اتنے بیگ لاد لیتی ہے کہ اس میں اتنی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ ڈاک خانہ انصاری روڈ کے پیکٹوں اور پارسلوں کے بیگ لاد سکیں۔ لہٰذا بیگ رات بھر پڑے رہتے ہیں اس لیے یہی بہتر سمجھا گیا کہ پونے دو بجے دوپہر کے بعد پیکٹوں اور پارسلوں کی بکنگ ہی نہ کی جائے۔

یہ بیان ڈاکخانہ انصاری روڈ کے رجسٹرڈ پیکٹوں کے بکنگ کلرک اور پوسٹ ماسٹر کا ہے۔ لہٰذا ہم محکمہ ڈاک کے وزیر مسٹر گیڈگل سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا یہ شرم کا مقام نہیں کہ رجسٹرڈ پیکٹوں اور پارسلوں کو ڈاکخانوں سے آر۔ ایم۔ ایس تک لے جانے کے لیے گاڑی کا بھی انتظام نہیں ہو سکتا ہے۔ محکمہ ٹیلی فون سے متعلق یہ لطیفہ بھی سن لیجئے کہ دفتر شانِ ہند کا ٹیلی فون خراب ہونے کے بارے میں متعدد بار شکایت کی گئی مہینوں ـــــ نہ ہونے کے بعد ایریا مینیجر کے ہاں شکایت کی گئی تو کچھ دنوں کے بعد ایک انسپکٹر تشریف لائے اور فرمانے لگے صاحب آپ کی شکایت کا کیا کریں ایریا منیجر کے دفتر کے بھی ٹیلی فون بیکار پڑے ہوئے ہیں۔ جب محکمہ ٹیلی فون کی کارکردگی اس قدر قابل تعریف ہو تو پارلیمنٹ میں وزیر متعلقہ نہ معلوم کس طرح لمبے چوڑے تعریفی بیان دیتے ہیں۔ سینئر سپرنٹنڈنٹ دہلی ڈویژن کو چاہیئے کہ وہ اپنے ماتحت ڈاک خانوں پر زیادہ توجہ دیں۔

کارِ خیر

جناب ظفر ادیب کے انتقال کے باعث اُن کے پسماندگان کی حالتِ زار سے متاثر ہو کر راقم الحروف نے اپنے چند مہربان احباب سے درخواست کی تھی کہ اس مشکل وقت میں ظفر ادیب کی بیوہ اور یتیم بچیوں کی مالی مدد فرمائیں چنانچہ اس سلسلے میں حسب ذیل حضرات نے رحم دلی کا ثبوت دیا۔

۱۔ جناب کالی داس گپتا رضا ایک ہزار روپیہ
۲۔ جناب راجندر کرشن صاحب پانچ سو روپیہ
۳۔ جناب کے۔ ایل نارنگ ساقی صاحب پانچ سو روپیہ
۴۔ جناب چندن بھارتی صاحب ٹونک دو سو اکیاون روپیہ
۵۔ جناب الحاج یوسف دہلوی صاحب مالک و مدیر اعلیٰ ماہنامہ شمع نئی دہلی ایک صد روپیہ ماہوار
۶۔ جناب ڈاکٹر اودے سرن ارمان بلاردی ایک سال تک ایک صد روپیہ ماہوار۔

کچھ اور احباب سے بھی ذاتی طور پر گزارش کی گئی ہے۔ قارئین "شانِ ہند" سے التماس ہے کہ وہ اس کارِ خیر میں حصہ لے کر ممنون فرمائیں گے۔

نیاز مند
سعید انور

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

بیس پچیس برس ہوئے کہ بمبئی کے ایک کاروباری شخص نے برلا ماتیشوری ہال میں ایک مشاعرۂ شاعرات منعقد کرانے کا اعلان کیا اور اس سلسلے میں یہ صاحب میرے پاس تشریف لائے کہ میں ان کا یہ مشاعرۂ شاعرات کامیاب کرا دوں۔ اُن دنوں شانِ ہند مشاعروں کے سلسلے میں ایک مسلّمہ حیثیت رکھتا تھا اور برصغیر کے اُردو شاعروں اور شاعرات کے بارے میں راقم الحروف کی رائے کو حتمی سمجھا جاتا تھا۔

شاعرات کے انتخاب کے سلسلہ میں مشہور فلم ایکٹریس نگار سلطانہ نے فرمایا سرور صاحب حیدرآباد کی نور جہاں نور کو ضرور بلایا جائے۔ نگار سلطانہ نے نور جہاں کے ترنم اور حسن کی تعریف کچھ ایسے الفاظ میں کی کہ مشاعرہ کے منتظم بضد ہوئے کہ نور جہاں کو ضرور بلایا جائے۔ چنانچہ نگار سلطانہ صاحبہ کی معرفت نور جہاں نور کو دعوت نامہ بھجوا دیا گیا۔

شاملی ضلع مظفر نگر کی ایک نوآموز شاعرہ کانتا کپور کو اس مشاعرہ کا کنوینر مقرر کیا گیا اور انھیں اس سلسلہ میں بمبئی بھجوایا گیا۔ مشاعرے سے دس روز پیشتر میں اور روحی صاحبہ بھی بمبئی پہنچ گئے۔ تب تک کانتا کپور نے مشاعرے کے ٹکٹ اچھے خاصے فروخت کر لیے تھے۔ مشاعرہ والے روز میں اور منتظمین مشاعرہ جناب نگار سلطانہ کے گھر گئے تو نور جہاں نور حیدرآباد سے آ چکی تھیں پہلی ہی نظر میں نگار سلطانہ کی تعریف کو حق بجانب پایا۔ نور جہاں کے حسن کا تمام نور اُنکی آنکھوں میں سمٹ گیا تھا اور ہماری کی بات تو یہ ہے کہ اُردو شعر نے جو شکل حسن اور جسم کا جو تصور شاعری میں قائم کر رکھا ہے وہ نور جہاں کی شکل میں ہمارے سامنے تھا۔ نور جہاں کی عمر اس وقت بیس بائیس برس کی رہی ہوگی۔ کہنا ہے کہ حیدرآباد کی خواتین میں جوانی چالیس برس کی عمر میں آتی ہے مگر نور جہاں تو اس عمر میں ہی ساری بمبئی میں نور پاشی کر رہی تھی۔ مشاعرہ میں نور جہاں اسٹیج پر بیٹھیں تو سامعین جن میں فلمی دُنیا کے اکثر حضرات شریک تھے نور جہاں کی آنکھوں کی نیلی نیلی جھیلوں میں ڈوب کر رہ گئے۔ جب نور جہاں نور کے نام کا اعلان ہوا تو کئی منٹ تک سامعین نے تالیاں بجا کر نور جہاں کا استقبال کیا۔ ایسی شاعرات کے پاس گنتی کی دو چار غزلیں ہی ہوتی ہیں جو اُن کے کسی چاہنے والے شاعر کا عطیہ ہوتی ہیں ترنم خدا کی دین ضرور ہے مگر بعض کو اپنی طوائف ماں سے ودیعت ہوتا ہے لہٰذا جب نور جہاں نے غزل شروع کی تو ترنم غمازی کر رہا تھا کہ کسی بلند ویلا کوٹھے کی وراثت میں ملا ہے۔ چنانچہ یکے بعد تین غزلیں جو ان کا کل سرمایۂ شاعری تھا سُن کر سامعین نے نور جہاں کے اشعار کی اوٹ میں اُن کے حسن اور ترنم کی جی بھر کر داد دی۔ مشاعرے کے دوسرے دن میں نگار سلطانہ صاحبہ کے ہاں گیا تو وہاں رئیس امروہوی (یہ صاحب غالباً بمبئی میں لانڈری چلاتے تھے مگر مشاعروں میں شاعرات کی بکنگ کی دلالی بھی کرتے تھے یعنی جو معاوضہ شاعرات کو دلاتے اُس میں سے کمیشن لیتے تھے اور ایک دو شاعرات سے خیرات حسن، الاونس کے طور پر بھی دستیاب ہو جاتی تھی) موجود تھے۔ نگار سلطانہ نے اپنی حیدرآبادی بادہ حسن کو بھی شاعرہ بنا رکھا تھا۔ بہرکیف رئیس امروہوی اس بادہ حسن کو شاعرہ اور قمر گی [illegible] لازم [illegible] جہاں تک

[illegible] تعلقات کے متعلق بہت کچھ باتیں
[illegible] اور نورجہاں کی تعریف میں تو وہ اپنی
تمام لسانی قوت صرف کر رہے تھے۔ [illegible] رئیس
صاحب خاموش ہو گئے وہ مجھے نہیں جانتے تھے مگر میں
ان کی تعریف شکیل بدایونی صاحب سے سن چکا تھا۔ نورجہاں
نے علیک سلیک کے بعد مجھے بٹھایا اور اندر جاکر
نگار سلطانہ کو اطلاع دی۔ دو چار منٹ بعد ہی نگار سلطانہ
صاحبہ ہال کمرے میں تشریف لائیں تو سب سے پہلے رئیس
مرزا سے تعارف کرایا۔ ... اور باتوں باتوں میں نگار
سلطانہ صاحبہ نے رات کے کھانے کی دعوت دی میں
نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بتایا کہ آج رات ہی
ہم دہلی روانہ ہو رہے ہیں۔ اس لیے معافی چاہوں گا تو
نورجہاں فرمانے لگیں کہ سرور صاحب سچ بتلائیے کل رات
میں مشاعرہ میں کیسی رہی میں نے ان کی توقع سے زیادہ تعریف
کی تو کہنے لگیں تو میری خاطر آج دہلی جانے کا پروگرام
ملتوی کر دیجیے اور رات کا کھانا یہیں کھائیے ایمانداری
یہ ہے کہ اس دعوت کا انکار میرے لیے انتہائی مشکل اور
کسی حد تک اپنی روایت کے خلاف تھا مگر میں نے مجبوری
ظاہر کی کہ شکیل صاحب نے بڑی دوڑ دھوپ کر کے
ریزرویشن دلایا ہے لہٰذا دہلی کی روانگی ملتوی کرنے کا
مطلب یہ ہوگا کہ پھر ریزرویشن کے لیے بمبئی کئی روز پڑے
رہیں۔ نورجہاں نے اصرار کر کے میرا پتہ لے لیا اور
اس کے بعد بات آئی گئی ہو گئی۔ سالہا سال گزر گئے اور
اس عرصہ میں کسی مشاعرہ میں نورجہاں سے دوبارہ ملاقات
نہ ہو سکی۔ مگر تقریباً بیس سال بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی
ریسیور اٹھایا تو ایک نسوانی آواز نے سلام علیکم کہتے
ہوئے اپنا تعارف کرایا کہ میں نورجہاں نور بول رہی ہوں
اور اس وقت نئی دہلی ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ
روم میں ہوں۔ فوراً آئیے اور مجھے اپنے یہاں لے چلیے
میں صرف آپ سے ملاقات کے لیے دہلی آئی ہوں۔
یقین جانیے تقریباً پچیس سال پہلے کی نورجہاں میری
آنکھوں کے سامنے یکایک اس طرح آگئی کہ میں ایک ٹیکسی پکڑ
کے بغیر نئی دہلی ریلوے اسٹیشن روانہ ہو گیا اور لیڈیز ویٹنگ روم کے باہر کھڑی نورجہاں کو پہچاننے میں کوئی
دقت نہیں ہوئی۔ وہ کافی [illegible] ہو چکی تھیں۔ جسم کا [illegible] پہلے سے کہیں
زیادہ (جس کا [illegible] صاف چغلی کھا رہا تھا) بیس سال
میں کسی بھی عورت میں اتنی تبدیلیاں آجاتی ہیں کہ وہ کچھ سے
کچھ نظر آنے لگتی ہے مگر نورجہاں نے اپنے آپ کو ہر لحاظ سے
"ابھی تو میں جوان ہوں" کی مفصل تفسیر بنانے کی کوشش کر
رکھی تھی۔ مگر احتیاط کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو بیس اور پچیس
سال کا وقفہ زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ ع
وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا۔
علیک سلیک کے بعد نورجہاں کہنے لگیں کہ بخدا میں
وضو سے ہوں صرف آپ سے ملنے کے لیے دہلی آئی ہوں
اگر نورجہاں تو کیا کسی دوسری عورت نے بھی پچیس سال
پہلے یہ کہا ہوتا تو میں کیا کوئی بھی میرا ہم عمر چونک اٹھتا اور
کسی حد تک اپنی خوش نصیبی پر نازاں بھی ہوتا مگر مجھ جیسے
ایڈیٹر کا دماغ یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ گذشتہ ۲۵ برس میں
ایک بھی خط کا تبادلہ ہمارے مابین نہیں ہوا۔ اس طویل
عرصے کے بعد ان محترمہ کے دل میں مجھ سے ملنے کی خواہش
کیونکر ہوئی جس کے لیے انھیں نے حیدرآباد سے دہلی تک
کا طویل سفر اختیار کرنا پڑا۔ میرا دل و دماغ اسی ادھیڑ بن
میں تھا کہ نور صاحبہ نے پھر دہرایا کہ بخدا میں وضو سے ہوں
صرف آپ سے ملاقات کے لیے دہلی آئی ہوں۔ نورجہاں کے
اس ارشاد مکرر نے میرے شکوک کو اور بھی پختہ کر دیا
میں نے مسکراتے ہوئے عرض کیا اچھا یہاں سے تو چلیے اب بھی
تو دو چار دن کے بعد بتا دیجیے گا کہ آپ دہلی کیوں تشریف لائی
ہیں۔ قلی سے نور صاحبہ کا سامان اٹھوا کر اسٹیشن کے باہر ٹیکسی
میں رکھوایا تو معاً حضرت رئیس امروہوی (کراچی) کے قطعہ کا
ایک مصرع گنگنانے کو جی چاہا [illegible]
کے لیے یہاں داشتہ آید بکار کو اس کے اصل معنوں میں [illegible]
صرف "داشتہ" آپ کے دل و دماغ میں محفوظ [illegible] (باقی)

گوشۂ عقیل صدیقی | خلیل الرحمٰن

"مشاعرہ بتقریب جشن رہبرؔ سہاوری"

آج ۱۰ مئی ۲۰۰۶ء بروز اتوار فیروز آباد (یوپی) میں انجمن احترام الادب کے زیرِ اہتمام ایک کل ہند مشاعرہ بتقریب جشن رہبرؔ سہاوری سیٹو گرافک تھیٹر پرانی منعقد کیا جا رہا ہے۔ مشاعرہ گاہ کو ایک وسیع اور خوبصورت پنڈال سے آراستہ کیا گیا ہے اور اسٹیج کو رنگا رنگ قمقموں سے دلہن بنا دیا گیا ہے میری نظر میں کسی معتبر شاعر کا جشن اس کی زندگی میں منانا ایک اچھی روایت ہے۔ لہٰذا اراکینِ انجمن احترام الادب فیروز آباد مبارکباد کے مستحق ہیں۔ محترم رہبرؔ سہاوری کا پورا نام فرزند حسین عرف نواب ہے اس وقت عمر کی ۷۵ ویں منزل میں ہیں اور سولہ سترہ سال کی عمر سے شعر کہہ رہے ہیں۔ اپنے ابتدائی کلام کی اصلاح خوشترؔ حسنی سہاوری سے لینے کے بعد زانوئے ادب صدیق مارہروی کے سامنے تہہ کیا۔ صدیق مارہروی کا سلسلہ حضرتِ داغؔ دہلوی تک پہونچتا ہے۔ داغؔ اسکول کے ماہرِ فن حضرت احسنؔ مارہروی ایک بہترین نقادِ فن اور زبان و بیان کے رموز و نکات جاننے والے تھے، "منتخبِ داغ" لکھ کر انھوں نے اردو ادب میں ایک خاص مقام حاصل کیا ہے احسنؔ مارہروی حضرت مرزا داغؔ دہلوی کے صحیح جانشین تھے اور اپنے تمام خواجہ تاشوں کے زمرے میں نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ حضرتِ امجدؔ حیدر آبادی۔ حضرتِ سیمابؔ۔ حضرتِ اقبالؔ۔ حضرت دلبرؔ مارہروی۔ حضرت فرقتؔ کاکوروی۔ حضرت بیخودؔ دہلوی۔ حضرت نوحؔ ناروی وغیرہم تمام سخنور و سخن فہم ان کا ادب کرتے تھے۔ حضرتِ رہبرؔ کے لیے اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ احسنؔ مارہروی اسکول کے آپ ایک نامور شاعر ہیں۔ حضرت رہبرؔ کم کہتے ہیں، مگر خوب کہتے ہیں۔ اس

وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں۔ سامعین ہزاروں کی تعداد میں اپنے شعرائے کرام کو سننے کے لیے بے چین ہیں اور تاخیر کے سبب سے پنڈال میں اچھا خاصا شور مچا ہوا ہے۔

بہرحال اب شعرائے کرام اسٹیج پر آ رہے ہیں۔ محمد ملک زادہ منظور احمد صاحب کو جب مشاعرہ شروع کرانے کے لیے آواز دی گئی تو سامعین میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی ڈاکٹر ملک زادہ صاحب فرما رہے ہیں کہ ایسے موقع پر زیادہ کہنا سامعین کے صبر و تحمل کا امتحان لینا ہے اور اپنی عزت کو خطرے میں ڈالنا ہے۔ مشاعرے کا آغاز نعت شریف سے کیا جا رہا ہے جس کے لیے معراجؔ فیض آبادی سے درخواست کی ہے۔ معراجؔ فیض آبادی مائیک پہ آ کر خوش گوار ترنم میں نعتِ رسول پیش کر رہے ہیں اور سامعین سے داد وصول کر رہے ہیں۔ نعت کے یہ شعر بہت پسند کیے گئے ؎

بہت ہے آپ کے در کی غلامی - یہ دنیا اہلِ دنیا کے حوالے
بنی کے شہر کا رستہ بتا دو - دعا دیں گے تمہیں پیروں کے چھالے
وہ سرکار مدینہ ... ہے جس دم - مجھے اللہ دنیا سے اٹھا لے

معراجؔ فیض آبادی نعت شریف سے سامعین کو متاثر کرنے کے بعد واپس ہونا چاہتے تھے مگر نقیبِ مشاعرہ کی درخواست پر ہی مشاعرے کا آغاز بھی فرما رہے ہیں۔

معراجؔ فیض آبادی غزل سے پہلے قطعہ شرحت میں پڑھ رہے ہیں۔ شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

یہ تبرکات کی ہو کی ... ہیں رہنے دو - ہمارے عصر ... آسمان ...
تمہاری ... کا شکریہ لیکن - ہمارے ... پہلے ...

[illegible] صاحب ترنم [illegible]
غزل کے چند اشعار بہت پسند کیے گئے ۔

آ قبلہ رو کی شادی کا ماتم نہیں ہوں
چلاؤ سب اس کی لاش میں خنجر میرا ہے
دُم تک دار و رسن دار و رسن دار و رسن
ایسے حالات میں جینا بھی ہنر میرا ہے

موصوف فیض آبادی اچھا تاثر چھوڑ گئے ہیں۔ اب بہار اکبر آبادی کو دعوت دی جا رہی ہے۔ بہار اکبر آبادی ایک قطعہ پیش کرنے کے بعد چھوٹی بحر میں مترنم آواز میں غزل پیش کر رہے ہیں۔ مگر زیادہ متاثر نہیں کر پائے۔ تاہم ان کے دو شعر آپ بھی گوارا فرمائیں ۔

بننے والا جو رو دیا ہوتا — سارا عالم بھگو دیا ہوتا
میں مقدر سے بچ گیا ورنہ — تو نے پیچھے ڈبو دیا ہوتا

نقیب مشاعرہ کو بھی شاید لطف نہیں آ رہا ہے اسی لیے وہ فرما رہے ہیں کہ مشاعرہ تاخیر سے شروع ہوا اس لیے مشاعرے میں وہ لطف نہیں آ رہا ہے جو آنا چاہیے تھا۔ لہٰذا سامعین کا موڈ بدلنے کیلیے مزاحیہ شاعر شگفتہ ٹانڈوی کو دعوت دی جا رہی ہے۔ شگفتہ ٹانڈوی کا نام ادھر کچھ دنوں سے بڑی کثرت سے سننے میں آ رہا ہے اور میں انکی شخصیت سے متعلق جو سچ بتایا تھا وہ یہ کہ وہ ادھیڑ عمر کے ہوں گے مگر آج جب یہاں [illegible] ایک دبلے پتلے چھوٹے قد کے نوجوان نظر آئے۔ دوران گفتگو یہ بھی معلوم ہوا کہ انھوں نے حال ہی میں شادی کی ہے۔ گویا بھڑکتے ہوئے شعلوں کو سرد کرنے کا بندوبست انھوں نے کر لیا ہے اسی لیے تو مائیک پر آ کر فرما رہے ہیں ۔

اس نے چپل سے توڑا اس طرح — دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے

شگفتہ ٹانڈوی ترنم میں پڑھتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں دوسرے شعراء کی نقل کرنا بھی خوب جانتے ہیں۔ وسیم بریلوی کے انداز میں پڑھ رہے ہیں۔ آپ دو شعر دیکھیں ۔

نوابی ختم ہو گئی [illegible] — اجڑ ہو گئی کھیتی جوان باقی ہے
خدا کے واسطے [illegible] — [illegible] باقی ہے

سامعین میں [illegible]
مرحوم گیت اقبال سلطان پوری کے انداز میں سنا رہے ہیں [illegible] ماحول کو قہقہہ زار بنا رہے ہیں۔ شگفتہ ٹانڈوی سامعین کو ہنسا کر واپس آ رہے ہیں حالانکہ ماحول ایسا ہو گیا ہے کہ [illegible] کچھ دیر اور مائیک پر رہتے۔ اب امروہے تشریف لائے ہوئے نوجوان شاعر مشکور رکان پوری مائیک پر آ گئے ہیں اور نہایت خوش گوار اور کسی قدر بلند ترنم سے غزل سنا رہے ہیں اور مشاعرے میں زندگی لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چند شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ۔

کیا وقت ہے اللہ یہ کیا [illegible] سا ہے
خورشید چراغوں سے ضیا مانگ رہا ہے
وہ شخص کہ جس سے تھا مرا خون کا رشتہ
ظالم مرے مرنے کی دعا مانگ رہا ہے
شیشے کی عمارت میں ہوں پتھر کی دعائیں
انسان بغاوت کا صلہ مانگ رہا ہے

مشکور رکان پوری بڑے حوصلے کے ساتھ غزل گا رہے ہیں۔ مشاعرے میں کچھ زندگی کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ مشکور صاحب کا مقطع بھی ملاحظہ فرمائیں۔ کیا خوب کہا ہے ۔

مشکور خدا دیتا ہے تو مانگ خدا سے
انسان ہے تو انسان سے کیا مانگ رہا ہے

غزل ختم کر کے مشکور صاحب کامیاب لوٹ رہے ہیں۔ اب رام پور سے تشریف لائے ہوئے ایک اور نوجوان شاعر اقبال رام پوری کو آواز دی جا رہی ہے۔ اقبال رام پوری بھی ترنم میں اپنی غزل سنا رہے ہیں اور کامیاب ہیں۔ سامعین بڑی توجہ سے انھیں سن رہے ہیں اور انھیں بھرپور داد و تحسین سے نواز بھی رہے ہیں۔ غزل کے چند شعر آپ کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں ۔

تری قاتل نگاہ نے مجھے کتنے زخم دیے
نہ ترے شمار کی بات ہے نہ بے شمار کی بات ہے
تجھے ناز اپنی جفا پہ تھا مجھے فخر اپنی انا پہ ہے
وہ ترے وقار کی بات تھی یہ وقار کی بات ہے

[illegible] جیسے ہی [illegible] غزل
اقبال سام پوری [illegible] سن رہے تھے۔ جلد صاحب حسبِ معمول
خود کو [illegible] اور انداز بیان پر احباب [illegible] کرنے
میں اپنا جواب نہیں رکھتے ہیں۔ اب ساغر [illegible] پوری کو آواز
دی جا رہی ہے۔ ساغر [illegible] پوری آکر سب سے پہلے سلام
کر رہے ہیں سلام کہنا شاعروں کی دیرینہ روایت ہے گویا
سلام کر کے روایت کو زندہ کر رہے ہیں۔ پھر ترنم آواز میں
غزل چھیڑ رہے ہیں۔ ساغر [illegible] پوری کی غزل مرصع ہے اور
سامعین پر اچھا تاثر چھوڑ رہی ہے۔ دو شعر توجہ کے لائق ہیں
پیار و محبت سے چلنا سنبھل کر۔ یہاں لوگ اک اک قدم پر کھڑے ہیں
محبت کی نظروں پہ نظریں ہماری۔ جو تم دیکھتے ہو وہ ہم دیکھتے ہیں
ساغر [illegible] غزل ختم کر کے واپس ہونا چاہتے تھے کہ ایک
اور ایک اور کی آوازیں آنے لگیں تو ایک غزل اور سنا رہے
ہیں۔ ساغر [illegible] کامیاب ہو کر لوٹے تو سبحان (بھائیو)
کے ابھرتے ہوئے نوجوان اور خوبرو شاعر قمر جاوید کو آواز دی
گئی۔ قمر جاوید اسٹیج پر آکر ماحول کا جائزہ لینے لگے تو نقیب
مشاعرہ کے منہ سے نکلا ”حضرات! شعر کے ساتھ ساتھ پڑھنے
والے کو بھی دیکھیں“ ـــ اس وقت رات کا ایک بجا چاہتا
ہے۔ [illegible] دن بھر سخت [illegible] ہونے کی وجہ سے موسم میں کوئی
[illegible] نہیں آئی ہے۔ لیکن قمر جاوید کی سریلی آواز اور [illegible]
[illegible] شاعری نے مشاعرے کے
ماحول کو [illegible] بنا دیا ہے۔ غزل کے یہ چند شعر قابلِ
تحسین ہیں ؎

آنکھوں میں تو خواب سجے ہیں دل میں مگر تنہائی ہے
کچھ تو بتا اے راہِ محبت کون سی منزل آئی ہے
دل میں ہیں جتنے زخم ہمیں کیوں تازہ تازہ لگتے ہیں
ابھی ابھی جو بیت چکا ہے شاید وہ پروائی ہے
تاروں کی صورت دیکھی ہے اشکوں کے آئینے میں
اکثر ہم نے اپنی طبیعت ایسے بھی بہلائی ہے
ہم نے جب سے ہوش سنبھالا چاروں طرف یہ دیکھا ہے
[illegible] کی قسمت [illegible] اور [illegible] کی [illegible] آئی ہے

قمر جاوید بہت کامیاب [illegible] سے غزل [illegible]
فرمائش ہونے لگی۔ قمر جاوید فرما رہے ہیں اگرچہ میں گیت کا نہیں
غزل کا شاعر ہوں لیکن ایک غزل گیت کے انداز میں پیش
کر رہا ہوں۔ قمر جاوید پھر اپنے مخصوص انداز میں غزل سرا
ہیں ؎

جب دل کے گھاؤ بھرنے لگے ہیں
وہ اور ہمیں یاد آنے لگے ہیں
ہم جب سے جینے پانے لگے ہیں
وہ اور ہمیں یاد آنے لگے ہیں

لوگ داد دے رہے ہیں مگر اسٹیج پر بیٹھے کچھ شعراء
ایک دوسرے کا منہ تک رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں۔ اب
وہ شعر سنیے جسے نوجوانوں نے خوب سراہا۔ ایک صاحب نے
تو بڑھ کر قمر جاوید سے کہا میں مار ہی ڈالا [illegible]۔ دل پر ہاتھ
رکھ آپ بھی سنیے ؎

جس رستے میں ملتی نہیں ہے لڑکی ایسے رستے ہم کترانے لگے ہیں

غزل ایسے ہی دو چار اور سنا کر قمر جاوید سامعین سے
داد لیکر لوٹ رہے ہیں۔ قمر جاوید نے جو ماحول بنایا ہے اس
کا پورا فائدہ اٹھا کر نقیب مشاعرہ ایک لطیفہ سنا رہے ہیں جو
یوں ہے کہ استاد نے اپنے لڑکوں سے سوال کیا کہ غزل کسے
کہتے ہیں؟ ایک لڑکے کا جواب تھا کہ شریف لڑکے شریف
لڑکیوں کو چھیڑنے کے لیے جو کچھ کہتے ہیں اسے غزل کہا جاتا ہے۔
بہرحال اب مختصر سے تعارف کے بعد شاعروں کے ایک
معتبر اور کہنہ مشق شاعر تمنا جمالی سے کلام سنانے کی درخواست
کی جا رہی ہے۔ تمنا جمالی اپنی خوش گلوئی اور خوش لحنی کی وجہ
سے مشاعروں میں خوب پسند کیے جاتے ہیں۔ پہلے تحت میں
کچھ شعر سنا رہے ہیں اور اب ترنم میں غزل سرا ہیں۔ سامعین
ان کے کلام سے کافی محظوظ ہو رہے ہیں۔ غزل کے یہ دو شعر مجھے
پسند آئے ؎

انھیں یہ خبر ہی کب تھی کہ جلے گی ساری بستی
مرا گھر جلانے والے مرا گھر جلا کے رو دیے
یہ خزاں ہی مستقل ہے جو ہمارا [illegible] بہار
کبھی رو کے مسکرائے کبھی مسکرا کے رو دیے

سامعین کے اوپر پڑھی دوسری غزل بھی لگتا ہے
ہیں اور مشاعرہ کامیابی کی طرف رواں دواں ہے۔ اس
غزل کے بھی کچھ شعر دیکھئے ؎

میں تو سمٹ جانے کو مٹ جاؤں کا میرا کیا ہے
تم پہ الزام نہ آئے وہ طریقہ کیا ہے
دیکھنے والو تماشا نہ بناؤ مجھ کو
پہلے اس راز کو سمجھو کہ تماشا کیا ہے
تم تمنا کی تمنا میں نہ جینا ہرگز
خواب تو خواب ہیں خوابوں کا بھروسہ کیا ہے

تمنا جمالی حسب معمول بہت کامیاب مائیک سے لوٹ
رہے ہیں۔ اس مشاعرے میں دو شاعرات بھی ہیں ایک
ہیں اورنگ آباد (مہاراشٹر) کی نوجوان اور ابھرتی ہوئی
شاعرہ شاہین شہزادہ اور دوسری تسنیم صدیقی۔ اب شاہین
شہزادہ کو دعوتِ سخن دی جا رہی ہے۔ سامعین سنبھل کر
بیٹھ گئے ہیں۔ شاہین شہزادہ قبول صورت بھی ہیں اور
سادگی پسند بھی۔ شاہین شہزادہ مائیک پر آکر کھڑی ہو گئیں
ہیں اور ماحول کا جائزہ لے کر غزل سرا ہو رہی ہیں مائیک
پر پھولوں کے بہت ہار لٹکے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے
شاہین شہزادہ کا چہرہ مہرہ سامعین کو نظر نہیں آ رہا ہے۔ کچھ
منچلے سامعین آواز لگا رہے ہیں کہ مائیک سے ہار ہٹا لیے
جائیں۔ فوراً اس مطالبہ پر عمل کیا گیا۔ شاہین شہزادہ بڑے
اطمینان سے اپنی دلپذیر آواز میں غزل کا جادو جگا رہی
ہیں۔ سامعین بڑی توجہ کے ساتھ انہیں سن رہے ہیں اور
داد دے رہے ہیں۔ شاہین کے اشعار بھی گوارا ہیں اور
ترنم بھی۔ پڑھنے کا انداز بھی غضب ہے۔ چند اشعار سے
آپ بھی محظوظ ہوئیے ؎

راز دل کا یوں ہی کھلتا ہے تو کھل جانے دو
اشک آنکھوں میں جب آئے تو چھپایا نہ گیا
ساتھ کچھ دور چلی راہ میں پھر چھوڑ گئی
زندگی نے بھی کیا ہم سے نبھایا نہ گیا؟

آگ کو پھول سمجھ بیٹھے تھے نادانی سے
اب شگفتہ جانے دو دامن کو بچا نا گیا؟
ہم تو شاہین سنا دیتے ہیں اپنے دل کی
کیا پتہ گیت ہے کیا اور ترانا گیا؟

شاہین بہت کامیاب رہیں۔ غزل ختم کر کے واپس جانا
چاہتی تھی مگر گیت کی فرمائش چاروں طرف سے آنے لگی
تو ٹھہر گئیں اور ایک گیت "ہم بنجارے" سنا رہی ہیں۔ گیت
میں بھی شاعرہ کا فن عروج پر ہے۔ الغرض دور بہ دور اور
زیادہ تر مشاعرہ اپنے شباب پر ہے۔ اب نقیب مشاعرہ
ڈاکٹر ملک زادہ منظور خود اپنا کلام سنا رہے ہیں ملک زادہ
منظور اگر اچھے ناظم نہ ہوتے تو بھی ایک اچھے اور با صلاحیت
شاعر ہونے کی وجہ سے مشاعروں میں یاد کیے جاتے۔ غزل کے
کچھ متفرق اشعار سنا رہے ہیں۔ جو کچھ نوٹ کر سکا آپ کی ضیافتِ
طبع کیلئے حاضر کر رہا ہوں ؎

محفل محفل دار کا چرچا مجلس مجلس ذکر رسن
مقتل مقتل خونِ شہیداں کل بھی تھا اور آج بھی
اب خون کوچۂ قلب کو پیمانہ کیا جائے
اس دور میں مقتل کو بھی میخانہ کیا جائے

ملک زادہ منظور کلام سنا کر بیٹھے تو کچھ لوگ اٹھ کر
جانے لگے۔ اس پر نقیب مشاعرہ فرمانے لگے کہ جو لوگ
شاہین شہزادہ کو سننا چاہتے تھے وہ لوگ جا رہے ہیں۔ ایک
ایک سامع فرما رہے ہیں کہ ابھی تو اور جنبل
باقی ہے۔ یہ اشارہ تسنیم صدیقی کی طرف ہے۔ تسنیم صدیقی
بھی سمجھ گئی ہیں اور زیر لب مسکرا رہی ہیں۔ ہاں جنبل کیفی
کو دعوت دی جا رہی ہے۔ لیکن ظفر صاحب متاثر نہیں
کر پائے۔ ان کے دو شعر آپ بھی سن لیجئے ؎

میں رہ اس چپکے سامنے میں ہوں گا
لیکن وہ میرا چلا ہے اپنی جگہ ہے
اس جیسا تو کوئی بھی نہیں اس جیسا ہے
اس شوخ پری وش کی ادا اپنی جگہ ہے

اب مشاعرہ کے گوہر تابدار پر تسنیم صدیقی ...

ہے۔ ناظم فیروز آبادی جہاں ہیں وہاں اپنی وضع قطع سے بھی شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ اسم شہر سہاور ی کے ہونہار شاگرد ہیں۔ ابھی ہیں اسٹیج بھی بڑے ہی ادا و اہتمام کے ساتھ جشن رہبر سہاوری منایا جا رہا ہے۔ ناظم فیروز آبادی بجا طور پر اس کیلئے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ناظم فیروز آبادی کا ترنم بھی بہت پیارا اور بلند ہے، ورشعر بھی فکر و فن کی بلندیوں کو چھوتے ہوئے چند شعر آپ بھی قبول فرمائیں ؎

کچھ اس ادا سے دل پہ نظر آپ کی رہی
ہر آرزوئے دید مودب کھڑی رہی
تھک کے بے خودی میں گذرتا چلا گیا
منزل تو ہر قدم پہ مجھے روکتی رہی
احباب جس قدر تھے کھڑے دیکھتے رہے
بحر فنا میں ناؤ مری ڈوبتی رہی

مقامی شاعر ہونے کے باوجود بھی لوگ ناظم فیروزآبادی کو داد و تحسین سے نواز رہے ہیں اور ان کی قدر افزائی فرما رہے ہیں یہی نہیں بلکہ جب غزل ختم کر کے رخصت ہونے لگے تو پھر ایک اور ایک ارت کی بھی بہت سی آوازیں آنے لگیں۔ دوسری غزل کے چند شعر سنا کر ناظم صاحب نہایت کامیاب لوٹ رہے ہیں۔ اور اب عزیز نازی پوری مائیک پہ آکر فرما رہے ہیں ؎

یوں ہی کبھی کسی کو گنہگار مت کہو
پہچے اگر کہوں تو طلب گار مت کہو
ممکن ہے بھوک ہی سے قدم لڑکھڑائے ہوں
پھر لڑکھڑانے والے کو میخوار مت کہو

عزیز غازی پوری بھی مائیک سے کامیاب لوٹ رہے ہیں۔ اور یہ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ وہ خوب رو، خوش گلو اور چلبلی شاعرہ کو آواز دی جا رہی ہے۔ سامعین خوشگوار کا اظہار کر رہے ہیں اور سنبھل کر بیٹھ گئے ہیں۔ میری مراد الٰہ آباد کی خوش فکر شاعرہ تسنیم صدیقی سے ہے۔

سامنے ڈائس پر بیٹھے ہیں مگر ابھی سامعین کثیر تعداد میں جمع ہیں۔ سب کی نگاہیں مائیک پر گڑی ہوئی ہیں خوش پوش خوش شکل شاعرہ تسنیم صدیقی کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ تسنیم صدیقی مترنم آواز میں اس طرح غزل سرا ہو رہی ہیں ؎

جذبۂ دوستی سے ملتے ہیں جس سے ملتے ہیں دل سے ملتے ہیں

ایک صاحب عقب سے کچھ بول رہے ہیں۔ تسنیم صدیقی بڑی حاضر جواب ہیں بولیں فرمانے لگیں "آپ پیچھے سے کیوں بولتے ہیں۔ سامنے آ جائیں تب" لیجئے حکم کی تعمیل ہو رہی ہے وہ صاحب سامنے آ کر بیٹھ گئے ہیں اور تسنیم صدیقی اس انداز میں فرما رہی ہیں ؎

جس نے ہر موڑ پر دئے ہیں فریب۔ جان کر پھر اسی سے ملتے ہیں
موسم گل تر سے سبھی انداز۔ میری دیوانگی سے ملتے ہیں

سامعین اپنی بیداری کا ثبوت دے رہے ہیں مشاعرہ بالکل اپنے عروج پر ہے۔ ایک صاحب جو اسٹیج پر میرے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں تسنیم صدیقی کی غزل اور انداز بیان سے اتنے خوش ہوئے کہ لپک کر تسنیم صدیقی کی گل پوشی کرنا چاہا مگر تسنیم صدیقی نے اس کا موقع نہیں دیا اور بڑی صفائی سے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور صاحب اپنی نارسائی پر مایوس لوٹ گئے بہرحال۔ تسنیم صدیقی اپنے اسی انداز میں غزل سنا رہی ہیں اور سامعین جھوم رہے ہیں۔ تسنیم صدیقی کی دوسری غزل کے بھی چند شعر ملاحظہ فرمائیں۔

قاتل سے ہم انعام وفا مانگ رہے ہیں
ہاتھوں کا لہو دے کے حنا مانگ رہے ہیں

گرچہ ردیف گھسی پٹی ہے پھر بھی تسنیم صدیقی سامعین سے داد وصول کرنے میں کامیاب ہیں۔ غزل کا ایک شعر پیش کرنے سے پہلے فرما رہی ہیں کہ اگر یہ شعر یہاں سمجھ میں نہ آیا تو گھر جا کر ضرور سمجھ میں آ جائے گا۔ وہ شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

وہ اشک چھپانے کا سلیقہ نہیں جن کو
سب زخم چھپانے کی دعا مانگ رہے ہیں

تسنیم صدیقی اپنی خوش لحنی کا افسوں پھیلا رہی ہیں۔ ساتھ ہی اس مشاعرے میں پیش کئے گئے کلام کی طرف...

اس شعر کی تفسیر بھی نظر آرہی ہیں ۔

بس پیاسا تو کوئی بھی نہیں صحنِ چمن میں
اس شوخ پہ ہی دشت کی ادا اپنی جگہ ہے

تسنیم صدیقی غزل ختم کر کے رخصت ہوئیں تو سامعین بھی اٹھ کھڑے ہوئے گویا مشاعرے کے اختتام کا اعلان ہو گیا ہے حالانکہ ابھی حضرت رہبر سہاوری، اکمل مسرور، والی آسی شمیم تمرادی وغیرہ جیسے کہنہ مشق شعرائے کرام ابھی باقی ہیں۔ مشاعرہ کچھ دیر کیلئے روک دیا گیا ہے۔ جب سامعین کی آمد ورفت کا سلسلہ رک گیا تو مشاعرہ پھر شروع ہو گیا۔ اور بڑے احترام کے ساتھ حضرت رہبر سہاوری سے درخواست کی جا رہی ہے۔ رہبر سہاوری تحت میں متفرق اشعار سنا کر سامعین کو محظوظ فرما رہے ہیں۔ چند اشعار ایسے آپ بھی لطف اندوز ہوں جن میں آپ کو حالاتِ حاضرہ کی تصویر مزید دکھائی دے گی ۔

ایک ایسے قافلہ سالار کی ضرورت ہے
تمام عمر جو حالات کا غلام نہ ہو
اس دور کے مفلس کی پہچان بتاتا ہوں
بیمار نہیں لیکن بیمار سا لگتا ہے
کچھ اس ادا سے حسن کی پہلی کرن پڑے
دشمن کو بھی ادب کے سوا کچھ نہ بن پڑے
پڑتا ہے آنسوؤں میں کچھ ایسے کسی کا عکس
شبنم پہ جیسے صبح کی پہلی کرن پڑے

اب سامعین کی تعداد و شمار کا وہ عالم نہیں رہا۔ اہلِ ذوق اور قدر دانِ سخن ہی تشریف فرما ہیں جو سراپا سماعت بنے ہوئے ہر شاعر کا کلام پوری توجہ سے سن رہے ہیں اور اپنی قدر شناسی کا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ اب اکمل مسرور اکبر ماحول کے مطابق فرما رہے ہیں ۔

یہ وقت مجھ سے کوئی چال چلنے والا ہے
خبر نہیں تھی کہ موسم بدلنے والا ہے
برسے خدا مری آنکھوں کو دے تو تابانی
سحر قریب ہے سورج نکلنے والا ہے

اب لکھنؤ کے والی آسی کو دعوت دی جا رہی ہے والی آسی ہندوستان کے ان گنے چنے شعراء میں سے ہیں جو مشاعروں اور رسالوں میں یکساں طور پر مقبول و مشہور ہیں۔ ان کی شاعری میں آپ کو ہمالہ کا وقار، گنگا جمنا کی پاکیزگی، کشمیر کا حسن، صبحِ بنارس کی تازگی اور شامِ اودھ کی رنگینی نمایاں طور پر ملتے ہیں۔ چونکہ انہیں تاخیر سے دعوتِ غزل سرائی دی جا رہی ہے اس لیے وہ کچھ شگفتہ نہیں۔ بہر حال اپنی کاوشوں کا ماحصل پیش کر رہے ہیں اور داد حاصل کر رہے ہیں۔ چند شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ۔

ہم نے اک شام چراغوں سے سجا رکھی ہے
شرط لوگوں نے ہواؤں سے لگا رکھی ہے
ہم بھی انجام کی پرواہ کہاں کرتے ہیں
جان ہم نے بھی ہتھیلی پہ اٹھا رکھی ہے
شاید آجائے کوئی ہم سے زیادہ پیاسا
بس یہی سوچ کے تھوڑی سی بچا رکھی ہے

والی آسی کامیاب لوٹ رہے ہیں اور اب شمیم تمرادی کو آواز دی جا رہی ہے۔ شمیم تمرادی ترنم کی بجائے تحت میں اپنا کلام سنا رہے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی وقت کی ناخوش گواری سے نالاں ہیں۔ تاہم ان کے حصے میں بھی کچھ داد و تحسین آئی ہے چند شعر ان کے بھی ملاحظہ فرمائیں ۔

تنکے بھی پھنک رہے ہیں شگوفے بھی جل رہے ہیں
اس دور کے گلستاں شعلے اگل رہے ہیں
اے کاروانِ الفت اللہ ترا محافظ
جن پر نہیں بھروسہ وہ ساتھ چل رہے ہیں
گلشن میں تھیں بہاریں لیکن شمیم ہم تو
پھولوں کی آرزو میں کانٹوں پہ چل چکے ہیں

یہ جوہر اٹاوی تشریف لا کر اپنا کلام سنا رہے ہیں اور کامیاب بھی ہیں۔ دو شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ۔

بجلیاں شہرِ دل پہ گرا لیجئے — صرف احساس کا گھر بچا لیجئے
آیئے تو ذرا طورِ دل کی طرف — سرخ شعلوں سے گھونگھٹ اٹھا لیجئے

اب مشاعرے کے آخر میں راقم الحروف کو موقع دیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر ملک زادہ منظور صاحب نے جو کلمات

خاکسار کے تعارف میں ادا کیے ہیں خاکسار ان کا اہل نہیں ہے ۔ یہ سب ان کی حوصلہ افزائی ہے — ہر چند کہ ماحول نہیں تھا کہ مشاعرہ اٹھایا جائے لیکن چونکہ نقیب مشاعرہ نے یہ کہہ کر خاکسار کو آواز دی ہے کہ اب مشاعرہ کا مقطع باقی رہ گیا ہے ۔ لہٰذا حاضر ہوں اور حکم کی تعمیل کر رہا ہوں ۔

آنے والی خوشیوں کے روز و شب سنہرے ہیں
کیا ہوا اگر دل پر آج غم کے پہرے ہیں
کس کو مہرباں کہیے کس کو جانئے قاتل ؟
شہر میں یہاں سب کے ایک جیسے چہرے ہیں
آپ اپنے خنجر کی نوک پر نظر رکھئے
یہ تو چارہ گر جانے زخم کتنے گہرے ہیں
ہر کوئی گمن اپنی بتکدے میں اے انجم
رہزنوں کی بستی میں قافلے بھی ٹھہرے ہیں

مشاعرہ پہلے ہی دور پر ختم کر دینا مناسب ہوتا ۔ دوسرا دور شعرا کو برداشت کرنے کی توانائی کھو چکا تھا اس لیے اختتام کا اعلان کرنا پڑا — فیروز آباد ایک تاریخی مقام ہونے کی حیثیت سے مشاعرے کو کامیاب ہونا تھا ہوا ۔ اراکین مشاعرہ کی خدمت میں تحفۂ خلوص پیش کرتے ہوئے مبارکباد پیش کرتا ہوں ۔

بہت جی خوش ہوا آپ سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

●●

ہماری قومی یکجہتی کی تعمیر میں اردو کا حصہ

توصیف علوی عاصی کیرانوی

[illegible]

اردو زبان نے جہاں ہمارے تہذیب وتمدن وعلم وفن کے نکھارنے اور سنوارنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے وہاں قومی یکجہتی کی تعمیر وترقی میں بھی اس کا ایک بڑا اور ناقابل فراموش حصہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہماری قومی یکجہتی اور ہم آہنگی کے تمام تر نقشے کے بنیادی خطوط اور نقوش کی اساس ہی اردو زبان ہے اور دوسرے معنوں میں ہماری قومی یکجہتی اور اردو زبان کی تاریخ اور داستان ایک ہی تصویر کے دو رخ اور ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔

اس حقیقت کو سمجھنے اور پرکھنے کیلیے اور قومی یکجہتی کے آئینہ میں اردو کا صحیح مقام دیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ تاریخ کا وسیع النظری کے ساتھ مطالعہ کیا جائے اور ہماری قومی یکجہتی کے بنیادی خطوط اور اس کی صحیح حدود کی نشاندہی کی جائے چنانچہ اگر ہم قومی یکجہتی تصورات کے ابھرنے اور نکھرنے کا پورا پورا جائزہ لیں اور اس کے ساتھ اردو کے پیدائشی محرکات پر نظر ڈالیں اور اس کی تعمیر وترقی کی منزلوں کو دیکھیں اور اردو کے معماروں اور قلمکاروں کی خدمات اور تخلیقی کاوشات کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت خود بخود واضح ہوجاتی ہے کہ اردو زبان ہماری قومی یکجہتی کی ایک مکمل تاریخ اور ہماری فکری اور ذہنی ہم آہنگی کا صحیح معنوں میں ایک خاکہ اور پرتو ہے۔

قومی یکجہتی کے خطوط اور نقوش کے جائزہ کے سلسلہ میں یہ بھی ضروری ہے کہ ہندوستان جیسے عظیم اور خطہ سرزمین کی جغرافیائی، تاریخی اور سماجی صورت حال بھی مدنظر رکھی جائے اس لیے کہ ہندوستان دنیا کا وہ اہم ترین اور وسیع ملک ہے جو مختلف مذاہب گہوارہ اور مختلف حلقہ ہائے فکر کا سرچشمہ ہے۔ جہاں الگ الگ عقائد کے حامل ایک ساتھ رہتے اور بستے ہیں۔ ایک حق میں ہندوستان ایک ایسی چھوٹی سی دنیا ہے جو بہت سی تہذیبوں بولیوں اور زبانوں کا سنگم کہا جا سکتا ہے اس لیے یہاں قومی یکجہتی کے تصورات اور محرکات بھی بالکل کچھ امتیازی اور انفرادی علامات اور نشانات کے حامل ہیں چنانچہ ہماری قومی یکجہتی کوئی ایسا بحرِ قلزم نہیں ہو سکتی جہاں مختلف دھارے ملکر اور انفرادیت اور امتیازیات کو کھو کر یک رنگ اور ہم آہنگ ہو جائیں اور نہ ہی ہماری قومی یکجہتی کے تصورات کسی ایسی کان نمک "کے تصور کو شامل کیا جا سکتا ہے جس کے متعلق کہا جائے کہ "ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد" بلکہ حقیقت میں ہماری قومی یکجہتی ایک ایسا حسین ورنگین گلشن ہے جس میں مختلف قسم کے پھول مل کر اپنی اپنی وضع قطع اور اپنے اپنے رنگ وبو کے ساتھ پورے چمن اور گلشن تمام تر فضائے چمن کو ایک خاص قسم کی یکرنگی اور ہم آہنگی دیتے ہیں دوسرے الفاظ میں ہماری قومی یگانگت اور یکجہتی ایک ایسی ہی "قوس قزح" ہے جس میں مختلف قسم کے رنگ "انیک" ہوکر بھی "ایک" نظر آتے ہیں اور ایک خاص ہم آہنگی اور یکرنگی کی عکاسی کرتے ہیں قومی یکجہتی کے انھیں خطوط اور تصورات کے ساتھ جب اردو کی پیدائش، اس کی لسانی ہیئت

اس تعمیر و ترقی پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ بالکل ہماری قومی یکجہتی کے ہم رنگ اور ہم آہنگ نظر آتے ہیں

تاریخ شاہد ہے کہ ہماری قومیت کی بنیاد تاریخی اعتبار سے ایک متحد اور منضبط ہندوستان کے تصور کے ساتھ منسلک ہے جس کا سہرا سب سے پہلے سیاسی نقطۂ نظر سے ایک حد تک اکبر اعظم کے دور کو جاتا ہے جبکہ پورے ہندوستان کی مختلف اکائیوں کو ایک رشتہ اور دھاگے میں پرونے کا تصور کے ہم آہنگ اور مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ اسی خیال نے دین الٰہی کو جنم دیا جو دراصل سیکولرازم کا ایک پرتو تھا اور اسی طرح مختلف فرقوں اور حلقوں کو قومی اور ملکی یکجہتی کا ایک تصور دینا تھا اور اپنے دربار کو اس کا ایک مرکز اور مظہر بنانا تھا۔ اس سلسلہ میں اگر ذرا اور تحقیقی نظر سے کام لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ قومی یکجہتی کا تصور اس انسانی اور عوامی یکجہتی کا ایک عکس اور پرتو ہے جو اکبر کے دور سے پہلے ہمارے صوفی سنتوں اور درویشوں کی تعلیمات اور اپدیشوں سے جنم پا چکا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ قومی یکجہتی اور انسانی یگانگت کا یہ تصور ہی اردو زبان کی پیدائش کے محرکات اور ضرورت کی اساس ہے۔

ظاہر ہے کہ صوفی سنتوں اور درویشوں کے حلقوں میں کسی ایک مذہب، فرقہ اور علاقہ کے لوگ نہیں ہوتے تھے بلکہ اُنکا تعلق مختلف مذاہب، عقائد اور افکار سے ہوتا تھا جنکی زبان، بولیاں اور اظہار خیال کا انداز بھی مختلف اور جداگانہ ہوتا تھا۔ چنانچہ ضرورت پڑی کہ ایک ایسی زبان کو جنم دیا جائے جو سبھی حلقوں، گوشوں اور فرقوں کی ترجمانی کر سکے اور جس میں مختلف زبانوں کے الفاظ ترکیبیں اور حروف رابطہ شامل ہوں۔ دوسری طرف سیاسی میدان میں چونکہ فوج اور لشکر کے حلقے وسیع اور ہمہ گیر ہوتے جا رہے تھے اور وہ بھی مختلف مذاہب اور حلقوں سے ترتیب پاتے تھے۔ اس لیے فطری طور سے انھیں بھی باہمی ربط اور اختلاط و ارتباط ایک ایسی زبان پیچھے سے نکھرنے لگی جو سبھی فوجی اور لشکری اکائیوں کی زبانوں اور بولیوں کا خلاصہ اور امتزاج تھا۔ اور اسی طرح جب سیاسی میدان کے ساتھ رسل و رسائل اور تجارت کا دائرہ وسیع ہوا تو مختلف تجارتی میدانوں اور بازاروں میں بھی یہی صورت حال سامنے آئی اور ان ہی سب قومی یکجہتی کے تصورات اور سیاسی اور سماجی یگانگت کے محرکات نے جس زبان کو جنم دیا وہ ہی پہلے ریختہ اور آخر میں اردو کہلائی

اس پس منظر میں جب ہم اردو زبان کی ماہیت لسانیت قواعد تراکیب علم البیان اور شعر و سخن کے قواعد و ضوابط کو دیکھتے اور ان کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ حقیقت بالکل ظاہر اور واضح ہو جاتی ہے کہ واقعی اردو وہ زبان ہے جو بہت سی زبانوں کا خلاصہ اور متعدد بولیوں کا امتزاج ہے اس میں ایک طرف اگر الفاظ، تراکیب عربی، فارسی ترکی سنسکرت اور انگریزی کی ہیں تو دوسری طرف افعال اور حروف رابطہ ہندی اور کھڑی بولی کے ملتے ہیں قواعد اور گرامر اگر عربی سے ماخوذ ہے تو "رسم الخط" فارسی کا ہے شعر و فن اور شاعری پر اگر فارسی کا سایہ اور پرتو ہے تو اصناف سخن اور اوزان کا ماخذ عربی ہے اسی طرح گیتوں، نغموں اور نظموں پر ہندی اور کھڑی بولی کی مہر اور رنگ ہے۔ غرضکہ اردو زبان کے تمام تر لسانی پہلوؤں اور اجزاء ترکیبی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ زبان مختلف فرقوں حلقوں اور طبقوں کی فکری یکجہتی کی ترجمان اور مختلف مذاہب، عقائد اور معاشروں کی یگانگت کی آئینہ دار ہے اور ایسے برصغیر کے مختلف علاقوں اور گوشوں کو ایک ہی رشتہ اور سوتر میں منسلک کرنے والا ایک اہم رابطہ اور واسطہ ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اردو کا کسی بھی دوسری زبان اور بھاشا سے کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ یہ تو سبھی زبانوں کا ایک گہوارہ اور سنگم ہے اور ہماری قومی یکجہتی کی اساس ہے۔

اردو زبان کے اس لسانی اور ماہیتی مطالعے کے بعد اگر اس کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت اور واضح انداز میں سامنے آتی ہے کہ اردو ہماری قومی ایکتا اور باہمی یگانگت کی

کی اساس ہے جس کی ایک مسلسل اور مکمل داستان ہے یہ وہ چمن ہے جس کی آبیاری میں بلا لحاظ مذہب و ملت اور بلا امتیاز علاقائی اور لسانی حدود سبھی کا خون پسینہ شامل ہے کیا صوفی سنت کیا اولیائے کرام کیا شاعر کیا ادیب سبھی نے اس گلشن کو سنوارا اور نکھارا ہے حضرت خواجہ نظام الدین، گیسو دراز، دہلی کے حضرت امیر خسرو، پنجاب کے بابا گرو نانک اور اتر پردیش کے کبیر وغیرہ درویش اور صوفی سنت ہی ہیں جن کے پند و نصائح، شاعرانہ ملفوظات زبان میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہی ہماری قومی یکجہتی اور ہم آہنگی کے بنیادی نقوش ہیں۔

اس کے علاوہ جہاں تک اردو شاعری اور ادبیات کا تعلق ہے تو اس میں بھی صحیح معنوں میں ہماری قومی یگانگت اور باہمی یکرنگی کا ایک طویل اور وسیع سلسلہ موجود ہے کشمیر سے کنیا کماری تک اور گجرات سے آسام تک ہندو، مسلمان، سکھ عیسائی سبھی نے اپنے اپنے خون دل سے اس چمن زار کو سینچا اور اپنے اپنے فکر و فن کے گل بوٹوں سے اسے رنگین اور دلکش بنایا ہے۔ اگر ایک طرف اس صحن گلشن کی آبیاری میں مسلمانوں کی ایک لمبی فہرست ہے تو دوسری طرف ہندو شعراء کا سلسلہ بھی اس کے دوش بدوش ہے اس کے ساتھ سکھ اور عیسائی بھی اردو کے علمبرداروں اور پرستاروں میں کچھ کم نہیں ہیں اردو ادب میں بے شمار تذکرے اور شعری مجموعے اس کے شاہد ہیں۔

اردو شاعری اور شعر و سخن کی تاریخ کے ہر دور اور ہر عہد کو دیکھئے، ہر گوشہ اور ہر علاقہ پر نظر ڈالیے اگر ولی دکنی، وجدی اور ملا وجہی وغیرہ دکن کی نمائندگی کرتے ہیں تو حضرت امیر خسرو اردو شاعری کے بابائے آدم، میر تقی میر سودا غالب ذوق وغیرہ کی ایک طویل فہرست دہلی کے آسمان پر چمکنے والے ستاروں کی ہے اسی طرح اگر انیس دبیر آتش ناسخ اور چکبست وغیرہ لکھنؤ کی شعری دنیا کے سربراہوں میں ہیں تو علامہ اقبال، حالی، جوش، فراق اور جگر ہندوستان کے ہر دور سے گوشے سے ابھرنے والے آفتاب و ماہتاب ہیں اس علاقائی امتیاز کے علاوہ اگر مذہب و ملت کی حیثیت سے دیکھا جائے تو اردو شاعری میں اور بھی یکجہتی اور ہم آہنگی ملتی ہے، اگر میر، غالب، حالی اور اقبال وغیرہ کا مسلمان قوم سے ملنا ہے تو پنڈت دیا شنکر نسیم، پنڈت برج نرائن چکبست، کیفی اور فراق وغیرہ کا تعلق دیگر سے ہے اور یہ بھی اردو کے وہ پرستار اور علمبردار ہیں جنہوں نے بلا لحاظ مذہب و ملت اردو کے دامن کو اپنے فن پاروں سے مالا مال کیا اور قومی یکجہتی کے شہپارے تراشے اور نغمے الاپے ہیں۔

ایسے تو اردو شعر و فن کی دنیا کا ہر شاعر ہماری قومی یکجہتی کے قصر و ایوان کا معمار اور تخلیق کار ہے جس نے اپنے اپنے انداز سے اس کی تعمیر و تشکیل میں حصہ لیا اور اپنے اپنے فنی شہپاروں سے اسے سنوارا اور سجایا ہے مگر اردو دنیا کے کچھ ایسے خاص مینارے ہیں جن کے فکر و فن کی تابناک کرنوں سے ہمارے علم و ادب کی شاہ راہ ہمیشہ مضبوط ہوتی رہیں گی اور قومی یکجہتی اور ہم آہنگی کو جلا ملتی رہے گی۔ انہیں بابائے اردو حضرت امیر خسرو کا نام سرفہرست ہے جنہوں نے ایک ایسی ملی جلی گنگا زبان کی بنیاد ڈالی جو اردو زبان کا "سنگ میل" اور قومی ایکتا کی "اساس" ہے اور ساتھ ہی اپنے عام فہم گیتوں سے قومی یکجہتی اور ذہنی اور فکری یگانگت کے بنیادی تصور کو جنم دیا اس شاہ راہ کو ہموار و استوار کیا اور قومیت کی روح کو بیدار کرتے ہیں جن شعراء کا خاص کردار ہے۔ انہیں انسانی اور فکری ہم آہنگی کے تقاضا کے پیش نظر ان میں خاص طور سے غالب قابل ذکر ہیں "ترک رسوم" اور مختلف ملتوں کے مٹنے نقوش کے کو اجزائے ایمان تصور کرتے ہیں اور آدمی کو نہج میں وہ ان تیغوں کی تلقین کرتے ہیں جو قومی ایکتا اور یکجہتی کا ایک بنیادی عکس سے کہتے ہیں ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

درد دل پاس وفا جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

بعد ازاں اردو شاعری کے میدان میں غالب کے خاص تلمیذ رشید مولانا حالی کا قومی یکجہتی اور یگانگت کے تصور کو اس کے اصلی رنگ و روپ اور خد و خال کے ساتھ سربلند کرنے میں نمایاں مقام ہے انھوں نے مختلف انداز سے اس جذبہ کو ابھارا یا نکھارا ہے —

قوم سے جان تک عزیز نہ ہو
قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو

ہے جنوں خیز یہ ہنگامۂ عبرت کیا
قوم کا حال ہے غفلت کی بدولت کیا

اس سلسلہ میں

پنڈت برج نرائن چکبست ہمارے قومی شعراء میں بہت ہی بلند اور خاص مقام کے حامل ہیں انھوں نے قوم میں آزادی کو بیدار کرنے اور ایکتا اور یکجہتی کی روح کو پھونکنے میں جو کردار ادا کیا اس سے اردو شاعری کا سر ہمیشہ ہی بلند رہیگا۔ ان کی بے شمار نظمیں اس کی آئینہ دار ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

اے صور حبِ قومی اس قوم کو جگا دے
* بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے

نفاق گبر و مسلماں کا یوں مٹا آخر
* یہ بت کو بھول گئے وہ خدا کو بھول گئے

اذاں [illegible] بت خانہ میں [illegible]
* حرم میں نعرۂ ناقوس ہم ایجاد کرتے ہیں

رہا مزاج میں سودائے قوم خو ہو کر
* وطن کا عشق رہا دل کی آرزو ہو کر

اس کے بعد [illegible] میں علامہ اقبال کا [illegible] آپ ہی ہیں انھوں نے قومی تصورات کو ابھارنے اور یگانگت کے جذبات کو بیدار کرنے میں جو کام کیا اور جو پیغام دیا وہ ہمیشہ دنیائے اردو شعر و فن کا ایک بیش قیمت سرمایہ رہیگا حقیقت یہ ہے کہ انکے تمام تر کلام کا موضوع قوم کی بیداری اور اس میں یکجہتی اور ہم آہنگی کا شعور پیدا کرنا ہے۔ انکا پیغام ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

●

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

شاعری کے فن پاروں اور شاہکاروں کے علاوہ اگر اردو نثر اور ادب کے دوسرے پہلوؤں کو دیکھا جائے تو اس میدان میں بھی قومی یکجہتی اور باہمی یگانگت کے بے شمار علمبردار اور قلمکار ملتے ہیں جن سب کا احاطہ ناممکن البتہ کچھ نمایاں اور سربرآوردہ شخصیتوں کا ذکر ضروری ہے ان میں سر سید [illegible] سالار کارواں ہیں جنھوں نے [illegible] کے سانحے کے بعد قوم میں پھیلنے والے انتشار اور مایوسی [illegible] لوگوں میں ہمت [illegible] کرنے والا [illegible] کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اپنے [illegible] تہذیب الاخلاق [illegible] قوم میں زندہ دلی اور یکجہتی کی ایک نئی روح پھونکی [illegible] کے علاوہ مولانا شبلی، ڈاکٹر نذیر احمد، مولانا حالی اور [illegible]

[illegible] بہت سے وہ اہلِ قلم ہیں جنھوں
اپنی اپنی تحریروں اور سادگی کا وشوں سے اردو ادب
ن قومی یکجہتی اور ذہنی ہم رنگی کے مشن کو بڑھایا اور اس
تعمیر میں بھرپور کردار ادا کیا۔
بہرحال اردو زبان کی پیدائش اور اساس،
ا کی [illegible] اور مسلسل تاریخ اس کے شاعر اور ادیب،
مکار اور تخلیق کار یعنی اردو زبان کی ایک پوری دنیا
درحقیقت قومی یکجہتی، ہم آہنگی اور باہمی یگانگت کی
صحیح معنوں میں آئینہ دار اور علمبردار ہے اور ہم بجا طور
سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ قومی یکجہتی کی تعمیر و ترقی میں اردو زبان
نہایت ہی نمایاں اور ناقابلِ فراموش کردار ادا کر رہی ہے

●●

سرِ مغفرت

اگر آپ عرفان و آگہی کی تلاش میں سرگرداں ہیں
روحانیت کے دلدادہ ہیں کیف و مستی کے رسیا ہیں طالب حقیقت
ہیں تو مقدس گیتا کا وہ منظوم ترجمہ پڑھئے جو ابوالبلاغت پنڈت رتن
ناتھ سرشار کی گوناگوں بوقلمونی کا مظہر اور دنیائے ادب میں اپنی عظمت
و مقام کا ضامن ہے۔ گیتا حیاتِ انسانی کے ہر شعبہ کی ترجمان ہندو
فلسفہ کی جان اور ہندوؤں کا سرمایۂ ایمان ہے
سہل اور شگفتہ اسلوبِ نگارش سبک نرم و شیریں الفاظ جو
طبع لطیف پر قطعاً گراں بار نہیں ہوتے۔ پنڈت رتن پنڈوری
کی یہ گراں مایہ کاوش اہلِ علم و دانش کو دعوتِ فکر دیتی
ہے اور یقیناً اس کی انفرادیت و عظمت کا اندازہ آپ مطالعہ
کے بعد ہی کر سکتے ہیں ہمارا دعویٰ ہے کہ مقدس گیتا کا ایسا ترجمہ اردو
زبان میں آج تک شائع نہیں ہوا۔ ۱۲/ روپئے

دفتر شانِ ہند فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ
دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

جب دل بہت اداس ہو جائے اور عام طور پر معاشرے میں
کبھی لطف باقی نہ رہے تو زندگی ترشی کی بات کرنا لازمی ہو جاتا
ہے۔ جی ہاں غمِ روزگار سے نجات کو بھلانے کیلئے دنیائے رنگ و بو کی
لطافت کا مشاہدہ کیول بصیری آنکھوں سے کیجئے اور پڑھئے۔

بکھری ہوئی زندگی

حسن و عشق سے لبریز رومان پرور فضاؤں میں جنم لینے
والی کہانیاں انسانی محبت کی کبھی نہ ختم ہونے والی داستان
جذبات کی لطیف گدگداہٹ ہمیں یقین ہے کہ مناظرِ قدرت
کی رنگینی آپ کا دل موہ لے گی اور آپ یہ محسوس کرنے لگیں
گے کہ واقعی زندگی کتنی بکھری ہوئی ہے لیکن یہ بکھراؤ خزاں رسیدہ
پتوں کی مانند کسی گہرے سناٹے موت کی سی ویرانی اور ہُو کا عالم
طاری نہیں کرتا گھبرایئے نہیں ماحول کی اداسی، خاموشی آپ
کو مغموم اور مضمحل کرے گی بلکہ زندگی کا یہ انتشار دلالت
کرتا ہے اس شام کی پُر رونق تقریب پر جہاں انجانا موجود
ہے۔ جو شرمانی ہے تو عارضوں کے گلاب کھل اٹھتے ہیں۔
عمدہ کتابت و طباعت، رنگین سرورق سے مزین
مجلد کتاب۔ قیمت تیس روپے محصول ڈاک معاف

پتہ

دفتر شانِ ہند فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

چندن بھارتی

ٹونک راجستھان میں جناب چندن بھارتی کا وجود مبارک ہے جو
ٹونک کی یادگار "چہار بیتی" کو زندہ رکھے ہوئے ہیں حال ہی میں
چندن صاحب کا مجموعہ چاربیت گلزارِ چندن شائع ہوا ہے پہلی فرصت
میں منگا کر شاعری کی اس صنف کا بہترین نمونہ ملاحظہ فرمائیں

قیمت:- چھ روپئے

دفتر شانِ ہند انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بگڑی گھڑی

انتظار حسین

سامنے والی دوکان سے رحیم جو اس بحث پر مستقل کان
لگائے ہوئے تھا۔ موتی چور کے لڈو گوندھتے گوندھتے اونچی
آواز سے بولا "ابو نجومی تیرا علم کیا کہوے ہے"

مگر منحنی سینک سلائی ابو نجومی نے کچھ دیر سے اکڑوں
بیٹھا سلیٹ پر خانے بنائے اور مٹائے جا رہا تھا ہاتھ کو روکا
آنکھیں بند کر لیں، پھر آنکھیں کھولیں۔ اور اسی طرح گھٹنوں میں
سر دیتے سلیٹ پر نظریں جمائے بولا: "عطارد و مشتری و قمر و زہرہ
کو شبھ گرہ کہتے ہیں اور آفتاب و مریخ و ذنب جن کو پاپ گرہ
کہتے ہیں اور راس زحل کہ بعض حالت میں سعد یعنی نیک اور
بعض حالت میں نحس یعنی مکروہ ہوتے ہیں اور جب خانۂ میزان
میں آفتاب اور خانۂ جدی میں مشتری اور خانۂ سنبلہ میں زہرہ
اور خانۂ حمل میں زحل اور خانۂ قوس میں راس ہو تو نحوس
ہے۔ پاکستان کا ستارہ مریخ ہے کہ بلند اقبال ہے۔ پر شبہ
نہیں، جاننا چاہیے کہ اس ساعت وہ خانۂ سرطان میں
ہے، پس اگر خانۂ سرطان سے ساعت ختم ہونے سے پہلے نکل
گیا تو بھلا ہے۔ اور اگر دوسری ساعت لگ گئی تو اندوہناکی
ہے، گمان ہے، جان کا زیاں ہے۔"

ابو نجومی چپ ہو گیا، آنکھیں بند کر لیں۔ حاجی تراب علی
سہم گئے تھے اور ماسٹر نیاز سیاہ رنگ میگنیفائر آنکھ سے
لگائے ڈھکن کھلی گھڑی کے بند پرزوں کو یکسوئی سے دیکھ
رہے تھے۔ میں نے میز پہ پڑی ہوئی کتاب کھولی تھی اور
اس کے ایک صفحہ پر نظریں جمائی تھیں۔ سامنے کی دیوار
پر جو تین دن سے شام کو دوپہر کا اور دوپہر کو صبح کا
وقت بتا رہی تھی۔ یکایک حرکت میں آئی اور ٹن ٹن نو بجا ڈالے
رحیم اونچی آواز میں بولا: "حاجی صاحب، ابو نجومی کا تو
اپنا علم ہے۔ میں تو کوئی علم والا نہیں پر میں نے جوتی اچھال
کے بتا دیا تھا کہ ہندوستان پاکستان میں لڑائی ہوگی۔ اور یہ تو
ابھی کی بات ہے، پوچھ لو ابو نجومی سے۔ اس کے سامنے میں نے
جوتی اچھالی تھی۔ جوتی چت گری۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ لو
بھیا لیگ چت ہو گئی۔"

حاجی تراب علی ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے افسردگی کے
لہجہ میں بولے "میاں کوئی چت نہیں ہوا۔ چت تو پاکستان ہوا
ہے" چپ ہو گئے، کچھ سوچنے لگے، پھر بولے "مولوی اکبر علی
اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے نجومی وجومی تو
تھے نہیں، نہ عامل تھے۔ ہاں عبادت گزار بہت تھے۔ ان کی
کہی ہوئی ایک ایک بات پوری ہو رہی ہے۔ میں نے ایک مرتبہ
سوال کیا کہ مولوی صاحب مجھے حج بھی نصیب ہوگا۔ فرمایا کہ
جو قدم جہاں سے اٹھیں گے وہاں واپس نہیں آئیں گے
چنانچہ ایسا ہی ہوا حج سے ہمارے واپس ہوتے ہوتے
سارا قبیلہ یہاں پہنچ چکا تھا۔ پاکستان کے بارے میں میں
نے ان سے سوال کیا تو چپ سے ہو گئے، پھر فرمانے لگے کہ
جو چیز بہت ہے تھوڑی رہ جائے گی۔ جو چیز تھوڑی ہے بہت
ہو جائے گی۔ اس وقت تو نہیں مگر اب یہ بات سمجھ میں آ رہی
ہے۔ گیہوں یہاں کتنا ہوتا تھا۔ مگر اب .... اب دیکھ لو۔ اور اب
تھوڑی کے بہت ہونے کی بات تو بھائی تو ایک بے پردگی
کو ہی لے لو۔ ہمارے زمانے میں بس خان صاحب والے تھے
جن کی لڑکی نے پردہ چھوڑ دیا تھا۔ اب جسے دیکھو بے پردہ"

ماسٹر نیاز نے خاموشی سے پیچھے والی شیشے کی الماری
کھول دوسری گھڑی نکالی، ڈھکن کھولا کہ اس کے کھلتے ہی ننھے
نازک پرزوں کا تیز باریک شور ہونے لگا، پھر اسے بند کیا اور

کھائی۔ کان کھجایا۔ پھر اسے حاجی تراب علی کو دکھاتے ہوئے بولے: "حاجی صاحب میں تو یہ جانتا ہوں کہ یہ گھڑی ہے میرے پاس درستی کے لیے آئی ہے۔ اگر میں یہ کام جانتا ہوں اور ایماندار ہوں تو گھڑی درست کر دوں گا۔ اگر نہیں..... تو پھر میرے ہاتھ میں آکر یہ گھڑی اور بگڑ جائے گی یہ ہے موٹی بات، باقی رہا آپ کا نجوم، آپ کے عالموں کی باتیں تو میں جانتا نہیں۔"

رحیم چلا کر بولا: "ابو نجومی سنتا ہے، ماسٹر صاحب تیرے علم کو نہیں مانتے"

ابو نجومی نے اک وقار سے گھٹنوں سے سر اٹھایا اور ویران آنکھوں سے ماسٹر نیاز کو گھورتے ہوئے بولا: "ماسٹر ہم اندھے خدا ہیں۔ بس ہم نے کہہ دیا"

ماسٹر نیاز نے جواب میں پھر میگنیفائنگ گلاس آنکھ سے چپکا لیا اور گھڑی کا ڈھکن کھول کر پرزے دیکھنے لگا۔

ابو نجومی ماسٹر نیاز کو بدستور گھورے جا رہا تھا۔ "ماسٹر یہ اندھا علم ہے۔ ہم اندھے خدا ہیں۔ اب سوچو چاند یہاں سے کتنی دور ہے......"

ماسٹر نیاز نے گھڑی کے پرزوں کو دیکھتے دیکھتے بات کاٹی: "اب زیادہ دور نہیں رہا"

ابو نجومی نے ماسٹر نیاز کی بات سنی ان سنی کی، اور پھر کہنا شروع کیا: "چاند یہاں سے کوسوں دور ہے۔ مگر ہم یہاں بیٹھے بیٹھے بتا سکتے ہیں کہ چاند گرہن کب پڑے گا۔ تو جب چاند گرہن کا وقت بتایا جا سکتا ہے تو آدمی کہ زمین پہ چلتا پھرتا ہے اور خاک کا پتلا ہے اور بھول چوک سے بنا ہے، اس کی باتوں کا کیا پتہ نہیں چلایا جا سکتا۔ اور جانتے ہو ماسٹر ہمارے پاس حضرت آدم کی جنم پتری بنی رکھی ہے تو حضرت آدم کی جنم پتری بن سکتی ہے۔ تو پھر کون سا آدم ہے کہ اس کی جنم پتری تیار نہیں ہو سکتی"

حاجی تراب علی نے داڑھی پہ ہاتھ پھیرا، پھریری لی: "اللہ اکبر" اور چپ ہو گئے۔ ماسٹر نیاز نے آنکھ سے میگنیفائنگ گلاس ہٹایا اور گھڑی کو میز کی دراز میں احتیاط سے رکھتے ہوئے بولے: "ابو نجومی تمہارا علم عہد قدیم کی یادگار ہے۔ سائنس بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ اب ستارے انسان کی قسمت کے مختار نہیں رہے۔ انسان ستاروں کی قسمت کا مختار نہیں ہوگا"

سینک سلائی ابو نجومی کی گھورتی ہوئی ویران آنکھوں میں جو خفت کی کیفیت پیدا ہوئی تھی غائب ہو گئی اور کسی کرب سوچ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی کہ اس نے ان ویران آنکھوں کو اور ویران بنا دیا۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے انکار میں سر ہلایا۔ اور کسی قدر افسردہ لہجہ میں بولا: "ماسٹر جاندار کی اپنی چال ہوتی ہے۔ اس میں آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔۔ آدمی بہت مجبور ہے۔ کچھ نہیں کر سکتا وہ"

ابو نجومی نے آنکھیں بند کر لیں اور گھٹنوں میں سر دے ساری گفتگو سے بے تعلق اور بے نیاز ہو گیا۔

حاجی تراب علی اپنی کھچڑی داڑھی پہ ہاتھ پھیرتے پھیرتے خیالات میں کھو سے گئے۔ پھر جھرجھری کے ساتھ اللہ اکبر کہہ تامل کیا۔ پھر ماسٹر نیاز سے مخاطب ہوتے: "نیاز صاحب آپ کی سائنس نے آپ کہتے ہیں بہت ترقی کر لی ہے۔ مگر کسی سائنسدان نے آج تک چاند کو دو ٹکڑے کر کے دکھایا ہے؟"

ماسٹر نیاز نے حاجی تراب علی کو دیکھا اور جواب میں سامنے رکھی ہوئی ٹائم پیس کو اٹھایا اور چابی گھما شروع کر دی۔

حاجی تراب علی نے جھرجھری لی: "اللہ اکبر کیا شان قمر کی طرف انگلی اٹھائی شق ہو گیا۔ سورج کی طرف اشارہ کیا، ٹھٹھک گیا۔ کنکریوں کو اٹھایا، کلمہ پڑھنے لگیں ا وحوش وطیور......" حاجی تراب علی کی آنکھوں میں خواب سا تیرنے لگا۔ چہرے کے خطوط میں نرمی آگئی ا لہجہ دھیما ہو گیا: "صاحب کیا منظر ہوتا ہے روضہ پاک پر، کبوتروں پہ ٹکریاں جلتی ہیں جیسے بادل گھر کے آ ہوں۔ مدینہ پاک کی چھتوں پہ چھاؤں پھیل جاتی ہے ا گلیوں میں پروا چلنے لگتی ہے۔ دن بھر گنبد پاک پہ

سمجھتے ہیں۔ کیا مجال کہ ایک بھی غلط آئے...... اللہ اللہ پڑھ سے تو احترام کریں اور ہم انسان کلمہ تو کہیں کہ سبحان اللہ...... حاجی تراب علی کی زبان رک گئی۔ جسم میں ایک تھرتھری دوڑی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

ماسٹر نیاز نے آہستہ سے ٹائم پیس کا ڈھکن کھولا اور پہلے آنکھوں کے قریب لا کر دیکھا۔ پھر کان کے برابر کر لیا۔ کیسا ہی پیچیدہ مسئلہ ہو ماسٹر نیاز اپنے کام کے تسلسل میں فرق نہیں پڑنے دیتے۔ ان کی دوکان میں چاروں طرف گھڑیاں ہی گھڑیاں دکھائی دیتی ہیں۔ پھر بھی یہاں بیٹھ کر وقت سے آگاہ رہنا سخت مشکل ہے کہ چھوٹی بڑی گھڑیوں میں ہر گھڑی ایک سے بارہ تک سب بجتے نظر آتے ہیں۔ ماسٹر نیاز کی دوکان میں ہر وقت اوقات کا بلوہ رہتا ہے۔

برابر میں سڑک کے کنارے ابو نجومی اپنی میلی دری بچھائے، ٹوٹی سی ایک صندوقچی سامنے دھرے، صندوقچی کے آس پاس گتے کے ٹکڑے سجائے کہ کسی پہ پنجہ بنا ہے۔ کسی پہ نقشِ روحانی۔ کسی پہ ہدایات و عملیات، سرخ نیلے پیلے کاغذوں والی کسی پھٹی پرانی کتاب پہ نظریں جمائے بیٹھا رہتا ہے۔ آسمان کے ستاروں کو گھڑی کی سوئیاں سمجھتا ہے اور سلیٹ پر چاک سے نقش بناتا ہے کہ کس شخص کی قسمت کی گھڑی کس گھڑی کیا بجائے گی۔

دوسرے دن میں گھر سے سویرے نکلا۔ حاجی تراب علی ابھی تشریف نہیں لائے تھے۔ ماسٹر نیاز دوکان اکیلی چھوڑ کر جانے کہاں چلے گئے تھے۔ ماسٹر نیاز دکان سے نہ ہلیں تو سارا دن نہ ہلیں۔ اٹھتے ہیں تو گھنٹوں خالی پڑی رہتی ہے۔

میں نے کرسی دروازے کے قریب گھسیٹی اور بیٹھ گیا۔ ابو نجومی اپنے ایک دیہاتی گاہک سے لگا ہوا تھا دوکاندار اور گاہک دونوں گم تھے، ایک مراقبہ میں اور دوسرا دھڑکے میں۔ پھر ابو نجومی نے اچانک بولنا شروع کر دیا۔ "عطارد و مشتری و زہرہ سعد کیفیت عطارد کی یہ ہے کہ جب باہم سعد کے ایک خانے میں ہو تب شرف نیک اور جب باہم ستارہ نحس کو ہو تب شر بد ظہور میں آتا ہے۔ تیرا ستارہ مشتری ہے کہ شبھ گرہ ہے، پر ان دنوں وہ خانۂ جدی میں ہے کہ نتیجہ اس کا اندوہناک ہوگا۔"

دیہاتی بہت گھبرایا۔ تب ابو نجومی نے بڑی بے نیازی سے ہدایت کی۔ "جا بابا، اس وقت کچھ نہیں ہو سکتا جمعہ کی صبح کو سوا گز لٹھا اور آدھا پاؤ لوبان اور چھٹانک زعفران لے کے آئیو۔ نقشِ روحانی لکھیں گے اور تیرا ستارہ کہ شبھ ہے پر اس وقت خانۂ جدی میں ہے۔ خانۂ جدی سے نکل آئے گا۔"

جب دیہاتی چلا گیا تو میں نے یونہی پوچھ لیا "ابو نجومی، تم ہر گاہک سے جو سوا گز لٹھا لیتے ہو اس کا کیا کرتے ہو؟"

ابو نجومی نے بڑے وقار سے گھٹنوں سے سر اٹھایا۔ پھر مجھے گھورتے ہوئے بولا "بابو تیری سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی۔" اور پھر سلیٹ پر نقش بنانے میں مصروف ہو گیا۔

ابو نجومی جو نقش بناتا ہے میری سمجھ میں وہ کبھی نہ آئے۔ میری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آتی کہ آخر سلیٹ پر بار بار کیوں نقش بنائے جائیں۔ ابو نجومی جب کئی نقش چاک سے بنا اور بگاڑ چکا تو اس نے غور سے میری طرف دیکھا بولا "بابو یہ دنیا ڈھول ہے، خالی ڈھول۔ ہر شخص اپنی بساط کے مطابق اس ڈھول کو پیٹتا ہے۔"

میں اسے بھی سلیٹ پر بنا ہوا ایک نقش سمجھا اور چپ رہا۔

نیاز صاحب کی میز پر ایک کتاب پڑی تھی۔ طبیعت خالی سے بیکار تھی۔ میں نے یہ کتاب اٹھائی اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ لیکن اس کی خشک عبارت نے جلد بیزار کر دیا اور آنکھوں میں ترمرے آ گئے۔ میں نے کتاب بند کی اور ایک لمبی سی جمائی لی۔

ابو نجومی کے سامنے ایک عورت بیٹھی زار و قطار رو رہی تھی اور ابو نجومی کہہ رہا تھا "عورت تیرا ستارہ تیسرے

آسمان پہ ہے۔ اس کا ستارہ پانچویں آسمان پہ ہے۔ دونوں کا ملاپ ابھی نہیں ہو گا۔"

"بابا جی کچھ کرو" وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

ابو نجومی نے خاموشی سے کاغذ پہ نقش بنایا، انگلی پہ شمار کیے، آنکھیں بند کیں پھر کھولیں اور بڑبڑانے لگا "دو ستارے کے مقابل ایک دوسرے کے ہیں، سرطان اور ثور، ستارہ ثور صورت گائے، سرطان صورت کیکڑا، ایک دوسرے کے قریب کے قریب آتے ہیں اور ہٹ جاتے ہیں کہ بیچ میں ایک تیسرا ستارہ صورت حوت مچھلی کے موجود ہے جہاں میں تفرقہ ڈالتا ہے۔ جاننا چاہیے کہ نقش روحانی عورت گلے میں ڈالے تو یہ تیسرا ستارہ بیچ میں سے ہٹ جائے اور دونوں ستاروں کا ایک برج میں میل ہو۔" پھر اس نے عورت سے خطاب کیا "اے عورت اس وقت تو چلی جا۔ جمعہ کی صبح کو سوا گز لٹھا اور آدھا پاؤ لوبان اور ڈیڑھ چھٹانک زعفران لے کے آئیو۔ نقش روحانی لکھیں گے اور انشاء اللہ تیری مراد بر آئے گی۔"

عورت چلی گئی۔ میں پھر بول پڑا۔ "یہ بیچاری عورت تو بہت روتی تھی۔"

"ہاں جو آتا ہے روتا ہوا آتا ہے۔"

اس نے گھٹنے پہ ٹھوڑی ٹکائی اور چاک ہاتھ میں لے کر سلیٹ پر نقش بنانا شروع کر دیا۔ ٹھوڑی کو اسی طرح گھٹنے پہ ٹکائے، سلیٹ پہ نظریں جمائے نقش بناتے بناتے بولا "ایک کونڈا یا تھی۔ وہ تو بات ہی نہیں کرتی تھی بس روتی تھی۔" اس نے نقش کو ادھورا چھوڑ دیا۔ ہاتھ کو روک کر میری طرف دیکھا۔ میں سمجھا کہ آگے کوئی بات کرے گا۔ مگر اس نے اور ہی سوال کر ڈالا "بابو! تمہارا ماسٹر ستاروں کی چال کو نہیں مانتا؟"

"نہیں۔"

"اور سائنس بھی ستاروں کی چال کو نہیں مانتی؟"

"مانتی بھی ہے اور نہیں بھی مانتی۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اس طرح نہیں مانتی جس طرح علم نجوم مانتا ہے۔ سائنس کی کوشش تو یہ ہے کہ آدمی خود ستاروں میں پہنچ جائے۔"

ابو نجومی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

پھر اس کے ساکت جسم کو جنبش ہوئی اور ویران آنکھوں سے تحیر کا رنگ غائب ہو کر افسردگی کی کیفیت پیدا ہونے لگی "بابو ستاروں کی اپنی چال ہے۔ آدمی مجبور ہے۔ اس میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

اس نے بائیں گھٹنے پہ ہتھیلی رکھی۔ ہتھیلی پہ ٹھوڑی۔ سیدھے ہاتھ سلیٹ سرکائی اور پھر نقش بنانا شروع کر دیا۔

"روز وہ آجاتی۔ اور آکر چپ چاپ بیٹھ جاتی۔ بیٹھی رہتی۔" اس نے بغیر نوٹس دیئے بولنا شروع کر دیا اور میں نے بھی درمیان کی ساری گفتگو کو بھول کر سرے سے سرا ملایا۔ وہ گھٹنے پہ ہتھیلی پہ ٹھوڑی ٹکائے نظریں سلیٹ پہ بول رہا تھا "پہلے تو میں نے دھیان نہیں دیا۔ پر اس کی بھولی بھولی صورت دیکھ کے میرا جی ڈوبنے لگا۔ پوچھا کہ بی بی کیا بات ہے تو وہ رو پڑی۔ بہت روتی پر کچھ نہ بتایا۔ کیا بتاتی، بندہ دغا دے گیا۔ دوسری سے بیاہ رچا لیا۔ بس اس روز سے آنا، بولنا نہ چالنا، بس روتے رہنا۔ گورے گال سارے بھیگ جاتے۔ آنکھیں سرخ بوٹی ہو جاتیں۔ پھر خود ہی آنچل سے بھیگے گال تر بتر آنکھیں پونچھتی اور بے کہے سنے اٹھ کر چلی جاتی۔ وہ چلی جاتی تو پھر میں ......" وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔

"نقش روحانی نہیں بنایا اس کے لیے؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

وہ چپ سا ہو گیا۔ پھر بولا "دنیا ڈھول ہے خالی۔ ہر شخص اسے اپنی بساط کے مطابق پیٹتا ہے۔ ستاروں کا علم علم ہے۔ ستاروں کی اپنی چال ہے۔ اس میں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ کسی پہ بپتا پڑتی ہے اور دکھڑا لے کر ہمارے پاس آتا ہے۔ تو ہم اسے تسلی دے دیتے ہیں۔ کچھ لیتے ہیں ... سے ہم نے کچھ نہیں لیا ...... اور کچھ دیا بھی نہیں۔ ہم

[illegible] تھیں [illegible] ماده
[illegible] کے درمیان میں آگیا [illegible] اس کا میل
[illegible] اور [illegible] غروب [illegible] کی چھا جانے
عمل میں خلل آتا ہے ..... اس کا [illegible] آپ [illegible] تو
ہو گئی۔ وہ چلی گئی پھر نہیں آئی۔

اس نے چاک اٹھایا اور جو نقش ادھورا چھوڑ دیا تھا اسے [illegible] سے نقش [illegible] کر دیا۔

"حاجی صاحب نہیں آئے ابھی [illegible] سائیکل سے اتر [illegible] میں داخل ہوئے۔

"نہیں۔" اور ساتھ ہی میں [illegible] اٹھائی اور چلنے لگا۔

"کہاں چلے؟"

"ابھی آیا۔" اور میں دکان سے نکل بے سوچے سمجھے چل پڑا۔

ابھی تھوڑی دیر ہوئی تو میں گھر سے نکلا ہی تھا پھر بھی مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ تھک گیا ہوں۔ اور میں تھکا تھکا افسردہ افسردہ دیر تک بازار میں بے مقصد بے مطلب گھومتا رہا۔ جب واپس ہو کر ماسٹر نیاز کی دکان پر پہنچا تو یہ اندازہ نہ کر سکا کہ میں کتنی دیر گھومتا رہا۔ [illegible] کیونکہ ہر گھڑی الگ وقت بتا رہی تھی۔ اور ماسٹر نیاز کی کرسی کے پیچھے اور [illegible] ٹنگی ہوئی وال دیوار گھڑی آج بھی پچھلے تین دنوں کی طرح نو بجا رہی تھی مگر بحث کی گرمی سے یہ ضرور اندازہ ہوتا تھا کہ خاصی دیر سے محفل گرم ہے۔

حاجی [illegible] صاحب [illegible] بحث کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے "تم کہتے ہو کہ آدمی چاند تک پہنچ جائے گا [illegible] مریخ میں پہنچ جائے گا۔ یہ بھی مان لیا۔ یہی تمہاری سائنس کی معراج ہے۔ [illegible] برس پہلے جب [illegible] سائنس [illegible] انسان جا [illegible]

[illegible] ہے۔" رحیم [illegible] حاجی [illegible] علی کی بات

[illegible] کی طرح [illegible]
[illegible]
[illegible] ماسٹر نیاز [illegible] گھڑی [illegible] میں آئی [illegible] جا ئے۔

"[illegible] گھڑی [illegible] ماسٹر نیاز [illegible] سامنے [illegible] کیوں بھلا۔ اگر آپ سب کی گھڑیاں [illegible] گھڑی [illegible] چار [illegible]؟"

ماسٹر نیاز نے [illegible] گھڑی کا ڈھکن کھول کر اس کے پرزوں کو دیکھ [illegible]

ابو بکری نے دری [illegible] ماسٹر نیاز کی دکان کے تختے کے نیچے رکھی [illegible] بغل میں دبایا۔ [illegible] ماسٹر نیاز کی طرف رخ کر کے کھڑا ہوا اور [illegible] سے بولا

"ماسٹر تمہاری سائنس کا علم ہے۔ [illegible] اپنی چال ہے اس میں آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔ آدمی مجبور ہے۔"

ابو بکری آگے بڑھ لیا اور چار قدم چل کر اپنی گلی میں مڑ گیا۔

ماسٹر نیاز کی آنکھ [illegible] میں [illegible] گھڑی کے [illegible] میں [illegible] حرکت کرتا رہا۔

حاجی [illegible] علی کے [illegible]

"بے شک آدمی بہت مجبور ہے" اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

غزلیں

• اختر سعیدی۔ (مجو والٹمار۔ راجی)

[redacted] کا ہر راز زمانے سے چھپا رکھا ہے
جو تم اس کے ہیں نام آ نکا و نا رکھا ہے
دل کا جو حال ہے وہ کس کو دکھاؤں یار
ایک شعلہ ہے جسے میں نے دبا رکھا ہے
ہم نہیں کچھ تو کریں دردِ محبت کا علاج
درد ایسا ہے کہ دیوانہ بنا رکھا ہے
دیر تو ہیں گوہر نایاب نہیں ہیں آنسو
میں نے پلکوں پہ سلیقے سے سجا رکھا ہے
دل میں جو آئے کہے ہم کو زمانہ اختر
ہم نے الفت کا مگر نام خدا رکھا ہے

• ڈاکٹر گوپال کرشن شفق

نہ ہوا غم کا ہمارے کوئی چارا نہ ہوا
زخم الفت کسی مرہم سے بھی اچھا نہ ہوا
وجہ راحت جاں حسن کا وعدہ نہ ہوا
جز غم عشق کوئی اور ہمارا نہ ہوا
غم کے گرداب میں ڈوبا نہ سفینہ ہرگز
یہ وہ دریا ہے کوئی جس کا کنارا نہ ہوا
کب وہ تدبیر سے تقدیر بدل سکتے ہیں
اپنی ہمت پہ جنھیں آپ بھروسہ نہ ہوا
اختلافات مٹانے سے بھی مٹ سکتے تھے
روٹھ کر آپ چلے ہم سے یہ اچھا نہ ہوا
اس کو لازم ہے شفق سب سے رفاقت رکھے
جس کی قسمت میں کبھی صبح کا تارا نہ ہوا

• ڈاکٹر تفتہ کورو کشیتر یونیورسٹی

بے غرض اک فقیر کی مانند
عمر گذری ہے میر کی مانند
اک محبت دل پذیر کی مانند
تم سراپا ہو میر کی مانند
چاپلوسوں کا ایک اک جملہ
دل میں چبھتا ہے تیر کی مانند
میری دنیا میں روز اوّل سے
ہم رہے اک اسیر کی مانند
کون اردو کا شکسپیر ہے
اس جہاں میں نظیر کی مانند
نورِ الفت سے جو منور ہیں
وہ ہیں ماہِ منیر کی مانند
تم کو دیکھا تو خود کو دیکھ لیا
تم ہو میرے ضمیر کی مانند
ہم نے کاٹی ہے زندگی تفتہ
سور، تلسی، کبیر کی مانند

• جناب دواکر راہی رام پور

زباں یقیں کے لیے اور عمل گماں کے لیے
کہ ہم مکان بناتے ہیں لا مکاں کے لیے
کسی کی بندہ نوازی کے امتحاں کے لیے
تڑپ رہی ہے جبیں سنگ آستاں کے لیے
وہ ایک شب جو گذرتی ہے ایک پل کی طرح
زمانہ چاہیے اس شب کی داستاں کے لیے

خوشا کہ آپ ...
کہ اختصار ضروری ہے خوش بیاں کے لیے
اسی لیے کہ بہت بے ثبات ہے دنیا
تڑپ رہے ہیں سبھی عمر جاوداں کے لیے
نہ خوں بہائیں گے اردو کے واسطے ہرگز!
پسینہ تک نہ بہائیں جو اس زباں کے لیے

● اختر شاہجہاں پوری

میری راہوں سے ہو کر گزر زندگی
کر رہا ہوں اکیلے سفر زندگی
مجھ کو ٹھکرا کے جانے میں کیا ناز تھا
پوچھ لوں گا ملے گی اگر زندگی
جب بھی باطل کی صف سے نکل آئے ہیں
لے گئی ہے ہمیں دار پر زندگی
موت کی وادیوں سی خوشی ہے کیوں
بے ضرورت سہی بات کر زندگی
سعیِ پیہم نے بخشے اجالے ہمیں
شام سے ہو گئی ہے سحر زندگی
لوگ دن رات پتھر اچھالا کریں
کاش ہو جائے ایسا شجر زندگی
بیچ کلاہی آپ کا مقدر رہے
تو بھی اختر پہ کچھ وار کر زندگی

میری غزل (گیت)

یوسف ثاقب سلیمانی دہلی

میں تیرے لیے ایک غزل یار کہوں گا
تنہا جو پڑھوں گا وہی اشعار کہوں گا

رفتار تیری فردِ ہے تمثیل نہیں ہے
گفتار تری نثرِ لطیف اور حسیں ہے
اوصاف ترے حسنِ غزل یار کہوں گا
میں تیرے لیے ایک غزل یار کہوں گا
تنہا جو پڑھوں گا وہی اشعار کہوں گا

آنکھوں کو تری مطلعِ اوّل کی طرح سے
پھر سرخیِ لب مطلعِ ثانی میں سجا دوں
قطعہ ہے رباعی ہیں یہ رخسار کہوں
میں تیرے لیے ایک غزل یار کہوں
تنہا جو پڑھوں گا وہی اشعار کہوں

ہے نظمِ مسلسل یہ تیری زلف گرہ گیر
چہرہ ہے طرحدار غزل حسن کی تصویر
تا عمر قصیدہ ترا دلدار کہوں گا
میں تیرے لیے ایک غزل یار کہوں گا
تنہا جو پڑھوں گا وہی اشعار کہوں گا

جب کاتبِ تقدیر نے لکھے تھے نصیبے
بخشے مری تحریر کو تیرے ہی نصیبے
تقدیر کی تائید میں ہر بار کہوں
میں تیرے لیے ایک غزل یار کہوں
تنہا جو پڑھوں گا وہی اشعار کہوں

سورج مکھی ہے جھیل کا شاداب کنول ہے
کیا چاند ستارے ہیں غزل میری غزل ہے
بے مثل مہک باصفیاء یار کہوں
میں تیرے لیے ایک غزل یار کہوں گا
تنہا جو پڑھوں گا وہی اشعار کہوں گا

آخری سبق

ڈاکٹر [illegible]
(بنارس)

[illegible] میں ہونے کا سبب کے مقابلے میں ایک دیہاتی [illegible] ساتویں درجہ کا انعام، ایک مصور کے ہاتھوں اخبار کے پہلے صفحے پر چھپی سرخی یہ تھی، ایک میری نظر پڑی۔ میں نے اخبار [illegible] خبر واقعی دلچسپ تھی۔

میں ایک [illegible] سال کے طالب علم کا انٹرویو لیکر گھر واپس آ رہا تھا آپ چونکیں نہیں، بات یوں ہے کہ ایک [illegible] چودھری کے لڑکے کی تعلیم یافتہ بیوی نے کسی بات پر اپنے شوہر کو کہہ دیا کہ وہ کہنے کو چودھری ضرور ہیں مگر ہیں تو ہائی اسکول ہی پاس۔ اس زمانے میں اصلی دولت تو علم و فن ہے۔ چودھری صاحب کے کانوں میں جب یہ بھنک پڑی تو وہ کالے ناگ کی طرح تڑپ گئے اور [illegible] سال کی عمر میں کالج میں داخلہ لے لیا۔ سارے گھر والوں نے سمجھایا لیکن انہوں نے کسی کی نہ سنی۔ کالج کے پروفیسر اور اسٹوڈنٹ ہار کے رہ گئے لیکن وہ تھے کہ پڑھتے ہی رہے [illegible] سال کی عمر میں [illegible] ہندی میں ایم۔ اے پاس کر لیا۔ میں تو ایک [illegible] ہوں۔ دوسری کوڑی لانے کے فراق میں رہتا ہوں [illegible] پورا پتہ نوٹ کیا اور گھر جانے کے [illegible] کے گاؤں کی طرف رخ کیا گھر پہنچا تو وہ لوگ [illegible] پایا تھا [illegible] کھیت کھلیان کھینچ رہا تھا۔ [illegible] اندر داخل ہوا وہ آہٹ پا کر چونکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کہا "بیٹے پڑھائی کیا ہو رہا ہے؟" وہ غیر آدمی کے منہ سے اپنا نام سن کر حیرت زدہ ہو گیا اور [illegible] سا بولا "کچھ نہیں۔ آیئے" میں آگے بڑھا اس نے چارپائی بچھا دی اور بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں نے اپنا تعارف دیا۔ میری بات سنتے ہی اس میں پھرتی آگئی اور وہ اندر گیا [illegible]

پر بچھانے کے لیے دری لینے گیا تھا۔ بیٹے نے جھانک کر دیکھا چارپائی کے [illegible] ہوئے بال سہمے کی لڑیوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ میں پورٹ کی خستہ حالت دیکھ کر فنکار لڑکے کی تقدیر کو کوستا رہا، وہ [illegible] کے متعلق طرح طرح باتیں سوچتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک جگ میں شربت گھول لے آیا اور میرے گلاس میں انڈیلتے ہوئے بولا "مجھے بہار پنچایت کی ایک نمائش میں میری ایک تصویر پر انعام ملا تھا" اس کا انداز بیان فخریہ تھا۔ میں نے اس کی بہت تعریف کی کہ وہ واقعی قابل تعریف تھا۔

اب میں نے اس کو اپنے پاس بٹھا لیا اور سوال "کیا تم تنہا ہو؟" یہ سن کر اس نے ہاں میں اور پھر نہیں میں سر ہلایا "میں تنہا نہیں ہوں میرے تین ساتھی ہیں جو کسی وقت میرا ساتھ نہیں چھوڑتے قلم کاپی اور استاد کی وہ" کہہ کر وہ چپ ہو گیا اور مسکراتا رہا میں حقیقت کو سمجھ گیا بولا "تمہارے ماتا پتا کب گزر گئے؟" وہ جواب میں بولا "میں بارہ سال کا تھا اور ساتویں میں پڑھتا تھا"

"اب تم نے کتنی تعلیم پائی ہے؟" میں نے پوچھا تو اس نے [illegible] سے کہا "صرف ہائی اسکول تک"

"کیا تمہارے کسی رشتہ دار نے مدد کی یا کسی دوسرے نے؟" میں نے سوال داغا "[illegible] رشتہ دار کوئی کسی مدد نہیں کرتا ہے البتہ وقت پڑنے پر [illegible] جاتے ہیں مگر کوئی کام نہیں آیا"

"پھر تم کو یہاں تک کس کے سہارے نے پہنچایا" [illegible] نے [illegible] میں [illegible] پڑی چو

[illegible] مجھے [illegible]
بس جا ہوں مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔ سہارے تو
خود اعتمادی چھوتے ہیں ہاں ایک ماسٹر صاحب نے
مجھے گر سکھلائے اور کامیابی کا راستہ دکھایا۔ آج
انہیں کی وجہ سے اپنے پیروں پر کھڑا ہوں "
"انھوں نے تمھیں کیوں مدد دی"؟
"میں ڈرائنگ میں بہت اچھا تھا، وہ ڈرائنگ ٹیچر
میرے ماں باپ کی موت کے بعد جب میرا سلسلہ تعلیم
ٹوٹنے والا تھا تو انھوں نے طرح طرح سے مجھے سمجھایا میری
ڈھارس کی اور ہائی سکول پاس کرا دیا اس کے بعد میری تعلیم
بند ہو گئی کیونکہ تب [illegible] ماسٹر صاحب نے اس
میں بھی میری مدد کی انھوں نے بینک سے قرض لے کر مجھے
بھینسیں دلوا دیں جنکو میں دن بھر چراتا تھا اور دودھ بیچ کر
گزر اوقات کرتا تھا انھوں نے مجھے آخری سبق دیا جو آج
میرے دل و دماغ میں جھنکارتا رہتا ہے"
"کیا کہا تھا؟" میں نے جلدی سے سوال کیا اس نے
[illegible] عاجزی سے کہنا شروع کیا "انھوں نے کہا تھا کہ بیٹے تمہارے
اندر ایک فنکار کا دل چھپا ہوا ہے کسی دن تم [illegible] بڑے
آدمی بنو گے۔ یہ فن کا زمانہ ہے۔ فنکار کی زندگی کامیاب
[illegible] ہوتی ہے اس کے لیے نہ تو سکول جانا ضروری ہوتا ہے
[illegible] اونچی تعلیم ہی پانا اس کے لیے ضروری ہے مشق؛ میں
نے ان کی نصیحت بسر و چشم قبول کر لی۔ اور جب بھی بھینسوں
چرانے دریا کے کنارے لے جاتا تو کاپی اور پنسل بھی ساتھ
لے جاتا تھا اور جو بھی چیز اچھی لگتی تھی اس کی تصویر بنانے لگتا تھا
شام کو گھر آکر ماسٹر صاحب کو دکھا دیتا تھا، وہ کام چھوڑ کر
[illegible] اصلاح توجہ فرماتے اور نئی نئی باتیں بتا دیتے۔
ایک دن انھوں نے مجھے رائے دی کہ میں اپنی ڈرائنگ
طریقہ بدل کر کسی خاص خیال کو لے کر تصویر بنانا شروع
کر دوں۔ شروع شروع میں تو مجھے یہ طریقہ کار کچھ پریشان
کن لگا لیکن مشق نے سب آسان کر دیا"
"تمھاری تصویریں لندن تک کیسے پہنچیں"؟
"میرے ماسٹر صاحب کے [illegible]
نہیں معلوم کہیں سے آگئے ہوں گے [illegible] اصول کے مطابق ماسٹر
صاحب کو پانچ تصویریں دکھانے لے گیا تھا۔ ماسٹر صاحب کو
میری ان تصویروں میں کوئی خاص بات نظر آئی انھوں نے مجھے
انہیں بھی دکھائیں [illegible] کو پسند آئیں اور وہ اپنے ساتھ [illegible]
لے گئے اور برٹش ایمبیسی کی معرفت لندن میں ہونے والی
فری ہینڈ ڈرائنگ کمپٹیشن "لائف" کو شرکت کے لیے بھیج دیں
شاید انھوں نے یہ قدم اس لیے اٹھایا ہوگا کہ ان کے ایک
عزیز شاگرد کی تصویریں لندن کمپٹیشن میں شریک ہو جائیں
گی تو انھیں خوشی ہوگی مگر بات اس سے بھی آگے بڑھ گئی اور
انگلینڈ کے دانشوروں نے پانچ ہزار پونڈ والے [illegible]
کے انعام کا اعلان کر دیا"
"کونسی تصویر پر؟" میں نے پوچھا تو اس نے اس تصویر
کی فوٹو اسٹیٹ کاپی مجھے دکھائی۔ میں نے بغور دیکھا تو مجھے
اس میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ ایک دریا کے کنارے
پانی پر جھکا ہوا پھولا پھلا درخت جس پر بیٹھا ہوا [illegible]
کھولے لہروں کی طرف دیکھ رہا تھا یہ کوئی بات ہوئی۔
مگر میں نے زبان سے کچھ نہیں کہا کیونکہ ایسا کرنے سے
اس کی دل آزاری ہی ہوتی۔ میں نے اس سے پوچھا بیٹے
اس میں تم نے کونسا آئیڈیا پیش کیا ہے؟" یہ سن کر وہ ایسے
مسکرایا جیسے کوئی عقلمند کسی جاہل کی مضحکہ خیز بات پر مسکرا
دیتا ہے، پھر کہنے لگا "دریا ظالم ہے اس نے اپنی لہروں سے
کنارے پر کھڑے پیڑ کی جڑوں کی مٹی کاٹ دی ہے جس کی
وجہ سے پیڑ سیدھا کھڑا ہونے کے بجائے دریا کی طرف جھک گیا ہے جب
دریا ظلم کرتا ہے تو وہ سیدھا کیسے رہے۔ اگلی برسات
کے سیلاب کا پانی ان جڑوں کی بچی کھچی مٹی بھی کاٹ
دے گا اور اکھاڑ کر فنا کرنے کے لیے سمندر میں دھکیل دے گا
جہاں وہ خود بھی فنا ہو جاتا ہے۔ اتنا کہہ کر [illegible] کہ ظالم کے آگے
سر جھکا دینے والا برباد ہو جاتا ہے وہ طرفداری [illegible]
عاجزی۔ وفاداری کچھ بھی نہیں دیکھتا ہے ظالم کا [illegible]
شہید ہونے والے کی زندگی کامیاب ہوتی ہے [illegible]

چھرن بیچ ہوگیا تو میں نے پوچھا کیا انگلینڈ کے لوگوں نے تمہاری تصویر کی بابت جو آئیڈیا کریٹ کیا ہے وہ تمہارے آئیڈیے سے ملتا ہے؟"

• کچھ کچھ ملتا ہے۔ کہیں کہیں انھوں نے مجھ سے بھی اونچی بات سوچ لی ہے جیسے شاعر کے کلام کے عالم لوگ وہ وہ مطلب نکال لیتے ہیں جو شاعر کے ذہن میں بھی نہیں ہوتے ہیں۔ اُلّو ہمارے یہاں منحوس مانا جاتا ہے مگر مغربی تہذیب میں اس کو عقلمند سمجھا جاتا ہے دیکھئے انکا آئیڈیا" کہتے ہوئے اس نے انگلینڈ کا پرنٹیڈ لیٹر میرے سامنے رکھ دیا میں نے پڑھا اس میں لکھا تھا۔

• ظالم دریا کی طرف جھکے ہوئے مظلوم پیڑ کو بے وقوف سمجھ کر پانی کی چنچل لہریں خاموشی کے ساتھ مسکراتی ہوئی چلی جارہی ہیں اُلّو لہروں کی بے وقوفی پر ہنس رہا ہے وہ پیڑ کی چالاکی اور ہوشیاری کو نہ سمجھ کر اس کو بزدل اور بے وقوف سمجھ رہی ہیں مگر وہ جینے کا طریقہ جانتا ہے اس نے ظالم کے آگے سر نہیں جھکا دیا ہے بلکہ حالات سے مجبوتا کر لیا ہے یہ اس کے اکڑ کر جینے کا وقت نہیں ہے اُس پر پھول پھل آرہے ہیں جو بیج بن کر دریا کے کنارے کنارے دور تک بے شمار پودے تیار کردیں گے جو پانی کی دھار سے کنارے کو کٹنے سے بھی روکیں گے اور اپنی بھی حفاظت کریں گے۔ اس مقصد کے پورا ہونے تک پیڑ خاموش ہے اور سب کچھ برداشت کر رہا ہے" جب میں نے یہ آئیڈیا پڑھا تو مجھے معمولی سی تصویر ایک افسانہ معلوم ہونے لگی اور میں نے مان لیا کہ اتنی رقم انعام میں دینے والے لوگ معمولی دماغ والے نہیں ہیں۔ میں نے پوترن کا خوبٹ لیا جس کو اخبار میں چھپوانا تھا اور چلا آیا۔

• پروفیسر فریدہ قریشی سحر اکبرآبادی دہلی

بندگی کا راستہ یا بے خودی کا راستہ
اصل میں دونوں کا رخ ہے آگہی کا راستہ
اشک خوں برسا کے تازہ دل ہمیں کرنا پڑا
غم کی منزل میں نہاں ہے تازگی کا راستہ
مختلف ہیں سوچ کی راہیں ہر اک انسان کی
آدمی سے یوں جدا ہے آدمی کا راستہ
آپ کے ہوتے ہوئے پھرتا ہوں تنہا اجنبی
کٹ نہیں سکتا یہ تنہا زندگی کا راستہ
لوٹ آئے لوگ میخانوں سے تیری بزم میں
دیکھ کر آنکھوں میں تیری میکشی کا راستہ
ڈوب کر بحرِ غمِ ہستی میں دیکھو دوستو
غم کی موجوں ہی میں پاؤ گے خوشی کا راستہ
مغفرت بندوں کی کرنی جب اسے مقصود ہے
ہے پسند اس کو اسی سے عاجزی کا راستہ
پیار کی راہوں میں اب بھی گونجتی ہے یہ صدا
حسن کی چوٹوں سے نکھرا عاشقی کا راستہ
ظلمتِ ہستی تو اک دن دور ہوگی اے سحر
رات کیا روکے گی صبحِ روشنی کا راستہ

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

سرِ مغفرت پر نظرِ خوش گزرے

۱۷۶ صفحات پر محیط گیتا کا منظوم ترجمہ جس کو ماہنامہ شانِ ہند دہلی ۲۰۰۲ نے بصد اہتمام شائع کیا ہے اور جس کے مترجم ۱۰۸ شری پنڈت رتن پنڈوروی ہیں ہر اعتبار سے قابلِ صد ستائش نیز در خورِ اعتنا ہے۔ شاعرِ موصوف "دل بہ یار دست بکار" سادھو سنت ہستی ہیں۔ ملحوظ رہے گیتا کا فلسفہ بقول فیضی "دل بہ یار دست بکار" پیغام پیش کرتا ہے۔

"علم و عمل" پر تمام تر توجہات و محرکات مرکوز و متفرق اوصاف کے حامل رتن پنڈوروی اچھے شاعر ہی ہیں اور عظیم انسان بھی ہیں، تاہنوز متعدد شعری تخلیقات نیز متعلق شعر و ادب نثری تصنیفات بشمول سرمایہ بلاغت، فنِ تاریخ گوئی، ہندی کے مسلمان شعراء وغیرہ ادبی حلقوں میں خاصے مقبول ہوئے ہیں اور ان میں سے بیشتر پر شاعر و ناشر دونوں کو انعامات و اعزازات ملے ہیں۔ سرِ مغفرت بھی قابلِ انعام و اعزاز تصنیف ہے یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔

ویدک دھرم جس کو اب ہندو دھرم کہا جاتا ہے ہی ایسا مذہب ہے جس کی انسائیکلو پیڈیا ابھی تک مرتب نہیں کی جاسکی ہے۔ جو انگلینڈ کے عالمگیر شہرت کے حامل ناشر ہیں نے ہندو مذہب کی اصطلاحات و عقائد پر مشتمل ایک کتاب بہ عنوان HINDU WORLD (ہندو دنیا) دو حصوں میں شائع کی ہے جس کے دیباچہ میں یہ واضح طور پر اعتراف کیا گیا ہے کہ ہندو مذہب کو کسی انسائیکلوپیڈیا میں منقید نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جناب رتن پنڈوروی نے سرِ مغفرت کے ۳۸ صفحات پر مشتمل ہندو دھرم کے مبادیات نیز گیتا کا پس منظر سے متعلق جو معلومات بہم پہنچائی ہیں ان کو من حیث المجموع انسائیکلوپیڈیائی نوعیت و افادیت کی حامل نظر آتی ہیں۔ دیباچہ نہایت تحقیقی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں ۴۳ منظوم ترجموں پر روشنی ڈالی ہے۔ فہرست میں استاذی نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی نغمۂ جاوید بھی شامل ہے، جناب نایاب ہے ملحوظ رہے اثر مرحوم کو اس تصنیف پر پدم بھوشن کا خطاب دیا گیا ہے۔ گیتا کے بے شمار تراجم میری نظر سے بھی گزرے ہیں۔ فارسی میں فیضی، انگریزی میں ایڈون آرنلڈ، فرانسیسی میں موسگناں اردو میں اثر مرحوم ایسے ہوئے تراجم راقم الحروف کو بہت پسند ہیں اور اب اس کی پسندیدگی میں سرِ مغفرت کا اضافہ ہوا ہے اظہر عالم بھگوان کرشن کے عہد کے تاریخی واقعات چند اصطلاحات عنوانات کے تحت رتن پنڈوروی نے جو کچھ لکھا ہے وہ "گیتا اور متعلقات گیتا" پر وافر روشنی ڈالتا ہے۔ اگر ان ہی ۳۸ صفحات کو علاحدہ سے شائع کیا جائے تو اس تالیف کو "مبادیات ہندو مذہب" کے نام سے شائع کیا جا سکتا ہے۔

ترجمہ کرنا آسان کام نہیں ہے۔ جوئے شیر کو لانا ہے کیونکہ لفظ لفظ کے معنوں میں تاریخی و جذباتی نیز فکری منسلکات بھی شامل ہوتے ہیں جن کو ترجمے کے سانچے میں ڈھالنا اتنا بڑا کام ہے کہ مترجم تصنیف یعنی بہت کامیاب مترجم تصنیف کو انگریزی میں آج کل یعنی ثانوی تصنیف کہا جانے لگا ہے۔ اگر ترجمہ تخلیقی کاوش نہ ہو سکے تو اس کو کامیاب ترجمہ نہیں کہا جا سکتا۔ رتن

پنڈوری، جو کہ صاحبِ علم و عرفان ہیں، کا منظوم“ پیش
ترجمہ نہایت کامیاب ہے، ملاحظہ ہو:

یہ غم و رنج دائم بے سود ہیں
بے حقیقت بے یقیں بے بود ہیں
ہے ازل سے یہ نظامِ کائنات
ہے اسی پہ انصرامِ کائنات
طفلی و پیرانہ سالی و شباب
ہیں کتابِ روح کے تین باب
ان منازل سے گزرتی ہی رہی
ہو کے رہتی ہے نئے تن میں مکیں
دیدۂ بینا سے جو ہیں بہرہ ور
جینے مرنے کا نہیں ان پر اثر
جس نے پیدا کی ہے ارضِ کائنات
غیر فانی ہے اسی کی پاک ذات
روح قاتل ہے نہ خود مقتول ہے
اہلِ عرفاں کو یہی مقبول ہے
روح دائم ہے ولادت سے بری
ذات اس کی ہے ہلاکت سے بری
جسم کے مرنے پہ بھی مرتی نہیں
موت اس پہ کچھ اثر کرتی نہیں

●

کرم ہو جو دکھ مٹانے کے لیے — یا حصولِ مدعا کے واسطے
ترک کر دے ایسے کرموں کو اگر — وہ ہی سنیاسی کہا جاتا ہے بشر
بے غرض ہوتے ہیں گیانی کے عمل — چھوڑ دیتا ہے وہ سب کرموں کا پھل
کرم کرنا ہی ہے فرضِ اولیں — رکھتا ہے جو دل میں یہ پختہ یقین

محولہ ابیات بطور نمونہ مشتے از خروارے پیش کیے گئے ہیں۔ گیتا کا فلسفۂ عمل و عرفان ہر زمانے کے اہلِ علم و دانش کو متوجہ کرتا رہا ہے۔

ماجرائے من و معشوقِ مرا پایاں نیست
ہر چہ آغاز ندارد نپذیرد انجام

(ناتمام)

تو ہمہ پروانہ ای گر بزم شمع نظر داری
چوں من در آتش خود سوز اگر سوزِ جگر داری

(فیض)

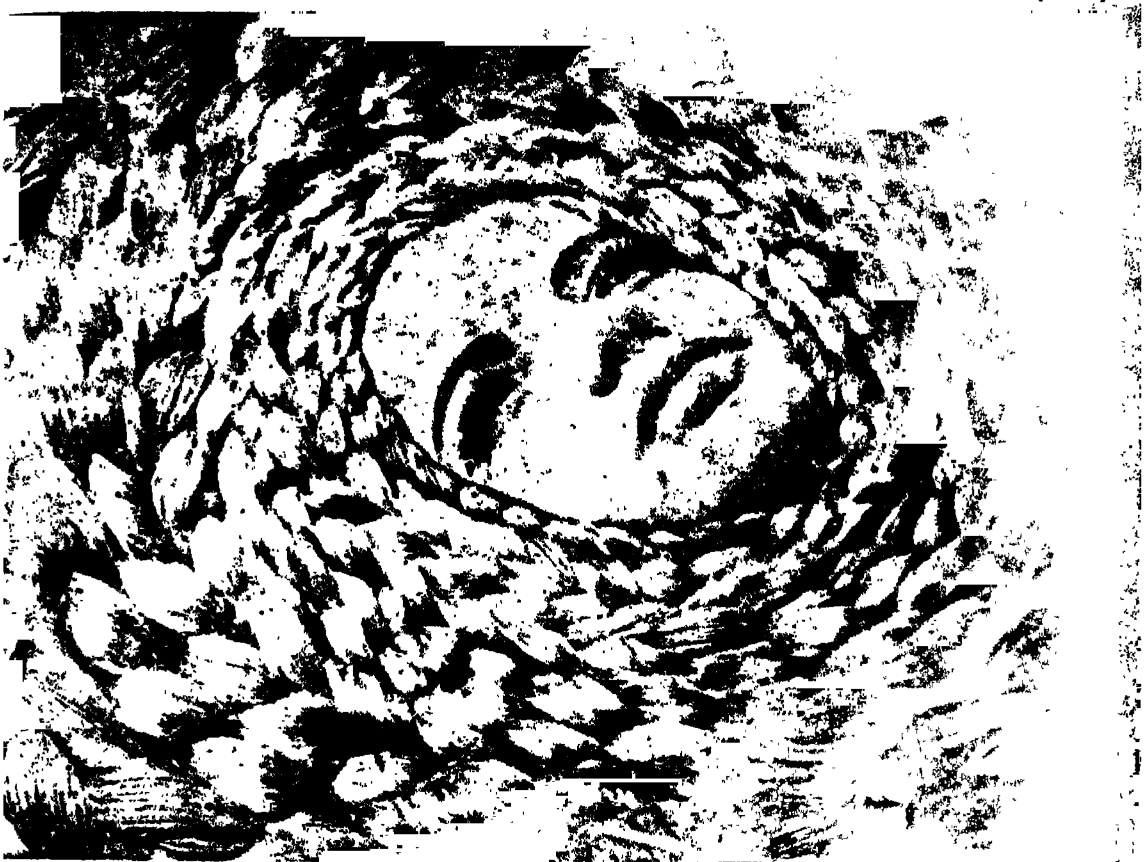
شمع خود را می گدازد در میانِ انجمن
نورِ ما چوں آتشِ سنگ از نظر پنہاں خوش است

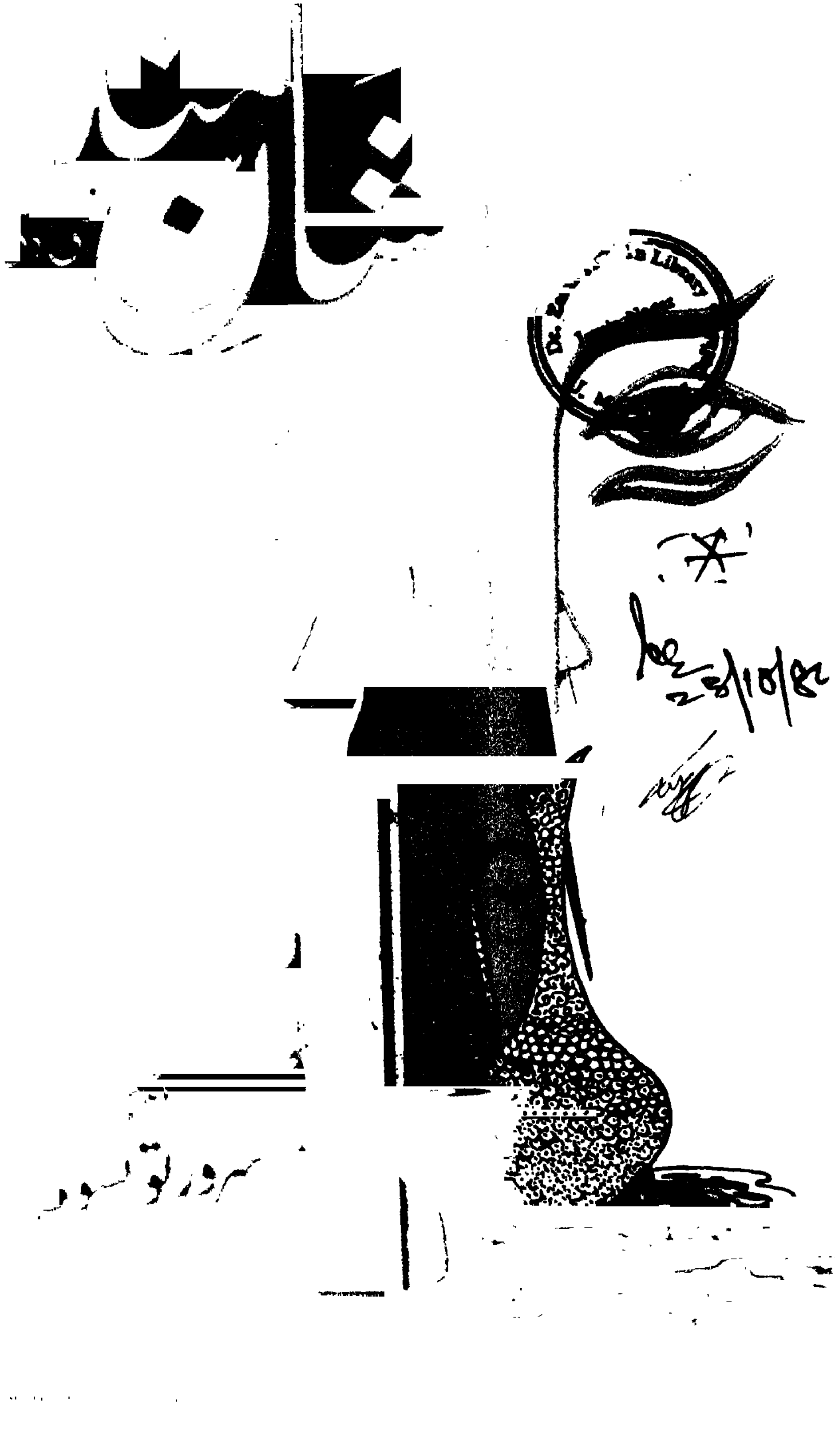
(میر رضی دانش)

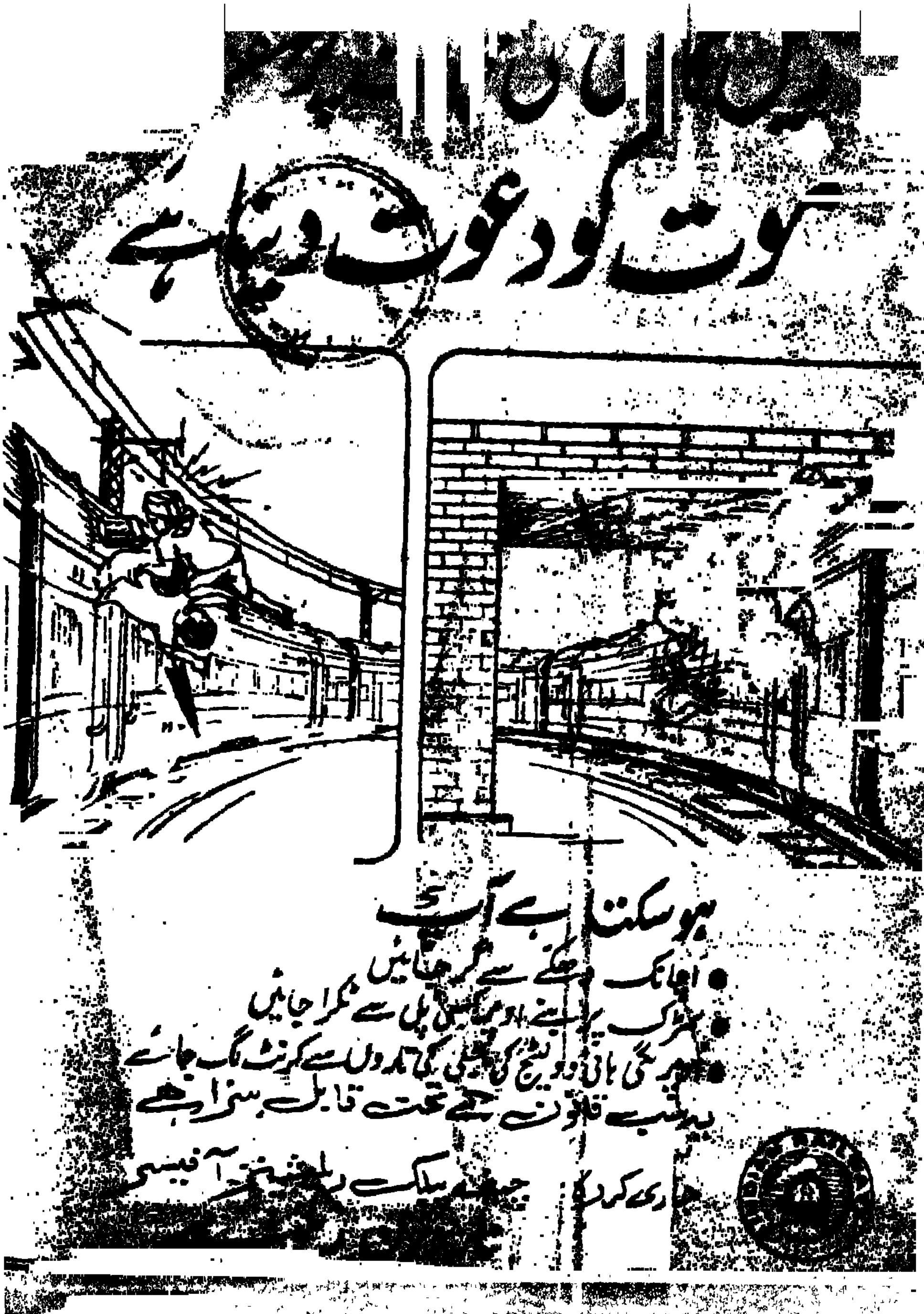
محولہ فوق فارسی اشعار میں پیش کردہ خیالات بھی گیتا میں ملتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گیتا میں حیات و کائنات کے رموز و غوامض سموئے گئے ہیں۔ شکوک انسانی، نفسیاتی الجھنوں، مشکلات زندگی و قلبی وغیرہ کے سدِ باب کے لیے گیتا مشعلِ ہدایت ہے۔

رتن پنڈوری مثنوی لکھنا چاہتے تھے اور جب جناب سرورؔ تونسوی مدیر شانِ ہند نے گیتا کو منظوم کرنے کا مشورہ دیا تو رتن پنڈوری نے اس ”بارِ امانت“ کو بسر و چشم اٹھانے کا بیڑا اٹھایا۔ سرِ معرفت کا بہت کامیاب ترجمہ ہے اور شانِ ہند نے اس کو بہ اچھے خط اب مع خوبصورت گرد پوش شائع کیا۔ رتن پنڈوری اور جناب سرور تونسوی دونوں داد و تحسین کے مستحق ہیں۔

THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002
Regd with the Registrar of Newspaper at R. No. 644,57






موت کو دعوت دینا ہے
ہو سکتا ہے آپ
• اچانک جھٹکے سے گر جائیں
• ٹرک پر بیٹھے اوور ہیڈ پل سے ٹکرا جائیں
• ہائی وولٹیج کی بجلی کی تاروں سے کرنٹ لگ جائے
یہ سب قانون کے تحت قابل سزا ہے
جاری کردہ: چیف سکیورٹی کمشنر آر پی ایف

ٹیلیفون نمبر [illegible] | رجسٹرڈ نمبر [illegible]

ہندو پرست ہوں نہ مسلمان پرست ہوں
ماضی پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ہر ذرّہ وطن سے ہے فیاضؔ مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انسان پرست ہوں
فیاض محمود ایادی

ماہنامہ

شانِ ہند
نئی دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

فی پرچہ [illegible]
زر سالانہ [illegible]

جشنِ جمہوریت نمبر

جلد نمبر ۳۵ | اگست ۱۹[illegible]ء | شمارہ نمبر [illegible]

۱۵۔ اگست

ہماری آزادی کا یادگاری دن ہے

آؤ

ہم سب مل کر عہد کریں کہ ہم سب ایک ہیں اور

ہمارا

ہندوستان ہم سب کا ہے اور اس کی حفاظت ہمارا فرض ہے

ہندوستان کا ہر باشندہ اپنے وطنِ آزاد کی آزادی کو برقرار رکھنے کا ذمہ دار ہے

لہٰذا

ہم سب بلا تفریقِ مذہب و ملت بھائی بھائی بن کر رہیں

اور

اپنے ملکِ عزیز کی آزادی کی حفاظت کریں

اسی میں ہم سب کا بھلا ہے۔ یاد رکھئے کہ جو شخص اپنے ملک کا وفادار نہیں ہے اُسے کہیں بھی پناہ نہیں ہے اور ملک کا غدار وہی ہے، دُنیا اور خدا کی نظروں میں قابلِ [illegible]

[illegible] سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے [illegible] سے چھپوا کر [illegible] انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

آزادی — ایک نعمت — ایک موقع

37 سال قبل ہم نے غلامی کی زنجیریں توڑ دی تھیں اور ہم آزاد ملک کے شہری بن گئے تھے۔
تب سے ہم نے زندگی کے تمام شعبوں میں بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کی۔

- آج ہمارے کسان قوم کی ضرورت کے لئے کافی اناج پیدا کرتے ہیں۔
- صنعتی پیداوار میں ہم نے دنیا کے تمام ملکوں میں ایک قابل فخر مقام حاصل کر لیا ہے۔

نیا بیس نکاتی پروگرام ہماری مسلسل عملی سرگرمیوں کا آئینہ دار ہے تاکہ سب کو سماجی اور اقتصادی انصاف مل سکے۔

- [illegible] اور ملکی سالمیت کا تحفظ اور دفاع کر سکتے ہیں۔

آئیے۔ آزادی کے 38 ویں سال میں داخل ہوتے ہوئے ہم کڑی محنت اور لگن سے کام کرنے کا عہد کریں۔ تبھی ہم اپنی منزل کو پہنچ سکتے ہیں۔



بُلبُل چہ گفت؟ گل چہ شُنید؟ وصبا چہ کرد؟

دلّی اردو اکاڈمی کا تجرباتی مشاعرہ

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر صاحب جب کرنال میں ڈپٹی کمشنر تھے تو ان کے زیر اہتمام ایک کل ہند مشاعرہ ڈسٹرکٹ ریلیف فنڈ کی فراہمی کے لیے منعقد ہوا۔ اس مشاعرہ میں حضرتِ جوش ملیح آبادی اور ملک کے دیگر کئی نامور شعرائے کرام نے شرکت فرمائی۔

عین مشاعرہ کے وقت رات کے ۹ بجے بارش نے ایسا ملہار راگ شروع کیا کہ کرنال جل تھل ہو گیا اور شعرا حضرات اور سامعین بھیگتے بھاگتے اپنے ٹھکانوں پر پہنچے۔ دوسرے دن صبح کے گیارہ بجے مشاعرہ منعقد ہوا اور یہ مشاعرہ ایسا کامیاب رہا کہ مدتوں یاد رہا۔ اس مشاعرہ کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہوا کہ مشاعرے دن کے وقت بھی کامیاب رہ سکتے ہیں۔ مگر انھیں اس سلسلے میں تجربہ کرنے کا کوئی موقع نہ مل سکا۔ گو بیدی صاحب نے اس مشاعرے کے بعد سینکڑوں اور مشاعرے منعقد کیے اور کرائے مگر یہ سب مشاعرے رات کے وقت ہی ہوتے رہے۔

دلی اردو اکاڈمی کی مجلسِ تقریبات کے صدر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر صاحب ہیں لہٰذا انھوں نے اس بار اکاڈمی کی جانب سے ہونے والے مشاعرۂ جشنِ آزادی کے انعقاد کا وقت صبح نو بجے رکھا۔ مشاعرہ پرانی دلی کے غالب آڈیٹوریم میں منعقد ہوا اور اس کی صدارت وزیر مملکت جناب ضیاء الرحمٰن انصاری صاحب نے فرمائی۔ مشاعرہ کا افتتاح محترمہ محسنہ قدوائی صاحبہ نے فرمایا۔ اور یہ مشاعرہ ایسا کامیاب رہا کہ شاید رات کے وقت یہ اتنا کامیاب نہ رہتا۔

دلی اردو اکاڈمی کے سکریٹری جناب شریف الحسن نقوی بہت زیرک اور محتاط قسم کے ایک فعال اور منتظم شخصیت کے مالک ہیں انھوں نے مشاعرے کے شروع میں فرمایا کہ دلی اردو اکاڈمی کی کئی سب کمیٹیاں ہیں اور پروگرام کمیٹی کے صدر جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر ہیں لہٰذا اکاڈمی کے زیرِ اہتمام جس قدر بھی تقریبات منعقد ہوتی ہیں اُن کے کرتا دھرتا یہی ہیں۔ یعنی ایک طرح سے سکریٹری صاحب نے اپنی صفائی پیش کر دی کہ تقریبات پر جو فضول خرچی وغیرہ ہوتی ہے یا چھٹ بھیّے آرٹسٹ یا شعرا مدعو کیے جاتے ہیں یا رفعت سروش صاحب کے بیٹے پر ۳۵ ہزار روپے دیا جانا وغیرہ کی تمام تر ذمہ داری کنور مہندر سنگھ بیدی سحر پر عائد ہوتی ہے۔

کنور صاحب نے مشاعرہ کو دن کے وقت منعقد کرنے کے بارے میں تفصیلات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ لال قلعہ میں ۲۶ جنوری کے موقع پر مشاعرہ ہوتا ہے مگر اس میں کئی مقامی اور بیرونی مستحق شعرا شرکت سے رہ جاتے ہیں لہٰذا یہ تجویز کیا گیا ہے کہ ۱۵ اگست کے موقع پر بھی مشاعرہ جشنِ آزادی منعقد کیا جائے تاکہ جو شعرا ۲۶ جنوری کے مشاعرہ میں مدعو نہیں کیے جاسکتے انھیں اس مشاعرہ میں بلایا جاسکے۔

مشاعرہ کا افتتاح محترمہ محسنہ قدوائی صاحبہ نے بہت ہی اچھی دلپذیر تقریر سے فرمایا۔ ایڈیٹر شانِ ہند نے محترمہ محسنہ قدوائی کی تقریر پہلی مرتبہ سُنی اور اس حقیقت کو ظاہر من الشمس پایا کہ قدوائی صاحبہ ایک اچھی مقررہ ہیں۔ اور ان کے دل میں اردو کے لیے واقعی تڑپ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اردو سے متعلق اپنی نیک خواہشات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں بے بس ہیں۔ کیونکہ ہماری حکومت الیکشن کے وقت تو اردو کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار رہتی ہے اور الیکشن میں کامیابی کے بعد اردو کو بھلا دیا جاتا ہے۔

مشاعرہ کے صدر جناب ضیاء الرحمٰن انصاری صاحب نے بڑے اچھے مزاحیہ انداز میں صدارتی تقریر شروع کی اور انھوں نے مزاح کو طنز کے رنگ میں تبدیل کرتے ہوئے اپنی تقریر میں بڑی اچھی باتیں کہیں اور بہت ہی اچھے اشعار بھی سنائے تقسیم ملک سے پہلے کہا جاتا تھا کہ قربانی کانگریس کی، تقریر احرار کی اور ووٹ مسلم لیگ کو مگر اب یہ کہا جاسکتا ہے کہ قربانی قدیم کانگریسیوں کی تقریر جالیسا کانگریسیوں کی اور ووٹ با اقتدار کانگریس کو۔ انصاری صاحب بہت اچھی تقریر کرتے ہیں اور مشاعروں کی صدارت کیلیے بھی ہیں ان کا دم غنیمت ہے کیونکہ اخلاقی طور پر یہ فرائضِ صدارت سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ مشاعرے کے اختتام تک مسندِ صدارت پہ تشریف فرما رہے ہیں اور اگر کسی شاعر نے قومی رہنماؤں یا ملکی وقار کے خلاف کچھ کہا تو سرِ مشاعرہ سرزنش کرنے سے نہیں چوکتے چنانچہ اس مشاعرہ میں انھوں نے ایک چور خود ساختہ مزاحیہ شاعر نظر برنی کو فریڈم فائیٹرز کے خلاف ایک بیہودہ قطعہ پر ایسی سرزنش کی کہ نظر برنی اپنی تو اپنی چوری شدہ شاعری بھی بھول گئے۔ نہ معلوم مشاعروں کے منتظمین اور دوردرشن والے نظر برنی ایسے چور شاعر کو کیسے مدعو کر لیتے ہیں جبکہ نظر برنی ایک گزٹیڈ چور شاعر قرار دیئے جاچکے ہیں۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ نظر برنی صاحب نے ملک کے مشہور مزاحیہ اور طنزیہ شاعر جناب واہی (پٹنہ) کی مزاحیہ نظم اپنے نام سے شائع کرائی تھی جس پر عظیم آباد ایکسپریس پٹنہ اور بشارتِ ہند نے تفصیلی طور پر روشنی ڈالی تھی۔ ایسے چور شاعروں کو تو خود اپنے ہاتھوں خودکشی کرلینی چاہیئے تھی چہ جائیکہ یہ دوردرشن اور اردو اکاڈمی کے جشنِ آزادی کے مشاعرے میں مدعو کئے جائیں۔ انصاری صاحب کی سرزنش کے بعد منتظمین مشاعرہ اور دوردرشن والوں کو یقیناً اپنی فراخ دلی پر افسوس ہوا ہوگا امید ہے کہ آئندہ وہ ایسی غلطی کا اعادہ نہیں کریں گے۔

مشاعرے کی نظامت انتہائی کمزور تھی۔ اول تو محترمہ نور جہاں ثروت ایک پیشہ ور اناؤنسر نہیں ہیں اس لیے سکہ بند قسم کی نظامت اُن کے بس کی بات نہ تھی دوسرے مشاعرہ میں شعرائے کرام کی اکثریت ایسی تھی جنھیں دلی کے کسی مشاعرے میں پہلی بار کلام سنانے کا موقع ملا ہے لہٰذا ناظم مشاعرہ ان شعرائے کرام کا تعارف کرانے سے قاصر تھیں۔ تیسرے جو مائیک ثروت صاحبہ کے سامنے رکھا گیا تھا شاید اس کا کرایہ نہیں دیا گیا جس کی وجہ سے نہ تو سامعین تک اور نہ ہی اسٹیج پر بیٹھے شعرائے کرام تک ثروت صاحبہ کی آواز پہنچتی ہی نہ تھی۔

مدعو شعرائے کرام میں اکثریت نوجوان حضرات کی تھی اور ان میں اکثر شعراء بہت کامیاب رہے خصوصاً منظر بھوپالی نے راگ پہاڑی میں غزل سنا کر جس فنکاری کا ثبوت دیا اس کی تعریف جس قدر بھی کی جائے کم ہے۔ راگ پہاڑی اس قدر عام فہم اور دل میں اتر جانے والا ہے کہ اگر دیہاتی نوجوان بغیر کسی ساز کے اس راگ میں گیت گاتے ہیں تو وہ بھی سننے والوں کے لیے روح افزا ہوتے ہیں جس قدر فلمی گانے راگ پہاڑی میں گائے گئے ہیں وہ سب کے سب ہِٹ ہوتے ہیں۔ اکثر و بیشتر شعراء نے اس راگ میں غزلیں کہی اور سنائی ہیں مگر جس انداز میں منظر بھوپالی نے غزل پیش کی اس سے بہتر آج تک کوئی شاعر راگ پہاڑی میں اپنی غزل پیش نہیں کر سکا۔

مرادآباد کے نور عالمی، گوڑگاؤں کے روی بھاردواج دہلی کے حیات جاوید کے علاوہ دو دیگر شعراء نے اپنی ناکامی سے یہ ثابت کیا کہ ایسے مشاعروں میں سفارشی شعراء کو مدعو کرنا جہاں عوام کا وقت ضائع کرنا ہے وہاں قوم کا روپیہ بھی ضائع کرنا ہے۔ خنداں دہلوی نے مزاحیہ کلام پر اس مشاعرہ میں جو داد پائی شاید وہ عمر بھر ایسی داد نہ ملے۔ چونکہ مسلمان سامعین کی تعداد بہت زیادہ ہے اس لیے وہ قومی اور وطن پرستانہ کلام پہ ہوٹ کرنے سے گریز نہیں کرتے جس کی وجہ سے پروفیسر ست نام سنگھ خمار اور جناب جاوید وششٹ کو قوم پرستانہ اور وطن پرستانہ کلام پر ہوٹ کیا گیا۔

ایک عرصہ کے بعد جناب شعری بھوپالی کو سننے کا موقع ملا کیونکہ مہندر سنگھ بیدی سحر کی فراخ دلی کے باعث جہاں دو چار نا اہل شعراء کا کلام زہر مار کرنا پڑا وہاں ان کے طفیل اکثر و بیشتر اچھے شعراء کے ساتھ ساتھ شعری بھوپالی ایسے کہنہ مشق شاعر کے کلام سے محظوظ ہونے کا بھی موقع ملا۔

بہ حیثیت مجموعی مشاعرہ نہ صرف کامیاب تھا بلکہ تعریف کیے جانے کے قابل تھا۔ آئندہ اگر لال قلعہ کا مشاعرہ بھی دن کے وقت منعقد کیا جائے تو منتظمین جہاں ہزاروں روپیہ کے اخراجات کی [illegible] گے

(باقی صفحہ ۵ پر)

بکوئے یار بہ انداز مجرمانہ گزر

سرور تونسوی

حاجی بخش الٰہی سگرٹ والے دلی کی ایک ایسی برگزیدہ ہستی تھی کہ ملک بھر میں اُن کی سخاوت کا ڈنکا بجتا تھا سینکڑوں کالجوں کو وہ مالی مدد دیتے تھے۔ دلی کے علاوہ کلکتہ میں اُن کی بہت زیادہ جائیداد تھی۔ غرضیکہ کروڑوں میں کھیلتے۔ ایک دفعہ انھوں نے وائسرے کو اپنے ہاں چائے کی دعوت پر بلایا تو وائسرے کے لیے جو چائے کی پیالی بنائی گئی اس کے لیے انھوں نے اسی ہزار روپیہ کے کرنسی نوٹ جلا کر چائے بنوائی اور وہ اس حماقت کو اپنی دولت مندی و فارغ البالی کا ایک ادنیٰ سا کارنامہ قرار دیتے تھے۔

حاجی صاحب ہر سال زکوٰۃ بھی شرعی احکام کے مطابق نکالتے تھے۔ حاجی صاحب کی بیگم صاحبہ جو اماں جی کہلاتی تھیں [illegible] والی خاتون تھیں۔ ایک غریب اور مفلوک الحال عورت پھٹے پرانے برقعے میں ان اماں جی کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور سوال کیا کہ انھیں بھی زکوٰۃ میں سے دیا جائے جس پر اماں جی نے فرعونی لہجے میں کہا کہ اب تو زکوٰۃ بٹ چکی اگلے سال آنا۔ عورت نے پھر منت سماجت کے ساتھ گزارش کی کہ اُسے سخت ضرورت ہے کسی نہ کسی طرح اُس کی مدد کی جائے جس پر اماں جی فرمانے لگیں کہ خاموشی سے چلی جاؤ ورنہ چٹیا پکڑ کر نکلوا دوں گی۔ غرض [illegible] ہوتا ہے سوالی عورت نے اپنی ضرورت اور اپنی مفلوک الحالی بیان اور شدت سے کیا اور پھر مطالبہ کیا کہ مجھے بھی دروازے سے خالی نہ بھجوایا جائے جس پر اماں جی کو غصہ آگیا اور انھوں نے اپنی ملازماؤں کو حکم دیا کہ اس کی چٹیا پکڑ کر دھکے دے کر نکال دیا جائے۔ چنانچہ اماں جی کے حکم کی تعمیل ہوئی اور اِس مفلوک الحال عورت نے جاتے جاتے روتے ہوئے کہا کہ انشا اللہ آئندہ سال زکوٰۃ بانٹنے کے اللہ میاں تمھیں اہل ہی نہیں رکھیں گے۔

چند ہی دنوں بعد گھریلو جھگڑوں نے وہ تباہی مچائی کہ واقعی اماں جی کو کھانے تک کے لالے پڑ گئے اور واقعی اللہ نے انھیں اس قابل نہ رکھا کہ اگلے سال وہ زکوٰۃ بانٹنے کی سعادت حاصل کر سکتیں۔

گلی قاسم جان دلی میں ایک صاحب فیروز نامی تھے دوکان تو اُن کی بیڑی کی معمولی سی تھی مگر کپڑے وہ ہر وقت سفید براق پہنتے تھے شاید ہی کسی نے فیروز کو کبھی میلے یا رنگدار کپڑے پہنے دیکھا ہو گلی محلّے والوں نے فیروز کا عرفی نام "لانڈری دُھلا" رکھ دیا اور وہ اِس نام سے محلّہ اور علاقہ میں مشہور تھے۔

شامت اعمال کہ راہ چلتے ہوئے ایک ضعیف شخص اُن سے ٹکرا گیا۔ بڈھے کے کپڑے انتہائی میلے کچیلے تھے بھلا لانڈری دُھلا صاحب سے رہا نہ گیا اور اُس بڈھے کو گردن سے پکڑ کر ٹکریں دیں اور خوب مارا کہ تم نے میرے کپڑے خراب کر دیئے۔ محلّے کے ایک شریف شخص نے لانڈری دُھلے کو ٹوکا کہ تم نے یہ بہت بُرا کیا ہے اس پر لانڈری دُھلا اس شریف شخص سے بھی تو تو میں میں پر اُتر آیا۔ بہرکیف بات آئی گئی ہوئی۔ مگر تین روز بعد ہی پولیس نے لانڈری دُھلے کے ہاں چھاپہ مارا تو بھید کھلا کہ چرس اور افیون وغیرہ بیڑی کے پتوں کی آڑ میں کر رہے تھے۔ پولیس [illegible] ہوئی لانڈری دُھلے کو تھانے لے گئی اور حوالات میں بند کر دیا۔ پولیس نے دوسرے دن عدالت میں پیش کر کے مزید تحقیقات کیلیے

لانڈری ڈھلے کا رہا وڈ حاصل کر لیا۔ اور دو دن بعد جب پولیس تفتیش کے لیے لانڈری ڈھلے کو اُس کے مکان پہ لائی تو حضرت ایک میلے کچیلے بنیان اور انتہائی گندے جانگیہ میں ملبوس تھے۔ محلے اور گلی بازار کے لوگ ایک دوسرے کو آوازیں لگا لگا کر کہہ رہے تھے کہ لانڈری ڈھلے کی اصلیت دیکھ لو۔ جس شریف شخص نے لانڈری ڈھلے سے کہا تھا کہ تم نے غریب بوڑھے کو مار کر اچھا نہیں کیا وہی صاحب تشریف لائے اور لانڈری ڈھلے سے کہنے لگے دیکھا اُس غریب کی آہ کا نتیجہ۔ لانڈری ڈھلا ندامت سے آنکھیں نیچے کیے کھڑا رہا۔

گلی قاسم جان میں احمد نام کا ایک بدمعاش تھا جس کا قد سوا سات فٹ تھا۔ اس نے بسکٹ اور بچوں کی مٹھائیوں کی دوکان بنا رکھی تھی۔ اس کی عادت تھی کہ دوکان کے دروازے کا ایک پٹ ہمیشہ بند رکھتا اور اُس کی اوٹ میں بیٹھا رہتا جونہی کوئی بچہ دوکان کے پاس سے گزرتا تو اُسے بڑے پیار سے بلاتا اور بغیر کچھ لیئے دیئے بسکٹ یا ٹافی وغیرہ دے دیتا۔ بچہ خوشی خوشی مفت کا بسکٹ یا ٹافی کھاتے ہوئے اپنے گھر چلا جاتا۔ بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ انھیں کوئی پیار سے بلائے اور کھانے کے لیے مٹھائی وغیرہ دیتا رہے تو وہ اُس سے مانوس ہو جاتے ہیں چنانچہ یہ بدمعاش گلی محلے کے بچوں کو بسکٹ ٹافی کھلاتا رہتا اور جونہی سات آٹھ دن گزرتے تو بچوں کے والدین کو جب دوکان کے آگے سے نکلتا دیکھتا تو بڑی رُعب دار آواز میں مفت کھانے والے کسی بھی بچے کے باپ کو بلا لیتا اور کہتا کہ تمھارا بچہ ہر روز بسکٹ ٹافی لے جاتا ہے سات روپیہ کا بل ہو گیا ہے فوراً ادا کرو۔ بدمعاش کے رُعب سے ڈرتے ہوئے ہر باپ اپنے بچوں کے اس فرضی بلوں کی ادائیگی کرنے میں ہی خیریت سمجھتا۔ احمد بدمعاش کے اس رویّے سے گلی محلے کے سب لوگ نالاں تھے مگر کچھ کر نہیں سکتے تھے۔

ایک دن کسی راہ چلتے نے احمد بدمعاش کو بتایا کہ تمھارا بھائی ہمدرد دواخانہ کے سامنے پٹ رہا ہے۔ احمد بدمعاش کھانا کھا رہا تھا۔ لہٰذا وہ کھانے کو ویسے ہی چھوڑ کر ہمدرد دواخانہ کی طرف دوڑا اور جاتے ہی اُس شخص کے سر پہ زور سے مکا مارا جو احمد بدمعاش کے بھائی کو پیٹ رہا تھا جس سے وہ شخص بڑی طرح سے ایک طرف گر پڑا اور احمد بدمعاش اس پر پل پڑا۔ احمد بدمعاش کے ہاتھوں پٹ رہے شخص کا چھوٹا بھائی جس کی عمر مشکل سے پندرہ سال کی تھی بڑی تیزی سے بھاگا اور ہمدرد دواخانہ کے سامنے والی گلی کی نکڑ پہ درزی کی بادنچی دوکان سے قینچی اٹھا لایا اور زور سے احمد بدمعاش کے پیٹ میں گھونپ کر دائیں طرف سے پیٹ میں قینچی گھس کر بائیں طرف جا نکلی۔ احمد بدمعاش کے پیٹ سے لہو کے فوارے چھوٹ رہے تھے محلے اور بازار کے سب لوگ احمد بدمعاش سے نالاں تھے کسی نے بھی اُسے اُٹھایا تک نہیں آخر کار احمد بدمعاش کے پٹے ہوئے بھائی نے ہی کسی طرح اُسے تانگ پہ لادا اور ارون ہسپتال کی راہ لی مگر تانگہ ابھی حوض قاضی بھی نہ پہنچا تھا کہ احمد بدمعاش کی موت ہو گئی۔

جالندھر کے ایک سرکردہ زمیندار (جن کا نام اس وقت یاد نہیں آرہا) گھوڑے پر سوار جا رہے تھے ایک گھوسی سر پہ سوکھی گھاس کا اونچا سا گٹھا اٹھائے آرہا تھا۔ معلوم کس طرح گھاس کے گٹھے کی پھیلی ہوئی سوکھی گھاس کے دو تین تنکے زمیندار صاحب کی ناک سے چھو گئے۔ جس پر زمیندار صاحب نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے چابک سے گھوسی کو اتنا پیٹا کہ دیکھنے والوں کے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور گھوسی پٹتا رہا آسمان کی طرف نظریں جمائے رہا۔ گھوسی نہ تو چیخا اور نہ ہی اُس نے کوئی احتجاج کیا بس خاموش رہا اور آسمان کی طرف نظریں جمائے رہا۔ قریب کے کھیت سے ایک صاحب دوڑتے ہوئے آئے اور گھوسی سے کہنے لگے کہ تو زمیندار کو کچھ کہہ دے یا خوب گالیاں دے دے مگر گھوسی خاموش رہا۔

دوسرے ہی دن زمیندار صاحب صبح ہی گھوڑے

(باقی صفحہ ۱۰۹ پر)

انجمن یادگارِ امن لکھنوی غازی آباد
کا طرحی مشاعرہ

انجمن یادگارِ امن لکھنوی نومبر ۱۹۸۳ء میں قائم ہوئی اس کے بعد سے ہر ماہ کے تیسرے اتوار کو بوقت صبح ۹ یا دس بجے حسبِ موسم نشست ہوتی ہے ۱۹ راگست کو جو نشست ہوئی شریک شعرا میں سے جن کا کلام دستیاب ہو سکا اس کا انتخاب مندرجۂ ذیل ہے۔ صدارت جناب شمس نے فرمائی مصرعِ طرح تھا۔ "دریچہ بے صدا کوئی نہیں ہے" صدا۔ وفا وغیرہ قوافی اور کوئی نہیں ہے ردیف

• جناب محمد صادق۔ ایک مسجد میں دینی تعلیم دیتے ہیں آپ بزرگوں میں ہیں۔ آپ کی غزل کے اشعار تبرکاً پہلے پیش کیے جاتے ہیں۔ آپ سب سے پہلے پڑھنے والے نہیں تھے لیکن چونکہ آپ کے کلام میں دینی جھلک ہے اس لیے اسی سے شروع کیا جاتا ہے۔ آپ کا تخلص ساحل ہے

انتخاب

کسی کی مانتا کوئی نہیں ہے
کسی کا بھی خدا کوئی نہیں ہے
یہ انساں خود ہی آئینہ ہے اپنا
کسی کا آئینہ کوئی نہیں ہے
رہے ہیں خون کے پیاسے تو لاکھوں
مگر ہاں کربلا کوئی نہیں ہے
زمانے میں ہیں مجھ سے تو ہزاروں
نہیں ہے آپ سا کوئی نہیں ہے
پتہ جب سے ترا پایا ہے میں نے
مجھے اپنا پتہ کوئی نہیں ہے

• جناب یامین متخلص بہ مسافر نوجوان شاعر ہیں۔ پیشہ تجارت ہے۔ جناب جمیل ہاپوڑی کے تلامذہ میں ہیں۔

کلام

وہاں غم کا پتہ کوئی نہیں ہے
یہاں جس سے بچا کوئی نہیں ہے
لیے بیٹھے ہیں سب ہاتھوں میں خنجر
لبوں پر اب دعا کوئی نہیں ہے
دعا آنکھوں کی مانگی تھی جنہیں نے
ہمیں پہچانتا کوئی نہیں ہے
یہ کس دل سے ملاقاتیں ہوئی ہیں
طبیعت سے ملا کوئی نہیں ہے
مسافر بھیڑ ہے یوں تو سفر میں
مناسب رہنما کوئی نہیں ہے

• جناب عتیق الرحمن صاحب نوجوان شاعر ہیں۔ جدید انداز کی غزل کہتے ہیں ؎

نظر آتے بھی کیا آنکھوں سے مجھ کو
پرندہ خواب کا کوئی نہیں ہے
خموشی شہر میں ہے چار جانب
تمہارا تذکرہ کوئی نہیں ہے
شہادت سب در و دیوار دیں گے
دریچہ بے صدا کوئی نہیں ہے
کہاں سے آرہی ہے گرم خوشبو
دریچہ جب کھلا کوئی نہیں ہے
پریشاں ہو رہے ہو کیوں سفر سے
عتیق اب فاصلہ کوئی نہیں ہے

• جناب بہار ایٹوی۔ نوجوان شاعر ہیں۔ ترنم دلکش ہے۔ کسی ضرورت سے غازی آباد آئے تھے۔ شرکت سے

مشاعرے کو شرف بخشا

کلام

بس اب شکوہ گلہ کوئی نہیں ہے
کہ تم سے آسرا کوئی نہیں ہے
ہمیں اتنی نہ دھمکی ناخدا دے
ہمارا ایک خدا کوئی نہیں ہے
نظر کے فاصلوں کو غم نہ کر دو
دلوں کا فاصلہ کوئی نہیں ہے
ملا بھی دو من و تو کے یہ جھگڑے
تمہیں ہو ماسوا کوئی نہیں ہے
نظر افروز ہیں یوں تو ہزاروں
مگر پھر آپ سا کوئی نہیں ہے

● جناب محمد اشرف انجم ۔ دہلی گیٹ غازی آباد میں مقیم ہیں ۔ ایک مسجد کے امام ہیں ۔ غزل کا انداز جدید ہے

کلام

فنا تک فاصلہ کوئی نہیں ہے
وہاں چھوٹا بڑا کوئی نہیں ہے
گلی میں نقش پا کوئی نہیں ہے
پتہ [illegible] کا ملا کوئی نہیں ہے
نگر کے راستے خاموش کیوں ہیں
دریچہ تک کھلا کوئی نہیں ہے
چلے آؤ تصور میں ہمارے
سمندر خوں کا کوئی نہیں ہے
مجھے ڈھونڈوگے انجم کس گلی میں
مرے گھر کا پتہ کوئی نہیں ہے

● جناب پروفیسر نصر حمید ستار گڑھ ۔ ایم ۔ اے ۔ ڈی ۔ پی اے ۔ بی ۔ ایچ ۔ ڈی آپ جناب اسن کے منجھلے صاحبزادے ہیں ۔ دہلی میں پروفیسر ہیں ۔

کلام

غضب ہے بولتا کوئی نہیں ہے
بھری محفل میں کیا کوئی نہیں ہے
جہاں سے لوٹ کے جو گھر میں تو جانیں
جہاں میں باوفا کوئی نہیں ہے
میں اپنے آپ کو دیکھوں تو کیسے
نظر میں آئینہ کوئی نہیں ہے
سڑک پر دور تک جنگل سڑک کا
کہیں بھی راستہ کوئی نہیں ہے
تماشا دیکھنے والے بہت ہیں
مگر درد آشنا کوئی نہیں ہے

● جناب اصغر باغپتی ۔ آپ جناب جمیل مانپوری کے تلمیذ ہیں ۔ فی الحال ملازمت کے سلسلے سے غازی آباد میں قیام ہے ۔

کلام

خدا والے جسے تسلیم کر لیں
صنم ایسا بنا کوئی نہیں ہے
بجھا دے پیاس جو سب کے دلوں کی
کہیں ایسی گھٹا کوئی نہیں ہے
سبب کچھ اور ہے گمراہیوں کا
نہ سمجھو رہنما کوئی نہیں ہے
الٰہی آنسوؤں کی لاج رکھ لے
لبوں پر التجا کوئی نہیں ہے
زبانوں پر تو ہے اصغر سبھی کی
دلوں میں ایکتا کوئی نہیں ہے

● جناب تصور نصرانی ۔ عرصہ دراز سے غازی آباد میں مقیم ہیں ۔ خوش گو شاعر ہیں ۔

کلام

کہوں کیا اب مرا کوئی نہیں ہے
تصور آشنا کوئی نہیں ہے
خوشی کی ابتدا ہی انتہا ہے
غموں کی انتہا کوئی نہیں ہے
یقیناً ڈوب جائے گا سفینہ
کہ جس کا ناخدا کوئی نہیں ہے
مرا سایہ بھی ہے مجھ سے خفا سا
مرے سب ہیں مرا کوئی نہیں ہے

اگر ہے تو پردے ہے آسماں کے
زمیں پر تو خدا کوئی نہیں ہے

● جناب منظر سہاوری۔ مدت دراز سے شعر کہتے ہیں پختہ گو شاعر ہیں بیشتر قیام غازی آباد کے باہر رہتا ہے ؎

کہیں نغمے کہیں آہیں ملیں گی
دریچہ بے صدا کوئی نہیں ہے
سر مدفن ہیں لاکھوں شمعیں روشن
تہ مدفن دیا کوئی نہیں ہے
نظر اہل نظر پہچان لیں گے
لبوں پر التجا کوئی نہیں ہے
مری قسمت ہی میں بربادیاں تھیں
مجھے تم سے گلہ کوئی نہیں ہے
بزرگوں کا پتہ دیتے تھے جو لوگ
اب ان کا بھی پتہ کوئی نہیں ہے

● جناب جمیل ہاپوڑی۔ آپ کا شمار اساتذہ میں ہے۔ عرصۂ دراز سے غازی آباد میں مقیم ہے۔ کلام اور ترنم دونوں دلکش ہیں۔ آپ کا تعلق ترقی پسندوں سے ہے ؎

کلام

میں ایک ایسی بلندی پر کھڑا ہوں
جہاں چھوٹا بڑا کوئی نہیں ہے
زبانیں کاٹ کر بھاگا ہوں جیسے
مرے پیچھے صدا کوئی نہیں ہے
دعا کچے مکانوں کی جو سن لے
فلک پر وہ گھٹا کوئی نہیں ہے
ہم اچھا وقت لانا چاہتے ہیں
سوا اُس کے خدا کوئی نہیں ہے
سب اپنے اپنے چہروں پر فدا ہیں
کسی کو دیکھتا کوئی نہیں ہے

● جناب کرشن لال نام۔ ادیب تخلص۔ جناب امن لکھنوی کے منجھلے بھائی ہیں آپ کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے علم عروض پر اچھی نگاہ رکھتے ہیں۔ قادر الکلام شاعر ہیں

کلام

در و دیوار کہتے ہیں فسانے
دریچہ بے صدا کوئی نہیں ہے
سبھی ہیں آپ سے اے میرے خالق
مگر ہاں۔ آپ سا کوئی نہیں ہے
نہ بھولے سے کسی کا دل دکھاؤں
سوا اس کے دعا کوئی نہیں ہے
نہیں تاب و تواں رہرو میں خود ہی
غلط ہے رہنما کوئی نہیں ہے
مرا دست دعا ہے اک محافظ
سپر اس کے سوا کوئی نہیں ہے

● جناب منیا میرٹھی۔ جناب سیماب اکبرآبادی اور علامہ کیفی کے تلامذہ میں ہیں کہنہ مشق شاعر ہیں۔ انجمن یادگار اتحاق کی نشستیں آپ ہی کے دولت کدے پر ہوتی ہیں ؎

کلام

میں وہ دلدادۂ حسن و وفا ہوں
کہ جس کا مدعا کوئی نہیں ہے
زمانے بھر میں ہے باطل پرستی
حقیقت آشنا کوئی نہیں ہے
کہاں ہیں اب فغان و آہ و نالہ
دم آخر مرا کوئی نہیں ہے
بجا ہے یہ سخن بالکل تمہارا
محبت کا صلہ کوئی نہیں ہے
خدا کا نام ہے لب پر ضیا کے
خیال ماسوا کوئی نہیں ہے

(بقیہ صفحہ ۱۰ کا)

بلبل چہ گفت

دہلی مشاعرے کی کامیابی یقینی بنا دی گئی منتظمین [illegible] نے اس بار بھونوں کی بے تحاشہ بربادی سے گریز کیا ہے [illegible] آئندہ بھی دلی اردو اکاڈمی کی تقریبات میں ہر قسم کے فضول [illegible] سے گریز کیا جائیگا۔

مشاعرہ جشنِ آزادی انجمن عروجِ ادب دہلی

شمس تبریزی

گذشتہ دنوں راجدھانی میں ہوئے چند مشاعروں سے مشاعروں کی فضا بنی تھی اور شاعر و سامعین کے درمیان جو ربط قائم ہوا تھا اسے انجمن عروجِ ادب کے مشاعرے نے تقریباً ختم کر دیا اور ایک مرتبہ پھر اس مشاعرے میں وہ تمام باتیں دہرائی گئیں جن سے ادبی مشاعروں کی روایت کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ حالانکہ گزشتہ برس بھی اس انجمن کی جانب سے کل ہند مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا اور مشاعرہ کامیاب رہا تھا لیکن اس مرتبہ نہ جانے کیوں اراکین انجمن میں وہ جوش دیکھنے میں نہیں آیا۔

جشنِ آزادی کے موقع پر انجمن عروج ادب کا یہ ۲۲ واں ال ہند مشاعرہ تھا جس میں سامعین توقع لے کر آئے تھے کہ کچھ ایسا کلام سننے کو ملے گا جو تشنگی مٹا دیگا۔ لیکن اس کے برعکس مشاعرے میں چند ایک کے علاوہ جو شاعر موجود تھے سامعین سے ذہنی طور پر ہم آہنگ نہ ہو سکے۔ غالباً اس مشاعرے میں بھی انھیں شاعروں کو مدعو کیا گیا تھا جن کا اراکین انجمن سے کوئی تعلق تھا یا کسی دباؤ کے تحت انھیں مذکورہ شاعر کو بلانے کے لیے مجبور ہونا پڑا تھا جہاں تک سامعین کا سوال ہے انھیں اگر سنجیدہ اور معیاری کلام سننے کو ملے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ مہمان شاعر کو نہ سنیں اور اس سے محظوظ نہ ہوں۔ یہی وہ سامعین ہیں جو اچھے شاعر کو اس کے کلام سے زندہ رکھتے۔ اس مشاعرے میں کم و بیش ۲۱ شعرا نے شرکت کی جن میں زیادہ تر نے کلام سے زیادہ ترنم کو ترجیح دی۔ حالانکہ اب یہ چیز فرسودہ نظر آتی ہے اور بقول شاعر ہی ؎

یہ ہنر تو کتابوں میں چھپ نہیں سکتا

پھر بھی مسلسل اس روش پر قائم رہنے سے نہ جانے کیوں گریز نہیں کرتے۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر مشاعرہ اپنے مقررہ وقت سے پون گھنٹہ تاخیر سے شروع ہوا۔

مشاعرے کی صدارت وزیر مملکت مسٹر ضیاء الرحمٰن انصاری نے کرنی تھی جسے انھوں نے کنور مہندر سنگھ بیدی کے سپرد کر دی۔ مشاعرے کا افتتاح کرتے ہوئے مسٹر انصاری نے کہا شاعر ہمارے وطن کا قیمتی سرمایہ ہیں اور انھوں نے ہمیشہ محبت اور اخوت کے گیت گائے ہیں اور اس وقت بھی ان کے ان گیتوں کی ملک کو اشد ضرورت ہے۔ تقریر کے اختتام پر انھوں نے دو شعر پڑھے دوسرے شعر کو نہ تو اپنا بنایا اور نہ ہی کسی شاعر کا حوالہ دیا۔ بالترتیب جو شعر پڑھے آپ کی خدمت میں حاضر ہیں ؎

عجب انداز ہے ان کے مزاج خود نمائی کا
جسے ناکام رکھتے ہیں اسے اپنا سمجھتے ہیں

●

آج نیرنگیٔ تقدیر کو ہم مان گئے
ہم نہ پہچان سکے وہ ہمیں پہچان گئے

مسٹر ضیاء الرحمٰن انصاری کی تقریر کے بعد صدر انجمن۔ نظامت کے فرائض ملک زادہ منظور احمد کو سونپتے ہوئے مائک سنبھالنے کی درخواست کی۔ اور ناظم مشاعرہ نے سب سے پہلا دہلی کے ہی ایک میزبان شاعر حبیب عاصم کو دعوتِ کلام دی۔ حبیب عاصم بنیادی طور پر گیتوں کے شاعر ہیں۔ متفرق اشعار کے بعد گیت پڑھا۔ ایک شعر آپ بھی ملاحظہ کریں ؎

یہ کیا کہا کہ بہت زخم کھائے ہیں دل پر
اگر یہ دل ہے تو بس ایک زخم کافی ہے

اب باری تھی امروہہ کے نابینا شاعر حافظ شمیم احمد شاعر بظاہر نابینا تھا لیکن احساس کی آنکھوں سے تمام کائنات کا مشاہدہ کرتا تھا۔ دو شعر ؎

کوئی بھی راہ زمانے میں پُرخطر نہ لگے
مسافروں کو اگر ہمسفر سے ڈر نہ لگے
ہمارے دور کی تہذیب کا نمائندہ
وہ شخص ہے جسے آئینہ معتبر نہ لگے

حافظ شمیم کے بعد دعوت کلام دی گئی نظر ابڑوی کو۔ پنڈت نظر ابڑوی کا ترنم اچھا ہے غزل سے زیادہ معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی فلمی گیت پڑھ رہے ہوں جو شعر پڑھے ان میں سے چند آپ بھی دیکھیں ؎

اس نے ہنس کر نظر جھکا لی ہے
آج کچھ بات ہونے والی ہے
آپ نے مجھ کو بے وفا کہہ کر
کون سی دشمنی نکالی ہے

اب رضا امروہوی آئے جو غزل پڑھی سامعین نے اس ردیف پر گاہے گاہے چوٹیں کسیں۔ دو شعر پڑھئے ؎

نئی بہار کا جب پیرہن سلگتا ہے
گلوں میں رہ کے صبا کا بدن سلگتا ہے
مجھے خبر بھی ہے تیری نگاہ سے بچ کر
وہ کون ہے جو سرِ انجمن سلگتا ہے

ناظم مشاعرہ نے دعوتِ کلام دی اب انجمن عروج ادب کے صدر ساحر ہوشیارپوری کو۔ اور انھوں نے غالب کی زمین میں کہی گئی ایک غزل پڑھی چند شعر ملاحظہ کریں ؎

خدا جانے یہ قہر آلود ہے یا مہر افشاں ہے
تمھاری ہر نظر لیکن سکونِ دل کا ساماں ہے
یہ کس کے خال و خد ہیں بگڑتے مٹتے رہتے ہیں
یہ کیسا شخص ہے جو سامنے ہے اور پنہاں ہے

ساحر کے بعد اب مزاحیہ شاعر کی باری تھی۔ ساغر خیامی اسٹیج پر آئے۔ ساغر غالباً طنز و مزاح کے میدان میں تنہا شاعر ہیں جو شاعری کے انداز میں ہنستے ہنساتے سامعین سے ہم کلام ہوتے ہیں اور ان کی توقع پر کھرا اترتا ہے جو نظمیں اور قطعات سنائے ان میں سے ایک آپ بھی پڑھئے ؎

ایسی کوئی مثال زمانے نے پائی ہو
ہندو کے گھر میں آگ خدا نے لگائی ہو
بستی کسی کی رام نے یارو جلائی ہو
نانک نے صرف راہ سکھوں کو دکھائی ہو
رام و رحیم نانک و عیسیٰ تو نرم ہیں
چیلوں کو دیکھئے تو وہ پیتل سے گرم ہیں

ساغر خیامی نے محفل کو زعفران زار بنایا اور ان کے بعد مہمان شاعر گوہر عثمانی کو دعوتِ کلام دی گئی۔ اور انھوں نے سامعین کو سوچنے پر مجبور کیا۔ دیکھئے ؎

کیسے پتہ چلے گا گنہگار کون ہے
سب بے قصور ہیں تو خطاوار کون ہے
یہ فیصلہ بھی آپ مورخ پہ چھوڑیئے
تاریخ خود بتائے گی غدار کون ہے

گوہر عثمانی کے بعد صدر مشاعرہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کو بلایا گیا۔ سحر صاحب نے ایک پرانی غزل پڑھی دو شعر آپ بھی سنئے ؎

تم مری بات نہ مانو گے نہ مانو لیکن
اس سے بھاگو گے کہاں اس سے مفر کوئی نہیں
دل محبت کا وہ زنداں ہے کہ جس میں اے دوست
صرف دیوار ہی دیوار ہے در کوئی نہیں

مشاعرے کی صدارت شاید غائبانہ طور پر خمار بارہ بنکوی کو سونپی گئی کیونکہ سحر صاحب اپنے شعر پڑھ کر روانہ ہو چکے تھے (غائبانہ اس لیے کہ اس مرتبہ متبادل صدر کا باقاعدہ نام نہیں لیا گیا) بہرحال اب ناظم مشاعرہ نے کیف بھوپالی کو زحمت کلام دی اور انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں غزل چھیڑی ؎

جھگڑے ہیں عبادت خانوں میں دھوکے ہیں زیارت گاہوں میں
اللہ کے بندو ہم سے ملو ایمان ہے ہم گمراہوں میں
وہ کیف وہ اک آوارہ منش اس شہر کو جب سے چھوڑ گیا
زینت نہ رہی بازاروں میں رونق نہ رہی چوراہوں میں

کیف بھوپالی کی مترنم غزل کے بعد مزاحیہ شاعر ناظم انصاری کو بلایا گیا۔ ناظم انصاری نے چند پرانے اشعار پڑھے جن کو سامعین نے پسند کی نگاہ سے نہیں دیکھا کیونکہ ظرافت صرف ہنسنے ہنسانے کا نام نہیں ہے بلکہ ایک صحت مند شگفتہ فضا بھی تیار کی جاتی

ہے ناظم نے جو شعر پڑھے انھیں آپ بھی دیکھئے ؎

ترے ساتھ میرا کیوں ہو رہ عشق میں گزارا
ترن زندگی ہے ہم پٹ مری زندگی کا گذارا
کہیں تو لپک نہ جائے مری سختیوں سے دب کر
ترا حسن ہے شرارے مرا عشق ہے چھوارا

اب ناظم مشاعرہ ملک زادہ منظور احمد خود مائک پر آئے اور اس طرح گویا ہوئے ؎

گزرا ہے کون غلغلہ فشاں کچھ جواب دو
دل ہے اسیر وہم و گماں کچھ جواب دو
کیوں تشنہ کام اب بھی ہیں رندان باصفا
سیراب جب ہے پیر مغاں کچھ جواب دو

ناظم مشاعرہ کے بعد اب رام کرشن مضطر مائک پر آئے اور روایتی انداز کی غالب کی زمین میں کہی گئی غزل پیش کی جسے سامعین نے صبر و استقلال سے سُنا۔ دو شعر آپ بھی پڑھئے ؎

برگشتہ ان کے ساتھ ہی سارا جہان ہے
اب وہ زمین اور نہ وہ آسمان ہے
مینج خموشش فکر سخن ساغر شراب
اب میرے واسطے یہی دارالامان ہے

اب ناظم مشاعرہ نے بنگلور کے مہمان شاعر باقری کو دعوت کلام دیتے ہوئے ان کا تعارف کرایا کہ وہ اس سے قبل مشرانڈ یا رہ چکے ہیں اور اب شاعری کے میدان میں یہ اعزاز حاصل کرنے کے لیے جولانیاں دکھا رہے ہیں۔ بہرحال انھوں نے کسمپرسی کے عالم میں ایک نظم بعنوان "شاعر کسے کہتے ہیں" پڑھی اور نظم کو ادھورا چھوڑ کر ہی چلا جانا پڑا۔ اب باری تھی والی آسی کی لکھنؤ کے مہمان شاعر نے جدید لہجے کے شعر پڑھے جو عہد حاضر کے کرب کو بیان کر رہے تھے ؎

ہم نے اک شام چراغوں سے سجا رکھی ہے
شرط لوگوں نے ہواؤں سے لگا رکھی ہے
[illegible] کوئی ہم سے بھی پیاسا زیادہ
بس یہی سوچ کے تھوڑی سی بچا رکھی ہے

والی آسی کے بعد رفعت سروش کو بلایا گیا۔ رفعت سروش نے بڑی بحر کی غزل پڑھی۔ ایک شعر دیکھئے ؎

منزل پہ کھڑا یہ سوچتا ہوں پھر راہ سے میں بھٹک گیا ہوں
خود آیا ہے وقت میرے پیچھے میں وقت کے ساتھ کب چلا ہوں

اب بزرگ شاعر مشیر جھنجھانوی کو زحمت دی گئی اور انھوں نے فکری عناصر سے بھرپور مکمل غزل پیش کی جس میں انکے تجربات نمایاں تھے ؎

نظر تحریر بنتی جا رہی ہے
خلش تفسیر بنتی جا رہی ہے
یہ پتہ گر گیا وہ شاخ ٹوٹی
ہوا شمشیر بنتی جا رہی ہے
نقوش زرد یکجا ہو رہے ہیں
مری تصویر بنتی جا رہی ہے

مشیر جھنجھانوی کے بعد اب طنز و مزاح کے تیسرے شاعر جو لکھنؤ سے تشریف لائے تھے وحشت لکھنوی کو بلایا گیا۔ وحشت نے سامعین سے رابطہ کیا لیکن کامیابی ہاتھ نہ لگی۔ دیکھئے ؎

اس دور گرانی میں ہے شادی جنجال
بیوی ہوئی ناراض ہوئے ہم کنگال
اب کیسے کٹیں ہجر کی راتیں وحشت
حجام کی قینچی میں ہے زلف بنگال

مزاحیہ شاعر کے بعد ناظم مشاعرہ نے ڈاکٹر بشیر بدر کا نام لیا۔ بشیر بدر کی شاعری عہد حاضر کی نمائندہ شاعری کہی جا سکتی۔ جسے سُن کر یا پڑھ کر ایک توانائی کا احساس پیدا ہوتا ہے چند شعر دیکھئے ؎

اسے پاک نظروں سے چومنا بھی عبادتوں میں شمار ہے
کوئی پھول لاکھ قریب ہو کبھی اُس کو میں نے چھوا نہیں
اسی شہر میں کئی سال سے میرے کچھ قریبی عزیز ہیں
انھیں میری کوئی خبر نہیں مجھے اُن کا کوئی پتہ نہیں

بشیر بدر کے بعد جدید لہجے کے شاعر مخمور سعیدی کو دعوت سخن دی گئی۔ مخمور سعیدی کی غزلیں فکری عناصر سے بھرپور ہوتی ہیں۔ جو غزل پڑھی اُس کے دو شعر پڑھیے ؎

خون گل اس قدر ارزاں نہیں دیکھا جاتا۔ ہم سے یہ رنگ گلستان نہیں دیکھا

کوئی دیوانہ اٹھے کوئی سنوارے آکر
زلف گیتی کو پریشاں کو نہیں دیکھا جاتا

اب باری آئی رام پور کے مہمان شاعر ڈاکٹر راہی کی ۔ راہی کے شعروں میں شیخ و برہمن کی چھیڑ نمایاں ہے ۔ انھوں نے مختلف اشعار سنائے ۔ ان میں دو شعر دیکھئے ۔

آج اصولوں کی دہائی کا سہارا لے کر
آپ جو چاہیں کہیں آپ کو آزادی ہے

اور یہ شعر جوان کا نمائندہ شعر ہے اور زبان خاص و عام ہے ۔

آج اتنی بھی میسر نہیں میخانے میں
جتنی ہم چھوڑ دیا کرتے تھے پیمانے میں

اور اب مشاعرے کے مقطع کے طور پر جناب بارہ بنکوی بچے تھے ۔ ناظم مشاعرہ نے ان کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ خمار جس دور کے شاعر ہیں تقریباً اس دور کی شاعری چراغ بجھا رہے ہیں ۔ جو غزل پڑھی تغزل سے بھرپور تھی ۔ شعر پڑھیے ۔

وہ مجھ سے میں اس سے جدا ہو گیا
زمانے کا قرضہ ادا ہو گیا
بچا سا ہی تھا یوں بھی اپنا دیا
چلو آندھیوں کا بھلا ہو گیا
جو بارش کو خاطر میں لاتا نہ تھا
وہ ادنیٰ سا مکاں راستہ ہو گیا

رات کے تقریباً ساڑھے بارہ بج رہے تھے مشاعرے سے پہلے دور کے اختتام کا اعلان کر دیا گیا ۔ سامعین اپنی نشستوں سے ... کی طرف دوڑے جس کا انتظام کیا گیا تھا ۔ بعد ازاں ہم یہ سوچتے ہوئے اٹھے کہ اگر ایسے ہی شاعرے چند دن ... ہوتے رہے تو یہ تمیز کرنا مشکل ہو جائے گا کہ اشارہ ... کی تہذیب اچھی ہے یا ہماری تہذیب کو مسخ کرنے میں ... کا زبردست رول ہے ۔ حالانکہ اس سے قبل بھی ایسے ... ہوتے رہے ہیں لیکن اتنا خراب تو نہیں تھا جس میں یہ ... جا سکتا کہ ان کا اہتمام و انتظام ہی یکسر بے سود ہے ... اگر مشاعروں کو اسی طرح منعقد کیا جاتا رہا اور ... شاعروں کو بلایا جاتا رہا تو وہ دن دور نہیں جب ہمیں مشاعرہ کا نام بدل کر کچھ اور رکھنا پڑے ●●

(بقیہ صفحہ ... کا)

بہ کوئے یار

پر سوار ہو کر گھر سے نکلے ابھی گاؤں سے تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ چھوٹے سے گڑھے میں گھوڑے کا پاؤں اس انداز سے پڑا کہ گھوڑا اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور گر گیا ۔ گھوڑے کے گرنے ہی زمیندار صاحب بھی گھوڑے کی اگلی طرف گر پڑے اور اُن کا سر ایک بڑے سے پتھر پر اس زور سے لگا کہ زمیندار صاحب کلمۂ شہادت بھی نہ پڑھ سکے اور اُن کی روح قفسِ عنصری سے اڑ گئی ۔

گاؤں والوں نے اُس شخص سے پوچھا کہ آپ نے اس وقت گھوسی سے یہ کیوں کہا تھا کہ زمیندار کو کچھ کہہ دے خواہ گالیاں ہی دے دے تو اس شخص نے فرمایا کہ میں نے بڑوں سے سُنا ہے کہ اگر ظلم کرنے والے کو مظلوم کچھ بددعا یا گالی وغیرہ دے دے تو معاملہ عوض معاوضہ گلہ انداز کے طور پر وہیں ختم ہو جاتا ہے اور اگر مظلوم قطعاً خاموش رہے تو پھر معاملہ خدا کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور خدا کا فیصلہ تو بالکل سولہ آنے صحیح ہوتا ہے ۔ رہے نام اللہ کا

غزلیں

• ڈاکٹر راہی رام پور

مرا ہر شعر شرحِ معرفت ہے
مری ہر اک غزل اک منقبت ہے
جنوں اک تاجدارِ سلطنت ہے
خرد اسکی مشیرِ مملکت ہے
خدا تو دور خود سے بے خبر ہوں
یہ احساسِ آگہی کی منزلت ہے
خبر بھی ہے تجھے اے مصلحت بیں!
دیانت سب سے بڑھ کر مصلحت ہے
ترس آتا ہے واعظ پر کہ راہی!
اُسے ہر لحہ خوفِ عاقبت ہے

• احمد حسین شمس

صبا قصۂ شب سناتی رہی
چمن میں کلی مسکراتی رہی
حیات اپنی رودادِ غم یہ ہو موت سے
وہ کہتی رہی یہ بلاتی رہی
وہ خود کو سنوارا کیے رات بھر
چمک آئینے کی لجاتی رہی
خوشا بخت وہ آپ کی کار یقنی
ملاقات بھی حادثاتی رہی
اُدھر آپ دامن بچاتے رہے
اِدھر آنکھ موتی لٹاتی رہی
صفات اپنی حد میں تو ہیں بے حجاب
مگر ذات کیوں منہ چھپاتی رہی
دھدکتی رہی آگ دل میں مگر
زباں شمس کی گنگناتی رہی

• پیارا مجید الرب نشتر

نہ دیکھا جس نے نگاہیں کبھی اٹھا کے مجھے
اسی نے لوٹا سرِ انجمن بلا کے مجھے
یہاں تو خود میرا سایہ بھی ہوگیا دشمن
کہاں یہ چھوڑ دیا بے کسی نے لا کے مجھے
میں آج اپنی حقیقت کو بھول جاؤں گا
جو دیکھے گا وہ محبت سے مسکرا کے مجھے
شبِ فراق گئی ہے تو کس طرح اے دوست
جلا رہے تھے ستارے بھی جھلملا کے مجھے
نہ مل سکا میرے دل کو سکون دنیا میں
سکوں ملا ہے ترے در پہ سر جھکا کے مجھے
تمام عمر کیا جن پہ ناز اے نشتر
چلے ہیں آج وہی خاک میں ملا کے مجھے

• بسمل نقش بندی (بانس واڑہ)

آخر کھلا یہ پردۂ زر تار کا سبب
تم بن گئے ہو خواہش دیدار کا سبب
اک پھول کو مسل کے ہوا میں اڑا دیا
پوچھا جو اُن سے رفعتِ کردار کا سبب
ساقی سے بازپرس کی جرأت غلط ہے جب
اک جرعۂ مئے ہے لغزشِ میخوار کا سبب
محور بنو دِ حسن۔ تو مرکز وجودِ عشق
اک دائرہ ہے گردشِ پرکار کا سبب
بسمل کو پہلے خود ہی دیا داغ آرزو
پھر پوچھتے ہو عشق کے آزار کا سبب

تجدیدِ فکر و شوق

توصیف علوی عاصی کیرانوی

جب کہ آزادی کا گونجا تھا پیام
زندگی کے جب نئے چھلکے تھے جام
جب نئی کرنوں کے ابھرے تھے نقوش
جبکہ صبح نو سے بدلی تھی [illegible]

میکدہ کی جبکہ بدلی تھی فضا
جب لیا تھا رندوں نے عہد وفا
جبکہ ساقی کی سجی تھی بزم شوق
جب افق سے گھر کے آئی تھی گھٹا

مل کے جب کھائی تھی الفت کی قسم
جب بڑھے تھے جانب منزل قدم
جب ہوئے تھے ایک ناقوس و اذاں
جب ہوئے تھے ایک دل دیر و حرم

عزم تھا تعمیر گلشن کے لیے
عہد تھا توقیر گلشن کے لیے
تھی قسم فصل چمن کے واسطے
شوق تھا تصویر گلشن کے لیے

پھر سے دینا تھا اخوت کا پیام
بخشنے تھے زندگی کے پھر سے جام
غم کدوں میں تھی جلانی شمع نو
پھر سے کرنا تھا جہاں کو شادکام

کیا ہوئے وہ عہد و پیماں کیا ہوئے
کیا ہوئے وہ ولولے وہ حوصلے
کیوں بھلا بیٹھے وہ نغمات خلوص
کیوں محبت کے وہ ٹوٹے سلسلے

کیوں لگے گرنے وہ خوابوں کے محل
دوستی کے کیوں وہ مرجھائے کنول
کیا ہوا وہ شعر و نغمہ کا سرور
کیا ہوئی وہ شوق کی رنگیں غزل

آگ کے شعلوں میں کیوں ہے گلستاں
رقص کرتی ہے یہ کیوں برق تپاں
خار و گل میں چپقلش کیسی ہے یہ
فصل گل کیوں رہ گئی بن کر دھواں

آؤ پھر رنگیں کریں ہر خواب کو
دیں سکوں ہر اک دل بیتاب کو
جو دھندلکوں میں ہے کھو کر رہ گیا
پھر جلا دیں شوق کے اس باب کو

پھر سے فکر و ذوق کو تعمیر دیں
پھر فضاؤں کو نئی تنویر دیں
جن کو عاصی بھول بیٹھا یہ جہاں
پھر انھیں نغمات کو تاثیر دیں

ملک و قوم کی شاندار ترقی کے لئے

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی

کے

جدید بیس ۲ نکاتی پروگرام

کی کامیابی اور اسے عملی جامہ پہنانے میں

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹ

پوری طرح مستعد ہے اور اپنی تمام تر خدمات وقف کر

بینک نے موجودہ قرضہ جات کی رقم پر ۱۰ فیصد سے زائد سرمایہ اسی پروگرا
تحت پسماندہ طبقوں کو فراہم کیا ہے

هیڈ آفس
۷۸ محمد علی روڈ بمبئی ۳ ۴۰۰۰۰۳
فون نمبر ۔ ۶۵ ۔ ۳۲۴۹۹۱

دھلی بر
۳۶۵۵ نیتاجی سبھاش مارگ دریاگنج نئ
فون نمبر ۲۹۴۳۷۴ ۔ ۲۶۸۲۹۶

ملت اسلامیہ کے لیے لمحۂ فکریہ

• ۔ نظام الدین صادق قرولوی جے پور

آج جبکہ انسان شب و روز ترقی کی راہوں پر گامزن ہے اور دن رات کی مسلسل کوششوں میں انسان کی بہبودی و بہتری کے لیے فنی، مالی، اور اقتصادی حل تلاش کرکے بیکار بعض اشیاء کو بھی آج کے دور میں نسخۂ کیمیا بنا کر پیش کرتا ہے۔

اسی دور میں ایک ایسا قیمتی سرمایہ انسان اپنی لاعلمی کی بنا پر کھوتا چلا جا رہا ہے جو ایک مقدس مقام پر سالہا سال لاکھوں کی تعداد میں خوردنی نعام کی شکل میں دستیاب ہوتا ہے۔ اور قابو سے باہر ہونے کی سبب سپرد خاک کر دیا جاتا ہے یعنی جبکہ آج زمین کے اندر بھی کسی مفید شئے کا ذرا بھی سراغ ملتا ہے تو انسان کروڑوں روپیہ خرچ کرکے اُسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جبکہ کامیابی اور ناکامی خدا کے ہاتھ ہوتی ہے۔

دنیا میں یہ مقدس مقام سرزمین عرب ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ہر عیش و آرام سے نوازا ہے جہاں خدائے قدوس کی رحمتوں کی دن رات بارش ہوتی رہتی ہے۔ اور بارش بھی منارہ انداز سے آپ میرا مقصد شاید سمجھ گئے ہوں گے۔ کہ بارش آسمان سے نہیں بلکہ زمین کے اندر سے ہوتی ہے۔ جسکی شہرت ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور عرب کا ہر باشندہ یعنی معمولی سے معمولی آدمی بھی اس سے فیض حاصل کر رہا ہے۔ اور یہ فیض کا دریا سارے عالم انسانیت کو فیضیاب کر رہا ہے۔ اس فیضیابی سے اہل عرب کی کامیابی تو یقینی ہے مگر اس کامیابی نے خود دل و دماغ کی وسعتوں کو محدود کرکے رکھ دیا ہے۔ جس کا تعلق اہل عرب سے نہیں بلکہ حکومت سعودیہ سے ہے۔ کہ وہ خدا کے

دیئے ہوئے اس انعام کو سالہا سال سے چند ہی روز بلکہ چند ہی گھنٹوں میں لاکھوں کی صورت میں جو نایاب طور دستیاب ہوتا ہے قربانی کے بعد وہی نایاب سرمایہ سپرد خاک کر دیا جاتا ہے۔

یہ چھوٹا سا لمحۂ فکریہ ایک قومی جذبہ کے تحت آپ کے ذہن تک پہنچانے کی جسارت کی گئی ہے کیونکہ ایک عظیم رشتہ کی بدولت قوم کی ہر ملکیت پر فرد اسلام کا پورا پورا حق ہوتا ہے۔ کاش! میری یہ آواز اہل سماعت کے ذہن و دماغ پر اثر کرے۔

ہمیں تسلیم کہ اہل عرب اس بات کو اس لیے نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ سرمایہ چند ہی گھڑیوں میں یا چند ہی دنوں میں، لاکھوں کی تعداد میں جمع ہوتا ہے لیکن کیا یہ زمانہ سو سال پہلے کا زمانہ ہے جو کسی چیز پہ غور و فکر کرنے کا موقع نہیں۔ یہ منطقی دور تو کوڑا کرکٹ سے بھی کیمیا بنا لیتا ہے مگر کیمیا سے کوڑا کرکٹ بنایا جاتا ہے کب تک گوارا کرتے رہیں گے۔ اس مقام پر یہ کہنا تو بے سود ہے کہ عرب والوں کو اللہ نے بہت نواز رکھا ہے اس لیے اس قیمتی سرمایہ کی طرف التفات نہیں جاتا یہ بات غلط ہے۔

آج سعودیہ میں بڑے بڑے کارخانے اور کمپنیاں نیز صنعت و تجارت میں اہل عرب حصہ لے رہے ہیں اور دن بدن نئے کاروبار جاری ہو رہے ہیں اور نئے کارخانے لگانے میں بھی پیش رفت ہو رہی ہے نیز روزگار کے نئے ذرائع تلاش کرکے ساری دنیا کے انسانوں کی بے روزگاری دور کرنے میں ہاتھ بٹایا جا رہا ہے کیا اس قومی سرمایہ کو بھی مکمل اسلامی طریقہ سے پیش کیا جائے

اس میں چار چاند لگ جائیں۔

جہاں تک انسانی فکر و نظر اور جستجو کا تعلق ہے ہر انسان اپنی بساط کے مطابق کرتا ہے۔ میں نے بھی یہ قدم اپنی علمی اور نا اہلی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قوم کے سامنے ایک چھوٹا سا مشورہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاید میری اس تجویز پر دھیان دیا جا سکے

میرا مقصد ضائع ہونے والی بیش بہا شئے ہے چونکہ لالچ ہر انسان کے دل میں فطری طور پر ہوتا ہے اور لالچ و فکر کے تحت ہی آج اہلِ عرب نے چھوٹی چھوٹی صنعتیں چھوٹے چھوٹے کاروبار کو بڑھا وا دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اور مستقبل میں دل و جان سے چھوٹے کاروبار میں حتیٰ کے چھوٹی دکانوں میں حصہ لیکر ساری دنیا کو زرِ مبادلہ سے نوازا ہے۔ جس سے دنیا کا کوئی انسان انکار نہیں کر سکتا۔

مذکورہ حالات کو دیکھتے ہوئے کبھی کبھی دلی احساس کو ایک جھٹکا سا لگتا ہے۔ دماغ کی بیداری دل کو کچوکے دینے لگتی ہے مگر ڈرتے ڈرتے بات زبان پہ آ ہی جاتی ہے کہ کیوں نہ اپنے اس ناقص تخیّل کو رہبرانِ قوم کی نذر کر دوں۔

مگر لغزشیں فطرتاً انسانی میراث ہیں۔ اس لیے صانعِ حقیقی کا خوف ہے۔ میرے ان الفاظ سے اور میرے اس مشورے سے کہیں خدا کی گرفت میں نہ آ جاؤں اور دین و دنیا دونوں ہی خراب ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مجھے ہر آنے والی برائی سے اپنی پناہ میں رکھے آمین

اسلامی زندگی کے پانچ اہم فریضہ ہیں جن میں سب سے اہم فریضہ پانچواں ہے۔ جسکو ہم حج کہتے ہیں۔

کلمہ۔ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج

حج بیت اللہ کا سلسلہ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہو کر سلسلہ بہ سلسلہ امتِ محمدیہ یعنی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر فرض عین قرار دیدیا گیا اور اس حکم خداوندی کے تحت مسلمانانِ عالم یا وہ لوگ جو کہ مالی طور سے مستحکم ہیں اس فریضہ کو ادا کرنے کیلئے ساری دنیا سے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ اور دیگر مقاماتِ مقدسہ کا سفر بمعہ ارکان ادا کرتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں ہے جو کہ ہر مالدار مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔

میرا مقصد حج اور حج بیت اللہ سے متعلق کسی طرح پر روشنی ڈالنا نہیں بلکہ فریضہ حج میں ہونے والی قربانی ایسا ہی ہے فرمان ہے جسے قربانی کہتے ہیں۔ قربانی ہر ایک پر فرض کی گئی ہے۔ اور اسی حج کے وقت جب حاجی قربانی حج کی خاطر ایک سے لیکر دو جانور بھی خدا کی راہ میں قربان کرتا ہے یہاں تک کہ لاکھوں حاجی اس روز تقریباً ۲۵، ۳۰ لاکھ جانور خدا کی راہ میں ذبح کرتے ہیں۔

بیک وقت لاکھوں جانوروں کا ذبح ہونا جن کو گودام میں بھی رکھنے کے لیے بھی جگہ نہیں ہوتی سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں بنتا کہ ان کو مشینوں کے ذریعہ جلد از جلد اٹھا کر قربان گاہ صاف کر دی جائے۔ اس وقت ہر حاجی اللہ کی رضامندی کے لیے عالمِ بے قراری میں ہوتا ہے۔ اور وہ کیفیت ایسی طاری ہوتی ہے کہ ہر ہر قدم پہ ہر ہر فعل سے خدا کے بندہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے علاوہ کچھ نہیں سوچتا۔ بے چارے منتظمین کے دماغ تو اس وقت اس ہجوم سے بڑی طرح الجھے ہوتے ہیں۔ حجاج تو سب مہمانِ خداوندِ قدوس ہوتے ہیں اور اہلِ عرب مہمان نواز اور نواز بھی کیسے کہ ساری دنیا میں عربوں کی مہمان نوازی تاریخ کے زریں ورق پر چمکتی ہے۔ اور چمکتی رہے گی۔ بوقتِ قربانی بے قراری اور بدحواسی کا ہونا بھی عین فطرت کے مطابق ہے کیونکہ سیدنا حضرت ابراہیم خلیل اللہ پر بھی اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کے وقت اسی بے خودی کا عالم طاری ہو گیا تھا۔ حالانکہ وہاں قربانی اپنے بیٹے کی تھی اور یہاں جانوروں کی۔ لیکن خدا کے حضور دونوں برابر ہیں۔ اس لیے بے خودی اور بے قراری کا ہونا کوئی تعجب نہیں۔ مگر خلوص، نیک کمائی اور حلال محنت کا ہونا ضروری ہے۔

اب آیئے میں اپنے اصل مقصد پر آتا ہوں جس میں دینی اور دنیاوی دونوں مفاد شامل ہیں۔

چرم قربانی کے بارے میں ہزاروں کتابوں میں اور احادیث و قرآن سے ثابت ہے کہ چرم قربانی غرباء و مساکین یا طلباء جو اپنے گھر بار کو چھوڑ کر علم دین حاصل کرنے کیلیے خدا کے حکم کے مطابق سفر دراز کا سفر کرتے ہیں۔ ان اسلامی مدارس میں جن میں بچوں کا رہائش اور تعلیم کا مکمل انتظام ہو کھانا کپڑا، کتاب وغیرہ اور دیگر ضروری خرچی اخراجات کو پورا کیا جاتا ہو، یہ چرم قربانی اُن کا حق ہے۔ یا پھر اس کا ایک مستقل بیت المال ہو جو صرف امداد غرباء و مساکین کے لئے ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ اس اتنی بڑی ذمہ داری کے لیے ایک الگ شعبہ قائم کرنا پڑتا ہے اور حکومت سعودیہ کو ایک الگ محکمہ قائم کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے محکمہ تو موجود ہے لیکن محدود ہے۔ کاش۔ اس محکمہ کو وسیع پیمانے پر بڑھا کر اس میں مزید اضافہ کیا جائے۔ تو کیا نہیں ہوسکتا۔

آج کا دور تو ہر ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔ تو کیا یہ ناممکن ہے کہ لاکھوں چرم قربانی پر قابو نہیں پایا جاسکتا کچھ دنوں کے لیے مزید مزدوروں کو جمع کرکے کھالیں نکالی جاسکتی ہیں۔ جو نئے نئے سائنسی کیمیکلس کے ذریعہ بحفاظت رکھی جاسکتی سکتی ہیں۔

بہتر تو یہ ہے کہ چند دنوں کے لیے چاہے سعودیہ کو غیر ممالک سے قصاب وغیرہ بلوانے پڑیں۔ انھیں بھی روزگار کے ذرائع حاصل ہوں گے اور بڑے بڑے کارخانے کروم وغیرہ کے لگائے جاسکتے ہیں۔ آج کے دور میں ایسی مشینیں بھی ایجاد کر دی گئی ہیں جن میں ہزاروں جانوروں کی کھالوں کی کروم ایک دن میں تیار ہو جاتی ہے۔ اور اس کروم سے تیار ہونے والے ہزارہا قسم کے بہترین چیزیں بنا کر زرمبادلہ کو دن دونا رات چوگنا کیا جاسکتا ہے جس سے ہماری قوم کے لاکھوں غرباء و مساکین دینی مدارس اور یونیورسٹیاں پنپ سکتی ہیں اور بلند اعلیٰ تعلیمی مرکز بن سکتی ہیں۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ حکومت سعودیہ امداد تو کسی میں بھی کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہی لیکن پھر بھی امداد پر جہاں تک خرچ ہوتا رہا ہے وہ صرف خدا اور عطا کردہ روغن خاک (تیل) پر ہی منحصر ہے۔ کاش یہ امداد تیل کی آمد سے ہٹا کر ایک جائز حق کی طرف منتقل ہو جائے تو پورے سعودیہ حکومت کو بھی بہت بڑا فائدہ ہے اور پوری قوم کو بھی کیونکہ یہ دور مشینوں کا دور ہے اور اس دور میں جس نے وقت کی ایجاد کردہ اور خدا کے عطا کردہ دماغ کی وسعتوں کو کام میں نہیں لیا تو وہ انسان تاریخ میں وقت کا سب سے بڑا بدنصیب کہلائے گا۔ اور یہ نااہلی ایک نہ ایک دن تباہی کے دہانے تک پہونچا دیگی کبھی کبھی انسان عقل سلیم کو جب محدود دائرے تک ہی کام میں لیتا ہے تو اس کی دماغی وسعتیں کند ہو جاتی ہیں۔ اور وہ بربادی کے گہرے غار میں گرجاتا ہے۔ جب کہ آج ضروری ہے کہ ہم اپنے ہر عیش و آرام اور سکون کے لیے ہر سائنسی آلات کا استعمال کرتے ہیں تو کیا ضروری نہیں بلکہ ہم حق العباد کی شے پر کوئی توجہ نہ دیں۔ اور ایسے سالہا سال یوں ہی دفن کرتے چلے جائیں۔ دُنیا کے دوسرے ممالک جو شب و روز بہتر سے بہتر بہترین تحفہ سائنسی ایجادات کرنے کی روشنی میں نکال کر دُنیا کے سامنے سربلندی حاصل کرتے ہیں اور ہم ہیں کہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو ضائع کر کے بھی اپنے آپ کو کامیاب سمجھ رہے ہیں۔ اگر دینی نظری سے کام لیں تو دینی ترقی جو عین فطرت کے مطابق ہے اور دنیاوی ترقی جو حالات کی ترجمان ہے۔ اس میں بھی ہم کسی کے محتاج اور کسی سے کم نہیں رہیں۔

اس نظریہ کے تحت اپنے حوصلوں اور مستحکم ارادوں کو لے کر ہم گامزن ہونگے تو یقیناً خدا ہماری مدد کرے گا۔ اور ہم تو دنیا کی ایک بہترین امت ہیں کیونکہ قرآن کریم کا قول سو فیصدی حق ہے کہ کُنتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ کی باعث اور عظمت تمام دینی اور دنیاوی ترقیاتی امور پر بھاری ہے جس کا زندہ مثال قرآن پاک خود زندہ معجزہ ہے۔ جو آج چودہ سو صدی تک ہی نہیں بلکہ قیامت تک ہر ترقیاتی شعبہ میں شامل ہے

رہیگا۔ اسی لیے آج بھی قرآن مجید عالمِ ملت کا محافظ اور انسانیت کا داعی و ملجا اور سہارا بنا کر پائی نظر آتا ہے۔ اور رہتی زمانے کو روشنی کا مینار بن کر عرفانِ حق دکھاتا رہے گا۔

اسی روشنی کے سبب آج ہم کو ہر برائی و بھلائی کی تمیز ہوتی ہے۔ اس نے ہماری دنیا میں دینی کامیابی کے نقشے سمجھائے۔ کھانے پینے، رہنے، سہنے و پہننے، لین دین تجارت و عبادت کے راستے بتائے۔ جس کی روشنی میں مومن کا ہر عمل عبادت بن گیا۔ یہ اُسی روشنی کا طفیل ہے کہ ازل سے ابد تک مومن کسی ایجاد و ترقی میں دنیا کی کسی قوم سے پیچھے نہ رہیگا۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس کے صحیح طریقے سے کامل یقین کے ساتھ اس کے اصولوں کو اپنائے اور رہنمائی لے۔

آج جب بھی کبھی ہماری غیر ہونگی ایجادات کی طرف نظر اُٹھتی ہے تو اس میں بھی اپنی کوتاہی نظر آتی ہے کیونکہ اس سمجھے جانے قرآن والے انسان کو قرآن سے استفادہ کرنے کا موقع ہی نصیب نہیں ہوا کیونکہ قرآن والا انصیب بنانے کی کوشش ہی نہیں کرتا بلکہ خدا داد ذہن کو انسان کی بنائی ہوئی شئے کا غلام سمجھنے لگتا ہے اس لیے آج کا انسان بغیر ایجادات کے استعمال کے زندہ رہنے کا تصور ہی نہیں سمجھتا۔ عہدِ حاضر کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ ضرورت بھی ہے لیکن کسی شئے کا غلام ہو جانا درست نہیں۔

جہاں تک ضروریات کا تعلق ہے سادہ زندگی کو بھی اعلیٰ بنانے والی کردار ادا کر سکتی ہیں تاہم عظمت و حقیقت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ... بھی اس تمام ترقی و ایجاد کو تسلیم کرنا ہوگا کہ ... ریڈیو، ٹیلیفون، ٹیلی ویژن، ٹیپ ریکارڈ، ہوائی جہاز وغیرہ آج انسانی زندگی کا ایک جزو بن گئے ہیں۔ کیا یہ ہماری دینی ترقی کے معاون ہو سکتے ہیں بے شک۔ ہر ایجاد سے دنیوی ترقی کے ساتھ ترقی دینی ممکن ہے فطرتِ انسانی کے موافق ہے کیونکہ دین محمد فطری ہے یعنی فطرتِ انسانی پر مبنی ہے ... کہ ہم اپنی ترقی کے کسی شعبہ میں کسی قوم سے پیچھے نہیں ہمارا دینی و دنیوی ترقی ... کا تقاضہ ہے کہ ہم آج دنیا کی ایجادات

کی طرف اور دنیاداروں کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھیں بلکہ ہر شعبہ میں وہ شانِ مسلم ہے کہ آگے ہی رہیں اور تکے ہی سب

اسی طرح چرم قربانی جو غربا و مساکین اور نادار طلبہ و غریب الوطن لوگوں کا حق ہے۔ اس کے لیے ایک ادنیٰ سا مشورہ محتاجِ توجہ ہے تاکہ حقوق تو حقوق کی جگہ پہنچ جائیں (حقدار حقدار رسید) اور دنیا کے لاکھوں انسانوں کو روزگار کے ذریعے مہیا ہوں گے۔ چرم وغیرہ کی کئی بڑی بڑی فیکٹریاں بنیں گی۔ اور چرم سے تیار ہونے والا سامان سوٹ کیس، اٹیچی، بیڈ، سوفہ سیٹ، بیگ، پرس، بیلٹ اور بوٹ وغیرہ کی ہزاروں کمپنیاں بن جائیں گی۔ جس سے پورے عرب کو فائدہ تو ہے ہی ساتھ ہی وہ وقت بھی دور نہیں کہ عرب ملک دنیا کی بڑی طاقتوں میں شمار کیے جانے لگے اور ہر قسم کی ٹیکنولوجی میں آگے بڑھتا رہے۔

انشاء اللہ یہ مشورہ آج قبول ہو نہ ہو لیکن آنے والا وقت اسے ضرور عملی جامہ پہنائیگا کیونکہ اس میں سچائی ہے۔

جہاں تک نظریاتی اختلافات کا تعلق ہے اس میں کچھ تعصب کی بنا پر بعض اوقات امیری کی گرمی آڑے آتی ہیں ... کو حق اتحاد سے بنا کر الٰہی کے ثمرات لے جاتی ہیں جہاں تک فقہِ مسلک اور ایمانی سوجھ بوجھ کا تعلق ہے ... مشورہ ... پیدا ہونے کے ہیں ... قرآن و سنت کی روشنی میں عمل صحیح ... کا خیر و جاری کرنے میں توقف نہیں ہونا چاہیے۔

انشاء اللہ میری اس مشورے کو اپنی بارگاہِ خاص سے قبولیت عطا کرے۔ آمین ثم آمین

تذکرہ شعرائے اجین

محمد خالد عابدی اندور

مرزا محمد ظفر:- آپ [illegible] میں دہلی کے ایک مغلیہ خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مرزا محمد عمر ایک ماہر گھڑی ساز تھے۔ جو بعد میں مہاراجہ سندھیا گوالیار کی دعوت پر گوالیار تشریف لائے تھے اور محلات کی گھڑیوں کی درستی کے لیے مامور کئے گئے تھے۔ سندھیا کے رخصت کے بعد مرزا محمد عمر غالباً ۱۹۲۶ء سے اجین آ کر آباد ہو گئے۔ مرزا محمد عمر کو میر، غالب، مومن، ذوق، داغ، مائل اور بیخود وغیرہ کا بیشتر کلام ازبر تھا۔ اساتذہ کا کلام وہ اکثر محافل و مجالس اور خانگی گفتگو میں استعمال کرتے تھے۔ کوثر و تسنیم کی دُھلی ہوئی قلعۂ معلیٰ کی زبان اور لب و لہجہ سن کر عوام محظوظ ہوتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے خاندانی قصے سنایا کرتے تھے۔ آخر کار ۱۹۶۶ء میں مرزا محمد عمر کا انتقال ہو گیا۔ مرزا محمد عمر کی بیشتر خوبیاں اُن کے بیٹے مرزا محمد ظفر کو ورثے میں ملیں۔

مرزا محمد ظفر کی ابتدائی تعلیم دہلی کے ایک مکتب میں ہوئی۔ گوالیار آ کر اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ اجین آئے تو مرزا سید مظفر علی سے اُردو فارسی پڑھی اور جامعہ اُردو علی گڑھ سے امتحانات ادیب ماہر میں شرکت کی۔

سلطان احمد صدیقی نے مرزا محمد ظفر کے تعارف اور اُن کی شاعری کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"مرزا محمد ظفر کو شاعری کا شوق زمانۂ طالب علمی سے ہوا اور ابتدائی کلام پر مرزا محمد علی خان اوپر سے اصلاح لی جو کہ بعد میں اُردو کے جانے پہچانے تھے۔ اجین آنے پر اُستاد نیازی رام پوری کی شاگردی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ شاعری میں دہلی اسکول کی پابندی کرتے تھے: زبان و بیان، روانی، روزمرہ محاورہ کا برمحل استعمال، سلاست اور فصاحت کلام [illegible] ہے۔ مرزا محمد ظفر غزل کے شاعر تھے۔"

محمد ظفر اپنے والد مرزا محمد عمر کی طرح ایک بہترین گھڑی ساز [illegible] ہو گئے تھے۔ مشہور ہے کہ جب اجین کے دوسرے [illegible] ساز گھڑی کی درستی نہیں کر پاتے تو تھک ہار کر محمد ظفر کے پاس ہی لاتے تھے۔ اکثر دیگر گھڑی ساز، اُلجھی ہوئی گھڑیوں کی مرمت و درستی غائبانہ طور پر آپ ہی سے کراتے تھے۔ میونسپل کارپوریشن اجین کے دفتر کے نزدیک دہلی والوں کا گھڑی سازی کی دکان اضلاع میں مشہور تھی۔

مرزا محمد ظفر ویسے تو کثیر العیال تھے۔ اُن کے ایک صاحبزادہ مرزا محمد فرید الظفر جمالی، رتلام کے گورنمنٹ کالج میں لکچرر ہیں۔ انہیں بھی افسانہ نگاری اور مضامین نگاری میں دلچسپی ہے۔

مرزا محمد ظفر کا ۷ / اکتوبر ۱۹۷۹ء کو رات پونے بارہ بجے حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوا تھا۔ دوسرے دن ۸ / اکتوبر کو مولانا مغیث الدین فریدی کے قبرستان میں اپنے والد ماجد مرحوم کے پاس دفن کئے گئے۔

نمونۂ کلام

ابھی کچھ دن یوں ہی رہنے دو حالات گلستاں کو
زمانہ خود بدلنا چاہتا ہے نظم دوراں کو

نظر میں لالہ و گل ہیں تصور میں نشیمن ہے
قفس میں بھی میں اپنے ساتھ لایا ہوں گلستاں کو

کہیں ایسا نہ ہو راز محبت فاش ہو جائے

خدا کے واسطے دیکھو نہ میرے زخمِ پنہاں کو
امث اب جہاں سے جا ئیں نے جا ئیں خدا حافظ
ابھی سے ابھی اکس سونپ دی ہے موج طوفاں کو
نہ پھولوں میں تبسم ہے نہ کلیوں میں ترنم ہے
مجھے حیرت ہے یہ کیا ہو گیا میرے گلستاں کو
اگر کچھ رحم تم کو آ گیا مجھ پہ تو کیا ہوگا؟
خدا کے واسطے دیکھو نہ میرے زخم پنہاں کو
ظفرؔ مرضِ مرض سے اب تو جینا چاہتا ہوں
وہ شاید دیکھنے آئیں مرے حالِ پریشاں کو

●

نہ جینا میرے امکاں میں نہ مرنا میرے امکاں پر
حیات موت دونوں ہی گریزاں ہیں جہاں میں ہوں
زبانِ خار سے یہ راز چھوٹا ہے بہاروں کا
گلوں منہ کی رعنائی فریبِ رنگ و بو ہے
ابھی کچھ وقت ہے گر ہوش میں آؤ تو ممکن ہے
اٹھو اے یارِ زنجیر در تک بات جا پہنچی
سہمے ہوئے از کا نظر دیکھ رہا ہوں
گذرے ہوئے طوفاں کا اثر دیکھ رہا ہوں

●●

بقیہ صفحہ ۴۲ کا

بارش

افسانہ

راجندر نے ایک لمبا کش لیا اور سارا دھواں سامنے پڑے ہوئے بلوریں گلاس میں پھینک دیا۔

"اس نے کہا اچھا، تم میرا سارا جسم لے لو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میرے ہونٹ چومنے کی کوشش مت کرو۔ تمہیں شاید حیرت ہوگی کہ میں نے آج تک اپنے شوہر تک کو اس کی اجازت نہیں دی ہے کیونکہ ان ہونٹوں پر ایک ایسے بوسے کی لذت ثبت ہے جسے میں ساری زندگی فراموش نہیں کر پاؤں گی۔"

ایک دم سے کوئی چیز راجندر کے دماغ سے نکل گئی۔ اس نے شیشے کا سامنے پڑا ہوا گلاس اپنے ہونٹوں سے لگا لیا اور تب ہی پہلے محسوس نے محسوس کیا جیسے اچانک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی ہے!

غزل

شمس رمزی جوائنٹ ایڈیٹر ماہنامہ معمار
۷۸۲ ویلکم سیلم پور III دہلی ۵۳ ۱۱۰۰

آئینہ بنا اور کبھی نکھرا پتھر
اپنے ہاتھوں سے جو آنسو تراشا پتھر
کیوں نہ بن جائے نگاہوں میں یہ دنیا پتھر
بستی پتھر ہے کہیں، تو کہیں صحرا پتھر
جسم حیرت سے سرِ راہ جو دیکھا اس نے
بن گیا یوں دلِ مضطر کی تمنا پتھر
دیکھنا ٹوٹ کے بکھرے گا ابھی عکسِ جمیل
بر سرِ آب اگر آپ نے پھینکا پتھر
یہ الگ بات کی تقدیر نہ چمکی میری
میرے سجدوں نے تو چمکا دیا میلا پتھر
ایک بے معنی سی تقریر بجاتی ہے اسے
ورنہ دیوانے کے مارا کرے دنیا پتھر
شمسؔ بخشی ہے میرے سر کو یہ عظمت جس نے
کس نے پھینکا میری جانب یہ نرالا پتھر

بارش

الیاس احمد گدی

جیسے سر کے اوپر کھلا ہوا نیلا آسمان ہو جس پہ بے شمار تاروں کے قمقمے آویزاں ہوں، رات کا پچھلا پہر ہو، ویران سڑکیں کشادہ اور پُراسرار معلوم ہونے لگیں، دُور دُور تک کوئی متنفس نہ دکھائی دے رہا ہو اور ساتھ ہی لڑکھڑا کر چلتی ہوئی نیلما مکرجی ذرا رُک کر خمار آلود آنکھوں سے تکنے لگے تو جی چاہنے لگتا ہے کہ ساری زندگی سفر ختم نہ ہو، ہم یوں ہی چلتے رہیں، ایک دوسرے کے وجود میں گم، بظاہر ایک دوسرے لاتعلق مگر ایک دوسرے میں مدغم...!

مگر یہ نیلما مکرجی جب کل صبح ملے گی تو اسے رات کی باتیں ذرا یاد نہ ہوں گی۔ وہ ویسے ہی اجنبیت سے ملے گی، رسمی باتیں کرے گی اور ذرا محسوس نہ ہوگا کہ کل آدھی رات تک یہ عورت ہمارے ساتھ ناچتی رہی ہے، اپنی گاڑی میں بٹھا کر ہمیں گھر چھوڑ آئی ہے اور جب راستے میں تیل ختم ہو گیا تو کوئی دو فرلانگ، ساتھ ساتھ، شانہ بشانہ چل کر تیل لینے پٹرول پمپ تک گئی ہے!

ہاں یہ نیلما مکرجی ہے جس کے سرخ ترشے ہوئے ہونٹ کیوٹکس کی لپ اسٹک سے آراستہ ہو کر کچھ ایسے خون آشام ہو جاتے ہیں کہ آدمی کو اپنے اوپر سے اعتماد اٹھتا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے۔ اس سے کوئی بڑی وحشیانہ سی خواہش دل میں پلنے لگتی ہے کہ چاہے جیسے بھی ہو، جس قیمت پر بھی ہو، ان ہونٹوں کو...!

مگر نیلما مکرجی کو ذرا احساس نہیں ہوتا۔ وہ ویسے ہی مسکرا مسکرا کر بات کرتی ہے۔ آپ سے ہاتھ بھی ملاتی ہے، بعض اوقات آپ کے اتنے نزدیک آجاتی ہے کہ آپ گھبرا سے جاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ سے یہ اپنے حسن کی قوت سے بے خبر ہو! اسے سب معلوم ہے کہ کب اور کہاں، کون سا وار کتنا گہرا اثر کرتا ہے۔ شاید اسی لیے کلب کے سارے ممبروں میں وہ اس حد تک مقبول ہے کہ عورتیں رشک کرتی ہیں اور اسے رنڈی، فاحشہ اور پتہ نہیں کن کن لفظوں سے یاد کرتی ہیں، حالانکہ وہ سیٹھ نروتم کی بیوی ہے اگرچہ سیٹھ نروتم کی عمر اس کے باپ کے برابر ہے لیکن دونوں میں بڑی محبت ہے اور دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پہلو بہ پہلو کلب کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر برآمدے میں آتے ہیں۔

اُن کو اس طرح آتے دیکھ کر راجندر تلخی سے مسکراتا اور اپنا چہرہ دوسری طرف گھما لیتا ہے، ایسے جیسے انہیں دیکھنے کی تاب اس میں نہ ہو کیونکہ یہ وہی نیلما مکرجی ہے، یہ وہی نیلما مکرجی ہے......

وہ بے چینی سے سوچتا ہے اور اس کے ذہن میں کوئی ستارہ ٹوٹتا ہے۔ ایک تیز روشنی جو اس کے احساس کی آنکھوں کو خیرہ کر دے، چکا چوند پیدا کرتی ہوئی گزر جاتی ہے اور پھر لمحہ بھر بعد اس کے ذہن میں گھپ اندھیرا چھا جاتا ہے، گہرا بھیانک اندھیرا! کچھ دکھائی نہیں دیتا، سب گم ہو جاتا ہے، کھو جاتا ہے......!

"ہلو راجندر!" وہ برآمدے میں آکر بے تکلفی سے کہتی ہے "کہو کیا حال چال ہے؟"

"سب ٹھیک ہے" وہ عجیب سا جواب دیتا ہے۔

نیلما ہنستی ہے اور اپنے شوہر سے دھیرے دھیرے کہنے لگتی ہے۔

"یہ راجندر میرے ساتھ پڑھتا تھا، بڑا شاندار کیریئر تھا اس کا، مگر یہ ایکسپورٹ ہو گیا!"

"ایکسپورٹ ہو گیا؟"

نیلما کو لرزش پڑتی تھی: ہاں، ہیپو سٹ ہو گیا کیونکہ
اس نے ایک بہت بڑے تاجر کی لڑکی سے شادی کر لی
جس کا ایکسپورٹ امپورٹ کا بہت بڑا کاروبار تھا اور اب
یہ اس فرم کا منیجر ہے۔ بہت بڑا رئیس سمجھا جاتا ہے لیکن
بیوی کو کبھی طلب نہیں لاتا.....؟"

ہاں تو یہ کہانی وہاں سے شروع ہوتی ہے۔ راجندر
نے سوچا، مگر کیا فائدہ؟ ہم کیوں سوچ سوچ کر ہلکان ہو کر
کھرنڈ چڑھے زخموں کو نوچ نوچ کر لہو لہان کر لینے سے
کیا فائدہ؟ سوائے ایک تکلیف دہ پچھتاوے کے اور کیا
ملتا ہے؟

جیسے ہمارے ہاتھ سے شیشے کا کوئی بیش قیمت
سامان گر کر فرش پر ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتے اور ہم اس
کو دیکھتے رہیں، ملول ہو کر، غمزدہ ہو کر پشیمانی کے ساتھ
کہ اب یہ دوبارہ جوڑا نہیں جا سکتا، یہ نقصان جو ہوا اس
کی تلافی ممکن نہیں.....

مگر اس نے ایک بار اس نقصان کی تلافی کرنی
چاہی اور ایک دن رقص کے دوران اس سے پوچھا
تھا: مجھے بھول گئیں؟"

"میں نے تمہیں کبھی یاد نہیں کیا!"

"لیکن میں تمہیں اکثر کرتا رہا ہوں!"

"اب میں وہ پہلے والی معصوم سی نیلما نہیں ہوں۔
اب میں سچ اور جھوٹ کا فرق سمجھتی ہوں!"

"کیا تمہیں میری بات کا اعتبار نہیں؟"

"پہلے تھا، اب نہیں رہا!"

"میں اب محسوس کرتا ہوں کہ تمہیں کھو کر میں نے
غلطی کی ہے!"

"کھو کر یا ٹھکرا کر.....؟"

"میرے زخموں پر انگلی مت رکھو!"

"تم بہت اچھا رقص کر لیتے ہو!"

"شکریہ.....!" اس نے ذرا سا رک کر پوچھا
"اب کوئی صورت نہیں ہو سکتی؟"

"اب مجھے تم سے نفرت ہے!"

"میں ایک بار، صرف ایک بار..."

"میں شادی شدہ ہوں اور مجھے اپنے شوہر سے
محبت ہے!" اور وہ آہستہ سے اس کی گرفت سے نکل کر
باہر چلی گئی تھی!

ہاں یہ وہی نیلما ہے جس نے ایک بار کہا تھا:
جب تک یہ دنیا قائم ہے، اور جب تک سورج نکلتا
ہے، جب تک تارے چمکتے اور بجھتے ہیں، جب
تک ہوا اندر جاتی ہے، ہم کبھی بھی ایک دوسرے سے جدا
نہ ہوں گے کبھی نہیں۔

اس نے بڑے پیار، بڑی محبت، بڑی لگاوٹ،
اپنائیت اور بڑے جذبے سے اس کی طرف دیکھا
جواب دینے کی بجائے وہ اس پر جھک گیا تھا
کہ اپنے اندر کے مچلتے الفاظ کی قید میں نہ آ سکے

اور اُسے اپنے اوپر فخر اس وقت بھی محسوس ہوا
تھا، جب سیٹھ رام ادھین کے یہاں خدمت میں
گیا تھا۔ اس کے باپ نے اسے مہر بند لفافہ دیا
تھا کہ اس کی چھٹیاں وہیں گزارو، اور ساتھ
شائستگی سے ملو کیونکہ وہ بہت بڑے آدمی ہیں۔
کا کاروبار ہے۔ جمع پونجی کا تو کوئی حساب نہیں
تمام دولت کی وارث ہے اُن کی اکلوتی لڑکی،
تب وہ چونکا تھا اسے ایسا لگا تھا
دل میں درد کا کوئی ٹکڑا اچھل رہا ہو اور اُس
کو دھکیل رہا ہو، مگر وہ کچھ بولا نہیں تھا کسی
کی طرح چپ چاپ
سیٹھ رام ادھین کے یہاں چلا گیا
سیٹھ رام ادھین کی کار تھی جو اسے سٹیشن
لینے کے لیے کھڑی تھی۔ اس نے وردی میں خدمتگار
گاڑیوں میں اس کی پیشوائی کے لیے آئے
قیمتی لباس پہن رکھے تھے، بڑی شائستگی سے

مہذب [illegible] میں [illegible]
تھا جیسے کسی بہت بڑی اسٹیٹ کا راجہ مہاراجہ ہو۔ جیسے کوئی خوبصورت خواب دیکھ رہا ہو......!

مگر یہ خواب نہیں تھا، بڑی دلآویز حقیقت تھی۔ سیٹھ رام اوتار کی شاندار کوٹھی، غیر ملکی فرنیچر [illegible] کی دولت کی چکاچوند نے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ اسے یکایک اپنی اہمیت کا احساس ہوا کیونکہ وہ جدھر جاتا ایک ہجوم اس کے آگے پیچھے گھومتا رہتا۔ اس کے [illegible] کے آرام کا خیال رکھا جاتا۔ درجنوں لڑکیاں اس کی قدم بوسی کے لیے کھڑی رہتیں۔ بڑے بڑے لوگ اس سے ملاقات کے لیے آتے اور وہ کسی سحر زدہ انسان کی طرح حیرت زدہ یہ سب کچھ دیکھتا رہتا۔ سوچتا رہتا، دیکھتا رہتا اور بھولے بھٹکے کبھی نیلما بھی یاد آجاتی لیکن وہ اتنی نیچے ہوتی کہ اسے کوئی پکار بھی نہ سکتا پھر وہ دھیرے دھیرے اس کے دماغ سے اُتر گئی۔

آخر اس میں کیا تھا کہ وہ یاد رکھتا؟ ایک کھاتے پیتے گھرانے کی بنگالن لڑکی، معمولی سوتی ساڑیوں میں لپٹی رہتی۔ سیاہ ملیح بال بکھرے رہتے۔ ہرنی جیسی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے چاروں طرف دیکھتی رہتی، جیسے اسے کسی کا خوف ہو۔ سوائے اس کے کہ وہ بہت ذہین لڑکی تھی۔ اس میں اور کیا خوبی تھی؟ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ اسکول سے لے کر گریجویشن تک اس نے ہمیشہ ٹاپ کیا تھا شاید یہی وجہ تھی کہ لڑکے اس سے تعلقات بڑھانے کی فکر میں رہتے تھے لیکن وہ متوسط طبقے کی ایک محجوب سی لڑکی تھی۔ اس لیے ہمیشہ شرمائی شرمائی سی رہتی، شاید یہی وجہ تھی کہ وہ کسی سے کھل مل نہ سکتی تھی لیکن ہر لڑکی کے دل میں چاہے وہ کسی طبقے کی ہو، کسی خاندان، کسی ملک سے کیوں نہ تعلق رکھتی ہو، ایک چور دروازہ ہوتا ہے اور یہی چور دروازے سے وہ اس کے دل میں داخل ہوا اور تب اس نے بھولی بھالی سی معصوم لڑکی کو بہت پسند بھی کیا تھا [illegible] ہمیشہ [illegible] کا احساس ہوتا۔

[illegible] بات جاتا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کا لمبا سا [illegible] اور سب سے خوبصورت اس کے ترشے ہوئے [illegible] ری، دلآویز ہونٹ...... صرف ایک بار [illegible] کوشش کیا تھا۔

[illegible] برسات کی رات تھی۔ دن بھر موسلا دھار [illegible] موسلا دھار بارش ہو کر رک گئی تھی۔ جب [illegible] ہال سے باہر نکلے تو سڑکوں پر پانی کھڑا ہوا تھا [illegible] لبالب بھری ہوئی تھیں۔ ساری فضا بے انتہا خوبصورت ہوگئی تھی۔ ہوا اتنی ہلکی ہوگئی تھی اور ایسے لپٹ [illegible] جیسے سمندر میں آگئی ہو۔ سیاہ گھنیرے بادل ابھی [illegible] تھے۔ وہ اپنی ساڑی کو دو انگلیوں سے پکڑے [illegible] نکلی تو اس کی گرگابی راستے کے پانی میں بھیگ گئی۔

"کوئی سواری کر لیتے ہیں؟" راجندر بولا۔

"نہیں!"

"رکشہ کر لینے میں کیا حرج ہے؟"

"نہیں میں پیدل چلوں گی۔"

پتہ نہیں وہ کیوں اس کے ایک دم قریب آنے سے گھبرا گئی تھی۔ شاید اسے خوف معلوم [illegible] وہ کالج میں پڑھتی تھی، آزادی سے رہتی تھی [illegible] بھی چلی جاتی تھی، کئی لڑکے اس کے دوست [illegible] وہ [illegible] سا خوف، جس نے اس [illegible] دوشیزگی کو، ایک عجیب طرح کی [illegible] وہ بھی اس کے ساتھ ہو گیا۔ راستے [illegible] تھا۔ چلتے چلتے جب [illegible] نیلما کا پاؤں گڑھے میں پڑ جاتا تو وہ [illegible] میں [illegible] پھیل جاتیں۔ [illegible] رات [illegible] ویران تنہائیاں [illegible] تھی۔

تو پھر ایسا ہوا کہ اچانک [illegible] بارش [illegible] اور وہ دونوں [illegible]

بھیگ گئے آج کی جگہ وقت تھا اس لیے گاڑی یہاں سے ہوٹل تک پیدل ہی سڑک پر چلتے ہوئے ایک آدھ ہی کار گزرے ہوئے تھے اور چاروں طرف کوئی متنفس نہ تھا پانی ٹوٹ کر برس رہا تھا اور بارش کے چھینٹوں کو دھیرے دھیرے بھگوئے جا رہے تھے۔ وہ دونوں بے حد مسرور تھے، پھر راجندر نے اس سے کہا تھا

"نیلما! جی چاہتا ہے، ساری زندگی یہ بارش یونہی ہوتی رہے اور ساری زندگی ہم دونوں ساتھ ساتھ بھیگتے رہیں، یہ رات ٹھہر جائے اور یوں ہی چپ چاپ صدیاں گزر جائیں!"

اس نے تیز تیکھی اور ایک حد تک خوفزدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا مگر بولی کچھ نہیں تھی۔

"مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تمہیں پا لینے کے بعد زندگی کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ جیسے مجھے سب کچھ مل گیا ہے"

وہ پھر بھی چپ رہی۔

"سنو۔۔!" پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر بڑی ملائمیت سے اس کو اپنی طرف کھینچا تھا اور وہ کسی بے جان شے کی طرح اس کے بازوؤں میں آگئی تھی، پھر اس نے اس کی ٹھوڑی اٹھائی تھی اور اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیے تھے!

جانے کتنا وقت گزرا، ایک لمحہ کہ ایک صدی، اسے کچھ معلوم نہیں لیکن اس بوسے کی لذت، اس کی کیفیت اس کا سرور اور خوف سے تھر تھر کانپتا ہوا نیلما کا جسم، یہ سب کچھ وہ آج تک نہیں بھول سکا۔

پھر نیلما یکبارگی میں سڑک پر چلی آئی تھی، اور مکمل خاموشی سے راستہ طے کیا تھا۔

اور جب وہ اپنے گھر میں داخل ہونے لگی تو دھیما سا مسکرا کر بولی تھی "یہ میرا پہلا بوسہ ہے"

"ہیلو راجندر!" کوئی شوخی سے کہتا ہے۔ راجندر اپنے خیالات سے چونک کر دیکھتا ہے، یہ راج ہے۔ رئیس زادہ مگر عیاش۔ اگر پڑھا لکھا ہوتا اور دولت مند نہ ہوتا تو تیسرے درجے کا غنڈہ ہوتا۔

"کیا بات ہے آج بہت پریشان ہو؟" وہ پھر بولا۔

راجندر ایک ٹھنڈی سانس بھرتا ہے "نہیں یار جی چاہتا ہے آج اچانک موسلا دھار بارش ہو جائے۔"

راج بے تحاشہ ہنسنے لگتا ہے "مئی کا مہینہ ہے اور تم بارش کھوجتے ہو، دماغ تو گھاس چرنے گیا [illegible] تھا......"

دونوں کلب کے بار میں چلے آتے ہیں، کاؤنٹر کی کرسی پر بیٹھ کر وہسکی کا بڑا پیگ منگواتے ہیں۔ ایک کونے میں نیلما مکرجی بیئر کا جگ پکڑے دھیرے دھیرے چسکی لے رہی تھی۔

بیئر کا ہلکا سرور، ہلکا گلابی رنگ بن کر اس کے رخساروں پر چھلک رہا ہے اور بیئر میں بھیگے ہوئے اس کے ہونٹ یوں محسوس کر رہے تھے جیسے گلاب کی پنکھڑیاں شراب میں بھگو دی گئی ہیں۔

راج بڑی رازداری سے کہتا ہے "میں جب ان ہونٹوں کو دیکھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ ہونٹ میرے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں!"

راجندر اس کو مسکرا کر دیکھتا ہے، جیسے پوچھ رہا ہو کیوں؟ وہ اس کا سوال سمجھ جاتا ہے اور ایک بڑا سا گھونٹ پی کر کہتا ہے "تم کو معلوم ہے، یہ عورت یہ نیلما مکرجی میرے ساتھ رہ چکی ہے۔"

"یعنی؟" راجندر حیرت سے اس کو دیکھتا ہے۔

وہ بڑے تلخ انداز میں ہنستا ہے "یعنی اب مجھے ساتھ رہنے کا مطلب بھی بتانا پڑے گا؟"

راجندر چپ ہو جاتا ہے۔

"ہاں تو میں نے اسے بڑی مشکلوں سے، بڑی کثیر رقم اور بہت سا وقت برباد کر کے حاصل کیا۔ اسے گھنٹوں شراب پلائی اور جب وہ مدہوش ہو گئی تو اسے اپنے گھر لے گیا۔۔"

راجندر نے سگریٹ جلانے کے لیے ماچس جلائی۔

"لیکن ایک حیرت انگیز بات سنو! جب میں نے اس کے ہونٹ چومنے چاہے تو وہ ایک دم سے برہم ہو گئی۔"

(بقیہ صفحہ ۳۹)

مُلّا کی دَوڑ!

مظفر حنفی

واقعی اُسی کا دل گردہ تھا کہ ایسے روح فرسا سانحات سے گزرنے کے بعد بھی خدا کے وجود میں اُس کا اعتقاد متزلزل نہ ہوا تھا۔

نماز کی ابتدا اُس نے اُس وقت کی تھی جب آٹھ سال کی عمر میں اُس کے والد پر نمونیہ کا حملہ ہوا۔ اس کی والدہ ایک مثالی مسلم خاتون تھیں۔ جب وہ خاوند کی صحتیابی کیلیے دعا مانگنے کو مصلّے بچھا کر بیٹھتیں تو اسے بھی بلا لیتیں۔

"حمید بیٹے آؤ! کیا ابوجان کی صحتیابی کے لیے اللہ میاں سے دعا نہ مانگو گے۔؟"

حمید جلدی جلدی پانی کے الٹے سیدھے چھینٹے منہ پر مار کر وضو کرتا اور اپنی ماں کے پہلو میں بیٹھ کر اُن کی حرکات و سکنات کی نقل کرتے ہوئے اُس خدا کی درگاہ میں جس کے بارے میں اس کا ناپختہ ذہن ابھی تک کوئی تصور نہ قائم کر سکا تھا، سربسجود ہو جاتا اور پھر اپنے ننھے ننھے ہاتھ اٹھا کر دعائیں مانگتا ——

"اے اللہ میاں! ہمارے ابو جان کو اچھا کر دو نا! میرے پیارے اللہ میاں تو!"

لیکن شاید پیارے اللہ میاں تک اس کی خیف اور باریک آواز نہیں پہنچ سکی اور اُس کے ابو جان کا مناسب علاج نہ ہو سکا اور نتیجے کے طور پر اُسے چند دن بعد ایک جنازے کے پیچھے روتے ہوئے پہلی بار قبرستان تک جانا پڑا۔

پھر اُسی دن رات کو سونے سے قبل جب اُس نے ماں کے گلے میں ننھی ننھی بانہیں حمائل کرتے ہوئے کہا۔

"امّی یہ اللہ میاں بہت برا ہے۔!"

تو اُس کی امّی کے اندر سوئی ہوئی نیک اور مثالی [illegible] جاگ اٹھی۔

"ارے ارے! یہ کیا بکتے ہو حمید میاں!؟"

کیوں پھر ہمارے ابو جان کو مار ڈالا۔؟"

"نہیں بیٹے! کفر نہیں بکا کرتے" اس کی امّی نے اُسے سمجھایا: "اللہ میاں کا کارساز ہے۔ اُس کے کھیل نرالے ہیں"

"لیکن یہ کھیل ہمیں اچھا نہیں لگا امّی!" اُس نے منہ بنا کر کہا۔

"ہمارے یا تمہارے اچھا نہ لگنے سے کیا ہوتا ہے!؟ میں بھی اس کی کوئی مصلحت ہوگی۔ پھر اللہ کی مرضی میں کس کا چلتی ہے؟"

اس وقت یہی سیدھی سی باتیں حمید کے ذہن کی سطح سے بہت بلند تھیں۔ تب تک اس کی سمجھ میں یہ نہ آیا تھا کہ انسان کتنا مجبور ہے۔ پھر ابو میاں کے انتقال کے بعد اس کی امّی نے ہر طرف سے منہ موڑ کر مذہب کا سہارا لے لیا کیونکہ بعض اوقات دنیا میں زندہ رہنے کے لیے مذہب کا سہارا ہی واحد سہارا رہ جاتا ہے۔ ابو جان کی موت کے فوراً بعد ملنے والی پنشن بھی بند ہو گئی۔ حمید کا بڑا بھائی، جو کان پور کسی مل میں ملازم تھا، اتنی کم تنخواہ پاتا تھا کہ اپنے خرچ سے پیسے انداز کر کے بہت ہی معمولی سی رقم انھیں بھیج سکتا تھا۔ ایسے آڑے وقتوں میں مذہب ہی حمید کی امّی کے کام آیا۔ انھوں نے بچوں کو کلام مجید پڑھانے اور مذہبی تعلیم دینے کا کام شروع کر دیا۔ اس طرح پچیس تیس روپیہ ماہوار کی آمدنی ہو جاتی اور خدا کی عبادت کرتے ہوئے ان لوگوں کے دن کسی طرح بسر ہو جاتے۔

لازمی تھا کہ اس قسم کی فضا میں پروان چڑھتے ہوئے حمید کا ذہن بھی دینی اثر قبول کرتا۔ اس نے تین سال میں ہی قرآن شریف حفظ کر لیا اور پنج وقتہ نماز کا پابند ہو گیا۔ پھر خدا کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ چودہ برس کی عمر کو پہنچ کر حمید شفقت مادری سے بھی محروم ہو گیا لیکن تب تک وہ خدا کی ہستی سے اس حد تک مرعوب ہو چکا تھا کہ جی چاہنے پر بھی وہ خدا کی اس ناانصافی کا گلہ تک نہ کر سکا۔ جب کبھی اس کا دل بری طرح گھٹنے لگتا اور جی چاہتا کہ خوب بلک بلک کر رو دیا جائے حمید اپنی ماں کی پرانی شکستہ جانماز بچھا کر خدا کی درگاہ میں جھک جاتا اور صدق دل سے دعا مانگتا۔

"اللہ میاں! شکریہ تمہارا۔ یا اللہ میری امی کو جنت کے سب سے اونچے محل میں بھیجنا ہے۔"

نہیں معلوم اللہ میاں نے اس کی امی کو کتنے اونچے محل میں بھیجا لیکن اس کے لیے یہ دنیا دوزخ بن کر رہ گئی محلے والے اس بات پر رضامند نہ تھے کہ اُن کے بچے اپنے ہی ہم عمر لڑکے سے تعلیم حاصل کریں۔ گھر کے ٹوٹے پھوٹے برتن اور بچا کھچا سامان بکتا رہا اور پھر ایک دن وہ بھی آیا جب حمید اپنے ٹوٹے ہوئے پلنگ پر بھوکا ہی سویا۔

دوسرے دن حمید کا اعتقاد خدا کی رحمت پر اور بھی [illegible] گیا کیونکہ اُس کا بڑا بھائی اسے لینے کے لیے کانپور سے [illegible] دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے لیکن حمید کے بھائی نے محسوس کیا جیسے وہ اپنے چھوٹے بھائی سے بغلگیر نہیں ہے بلکہ کوئی بزرگ اسے اپنے سینے سے لگا کر تسلی دے رہا ہے۔

"ارے بھیا! تم رو رہے کیوں ہو؟ امی مر گئیں تو کیا ہوا؟ اس میں بھی اللہ میاں کی کوئی مصلحت ہوگی!"

بھیا نے حمید کو اور زور سے چپٹا لیا۔

"ہاں حمید! میں پاگل ہوں۔ خدا کرے تمہارے حوصلے اسی طرح بلند رہیں۔"

"مگر بھیا! اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔"

"میں تم کو لینے ہی کے لیے آیا ہوں حمید!"

اور یہ بات سن کر حمید نے فوراً سجدے میں [illegible] دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی پھر دونوں بھائی کانپور چلے گئے۔ حمید کو کوشش کرکے پانچویں کلاس میں داخل کر دیا گیا۔

لڑکا ذہین اور حساس تھا، چل نکلا۔ زمین اپنے محور پر گھومتی رہی، وقت گزرتا گیا۔ ہر سال کامیابی حاصل کرنے پر حمید کا زہد و تقویٰ بھی بڑھتا گیا اور جب اُس نے اکیس سال کی عمر میں میٹرک پاس کیا تو اس کی ٹھوڑی پر ایک چھوٹی سی داڑھی اور پیشانی پر ایک نشان کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اب اسے ملازمت کی فکر پیدا ہوئی۔ ایمپلائمنٹ ایکسچینج کی معرفت سرکاری دفاتر سے کئی بار اسے بلاوا بھی آیا لیکن ہر جگہ محض اس کی ظاہری وضع قطع دیکھ کر ہی افسروں نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے رد کر دیا۔ حمید ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرتا رہا لیکن دوسری طرف اُس کے بھیا نے اپنی مل کے منیجر سے خوشامد شروع کر رکھی تھی اب معلوم نہیں، یہ خدا کی رحمت حمید پر نازل ہوئی یا بھیا کی خوشامد نے آخرش منیجر کا دل پگھلا دیا۔ بہرحال ایک دن حمید اس مل کے دفتر میں فائلوں کے سامنے کرسی پر نظر آیا۔

اب اس نے ہر جمعرات کو روزہ رکھنا بھی شروع کر دیا

اسی دوران مل کے جاہل مزدوروں میں اپنی حق تلفی کا احساس پیدا ہوا۔ پہلے مالکان کی خدمت میں وفد بھیجے گئے۔ اس سے کام نہ چلا تو جلسے کیے گئے، جلوس نکلے اور جب یہ حربے بھی کارگر نہ ہوئے تو آخر کار ایک عام ہڑتال کا اعلان کر دیا گیا۔ دوسرے دن حمید اپنی سیاہ شیروانی زیب تن کیے، ترکی ٹوپی لگائے، ڈیوٹی پر جانے کے لیے مل کے دروازے پر پہنچا تو مزدوروں کے ایک بڑے ہجوم نے اُسے گھیر لیا۔

"نہیں حمید صاحب! آپ کام پر نہیں جا سکتے۔" کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔

"کیوں بھئی؟" اُس نے حیران ہو کر پوچھا۔ "آخر بات کیا ہے؟"

"مل والے ہمارے حقوق ادا نہیں کرتے۔"

"آپ سب کی اجرت تو برابر ادا کی جاتی ہے"

"لیکن ہمارا بونس روک لیا گیا ہے!"

"اس کے لیے تجربے کیجیے۔"

"وہ کوئی بات سننے کے لیے رضامند نہیں۔" آوازیں

"مالک بھی نہیں سنتا۔!"

"آپ مالکوں سے ملے بھی۔؟"

"وہ ملنے کے لیے رضامند نہیں ہوتے۔"

"تو پھر صبر کیجیے — اِنَّ اللہَ مَعَ الصّابرین" حمید

سمجھایا۔

"کیوں صبر کریں؟" ایک شکستہ حال بوڑھے مزدور

ڑ آ کر پوچھا — "ہم جان توڑ کر محنت کرتے ہیں ہمیں

معاوضہ ملنا چاہیے۔"

"جہاں آپ کی محنت کا معقول معاوضہ نہیں ملتا وہاں

ملازمت ہی چھوڑ دیجیے۔"

"ملازمت نہ کریں تو کھائیں گے کیا — ہڑتال

امیابی ہی ہماری کامیابی ہے۔"

"آپ ہڑتال کیجیے میں آپ کو نہیں روکتا —

کام پر جاتا ہوں، آپ مجھے نہ روکیے۔"

"تم کو بھی کم تنخواہ ملتی ہے۔ تم بھی ہمارا ساتھ دو۔"

"نہیں!" حمید بولا — "مجھ سے نمک حرامی نہ ہوگی

اپنی موجودہ تنخواہ پر ہی قانع ہوں۔ اللہ کو قناعت

ب ہے۔!"

یہ سب سرمایہ داروں کا پروپیگنڈا ہے۔"

ابھی بحث اور بڑھتی لیکن اسی وقت پولیس نے

چارج کر دیا مجمع تتر بتر ہو گیا۔ حمید اور مزدوروں کی

بہت ہی قلیل سی تعداد مل میں کام کرنے کے لیے

خل ہو گئی۔

شام کو وہ کام سے لوٹا تو دیکھتا کیا ہے بھیا پلنگ

لیٹے ہوئے کراہ رہے ہیں۔ اُن کے سر پر پٹی بندھی ہوئی

ا۔

"یہ کیا ہوا بھیا —؟" حمید نے بےچین ہو کر پوچھا۔

بھیا نے اس کے سوال کو ان سنا کر کے کہا۔

"کیا تم آج بھی کام پہ گئے تھے —؟"

"ہاں لیکن یہ آپ کے سر میں ....؟"

"اس کی فکر مت کرو تم!" بھیا بگڑ کر بولے: "دیکھو

مل کے پھاٹک پر پکٹنگ کرتے ہوئے لاٹھی چارج میں چوٹ

لگ گئی۔ لیکن میں پوچھتا ہوں تم آج کام پر کیوں گئے تھے؟"

"کیوں —؟ مجھے تنخواہ ہی اس بات کی ملتی ہے۔"

"نہیں — یہ تنظیم سے غداری ہے۔" بھیا نے کہا

"کس تنظیم سے —؟"

"مزدور یونین سے!"

"لیکن بھیا!" حمید نے کہا — "یہ کہاں کا انصاف

ہے؟ اُن لوگوں کو کام پر جانے سے کیوں روکا جاتا ہے

جو اپنی موجودہ اجرت پر ہی کام کرنے کے لیے تیار ہیں۔!"

"وہ خود غرض ہیں، بزدل ہیں۔ ہمیں اپنے حق کے لیے

پُرامن طریقے پر لڑنا چاہیے۔ حمید! مجھے بہت افسوس ہے

کہ تم آج بھی ڈیوٹی پر گئے تھے۔"

"بھیا! اللہ پاک خود فرماتا ہے کہ وہ صبر کرنے والوں

کے ساتھ ہے۔"

"صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ہم کو اپنا حق خود حاصل

کرنا ہوگا اور ہاں — کل سے تم کام پر نہیں جاؤ گے۔"

"یہ تو کھلی ہوئی نمک حرامی ہوگی۔ آپ کہیں تو میں اپنا

استعفیٰ البتہ بھیج دوں —؟"

"کچھ بھی کرو —" اُس کے بھیا نے جھنجھلا کر کراہتے

ہوئے کہا — "لیکن کل سے تم کام پر نہیں جاؤ گے میں

نے جہاں اتنے دن تمہیں کھلایا ہے اور بھی بٹھا کر کھلا

سکتا ہوں۔"

اس دن واقعی حمید نے اپنا استعفیٰ بھیج دیا اور

عبادت گزاری میں معروف ہو گیا۔

لیکن دوسرا دن حمید کے لیے بہت منحوس ثابت

ہوا۔ شام کو اُس کے بھیا کی لاش ایک بہت بڑے

جلوس کے ساتھ قبرستان کی طرف لے جائی جا رہی تھی

ہڑتالیوں کے جلوس پر فائرنگ ہو رہی تھی، ایک گولی

نے اُس کے بھیا کا بھی خاتمہ کر دیا جو مزدوروں کو

مشغول ہو رہے تھے۔

قبرستان سے لوٹ کر حمید بڑی دیر تک گم سم اپنی کوٹھڑی میں بیٹھا رہا۔ بار بار یہی خیال اُس کے دماغ میں گردش کر رہا تھا کہ آخر اُس کے بھیا کی موت میں اللہ میاں کی کیا مصلحت ہوگی؟ پھر اچانک اُس نے [illegible] استغفار شروع کر دی۔ ہو سکتا ہے خدا اس کا [illegible] رہا ہو۔

اُس دن پہلی بار اُس نے رات کو اٹھ کر [illegible] نماز شروع کر دی۔

اب اس کا دل دنیا سے بالکل سیر ہو چکا تھا۔ واقعی یہ دنیا ایک سرائے ہے ایک آتا ہے، دوسرا جاتا ہے یہاں آرام و سکون تو وہ ہے جو تمام عمر۔۔۔ اصل سکون تو وہ ہے جو تمام عمر خدا کی عبادت میں صرف کرنے کے بعد موت کی سرحد پار کر کے جنت میں نصیب ہوتا ہے۔

اُس نے ایک مسجد میں پیش امام کی ملازمت اختیار کر لی۔

پیش امامی کرتے ہوئے اُسے اٹھارہ سال گزر گئے صبح شام بچوں کو مذہبی تعلیم دینا اور راتوں کو اٹھ کر تہجد کی نمازیں ادا کرنا اس کی زندگی کے معمولات بن گئے جمعرات اور جمعہ کا روزہ بھی اُس نے اپنے اوپر عائد کر رکھا تھا۔ اب اسے دنیا سے کوئی مطلب نہ رہ گیا تھا۔ دل میں کوئی آرزو، امید کی کوئی کرن ہی نہ تھی جس کے پورا نہ ہونے سے اُسے کوفت ہوتی۔ اُس کی زندگی بڑے سکون سے گزر رہی تھی۔ لیکن اس پُرسکون زندگی میں ایک دن ہلچل سی مچ گئی۔

اس دن دوپہر کو نماز ظہر پڑھانے کے بعد حمید اپنے حجرے میں بیٹھا ہوا تلاوت قرآن پاک کر رہا تھا کہ اچانک مسجد میں دو بچوں کی آوازیں سنائی دیں — اُس نے بوسہ دے کر کلام پاک بند کر دیا اور اپنے حجرے کے دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔

ایک سات سالہ بچی، تقریباً پانچ سالہ چھوٹے سے بچے کے ساتھ منبر کے سامنے دامن پھیلائے کھڑی تھی۔

"ہاں حنا! بولو —" اُس نے بچے سے کہا۔

"اب تو دُعا مانگ چکے —" بچہ ٹھنکا "اب چلو کھیلیں"

"نہیں — ۔" لڑکی نے کہا "امّی نے کہا تھا خوب دُعا [illegible] ابھی تو ایک ہی بار مانگی ہے"

"[illegible] ایک بار اور مانگ لو —" بچہ رضامند ہو گیا۔

[illegible] دونوں طوطے کی طرح پڑھنے لگے۔

"[illegible] پیارے اللہ میاں! ہمارے ابّو جان کو اچھا کر دو [illegible] کی عمر میں برکت دو اور ہم معصوم بچوں کی دعا قبول کر دو"

وہ دعا ختم کرتے ہی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ حمید نے حجرے سے مسجد کے صحن میں آتے ہوئے کہا۔

"بچو! مسجد میں جوتے پہن کر نہیں آتے — اچھا — اللہ میاں ناراض ہوتے ہیں"

وہ دونوں سہم کر اپنے گرد سے لوٹے ہوئے جوتوں کو دیکھنے لگے۔ حمید نے پیار سے دونوں کی پیٹھ تھپک کر کہا۔

"جاؤ!"

اُس دن کے بعد سے حمید روزانہ دیکھتا کہ جب دوپہر کو مسجد میں سناٹا ہو جاتا، وہ دونوں بچے آتے، منبر کے سامنے دامن پھیلا کر دو تین بار طوطے کی طرح دعا مانگتے اور اچھلتے کودتے باہر چلے جاتے۔ کچھ دن تو حمید پر کوئی اثر نہ ہوا لیکن ان بچوں کا ہر روز آنا ایک معمول ہی بن گیا تو اُس نے نمازیوں سے پوچھا گچھ کی۔

معلوم ہوا کہ وہ بشیر خاں کے بچے ہیں جو مل مزدور تھا اور آج کل سخت بیمار ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں اُسے ٹی۔ بی ہے۔ اور اُسے سینی ٹوریم میں داخل ہونا چاہیئے ورنہ کوئی طاقت اُسے موت سے نہ بچا سکے گی۔

"ارے توبہ کرو میاں!" حمید نے اطلاع دینے والے کو ہدایت [illegible] "یہ کمبخت ڈاکٹر تو بڑے دہریئے ہوتے ہیں۔ اللہ بڑا کارساز ہے کوئی بات اُس کے قبضۂ قدرت سے باہر نہیں"

"درست فرمایا آپ نے مولانا صاحب!"

وہ شخص چلا گیا۔ دوپہر کے دونوں بچے پھر دعا مانگنے آئے تو حمید کو اپنے ابّو جان کی علالت کا واقعہ یاد آ گیا۔ اُس نے

...بچے کتنے بھولے بھالے انداز میں دعا مانگتے ہیں۔ ان کی نگاہوں میں دعا کی اہمیت ایک کھیل سے زیادہ نہیں ہے اُس نے اپنی تمام عقیدت اور خلوص کو سمیٹ کر بچوں کی دعا کے ساتھ آمین کہنا شروع کر دیا۔ دوسرے دن بھی اُس نے یہی عمل دہرایا لیکن شام کو جب حمید نے سُنا کہ شیر خاں کی حالت اور بھی زیادہ نازک ہو گئی ہے تو اُس نے اس شب کا ایک ایک لمحہ دعا مانگنے پر صرف کیا۔

دوسرے دن جب حمید اس انتظار میں بیٹھا تھا کہ کوئی آکر اسے شیر خاں کے مرض میں افاقہ کی خبر سُنائے گا ایک شخص نے آکر کہا ـــــ

"مولانا صاحب ذرا قبرستان تک چلیے!"

"انّا للہ و انّا علیہ راجعون۔! حمید کے منہ سے بیساختہ نکلا" کیوں بھئی کس کا انتقال ہو گیا؟"

"شیر خاں ـــ!"

حمید کو محسوس ہوا جیسے کسی نے اُس کا دل پکڑ کر نوچ لیا ہو۔ تقریباً بیہوشی کے عالم میں اُس نے قبرستان جا کر نماز جنازہ ادا کی، واپس آیا تو ظہر کا وقت ہو چکا تھا۔ حمید نے جیسے تیسے اذان دے کر جماعت کو نماز پڑھائی اور جب اُس نے نماز ختم کر کے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے تو اُس کے دل میں پہلی بار خدا کے لیے بغاوت کا جذبہ پیدا ہوا۔

"ہونہہ اب تجھ سے کس بات کی دعا مانگوں!؟"

اُس نے جلدی سے ہاتھ سمیٹ لیے اور اپنے حجرے میں جا کر پڑ رہا۔ نہ معلوم کیسے کیسے الٹے سیدھے خیالات اُس کے ذہن میں اتھل پتھل مچا رہے تھے۔ ایک ایک کر کے اپنی زندگی کے تمام خاص واقعات یاد آئے باپ کی بیماری، علاج کے لیے روپے کی کمی، اس کا انتقال ماں کی موت، اس کی ملازمت ہڑتال، بھائی کا قتل اور..."

اچانک اُس کے خیالات کا تانا بانا ٹوٹ گیا۔

باہر مسجد میں، کچھ آوازیں سنائی دے رہی تھیں اس نے حجرے کے دروازے پر آکر دیکھا۔ وہی شیر خاں کے بچے بیٹھے کہہ رہے تھے۔

"ہاں سے دعا مانگو"

دونوں کے ہاتھ مشین کی طرح اوپر اُٹھ گئے اور طوطے کی طرح بولنے لگے۔

"اے اللہ میاں، ہمارے ابّو جان کو اچھا کر دو ان کی عمر میں برکت دو۔ ہم معصوم بچوں کی دعا قبول کر لو"

حمید کا دل چاہا کہ وہ زور زور سے روئے لیکن اُس نے ہونٹ کاٹ کر اپنے امنڈتے ہوئے جذبات کو دبا لیا اور بچوں کے پاس جا کر بولا۔

"آؤ بچو چلیں تمھاری دعا قبول ہو گئی۔!"

اُسی دن عدت کے ایام گذرنے کا انتظار کیے بغیر حمید نے شیر خاں کی بیوہ سے نکاح کر لیا تھا پیش امامی ترک کر دی اور دوبارہ مل میں ملازم ہو گیا۔!

غریب اور کرتا بھی کیا۔ مذہب سے فرار میں ملّا کی دوڑ یہیں تک تھی۔!

غزل

● محمد مبین نغمہ کھامگانوی ۔ سورت

رات کے زخم سہے، صبح کے شیدائی رہے
ہم بہر حال اجالوں کے تمنائی رہے

وقت کے ساتھ بدلتے نہیں الفت کے نقوش
بھولنے والے ذرا کچھ تو شناسائی رہے

نام لو ان کا کہ بیمار سنبھالا لے لے
کچھ تو اے چارہ گرو! زعم مسیحائی رہے

ہم سے آوارہ نگاہوں کے بھی جل جائے جگر
یوں بھی جانسوز گل تیری رعنائی رہے

اب کوئی فرق نظر اور نظارہ میں نہیں
چشم پُر شوق کی بن کر وہی بینائی رہے

فیض ہے عام ترا ساقی یہ سنتے آئے
کچھ تو ہم تشنہ لبوں کی بھی پذیرائی رہے

بن کے اپنی ہی تمنا کا نشانہ نغمہ
دردِ دنیا سے الگ لالۂ صحرائی رہے

کالیداس گپتا رضا کی

تاحال مطبوعہ تصانیف

"شعلۂ خاموش"
مجموعۂ کلام قیمت ۵۰ روپے

"شورشِ پنہاں"
مجموعۂ کلام قیمت ۲۰ روپے

"شاخِ گل"
مجموعۂ کلام قیمت ۱۵ روپے

"اُجالے"
نعت اور سلام قیمت ۱۰ روپے

"شعورِ غم"
سلام وغیرہ قیمت ۳ روپے

"شاخِ جاوید"
مجموعۂ کلام رباعیات
قیمت ۲۰ روپے

"دی سائیلینٹ فلیم"
THE SILENT FLAME
قیمت ۱۰ روپے

"ہندوستان مشرقی افریقہ میں"
(تاریخ)
قیمت ۱۰ روپے ۵۰ روپے

"مکتوباتِ جوش ملسیانی"
بنام رضا (خطوط)
قیمت ۱۹ روپے ۵۰ پیسے

"منشوراتِ جوش ملسیانی"
قیمت ۲۰ روپے

"متعلقاتِ غالب"
قیمت ۲۰ روپے

"دُعائے صباح"
غالب کی ایک مثنوی
قیمت ۱۵ روپے

"غالبیات چند عنوانات"
قیمت ۵۰ روپے

"انتخاب آتش و غالب
چکبست قیمت ۳۰ رو

"چکبست اور باقیاتِ چکبست"
قیمت ۴۰ روپے

"کلیاتِ چکبست" زیر
قیمت ۶۰ روپے

"سہو و سُراغ"
مجموعۂ مضامین
قیمت ۳۵ رو

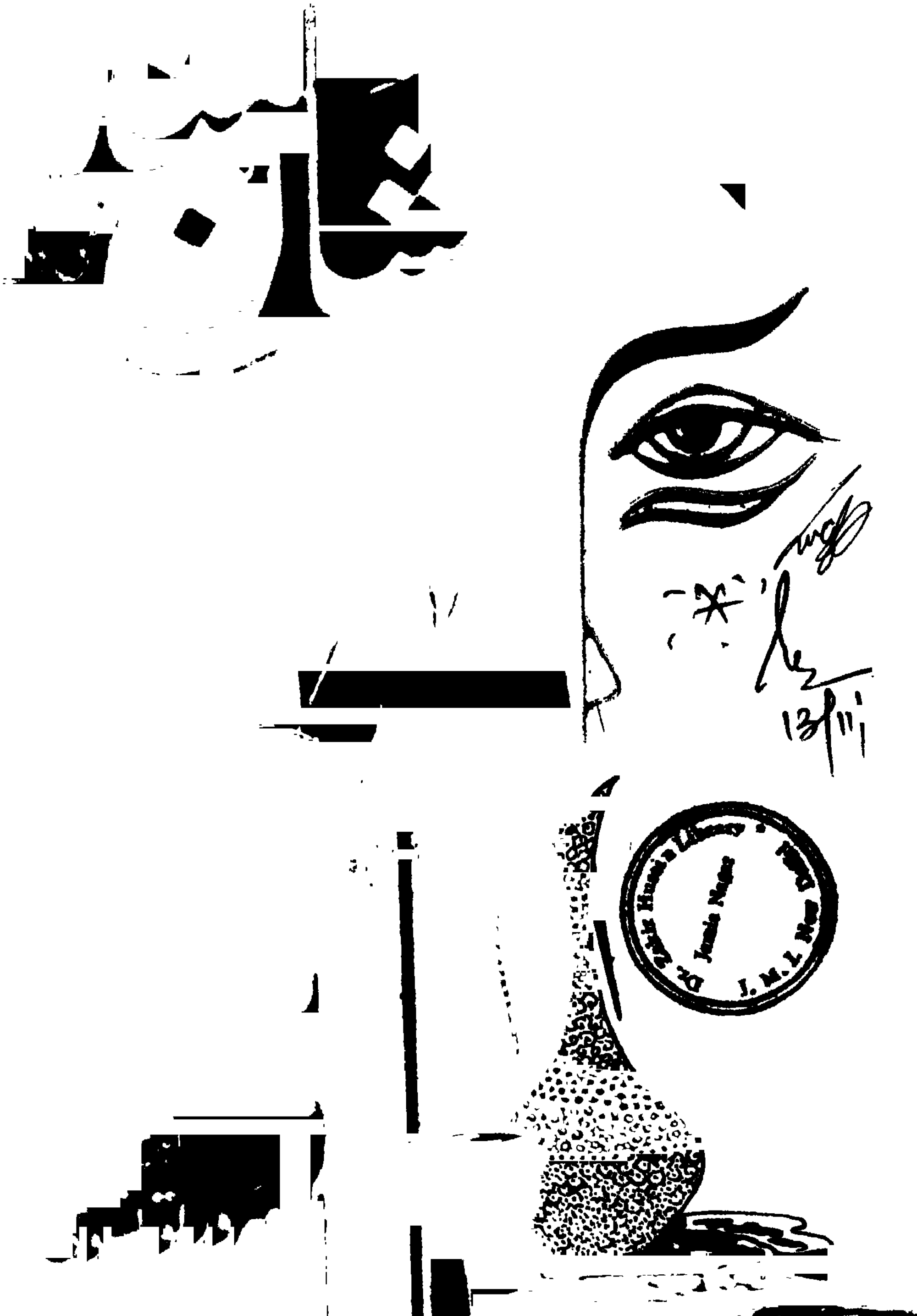
"مقالاتِ چکبست"
قیمت ۷۵ روپے

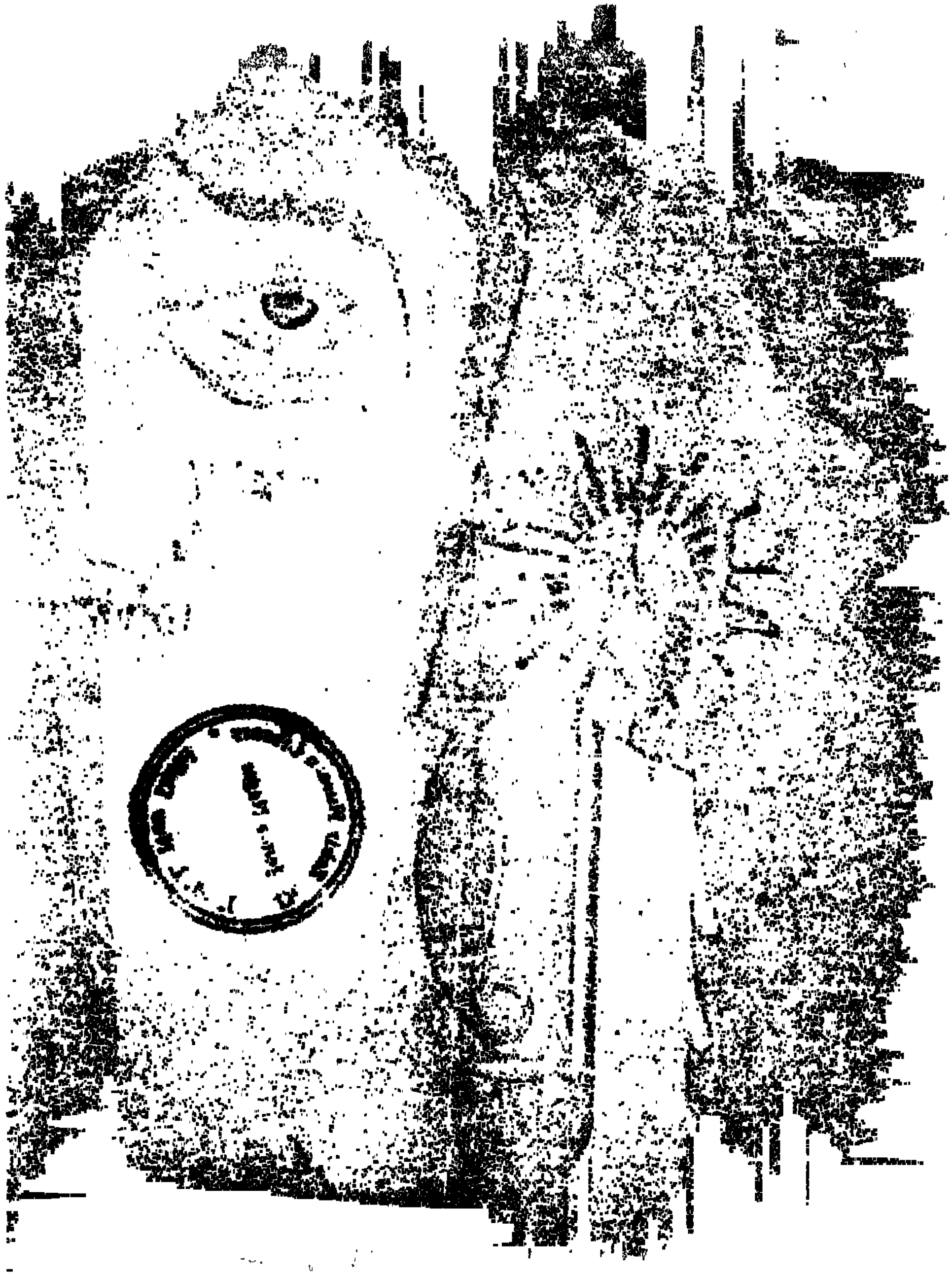
غیر مطبوعہ تصانیف کا
طبع ہونے پر کیا جائے گا

پبلیشنز

۳۰۵ چرچ گیٹ چیمبرز نیو میرین لائنز
چرچ گیٹ بمبئی ۴۰۰۰۲۰







ٹیلی فون نمبر ۲۷۵۰۶۰۲ | رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۵۷-/۴۴/۶۲ | رجسٹرڈ نمبر ڈی ۳۰۷۰/DN

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاضؔ مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
فیاضؔ گوالیاری

ماہنامہ شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر
سرورؔ تونسوی

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے
زرِ سالانہ ۲۴/- روپے

جلد نمبر ۴۵ | ستمبر ۱۹۸۴ء | شمارہ نمبر ۹

- رام پور کا ایک مسلمان خطّاط اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآنِ پاک کا ایک نسخہ لے کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں حاضر ہوا۔ اس کا ہدیہ اس نے ایک لاکھ روپیہ مانگا۔ سکھ راجہ عربی داں تو کجا بالکل ہی ان پڑھ تھا، مگر اپنی چاندی کی کرسی سے اٹھا خطّاط کے ہاتھ سے قرآن لے کر چوما اور اپنے وزیر فقیر عزیز الدین کو حکم دیا کہ خطّاط کو اس کی منہ مانگی رقم دی جائے۔ وزیر کو معلوم تھا کہ اتنی رقم دہلی اور حیدرآباد کے درباروں سے بھی اس خطّاط کو نہ مل سکتی تھی۔ چنانچہ وزیر نے حیران ہو کر پوچھا۔ عزت مآب! آپ اس قرآن کے لئے اتنی زیادہ رقم کیوں دینا چاہتے ہیں جب کہ اس کا تعلق آپ کے مذہب سے نہیں ہے، وہ سکھ راجہ کی ایک آنکھ بچپن ہی سے جاتی رہی تھی، اپنی اس آنکھ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے راجہ نے جواب دیا کہ "خدا کا حکم مجھے بچپن ہی سے ایسا ہوا ہے کہ میں ہر مذہب کو ایک ہی آنکھ سے دیکھوں۔ شاید اسی لئے اس نے میری ایک آنکھ کی روشنی مجھ سے چھین لی ہے"
- میں نے جو سیکھا شہروں میں بسنے والے انسانوں سے نہ کہ درختوں اور کھیتوں سے
(سقراط)
- مجھے اپنے استاد کا ادب ملحوظ ہے لیکن اس سے زیادہ میں صداقت کا پاس لحاظ رکھتا ہوں (ارسطو)
- مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے کلکتے میں اینٹی داڑھی لیگ قائم کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ "آج زندگی کی اقدار بدل چکی ہیں۔ آج داڑھی کا تصور کذب و افترا اور ریاکاری کا تصور چھوڑتا ہے"
- مسلم ملک تیونس میں مسلم حکومت کی جانب سے سرکاری افسروں کو رمضان میں روزے رکھنے کی ممانعت ہے۔ تیونس کے صدر حبیب بورقیبا کا خیال ہے کہ بھوک پیاس کی حالت میں انسان کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔

ودیا پرکاش سرورؔ تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے لیتھو کے صفحات خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی اور سرورق بائیلٹ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ دریاگنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

4.50000

ساڑھے چار لاکھ روپے کے

(6) چھ انعامات

دلی کے چیف ایگزیکیوٹو کونسلر جناب جگ پرویش چندر نے طالب علموں کے لئے "تحریک آزادی کی متعلق" کتاب لکھنے پر مصنفین کو دیئے جانے والے انعامات کی رقومات اور تعداد میں اضافے کا اعلان کیا ہے۔ اب چھ انعامات دیئے جائیں گے جن کی مجموعی رقم ایک لاکھ کی بجائے ساڑھے چار لاکھ روپے ہوگی۔

انعامات کی تفصیل حسب ذیل ہے

پہلا انعام : ڈیڑھ لاکھ روپے (ایک انگریزی ایک ہندی)

دوسرا انعام : پچاس ہزار روپے (ایک انگریزی ایک ہندی)

تیسرا انعام : پچیس ہزار روپے (ایک انگریزی ایک ہندی)

وزارت مالیات نے مندرجہ بالا انعامات کو سرکاری انعامات قرار دیا ہے اور ان انعامات کو انکم ٹیکس سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔

اس مقابلہ میں شریک ہونے والے مصنفین کو کتاب لکھتے وقت حسب ذیل ہدایات پر لازمی دھیان دینا ہوگا

۱۔ اس کتاب کے لئے تاریخ تحریک آزادی ہند کی مدت ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک ہے۔

۲۔ کتاب کا مسودہ انگریزی یا ہندی کسی بھی زبان میں ہو سکتا ہے۔

۳۔ مسودہ میں تقریباً چالیس ہزار الفاظ ہونا چاہیے۔

۴۔ کتاب لکھنے والوں کو مسودہ کی تین تین کاپیاں رجسٹری کے ذریعہ اکنالجمنٹ کے ساتھ ۳۱ دسمبر تک سیکریٹری چیف ایگزیکیٹو کونسلر دلی انتظامیہ اولڈ سیکریٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۵۴ کے پتہ پر بھجوانی ہوں گی۔

ان مسودات کی جانچ مشہور مصنفین اور ماہرین علم التواریخ کی ایک کمیٹی کرے گی اور اس کمیٹی کا فیصلہ آخری اور سبھی متعلقہ افراد کے لئے واجب تسلیم ہوگا۔

اول انعامات کے مستحق مسودوں کے جملہ حقوق ملکیت و اشاعت دلی انتظامیہ کے نام محفوظ رہیں گے۔ دوسرے اور تیسرے انعامات کے مستحق حضرات اپنے مسودات کی اشاعت کسی بھی ناشر سے کروا سکیں گے۔ اس سلسلہ میں کسی وضاحت یا مشورے کے لئے پتہ ذیل پر رجوع فرمایئے۔

چیف ایگزیکیٹو کونسلر۔ دلی انتظامیہ۔ اولڈ سیکریٹریٹ دہلی

بُلبُل چہ گُفت؟ گُل چہ شنید؟ وصبا چہ کرد؟

سانچی بات سعد اللہ کہیں
سب کے من سے اُترے رہیں

رفعت سروش کا استعفیٰ

اخبارات میں شائع ہوا ہے کہ گورنر صاحب دلّی نے اُردو اکاڈمی دلّی کے ایک ممبر رفعت سروش صاحب کا استعفیٰ منظور کر لیا ہے اور ان کی جگہ منظور الامین صاحب کو ممبر نامزد فرمایا ہے۔ اُردو اکاڈمی دلّی کی ممبری سے استعفیٰ رفعت سروش صاحب نے صحت کی خرابی کی بنا پر دیا ہے جس کے لئے ہم اُردو داں حضرات سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ رفعت سروش صاحب کی صحت کے لئے دُعا فرمائیں تاکہ وہ صحت مند ہو کر از سرِ نو اُردو کی مقصدی خدمت کر سکیں۔

ناظرین کو یاد ہوگا کہ رفعت سروش صاحب نے اپنے تحریر کردہ بیلے کا ایک شو دکھا کر اُردو اکاڈمی سے ۳۵ ہزار روپیہ اینٹھ لیا ہے جب کہ یہ بیلے دیکھنے والے ۳۵ حضرات بھی ایوانِ غالب میں موجود نہ تھے۔ اگر صحت کی خرابی درحقیقت استعفیٰ کی وجہ ہے تو پھر انہیں سب سے پہلے غالب انسٹی ٹیوٹ کے عہدۂ ڈائریکٹر سے دست بردار ہونا ضروری تھا کیوں کہ اُردو اکاڈمی دلی کی میٹنگ تو سال میں تین چار مرتبہ ہوتی ہے اور بطور ڈائریکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ انہیں ہر روز صبح دس بجے سے شام کے پانچ بجے تک ایوانِ غالب میں بیٹھنا پڑتا ہے اس سلسلے میں بیگم صاحبہ فخر الدین علی احمد صاحب اور شفیع قریشی صاحب کے لئے انتہائی ضروری ہے کہ وہ ایوانِ غالب کی ڈائریکٹری کے لئے کسی صحت مند اُمیدوار کو تلاش کریں کیوں کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کی ادبی اور علمی سرگرمیوں کا صدودار بعہ اب محض غالب کے ایک شعر کے غلط سلط مطالب بیان کرنے تک محدود رہ گیا ہے اور پھر رفعت سروش ایسے ریٹائرڈ نیز بیمار جسم اور بیمار ذہن سے انہیں اُمید بھی کیا ہو سکتی ہے لہٰذا اگر غالب انسٹی ٹیوٹ اور اس سے ملحقہ ادارے واقعی قوم کی امانت ہیں تو پھر اس کا ڈائریکٹر رفعت سروش ایسا علیل جسم و بیمار ذہن والا شخص نہیں ہونا چاہئے اور اگر بیگم صاحبہ اور شفیع قریشی صاحب اس ادارے کو بھی ایک ذاتی ادارہ سمجھ کر کسی نااہل کی پرورش کرنا چاہیں تو پھر ان کی مرضی۔

دراصل اُردو اکاڈمی سے رفعت سروش کا استعفیٰ دینا اس امر کی غمازی کر رہا ہے کہ اُردو اکاڈمی کی ایوارڈ کمیٹی سے انہیں ایوارڈ سگنل مل چکا ہے کہ اس سال انہیں پانچ ہزار روپیہ کا شاعری ایوارڈ دیا جائے گا چوں کہ اُردو اکاڈمی کے ممبر رہ کر وہ اس پُھکّے (پُھکّے پنجابی لفظ ہے جس کے معنی مالِ غنیمت کے ہیں) پہ ہاتھ صاف نہیں کر سکتے لہٰذا انہوں نے خرابیٔ صحت کا بہانہ کر کے اُردو اکاڈمی کی ممبری سے پیچھا چھڑا لیا اگر۔

اس ضمن میں یہ عرض کرنا انتہائی ضروری ہے کہ اگر واقعی اُردو اکاڈمی دلی کی ایوارڈ کمیٹی نے رفعت سروش کو ایوارڈ کا سگنل دے دیا ہے یا کسی دباؤ کے تحت ایوارڈ کمیٹی ایسا کرنے پر مجبور ہو رہی ہے تو ایسا ہونا انتہائی افسوسناک ہے کیا جب بمبئی میں اُردو اکاڈمی وجود میں آئی تو ماہنامہ شگوفہ بمبئی کے مدیر نذیر فتح پوری (جو مہاراشٹرا اُردو اکاڈمی کے ممبر تھے) دوسرے ممبرانِ اُردو اکاڈمی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تھا کہ بھائیو اگر اکاڈمی کا روپیہ ہم سب نے ہی مل جل کر ہضم کرنا ہے تو پھر انتظار کس بات کا ہے اور ہم اس کے لئے بہانے اور

وقت گزاری نہ کریں۔ یہ نیک کام جلد از جلد کر دیا جائے عوام کا کیا ہے وہ شور مچا کر خاموش ہو رہیں گے۔

ہم راجندر سنگھ بیدی کی زبان میں ہی اردو اکاڈمی کی ایوارڈ کمیٹی کے ممبران سے یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اگر اکاڈمی کا روپیہ آپ لوگوں نے بقول ماں بہنوں میں گم کرنا ہی ہے تو پھر دکھاوے کو رکھ رکھاؤ کی بھی کیا ضرورت ہے۔

اگر ایوارڈ کمیٹی کے ممبران کے دماغ کے کسی گوشے میں یہ خیال جاگزیں ہو کہ امسال شاعری کا ایوارڈ رفعت سروش کو دیا جائے تو ہم ان سے یہ مطالبہ کریں گے کہ وہ اپنے اس فیصلے کی تائید میں عوام کو بتائیں کہ رفعت سروش کی شاعری میں وہ کون سی خوبیاں ہیں جن کی بنا پر انہیں ایوارڈ دینے کی پیش بندیاں کی جا رہی ہیں اور کیا دلی میں رفعت سروش سے بہتر کوئی اور شاعر نہیں ہے جو اس ایوارڈ کا جائز مستحق ہو۔؟

غالباً ایوارڈ کمیٹی کے صدر جناب پروفیسر گوپی چند نارنگ ہیں اور ممبران میں جناب انور دہلوی اور ڈاکٹر صلاح الدین صاحب ایسے صداقت پسند حضرات موجود ہیں اگر ان حضرات کی موجودگی میں شاعری کے ایوارڈ کا سگنل قبل از وقت رفعت سروش صاحب کو دیا گیا ہے تو یہ انتہائی طور پر قابلِ افسوس بات ہے اور اگر یہ ایوارڈ اس سال رفعت صاحب کو دیا جاتا ہے تو یہ امر اور بھی قابلِ نفریں ہوگا

غالب انسٹی ٹیوٹ "بدستِ طفلاں"

رفعت سروش صاحب کو آل انڈیا ریڈیو سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد محترمہ بیگم عابدہ صاحبہ اور شفیع قریشی صاحب نے غالب انسٹی ٹیوٹ کا قائم مقام ڈائریکٹر مقرر کیا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو میں ریٹائرڈمنٹ کی عمر غالباً اٹھاون سال ہے۔ بظاہر اٹھاون سال کی عمر کے کسی شخص کو طفلِ نادان نہیں کہا جا سکتا مگر ہمارے رفعت سروش صاحب نے ایوانِ غالب کا قائم مقام ڈائریکٹر بنتے ہی طفلانہ حرکات شروع کر دی ہیں۔ جسے ہم دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ غالب انسٹی ٹیوٹ بدستِ طفلاں۔ آیئے رفعت سروش کی طفلانہ حرکات سے ذرا آپ بھی واقف ہو جیئے۔

جس طرح نومسلم اپنی نومسلمی کا ثبوت دینے کے لئے بجائے پانچ وقت کے سات وقت نماز پڑھنے لگتا ہے اور ہر وقت اللہ اللہ کی رٹ لگاتا ہے اسی طرح رفعت سروش نے اپنی ڈائریکٹری کا سکہ جمانے کے لئے اپنی تمام تر کوششیں اس امر پر مرکوز کر دیں کہ کسی نہ کسی طرح ان کی ڈائریکٹری کا ذکرِ خیر اخبارات میں ہوتا رہنا ضروری ہے لہٰذا انہوں نے دیگر ذرائع کے علاوہ ایک یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ غالب کے اشعار پر ہر ماہ سیمینار کا انعقاد شروع کیا۔ غالب کے کسی شعر کے بارے میں اعلان شائع کر دیا جاتا ہے کہ اس شعر کے مطلب و مفہوم پر فلاں فلاں صاحب روشنی ڈالیں گے اور اس سلسلے میں ہوتا یہ ہے کہ جن اصحاب کے اسمائے گرامی کا اعلان کیا جاتا ہے وہ کلامِ غالب کی مختلف شرحوں کو سامنے رکھ کر موضوعی شعر کے بارے میں ہر شارح کی علاحدہ پسند آرا کو جمع کر کے ایک نئی شرح اختراع کر لیتا ہے اور اس سیمینار کے چند انگلیوں پر گنے جانے والے سامعین پر اپنی غالب شناسی کا رعب گانٹھتا ہے۔ اس سلسلے میں ہر نیا شارح اپنی پبلسٹی چاہتا ہے اور سب سے زیادہ شہرت چاہتے ہیں رفعت سروش صاحب کہ انہوں نے اس قسم کے سیمینار شروع کر کے غالب شناسی کے نئے انداز مروج کئے ہیں۔

چنانچہ اس سلسلے میں جمال بھارتی صاحب کا مراسلہ مطبوعہ قومی آواز پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے اور اس مراسلے کے جواب میں خدا بخش لائبریری پٹنہ کے وہاج الدین علوی کا مراسلہ مطبوعہ قومی آواز بھی اپنے جلو میں پروفیسر عنوان چشتی صاحب کی تعریف اور ان سیمیناروں کی افادیت پر اس طرح روشنی ڈال رہا ہے کہ جیسے علوی صاحب ان سیمیناروں میں اشعار غالب پر کی گئی شرح سے پہلے قطعی طور پر غالب کے ان اشعار کے مطالب و مفہوم سے نابلد تھے علوی صاحب کے مراسلے کا حرف حرف غمازی کر رہا ہے کہ یہ مراسلہ انہوں نے از خود

نہیں لکھا بلکہ ان سے لکھوایا گیا ہے۔

اس سلسلے میں ملک کے مشہور پڑھے لکھے نقاد جناب ڈاکٹر تارا چرن رستوگی اپنے ایک مراسلے میں تحریر فرماتے ہیں۔

"غالب انسٹی ٹیوٹ غالب کے اشعار پر سیمینا روں کا انعقاد کرتا ہے جو خاصی مضحکہ بات ہے راقم الحروف نے غالب کے درج ذیل شعر

مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

پر منعقدہ سیمنار (۹) کی رُوداد کسی ہفتہ وار پرچے (غالباً ہماری زبان) میں پڑھی تھی۔ شرکا نے کیا کیا نہ کہا مگر شعر ہذا کا مطلب و مفہوم پر روشنی نہ ڈال سکے۔ کیا اس سے غالب انسٹی ٹیوٹ کی عنیت میں بٹا نہیں لگتا؟ کسی انجمن سے توقعات وابستہ ہوتی ہیں لہٰذا اس کو معیاری سطور پر چلانے کے لئے بجزیاتی ادبی ذہن و دل کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر غالب انسٹی ٹیوٹ میں اس کا فقدان ہے"۔

ہر نااہل اپنی نااہلیت پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے کوشاں رہتا ہے کہ اس کی نااہلیت کے بارے میں اُس کے ناخداؤں کے کانوں میں بھنک نہ پڑنے پائے لہٰذا اس سلسلے میں بھی رفعت سروش صاحب کی طفلانہ حرکت سے ہمیں حیرانی ہوئی۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ شانِ ہند میں غالب ایوارڈز کے بارے میں لکھا گیا کہ طنز و مزاح کا ایوارڈ فکر تونسوی صاحب کا حق تھا مگر ان کی حق تلفی کی گئی اور یہ ایوارڈ مجتبیٰ حسین صاحب کو دیا گیا۔ شانِ ہند کا یہ شمارہ جس میں فکر تونسوی صاحب کی حق تلفی پر احتجاج کیا گیا تھا محترمہ بیگم عابدہ صاحبہ اور شفیع قریشی صاحب کے مطالعہ کے لئے بھجوانے کے لیے رفعت سروش صاحب کو خط لکھا گیا کہ ان دونوں سربراہان نے غالب انسٹی ٹیوٹ کے رہائشی پتے بتائے جائیں تاکہ شانِ ہند بھجوایا جا سکے تو رفعت سروش صاحب نے جواباً لکھا کہ ان دونوں حضرات کے پتے غالب انسٹی ٹیوٹ ماتا سندری لین نئی دہلی ۲ ہیں۔ بیگم صاحبہ اور شفیع قریشی صاحب کے گھریلو پتے محض اس لئے رفعت صاحب نے نہ دئیے کہ نہ معلوم ہم انہیں

رفعت صاحب کے بارے میں کیا کچھ لکھ دیں۔ چنانچہ الگ الگ ان دونوں حضرات کو غالب انسٹی ٹیوٹ کے پتہ پر شانِ ہند معہ خطوط بھجوا دئے گئے اور شفیع قریشی صاحب اور بیگم صاحبہ دونوں سے ملاقات کا وقت لینے کی درخواست کی گئی تاکہ بالمشافہ طور پر اس حق تلفی کے بارے میں انہیں رائے عامہ سے آگاہ کیا جائے مگر نہ معلوم ہمارے ان خطوط کا کیا ہوا کہ نہ تو شفیع قریشی صاحب اور نہ ہی بیگم صاحبہ نے وقت دیا اور نہ ہی خطوط اور شانِ ہند ملنے کی اطلاع دی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ خطوط ان دونوں حضرات تک پہنچے ہی نہ ہوں اور رفعت سروش صاحب نے سنسر کرنے کے بعد ان کا اصل مکتوب الیہ تک پہنچانا مناسب نہ سمجھا ہو۔ اور اگر ایسا نہیں ہے اور ہمارے خطوط ان دونوں حضرات تک پہنچے تو پھر ان کی خاموشی اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ وہ اس حق تلفی کے بارے میں دیدہ دانستہ خاموش رہنا چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نہ تو بیگم صاحبہ اور نہ ہی قریشی صاحب میں اتنی ادبی و علمی قابلیت ہے کہ وہ اپنے طور پر اس امر کا جائزہ لے سکیں کہ غالب ایوارڈ کے اصل حق دار کون ہو سکتے ہیں اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ غالب ایوارڈز کا فیصلہ کرنے میں جو شخصیت در پردہ تار ہلاتی ہے وہ کافی حد تک مذہبی تعصب کے زیر اثر ہے اور کسی غیر مسلم کو غالب ایوارڈ دیتے ہوئے ان کی مسلمانی ان پر نفریں کرتی ہے مگر وہ کسی نہ کسی غیر مسلم کو دکھاوے کے طور پر ہی سہی غالب ایوارڈ دینے کے لئے یوں مجبور ہو جاتی ہے کہ غالب ایوارڈز کے سلسلے روپیہ بیشتر غیر مسلم حضرات کا ہی عطیہ ہوتا ہے۔ اور یہ تو ہر کوئی جانتا ہے کہ جب سے رفعت سروش صاحب قائم مقام ڈائریکٹر ہو کر آئے ہیں ایوانِ غالب کبھی لاؤڈ سپیکر نظام خراب ہے تو کبھی ایئر کنڈیشن جواب دے جاتا ہے جس کی وجہ کئی پروگرام ایوانِ غالب میں طے شدہ ہونے کے باوجود دوسرے ہالوں میں کرنے پڑے اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ ریڈیو اسٹیشن کی ملازمت میں

کسی دوسرے منتظم کے تحت کام کرتا ہوتا تھا اور یہاں تمام نظام رفعت سروش صاحب کے ہاتھ میں دے دیا گیا جب کہ ان میں انتظامیہ صلاحیت کا فقدان ہے۔

بیگم عابدہ صاحبہ اور شفیع قریشی صاحب نے نہ معلوم کس وجہ سے رفعت سروش ایسے شخص کو غالب انسٹی ٹیوٹ اور اس کے دوسرے شعبوں کا ڈائرکٹر مقرر کر دیا جب کہ ان میں ان تمام خوبیوں کا دور دور تک پتہ نہیں چلتا جو ایسے عظیم الشان ادارے کے ڈائرکٹر میں ہونی ضروری ہیں۔ ہاں رفعت سروش صاحب میں ایک خوبی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے جسے عرفِ عام میں خوشامد کہتے ہیں۔ اگر ان کی اس واحد خوبی سے خوش ہو کر بیگم صاحبہ اور شفیع قریشی صاحب نے انہیں یہ "پدوی" بخشی ہے تو پھر دوسری بات ہے۔

عیدکارڈ یا خبثِ باطن کا اظہار

غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے عیدِ سعید کے مبارک موقعہ پر عید کی مبارک باد دینے کی غرض سے ایک عید کارڈ کچھ حضرات کو بھجوایا گیا ہے یہ عید کارڈ جناب محمد شفیع قریشی سکریٹری غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے جاری کیا گیا ہے۔ پہلے اس عید مبارک کارڈ سے متعلق جناب ڈاکٹر تارا چند رستوگی کا گرامی نامہ ملاحظہ فرمایئے جو انہوں نے مدیر شانِ ہند کے نام تحریر فرمایا ہے۔

"گوہاٹی — ۱۵ ستمبر

محترم سرور صاحب

منسلکہ دعوت نامہ عید سعید پر منجانب غالب انسٹی ٹیوٹ ہے ارسال کیا گیا ہے "عید مبارک" کو مشمول شعرِ غالب ؎

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

سے کیا ہم آہنگی ہو سکتی ہے لہذا اس کی بجائے کوئی ایسا شعر جو عید سعید سے متعلق جذبات و تصورات کا آئینہ دار ہوتا ... میں ہونا چاہیئے تھا۔ مزید برآں غالب کا محولہ شعر ... کے پسادِ سکینہ سرور کے درج ذیل شعر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے ؎

از گرمیٔ نشاطِ تصور کشم سرود
من عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ام

ملحوظ رہے کہ سرور مرحوم فرید پور ضلع بریلی کے ساکن تھے اور انہوں نے اپنا دیوان ۱۸۱۲ء میں مرتب کیا تھا۔ آخری صفحہ پر دسمبر ۱۸۱۲ء صاف لکھا ہوا ہے۔ غالب کو مضمون اڑانے میں ید طولیٰ حاصل تھا مثلاً بیدل کے اس شعر ؎

بوئے دل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
ہر کہ از بزمِ تو برخاست پریشاں برخاست

کو غالب نے اردو میں ڈھال لیا مگر کچھ بھونڈے پن سے ؎

بوئے دل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا

بہرحال اس وقت موضوعِ سخن کلامِ غالب کا جائزہ لینا نہیں بلکہ عید کارڈ پر درج شعرِ غالب ہے۔ اس سلسلے میں جہاں تک ہمارا اندازہ ہے وہ یہ ہے کہ سکریٹری صاحب جناب محمد شفیع قریشی نے غالب انسٹی ٹیوٹ کے قائم مقام ڈائرکٹر حضرت رفعت سروش سے کہا ہوگا کہ ان کی جانب سے عید مبارک کارڈ چھپوا دیں اور کارڈ پر غالب انسٹی ٹیوٹ کی نسبت سے غالب کا ہی کوئی موزوں شعر ہونا چاہیئے چونکہ آج کل ویسے بھی رفعت سروش پر "شعرِ غالب" کا بھوت سوار ہے لہذا ؎

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

غالب کا یہ شعر رفعت سروش صاحب کا ہی ذریں انتخاب ہو سکتا ہے تاہم یہ شعر چاہے رفعت سروش صاحب کا انتخاب کردہ ہو یا جناب شفیع قریشی کا، عید کی مبارک باد والے کارڈ کے لئے قطعاً فٹ نہیں بیٹھتا۔

اس شعر کی معنوی تشریح کے لئے ہم نے جناب مالک رام صاحب، جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر عنوان چشتی صاحب وغیرہ کو تکلیف دینی چاہی مگر ایک ماہ سے ٹیلی فون وغیرہ مواصلات کے سلسلے صاحب کو دعائیں دینے کے لئے سماد ھی لئے ہوئے ہے۔ تاہم سیدھے سادے الفاظ میں اس

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اُس متوقع خوشی جس کا کہ تصوّر کیا گیا تھا کی گرمی کی وجہ سے فرحت بخش ہوں ویسے تو میں گلشنِ ناآفریدہ کا بلبل ہوں "گلشنِ ناآفریدہ" کا ترجمہ ہم نے اس لئے نہیں کیا کہ فارسی سے ناآشنا ہونے کے باعث ممکن ہے کہ کچھ غلطی ہو جائے جنابِ رفعت سروش اور جناب شفیع قریشی صاحب گلشنِ ناآفریدہ کا ترجمہ بہتر فرما سکتے ہیں۔ اگر یہ دونوں حضرات بھی ہماری طرح فارسی سے نابلد ہیں تو غالب انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں ایسی لغات موجود ہیں جس میں گلشنِ ناآفریدہ کے معنی درج ہیں۔

حقیقت میں اس شعر کے اندراج کے اصل معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان عید کی اُس خوشی جس کا کہ تصوّر کیا جا سکتا ہے کی گرمی کے باعث عید کی خوشیاں منا تو رہے ہیں ویسے یہ ہندوستان میں ایسے رہ رہے ہیں جیسے گلشنِ ناآفریدہ میں عندلیب

یہ ہے غالب انسٹی ٹیوٹ کا سیکولرازم جس پر سکریٹری صاحب اور قائم مقام ڈائریکٹر نازاں ہیں۔

ایک افواہ

قومی آواز مورخہ ۱۵ر اکتوبر ۱۹۸۳ء کے کالم مراسلات میں حسب ذیل مراسلہ "خرابی صحت یا مصلحت" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جسے ہم بغیر کسی تبصرہ کے نذرِ قارئین کر رہے ہیں۔

"حال ہی میں قومی آواز اور دیگر اخبارات میں شائع خبر سے معلوم ہوا ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے قائم مقام ڈائریکٹر مسٹر رفعت سروش نے اُردو اکیڈمی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ مسٹر رفعت سروش نے استعفے کی وجہ خرابیٔ صحت بتائی ہے جب کہ اُردو حلقوں میں اسے خرابیٔ صحت نہیں بلکہ مصلحت سمجھا جا رہا ہے اور حلقوں میں گردش کرنے والی اس افواہ کو مزید تقویت مل رہی ہے کہ ایک سرکردہ پروفیسر اور مسٹر رفعت سروش میں ایک خفیہ سمجھوتہ ہو گیا ہے جس کے تحت پروفیسر صاحب نے مسٹر رفعت سروش کو یقین دلایا ہے کہ وہ اُردو اکیڈمی کا سالانہ ایوارڈ جو ایک شاعر کو بھی دیا جاتا ہے اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کرتے ہوئے انہیں دلوائیں گے۔ واضح رہے کہ یہ ایوارڈ اُردو اکیڈمی کے رکن ہوتے ہوئے حاصل نہیں کیا جا سکتا ہے اور پروفیسر صاحب اردو اکیڈمی کی ایوارڈ کمیٹی کے رکن ہیں۔ دوسری طرف مسٹر رفعت سروش پروفیسر صاحب کو غالب انسٹی ٹیوٹ کا غالب ایوارڈ دلانے کے لئے ممکن کوشش کریں گے اور کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھیں گے اب اس افواہ کی اور مسٹر رفعت سروش کے استعفیٰ دینے کی حقیقت اس وقت سامنے آ سکتی ہے جب اُردو اکیڈمی کے ایوارڈ یافتگان کی فہرست میں مسٹر رفعت سروش کا نام نہ ہو اور غالب ایوارڈ پانے والوں کی فہرست میں پروفیسر صاحب کا نام دیکھنے میں نہ آئے۔"

اختر حیات۔ ٹیا محل۔ دہلی۔

محترمہ بیگم عابدہ اور شفیع قریشی صاحب کی نذر

غالب انسٹی ٹیوٹ کے قائم مقام ڈائریکٹر جناب رفعت سروش کی اصلی کارکردگی سے متعلق ذیل کا سرٹیفکیٹ آپ کی نذر ہے۔ یہ سرٹیفکیٹ موقر روزنامہ "قومی آواز" ۱۵ر اکتوبر کے مراسلات کالم میں شائع ہوا ہے۔

"مکرمی۔ مسٹر رفعت سروش نے اُردو اکیڈمی سے جو استعفیٰ دیا ہے اس کے بارے میں خبر پڑھی اور آپ کے اخبار میں جو مراسلہ شائع ہوا ہے اس میں اگرچہ کسی کا نام نہیں تھا تاہم یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس مراسلہ میں مسٹر رفعت سروش کا ذکر کیا گیا تھا۔ میں بھی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ مسٹر رفعت سروش نے اُردو اکیڈمی سے جو استعفیٰ دیا ہے اس میں کوئی مصلحت پوشیدہ ہے۔ اگر واقعی ان کی صحت خراب ہے تو انہیں غالب انسٹی ٹیوٹ سے بھی مستعفی ہو جانا چاہئے۔ جب سے مسٹر رفعت سروش نے غالب انسٹی ٹیوٹ کا کام سنبھالا ہے تب سے غالب انسٹی ٹیوٹ کی کارکردگی خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی ہے وہاں پر کبھی بجلی نہیں ہوتی اور کبھی پانی۔

حضرت امام حسین جشن منانے کے لئے غالب انسٹی ٹیوٹ کو بک کیا گیا تھا اور عین آخری موقع پہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے اس بکنگ کو منسوخ کر دیا تھا جس کی وجہ سے جشن حضرت امام حسین مولانا آزاد میڈیکل کالج میں ہوا جس کی وجہ سے لوگوں کو بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔"

ممتاز الحق
بی ۱۳۳/-جگت پوری-دہلی

دیکھئے آپ دونوں سربراہانِ غالب انسٹی ٹیوٹ کی مزید واقفیت کے لئے شانِ ہند کی اشاعت آئندہ میں ہم کچھ ایسے واقعات پیش کریں گے کہ انسٹی ٹیوٹ کے الیکٹرک نظام وغیرہ کے لئے جو ٹھیکہ دیا گیا اس میں ایسے طریقے استعمال کئے گئے جو "مشکوک" انداز لئے ہوئے تھے۔

دِلّی دُور درشن پہ اُردو کی ترقی معکوس

ہماری حکومت۔ ہمارے وزیر اطلاعات و نشریات اور دُور درشن وغیرہ یہ دعویٰ کرتے ہوئے نہیں تھکتے کہ یہ سب اُردو کی ترقی۔ تحفظ اور اس کی بقا و حیات کے لئے کوشاں ہیں اور عمل یہ ہے کہ دُور درشن نے "بزم" نامی اُردو پروگرام اب چینل ۴ سے چینل ۱۰ پر دکھانا شروع کر دیا ہے جب کہ یہ نیا چینل محض دلی کے علاقہ تک ہی محدود ہے "بزم" چینل ۴ پر بھی محض رسم پوری کرنے کی حد تک ہی پیش کیا جاتا تھا۔ تاہم یہ اچھا یا برا پروگرام دُور دراز تک دیکھا اور سنا جا سکتا تھا اور اب چینل ۱۰ پر دکھانے سے دُور دراز کے اُردو دوست حضرات اس سے محروم ہو گئے۔

ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ کسی بھی اُردو دانشور نے دُور درشن کی اس ناانصافی اور اُردو دشمنی کے خلاف آواز نہیں اٹھائی بلکہ یہ حضرات خوش ہیں کہ انہیں کچھ زیادہ پروگرام ملنے کی راہ کھل گئی اُردو گئی جہنم میں انہیں تو کم از کم ڈیڑھ صد روپیہ عوام کی سمع خراشی کے عوض مل ہی جائے گا۔

غزل

واجدہ تبسم سرینگر

بنا شاخِ چمن پہ آشیانہ
سمجھ کر زندگی کو قید خانہ
تغیّر ہے ہمارے دم سے قائم
جو ہم بدلیں بدل جائے زمانہ
چٹکنے دے ذرا غنچوں کو گلچیں
نہ ڈالے اُن پہ نگاہِ طائرانہ
تباہی کے سوا کیا ہوگا حاصل
بدلئے لاکھ طرزِ دوستانہ
سنور جائے ابھی زلفِ غزل بھی
نئے الفاظ کا لائیں جو شانہ
سمجھ بیٹھے تھے جن کو دشمنِ جاں
انہیں سے پھر ہے ربطِ دوستانہ
تبسم خوش نصیبوں کو ہمیشہ
میسّر ہے چمن کا آب و دانہ

عقیل صدیقی

ریڈیو لکھنؤ کا مشاعرہ

ہربنس لال ایم۔ اے

اکیس برس ہوئے کہ ۳؍ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو لکھنؤ الہ آباد ریڈیو اسٹیشن سے ایک مشاعرہ نشر ہوا تھا۔ اس مشاعرے کی روداد ایڈیٹر شانِ ہند کے فرزند ارجمند ہربنس لال ایم۔ اے نے ریڈیو سنتے ہوئے لکھی اور اسے نومبر ۱۹۶۱ء کے شانِ ہند میں شائع کیا گیا تھا۔ یہ مشاعرہ اس قابل ہے کہ اسے دوبارہ سنا یا پڑھا جائے۔ لہذا نذرِ ناظرین ہے۔ (ادارہ)

لکھنؤ کے دبستانِ شاعری کو اردو زبان کے شعری ادب کی تاریخ میں اہم مقام حاصل ہے۔ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کے سالانہ مشاعرے اس دبستان سے منسلک روایات کو موجودہ دور میں زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ دلی اسکول کے کسی بھی نمائندہ شاعر کا کلام پڑھ کر یا سن کر دل سے آہ نکلتی ہے تو لکھنؤ اسکول کے کسی بھی نمائندہ شاعر کا کلام پڑھ کر یا سن کر دل سے واہ نکل جاتی ہے۔ ۳۱؍ یا ۳؍ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو لکھنؤ الہ آباد ریڈیو اسٹیشن سے جو مشاعرہ نشر ہوا اس کے منتظمین کو بھی اس واہ کی فکر زیادہ دامن گیر تھی وہ ریڈیو پر مشاعرہ سننے والوں کو شاعروں کے کلام سے زیادہ واہ واہ کی آوازیں سنانا چاہتے تھے تاکہ ہر لحظہ یہ خیال رہے کہ مشاعرہ لکھنؤ اسکول کی نمائندگی کر رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ منتظمین نے چند آدمی کرائے پر لے کر مائکروفون کے سامنے بٹھا دئے ہیں جو ہر شاعر کے ہر مطلع پر خواہ مخواہ واہ واہ کا اتنا شور بلند کرتے کہ سامعین پورا مصرع

بھی نہ سن پاتے۔ میں اس مشاعرہ کی روداد لکھنے کے واسطے اشعار نوٹ کر لینے کے لئے جناب کریمی الاحسانی اور راقم السطور دو الگ الگ ریڈیو سیٹوں کے سامنے کاغذ اور قلم لے کر بیٹھے رہے۔ ہم دونوں نے درجنوں مشاعروں میں کلام نوٹ کیا ہے لیکن اس مشاعرہ میں کرایہ کے واہ واہ کرنے والوں کے شور کے سامنے ہم دونوں کی زود نویسی منہ تکتی رہی۔ یہ پہلا مشاعرہ تھا جب میں پڑھے گئے اکثر اشعار ہم دونوں ہی نوٹ نہ کر سکے۔ ایک دو شاعروں کا تو ایک مصرع بھی نوٹ نہ ہو سکا۔ نہ جانے مشاعرہ کے منتظمین ریڈیو پر نشر ہونے والا مشاعرہ کس کو سنانا چاہتے تھے کیوں کہ ریڈیو پر سننے والے کان اکثر شعراء کا کلام نہیں سن سکے۔ تسلیم کہ داد و تحسین کا شور مشاعرہ کی کامیابی کا ایک ہوتا ہے لیکن مشاعرہ کے کامیاب ثابت کرنے کے لئے چند لوگوں کو صرف واہ واہ کرنے کے لئے مائک کے سامنے بٹھا دینا ریڈیو مشاعرہ کی خصوصیت نہیں ہونی چاہئے۔ امید کی جاتی ہے کہ

آئندہ ریڈیو مشاعروں کے منتظمین اس بات کا خیال رکھیں گے کہ یہ مشاعرہ مدعو حاضرین سے زیادہ ریڈیو سننے والوں کے لئے ہوتا ہے۔

یہ مشاعرہ اردو مشاعروں کی تاریخ میں یادگار رہے گا کیوں کہ آزادی کے بعد شاید یہ پہلا مشاعرہ ہے جس میں ایسے شعرا نے کلام سنایا جو ریڈیو مشاعرے میں پڑھنے کے واقعی مستحق تھے جن کی شعری خدمات مسلّم ہیں اور جو کسی سفارش کے بغیر اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کی وجہ سے لکھنؤ ریڈیو کے مشاعرے میں شرکت کر سکتے تھے۔ غلام رسول نازکی، خمار بارہ بنکوی، بسمل الٰہ آبادی، سید صدیق حسن، نشور واحدی، حبیب احمد صدیقی، معین احسن جذبی، گوپی ناتھ امن لکھنوی، میکش اکبرآبادی، حیرت بدایونی، سراج لکھنوی، آنند نرائن مُلّا اور اثر لکھنوی۔ ان میں سے بیشتر شعراء استادی کا درجہ رکھتے ہیں اور اردو شاعری کی تاریخ میں اپنا مقام پیدا کر چکے ہیں۔

یہ مشاعرہ اس لئے بھی یادگار رہے گا کہ اس کو گلے باز شاعروں سے پاک وصاف رکھا گیا۔ اس مشاعرہ میں کوئی بھی ایسا شاعر نہیں تھا جس کو اپنے ترنم کی وجہ سے ہی شہرت حاصل ہوئی ہو۔

یہ مشاعرہ اس لئے بھی یادگار رہے گا کہ اس میں مجھے تین ایسے شاعروں کو سننے کا موقع ملا جن کو کبھی نہیں سنا تھا اور شاید "شانِ ہند" کے قارئین کے لئے بھی یہ شاعر نئے ہوں۔ نئے صرف اس لئے کہ شانِ ہند میں شائع ہونے والی رودادوں میں ان شاعروں کا ذکر نہیں آیا ہوگا ویسے یہ تینوں شاعر اردو کی شعری دنیا میں اجنبی نہیں۔ سید صدیق حسن اور حیرت بدایونی تو اساتذہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔

یہ مشاعرہ اس لئے بھی یادگار رہے گا کہ اس میں داد و تحسین کے ڈونگرے بلا امتیازِ وصفِ شعر بڑی بے دردی سے برسائے گئے۔

آئیے اب مشاعرہ سنیں۔ اس وقت رات کے ٹھیک ساڑھے نو بجے ہیں۔ ریڈیو اعلانچی کی درخواست پر یو پی کے وزیر اطلاعات شری رؤف جعفری مشاعرہ کا افتتاح فرما رہے ہیں۔ اعلانچی نے جناب غلام رسول نازکی کو دعوتِ سخن دی ہے۔ نازکی کشمیری ہیں اور کشمیر کی حسین وادی کی جھیل مانسرور پر نظم سنا رہے ہیں۔ عنوان ہے "ایک سہانی چاندنی رات اور مانسرور کی جھیل" فرماتے ہیں ؎

مرے کشمیر کی ہر شے حسیں ہے   یہاں کی ہر پہاڑی مہ جبیں ہے

داد کا شور پر شور ہی اٹھ کھڑا ہوا ہے اور اب کوئی بھی مصرع پوری طرح نہیں سنا جا رہا۔ بڑی مشکل سے ایک شعر اور نوٹ ہو سکا ہے ؎

مرے محبوب موسیقار تم ہو   مرا دیپک مرا ملہار تم ہو

نظم پر داد بہت دی گئی ہے۔ کہہ نہیں سکتا کہ نظم ہی اتنی اچھی تھی کہ اتنی داد دی جاتی یا کرایہ کے داد دینے والوں نے حقِ مزدوری ادا کیا۔ نظم کے بعد نازکی غزل سنا رہے ہیں۔ مطلع سنئے ؎

جبینِ ناز کو آلودۂ ملال نہ کر
میں بے ادب ہوں مری بات کا خیال نہ کر

داد کا شور اس مطلع پر بھی بلند ہوا ہے حالانکہ مطلع میں کوئی ایسی بات نہیں جس پر داد دی جائے
دوسرا شعر سنئے ؎

یہ غم وہ غم ہے کہ جس پر نشاط ہو قرباں
غمِ فراق کو شرمندۂ وصال نہ کر

یہ شعر لکھنؤ کے دبستانِ شاعری کی عکاسی نہیں کرتا۔ یہ نشاط اور وصال جن سے نازکی دور بھاگ رہے ہیں لکھنؤ والوں کو بہت مرغوب ہیں لیکن اب دلّی اور لکھنوی دبستانوں میں مفاہمت سی پیدا ہو گئی ہے اس لئے داد مل رہی ہے۔ نازکی فرما رہے ہیں ؎

نہ اس میں شام و سحر ہے نہ دوش و فردا ہے
گدازِ عشق کو پابندِ ماہ و سال نہ کر

اس شعر کو شاید لکھنؤ کے دعو منتخب خواتین و حضرات بہت سمجھ پائے ہیں جبھی تو ریڈیو سے داد کا شور سنائی دے رہا ہے۔ نازکی کا شعر ہے ؎

خدا ابھی تجھ سے جو پوچھے تری رضا کیا ہے
قلندری کا تقاضا ہے عرضِ حال نہ کر

ریڈیو سے اٹھنے والے داد کے شور میں آپ کو بھی شامل ہونا چاہئے کیوں کہ یہ شعر داد کا مستحق ہے کیوں نہ ہو نازکی نے بیسویں صدی کے عظیم ترین اردو شاعر اقبال سے چار قدم آگے بڑھ آئے ہیں۔ اقبال نے کہا ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اقبال کی خودی سے نازکی کی قلندری سبقت لے گئی ہے۔ کیوں ؟ نازکی کا اگلا شعر سنئے ؎

ترا مقام مقامِ رضا سے آگے ہے
خودی نہ بیچ طفیلی نہ بن سوال نہ کر

اقبال نے اردو غزل کو جو نئے جہانِ معنیٰ عطا کئے جو نئی وسعتیں دی ہیں نازکی کی غزل کے یہ دو اشعار انہیں کی طرف اشارے کرتے ہیں۔ نازکی اس وقت لکھنؤ کے ریڈیو اسٹیشن سے غزل پڑھ رہے ہیں جہاں کی آرائشِ جمال شامِ اودھ کی یاد کو ابھی تک دلوں سے محو نہ کر سکی ہے۔ اس لئے ان کا فراق پسند دل بھی مچل جانے کو بے تاب ہے فرماتے ہیں ؎

مچل نہ جائے کہیں یہ دلِ فراق پسند
خدا کے واسطے آرائشِ جمال نہ کر

غلام رسول نازکی داد و تحسین کے شور میں تشریف لے جا رہے ہیں۔ اب اعلانچی نے ایک نام پکارا ہے لیکن شور اتنا ہے کہ شاعر کا نام بھی سنائی نہیں دیا۔ غزل کے مقطع سے معلوم ہوا کہ آپ بسمل الہ آبادی تھے۔ منشی سکھ دیو پرشاد بسمل کو حضرت نوح ناروی سے شرفِ تلمذ حاصل ہے اس لئے ایک خوش مزاج اور بذلہ سنج

سے شائع ہو چکا ہے۔ بسمل اپنی رباعیات کی وجہ سے مشہور ہیں جن میں فلسفۂ ہستی کو بہت دلچسپ اور شاعرانہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ لیجئے بسمل صاحب رباعی سنا رہے ہیں ؎

پردے میں ہے جو راز سنا کرتا ہوں
بجتا ہوا اک ساز سنا کرتا ہوں
بسمل کوئی غمخوار نہیں دل کے سوا
آپ اپنی ہی آواز سنا کرتا ہوں

داد کا وہی عالم ہے۔ اب بسمل صاحب حضرت جگر مرادآبادی کو یاد فرما رہے ہیں ؎

چمن سونا ہے بلبل اب نہیں ہے
وہ رنگِ لالہ و گل اب نہیں ہے
جگر کی یاد تڑپاتی ہے بسمل
شہنشاہِ تغزل اب نہیں ہے

اس رباعی پر سامعین نے داد دے کر حضرت جگر مرادآبادی کو اپنا اپنا خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اب جناب بسمل الہ آبادی غزل سنا رہے ہیں۔ داد کے موقع بے موقع شور کے سامنے میری زود نویسی گھٹنے ٹیک رہی ہے بعد میں معلوم ہوا کہ جناب کریمی الاحسانی بھی صرف چار اشعار نوٹ کر پائے ہیں وہ بھی نامکمل سے۔ بسمل کی غزلوں میں سادگی، بے ساختہ پن اور صفائی کافی ہوتی ہے کہیں کہیں تصوف کی جھلک بھی ہوتی ہے آپ حسن و عشق کے راز و نیاز بڑی خوبی سے ادا کرتے ہیں اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نہ اپنا دل ہم کریں گے صدقے نہ جان اپنی فدا کریں گے
جب اس پہ قبضہ ہے نیستی کا تو ایسی ہستی کو کیا کریں گے
کبھی برا برق کو کہیں گے کبھی خزاں کا گلہ کریں گے
چمن میں جب آشیاں نہیں ہے چمن میں رہ کے کیا کریں گے
فنا کی صورت بقا کی صورت، بقا کی صورت فنا کی صورت
ملی ہے جن کو نگاہِ حق بیں وہ فرق دونوں میں کیا کریں گے

گئے ہیں داد کے شور میں اگلا شعر گم ہو گیا تھا لیکن یہ شعر اتنا اچھا تھا کہ بسمل صاحب کو کئی بار پڑھنا پڑا اور کوئی صاحب ایک لفظ کو چھوڑ کر پورا شعر نوٹ کرنے میں کامیاب ہو گئے شعر ہے ؎

حدودِ دیر و حرم سے باہر نکل گئے شوق میں جو بڑھ کر
انہیں کا سجدہ قبول ہو گا جہاں وہ سجدہ ادا کریں گے

بسمل صاحب کے بعد خمار بارہ بنکوی تشریف لائے ہیں۔ خمار صاحب ترنم سے پڑھتے ہیں بہت اچھا پڑھتے ہیں اور ایسا پڑھتے ہیں کہ میں ان کا کلام بہ آسانی نوٹ کر سکتا ہوں لیکن آج مجبور ہوں۔ مشاعرہ ریڈیو سے سن رہا ہوں۔ ریڈیو بھی جرمنی کا بنا ہوا ہے اور بالکل صاف آواز دیتا ہے مگر کرائے کے داد دینے والے آج ہی اپنا فرض ادا کرنے کی قسم کھائے بیٹھے ہیں۔ خمار صاحب کا کوئی شعر کام کا نوٹ نہیں ہو سکا مطلع اور مقطع سن لیجئے ؎

اے حشر والو تم سے مرا اک سوال ہے
دیکھا ہے ان کو بھی جنہیں ہنسنا محال ہے
ہم نے انہیں قریب سے دیکھا ہے اے خمار
اپنا جو حال ہے وہی اُن کا بھی حال ہے

یہ غزل خمار کی نمائندہ غزل نہیں کہی جا سکتی۔ درمیانہ درجہ کے اشعار پر بھی ریڈیو اسٹیشن والوں کے مدعو کئے گئے منتخب حضرات و خواتین کا شاید یہی معیار ہو۔ داد کا اتنا شور مچا ہے کہ سب حیران ہے یہ ہو کیا رہا ہے۔ اب جناب سید صدیق حسن کو دعوتِ سخن دی گئی ہے۔ آپ غزل میں اپنے رنگِ خاص میں منفرد ہیں۔ داخلی کیفیات اور فطری تاثر و سوز و گداز آپ کے کلام میں با افراط پایا جاتا ہے زبان کی صفائی اور بندش کی چستی کے اچھے نمونے آپ کے کلام کا نمایاں وصف ہیں۔ مجموعی طور پر آپ کے کلام میں وہ تمام محاسن پائے جاتے ہیں جن کی عصری دور میں ضرورت ہے لیکن اس کے باوصف صدیق حسن صاحب گوشۂ گمنامی کو عزیز رکھنے پر مجبور ہیں۔ آپ گروہ بندی اور موجودہ دور کے شاعروں کی پروپیگنڈہ بازی سے دور ہیں اور خاموشی سے شعر و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ صدیق حسن صاحب تحت اللفظ میں پڑھ رہے ہیں۔ تحت اللفظ بھی ایسا جس پر سیکڑوں ترنم قربان کئے جا سکتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

پہلے بہ پے جلوۂ صد رنگ لے آتی ہے
موت سے زلف کی یوں چھیڑ چلی آتی ہے

داد و تحسین کا وہ شور بلند ہوا ہے کہ ایسا معلوم ہے جیسے لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کے اسٹوڈیو میں آگ لگ گئی ہے اور مدعوئین ہڑبڑا کر شور کرتے ہوئے ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔ صدیق صاحب دیکھئے کتنے اچھے اشعار سنا رہے ہیں بہت مشکل سے نوٹ کئے جا سکے ہیں یا ہر شعر پر بے انتہا داد دی گئی ہے۔

گر فریبِ نظر و ہوش نہیں موجِ سراب

- - - - - - - - - - - - -

یاد ان کی کبھی اس طرح بھی آ جاتی ہے جیسے
لالہ زاروں میں شبک سیر بہار آتی ہے

کریمی صاحب نے سبک سیر بہار آتی ہے نوٹ کیا ہے سب داد کا شور مچانے والوں کے کرم کا نتیجہ ہے صدیق صاحب کے پڑھنے کا انداز اور ایسے اچھے اشعار داد تو ان کا حق ہے ہی لیکن داد سلیقے سے بھی دی جا سکتی ہے کہتے ہیں کہ داد بے ساختہ دی جاتی اور اس کو روکا نہیں جا سکتا۔ مائک تو داد دینے والوں کے شور مچانے والے منہ سے دور کیا جا سکتا ہے دیکھ کتنا اچھا شعر ہے ؎

آتے رہتے ہیں جو طوفانوں کے یاد دل گھر کر
ان کے سائے میں کبھی نیند بھی آ جاتی ہے
ہو رہی ہے مئے دیدار عطا جام بہ جام
خم بہ خم تشنگیٔ دید بڑھی جاتی ہے
حلقۂ ابر کو جب توڑ کے بنی برق تپاں
کام آتی ہے تو شوریدہ سری آتی ہے

داد کا طوفان بپا ہے۔ اب مصرعوں کا نوٹ کرنا نا ممکن

ہے۔ کریمی صاحب اور واقم الحروف دونوں نے مل کر جوں توں کر کے دو شعر اور مکمل کر لئے ہیں یہ شعر حاضر ہیں ؎

نکہتِ گل ہوئی آوارہ تو عالم مہکا
جانے کیا بھید یہ دیوانہ وشی لاتی ہے
چادرِ آب ہوئی چاک تو ہر سُو ابھریں
اک جہاں ساتھ لئے ۔ ۔ ۔ آتی ہے

داد و تحسین کے شور میں صدیق حسن صاحب کے بعد ریڈیو اعلانچی نے ایک اور شاعر کو دعوتِ سخن دی ہے لیکن نام ہی صاف سنائی نہیں دیا کیوں کہ سامعین ابھی تک صدیق حسن صاحب کے آخری شعر پہ داد دے رہے ہیں اور ریڈیو اعلانچی ان کے خاموش ہونے تک انتظار نہیں کر سکتا۔ ریڈیو مشاعرے میں وقت کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے۔ شاعر کی آواز سے معلوم ہوا کہ آپ نشور واحدی ہیں۔ نشور واحدی کے ساتھ ساتھ آپ کا ترنم بھی اب عمر رسیدہ ہوتا جا رہا ہے اور کلام ؟ نشور صاحب کا اعتقاد ہے کہ شاعری زندگی کے ساز کی مضراب ہے۔ کائنات کی حقیقتوں کا آرگن ہے، جذبات کی بانسری ہے، خیالات کا راگ ہے، فطرت کا ساز ہے، حسن کا ترانہ ہے، عشق کا نغمہ ہے، سنئے نشور صاحب داد و تحسین کے شور میں غزل سرا ہو رہے ہیں ؎

پھر زلفِ مسلسل کی شکن جاگ پڑی ہے
پھر حسن میں جادو کی کرن جاگ پڑی ہے
معلوم نہیں پھول ہیں یا نقشِ کفِ پا
گزرا ہے کوئی راہِ چمن جاگ پڑی ہے

اس شعر پہ داد نہ دینا بد ذوقی کی دلیل ہوگا۔ اور داد کا طوفان برپا ہے۔ شور اتنا زیادہ ہے کہ لفظ بھول بڑی مشکل سے گرفت میں آسکا ہے۔ نشور نغمہ سرا ہیں ؎

جب دل کی نہیں خیر نہ لے نام وفا کا
پھر وہ نگہِ وعدہ شکن جاگ پڑی ہے
ساغر میں کوئی موج غم زدہ نہ ملے گی
شیشوں میں بھی صہبائے کہن جاگ پڑی ہے
اس دور کی تہذیب بھی اک نیند ہے گہری
کروٹ نہیں بدلی تو تھکن جاگ پڑی ہے

اس شعر پہ واقعی داد دی گئی ہے۔ واہ واہ کیا شعر ہے۔ کیا اب بھی شکایت ہے کہ غزل کا دامن تنگ ہے۔ نشور صاحب فرما رہے ہیں ؎

اس تیز ہوا میں جو گرے ٹوٹ کے کچھ پھول
سوئی ہوئی ہر شاخِ چمن جاگ پڑی ہے
جیسے کہ تجلی . . . .
ملبوس میں گل رنگئی تن جاگ پڑی ہے
محتاج نہیں باغ نسیم سحری کا
اے جانِ چمن روحِ چمن جاگ پڑی ہے
ہے منتظر اس دل کے دھڑکنے کا زمانہ
جس دل میں محبت کی کرن جاگ پڑی ہے
سب خاکِ نشیمن کو یوں ہی چوم رہے ہیں
یا غیرتِ اربابِ وطن جاگ پڑی ہے

اس آخری شعر نے سامعین پر داد کا دورہ اس بُری طرح جاری کر دیا ہے کہ نشور صاحب کی غزل کا مقطع گم ہو گیا ہے۔ اب جناب حبیب احمد صدیقی صاحب تشریف لاتے ہیں۔ تحت اللفظ میں پڑھ رہے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

یہ نہیں کہ لب ہلا نہ سکے
جو سنانا تھا وہ سنا نہ سکے
اس سے امید کیا گلہ کیسا
خوگرِ غم بھی جو بنا نہ سکے

داد کا شور برابر طوفان کی صورت میں بپا ہے۔ اسی طوفان نے حبیب احمد صدیقی صاحب کا ایک شعر بھینٹ لے لیا ہے۔ حبیب فرما رہے ہیں ؎

غم نہیں اس کا جو گنوا ڈالی ہائے وہ عمر جو گنوا دی سکے

اسی شعر پر تو سامعین کئی منٹ تک سر دھنتے رہے اور ابھی تک دھن رہے ہیں۔ حبیب فرما رہے ہیں ؎

گلشنِ آرزو بنائے تو کیا — ہاتھ گلوں کو ہم لگا نہ سکے
ان کی مجبوریاں کوئی دیکھے — پاؤں بھی جن کے ڈگمگا نہ سکے
وہ جفا کر کے باہنر ٹھہرے — ہم وفا کو ہنر بنا نہ سکے

کیا شعر ہیں صاحب۔ ایک ایک شعر پر سر دھننے کو دل چاہتا ہے اور مدعو حاضرین نے داد کا حق ادا کر دیا ہے۔ حبیب صاحب نے واقعی ثابت کر دیا ہے کہ وہ کہنہ مشق شاعر ہیں صرف غزل کہتے ہیں۔ آپ کی غزل کا انداز کلاسیکی ہے۔ مختصر بحروں میں کئی خوبصورت غزلیں کہی ہیں اسلوب ہموار ہے کہیں کہیں ذاتی تجربے گریباں چاک سامنے آجاتے ہیں۔ البتہ عام طور پر ان پر گہرے پردے ڈالنے کا اہتمام نظر آتا ہے۔ دلی جذبات اور واردات قلب اور تاثرات کو اگر کسی شاعر نے سلیقہ سے استعمال کیا ہے تو حبیب احمد صدیقی صاحب کا نام اور مقام محفوظ اور مخصوص ہو گیا ہے۔ اب ریڈیو سے اس شاعر کی آواز آرہی ہے جس کا یہ شعر آپ کبھی نہ بھول سکیں گے ؎

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

جی ہاں معین احسن جذبی آپ کو الفاظ کے انتخاب کا سلیقہ ہے۔ آپ کے ہاں ایک ہلکی افسردگی، ایک میٹھا درد، ایک خاموش الم ہے۔ گو آپ ترقی پسندوں میں شمار کیے جاتے ہیں لیکن ان کی ترقی پسندی باغیانہ شاعری سے مختلف رہی ہے۔ آپ کی طبیعت میں ایک خاص گداز اور فکر میں محو ہونے والی کیفیت ہے۔ جذبی تحت اللفظ لیکن جذب ہو کر پڑھتے ہیں۔ فرما رہے ہیں ؎

اس بُت کے ہر فریب پہ قربان سے رہے
اک عمر اپنے مٹنے کے سامان سے رہے
اس جانِ نواز کوچے میں ہم بھی رہے مگر
بے دل کبھی رہے کبھی بے جان سے رہے

اس شعر پر داد کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا ہے اور جذبی اس طوفان میں اضافہ فرما رہے ہیں ؎

رندانِ میکدہ ہیں کہ تنگ آ کے اٹھ گئے
یارانِ میکدہ ہیں کہ انجان سے رہے

ایک طرف داد کا شور کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہ دے اور دوسری طرف بجلی کی خرابی کے خیر۔ بجلی خراب ہونے سے طوفان داد و دہش کو کچھ سکون آگیا ہے۔ ریڈیو مکمل طور پر خاموش۔ اب جو ریڈیو بولا تو جذبی کا یہ مصرع سنائی دیا

برسوں ہمارے سینے میں طوفان سے رہے

داد کا شور حسب معمول جاری و ساری ہے جذبی کا ایک شعر اور نوٹ ہو سکا ہے۔ آپ بھی سنئے ؎

گلشن میں جوشِ گل ہیں، بگولے ہیں دشت میں
اہلِ جنوں جہاں بھی رہے آن سے رہے

اب جناب گوپی ناتھ امن تشریف لائے ہیں۔ آتے ہی داد و تحسین کی آوازیں بند ہو گئی ہیں۔ صاحب کی غزل بڑے آرام سے نوٹ کر سکا ہوں ملاحظہ کیجئے ؎

آباد ابھی کرنے ہیں ویرانے بہت سے
بستی میں بھی بے نور ہیں کاشانے بہت سے
انساں کی سرشت ایک ہے اور ظرف الگ ہیں
مٹی تو یہاں ایک ہے پیمانے بہت سے
فرہاد ہو یا قیس ہو، وامق ہو کہ راجھا
ہیں ایک ہی عنوان کے افسانے بہت سے
دنیا کے فریبوں سے جداگانہ ہے انداز
ہے دام یہاں ایک تو ہیں دانے بہت سے
مطلب کی محبت ہو تو کیا خاک محبت ہے
اس دور میں توڑے گئے یارانے بہت سے
علم و ادب و فکرِ معاش و غمِ احباب
اک زیست میں انسان کے ہیں خانے بہت سے

کہیں کہیں سے حقیقی داد کی آوازیں آئی ہیں اور جناب میکش اکبر آبادی تشریف لاتے ہیں۔ ... سے پڑھ رہے ہیں۔ ترنم بالکل بودا ہے داد ... میں ایک مصرعہ بھی پورا نوٹ نہیں ہو سکا۔ وجہ

پرچا دلّو اس قدر مل رہی ہے کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔ اس
ادے ہی میکش صاحب کی عمر میں دس سال کا اضافہ ہو گیا
ہوگا۔ بڑی مشکل سے ایک شعر حاصل کرسکا ہوں، حاضر ہے ؎

نگاہ پھیر کے تم نے چھپا لیا ان کو
گناہ بزم میں جو چشمِ آرزو نے کئے

اس شعر پر واقعی بے پناہ داد دی گئی ہے اور اب ایک
یسا نام پکارا گیا جو باعثِ حیرت بنا ہے کیونکہ میرے
لئے یہ نام کچھ اجنبی سا ہے۔ جناب حیرت بدایونی۔ آپ
کے پڑھنے کا انداز بھی حیرت کا باعث بن رہا ہے یہ انداز
ت اور ترنم کے پیچ کی کسی منزل کا پتہ دیتا ہے۔ آپ کا نام
علامہ سید حسن ہے۔ شعر گوئی کا ذوق آپ کو ورثے
میں ملا ہے آپ زیادہ تر غزلیں کہتے ہیں جن میں عصری
رجحانات اور وقت کے تقاضوں کی جھلک دکھائی دیتی
ہے کلام میں پختگی اور استادانہ رنگ ہے۔ زبان
و اظہارِ بیان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ دیکھئے کتنی
دلنشین غزل سنا رہے ہیں حیرت صاحب ؎

وہ شباب وہ جوش وہ دل نہ رہا وہ تڑپ نہ رہی وہ مزا نہ رہا
تری آنکھ میں قدرِ وفا نہ رہی مرے دل میں مذاقِ جفا نہ رہا
وہ امنگ نہیں وہ ترنگ نہیں وہ نکھار وہ روپ وہ رنگ نہیں
وہ تم ہی رہے نہ وہ ہم ہی رہے نہ وہ عمر رہی نہ زمانہ رہا

آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ داد و تحسین کا کس
قدر شور برپا ہے لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کے اسٹوڈیو میں
اتنی پہلی مرتبہ اتنا شور بلند ہوا ہوگا۔ طویل بحر حسن و
عشق کا بیان اور حیرت کا اندازِ ادا سب کو محوِ حیرت
کر رہے ہیں۔ حیرت صاحب نے مشاعرہ کو سر پر اٹھا لیا ہے
فرماتے ہیں ؎

تری دھن میں گیا ہوں وہاں نہ غمِ دل و جاں نہ غمِ دو جہاں
کوئی دھن تری دھن کے سوا نہ رہی کوئی غم ترے غم کے سوا نہ رہا
ترا جلوۂ ناز وہ رشکِ ارم نہ رہے جیسے دیکھ کے آپ میں ہم
من و تو کا ملاپ ہوا جو بہم من و تو میں وہ فرق جو تھا نہ رہا
وحیا و حجاب سے بے خبری کبھی جلوہ گری کبھی پردہ دری
کوئی جلوہ وہ تھا جو عیاں نہ ہوا کوئی پردہ نہ تھا جو اٹھا نہ رہا
ترے کوچہ سے فتنۂ نو جو اٹھا تو زمانے میں ہو گیا حشر بپا
جو اٹھی تری بزم سے رسمِ وفا تو جہاں میں رواجِ وفا نہ رہا
مجھے سمجھے حیرتِ موج و نظر مجھے چاہیے جلوۂ برق و شرر
میں ہوں بزم میں ایک چراغِ سحر مرا ٹھیک ہی کیا کہ رہا نہ رہا

کہئے یہ غزل پڑھ کر آپ کو "مومن کی "تمہیں یاد ہو
کہ نہ یاد ہو" والی غزل یاد آئی یا نہیں۔ حیرت صاحب
مومن و غالب و ذوق کے دور کے ہی شاعر معلوم ہوتے
ہیں۔ واہ واہ کا ایک شور ہے کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔ دو
چار منٹ کی خاموشی کے بعد اعلانچی نے حضرت سراج لکھنوی
کا نامِ نامی پکارا ہے۔ سراج صاحب دبستانِ لکھنؤ کی
آخری یادگاروں میں سے ہیں۔ پاکیزگیِ زبان و محاورہ
پر آپ کو بجا طور پر ناز ہے۔ جدید خیالات نے آپ کو
اس دور کے غزل گو شاعروں میں ممتاز مقام دیا ہے
آپ نئی غزل سنا رہے ہیں جس میں وقت کے تقاضے
جھانک رہے ہیں۔ آپ بھی ملاحظہ کیجئے۔ بُرا ہو داد کے
شور کا کہ غزل پوری نوٹ نہ کرسکا۔ مطلع حاضر ہے اس
میں لفظ "سست" ممکن ہے سراج صاحب کا نہ ہو بلکہ
سراج صاحب کے لفظ اور داد کے شور کا مرکب ہو ملاحظہ ہو ؎

رہے گا سست پہ ہو کر اسیرِ آشیاں کب تک
تڑپتی بجلیوں کے سائے میں خوابِ گراں کب تک

مطلع پر جو شورِ داد بلند ہوا ہے وہ بیان سے باہر ہے
سنئے اور غور کیجئے سراج صاحب کیا فرما رہے ہیں ؎

یونہی بدلا کریں گے کارواں بے کارواں کب تک
یہ تقسیمیں کہاں تک یہ فراقِ جسم و جاں کب تک
تکلف برطرف یونہی تماشہ دیکھنے والو
اٹھو انگڑائیاں لیتا ہوا عزمِ جواں کب تک
تبسم سے لبوں کو آشنا کر لو بہکتے بھی آنسو
یہ پیشہ ہے بہت نازک حبابوں کی دکاں کب تک

داد کا شور قیامت کا سماں پیدا کر رہا ہے۔ سراج صاحب
ہر شعر تین بار پڑھ رہے ہیں پھر بھی شعر لوٹ کی طرح

سنائی نہیں دے رہا ہے۔ ایک ایک شعر موتی ہے لیجئے آپ بھی چند موتی اپنے دامن میں سمیٹ لیجئے ؎

غنیمت جان اس ہنگامہ زار زندگانی کو
بھروسہ کر نفس پر خوفِ مرگِ ناگہاں کب تک

زبانِ حال بھی گرمِ سخن ہے کچھ سنو بھی تو
فقط ماضی کی دہراتے رہو گے داستاں کب تک

کہاں یہ قطرہ سامانی کہاں اشکوں کی طغیانی
بھرے اشکوں سے ساغر ساقیٔ نامہرباں کب تک

مرے ہی دل کی دھڑکن سے زمیں کی نبض چلتی ہے
یہ دیکھو اب میں بنتا ہوں ضمیرِ آسماں کب تک

اُٹھو بھی اب طلوعِ آفتابِ آشیاں دیکھو
سنہری دھوپ میں شامِ قفس کی داستاں کب تک

اس مرصع و مسجع غزل کے ایک ایک شعر پر بے پناہ داد پانے کے بعد سراج صاحب مائک سے ہٹنے لگے تو ایک اور ایک اور کا ایسا شور بلند ہوا کہ سراج صاحب کو دوسری غزل شروع کرتے ہی بن پڑی لیکن اس غزل کا مطلع شور کی نذر ہو گیا شور میں کچھ بھی سنائی نہیں دیا۔ مطلع پر داد کا شورِ قیامت بپا ہوا ہے۔ سراج صاحب فرما رہے ہیں ؎

دامن ہو کسی کا تو ابھی دھوپ جھٹک جائے
ہر اشکِ محبت میں تجلی ہے سحر کی
ہاں عشق کے سجا۔ - - - - - - - -
قسمت سے کسی دن تو ہوا ہو گی ادھر کی

"شائستہ فریاد" جیسی اچھوتی اور شگفتہ ترکیبیں ہی تو سراج کا سرمایہ ہیں۔ اُردو زبان ان کے احسان کو کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ مقطع ملاحظہ کیجئے اور سراج صاحب کی خدمات کو داد دیجئے ؎

دامن ہے زمانے کا سراج اور مرے آنسو
دن رات لکھا کرتا ہوں روداد بشر کی

اتنا شور اُٹھ رہا ہے کہ اعلانچی نے کسی شاعر کا نام لیا ہے میں صرف اسد صاحب ہی سن سکا ہوں یا سمجھ سکا ہوں۔ ریڈیو سے ایک بھاری اور بھدّی آواز آ رہی ہے لفظ صاف سنائی نہیں دے رہے ہیں۔ مقطع سے معلوم ہوا آپ حضرت آنند نرائن ملّا ہیں مطلع سنئے ؎

چھائی ہوئی دلوں کی دنیا پر اس صبحِ خرد میں شام بھی
اہلِ ہوس کے ہاتھوں کچھ نامِ الفت بدنام بھی۔

مطلع میں جو جہانِ معنی آباد ہے وہ ملّا کی شاعری کا نمایاں وصف ہے۔ ملّا کے ہاں سادہ الفاظ میں دقیق خیالات، دلکش تشبیہات اور پُر لطف استعارے فراوانی سے پائے جاتے ہیں۔ آپ کے جذبات میں تو زبان میں سنجیدگی اور سلاست ہے۔ ذوقِ تغزل قسم کا ہے۔ مطلع ہی سے داد کے ڈونگرے برسنے لگے ہیں اور ہر شعر پر برس رہے ہیں۔ لیجئے غزل ملا فرمایئے ؎

جینے کی یہی رُت ہے شاید ہر سانس میں اک پیغام بھی
اک شام بھی ہے اک بام بھی ہے - - - - - - -
یہ غم بھی نہیں راحت بھی نہیں آخر اس کا کچھ نام بھی۔
اک میٹھی میٹھی دل میں خلش جو صبح بھی ہے اور شام بھی۔
دونوں سے بصیرت مجھ کو ملی دونوں نے سنواری زیست
ہاتھوں میں درخشاں اشک بھی ہیں ہاتھوں پہ فروزاں جام
اس دل کی زباں میں لفظوں کے مفہوم بدلتے رہتے
ہاں پیاس کے بولوں میں شامل لگا ہے دشنام بھی۔
اس کسبِ نور سے کیا حاصل جو شمعِ ہدایت بن نہ سکے
ہے زیست کے شایاں زیست وہی جو زیست بھی ہے پیغام
ہے عشق خود اک آئین اس پہ آئینِ جہاں کا زور نہیں
یہ آپ سزا بھی اپنی ہے اور آپ اپنا انعام بھی۔

اسی حاصلِ مشاعرہ غزل کا ایک ایک شعر بیش قیمت موتی ہے داد و تحسین کا کچھ حساب نہیں۔

ایک شعر جناب کریمی الاحسانی صاحب نے اس نوٹ کیا ہے ؎

اک رُخ ہے وجود اک رُخ ہے عدم وقتِ گزراں کا
اس بنتی مٹتی دُنیا کا آغاز بھی ہے انجام بھی۔

مجھے شک ہے کہ کریمی صاحب یہ شعر صحیح صحیح نوٹ نہیں کر

[ہ]یسے اس شعر پر آج کے دار لنشاط مشاعرے میں سب سے [ز]یادہ داد دی گئی ہے سنئے ملا صاحب کیا فرما رہے ہیں ؎

اپنی اپنی قسمت اس میں یہ راہِ محبت بھی ہے عجیب
اک عمر سفر بھی ناکافی، آگے منزل دو گام بھی ہے

شمعوں کے حسیں میناروں کے قدموں میں ہے خاک پروانہ
میناکی صدائے قلقل میں آوازِ شکست جام بھی ہے

دنیا ہے خرابوں کا میدان نقلی چہرے جھوٹی باتیں
اف رے ادائے شبنم افسردہ فکر اندام بھی ہے

[د]اد کا اتنا شور اٹھ رہا ہے کہ شاید یہ شعر صحیح نوٹ نہیں ہو سکا [ا]ور اس سے اگلا شعر تو بالکل نوٹ ہی نہیں ہو سکا مقطع ملاحظہ [کیجئ]ے ؎

دشمن سے نہ کھائی مات کبھی اور دوست کی شہ سے بچ نہ سکا
ملاؔ کی حقیقت کیا کہیے پختہ بھی ہے کچھ کچھ خام بھی ہے

[ی]ہ غزل حاصل مشاعرہ قرار دی جا رہی ہے سامعین واہ واہ [ک]ر رہے ہیں اور اب حضرت نواب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر [لک]ھنوی کی آواز آ رہی ہے۔ اثر صاحب کی عمر اس وقت ۸۰ [ب]رس ہے آپ لکھنوی شعراء میں رنگینی اور شادابی کے لئے [م]متاز ہیں۔ آپ کے ہاں قدیم رنگ کی پختگی ہے اور جدید رنگ [ک]ی سادگی۔ آپ میرؔ سے زیادہ متاثر ہیں سادگی، زبان و [بی]ان، سلاست مضمون، سوز و گداز، تصوف اور معرفت [آ]پ کے کلام کے محاسن ہیں لیجئے غزل سنئے اور سر دھنئے [اث]ر صاحب مطلع فرما رہے ہیں ؎

[ز]ندگی موت پر جو ہنستی ہے ؛ کتنی مہنگی ہے کتنی سستی ہے
[ز]ندگی نام تھا محبت کا ؛ یا محبت کو اب ترستی ہے

کیا بات ہے واہ واہ، داد و تحسین کا شور ہے کہ سب [ک]چھ بہائے لئے جا رہا ہے اور اثر صاحب فکر و خیال کی قندیلیں [ر]وشن کر رہے ہیں۔ فرما رہے ہیں ؎

[آ]دمیت سنا کیجئے ؛ خود پرستی کہ زر پرستی ہے
[د]ل کہ تھا شہر آرزوؤں کا ؛ اب وہاں خاک سی برستی ہے
[ی]وں برستی ہیں شام غم آنکھیں ؛ جیسے امڈی گھٹا برستی ہے

کوئی غم خوار اب کسی کا نہیں ؛ خود پرستی ہی خود پرستی ہے

اب شور نے ایسی صورت اختیار کر لی ہے کہ کچھ بھی نوٹ کرنا ممکن نہیں۔ یہ غزل ختم ہونے پر سامعین کے بیحد اصرار پر آثر صاحب نے دوسری غزل شروع کی ہے۔ اس غزل کے بھی ایک ایک شعر پر بے انتہا داد دی جا رہی ہے۔ اس غزل کے صرف دو شعر نوٹ ہو سکے ہیں ملاحظہ ہوں ؎

چمن زار محبت میں وہ بوٹے ہم لگا دیں گے
کہ جن کے پھول مرجھانے پہ بھی بوئے وفا دیں گے

اگر حالت یہی ہے تند جھونکے بھی حوادث کے
ہمارے کلبۂ غم کی کو لوریاں دے کر سلا دیں گے

حضرت آثر لکھنوی کی اس دوسری غزل کے ساتھ ہی ٹھیک گیارہ بجے یہ یادگار محفل مشاعرہ اختتام پذیر ہو رہی ہے ●●

غزل

علی احمد بکھروی

یہ غزل بھی مشاعرہ انجمن یادگار میں پڑھی گئی تھی [illegible] دیر میں موصول ہوئی اس لیے گذشتہ [illegible] میں شائع نہ ہو سکی۔

لبوں پر اب دعا کوئی نہیں ہے
بلا [illegible] بلا کوئی نہیں ہے
زبانیں رکھ دی رقیبوں کے دہن میں
شکایت بر ملا کوئی نہیں ہے
ذرا سی کامیابی پر یہ عالم
سمجھتے ہیں خدا کوئی نہیں ہے
خطا [illegible] کی سزا اللہ اکبر
دعاؤں کا صلہ کوئی نہیں ہے
دئے تو اور بھی روشن ہیں احمد
مری صورت جلا کوئی نہیں ہے

چندن بھارتی

جناب گوردھن لال
ادیب لکھنوی

چندن اردو داں حضرات کے لئے محتاج تعارف نہیں۔ اردو میں ان کی ۵ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور خاص و عام سے مقبولیت کا شرف حاصل کر چکی ہیں۔ ان کی پہلی مطبوعہ تصنیف بہارِ چندن چار بیت کا مجموعہ ہے جو ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ہم سفر سر چشمہ۔ ۱۹۸۴ء میں گلزارِ چندن اور سینے۔

چندن کا نام رام چند ہے اور چندن تخلص۔ تخلص کے ساتھ بھارتی لکھتے ہیں جو ان کی وطن دوستی کی علامت ہے۔ پیدائش ۱۶ جنوری ۱۹۱۲ء کو قصبہ شجاع آباد ضلع ملتان میں ہوئی۔ ان کے والد جودھری رام چند گوگیا بڑے معزز زمینداروں میں تھے۔ کاروبار اتنا زیادہ تھا کہ اسکولی تعلیم کے زمانے سے چندن کو اپنے والد کے کام میں ہاتھ بٹانا پڑا۔ ۱۹۳۴ء میں شادی ہوئی۔ یکے بعد دیگرے تین لڑکیاں ہوئیں مگر صغر سنی ہی میں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ ۱۹۳۶ء میں والد کے انتقال کے بعد تمام و کل ذمہ داری انہیں پر آ پڑی۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ وطن کا سانحہ پیش آیا۔ گھر بار چھٹا۔ پریشان حالی میں یکے بعد دیگرے مختلف شہروں میں ہوتے ہوتے آخر ٹونک میں قیام پذیر ہوئے۔ یہاں اپنی دیانتداری اور خوش معاملگی کے باعث کافی ترقی کی۔ موٹروں کا کاروبار ہے اور ایک ٹیشروں کی ایجنسی ہے۔ اب ان کا شمار سیٹھوں میں ہے۔

شاعری کا شوق اسکول کی تعلیم کے زمانے سے ہے۔ خدائے پاک نے ذہانت کے ساتھ ساتھ خوش گلوئی بھی عطا کی ہے۔ اسکول کی بزم ادب اور دیگر جلسوں میں حصہ لیتے تھے چنانچہ خود بھی شعر کہنے لگے مگر وہاں ان کی ذہانت اور خوش بیانی کے جوہر نمایاں نہ ہو سکے۔ ٹونک میں جب چندن آ کر مقیم ہوئے اس وقت ٹونک میں اچھے سخن گو موجود تھے جن میں سید عزیز الدین عزیز اور منشی عبد اللطیف کا چندن نے بہارِ چندن میں شکریہ بھی ادا کیا ہے۔

بہارِ چندن چندن کی پہلی مطبوعہ تصنیف ہے یہ چہار بیت (یا چار بیت) کا مجموعہ ہے اس صنفِ نظم کی طرف بیشتر شعرا نے توجہ نہیں کی اس وجہ سے یہ صنف بالعموم ناخواندہ لوگوں کے گانے میں کام آتی رہی چندن نے اس کو ادبی حیثیت دی اور بہارِ چندن اور گلزارِ چندن دو مجموعے شائع کئے جن میں صرف چار بیت ہیں۔

بطور نمونہ ایک بند بہارِ چندن اور ایک گلزارِ چندن سے پیش کیا جاتا ہے۔

از بہارِ چندن:-

بڑی مشکل سے طوفانِ غم و حرماں سے نکلے ہیں
کہ ہم آزاد ہو کر خانۂ زنداں سے نکلے ہیں
وطن کو کس لئے سمجھیں نہ اب اہلِ وطن اپنا
گل اپنے، شاخِ تر اپنی، بہار اپنی چمن اپنا
بگاڑے گا نئے بھارت میں کیا چرخِ کہن اپنا
کہ ہم باعزم دہشت گردشِ دوراں سے نکلے ہیں

مندرجہ بالا بند میں جذبۂ حب وطن، اندازِ بیان کی شگفتگی اور لطفِ زبان سب کچھ ہے جبکہ یہ چندن کی پہلی مطبوعہ کتاب سے لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر اچندن :-

محبت کا جہاں ہے خطۂ ارضِ وطن اپنا
بہارِ بے خزاں ہے گلشن سرو سمن اپنا
حیات افروز بہتا ہے ندی یا یاس کا دھارا
اسی سے سرزمینِ ٹونک ہے جنت کا نظارا
یہ مردم خیز خطہ ہے، ادب کا ہے یہ گہوارا
یہاں کا ذرہ ذرہ کیوں نہ ہو لعلِ یمن اپنا
محبت کا جہاں ہے خطۂ ارضِ وطن اپنا

ایک فارسی شاعر نے سچ کہا ہے -

سالیکہ نکوست از بہارش پیداست

جناب چندن کے شروع کے کلام سے ان کے شاعرانہ مستقبل کی جھلک ملتی ہے۔ علاوہ چہار بیت کے جناب چندن نے دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے مگر غزل ان کی پسندیدہ ترین صنف سخن ہے۔ ہمسفر، سرچشمہ اور سپنے ان کی غزلوں کے مجموعے ہیں۔

غزل کے لفظی معنی ہیں عورتوں سے گفتگو۔ چنانچہ غزل کی زبان بھی انداز گفتگو کی ہونی چاہیئے۔ بقول آزاد تار باجا اور راگ بوجھا۔ بعض اوقات مشاعروں میں غزل کی بیت کا مصرعہ اولیٰ ایسا ہوتا ہے کہ سخن فہم سامعین بغیر سنی ہوئی غزل کا مصرعہ ثانی دہرا دیتے ہیں۔ بعض مصرعے ایسے ہی بولتے ہوئے ہوتے ہیں۔ چندن کی غزل کی زبان مزاج غزل کے موافق ہوتی ہے اور اشعار ان کی زندگی کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ انہوں نے زندگی میں بہت ہمت سے مقابلہ کیا ہے اس لئے ان کی غزلوں میں بھی باوجود اظہار مصائب کے بلند حوصلگی کی تلقین ہے۔ ایک غزل کا مقطع ہے -

دین و دنیا کو اے چندن   جل کر ہی مہکانا ہوگا

اگرچہ چندن خود صاحب مال و دولت ہیں مگر ان کے دل میں غریبوں کا درد ہے۔ بکثرت شعر غریبوں کی ہمدردی میں لکھے ہیں مثلاً

دینا پڑے گا ایک دن ان کو حساب بھی
لاشوں پہ آج محل جو چنوا رہے ہیں لوگ

لازمی ہر کام میں ہمت ہے انساں کے لئے
منزلیں مشکل ہیں جتنی اتنی ہی آسان ہیں

چندن کے بیان عشق میں بھی وضعداری ہے

سمجھنا ہے تو صورت سے سمجھ لو چندن   غم دل کیا کہیں اپنی زبان

چندن خدا پرست ہیں۔ بکثرت اشعار میں اس کا اظہار ہے ان کی خدا پرستی میں تعصب کی گنجائش نہیں فرماتے ہیں -

جلوہ نما جو دیر میں ہے وہ حرم میں ہے
کعبے کا بھی وہی ہے خدا جو صنم میں ہے

اپنی شاعری کے متعلق چندن نے اپنے ایک شعر میں خود ہی روشنی ڈالی ہے -

تیرے سادہ کلام میں چندن   حالِ دل بھی ہے شاعری بھی

چندن نے جا بجا مختلف مذاہب کے بزرگوں کا احترام کیا ہے وہ مسجد، مندر، گردوارے سب کی عزت کرتے ہیں

الغرض چندن کے کلام میں حسن بیان، شستگی زبان، وسیع النظری۔ بے تعصبی۔ تصوف کی چاشنی اور واردات قلب کا اظہار سب کچھ ملے گا۔

آخر میں یہ بھی عرض کردوں کہ چندن بھی ایک انسان ہیں اور پُرگو شاعر اس لئے ماہرین فن کو جگہ جگہ کچھ نقص بھی نظر آئیں گے لیکن بڑے سے بڑے شعراء کے یہاں بھی نقص ملتے ہیں۔ مرزا غالب کی ایک رباعی پر خلاف وزن ہونے کا اعتراض ہے شیکسپیئر جو انگریزی زبان کا سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے اس نے ایک ڈرامہ میں گھڑی کا ذکر کیا ہے حالاں کہ جس زمانے کا واقعہ لکھا گیا ہے اس وقت تک گھڑی کی ایجاد بھی نہیں ہوئی تھی۔ میر انیس پہ اردو زبان جس قدر ناز کرے کم ہے مگر ان پر اعتراضات کی کمی نہیں۔ حالی ہی میں ان کے ایک مشہور شعر پر اعتراض ہے -

کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

معترض نے لکھا ہے کہ اوس کھانا محاورہ نہیں ہے حالانکہ فارسی غزل کا مانا ہوا استاد ہے لیکن اس کے مندرجہ ذیل شعر پر معترضوں نے اعتراض کیا ہے کہ قافیہ غلط ہے۔

کار بجا دمن خراب کجا
بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

خواجہ آتش پر اعتراض ہے کہ انہوں نے حلوا کے بجائے جلوہ نظم کیا۔ مصرعہ کوئی نہیں چھوڑتا جلوہ بیدرد کو اس معاملے میں امیر خسروؒ کی رائے قول فیصل کی حیثیت رکھتی ہے۔

نظم کس از عیب و ہنر پاک نیست
آب روا ں بے خس و خاشاک نیست

(معنی) کسی کی نظم عیب و ہنر سے پاک نہیں ہے۔ بہتا ہوا پانی خیر بھو سے اور تنکے کے نہیں ہوتا۔

دیکھئے علامہ اقبال کا مشہور مطلع ہے

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

مطلع میں ستاں۔ او ستاں قافیے میں ہے مگر باقی اشعار میں جہاں اور نہاں وغیرہ قوافی ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ چند غلطیوں کو نظر انداز کر کے کلام کو مجموعی حیثیت سے دیکھنا چاہیئے۔ ایک عیب کے باعث سیکڑوں محاسن کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔

پنڈت ن ایک خاموش خادم زبانِ اردو ہیں۔ جا بجا اردو کے لئے ترقی کی دعائیں کی ہیں۔ اردو کو ایسے ادب دوست حضرات کی سخت ضرورت ہے۔ ●●

غزل

میکش اجمیری (نیم ہیڑا)

غبارِ کارواں گر غازیٔ احرام ہو جائے
تو منزل سر بہ سجدہ خود ہی ہر ہر گام ہو جائے

نہیں منظور ہم کو وہ بہاریں جن کے بدلے میں
چمن بے آبرو ہو ہر کلی نیلام ہو جائے

نمائش آنسوؤں کی اس لئے میں نے لگائی ہے
زمانہ آشنائے گردشِ ایام ہو جائے

مری خاموشیوں پر مصلحت کا سخت پہرا ہے
زباں کو کھول دوں تو بزم میں کہرام ہو جائے

ہے شہرت ہی کی خواہش تو وہ شہرت پا کے دکھلا دے
کہ تیرے نام ہی سے شہر بھر کا نام ہو جائے

سہانا خواب ہے جس کا کہ سچ ہونا نہیں ممکن
کہ میرے دور کا ہر ایک بھیا رام ہو جائے

ابھی تو دوپہر کی دھوپ کا رخ بھی نہیں دیکھا
ابھی سے دوستو کیوں چاہتے ہو شام ہو جائے

نکھرتی چاندنی بھی دھوپ کی شدت لئے آئی
چلو یہ آج کی شب میکدے کے نام ہو جائے

کتابِ زندگی پہ تم جو اپنے دستخط کر دو
میرے افسانۂ دل کا محبت نام ہو جائے

فریبِ اعتمادی کا ہنر گر ہو تو ایسا ہو
ستم ہوں دوستوں کے دشمنوں کا نام ہو جائے

طلب ہر ایک میکش کی بجھانے کے لئے ساقی
اگر خالی ہو کوئی تو مرا ہی جام ہو جائے

ڈاکٹر اودے سرن ارمان
بلاری

بے غیرتی کی زندگی کوئی زندگی ہے

ریوتی یوں تو ایک غریب کسان کی بیوی تھی جسے ضروریاتِ زندگی بھی بہ مشکل میسر آتی تھیں مگر قدرت نے اسے اس قدر صابر اور شاکر دل عطا کیا تھا کہ اس نے کبھی بھولے سے بھی اپنی ناداری یا غربت کا شکوہ نہیں کیا نہ کسی سے حسد کیسے کیا جاتا ہے شاید اسے یہ معلوم بھی نہ تھا۔ وہ ہر کسی کی خوشی کو اپنی ہی خوشی سمجھتی تھی اور ہر کسی کے دُکھ کو اپنا دکھ سمجھتی تھی مگر پچپنس کو پار کر جانے پر بھی اس کی گود ہری نہ ہوئی تھی۔ ریوتی جب کسی عورت کی گود میں بچہ دیکھتی تو دل ہی دل میں بھگوان سے مخلصانہ انداز میں اپنی اس محرومی کا شکوہ یوں کرتی کہ مجھے بھی بچے کا منہ دکھا دو بھگوان۔

کہتے ہیں کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے اور ویسے بھی صابر و شاکر خدا پسند کرتا ہے لہٰذا ریوتی کے من کی مراد بر آئی اور اس کی گود بھی ہری ہوگئی موہن کے پیدا ہوتے ہی ریوتی خاندان کے چراغ کو جنم دینے والی ایک بھاگوان عورت سمجھی جانے لگی سب عزیز و اقارب اس سے ہمدردی اور محبت کا سلوک کرنے لگے۔

ریوتی اپنے لاڈلے موہن کو ابھی پاؤں پاؤں چلنا ہی سکھا رہی تھی کہ اس کے شوہر موہن کا آناً فاناً انتقال ہوگیا۔ ریوتی کے ماں باپ مدت ہوئی راہیٔ ملکِ عدم ہو چکے تھے۔ ساس سسر پہلے ہی نہیں تھے۔ تھوڑی سی کھیتی باڑی کے علاوہ اس کا کوئی دوسرا سہارا نہیں رہا تھا۔

ریوتی نے قدرت کی اس ستم ظریفی پر بھی اپنے ہوش و حواس قائم رکھے اور محنت و مشقت کر کے اپنے اچھے کردار اور شرافت کے بل بوتے پر اپنی زندگی کے دن اس انداز سے گزارے کہ سماج کو اس کی کسی حرکت پر انگشت نمائی کا موقع نہ مل سکا۔ موہن اب گیارہ سال کا ہوگیا تھا اور اب وہ چھٹی کلاس میں زیر تعلیم تھا۔ ریوتی اپنے بیٹے پر برابر نظر رکھتی تھی وہ اسے اِدھر اُدھر بغیر ضرورت نہیں جانے دیتی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ رانڈ کا پوت اور رنڈوے کی لڑکی بگڑ جاتے ہیں۔

ایک دن موہن حسبِ معمول بازار سودا سلف خریدنے گیا تو مناسب وقت میں واپس نہیں آیا ریوتی کچھ دیر تو انتظار کرتی رہی مگر جوں جوں موہن کے آنے میں دیر ہو رہی تھی اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی اور وہ دل میں کئی قسم کے وسوسے لیے ہوئے گھر سے باہر نکل کر گھر کے سامنے تیز قدموں سے اِدھر اُدھر بے قراری کے ساتھ ٹہلنے لگی۔ ریوتی دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ ذرا موہن آجائے تو اسے اس قدر دیر لگا کر آنے کی ایسی سزا دوں گی کہ پھر وہ ایسی لاپرواہی نہ کر سکے۔ ابھی وہ شک و شبہ اور اندیشوں کے عالم میں بھٹکتی ہوئی اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ٹہلے جا رہی تھی کہ اسے موہن آتا ہوا دکھائی دیا اور اس کا تمام غم و غصہ جاتا رہا مگر وہ بے ساختہ

کر چکی تھی کہ موہن کو دیر سے آنے کی سخت سزا دیجائے ورنہ اسے ہر روز دیر سے آنے کی عادت پڑ جائے گی۔ چنانچہ وہ جلدی سے گھر کے آنگن سے ایک چھڑی اٹھالائی۔ موہن ماں کے قریب آیا اور اس نے ماں کی آنکھوں میں غصے کی جھلک اور ہاتھ میں چھڑی دیکھی تو فوراً دس روپے کا نوٹ ماں کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"ماں، یہ نوٹ مجھے تاؤ سیٹھ نے دیا ہے"

یہ سنتے ہی ریوتی حیران سی رہ گئی اور یکایک اس کے دل و دماغ میں کئی خیالات گھومنے لگے کہ انہوں نے دس روپے کس لئے موہن کو دئے۔

ریوتی نے چھڑی آنگن میں پھینکتے ہوئے انتہائی بے صبری سے کہا "موہن تم نے ان سے دس روپے کیوں لئے اور انہوں نے کیوں دئے؟"

موہن نے نہایت سادگی اور سچائی سے بتایا کہ میں بازار سے واپس آرہا تھا کہ تاؤ سیٹھ نے مجھے دیکھ کر اپنی چھڑی زمین پر زور سے پٹکی۔ میں اس آواز سے چونک کر ادھر دیکھنے لگا تو تاؤ سیٹھ نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلایا۔ میں ان کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہ بیمار تھے اور زور سے بول بھی نہیں سکتے تھے۔ میں نے پرنام کر کے کام پوچھا تو کہنے لگے بیٹے۔ تل ... پانی کی صراحی کڑوا دہ ہے اور میں بہت دیر سے پیاسا ہوں۔ سامنے صحن میں نل سے تازہ پانی لاکر پلا دے، بھگوان تمہارا بھلا کریں گے۔ میں نے فوراً پانی لاکر پلایا تو انہوں نے جی بھر کر پانی پیا۔ نہ معلوم کب کے پیاسے تھے۔ پانی پی کر سیکڑوں دعائیں دیں۔ ماں میں نے ان سے بڑے پیار سے پوچھا تاؤ سیٹھ جی آپ کے بہو اور بیٹے کیا اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ آپ کی دیکھ بھال اچھی طرح سے کریں۔ اس پر وہ کہنے لگے بیٹا وہ دونوں مر گئے۔ ماں میں نے کل شام کو ہی انہیں بچھر ہال سے نکلتے دیکھا تھا آج وہ کیسے مر گئے؟

بیٹا وہ دونوں زندہ ہیں تو اس کا مطلب نہیں سمجھ... ہاں بیٹے پھر تو نے کیا کیا؟

پھر میں نے ان کا بستر جھاڑ کر ٹھیک طرح ... بچھایا۔ آس پاس پڑے گندے برتنوں کو صاف کر... اور لوٹا پانی کا بھر کر ان کی چارپائی کے پاس رکھ دیا... یہ سن کر ماں نے موہن کو چپٹا لیا۔ موہن ماں کو خوش... دیکھ کر ذرا نڈر ہو کر بولا۔ پھر تاؤ نے سگریٹ ماچ... منگائی اور جب میں چلنے لگا تو تاؤ سیٹھ نے تکیے... نیچے سے دس روپے کا نوٹ نکال کر مجھے دیتے ہو... کہا۔ لو یہ تمہاری برخورداری اور بزرگوں کی سیو... کا انعام ہے۔ میرے ہزار منع کرنے پر بھی انہو... نے یہ نوٹ میری جیب میں ٹھونس دیا اور کہا کہ ... انعام ہے اور انعام واپس نہیں کیا کرتے۔

ریوتی نے موہن کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا کہ بڑے بوڑھوں کی خدمت کرنا بہت اچھی بات ہے لیکن خدمت کو فروخت کرنا اچھی بات نہیں ہے لہذا صبح جاکر یہ نوٹ انہیں واپس کر دینا۔ جب آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے تب انعام لوں گا اور ہر روز آپ کی سیوا کیا کروں گا۔ موہن نے بھ... لاشعوری طور پر سوال کیا۔ ماں جی ان کے بہو بیٹے کیا ان کو پانی بھی نہیں پلا سکتے؟ یہ تو بڑی بری بات ہے۔ ریوتی نے موہن کو سمجھایا کہ تاؤ سیٹھ کا بیٹا اپنی بیوی کے اشاروں پہ چلتا ہے کیونکہ وہ ایک کالج میں پڑھاتی ہے اور ہزار بارہ سو روپے مہینے کما کر لاتی ہے۔ میاں جی خود بے روزگار ہیں ... بہو چاہتی ہے کہ بوڑھا جلدی مر کھپ جائے تو سارا جائیداد کے مالک بن جائیں۔ بتاؤ ایسی حالت میں کون کس کی خدمت کرے گا۔ یہ سن کر موہن نے کو... تاؤ سیٹھ کے تئیں ہمدردی کا جذبہ اور بھی بڑھ... اور وہ روزانہ ان کے ہاں جاکر تاؤ سیٹھ کی خدمت کرنے لگا۔ تاؤ سیٹھ کی صحت دن دن گرتی جارہی تھی۔ ایک روز انہوں نے زندگی سے ناامید ہو کر ریوا...

کو بلایا۔ ریوتی موہن کے ساتھ تاؤ سیٹھ کے پاس گئی تو اس نے تاؤ سیٹھ کے کمرے سے آرہی آوازوں کو سننے کے لئے وہ موہن کو لئے ایک طرف دروازے کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

کوئی کہہ رہا تھا۔ تاؤ سیٹھ آپ اپنی تمام جائیداد ریوتی کے لڑکے موہن کے نام کرکے سخت غلطی کر رہے ہیں۔ تمہارے بعد سب لوگ تمہیں برا کہیں گے۔ ہر شخص اپنی اولاد کے لئے جائیداد وغیرہ چھوڑ جاتا ہے اور ایک آپ ہیں کہ اس کے الٹ کر رہے ہیں۔ تاؤ سیٹھ کہہ رہے تھے وکیل صاحب۔ بے شک سب کچھ اولاد کے لئے کیا جاتا ہے یہ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں مگر اس کے ساتھ اولاد کا بھی تو یہ فرض ہے کہ وہ اپنے بوڑھے ماں باپ کا خیال رکھیں۔ میں بھوکا پیاسا تڑپتا رہتا ہوں ان دونوں میں سے کوئی بھی میری خبر تک نہیں لیتا۔ میرے ذاتی نوکر کو بھی یہ کہہ کر جواب دے دیا گیا کہ ہمارے پتاجی کی سیوا نوکر نہیں ہم خود کریں گے اور آج جب کہ میرا دم نکل رہا ہے تو وہ دونوں آگرے سیر کو گئے ہوئے ہیں۔ ایسی نالائق اولاد کے لئے اپنے خون پسینے کی کمائی گلچھرے اڑانے کے لئے دے جاؤں یہ کبھی نہ ہوگا۔ یہ جو میرا بیٹا ہی کہتا ہے کہ ہمارے ماں باپ نے ہمیں پال پوس کر بڑا کیا تو کون سا احسان کیا ہے ہر ماں باپ اپنے بچوں کو پال پوس کر بڑا کیا ہی کرتے ہیں۔ وکیل صاحب ماں باپ کے ذمہ فرض ہی فرض ہے ان کا کوئی حق نہیں ہے۔ ریوتی نے اپنے لڑکے موہن کو میری بیماری کے دوران ہر روز میری خدمت کے لئے بھجوایا۔ موہن نے میرے بیٹے سے بڑھ چڑھ کر میری خدمت کی ہے اس لئے میں اپنی ساری جائیداد موہن کے نام کرتا ہوں تاکہ نئی تہذیب اور نئے قدروں کے شیدائی کو یہ سبق دے سکوں کہ جو بچے ماں باپ کی آخر عمر میں ان کی خدمت سے کتراتے ہیں انہیں حق وراثت سے محروم کر دینا چاہئے۔

وکیل نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ تاؤ سیٹھ دل دکھتا ہے تو سب کچھ کہا جاتا ہے مگر کسی نالائق کی بے وقوفی کا جواب اسی انداز میں دے کر آپ ایسے قابل شخص کو اپنی قابلیت کو داغدار نہیں کرنا چاہئے۔ اس پر تاؤ سیٹھ نے ناخوشگوار سے انداز میں کہا۔ وکیل صاحب میں نے آپ کو وصیت لکھوانے کے لئے بلایا ہے نصیحت کرنے کے لئے نہیں۔ اگر آپ میری مرضی کے مطابق وصیت نہیں لکھ سکتے تو جائیے میں کسی دوسرے وکیل کو بلوا لوں گا۔

باہر کھڑی ریوتی نے یہ سنتے ہی دروازے پہ دستک دی۔ وکیل صاحب نے دروازے کے پٹ کھولے تو ریوتی نے اندر داخل ہو کر پلو سے تاؤ سیٹھ کے چرن سپرش کئے۔ تاؤ سیٹھ نے آشیش دیتے ہوئے پوچھا تم کون ہو۔ تاؤ سیٹھ جی میں موہن کی ماں ہوں۔ فرمائیے کیا حکم ہے۔ تاؤ سیٹھ نے مزید دعائیں دیتے ہوئے کہا کہ تیرے بیٹے موہن نے جو میری سیوا میرے مشکل وقت میں کی ہے اس کا اجر تو اسے ایشور دے گا مگر میں اس کی برخورداری اور خدمت گزاری سے خوش ہو کر اپنی تمام جائیداد اس کے نام کر رہا ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ میرے سگے بیٹے اور بہو کے ہاتھوں میری سب جائیداد تباہ ہو جائے گی اور موہن میری یادگار قائم رکھے گا۔

ریوتی نے تاؤ سیٹھ کا دلی شکریہ ادا کرتے ہوئے نہایت ادب سے کہا۔ تاؤ سیٹھ جی نادان ہیں وہ نادان ہے۔ آپ اپنے غصہ کو ترک فرما دیں اور یہ سب کچھ اپنے بہو اور بیٹے کو دے دیں۔ ان کے ہوتے میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ اگر آپ نے ایسا کر دیا تو یہ سمجھئے کہ آپ نے میرے بیٹے کے ساتھ دشمنی کی ہے کیونکہ ایسا ہو جانے سے آپ کا بیٹا اور بہو میرے

ہو بہن کے جانی دشمن ہو جائیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ سماج بھی مجھ سے نفرت کرنے لگے گا اور یہ سمجھنے بیٹھ جائے گا کہ میرے اور آپ کے کوئی ناجائز تعلقات تھے جن کے باعث آپ نے ایسا کیا۔ میں غریب ضرور ہوں مگر عزت دار ہوں۔ ایسی دولت اور جائیداد جس کے ساتھ نفرت، دشمنی، بے عزتی اور بدنامی جڑی ہوئی ہو میں قبول نہیں کروں گی تاؤ سیٹھ ایمان کا جیون جیون نہیں ہوتا۔

یہ سن کر تاؤ سیٹھ گاؤ تکیے پر جھک گئے، آنکھیں بند تھیں وکیل منتظر تھا کہ تاؤ سیٹھ کچھ فرمائیں مگر تاؤ سیٹھ کی آنکھیں ہی کھلیں اور نہ ہی زبان۔

●●

غزل

احمد حسین شمسؔ۔ کشن گنج بہار

یہ کون ناگن ہواؤں میں زہر اگل رہی ہے
کہ میری رگ رگ میں آگ کی لہر ابل رہی ہے

زمانہ کیوں آرہا ہے جلنے پہ کبھی چہرہ کے
مکان کی چھت تو خود اپنے اندر سے جل رہی ہے

ہوا نہ پھر بھی کو رفتہ رفتہ سحر بھی آئے
مرے ہیولیٰ کو ظلمتِ شب نگل رہی ہے

کوئی ادھاگا ادھر سے بھاگا نہ جا رہا ہو
گلی گلی میں ہوا بڑی تیز چل رہی ہے

اب اک جزیرے میں بھاگ آیا ہوں بچ بچا کر
کہ اپنے خود کی شناخت دنیا کو کھل رہی ہے

ندی کنارے چتا کے سامان ٹھیک کر لیں
اب آخری سانس بھی ہوس کی نکل رہی ہے

پہنچ بھی سکتے ہیں شمسؔ کیا شام ہوتے ہوتے
مکان ادھر کو سرک رہا ادھر دھوپ ڈھل رہی ہے

ہندی کے مسلمان شعراء

یہ کتاب ہندی اردو کی تحقیق مسلمان بھائیوں کا ہندی سے تعلق اور خدمت مسلمان شعراء ہند کے سوانح حیات مع تصاویر سے مزین ہے جس پر ویسٹ بنگال اردو اکاڈمی نے مصنف کو دو ہزار روپے اور بہار اردو اکاڈمی پٹنہ نے ۳ ہزار روپے نیز اردو اکاڈمی نے ایسی معیاری اور قابل قدر کتاب کی اشاعت پر ماہنامہ شان ہند کو دو ہزار روپے انعام دیا گیا ہے یہ ایک نادر الوجود اور بے نظیر کتاب ہے جس کا بدل موجود نہیں ہے۔ محققین کالجوں اور یونیورسٹیوں کی لائبریریوں نیز ادبی اداروں کے لئے مفید ترین تحفہ ہے۔ قیمت ۱۵ روپے اور ڈی لکس ایڈیشن ساٹھ روپے۔ اب صرف ڈی لکس ایڈیشن ہی کی چند جلدیں باقی ہیں۔

دفتر شان ہند فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ
دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ضروری گذارش

کیا آپ اپنی کتاب چھپوانا چاہتے ہیں

یا

فروخت کی ایجنسی دینا چاہتے ہیں

● تو فوری طور پر ہم سے رجوع کریں۔ کتاب کا معیاری ہونا شرط ہے ● کتاب چھپوانے یا فروخت کرنے میں ہم مدد کر سکتے ہیں ● اگر آپ کو کسی اردو اکاڈمی یا دیگر ادارے سے جزوی مالی امداد ملتی ہے تو اشاعت کے لئے ہمیں لکھئے ● معلومات اور شرائط کے لئے جوابی لفافہ کے ساتھ ذیل کے پتے پر خط لکھئے۔

سرور تونسوی ایڈیٹر شان ہند فلیٹ نمبر ۸
انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

طنزیہ

پوسٹ مارٹم

رام لعل نابھوی

غالب ایوارڈ برائے طنز و مزاح اس سال مجتبیٰ حسین کو ملا۔ ایڈیٹر "شان ہند" نے لکھا کہ حق فکر تونسوی کا تھا۔ ان پر الزام فرقہ پرستی کا لگا دیا گیا۔ آیئے ذرا دیکھیں کہ "ہونا تھا کیا۔ کیا ہو گیا ہے"

"اردو پنچ" راولپنڈی (پاکستان) کا واحد طنز و مزاح کا پرچہ ہے۔ فی شمارہ قیمت ۲۰ روپے سے تیس روپے تک ہوتی ہے۔ مدیران سید ضمیر جعفری۔ کرنل محمد خاں۔ ڈاکٹر صفدر محمود اور ملک سلطان کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اعلیٰ پایہ کی تخلیقات نظم و نثر چھپتی ہیں۔ اب تک ۶ شمارے منظر عام پر آ چکے ہیں۔

شمارہ ۲ میں ایک مضمون بعنوان "تعارف" چھپا ہے۔ اسے ممتاز مزاح نگار شفیق الرحمان نے لکھا۔ ڈیمائی سائز کے ۱۹ صفحات پر مشتمل ہے پہلے نمبر پر چھپا ہے۔ یہ تعارف "فکر تونسوی" کا ہے "شنیدہ کے بود مانند دیدہ"۔ بات آ گئی پہلے فکر کا ذکر پہلی بار تھوڑے ہی ہوا تھا۔

ہوا یوں بھی کہ شمارہ ۳ میں ایک خط ڈاکٹر خورشید خضر کا شکاگو سے چھپا۔ لکھا تھا۔ "آپ یقیناً مزاح نگاروں کے متلاشی ہوں گے ایک صاحب ہیں مجتبیٰ حسین ان کو پکڑیئے۔ انڈیا کے ادبی حلقوں میں کسی طرح مشہور ہیں۔ ان کے تعارف کے لئے اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ مرحوم ابراہیم جلیس کے بھائی ہیں" دیکھا آپ نے "تعارف" یہاں بھی چھپا۔ ہمارا خیال تھا کہ

یہ مدیران تو پاتال سے طنز و مزاح نگار پکڑ کر نکال لاتے ہیں۔ لندن۔ واشنگٹن۔ کینیڈا۔ عرب ممالک وغیرہ سے خطوط چھپ رہے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انہیں ملک ہندوستان کے "اکلوتے" مزاح نگار کا علم ہی نہ ہو۔ اور پھر اس صورت میں جب کہ وہ ابراہیم جلیس کے بھائی ہوں۔ ایک خیال یہ بھی کوندا کہ شاید چاروں مدیران نے ہندوستان کی چاروں سمتوں کی طرف پرواز کیا ہو کہ مجتبیٰ حسین کو پکڑ لائیں۔ اندازہ یہ بھی ہوا کہ مدیران نے ہندوستان میں اپنے دوستوں کو خطوط لکھے ہوں گے کہ وہ مجتبیٰ حسین کو پکڑ لیں جانے نہ پائے۔ اسی الجھن میں الجھے ہماری نظر خط کے نیچے ایک مہین لائن پر پڑ گئی۔ لکھا تھا۔ "مجتبیٰ حسین کا پتہ تو لکھ دیا ہوتا۔ حضرت مدیر کیا ہوا۔ مدیران خاموش۔ شمارے چپ۔ خورشید خضر کی زبان بند۔ ہم نے دوستوں سے پوچھا کسی نے جواب تک نہ دیا۔ شمارے آئے۔ نہ خورشید خضر دکھائی دئے۔ نہ مجتبیٰ حسین۔ نہ ان کی تعریف نہ تحریر۔ نہ تصویر۔ قصہ یوں ختم ہوا کہ مجتبیٰ حسین اپنے خول میں سکڑ کر دبکے اور تھر وہیں ہیں۔

حضرت! تصویر کے دونوں رخ آپ کے سامنے ہیں۔ فیصلہ فرمائیں۔ جوش ملیح آبادی کا یہ شعر نہ بھولئے گا۔

"ادب ادب ہے ادب کا نہیں کوئی مذہب
خدا کے فضل سے یہ کفر ہے نہ یہ اسلام"

کے ہاتھوں دنیائے طنز و مزاح کا ایک اور کرشمہ دیکھئے۔ ہندوستان سے "شگوفہ" طنز و مزاح کا واحد پرچہ حیدرآباد سے نکلتا ہے۔ اسی ہندوستان میں ایک طنز و مزاح نگار کنھیالال کپور رہتے تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ طنز و مزاح کے قطب مینار تھے۔ "نقوش" لاہور نے تو انہیں اپنے ایک بازو سے قطب مینار کو دبائے ہوئے دکھا دیا ہے۔ ہماری نظر سے "شگوفہ" کے دو خاص نمبر بھارت چند کھنہ نمبر اور "نریندر لوتھر نمبر" گزرے۔ پھر "تکلف برطرف" میں زندہ دلانِ حیدرآباد کے پہلے اجلاس ظرافت کی روداد پڑھی۔ اب کیا کہیں کہ کنھیالال کپور کا ذکر ہی نہیں تھا۔ نہ انہیں کسی نے یاد کیا اور نہ ان کی زندگی میں نمبر چھپا۔ "شگوفہ" کو کپور نمبر نکالنے سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے ہر سال جلسے ہوتے رہے۔ جلسے بھی زندہ تھے اور کپور صاحب بھی۔ لیکن بات وہی رہی جینی ہوں گے کوئی کپور صاحب۔ کپور صاحب انتقال فرما گئے تو "دل جلوں" نے "شگوفہ" کا کپور نمبر نکلوا کر ہی دم لیا۔ کپور صاحب کی اردو زبان میں دس تصنیفات ہیں۔ پاکستان میں یہ سب کتابیں پھر سے شائع ہوئی ہیں۔ نام کام سے ہوتا ہے دانشور تخلیق دیکھتے ہیں۔ پرچے عمدہ تحریروں پر ہی قائم رہ سکے ہیں۔ میں ہندوستان کے ایک طنز و مزاح نگار کا نام بتا سکتا ہوں جس کی تخلیقات نظم و نثر ان ۱۲ شماروں میں سے ۵ شماروں میں نمایاں طور پر شائع ہوئی ہیں۔ کنھیالال کپور صاحب نے پورا مضمون اس پر "تجارت" کراچی میں شائع کیا۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ بڑے بڑے مشاعروں میں ایک مزاحیہ شاعر پورے مشاعرے کو لوٹ کر چلا جاتا تھا اور شائقین انہیں تلاش کرتے رہتے تھے۔ پھر دیکھا تو نہیں سنا ہے کہ ہر سال ہر بڑے شہر میں جشنِ ظرافت ہونے لگے اور پھر ایسے دو مشاعروں اور جلسوں کی رودادیں بھی پڑھنے کو ملیں کہ مزاح نگار ہوٹ بھی ہوئے اور شوٹ بھی۔ ایک ایسی محفل چنڈی گڑھ میں سرکاری سطح پر ہوئی اور وہ ہوٹنگ ہوئی کہ چنڈی گڑھ اس صدمہ کی آج تک تاب نہیں لایا اور پھر کسی مزاح نگار نے ادھر کا رُخ نہیں کیا۔ دوسری محفل اردو اکادمی دہلی کے اہتمام دہلی میں ہوئی۔ صدر جمہوریہ ہند خوش ہونے کے لئے آئے تھے۔ بیچ میں ہی اٹھ کر ناخوش چلے گئے۔ یار دلوں نے جو ہوٹنگ اور شوٹنگ کی کہ سامعین الاماں الحذر۔ الحفیظ پکار اٹھے۔ ہم نے وہ نظارہ نہیں دیکھا اور ہم تلاش میں ایسے شخص کی ہیں جس نے ہوٹنگ دیکھی ہو اور شوٹنگ میں حصہ لیا ہو لیکن بات وہی ہے "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" سنا ہے دلّی کا دل جب سے بہت خراب ہے اور طنز و مزاح نگار اب ادھر بھی پھٹکتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ہر روز بے عزت ہو کر جانا کون چاہے گا۔

دوستو آج پوری دُنیا کا ادب اور ادیب گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ صرف ایک کام ان کے سامنے ہے وہ ہے اپنا نام اچھالنا اور موقعہ ہاتھ آئے تو دوسروں کی پگڑی اچھالنا۔ ان حالات میں اکیلے دکیلے کا اللہ بیلی۔ اللہ ہی کیا کرے وہ خود اکیلا ہے وہ ہر جاندار کو اکیلا اس دنیا میں بھیجتا ہے لیکن کبھی کبھار ورائٹی کے طور پر دو دو تین تین، چار چار بھی بہ یک وقت بھیج دیتا ہے شاید یہ گروہ بازی انہیں کی پیداوار ہے بہرحال وہ ملک کے لئے مصیبت ہوتے ہیں اور یہ مادرِ وطن کیلئے۔

پہلے پوری دُنیا میں طنز و مزاح نگار انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے اب انگلیوں پر ان کو گنا جا سکتا ہے جو طنز و مزاح نہیں لکھتے۔

"تو بھی بدل فلک کہ زمانہ بدل گیا" ●●

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
بیرو باڑی گوہاٹی

شعرِ حیرت پہ نظر خوش گزرے

دہلی ہی نہیں بلکہ پورے ملک کے اُردو شعرا
میں براج حیرت کا مقام و مرتبہ خاصا بلند و رفیع ہے۔
ملتہ رسی، مخصوص تیور، پختہ کلامی خصوصیات کا آئینہ دار
ان کے کلام کا پہلا انتخاب از بر جس کی ترتیب و تہذیب
جناب رام پرکاش راہی کی جمالیاتی سعی کی مرہونِ
منت ہے۔ اترپردیش کے مالی اشتراک سے ۱۹۸۳ء
میں شائع ہوا۔ یہ مجموعۂ کلام جو غزلیات و منظومات
پر مشتمل ہے معمولی تخلیقی کارنامہ نہیں ہے۔ اس کی
ہر جہتی اہمیت بھی ہے اور دلکش انفرادیت بھی ہے
آج کل مجموعہ ہائے کلام بالعموم طول و طویل مقدمات
سے شروع ہوتے ہیں جن کی توصیفی لے بے وقت کی
راگنی سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ تعارف جو شعرا اور
ادبی حیثیت کے خواہاں پیش لفظ نگار حضرات یہ کیوں
بھولتے ہیں کہ صحت مند ادبی ذوق رکھنے والے کلام
کو دیکھتے ہیں۔ حیرت نے "بیان اپنا" کے تحت اس
سبب کی واشگاف طور پر نشان دہی کی ہے کہ ازبر
خدمت میں حاضر ہے اس کے آغاز میں کسی دوسرے ادیب
کا دیباچہ یا مقدمہ مجھے اس لیے گوارا نہ ہوا کہ ایسی
تحریریں بالعموم گمراہ کن حد تک تعریفی و یک رُخی
ہوتی ہیں اور ایسی ایسی باتیں شاعر سے منسوب
کردی جاتی ہیں جن کا سایہ بھی اس غریب پر نہ پڑا ہو"
حیرت کی یہ رائے درخود اعتنا ہے۔ شاعر و سامع
یا شاعر و قاری کو ایک سطح پر لانے کی صلاحیت و
توانائی کلام ہی میں مضمر ہوتی ہے۔

مقابلہ ہے زبردست لایعنی سے
میں اپنا جام اٹھاؤں تو اپنا ساز اٹھا

جام کو جلوہ جلوہ کرنے والا بادۂ کلام اگر
سازِ دل کو نہ چھیڑ سکے تو فروغِ بادہ اور نغمہ سنجی
دونوں معرضِ وجود میں نہیں آسکتے۔

حیرت کا کلام کسی تعارف کا محتاج نہیں
ہے کیوں کہ وہ "از دل خیزد بر دل ریزد" میں مضمر جملہ
مفاہیم پر محیط ہے۔ مجموعۂ کلام کا نام ہی توجہ طلب
ہے۔ ازبر کے معروف معنی ہیں حفظ، نوکِ زبان، زبانی
یاد وغیرہ۔ بالاستیعاب نظر لفظ بر جس کے معنی
"بلند غالب ثمر سینہ" ہیں پر بھی مرتکز ہو جاتی
ہے لہٰذا اس معنوی سیاق و سباق میں ازبر سے
مراد "از دل" بھی ہو سکتی ہے میں مجموعہ کلام کو اسی
معنوں میں لیتا ہوں کیوں کہ اس میں پیش کردہ
خیالات و محسوسات جو صدق و خلوصِ دل پر استوار
ہوئے ہیں دل، سامع و قاری پر جمالیاتی توانائی
سے مرتب ہو جاتے ہیں۔

شعرِ حیرت متعدد خصوصیات کا حامل ہوتا ہے
محسوسات و جذبات جو تہ در تہ فکریات سے عبارت
نہ ہوں اچھے اشعار میں متصور نہیں ہو سکتے۔ جذبات
کی فراوانی جگر تو پیدا کر سکتی ہے مگر یگانہ و
فراق ایسے شاعر پیدا نہیں کر سکتی۔ فکری و نظریاتی
نکات کو جذباتی و محسوساتی اظہار و ترسیل میں
کشید کیے بغیر اشعار فاعلاتن مفاعیلن وغیرہ
ارکان پر وضع ہونے کے باوجود عظمت و وقار کے
افق و شفقِ شعری سے کوسوں دور رہتے ہیں
سلسلہ در سلسلہ مرحلہ بہ مرحلہ منسلکات سے بھرپور
رو بہ نقطۂ عروج رواں دواں خیال کا جذبے میں

فنائی و رعنائی سے نظر ہو جاتا ہے کا یہ شعریت ہوتا ہے۔ بشری و سماجی مسائل کو جذبات و محسوسات ہی نہیں بلکہ ترغیبات و تشویشات وغیرہ کو جلو میں لئے شعری قلب و قالب سے متصف کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس سے صرف بڑا شاعر ہی عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ ذاتی حادثات و تجربات کا سماجیاتی پس منظر میں اتر جانا اور روحانی وجد و حال میں عروج پذیر ہونا ہی ہے شعر کی سرچشمگی مسرت و بصیرت سے آشنا کرتا ہے۔ اچھے شعر میں آپ بیتی جگ بیتی بن جاتی ہے۔ فرد پورے سماج کا نمائندہ ہو جاتا ہے۔ شاعر اور قاری یا سامع کے مابین کوئی دیوار نہیں رہتی۔ خود کلامی، لمحہ بہ لمحہ بدلتا ہوا ذہنی تناظر تشکک و تیقن، افہام و تفہیم دنیا و مافیہا سے متعلق تاثرات و تخیلات سماجی ماحول سے مرتب ہونے والے اثرات نیز ان سے زائدہ ردِ عمل وغیرہ کو بہ خلوص و اہتمام مناسب و معقول در و بست فراہم کرتا وغیرہ شعر کی ضمیر و خمیر میں جذب ہو جاتے ہیں فضائے شعر و سخن زمان و مکان پر محیط ہوتی ہے۔ از بر کو بالاستیعاب دیکھنے کے لئے متذکرہ مختصات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ ملحوظ رہے کہ حیرت کی شاعری کا تخاطب عوام سے بھی ہے اور خواص سے بھی اور اس میں کسی قسم کی ژولیدگی نہیں پائی جاتی ہے۔ افہام و تفہیم کو کسی دقت سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔ حیرت کی شاعری میں وہ شیشہ گری جو الفاظ کو مبہم علامات میں تبدیل کر کے سنگ باری کرنے لگے نہیں ملتی سیدھے سادے الفاظ میں گفتگو کرتی ہوئی یہ شاعری نقش ہائے رنگ برنگ سے خالی نہیں ہے۔ "چشم ما روشن دلِ ما شاد" کہتے ہوئے شاعر و سامع دونوں محوِ گفتگو ہو جاتے ہیں۔

ہزار منزلِ مقصود ایک ہو لیکن
ہماری راہ جدا ہے تمہاری راہ جدا

- قتال اور کا کچھ راہ خود نمائی کی
  بچا دلوں سے یہ پرہیز بھی بچاؤ ہے ایک
- تعلقات کو بنیادِ زندگی نہ بنا
  تعلقات بگڑتے سنورتے رہتے ہیں
- حیرت کہاں تھے دست بہ دا[illegible]
  بارش میں بھیگتا ہوا شو[illegible]
- پوچھ رہے ہو میرا حال
  جیسے تمہیں معلوم نہیں
- فقیہہ شہر ترے واسطے بچاؤ ہے ایک
  عمل ہی ذلتِ کردار سے بچاؤ ہے ایک
- اتنا لہولہان تو چہرہ کبھی نہ تھا
  پتھر سے بھی ہیں سخت تمہاری ہنسی کے پھول
- تم اپنے ہو زماں اپنا مکان و لامکاں اپ[illegible]
  یہ سب تسلیم لیکن دوستو ہم خود کہاں اب[illegible]

شاعر کو محوِ گفتگو دیکھنے کے بعد ملاحظہ [illegible] اس کی خود کلامی کا جو خود احتسابی سے لے کر تج[illegible] و پیش کا احاطہ کرتی نظر آتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

میں خود سے محوِ تکلم تھا بے حجابانہ
مجھے خبر نہ تھی دنیا بھی سن رہی ہوگی

حیات میں وہ مقام آرہا ہے اب کہ جہاں
نہ اعتقاد معاون نہ آگہی ہوگی

- یہ گھر بھی میرا ہے اس کی تمام چیزیں بھی
  ہر ایک گوشے میں لیکن یہ ناشناس سے لوگ
- مقام آہی گیا زندگی میں اب وہ جہاں
  نہ کوئی خاک بہ سر ہے نہ کوئی مہ بہ جبیں
- اپنی ہر خود سپردگی کی قسم
  میں جہاں تھا وہ میرا گھر تو نہ تھا
- میں نے کب چاہا مرادوں کا سفر ایسا نہ [illegible]
  بس مرے احساس کو جینے سے ڈر ایسا نہ [illegible]
- غالباً ہم سب کی تقدیریں ہیں باہم منسلک
  لیکن اس صورت میں کیا ہوگا اگر ایسا نہ [illegible]

آگے کا سفر تیری قیادت میں کریں گے
عقبیٰ سے پرے دیدۂ بینا نہیں جاتا

سست گامی کے بدلے صرف شبِ غم ہی ملی
گردشِ وقت بالآخر ترا منشا کیا ہے

منزلوں کے باب میں رستوں سے مت کر مشورے
منزلیں اپنے مسائل خود کیا کرتی ہیں حل

امید شام کے سورج سے کچھ نہ تھی لیکن
جب اس کو ڈوبتے دیکھا عجیب طرح سا لگا

نہ ہو کہیں معراجِ زندگی حیرت
جہاں پہونچ کے مجھے عیب بھی ہنر سا لگا

خود کلامی و خود احتسابی سے متعلق
...ت بطور نمونہ مشتے از خروارے ہی پیش کئے گئے ... حیرت کے کلام میں فلسفیانہ نیز نفسیاتی نکات ... کسی دقت کے بغیر مل سکتے ہیں۔ محض مبادہ فلسفہ ...ات و کائنات سے متعلقہ اعتقادات و نظریات ... نہیں کہتے۔ فرد و ملت، کائنات و ماورائے کائنات ... بالاستیعاب نیز مسلسل نظر ڈالتے ہے کو ...سفیانہ نظر کہا جا سکتا ہے۔ جام شعر میں فلسفے ... پری کو اتارنا معمولی بات نہیں ہے۔ اگر بیش ...رده فلسفیانہ نکتہ تغزل میں نہ ڈھلا تو وہ پند و ...نصیحت ہو کر بے کیف و بے سرور رہے گا۔ حیرت نے ...سفہ پڑھا ہی نہیں بلکہ برتا بھی ہے۔ درج ذیل ...ئیت کے اشعار ان کے ہاں بغیر تلاش ہی نظر ...تے ہیں سو

میں تو ازبر کر چکا حیرت کتابِ زندگی
زندگی کا ہر ورق بھی کیا مجھے پڑھتا گیا

لوگ سمجھے یا نہ سمجھے اس کا مطلب کیا خبر
اک عبارت پڑھنے والی تھی سو میں پڑھتا گیا

کیا کیا حسیں جواز تراشے ہیں زیست نے
کم بخت لیکن اب بھی سراپا سوال ہے

گذرا ہے دل کچھ ایسے مراحل سے بھی جنہیں
الفاظ کہہ گئے ...

• ترک و طلب کے ہنگاموں کو عشق سمجھنا وحشت ہے
عشق تحیرِ بے پایاں ہے عشق مجسم حیرت ہے
فکر نہیں ہے اس عنصر کا نام محبت ہے شاید
جس سے تہذیبیں بنتی ہیں جس سے زیست عبارت ہے

• منزلوں کے باب میں رستوں سے مت کر مشورے
منزلیں اپنے مسائل خود کیا کرتی ہیں حل

غرض کہ فلسفیانہ نکات کو سمو کر کہے گئے اشعار ہر صفحے پر نظر آتے ہیں۔ عشق تحیر بے پایاں ہی نہیں مجسم حیرت بھی ہے۔ محبت ہی وہ عنصر ہے جس سے زیست تو عبارت ہے ہی، تہذیب اور ثقافت بھی محبت ہی کی مرہونِ منت ہیں۔ گر یہ حیات یہ محبت "دل بہ یار دست بہ کار" پر استوار ہو کر ہی حیات و محبت ہوتی ہے عمل کئے بغیر مسائل حل نہیں کئے جا سکتے۔ حیرت کا فلسفۂ حیات و کائنات کے دائروں کو متعدد مقامات پر چھوتا ہے ان کا شاعرانہ نرم و نازک ہوتا ہے اور کسی پیش کردہ خیال کے مشکلات و ملزمات خود بخود بیدار کر دیتا ہے۔

حیرت کا کلام جذباتی توانائی منطقیاتی قبولیت اور اخلاقی جرأت وغیرہ سے متصف ہونے کی وجہ سے خاصی اہمیت و مقام رکھتا۔ مزید برآں کلاسیکی حسن و خوبی، بیدار آگہی، متوازن و متعدل محرکات کار، آگہیانہ اظہار و ترسیل، مسرت سے بصیرت تک پرواز کرتے ہوئے خیالات و تصورات خصوصیت کی دروبست سب کچھ ان کے یہاں ملتا ہے۔ وہ لفظوں سے نہیں کھیلتے اور نہ ہی لفظ کو معنی سے علیحدہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جدیدیت کا جھوٹا جوش و خروش جو اکثر و بیشتر ابہام سے ابہام تک ہی تگ و دو میں مصروف نظر آتا ہے ان کے یہاں کہیں نہیں ملتا۔

ابہام کے بھی ہم قائل ہیں ابہام اگر ابہام رہے
ابہام بھی خوبی ہے لیکن ابہام صفت ابہام نہ ہو

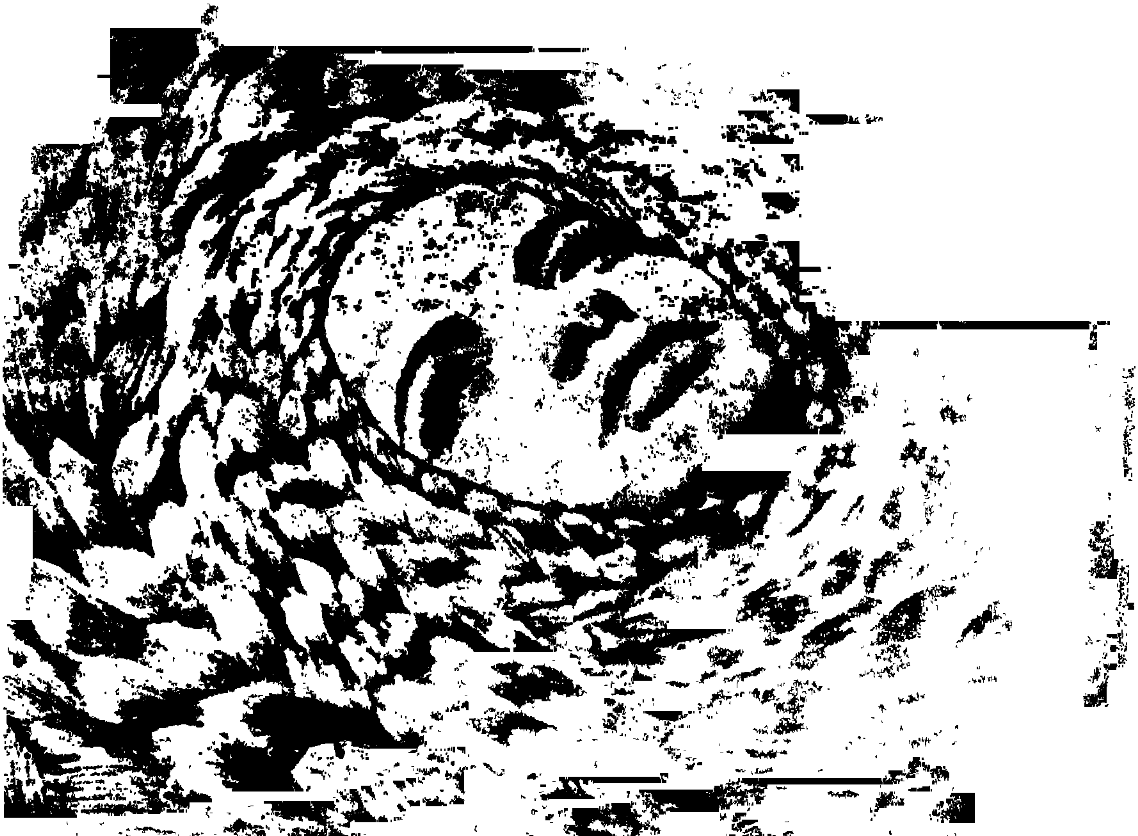
گرد و پیش، عصری تقاضے، اقدار کی شکست و ریخت، لمحہ لمحہ بدلتے حالات سے حیرت متحیر ہو کر دم بخود ہو کر دیوانہ وار دلندیزیت پر نہیں اترتے چیستانی انداز بیان سے اپنی فضائے شعریت کو آلودہ نہیں ہونے دیتے۔ حیرت کا کلام تعدد معنویت (PLURISIGNATION) سے معمور، اظہار و ترسیل کے صاف ستھرے ذرائع سے بھرپور، اور تہہ در تہہ خیالات و محرکات سے پر نور ہے اور رہے گا وہ ہنر شناس ہیں اور ایسے ہنر شناس جو تحسین ناشناس سے دور، بہت دور رہتے ہیں۔ از بر کو سرسری نظر سے دیکھئے یا بالاستیعاب آپ کو دلکش اشعار صفحہ صفحہ پر نظر آئیں گے۔ ہر شعر مزید توجہ کا تقاضا کرتا لے گا ؎

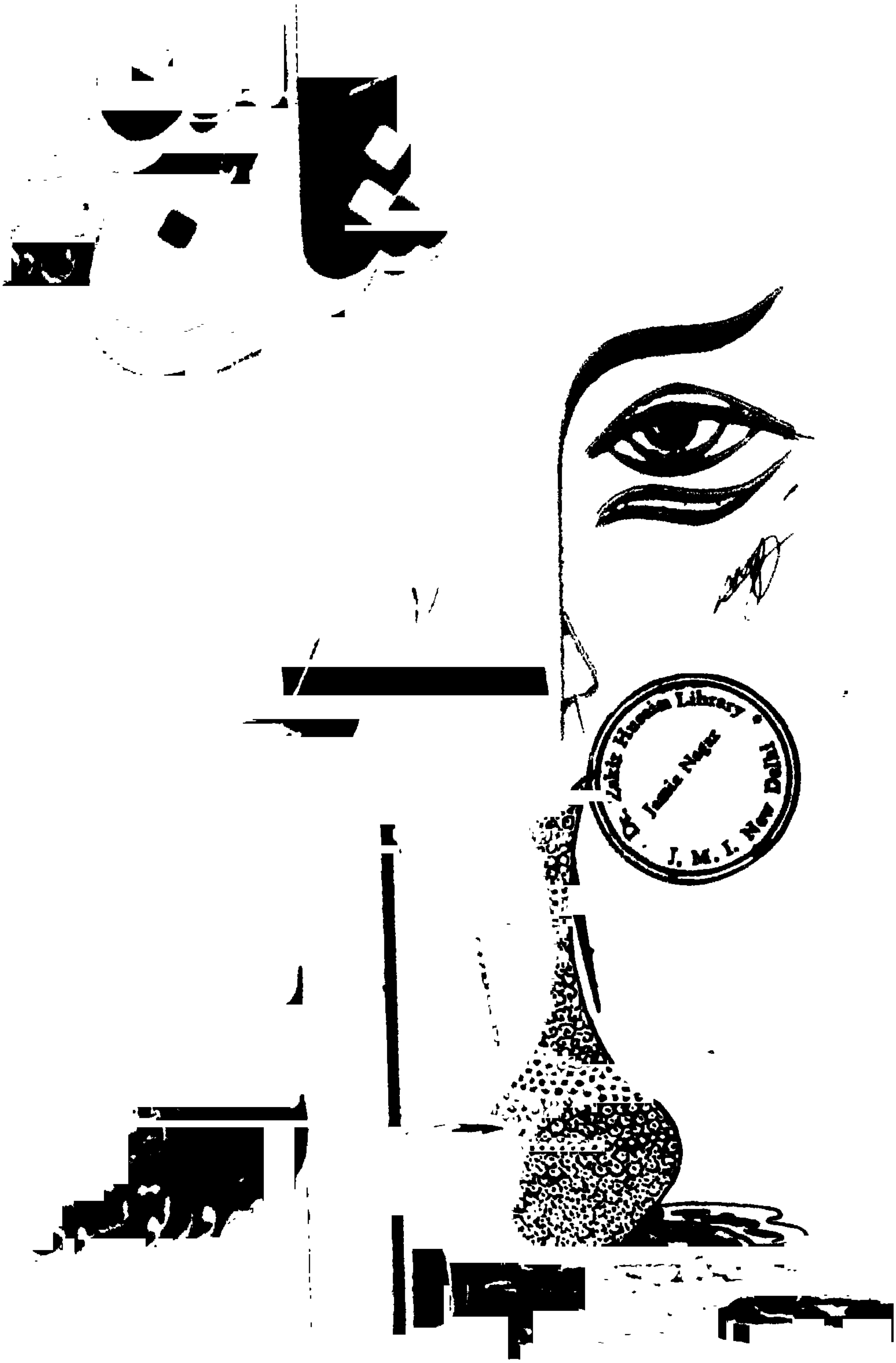
قدم بے باک تر نہ در حریم جانِ مشتاقاں
تو صاحب خانہ آخر چرا دزدانہ می آئی

یعنی قاری ہو یا سامع حیرت کے شعر شعر میں اپنے خیالات کی بازگشت سنے گا۔ ایوان کلام حیرت میں قاری خود کو بہ حیثیت صاحب خانہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ از بر میں جو کچھ ہے وہ "از دل" سے عبارت ہے لہٰذا اس میں "بر دل خیزد" کی صلاحیت بھی ہے۔

حیرت کے ہاں کلاسیکی رچ رچاؤ ہے۔ انداز بیان زمانہ حال سے ہم آہنگ ہے۔ ان کے ہاں وہ کھینچا تانی نہیں ملتی جو جدیدیت کے نا سمجھ علم برداروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ شعر حیرت معنی و مفہوم سے آنکھیں نہیں چراتا اور وہ الفاظ کی بھول بھلیوں میں نہیں پھنستے از بر تمام تر شعری خوبیوں کا آئینہ دار ہے۔ خیالات و جذبات کا دلکش عطر مجموعہ جس کی بھینی بھینی خوشبو دل و دماغ کو معطر کرتی ہے ان کے ہاں وہ گرمی ہے جو ان کے اپنے خیالات و جذبات سے عبارت ہے ؎

تو اے پروانہ این گرمی ز شمع محفل داری
چو من از آتش دل سوز اگر سودائے دل داری





ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ | رجسٹرار آف نیوز پیپر فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۵۰/۶۲۲ | رجسٹرڈ نمبر ڈی ۲۰/۵۱۱

ہندو پرست ہوں نہ مسلمان پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریبان پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انسان پرست ہوں

فیاض گوالیاری

ماہنامہ

شانِ ہند

نئی دہلی

ایڈیٹر
سرمد تونسوی

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے
زرِ سالانہ ۲۲/ روپے

جلد نمبر ۴۵ | اکتوبر سنہ ۱۹۸۴ء | شمارہ نمبر ۱۰

حسنِ یقین

(تضمین بر اشعارِ اقبالؒ)

یقیں محکم ہو تو دورِ خودی معراج پاتی ہے
یقیں پختہ ہو تو راہِ عرفاں جگمگاتی ہے
یقیں میں ہے وہ قدرت جو پہاڑوں کو ہلاتی ہے
یقیں پیدا کر اے ناداں! یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

◆ ◆ ◆ ◆ ◆

امینِ عزمِ فطرت ہے، ضمیرِ کن فکاں ہے تو
بشیرِ انقلابِ نو ہے تو، خیر الزماں ہے تو
امامت ہے ترا ورثہ، سرخیلِ جہاں ہے تو
خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں ہے تو
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں ہے تو

ونیا پرکاش سرمد تونسوی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے لیتھو کے صفحات نو بہار پریس [illegible] جامع مسجد دہلی اور سرورق [illegible] پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند
[illegible] انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔



ہمارا خراجِ عقیدت —— اتحاد

"ہم سب ایک ہی خدا کے بندے ہیں، جس کی بندگی ہم مختلف ناموں سے ادا کرتے ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے لازمی اتحاد کو محسوس کریں، اور انسانوں کے درمیان چھوت چھات، برتری اور کمتری کے احساس کو ترک کر دیں!"

ایسا تھا باپو گاندھی نے جنہوں نے اپنی ہستی کروڑوں کے لئے مکمل طور پر وقف کر دی تھی۔ باپو "پورے سماج کی فلاح" کے علم بردار تھے۔ سماجی انصاف ہمارا قومی نصب العین ہے، جس کے حصول کے لئے ہم کئی ترقیاتی پروگراموں پر عمل کر رہے ہیں، خاص طور سے 20 نکاتی پروگرام پر۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے لفظوں میں، "ملک کی ترقی کے تمام منصوبوں کا مقصد، اقتصادی بنیاد کو مستحکم بنانا ہے، تاکہ ہم لوگ بتدریج، اور اگر ممکن ہو تو بتعجیل، اپنے ملک سے غربت کا خاتمہ کر دیں، اور اپنے سماج سے اقتصادی پسماندگی کو اکھاڑ پھینکیں۔"

ہمارا عزم —— پسماندگی کا خاتمہ

[illegible]

آ

نپولین کا قصہ مشہور ہے کہ جب ایک غیر ملکی فوج کو لے کر وہ فرانس میں دوبارہ داخل ہوا ہے اور فرانسیسی فوج اس کا مقابلہ کرنے کے لئے بھیجی گئی۔ تو اس نے اپنی مختصر سی فوج سے آگے بڑھ کر مخالف فوج کا تنہا سامنا کیا۔ وہ [illegible] ہے کوئی جو اپنے باپ کے سینے پر گولی مارے؟ پوری فوج نے اس آواز کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

جواہر لال جی نے اگرچہ [illegible] ایسی ہی بہادری اور جانبازی کا مظاہرہ دکھلائی ہے۔ صرف چند لاکھ فوج کے سامنے نہیں کر مشتعل عوام کے سامنے۔ ایک صاحب جن کے خسر سے جواہر لال جی اور وزیر اعلیٰ بہار سے کافی نزدیکی تعلقات تھے۔ ایک زمانہ میں پٹنہ میں تھے ان کے گھر والوں کی طرف بلوائی بڑھنے لگے انہوں نے ایک بڑے عہدہ دار کو فون کیا۔ انہوں نے کہا گھبراؤ نہیں میں پولیس بھیجتا ہوں۔

انہوں نے پانچ چھ منٹ انتظار کیا اب مجمع اور قریب آگیا۔ انہوں نے ایک اور عہدہ دار کو فون کیا انہوں نے جواب دیا کہ پولیس کا دستہ چل چکا ہے۔ اتفاق سے ان کی بیوی کو یاد آیا کہ آج اخبار میں خبر تھی کہ جواہر لال جی شہر میں آئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کسی طرح ان کا فون نمبر معلوم کر لیا اور ان کو فون کر دیا۔ جواہر لال جی نے جواب دیا "میں آتا ہوں" اور پانچ منٹ کے اندر اندر موقع پر تنہا پہنچ گئے اور اپنی کار سے اتر کر کھڑے ہو گئے۔ بلوائی سڑک کے بیچ میں ان کو دیکھ کر رک گئے [illegible] رہے اور جوش میں بھرے نعرے لگاتے رہے۔ جواہر لال کے لئے تو چاہئے تھا کہ موقع سے فائدہ اٹھا کر جواہر کو بھی ٹھکانے لگا دیں۔ اس لئے وہ بلوائیوں کو آگے بڑھ کر پھر للکارنے لگے۔

جواہر لال نے کہا: اگر تم چاہتے ہو کہ یہاں کے باشندوں کو قتل کرو اور ان کے گھروں کو لوٹو تو پہلے مجھے مار ڈالو۔ اور میری لاش کو پامال کر کے آگے بڑھو۔ یہ نعرہ بھی ویسا ہی ہے کہ کون ہے جو اپنے باپ کے سینے پر گولی مارے۔ اگر فرق ہے تو یہ کہ نپولین کا نعرہ اپنی ذات کے بچاؤ کے لئے تھا اور جواہر لال کا مسلمانوں کے بچاؤ کے لئے۔

مگر جواہر لال جی کے اس جہان فانی سے رخصت ہونے کے صرف بیس سال بعد جو ہم اخلاقی سماجی اور انسانی قدروں پر اتنے گر گئے ہیں کہ [illegible] گناہ [illegible] کے مرتکب ہو کر [illegible] "ان" پر گولیوں کی بوچھاڑ کر کے اسے ابدی نیند سلانے میں ندامت تک محسوس نہیں کرتے۔

یاد رکھئے کہ تاریخ ہمیں ان دو گھناؤنے اقدام پر کبھی معاف نہیں کرے گی جب مہاتما گاندھی کی شہادت اور بعد ازاں اندرا گاندھی کی شہادت

مرنا اس کا ہے کرے جس کا زمانہ ماتم،
ورنہ دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لئے

ایک جذباتی ہندوستانی
[illegible] نقوی

بہ کوئے یار بہ انداز محرمانہ گزر

(مسرور لکھنوی)

کئی سال ہوئے مشہور قوالہ کامنی دیوی کہنے لگیں ...

مسٹر ..... صاحب میری خواہش ہے کہ کسی طرح اندرا گاندھی صاحبہ کو قریب سے دیکھوں۔ اور اگر ان کے ساتھ میری تصویر بھی ہو سکے تو میں یوں سمجھوں گی کہ میرا جنم سپھل ہو گیا۔ آپ صحافی ہیں اگر اندرا جی سے ملاقات کا انتظام کرا سکیں تو میری خواہش پوری ہو جائے گی۔

میں نے فوراً وعدہ کرتے ہوئے کہا کہ کل صبح آٹھ بجے تیار رہیئے۔ انشاء اللہ آپ کی خواہش پوری ہو جائے گی۔ ان دنوں بہار میں سیلاب کا شور مچا ہوا تھا۔ اور وزیر اعظم فلڈ ریلیف فنڈ کھولا گیا تھا۔ دوسرے دن اپنی حیثیت کے مطابق صرف ایک سو ایک روپیہ کا چیک پرائم منسٹر فلڈ ریلیف فنڈ کے حق میں لکھ کر جیب میں رکھ لیا۔ اور وعدہ کے مطابق کامنی دیوی کے ہوٹل میں پہنچا۔ اور قریب ساڑھے آٹھ بجے ہم اندرا جی کی کوٹھی پر ریسپشن آفیسر کے کمرہ میں پہنچ گئے۔ میں نے متعلقہ آفیسر سے کہا یہ ملک کی مشہور قوالہ ہیں۔ اور وزیر اعظم صاحبہ کے بہار سیلاب کا فنڈ کے لئے روپیہ فراہم کرنے کے لئے بغیر معاوضہ پروگرام پیش کرنے کی درخواست وزیر اعظم صاحبہ سے کرنا چاہتی ہیں۔ اور میں ایک حقیری رقم بھی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ متعلقہ افسر نے میرا وزیٹنگ کارڈ اور رسالہ دیکھ کر ایک صاحب کو بلایا اور کہا کہ انہیں کوٹھی کے اندر لے جائیے۔ اور مجھ سے کہا کہ ٹھیک نو بجے وزیر اعظم صاحبہ لان میں آئیں گی۔ اور وہاں بہ اہتمام عقیدت کی عرضداشت سنیں گی۔ اور آپ یہ سب کچھ اُن سے کہہ دیجئے گا اور چیک بھی پیش کر دیجئے گا۔

لان میں سیکڑوں سکولی بچے خواتین اور کافی تعداد میں فریادی اور درشن کرنے والوں کا ایک ہجوم لگا ہوا تھا۔ پورے نو بجے محترمہ اندرا جی تشریف لائیں۔ پہلے وہ سکولوں کے بچوں کے پاس گئیں۔ پھر خواتین سے کچھ بھی اور گفتگو رہی۔ سوا نو بجے ہمارے قریب پہنچیں تو نمسکار کرتے ہوئے میں نے گزارش کی یہ ملک کی مشہور قوالہ کامنی دیوی جی ہیں۔ آپ مجھ سے صرف اس لئے آئی ہیں کہ بہار سیلاب کا فنڈ کے لئے یہ اپنے پروگرام بغیر کسی معاوضہ کے دینا چاہتی ہیں لہٰذا یہیں

آپ جو بھی ہدایات دیں اس کی تعمیل ہوگی اور یہ سب کچھ کہتے کہتے میں نے چیک پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ میں ہفتہ وار کا جرنلسٹ ہوں۔ اور یہ حقیر رقم بہار سیلاب فنڈ کے لئے پیش کر رہا ہوں۔ چیک لے کر انہوں نے ساتھ کھڑے ہوئے ایک ملازم کو دیا اور کامنی دیوی کے لئے فرمانے لگیں کہ فلاں ڈپٹی منسٹر صاحب کے پاس چلے جایئے وہ آپ کا پروگرام مرتب کر دیں گی۔ میں نے فوراً التجا کی کہ ہم لوگ آپ کے ساتھ تصویر کھنچوانا بھی چاہتے ہیں۔ شکریہ ادا کر زمانے لگیں کہ وہ تو ہو گئی۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ کیمرہ کی روشنی تو ہوئی نہیں تصویر کیسے کھنچ گئی ہوگی۔ انہوں نے مڑ کر گیٹ کی طرف دیکھا تو اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا سر میں دوسری بار تصویر لے لیتا ہوں۔ چنانچہ کیمرہ کی روشنی ہوئی تب مجھے یقین ہوا کہ فوٹو ہوئی ہے۔ دوسرے دن پریس انفارمیشن کے دفتر سے پتہ چلا کہ واقعی دو تصاویر لی گئی تھیں اسی وقت تصاویر میرے پاس موجود ہیں۔

جناب مہدی صاحب نے مبارسہ سے لکھا کہ وہ اپنی شہرہ آفاق کتاب "انگریزی اور اُردو شاعری کی ہم آہنگی" (جس میں انہوں نے انگریزی کے مشہور شعراء کے ہزاروں مختلف اشعار جمع کئے تھے اور ہر شعر کے ساتھ اُردو کا ہم معنی شعر دیا گیا تھا اور اُردو کے ایسے شعراء کے اشعار لئے گئے تھے جو انگریزی سے تعلق نابلد تھے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یا تو انگریزی کے شعراء نے اُردو شعراء کے اشعار کا ترجمہ کیا ہے اور یا پھر اُردو کے شعراء نے انگریزی کے شعراء کے اشعار کا اُردو میں سرقہ کیا ہے) ہندوستان کے صدر جمہوریہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور محترمہ اندرا گاندھی صاحبہ وزیر اعظم کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مہدی صاحب نے یہ بھی قید لگا دی کہ وہ دس دن تک نئی دہلی آ رہے ہیں۔ لہٰذا صدر جمہوریہ ہند اور وزیر اعظم صاحبہ کی خدمت میں کتاب پیش کرنے کے لئے وقت لے رکھیئے گا۔ فوری طور پر صدر صاحب اور وزیر اعظم صاحبہ کو خطوط لکھے گئے۔ جناب صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا مکتوب گرامی تو چار روز بعد ہی مل گیا۔ جس میں انہوں نے اجازت فرمائی تھی کہ فلاں تاریخ کو وقت مقررہ پر آ جائیے گا۔ مگر وزیر اعظم صاحبہ کا کوئی جواب موصول نہ ہوا تو میں مہدی صاحب کو لے کر وزیر اعظم صاحبہ کی کوٹھی پر گیا۔

وزیراعظم سے ملاقات کا انتظام تمام تر وشنو متل صاحب کے ہاتھوں میں تھا چنانچہ ان سے گزارش کی گئی کہ مہدی صاحب بہار سے آئے ہیں اور انہیں وزیراعظم صاحبہ کو اپنی کتاب پیش کرنی ہے۔ متل صاحب فرمانے لگے سرور صاحب وزیراعظم صاحبہ سے ملاقات کے لئے تو شاید آپ کو ہفتوں انتظار کرنا پڑے اور آپ کا عزیز شہر کا نام دینا چاہیں تو میں ابھی کوٹھی کی چار دیواری کے اندر بھجوائے دیتا ہوں۔ مہدی صاحب نے اس میں غنیمت جانی اور متل صاحب نے ہمیں کسی سرکاری کارندے کے ساتھ کوٹھی کے لان میں بھجوا دیا۔

وزیراعظم صاحبہ تمام حاضرین کے پاس جا جا کر ان کی باتیں سنتی تھیں اور اپنے ہمراہ افسروں کو ہدایات دیتی جا رہی تھیں۔ پانچ منٹ ہی میں وہ ہمارے سامنے تشریف فرما تھیں۔ میں نے مہدی صاحب کا تعارف کراتے ہوئے کتاب کا ذکر کیا۔ اور مہدی صاحب نے کتاب اندراجی کی خدمت میں پیش کر دی۔ انگریزی کے اشعار پانچ منٹ تک پڑھتی رہیں۔ فرمایا کہ ان کے ہم معنی اردو کے شعر پڑھ کر سنائیے۔ بس پر میں نے عرض کیا کہ ہمیں تو یہ بتایا گیا ہے کہ آپ اردو پڑھ لیتی ہیں۔ فرمانے لگیں کہ میں اردو لکھ پڑھ نہیں سکتی صرف اردو میں دستخط کرنا سیکھا ہے۔ جن انگریزی اشعار کے بارے میں انہوں نے اردو کے متوازی اشعار سنانے کا ارشاد فرمایا تھا میں نے پڑھ کر سنا دیئے تو مسکراتے ہوئے کتاب لے کر اپنے ساتھ آئے سرکاری کارندے کو تھما دی اور فرمایا کہ اسے میرے کمرے میں رکھوا دیجئے گا۔ اس موقع پر انہوں نے فوٹو گرافر کو حکم دیا کہ تصویر لی جائے۔ یہ تصویر بھی میرے ہاں موجود ہے۔

ایک دن صبح سویرے ہی رانچی (بہار) سے شری مہندر ناتھ کشیپ شاداں تشریف لائے اور اپنے ہندی کلام کا مجموعہ "اپرنا" دکھاتے ہوئے فرمانے لگے سرور صاحب یہ مجموعہ اندراجی کو پیش کرنا ہے اور آج ہی یہ کام ہونا ہے۔ کیونکہ مجھے شام کو واپس جانا ہے۔ عرض کیا گیا کہ بھائی صاحب وزیر اعظم صاحبہ کا معاملہ ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے آج ہی آپ کو ان کی خدمت میں پیش کیا جا سکے۔ اس پر وہ کہنے لگے سرور صاحب کچھ بھی کیجئے یہ کام تو کرنا ہے۔ طوعاً و کرہاً متل صاحب کو فون کیا کہ رانچی (بہار) سے ایک صاحب آئے ہیں وہ اپنا شعری مجموعہ وزیراعظم صاحبہ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ جیسے بھی ہو یہ احسان فرمائیے اور اس کا انتظام فرما دیجئے۔ متل صاحب نے ایک منٹ خاموش رہنے کے بعد فرمایا اچھا جلدی سے آجائیے۔ میں شاداں صاحب کو جلد از جلد وزیراعظم صاحبہ کی رہائش گاہ پر لے گیا اور متل صاحب نے فوراً فون پر کسی سے بات کی اور دو منٹ بعد ہی ہمیں کوٹھی کے اندر ایک کمرہ میں پہنچا دیا گیا۔ بیٹھتے ہی بیرہ چائے کا ایک ایک کپ ہم دونوں کو اور کمرے میں بیٹھے ہوئے دیگر دس بارہ حضرات کو دے گیا۔ پندرہ منٹ بعد ایک صاحب کمرہ میں تشریف لائے اور کہنے لگے کہ P.M صاحبہ آ رہی ہیں دیکھا تو اپنی روایتی شان سے محترمہ اندراجی کمرے میں داخل ہوئیں ہم سب تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ کھڑے کھڑے انہوں نے سب سے بات کی جب ہمارے قریب تشریف لائیں تو میں نے عرض کیا کہ یہ شاداں صاحب رانچی سے صرف اپنا شعری مجموعہ پیش کرنے آئے ہیں۔ مسکراتے ہوئے شاداں صاحب سے انہوں نے کتاب کو شرف قبولیت بخشا اور کتاب کا نام پوچھا۔ چند ایک جگہ سے ایک ایک آدھ آدھ لائن پڑھی اور کتاب اپنے کارندے کو دیدی میں نے انتہائی بھولے پن سے عرض کیا حضور یہ صاحب رانچی سے آئے ہیں اگر آپ کے ساتھ تصویر ہو جائے گی تو ان کے لئے یادگار ہوگی کھل کھلا کر ہنس دیں اور فرمانے لگیں آپ جب بھی آتے ہیں تصویر کا ضرور کہتے ہیں۔ فرمانے لگیں فوٹو گرافر باہر چلا گیا لان میں چلئے وہاں تصویر ہو جائے گی چنانچہ تصویر لی گئی اور وزیراعظم کے حکم سے فوٹو گرافر نے تصویر لی مگر جب دوسرے دن انفارمیشن بیورو کے فوٹو ڈویژن میں پہنچے تو پتہ چلا کہ کیمرہ میں کوئی نقص ہونے کے باعث تمام فلم سادی کی سادی نکلی تھی۔ ایک کی بھی تصویر نہیں آئی فوٹو ڈویژن والے نے بتایا کہ صاحب آپ تو پھر بھی کسی وقت وزیر اعظم صاحبہ کے ساتھ تصویر کھنچوا لیں گے اس فلم نے تو ہمیں اور فوٹو گرافر کو انتہائی ندامت میں ڈالا کیونکہ کچھ بیرونی معزز مہمانوں کی تصاویر بھی لی گئی تھیں۔ اور انہیں یہ تصاویر بھجوانی تھیں میرے لئے تو یہ اتفاقیہ معاملہ کچھ پریشان کن نہ تھا تاہم میں نے شاداں صاحب سے کہا کہ بھائی اب کیا کیا جائے۔ بس پھر شاداں صاحب فرمانے لگے سرور صاحب یہ کیا کم ہے کہ ہماری محبوب وزیراعظم نے مجھے شرف بخشا دیا اور مجھ سے وہ ہم کلام ہوئیں۔ ان کے ساتھ تصویر نہ ہو سکی تو کوئی بات نہیں پھر کسی موقع پر سہی۔ جناب ڈاکٹر رافد کے ترجمان کی قومی یکجہتی پر مبنی کہانیوں کا مجموعہ مانسرووار ہندی اور اردو میں شائع ہونے کے بعد اب انگریزی میں شائع ہوا ہے چونکہ یہ کہانیاں ہماری محبوب وزیراعظم کی دلی خواہش قومی یکجہتی پر مبنی ہیں اور دیہاتی زندگی کی آئینہ دار ہیں اس لئے یہ طے کیا گیا تھا کہ مانسرووار کے انگریزی ایڈیشن کا اجرا محترمہ اندرا گاندھی کے مبارک ہاتھوں سے ہو۔ چنانچہ اس سلسلے میں ابھی پچھلے ہفتے ہی اندراجی کی خدمت میں بذریعہ خط لکھا تھا کہ جب بھی آپ کو وقت ملے گا مانسرووار کے انگریزی ایڈیشن کی اجرائی

ایم سلیم [illegible] بی۔ اے

اصلاحِ سخن

دنیا میں اُستادی و شاگردی کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ خود انسان کی۔ مختلف فنون کے جنم لیتے ہی ایسے ماہرین فن سے تلمذ کی ضرورت محسوس ہوئی جو ان کی الجھن کی مشکل حل کر سکیں۔ ان کی نا پختگیوں کو استحکام بخشیں، اور انہیں مشق و مزاولت کی اس راہ پر ڈالیں جس کی منزل کاملیت و مہارت ہوتی ہے۔ اس مقصد کا حصول ہمیشہ اصلاح کا مرہونِ منت ہوتا ہے جو نو واردانِ فن بزعمِ خود کسی کی اصلاح کو خاطر میں نہیں لاتے، آخر کار اپنے فن میں شاذ و نادر ہی کمال حاصل ہوتا ہے۔

شاعری کی تاریخ میں اُستادی و شاگردی کا نظام شروع ہی سے ساتھ رہا ہے اور اس کی روایات آج تک متواتر چلی آ رہی ہیں۔ بیشتر اُن کی اُستادی سند دوسرے اُستادوں کی آغوشِ عاطفت میں پرورش پائی۔ ہم ان سے یہ بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ ایک شاعر کے کلام پر کس حد تک اس کے اُستاد کے حسنِ نظر کی چھاپ ہے۔ اکثر اشعار جنہیں ہم سُنکر سر دھنتے ہیں اصلاح سے پہلے شعر بے کیف کی مانند تھے لیکن اُستاد نے چند الفاظ کا ایسا رد و بدل کیا کہ ان میں عالم ہی کا کیف و سرور سمٹ آیا لیکن یہ کوئی سہل کام نہیں قدرت نے اصلاحِ سخن کی قوت صرف مخصوص افراد کو عطا کی ہے۔ اسی وقت [illegible] کئے جا سکتے ہیں۔ اصلاح میں جن جن باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے ان میں فصاحت، بلاغت، تاثیر، زبان، محاورہ، تعقیدِ لفظی و معنوی، ترکیب، بندش، پختگی و برجستگی، نشستِ الفاظ، روانی، سلاست، موزونیت، مترادفات اور جملہ ظاہری و باطنی محاسن شامل ہوتے ہیں۔

سخن گوئی یا سخن فہمی سے آسان نہیں۔ شعر کہنا اگر مشکل ہے تو شعر کی روح کا ادراک کرنا بھی کوئی کم مشکل نہیں۔ اساتذۂ فن کے کلام سے اس امر کا اندازہ تو کیا جا سکتا ہے کہ وہ کیا کہتے تھے اور کیسے کہتے تھے لیکن ان کی وسیع النظری کا صحیح اندازہ صرف ان کی اصلاح سے ہی ہو سکتا ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ شاگرد نے کیا کہا اور اُستاد نے کیا اصلاح کی۔

خواجہ آتش مصحفی کے شاگرد تھے۔ آتش کا ایک شعر تھا

سنگِ ایام ہے میرے لئے سامانِ عیش
سنگِ در کو بھی سمجھتا ہوں میں زانو حور کا

اُستاد نے سنگِ در کی جگہ خشتِ بالیں کا فقرہ دیا۔ سنگِ در سر پٹخنے کے لئے زیادہ مستعمل ہے نہ کہ تکیے کے لئے۔ اس مناسبت [illegible] خشتِ بالیں تو گویا اسی حق کے لئے ہی موزوں ہے۔

خواجہ آتش کے ایک شاگرد [illegible] کسی کی طرح میں ایک غزل پر اصلاح لینے آئے جس میں شعر تھا

شور ہے گل میں یہ کہتا ہے کہ گلشن سے نکل
ایسی بے پر کی اڑاتا نہ تھا صیاد کبھی

تو استاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ حضرت میں نے یہ شعر خونِ جگر پی کر کہا ہے۔ مطلب یہ تھا اور دیکھئے۔ خواجہ صاحب نے کہا پہلا مصرع یوں پڑھئے

پر کتر کر یہ کہتا ہے کہ گلشن سے نکل

فرمایئے دو لفظوں کے رد و بدل نے شعر میں کیا برجستگی پیدا کر دی۔ پہلے مصرع میں بے پر کی اڑانے کا کافی ثبوت نہ ملتا تھا۔ آتش کی اصلاح نے نہ صرف یہ سقم رفع کر دیا بلکہ اس سے "پر کتر کر بے پر کی اڑانے" کا ایک نادر نکتہ بھی پیدا ہو گیا۔

بید لکھنوی اردو کے ایک ممتاز شاعر گزرے ہیں۔ ان کا یہ مشہور مطلع تو آپ نے بھی سنا ہوگا

اے عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

اُن کی ایک غزل کا مطلع تھا

مر گیا خاک ہوا گو مرا مدفن نہ رہا
تیرا کھٹکا بھی تو برقِ غضب افگن نہ رہا

اُستاد آتش نے پہلے مصرع میں بجائے "مر گیا" کے "جل گیا" کی اصلاح دی اور دوسرے مصرع میں "تیرا کھٹکا" کو "خوف تیرا" بنا دیا۔ اب شعر یوں ہو گیا

جل گیا خاک ہوا گو مرا مدفن نہ رہا
خوف تیرا بھی تو برقِ شرر افگن نہ رہا

برقِ شرر افگن کی مناسبت سے "جل گیا" کی اصلاح

نہایت معمولی ہے۔ مہ کے دوسرے مصرع میں ذرا اُلجھاؤ تھا۔ لیکن اصلاح سے اس میں بے حد روانی پیدا ہوگئی اور مطلع بھی بلند ہوگیا۔ مہ کا ایک شعر اصلاح سے پہلے یوں تھا ؎

پھر لے چلا ہے دل مجھے بُت خانہ کی طرف
اب ساکنانِ کعبہ ہمارا اسلام ہے

استاد نے اسے یوں بنا دیا ؎

پھر کھینچتی ہے اُلفتِ بُت دیر کی طرف
لو ساکنانِ کعبہ ہمارا اسلام ہے

مہ کے پہلے مصرع میں یہ وضاحت نہ تھی کہ دل بُت خانہ کی طرف کیوں لے چلا ہے۔ اب جواز پیدا ہوگیا ہے کہ اُلفتِ بُت دیر کی طرف کھینچتی ہے۔ دوسرے مصرع میں "لو" میں ایک جہانِ معنی پنہاں ہے جس سے سخن کے نکتہ داں ہی لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔

بعض اوقات چھوٹے چھوٹے لفظوں کا برمحل استعمال شعر میں ایک عجیب کیف پیدا کر دیتا ہے۔ ایک غزل کا مقطع ہے ؎

کیا ہی ... کہہ کے سہارا ہوا اپنا
وہ جو ہنس دیتے ہیں اور شنا نہیں کرتے

غور فرمایئے شعر کا تمام اثر "وہ جو" پر مرکز ہے۔ اگر ان الفاظ میں ذرا بھی ردّوبدل کیا جائے تو شعر آسمان سے زمین پر آرہے گا۔

استاد ناسخ کے ایک شاگردِ رشید کا شعر تھا ؎

بجلی ہمارے اس دلِ بیتاب پر گری
بچکے جو اس کے دانتِ دُرِ آبدار سے

استاد نے پہلا مصرع یوں کر دیا ع

بجلی سی گر پڑی دلِ پُر اضطراب پر

ہونہار شاگرد کا پہلا مصرع بالکل سُست اور معمولی تھا۔ نیز "اس" کا لفظ بھی بلا ضرورت تھا۔ اصلاح سے شعر میں صفائی اور چند سُقم میں چستی پیدا ہوگئی اور حشو کا نقص بھی جاتا رہا۔ "بجلی سی گر پڑی" کے اس ٹکڑے سے اہلِ نظر ہی لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔

رام بابو سکسینہ تاریخِ ادبِ اردو (ترجمہ عسکری) میں لکھتے ہیں کہ ایک دلچسپ استاد ناسخ کے سامنے کسی نے یہ شعر ... کا یہ شعر پڑھا ؎

لیلاف پڑھا صاحب کا اسے دودھ پلایا
اصغر علی اللہ نگہبان تمہارا

آپ سُن کر مسکرائے۔ فرمانے لگے کہ نہیں میر صاحب نے ہرگز یہ نہ کہا ہوگا۔ صحیح لفظ لایلاف ہے۔ اور پھر دوسرے مصرع میں "اصغر علی" کیسا؟ عرب میں ایسے نام سُننے میں نہیں آتے۔ آپ بھول گئے ہوں گے۔ میر صاحب نے اسے یوں کہا ہوگا ؎

پڑھ پڑھ کے لایلاف اسے دودھ پلایا
جا اے مرے اللہ نگہبان تمہارا!

استاد ناسخ کی نازک مزاجی مشہور تھی۔ دیکھئے کیا عجیب شعر میں اتنی اعلیٰ اصلاح بھی کر دی اور پھر غلطی کو شاعر سے منسوب بھی نہ کیا۔ مومن دہلوی کی نازک خیالیاں مشہور ہیں۔ ایک شاگرد غزل لیکر آئے۔ مطلع تھا ؎

ہجر میں کیوں پھر دل پر ستو نہ گھبرایا ہوا
وصل کی شب کا سماں آنکھوں میں ہے چھایا ہوا

استاد نے پہلا مصرع یوں کر دیا ع

اس طرف کو دیکھتا بھی ہے تو شرمایا ہوا

اہلِ ذوق سمجھ سکتے ہیں کہ اصلاح سے شعر میں واقعیت کا اظہار کتنے حسین پیرائے میں ادا ہوا ہے۔ شاگرد کے مصرع میں کوئی انوکھی بات نہ تھی لیکن استاد نے ایک طرف تو اس میں بلاغت پیدا کر دی اور دوسری طرف دو مصرعوں کو ایسا جوڑ دیا کہ مطلع بلند ہوگیا۔

مرزا غالب کو خدائے تخیل کہا گیا ہے۔ اس اعجاز کا عکس ان کی اصلاح میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ نواب یوسف علی ناظم والیٔ رام پور ایک بلند پایہ شاعر تھے اور غالب سے مشورۂ سخن لیتے تھے۔ ایک مرتبہ اصلاح کے لئے غزل بھیجی، ایک شعر تھا ؎

گر نہیں تیری کرامت تو کیا ہے ساقی
ہم نے ساغر کو تری بزم میں چلتے دیکھا

استاد کامل نے اسے یوں لکھا ؎

یہ ساقی کی کرامت کہ نہیں جام کے پاؤں
اور سب نے اسے بزم میں چلتے دیکھا

جاتے کے پاؤں نہیں اور یہ سب نے اسے بزم میں چلتے بھی دیکھا کیسا یہاں ثبوت ہے ساقی کی کرامت کا! ناظم کے شعر میں یہ ثبوت مبہم تھا اور وہ بے ساختگی بھی مفقود تھی جو اب ایک عجیب لطف دے رہی ہے۔

مولانا حالیؔ کی مشہور غزل کا ایک شعر اصلاح سے پہلے یوں تھا سے

عمر شاید نہ کرے آج وفا
سامنا ہے شبِ تنہائی کا

اُستاد نے "سامنا" کی جگہ "کاٹنا" کی اصلاح دیکر شعر کو بلند تر کر دیا۔ اس موقع پر "کاٹنا" ہی پُرلطف و معنی خیز ہے کیونکہ یہ عمر اور شب دونوں میں مشترک ہے۔

ایک مرتبہ کوئی صاحب میر انیسؔ کو اپنا تازہ مرثیہ سنا رہے تھے منظر کشی کے ایک بند میں ایک شعر تھا سے

رکھتی تھی دیکھ کر قدم اپنا ہوائے سرد
یہ خوف تھا کہ دامنِ گل پر پڑے نہ گرد

اس موقع پر میر انیسؔ نے مرثیہ سنانے والے صاحب سے کہا ٹھہر جائیے۔ اگر اس شعر میں کوئی سقم ہو تو خود درست کر لیں۔ آپکو تین گھنٹے کا وقت دیا جاتا ہے۔ مرثیہ گو شاعر شعر پر پورے تین گھنٹے غور کرتے رہے لیکن کوئی خلل محسوس نہ ہوئی۔ مجبور ہو کر کہا۔ میری نظر میں یہ شعر صحیح ہے میر صاحب بولے۔ آپ کا پہلا مصرع یوں ہے ع

رکھتی تھی دیکھ کر قدم اپنا ہوائے سرد

جب ہوا کی آنکھیں ہی نہیں ہوتیں، پھر وہ کیا دیکھ کر قدم رکھے گی اسے یوں ہونا چاہیئے:—

رکھتی تھی پھونک کر قدم اپنا ہوائے سرد

پھونک کر قدم رکھنا کتنا پیارا محاورہ ہے۔ اور پھر ہوا کے لئے کیسا برمحل ہے۔

میر صاحب کے ایک شاگرد نے ایک بار یہ شعر پڑھا سے

عرقِ گل اسے دینا تھا مناسب صیاد
چیختے چیختے بلبل کی زباں سوکھ گئی

اُستاد نے پہلے مصرع میں یہ اصلاح دی۔

رنگِ گل دھو کے پلانا تھا تجھے اے صیاد

"رنگِ گل دھو کے پلانا تھا" اس ٹکڑے کی تعریف سے زبان اور قلم دونوں قاصر ہیں۔ بلبل کو عرقِ گل اسوقت تک ملنا محال ہے جب تک کہ گل کا عرق کشید نہ ہو کون عاشق ہو گا جو اپنے معشوق پر یہ ستم روا رکھے جو خلافِ حقیقت بات ہے کس سہولت سے دو کیا ہے اب شعر پڑھئے اور سر دھنیئے

ایک خوش گو شاعر المتخلص فدا امیر مینائی کے پاس غزل لائے ایک شعر تھا سے

بُتو پچتاؤ گے ویران کر کے خانۂ دل کو
یہ وہ کعبہ نہیں جو گر کے ہو تعمیر کے قابل

استاد نے پہلا مصرع یوں بدل دیا۔

بُتو پچتاؤ گے ڈھا کر ہمارے کعبۂ دل کو

فداؔ کے مصرع میں "ویران کر کے" سے دوسرے مصرع کا صحیح مفہوم ادا نہ ہوتا تھا کیونکہ اس میں کعبہ کے گرنے کے معنی پائے جاتے ہیں اور ویرانی کیلئے انہدام لازم نہیں۔ تعمیر کے قابل وہی عمارت ہوتی ہے جو ڈھا دی جائے اصلاح سے شعر کی سلاست و روانی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

دل شاہجہانپوری کا ایک شعر تھا۔

جان و دل نازکو نذر دینگے ہم × مستحق لطف کی ادا بھی ہے

شعر میں کمال خوبی تھی۔ امیر مینائی نے یہ اصلاح دیکر اور لطف پیدا کر دیا۔

جان و دل دونوں نذر و غمزے کو
لیجئے اب معشوق سے تخاطب کا بھی نہ ہونے کیں

داغؔ دہلوی کے پاس اصلاح کیلئے ایک غزل آئی مطلع تھا

چہرے سے ان کے رنگ جو تیکا عتاب کا، کیا ہو چلا ہے رنگ گلابی نقاب کا

اُستاد نے اسے یوں لکھا ہے سے

چھپتا نہیں چھپائے سے چہرہ عتاب کا، ہوتا چلا ہے رنگ گلابی نقاب کا

جس شان کا مطلع تھا اسی شان کی اصلاح بھی ہوئی غور فرمائیے تو "چھپتا نہیں چھپائے سے چہرہ عتاب کا" اور اس پر قیامت کہ "ہوتا چلا رنگ گلابی نقاب کا" "ہوتا چلا ہے" کے اُستادانہ ٹکڑے کی تعریف نہیں اگر غور سے دیکھا جائے تو مذکورہ بالا اصلاحوں میں اصل نہ زیادہ مصلح کے شاعرانہ معیار کا پتہ چلتا ہے اور ہم نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہیں کہ اگر شعر کہنا کمال ہے تو صحیح اصلاح دینا انتہائے کمال صحیح اصلاح سے مراد وہ اصلاح ہے جس کے بعد شعر میں لفظاً و معناً ترقی کی گنجائش نہ رہے اور اس میں جو لفظ بھی رکھا جائے وہ ایک ترشا ہوا نگینہ ہو۔ خواجہ آتش نے کیا خوب کہا ہے سے

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

چیمسفورڈ کلب کا!
انڈو پاکستان مشاعرہ

موہن لال ایم۔اے

ایک زمانہ تھا کہ چیمسفورڈ کلب کے سالانہ مشاعرے ہندوستان میں اپنی جداگانہ نوعیت کے لحاظ سے بے مثال ہوا کرتے تھے۔ مگر اب وہ بات نہیں رہی، نئے ساتھ تیئیس سال (۱۹۶۰ء) پہلے کے مشاعرہ چیمسفورڈ کلب کا لطف اٹھائیے یادداشت

آج سوموار مارچ ۱۹۶۰ء کی اٹھائیس تاریخ ہے جس وقت رات کے سوا نو بجے ہیں چیمسفورڈ کلب کے سبزہ زار میں عظیم پنڈال اپنی گذشتہ روایات لئے ہوئے جگمگا رہا ہے۔ پنڈال حاضرین سے بھر چکا ہے اور تل دھرنے کو بھی جگہ باقی نہیں ہے لیکن حاضرین دھڑا دھڑ آ رہے ہیں اور جہاں جگہ پاتے ہیں کھڑے ہو رہے ہیں۔ سامعین میں شری شنکر پرشاد جنرل شاہنواز، چودھری برہم پرکاش اور شہر کے دیگر معززین شامل ہیں۔ اسٹیج پر شعراء کا جمگھٹ ہے جن میں ہندوستان و پاکستان کے تقریباً تمام بہترین شعراء شامل ہیں۔ اسٹیج پر ہندوستان کے ہردلعزیز اور مقبول ترین فلمی اداکار دلیپ کمار بھی جلوہ افروز ہیں۔

ٹھیک سوا آٹھ بجے میر مشاعرہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے دہلی چیف کمشنر شری بھگوان سہائے کا نام اس مشاعرہ کی صدارت کے لئے پیش کیا اور وہ اسٹیج پر تشریف لائے ہیں جب جناب وی شنکر اپنے مخصوص انداز سے جناب ہمایوں کبیر سے مشاعرہ کا افتتاح کرنے کی درخواست کر رہے ہیں کتنی خوبصورت اردو بولتے ہیں وی شنکر صاحب، شعراء اور سامعین داد دے رہے ہیں۔

پروفیسر ہمایوں کبیر نے مشاعرہ کا افتتاح کر دیا ہے۔ اب سحر صاحب فرما رہے ہیں کہ میں گنہگار سہی لیکن مذہبی بزرگوں کی اولاد ہوں۔ اس لئے مذہبی رسوم ادا ہونا، ہر مذہب سے محبت کرتا ہوں اس لئے اس مشاعرہ کا آغاز حافظ دہلوی سے کرتا ہوں۔ کلام ان کا ترنم ملاحظہ ہو۔ اختر صاحب حافظ بھی ہیں اور رند بھی سمجھے گئے ہیں لیکن ملاحظہ ہو کیا فرما رہے ہیں ؎

کوئی ایسا شاعر ساقی مخمور چاہئے
کہ جس سے میکدے کا میکدہ مخمور ہو جائے
وہاں نہ پی مجھے اے ساقی دل کہ جہاں
واعظ بھی پینے کے لئے مجبور ہو جائے

مناسب داد پانے کے بعد اختر صاحب غزل سنا رہے ہیں اور سامعین داد دے رہے ہیں لیکن شعراء خاموش ہیں۔ اب ایک اور اچھے ترنم سے پڑھنے والے شاعر شاعر خاص "ملاپ" جناب رام کرشن مضطر تک تشریف لائے ہیں سحر صاحب فرماتے ہیں کہ ان کا ترنم بھی اچھا ہے اور کلام بھی اور پھر آج وہ کچھ پڑھیں گے کیونکہ "ملاپ" کے ایڈیٹر ملک شری رنبیر موجود ہیں اور واقعی مضطر صاحب شاعری کا حق ادا کر رہے ہیں۔ دیکھئے کتنے اچھے اشعار سنا رہے ہیں ؎

پھر بہک چلیں آنکھیں چلنے لگی پروائی
پھر درد کے شانوں میں پھر چوٹ ابھر آئی
بربادِ محبت کا انجام ہی عجب دیکھا
سو بار ڈھونڈا، سو بار ہنسی آئی !!!

شعراء اور سامعین دونوں داد دے رہے ہیں مضطر صاحب نقاش کے متعلق فرما رہے ہیں کہ ان کی بھی رعنائی ہے پھر ان کی نظر ہے

رہتا ہے خیالوں میں پھر آ ہے نگاہوں میں
اک شاہد رنگین کا وہ عالم رعنائی

دیکھئے مضطر صاحب کتنا اچھا شعر فرما رہے ہیں ؎

اے حسن تیرے در کی عظمت ہے نگاہوں میں
دیکھئے کہ آتے ہی آداب جبیں ساتھ

اس شعر پر جب دوسری بار داد ملی [illegible] حاضری بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ پھر اب سحر صاحب سامعین کی [illegible] ہوئے جناب دلیپ کمار سے غزل سنانے کی درخواست کر رہے ہیں [illegible] کہ ہندوستان کے مشہور اداکار فلمی [illegible] جن کی ایک فلم دہلی میں [illegible] لگ رہی ہے [illegible] دلیپ کمار کا [illegible] ہیں گے۔ دلیپ کمار صاحب کی غزل سنا رہے ہیں۔ ترنم سے پڑھ رہے ہیں اور ایسا پڑھ رہے ہیں کہ ترنم میں کوئی خامی نہیں۔ پڑھنے کا انداز شاعرانہ ہے۔ ایک ایک شعر پر داد مل رہی ہے کلام حکیم [illegible] حسین ہیں۔ غزل ملاحظہ ہو ؎

ہر لحظہ کسی دل میں تری یاد رہے گی
بستی یہ اجڑنے پہ بھی آباد رہے گی

ہر آن نیا رشتہ ہے ہر لمحہ نیا عہد
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

ہے ہستیٔ عاشق کا بس اتنا ہی فسانہ
برباد تھی برباد ہے برباد رہے گی

ہے عشق وہ نعمت جو خریدی نہیں جاتی
یہ شے ہے خداداد خداداد رہے گی

"کیا کہنے صاحب واہ واہ، سبحان اللہ" کی آوازیں آ رہی ہیں۔ دلیپ کمار صاحب کی طرف دیکھ کر سامعین سے کہتے ہیں میں بھی یہی کہہ رہا ہوں دیکھئے کتنا اچھا شعر ہے ؎

وہ زلف پریشاں کا سنورنا نہ سنورنا
وہ اُن کے بگڑنے کی ادا یاد رہے گی

دونوں شعروں کا حق ہے اور پھر دلیپ کمار کا طرزِ ادا، واہ واہ کا شور ہے، تالیوں کا شور ہے اور محفل گرم ہو گئی ہے۔ بیدی صاحب فرما رہے ہیں کہ پہلوان [illegible] نے تو لنگوٹ کس لیا ہے۔ اس غزل کی کامیابی کو دیکھ کر میں بھی سوچ رہا ہوں کہ شاعری چھوڑ دوں، ہاں اگر کبھی دھوپیا صاحب نے کھینچ لیا تو آ جایا کروں گا۔ بیدی ان میں دھوپیا صاحب شکل و صورت میں واقعی پہلوان نظر آتے ہیں۔ آپ کلب کے کرتا دھرتا ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ دہلی میں آپ کی سعیٔ جمیلہ سے ہر سال کلب میں مشاعرہ ہوتا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد اردو شاعری کی حیاتِ نو کا امین بن چکا ہے [illegible] مشاعرہ [illegible] میں سامعین کی اتنی بڑی تعداد دھوپیا صاحب کی [illegible] داد دے رہے ہیں۔

دلیپ کمار کے ترنم اور انداز نے سحر صاحب کی شاندار غزل کے بعد شاعر کا [illegible] ہے۔ لیکن سحر صاحب پیر شاعر ہیں اور انہیں اس بات کا احساس ہے کہ کوئی [illegible] کلب میں مشاعرہ کی ناکامی مشاعرہ کی [illegible] ہے اس لئے وہ کافی جتنا رہے ہیں۔ انہوں نے شاعر وقف امروہی کو بلایا ہے جو اپنے مخصوص انداز میں بہت کچھ تو سنا رہے ہیں لیکن رنگ نہیں جما سکے۔ اس لئے وامق صاحب نے بھی آپ نے قطعہ سنا رہے ہیں جن پر داد مل رہی ہے۔ ایک نظم "ہماری جنتا کا سندیش جواہر لال کے نام" سنا رہے ہیں اس پر بھی داد مل رہی ہے۔ اب ایک ایسے شاعر جن کا ترنم اچھا ہے تشریف لا رہے ہیں۔ عشر امروہی صاحب نے غزل سنائی جو خاموشی سے سن لی گئی ہے۔ اب جناب نریش کمار شاد قطعات سنا رہے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

جو کبھی موت ہے سازِ ہستی کا — بیش قیمت سا ایک ترانہ ہے
ایک پیرا ہے تو بردہ ہو اگر — نیک خو ہو تو اک خزانہ ہے

بیدی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ وہ خزانہ ہے جو گھر والے کو اکثر دیوالیہ بنا دیا کرتا ہے، اس پر محفل میں قہقہے بکھر گئے ہیں۔ شاد صاحب کچھ قطعات اور ایک نظم — ایک عام سی لڑکی — سنا کر چلے گئے ہیں۔ اب انور صابری مائک پر آئے ہیں ان کا یہ قطعہ بہت پسند کیا گیا ہے ؎

حوادث کی رفتار کیا دیکھتا ہے — تو نقشوں کے آثار کیا دیکھتا ہے
ترے ساتھ کوئی نہیں چلنے والا — تو مڑ مڑ کے ہر بار کیا دیکھتا ہے

اب سحر صاحب فرما رہے ہیں ؎

رخ سے ورس لے کے لمحہ کا — تو نے ظلمت میں نور دیکھا ہے
گو کہ آنکھیں نہ تھیں مگر ہم نے — دل کی آنکھوں سے دور دیکھا ہے

سامعین سحر صاحب کو اس تعارف کی داد دے رہے ہیں۔

جناب سلیم کھنڈوی غزل سنا رہے ہیں مطلع ملاحظہ ہو ؎

پردۂ رنگِ حقیقت کو کوئی کیا جانے
پھول دیتے ہیں بہاروں سے تہی دامنی

مشاعرہ خاموش ہو گیا ہے اور اب جناب انور مرزاپوری نے زلفِ یار جتنی طویل بحر میں ترنم سے غزل چھیڑ دی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

[illegible] جیسے یہ سب مری [illegible]

جن کو سمجھتا تھا ہم [illegible] وہ بھی تو سوچ کر گئے

مناسب داد مل رہی ہے۔ اور اب اُردو شاعری کے ایک جاودانی نسل یہاں تک آ رہے ہیں۔ جس طرح بادل سے بجلی کی آمد سے دھرتی [illegible] دیتا ہے اسی طرح فراق گورکھپوری کی آمد سے مائیک نے [illegible] ہے۔ [illegible] فراق ہندوستان کے چوٹی کے شاعر ہیں لیکن ان کا ابھی پڑھنے کا مقام تو نہیں آیا لیکن [illegible] صاحب آج کے مشاعرے کا [illegible] نہیں دیا جانا چاہیے اس لئے انہوں نے [illegible] غزل کو [illegible] جرأت کی ہے اور فراق صاحب شمع پر چھا گئے ہیں ؎

بات اٹھی بھی ہے یا دیدۂ پُر نم ساقی
[illegible] خونِ رگِ جاں کی جب جلتی ہیں
کچھ چمک جاتی ہے تاریکیِ عالم ساقی
جب پیالوں میں چراغوں کی لویں جلتی ہیں

فراق صاحب کی یہ نظم ـــــ "رقصِ شبِ ناز" بہت ہی پسند کی گئی ہے۔ نظم کے بعد فراق صاحب فرما رہے ہیں کہ دیکھئے زبان کو کتنا دیا جا سکتا ہے ؎

تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو　　تم کو دیکھیں کہ تم سے بات کریں

اس شعر پر داد کا شور اٹھا ہے، دیکھئے فراق صاحب کتنی اچھی اور رسیلی غزل سنا رہے ہیں ؎

ہر [illegible] کے لئے اپنے غم میں کھو جاتی ہے
ہر [illegible] ہماری دنیا [illegible] رات کے سو جاتی ہے
رکے رکے سے [illegible] اظہارِ وفا کی جرأت کی
[illegible] انسان سے خطا ہو جاتی ہے
[illegible]
بے تاب [illegible] نسلِ آدم [illegible] جاتی ہے

داد و تحسین شعروں کا حق ہے۔ فراق صاحب شمع پر چھا گئے ہیں اور واقعی یہ ان کا حق بھی ہے، ایک اور غزل سنا رہے ہیں۔ اور غزل بھی [illegible] ہے ایک ایک شعر [illegible] ہے فرماتے ہیں ؎

[illegible] تم کو [illegible] کے آئی یہ بات کہاں
ہم بھی وہی ہیں تم بھی وہی ہو لیکن اب وہ بات کہاں

[illegible] آج ہماری آنکھوں سے
تم جانے کس دیس سدھارے [illegible]

وہ شکر فرماتے ہیں کہ [illegible] ہیں۔ صاحب [illegible] کی کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ داد کی [illegible] اور [illegible] شاعر دیکھئے۔ یہ [illegible] ملاحظہ ہو ؎

جھلمل جھلمل تاروں نے بھی پانی کی [illegible] تھی
[illegible] چھم چھم کرتی [illegible] کی بات کہاں

فراق صاحب [illegible] تو [illegible] لکھنوی تشریف لائے ہیں [illegible] ساز ترنم تو ہندوستان اور پاکستان میں کسی کا نہیں ہو سکتا ہے۔ فراق صاحب نے مشاعرہ جما دیا تھا [illegible] صاحب مشاعرہ کو لوٹ رہے ہیں اپنے قطعات اور ترنم سے فرماتے ہیں ؎

جذبِ وفا سے کام لیا اور پی گئے　　ساقی سے چھین کے جام لیا اور پی گئے
احساس جب ہوا کہ آتے ہیں [illegible]　　[illegible] کا کام لیا اور پی گئے

صاحب [illegible] ہے [illegible] اور [illegible] رہے ہیں اور آخر [illegible] ایک [illegible] ہے ہیں۔ [illegible] چاہیے [illegible] صاحب مشاعرہ کو لوٹ رہے ہیں فرماتے ہیں ؎

جی بھر کے زمانے کو [illegible] کے پی
پینے کا سلیقہ ہے کہ پی اور بہک کے پی
[illegible] پوچھتا ہے کہ [illegible]
ساقی کے پاس بیٹھ کے [illegible] کے پی

ایک بار پھر داد و تحسین کا شور [illegible] ہے۔ یہ قطعات سامعین کے دلوں کی ترجمانی کر رہے ہیں زبان سہل اور آسان ہے۔ اور [illegible] پر وجد کا عالم طاری ہو گیا ہے اور والہانہ فرماتے ہیں ؎

توبہ پہ [illegible] تو نے بڑا اہتمام کر دیا　　[illegible] جسے شام کر دیا
دو گھونٹ [illegible] قدم ڈگمگا گئے　　[illegible] شراب کو بدنام کر دیا

[illegible] دو گھونٹ [illegible] نہیں
خود کو [illegible] نہیں

[illegible] دیکھو کہ اے گردشِ ایام ٹھہر
[illegible] کے آ جاؤں ابھی [illegible]

داد و تحسین کا شور ہے [illegible] ہے۔ [illegible]

آج تک کسی شاعر کو اتنی داد نہیں ملی جتنی آج بیکل صاحب کا عالم چھا گیا ہے۔ اور بیکل صاحب نے غزل چھیڑ دی ہے فرماتے ہیں ؎

میرے فسانے میں کیا بات پائی جاتی ہے
کہ سنتے سنتے آنکھیں بھر آئی جاتی ہے

یہی نگاہ جو شرما رہی ہے محفل میں
اسی نگاہ سے بجلی گرائی جاتی ہے

کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑے ہو پروانو
یہ شمع رونے کو جلائی جاتی ہے

بلا سے ہم سے جو تم کو واسطہ ہی نہیں
تو پھر تمہاری نظر کیوں چرائی جاتی ہے

ہماری کشتیٔ ہستی کا اب خدا حافظ
سنبھالتے ہیں مگر ڈگمگائی جاتی ہے

غزل کا ایک ایک شعر کئی کئی بار پڑھا گیا ہے اور دل کھول کر داد دی گئی ہے کہ وہ اُسے اب اتنا کر نہیں دے جا سکتے۔ شعروں داد دی گئی ہے آج دل کو۔ اور اب جناب ابن احمد تاب حیدرآبادی مائک پر تشریف لا رہے ہیں قمر صاحب تعارف فرما رہے ہیں ؎

نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہیں مگر دیکھنے کی تاب نہیں

اس پر تاب صاحب نے فرمایا حضور میں تو ایک ذرہ ہوں
اس پر قمر صاحب نے جگر مرادآبادی کا مصرعہ برجستہ سنا دیا ؎

وہ ذرہ جس جگہ ہے آفتاب ہے

ابن احمد تاب صاحب طویل بحر کی غزل کچھ ایسے انداز سے سنا رہے ہیں جیسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کئی مصرعوں کو خلط ملط کر کے پڑھ رہے ہیں۔ اس انداز کی وجہ سے اچھے بھلے اشعار پر داد حاصل نہیں کر سکے اور محفل میں خاموشی چھا گئی اور اب قمر صاحب ایسے شاعر کو پیش کر رہے ہیں جو مسعود کلب کے مشاعرے میں پہلی بار پڑھ رہے ہیں۔ بیکل اتساہی صاحب آپ شانِ ہند کے لقب سے نہیں ہیں، آپ کا ترنم شاعرانہ ہے۔ اور شاعری میں ترنم کسے کہتے ہیں۔ اس کا جواب آپ بیکل صاحب کو سن کر آسانی پا سکتے ہیں ہندوستان میں بس دو چار ہی پڑھے ہوئے اور منجھے ہوئے اور عمدہ ترنم سے پڑھنے والے ہیں اور بیکل ان میں سے ایک ہیں ترنم کے سحر کے ساتھ ساتھ کلام کا جادو بھی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

پروانہ آج شمع کے پہلو میں جل گیا
کہ ختم تماشۂ عشق کا سامنے ہی ہو گیا

سوچا تھا آج اُن کو بتاؤں گا دل کی بات
وہ سامنے جب آئے تو جادو سا چل گیا

واقعی سامعین پر جادو چل گیا ہے۔ بیشمار تذکرے ہیں دل کو چھو جانے والا ترنم۔ آسان زبان، مضمون جانا پہچانا، ہر طرف مکرر مکرر کی آوازیں آ رہی ہیں۔ بیکل صاحب جب غزل سنا رہے تھے یہی کاش یہ غزل آپ بیکل صاحب سے سن رہے ہوتے۔ وجد چھا گیا ہے۔ والہانہ انداز سے سامعین داد دے رہے ہیں۔ اور بیکل صاحب بھی والہانہ انداز سے فرما رہے ہیں ؎

تری یاد کی داستاں چھوڑ آئے جہاں بھی گئے اک جہاں چھوڑ آئے
انہیں سے پوچھو کیا بیتی گلوں پر بہاروں میں جو گلستاں چھوڑ آئے

میرا خیال تھا کہ سامعین نے دل پر اتنی داد لٹائی ہے کہ اب تک ان کے گلے بیٹھ چکے ہوں گے اور وہ خاموشی سے کلام سن رہے ہوں گے لیکن نہیں صاحب اس شعر نے تو قیامت کا سا سماں پیدا کر دیا ہے کتنی سادگی ہے اس شعر میں۔ ایک اور ایسا ہی شعر سنیئے ؎

قفس میں بھی ذکرِ چمن کرنے والو بہاروں کو آخر کہاں چھوڑ آئے

بیکل کا ترنم اور ایسا جاندار شعر، داد ہے کہ مزہ آ رہا ہے مسعود کلب میں ایسا کامیاب مشاعرہ آج تک نہیں ہوا اور ایک مدت تک ایسا مشاعرہ دلی میں نہیں ہو سکے گا۔ دیکھئے بیکل صاحب اپنی میٹھی اور دلکش آواز سے شاخِ گلستاں سے کیسے موتی بکھیر رہے ہیں ؎

جہاں سے بھی گزرے جدھر سے بھی گزرے
محبت کی ایک داستاں چھوڑ آئے

تری انجمن کی نزاکت سمجھ کر
ہم اکثر تجھے بدگماں چھوڑ آئے

واہ واہ، سبحان اللہ۔ تالیاں ہیں کہ بیکل صاحب کو اٹھا کر اپنی جگہ پر چھوڑ آئی ہیں اور قمر صاحب سامعین سے پوچھ رہے ہیں کہ وہ جو تعارف کراتے ہیں وہ بالکل صحیح ہی ہوتا ہے نا اس میں مبالغہ تو نہیں ہوتا۔ ایک آواز آئی قربان جایئے۔ تو قمر صاحب نے فرمایا کبھی مجھ پر بھی قربان ہونے والے موجود ہیں۔ وہی آواز پھر آئی۔ آپ پر نہیں آپ کی نزاکت پر۔ اس نوک جھونک نے مشاعرہ میں نیا جوش، تازگی اور نئی زندگی پیدا کر دی ہے۔ یوں چلا جا رہا ہے مشاعرہ۔ اب جناب مخدوم محی الدین حیدرآبادی ایک

• چاہیئے گئے سنا رہے ہیں۔ نظم خوب ہے اور اس پر مناسب داد دی
ادی ہے۔ نظم کے بعد مخدوم صاحب غزل سنا رہے ہیں فرماتے ہیں سے

کوئی جلتا ہی نہیں کوئی پگھلتا ہی نہیں
موم بن جاؤ پگھل جاؤ کہ یہ رات کٹے

آؤ ہو جائے وہ پیمانہ کہ بدمست بنائے
آؤ ایک ایک کو پلا دو کہ یہ رات کٹے

ا ب ہی شعار پر مناسب داد ملی ہے گوہر صاحب اب عرشی ملسیانی کو
مشاعرہ بنا کر جا رہے ہیں اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے عرشی صاحب
ی کلام سنا رہے ہیں۔ آپ درد و غم کی تصویر بنے ہوئے یہ پرانی غزل
سنا رہے ہیں سے

تمہارا غم ہمارا غم ہوا کیوں تمہیں جانو کہ یہ عالم ہوا کیوں

آج کل عرشی صاحب مجسم درد و غم بنے ہوئے ہیں۔ آپ کی بینائی
بہت خراب ہو گئی ہے پوری غزل میں درد ہی درد ہے۔ غزل پسند کی
ہے۔ لیکن عرشی اب ان شاعروں میں نہیں رہے جو مشاعرہ کو لوٹ لیا کرتے
۔ میں نے عرشی صاحب کو مشاعرہ لوٹتے دیکھا ہے لیکن دو ایک سال
ایسا نہیں ہو رہا ہے کیوں؟ اس کا جواب شاید عرشی صاحب ہی جانتے
اب مائیک ایک ایسے قادر الکلام صاحب فن کے روبرو ہے جس
م دہلی میں اردو شاعری کی لاج کا امین ہے بسمل سعیدی صاحب ٹونکی
بس شاعر ہیں بلکہ مجسم شعر ہیں فرماتے ہیں سے

اب وہ کیا خاک پشیمان جفا پر ہوں گے
اب مری قبر پر آئیں گے پشیماں ہو کر

گل تو گل خار پہ جب بجلی کبھی گرم شعاع
چھا گئے باغ پہ ہم ابر بہاراں ہو کر

دہلی میں واقعی شعر و سخن کے چمن پر گرم شعاعوں کے سائے ہیں۔ اور بسمل
اب ابر بہاراں بن کر چمن شعر کو مرجھانے سے بچائے ہوئے ہیں۔
نے ہیں سے

کتنے خورشید حیات اس افق ہستی پر
رہ گئے شمع سر گور غریباں ہو کر

اب ترے حسن کی ہوگی حفاظت مجھ سے
اب ترا عشق رہے میرا نگہباں ہو کر

شاعرے میں پہلی بار اشعار پر داد دی جا رہی ہے۔ ہر شعر کے آخر پر شعراء
حضرات آپ ہی کا حصہ ہے۔ بسمل صاحب واہ واہ سبحان اللہ کہہ کر
کا الاپ شروع کر دیتے ہیں۔ اور سامعین اپنے باذوق ہونے کا ثبوت دیتے
ہوئے تالیوں سے نوازتے ہیں۔

پنڈال میں فلیچرہم ہے لوگ اٹھ اٹھ کر پیچھے کلب میں دل بہلانے
جاتے ہیں تو ان کی جگہیں پر ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے وہ پنڈال کے پیچھے کھڑے
ہو جاتے ہیں اور شور کرتے ہیں جس سے مشاعرے میں خلل پڑتا ہے
کلب میں آنا شاید پہلی مرتبہ ہوا ہے۔ اور کلب کے منتظمان کے لئے یہ تجربہ
ہے۔ وہ مجمع پر کنٹرول کرنے میں ناکام رہے ہیں اس کے ساتھ ہی ساتھ
یہ بھی ماننا پڑے گا کہ سامعین نے بھی اپنی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے جس سے
شاعر کو بار بار رکنا پڑا ہے۔ اسی شور و غل میں جناب کنھیا لال خاکر چند
قطعات سنا کر اور مناسب داد پا کر چلے گئے ہیں۔ اور اب گلزار دہلوی
کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا تعارف خاص کرا رہے ہیں۔ سحر صاحب نئے
اور پرانے قطعات سنا رہے ہیں فرماتے ہیں سے

جذبۂ عرشی کہیں جنت رسا ہوتا ہے
اُن کی جلتی ہے سدا اُن کا کہا ہوتا ہے

کلمۂ کفر نہ سمجھیں اسے سننے والے
حسن والوں کا طرفدار خدا ہوتا ہے

ہر حال کو ہی لیتے ہیں سینے والے
ہر حال میں جی لیتے ہیں جینے والے

ساغر جو نہیں ہے کا تو کیا غم اس کا
آنکھوں سے بھی پی لیتے ہیں پینے والے

شہر حرام کا جو ثواب پیتے ہیں
وہ پارسا ہیں مگر بے حساب پیتے ہیں

ادھر ہیں ہم کہ اگر دو گھڑی خوشی کے لئے
پھلوں کا رس بھی پئیں تو شراب پیتے ہیں

طاقت و حسن و مذہبی نشے ہیں ... مے کے نشے میں کیا خرابی ہے
بادہ نوشوں کو روکنے والو ... آدمی خطرناک شرابی ہے

ایک ایک قطعے پر سحر صاحب کو داد و تحسین سے بھر پور کر دی گئی ہے۔ اب سحر صاحب

ہندوستان میں عزیز ہوے کچھ عرصے سے شاعرِ جناب [illegible] سرور جعفری [illegible]
[illegible] جعفری صاحب [illegible] اختر نظم سنا رہے ہیں۔ نظم [illegible] ایک
[illegible] گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شاعر [illegible] شاعروں کی
[illegible] آگئی ہے۔ نظم کا ایک بند پیش ہے ــــ

ان ہاتھوں کی تعظیم کرو ان ہاتھوں کی تکریم کرو
دنیا کے چلانے والے ہیں ان ہاتھوں کو تسلیم کرو
تاریخ کے اور مشینوں کے پہیوں کی روانی ان سے ہے
تہذیب کی اور تمدن کی بھرپور جوانی ان سے ہے
دنیا کا فسانہ ان سے ہے انساں کی کہانی ان سے ہے
صدیوں سے گزر کر آئے ہیں یہ نیک و بد کو جانتے ہیں
یہ دوست ہیں سارے عالم کے [illegible]
[illegible] کی عظمت مانتے ہیں
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو ان ہاتھوں کی تکریم کرو
دنیا کے چلانے والے ہیں ان ہاتھوں کو تسلیم کرو

نظم کے ایک ایک مصرعے پر داد لٹائی جاتی ہے۔ اسرار جعفری صاحب والہانہ انداز سے شاعروں میں [illegible] رہے ہیں۔ نظم ختم کر کے اٹھنے لگے تو سامعین نے ایک اور [illegible] کی فرمائش [illegible] لیکن [illegible] صاحب [illegible] ہیں۔ رات کے [illegible] بج رہے ہیں اور [illegible] سینکڑوں شاعر بیٹھے [illegible] ہیں۔ اب [illegible] کے سامنے آ بیٹھے ہیں۔ جناب [illegible] وجد [illegible] [illegible] کر دیا ہے۔ غزل سنیے، آپ بھی داد دیں گے ــــ

پھول جب [illegible] — [illegible] یاد آئی
اک نگاہِ کرم کی بات — [illegible]
[illegible] پیغام [illegible] — [illegible]
حسن [illegible] تبسم — [illegible]
[illegible] — [illegible]
وقت کی راہ میں [illegible] — [illegible]
رات بھر [illegible] — تب [illegible]
[illegible] گلستاں میں آیا — [illegible]

[illegible] ایک [illegible] داد [illegible] سے گونج گئی۔ سامعین نے واہ واہ سے گرما دیا ہے

[illegible] صاحب [illegible] ہیں کہ سرسید [illegible] میں [illegible] ہے [illegible] کے [illegible] ایک [illegible] شخص [illegible] میں [illegible] صاحب نے [illegible] معلوم ہوتا ہے کون ہے [illegible] اس پر [illegible] نے جواب دیا ...... اور [illegible] کا باپ ہوں۔ سرسید [illegible] کے ساتھ [illegible] صاحب جناب [illegible] کے [illegible] جناب [illegible] سے [illegible] کر رہے ہیں کہ [illegible] کلام [illegible] سے سامعین کو محظوظ فرمائیں [illegible] صاحب کو [illegible] سننے کی سعادت نصیب ہوئی ہے فرماتے ہیں ــــ

[illegible] کا نام ہی [illegible] ہے [illegible]
[illegible] عالم [illegible] عالم مستی ہے

[illegible] صاحب کے بعد جناب [illegible] صاحب نے اپنی غزل سنائی اور اب ہندوستان و پاکستان کے مشہور [illegible] جناب [illegible] کراچی کی [illegible] ہیں اور سامعین ایک ایک مصرعہ [illegible] رہے ہیں۔ شوکت صاحب [illegible] کے [illegible] اور شاعر جناب [illegible] ساحر [illegible] فرماتے ہیں ــــ

ساقی دنیا پہ نگاہ کر لینے دو
کر سکتا ہوں [illegible] لینے دو

[illegible] کوئی [illegible] سینے میں
کچھ دیر تو آہ آہ کر لینے دو

اس قطعہ پر داد پانے کے بعد [illegible] صاحب غزل سنا رہے ہیں اور بہت کامیاب رہے ہیں۔ [illegible] پر کافی داد ملی ہے۔ فرماتے ہیں

میری معصومی عشق کی داد دو
جس نے جو بھی کہا اعتبار آگیا

[illegible] ان [illegible]
[illegible] طرح [illegible] بار بار آگیا

[illegible] جناب [illegible] صاحب [illegible] تشریف [illegible] ترنم سے فرماتی ہیں ــــ

[illegible] کر [illegible] کے [illegible]
[illegible] کر [illegible] ہے [illegible]
[illegible] کی [illegible] نظر [illegible] بھی نہیں

پلک بزم میں یک بیک جھپکی رہتی
اس شعر پر بہت مسعدی گی ہے شعر ملاحظہ ہو سے
عیب نظر مجھ کے انتظار میں پایا
خالق نے مجھے پلک نہ جھپکائے

صاحب موصوف کے بعد جناب سلیم شہزاد صاحب تشریف لائے ہیں۔ اور اب ایک مشاعرہ میں قوم اور عوام سب کو اپنی شاعری سے [illegible] ہیں۔ فرماتے ہیں فرماتے ہوں مشورہ دیتے ہیں اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر سے

غم عشق کی یہاں ہو جائیے | محبت کا ایمان ہو جائیے
اگر عشق میں نام درکار ہو | حسینوں پہ قربان ہو جائیے

سامعین ایسے ہی مشوروں کی تلاش میں ہیں۔ اس لئے پرزور داد دی گئی ہے۔ اب ایک پاکستان کے مشہور و معروف مزاحیہ شاعر جناب ظریف جبلپوری کے سامنے ہے آپ رباعیاں سنا رہے ہیں فرماتے ہیں سے

لیلیٰ کی مدد اگر شفا ہو جاتی | وحشت تری اے قیس ہوا ہو جاتی
وہ لوگ بھلے تھے شرافت والے | اس دور میں ہوتا تو سزا ہو جاتی

سو ہنس کر جسے دیکھیں کوئی ایسا نہ ملا | قسمت میں یہ لکھا تھا ہو لتانہ ملا
چلتے ہوئے بام کے پردے تو ملے | لیکن کسی انگلی کا اشارہ نہ ملا

یہ رباعیاں بہت پسند کی گئی ہیں۔ ظریف صاحب فرما رہے ہیں کہ دتی اگر پنڈت ہری چند اختر (مرحوم) بہت یاد آتے ہیں اور انہیں ان کی زمین میں ایک غزل کہی گئی ہے۔ فرماتے ہیں سے

محبت میں اس طرح بار آیا کہ شامت نہیں [illegible] کیا ہے
میں چاہتا نہیں چھوڑ کر ہوں یہ جرأت نہیں تو پھر اور کیا ہے

محبت کے کیا شینگ ہوتے ہیں سر پہ جتانے والے ہیں لگا کر تو دیکھو
داڑھی کا رہنا یہ کپڑوں سے دیکھو محبت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے
زرا فانہ دل میں اگر تو دیکھو یہ جھوٹا سا گھر، پر آرام دہ ہے
کھلی چھت جو چاہو یہ چوڑا سا سینہ کھلی چھت نہیں تو پھر اور کیا ہے

سنا ہے کہ فرقت میں بے حد مزہ ہے بڑی گت بنتی ہے لیکن یہ فرقت
یہ کم بخت بلانا یہ آہیں یہ رونا بڑی گت نہیں تو پھر اور کیا ہے
یہ وحشت کی کثرت ہیں دونوں مصیبت تو وحشت بھی اچھی نہ کثرت ہی اچھی
یہ بیوی کی وحشت یہ بچوں کی کثرت مصیبت نہیں تو پھر اور کیا ہے

البتہ ان مزاحیہ غزل کے ایک شعر پر بے جا داد دی گئی ہے لیکن

آخری شعر پر تو واہ واہ سبحان اللہ کا شور، جس کا ریلا [illegible] سنتے میں نہیں آتا۔ ظریف صاحب بار بار اس شعر کو پڑھ رہے ہیں۔ ظریف صاحب کو پیروڈی لکھنے میں کمال حاصل ہے۔ آپ نے جناب [illegible] کی نظموں اور غزلوں پر بہت پیروڈیاں لکھی ہیں۔ سامعین مطالبہ کر رہے ہیں کہ [illegible] کی بھی کوئی ہو جس کی پیروڈی سنائی جائے۔ لیکن ظریف صاحب حفیظ صاحب کی ایک غزل کی پیروڈی سنا رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حفیظ صاحب خود پڑھ رہے ہیں۔ ظریف اس طرح ہاتھ اٹھا کر مصرعہ کو بیچ سے اٹھا کر، رک کر تھوڑا سا ہنس کر، بالکل حفیظ کی طرح پڑھ رہے ہیں۔ اور حال یہ ہے کہ زعفران زاری جاری ہے سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں۔ جنہوں نے حفیظ صاحب کو سنا ہے وہ ظریف صاحب کی آرٹ کی داد دے رہے ہیں۔ جو حفیظ صاحب کو کبھی نہیں سن سکے وہ بھی جھوم رہے ہیں۔ واقعی کمال کر رہے ہیں۔ ظریف صاحب ظرافت کی پھلجھڑیاں اڑا رہے ہیں اور مزاح اور طنز پھلجھڑیاں چھوڑ رہے ہیں۔ فرماتے ہیں سے

ان سے اقبال جفا ہو مجھے منظور نہیں | اور پھانسی کی سزا مجھے منظور نہیں
میں تمہیں چاہوں چاہوں یہ طبیعت مری | تم مگر مجھ کو نہ چاہو یہ مجھے منظور نہیں
لطف تو جب ہے رقابت کا مزا بھی ہو | غیر بالکل ہی گدھا ہو یہ مجھے منظور نہیں
جس کا جی چاہے رقابت کرے مجھ سے لیکن | میری والدہ کا سگا ہو یہ مجھے منظور نہیں
آئے پنکھوں پہ خوشی سے وہ نزاکت آئے | سر پہ پانی کا گھڑا ہو یہ مجھے منظور نہیں

پرجوش تالیوں کے درمیان ظریف صاحب اسٹیج چھوڑ چکے ہیں۔

اور اب ایک ہندوستان کے اُس بزرگ شاعر جناب تلوک چند محروم تشریف لا چکے ہیں۔ اور ابھی تک نہیں اٹھے جب تک سامعین کی سیری نہیں ہوئی۔ پیدی صاحب شاذ کھانا کھانے گئے ہیں اور جناب جگن ناتھ آزاد میر مشاعرہ کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ محروم صاحب کے بعد جناب [illegible] نے اپنا کلام سنایا جسے بہت پسند کیا گیا۔ اب ایک ہر اعتبار سے بہترین غزل گو شاعر جناب [illegible] کو تکلیف دی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں سے

آہ جانبِ سوز کی افسردگی تاثیر نہ دیکھ
ہو ہی جاتی کوئی جینے کی تدبیر نہ دیکھ
حادثے اور بھی گزرے تری الفت کے سوا
ہاں مجھے دیکھ مجھے، میری تصویر نہ دیکھ
یہ قدا [illegible] سکے
[illegible] کی تصویر نہ دیکھ

کچھ پوشاک سے بہہ رنگ چمن جوشِ بہار
قفس کو دیکھے تو پھر پاؤں کی زنجیر تو دیکھ
دہی بزمِ وہی شاعر آ وارہ مزاج
کون اُٹھا ہے تری بزم سے دلگیر تو دیکھ

اتنا اچھا کلام لیکن مجروحؔ صاحب کا دامن داد سے نہیں بھر گیا حالانکہ داد ان اشعار کا حق ہے۔ بیدیؔ صاحب کہہ گئے ہیں کہ مشاعرہ دم توڑنے لگا ہے ساحر صاحب کی عدم موجودگی میں دو دو اچھے اور بڑے گرفتارِ بے داد کی نظر ہو گئے ہیں۔ جناب کلیم عثمانی (پاکستان) اور جناب ڈاکٹر عندلیب شادانی (پاکستان) سے کون واقف نہیں ہے تعجب ہے اس برس شعراء کے ذوق کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ بھی اچھے اشعار پر داد نہیں دیتے اگر سامعین شور مچاتے ہیں تو شعراء بھی واہ واہ کرتے ہیں۔ حالانکہ ایک شعر کو جتنا بہتر شاعر سمجھ سکتا ہے دوسرا کہاں سمجھ سکتا ہے لیکن شعراء شیخ پر اپنی اپنی مشاعری ابھارے ہوئے ہیں۔ اس طرح دو اچھے شاعر ہمارے مہمان بے داد کا شکار ہو گئے ہیں اتنے میں ساحرؔ صاحب آئے تو انہیں بھی اس کا احساس ہوا کہ مشاعرہ "ڈوب رہا ہے۔ وہ آج اس کے لئے تیار نہیں ہیں۔ سامعین کی نبض پکڑ لی ہے انھوں نے جناب ساحرؔ لدھیانوی کو پیش کیا ہے۔ ساحرؔ صاحب آج کل عوام کے ہر دل عزیز شاعر ہیں۔ ان کی نظمیں عوام کو زبانی یاد ہیں۔ آپ سے "پرچھائیاں" سُنی جا رہی ہیں۔ "پرچھائیاں" کیا ہیں یہ تو آپ پڑھ کر اندازہ لگا سکتے ہیں نظم بہت طویل ہے یہاں نقل نہیں کی جا سکتی۔ اس اتنا میں بتا دیتا ہوں کہ ایسی نظم پچھلے دس برس میں نہیں لکھی گئی اور نہ ہی اگلے دس برس میں لکھی جائے گی ایک ایک مصرعہ کئی کئی نظموں پہ بھاری ہے۔ سامعین ہیں کہ ساحرؔ کے جادو کے زیرِ اثر "پرچھائیاں" کے تخیل کی بلندیوں میں اُڑ رہے ہیں۔ محفل میں وجد انگیز سماں بندھ گیا ہے۔ رات کا ڈیڑھ بجا ہے۔ اور سامعین پر جو تاثر ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ پنڈال بھرا ہوا ہے کہیں بھی تل دھرنے کی جگہ نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سامعین کو کسی جادوگر نے اپنے سحر سے باندھ رکھا ہے، نظم ختم ہوئی تو تالیوں کا قیامت خیز طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ اب جگن ناتھ آزاد اپنا کلام سنا رہے ہیں۔ آپ بیدیؔ صاحب کی غیر حاضری میں جب میر شاعرہ تھے تو آپ نے مقامی شعراء سے گزارش کی تھی کہ وہ چار اشعار سنا کر مہمان شعراء کو سننے کا موقع دیں۔ اس لئے آپ چار اشعار سنا کر جا رہے ہیں۔ جو بہت پسند کئے گئے ہیں۔ اب ساحرؔ صاحب فرما رہے ہیں، جگن ناتھ کے بھتیجے مرا یاد آیا ہو اور سید محمد جعفری "پرانا کوٹ" سنا رہے ہیں، پڑھنے کا انداز سُننے سے تعلق رکھتا ہے۔ کلام میں جو بات گُدگداتی ہے جو مزاح پیدا کرتے ہیں وہ جعفری صاحب کا ہی حصہ ہے۔ سامعین ہیں کہ لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں "پرانا کوٹ" کے بعد جعفری صاحب مشہور نظم "بھنگیوں کی ہڑتال" سنا رہے ہیں۔ بھنگیوں کی ہڑتال ملاحظہ ہو ؎

بھنگیوں کی آج کل ہڑتال ہے گھر در بتر کا پتلا حال ہے
گردشِ دوراں نے ثابت کر دیا دفعِ حاجت بھی بڑا جنجال ہے
پیٹ پکڑے پھر رہے ہیں سیٹھ جی جیسے دھوتی بھی بہت سا مال ہے
ضبط کی حد پر کھڑے ہیں شیخ جی سانس کھینچے ہیں مگر منہ لال ہے
ہر گلی کوچے کی اپنی جیل ہے ہر جگہ دہلی میں نینی تال ہے
ایک مبلغ ہے پولیس و ہ پٹا آہ کیا جھاڑو کا استعمال ہے
وہ بچارہ خود تو اس قابل نہ تھا یہ مگر انگریز کا اقبال ہے

جعفری صاحب محفل کو لوٹ پوٹ کر رہے ہیں اور اب "بوفے ڈنر" سنا رہے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

کھڑے ڈنر ہے غریب الدیار کھاتے ہیں بنے ہوئے شتر بے مہار کھاتے ہیں
اور اپنی میز پہ ہو کر سوار کھاتے ہیں کچھ ایسی شان سے جیسے شہسوار کھاتے ہیں

شکمِ غریب کی یوں ورشِ ایذ ہوتی ہے
ڈنر کے سایہ میں فوجی پریڈ ہوتی ہے

کھڑے ہیں میز کنارے کہ ایک بت میں نہ لے انہیں نے گو نفقہ اپنے اپنے پلیٹ لئے
ادھر ادھر کو جو کھانے تھے سب سمیٹ لیے کھڑا ہی اچھے سوچ میں رہ گیا پلیٹ لئے

یہ میز ہو گئی خالی اب اور کیا ہو گا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہو گا

ایک مرغی ٹانگ اور رقیب لے بھاگا بدنصیب ہی جاگا تو دیر میں جاگا
گیا ہے شامی کباب میں بیت گیا دھاگا ڈنر یہ کیا ہے یہ چھاپے جو کل نہ آگا

یہ کیا خبر تھی جب آیا تھا ہی ڈنر کھانے
حقیقتوں کو بنانے ہی پڑے ہیں افسانے

حقیقتوں کا یہ کہنا زمانہ سازی ہے یہ شخص دیکھنے میں جو بڑا نمازی ہے
یہ انڈا نے کا مرغی ہو مرغی ڈانڈی ہے کا مزید کیا ہے یہ لقمہ دوڑ کی سی بازی ہے

ملائی بلوک میں میز جس نے پا لیا
نہیں تیری طرح سے ڈنر میں خوار ہوا

وہ ایک میز جو تھی گرد مثبت آرا وہیں جہاں سے مقامِ گفتار کا ہے سینہ
میں ایک گوشے میں سہاگر چلی جاؤ کرتیں ہیں تو اشاروں میں نان کا

اسیر حلقۂ خوباں جو مرغ دامی ہیں
تو ہم شہیدِ ستم ہائے کم نگاہی ہیں

مشاعرہ واہ واہ مرحبا کے شور میں چمک اٹھا ہے اور اب دورِ حاضر کے عظیم شاعر کرنل فیض احمد فیض مائیک پر تشریف لائے ہیں اور فرماتے ہیں کہ غزل پیش ہے۔ ایک آواز آئی صاحب غزل وہ غزل چلے آج تو فیض صاحب ہر سال کی طرح وہی سناتی ہوئی غزل سنا رہے ہیں ؎

سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں
ہم لوگ سرخرو ہیں کہ منزل سے آئے ہیں
شمعِ نظر خیال کے انجم جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں
اٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں
ہر اک قدم اجل تھا ہر اک گام زندگی
ہم گھوم پھر کے کوچۂ قاتل سے آئے ہیں
بادِ خزاں کا شکر کرو فیض جس کے ہاتھ
نامے کسی بہار شمائل سے آئے ہیں

اس غزل کے بعد فیض صاحب نے ایک نظم "نشاطِ رقص" سنائی ہے۔ لیکن سامعین فیض صاحب سے جو توقعات لگائے بیٹھے تھے وہ پوری نہیں ہو سکیں۔ فیض صاحب کے بعد جناب جاں نثار اختر "آخری ملاقات" سنا رہے ہیں۔ اس نظم میں اختر صاحب نے اپنے بچپن اور جوانی کی یادیں بڑے حسین اور دلکش پیرائے میں بیان کی ہیں لیکن یہ نظم جیمسفورڈ کلب کے سامعین نے پسند نہیں کی اور اختر صاحب اسے ادھوری پڑھ کر ہی مائک سے اٹھ گئے ہیں۔ اور اب ہندوستان اور پاکستان کے محبوب شاعر جناب قتیل شفائی تشریف لائے ہیں فرماتے ہیں ؎

خرد کے نام جنوں کا پیام لے کے چلے
ہم اپنے ساتھ ہی اپنا مقام لے کے چلے

رات کے دو بجے ہیں آنکھوں میں نیند کا نشہ چھا رہا ہے لیکن قتیل کا ترنم اور کلام بھی تو اپنا نشہ رکھتا ہے جو نیند کے نشے سے بدرجہا شدید ہے۔ سامعین مدہوش ہو رہے ہیں اور قتیل صاحب فرما رہے ہیں ؎

سکوتِ شام کا مطلب کوئی سمجھ نہ سکا
بس ایک ہمیں تری محفل میں جام لے کے چلے
بٹھا دیئے ہیں کس نے بہار پر پہرے
صبا چلے بھی تو مسموم خرام لے کے چلے
خدا کے نام سے واقف ہر اک راہ نہ تھی
کبھی کبھی تو ہم اپنا بھی نام لے کے چلے

اس شعر نے تو محفل میں دھوم مچا دی ہے اور قتیل صاحب ایک غزل سنا رہے ہیں فرماتے ہیں ؎

جھلکیاں دیکھ کے شہروں میں بیابانوں کی
لوگ اب خیر مناتے ہیں گریبانوں کی
اپنے حالات میں ہر کوئی مقید ہے یہاں
اب ضرورت نہیں اس قدر کو زندانوں کی

کیا حقیقت بیانی ہے۔ داد کیوں نہ ملے۔ اور فرماتے ہیں ؎

ہم کچھ خوش وقت سے بھی بے سر و ساماں رہے
کہیں نیت نہ بدل جائے نگہبانوں کی
ہم نہ کہتے تھے کہ رندوں سے نہ پھیرو آنکھیں
تم تو خود قدر بڑھا دیتے ہو پیمانوں کی
جانے کب پائیں گی پھر سے قد و قامت اپنا
یہ بھٹکتی ہوئی پرچھائیاں انسانوں کی

قتیل شفائی کے بعد ہندوستان کے شاعرِ رومان نامور ادیب اور غزل گو اور ریڈیائی رکن جناب روشن صدیقی اپنی غزل سنا رہے ہیں۔ دیکھئے کتنے اچھے اشعار ہیں ؎

اے تشنگیِ شوق ذرا سوچ سمجھ کر
ہونٹوں سے ابھی فاصلۂ جام بہت ہے
ہر چند کہ ہے دشمنِ آرام محبت
اس دشمنِ آرام سے آرام بہت ہے
آغاز تری بے رخی ہے اک مرگِ مسلسل
ناداں تجھے اندیشۂ انجام بہت ہے
وہ چشم فسوں ساز کی دل سے ہے مخاطب
اے جذبۂ دل تجھ پہ یہ الزام بہت ہے

روشن صاحب خوب داد پا کر تشریف لے گئے تو کنور صاحب نے جناب حبیب جالب کو زحمت دی ہے حبیب صاحب خوب پڑھتے ہیں۔ خوب کہتے ہیں۔ ان کے اشعار اور ترنم دل کی گہرائیوں سے نکلے ہیں۔ ملاحظہ

جلد ہی ڈوب کر نکلتے ہیں اور سامعین پر وہی اثر کرتے ہیں۔ حبیب صاحب شعر میں ڈوب کر شعر سناتے ہیں اور یقین جانیئے وہ خود رو دیتے ہیں۔ جذبات کا آسمان اور سنجیدہ ہے کہ پڑھتے وقت ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ اس وقت رات کے ساڑھے نو بجے ہیں حسین شعراء اور حسین ترنم کے اس حسین و جمیل امتزاج نے محفل میں سماں باندھ دیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

وہ صبح عاشقی ہیں کہیں شام نہ آجائے
مجھے بے وفا کہوں وہ مقام نہ آجائے
وہ جو منزلوں پہ لا کر کسی ہم سفر کو لوٹیں
انھیں رہزنوں میں تیرا کہیں نام نہ آجائے
ذرا زلف کو سنبھالو میرا دل دھڑک رہا ہے
کوئی اور طائر دل تہِ دام آنہ جائے
یہ مہ و نجوم ہنس لیں مرے آنسوؤں پہ جالب
مرا ماہتاب جب تک لبِ بام آنہ جائے

حبیب جالب کے ساتھ ہی بزم اکھڑ گئی ہے۔ سامعین و شعراء دونوں مضطرب ہیں۔ یادگار مشاعرہ اب اپنی آخری منزل میں آ رہا ہے۔ سامعین بہت رہ گئے ہیں اور جو ہیں وہ واقعی صاحبِ ذوق ہیں اور انھیں شعر و سخن سے الفت ہے۔ اب جناب کرشن ادیب اپنا مترنم کلام سنا رہے ہیں فرماتے ہیں ؎

جب بھی آتی ہے تری یاد کبھی شام کے بعد
اور بڑھ جاتی ہے افسردگی شام کے بعد

اب مائیک پر ایک عالم فاضل ادیب اور شاعر ڈاکٹر منوہر سہائے تشریف لائے ہیں۔ اور مائیک کو اپنے باوا کی جاگیر سمجھ کر بیٹھ گئے ہیں پر بیٹھے ہوئے شعراء سر پیٹ رہے ہیں کہ اس عالم کو ذرا بھی خیال نہیں کہ ان کا علم دوسروں پر کتنا بوجھ بن رہا ہے۔ آخر ایسے اشعار کی اردو شاعری میں نمائش کی ہے کہ ان حضرات، کو علم و ادب و تنقید کے نثری شاہکار سنا کر سامعین سے بعد کر دینا ہے شعر میں پناہ لینی پڑی فرماتے ہیں ؎

میرے ہر اک سانس میں شرکت ہے آہ کی
کھائے ہوئے ہوں چوٹ تیری نگاہ کی

پھر اس نگاہ کی چوٹ کا ذکر کوئی بیس منٹ ضائع کرنے کے بعد اور سامعین مرکی راہ چلانے کے بعد ڈاکٹر صاحب مائیک سے اٹھے ہیں

غزلیات

جناب دلارام صاحب شباب

شکستہ آشیاں ہے اور میں ہوں
جفائے باغباں ہے اور میں ہوں
یہ دل سجدہ کناں ہے اور میں ہوں
وہ سنگِ آستاں ہے اور میں ہوں
غمِ عشقِ بتاں ہے اور میں ہوں
وجودِ نیم جاں ہے اور میں ہوں
مری دنیا سمٹ کر رہ گئی ہے
کسی کا آستاں ہے اور میں ہوں
نہ چھیڑو شعلہ و شبنم کی باتیں
کہ ہر جانب دھواں ہے اور میں ہوں
کبھی دنیا کبھی عقبیٰ کی شورش
وبالِ دو جہاں ہے اور میں ہوں
میں قلب و روح سے جس پر فدا ہوں
وہی ہندوستاں ہے اور میں ہوں
غمِ ہستی کے چور اہے یہ یاس و
خلوص پیکراں ہے اور میں ہوں

بسمل نقشبندی رتلامی (بانس واڑہ)

یہ کہہ کے بہا دیدۂ نمناک سے پانی
ایسا نہیں برسا کبھی افلاک سے پانی
بن بن کے بہا شاید تباہی چمن کی
برگ و گل و اشجار و خس و خاشاک سے پانی
ابرو کے اشارے پہ مرے آنکھ سے ابلیں
اترا ہے ترے خنجرِ سفاک سے پانی
جو روح پہ بھی باقی نہ ہو شانِ تجلی
ڈھل جائے اگر دیدۂ بیباک سے پانی
بسمل ترے زخموں کی جو کھل جائے حقیقت
بہنے لگے ہر دیدۂ ادراک سے پانی

نیا قانون

سعادت حسین منٹو

منگو کوچوان اپنے اڈے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ استاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب استاد منگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سنی تھی تو اس نے گاما چودھری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دے کر مدبرانہ انداز میں پیشین گوئی کی تھی "دیکھ لینا چودھری تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی۔"

اور جب گاما چودھری نے اس سے یہ پوچھا تھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو استاد منگو نے بڑی متانت سے جواب دیا تھا "ولایت میں اور کہاں؟"

اسپین میں جنگ چھڑی اور جب ہر شخص کو اس کا پتہ چل گیا تو اسٹیشن کے اڈے میں جتنے کوچوان حلقہ بنائے حقہ پی رہے تھے دل ہی دل میں استاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے اور استاد منگو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگہ چلاتے ہوئے اپنی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔

اسی روز شام کے قریب جب وہ اڈے میں آیا تو اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتمایا ہوا تھا۔ حقے کا دور چلتے چلتے جب ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی تو استاد منگو نے سر پر سے خاکی پگڑی اتاری اور بغل میں داب کر بڑے مفکرانہ لہجے میں کہا:

"یہ کسی پیر کی بددعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں چاقو چھریاں چلتے رہتے ہیں اور میں نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل دکھایا تھا اور اس درویش نے جل کر یہ بددعا دی تھی جا تیرے ہندوستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے رہیں گے۔ اور دیکھ لو جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہوا ہے ہندوستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور پھر حقے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی۔ "یہ کانگریسی ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹکتے رہیں تو کچھ نہ ہوگا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہوگی کہ انگریز چلا جائے گا اور کوئی اٹلی والا آ جائے گا۔ یا وہ روس والا جس کی بابت میں نے سنا ہے کہ بہت تگڑا آدمی ہے لیکن ہندوستان سدا غلام رہے گا۔ ہاں میں یہ کہنا بھول ہی گیا کہ پیر نے یہ بددعا بھی دی تھی کہ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی راج کرتے رہیں گے۔"

استاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ اس کے ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ مگر اس کے تنفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے ان کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وہ گورے کے سرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو اسے متلی سی آ جاتی۔ نہ معلوم کیوں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ان کے لال جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آ جاتی ہے جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو!

جب کسی شرابی گورے سے جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت مکدر رہتی اور وہ شام کو اڈے میں آ کر ہل مارکہ سگریٹ پیتے یا حقے کے کش لگاتے ہوئے اس گورے کو جی بھر کے سنایا کرتا۔

"..........." یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہا کرتا تھا "آگ لینے آئے تھے۔ اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے۔ یوں رعب گانٹھتے ہیں گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں۔۔"

اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا جب تک اس کا کوئی ساتھی اس کے پاس بیٹھا رہتا وہ اپنے سینے کی آگ اگلتا رہتا۔

"شکل دیکھتے ہو نا تم اس کی۔ جیسے کوڑھ ہو رہا ہے۔ بالکل مردار۔ ایک دھپے کی مار اور گٹ پٹ گٹ پٹ یوں بک رہا تھا جیسے مار ہی ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم پہلے پہل جی میں آئی کہ ملعون کی کھوپڑی کے پرخچے اڑا دوں لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہتک

یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو جاتا اور ناک کو خاکی قمیص کی آستین سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا ـــ

"قسم ہے بھگوان کی ان لاٹ صاحبوں کے ناز اٹھاتے اٹھاتے تنگ آگیا ہوں۔ جب کبھی ان کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون والون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آجائے۔"

اور جب ایک روز اُستاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں اور ان کی گفتگو سے اسے پتہ چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

"مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔

"سنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا۔ کیا ہر چیز بدل جائے گی؟"

"ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور ہندوستانیوں کو آزادی مل جائے گی۔"

"کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟"

"یہ پوچھنے کی بات ہے، کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے۔"

ان مارواڑیوں کی بات چیت اُستاد منگو کے دل میں ناقابل بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا اور چابک سے بہت بری طرح پیٹا کرتا تھا۔ مگر اس روز وہ بار بار پیچھے مڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھی ہوئی مونچھوں کے بال ایک انگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اونچے کر کے گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہتا "چل بیٹا، چل ـــ ذرا ہوا سے باتیں کر کے دکھا دے۔"

مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اس نے انارکلی میں دینو حلوائی کی دوکان پر آدھ سیر دہی کی لسی پی کر ایک بڑی ڈکار لی اور مونچھوں کو منہ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا "ہت تیری ایسی کی تیسی۔"

شام کو جب وہ اڈے کو لوٹا تو خلاف معمول اسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینے میں ایک عجیب و غضب طوفان برپا ہو گیا۔ آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سنانے والا تھا۔ بہت بڑی خبر اور اس خبر کو اپنے اندر سے باہر نکالنے کے لئے وہ سخت مجبور ہو رہا تھا۔ لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

آدھ گھنٹے تک وہ چابک بغل میں دبائے اسٹیشن کے اڈے کی آہنی چھت کے نیچے بیقراری کی حالت میں ٹہلتا رہا۔ اس کے دماغ میں بڑے اچھے اچھے خیالات آرہے تھے۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اسکو ایک نئی دنیا میں لاکھڑا کر دیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق جو پہلی اپریل کو ہندوستان میں نافذ ہونے والا تھا، اپنے دماغ کی تمام بتیاں روشن کر کے غور و فکر کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں مارواڑی کا یہ اندیشہ "کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟" بار بار گونج رہا تھا اور اسکے تمام جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑا رہا تھا۔ کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اس نے مارواڑیوں کو گالی دی۔ ....

"غریبوں کی کھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل ـــ نیا قانون ان کے لئے کھولتا ہوا پانی ہوگا۔"

وہ بے حد مسرور تھا۔ خاص کر اس وقت اس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچتی جب وہ خیال کرتا کہ گوروں ـــ سفید چوہوں (وہ ان کو اسی نام سے یاد کرتا تھا) کی تھوتھنیاں نئے قانون کے آتے ہی بلوں میں ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائیں گی۔

جب نتھو گنجا، پگڑی بغل میں دبائے اڈے میں داخل ہوا تو اُستاد منگو بڑھ کر اس سے ملا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بلند آواز سے کہنے لگا۔ "لا ہاتھ ادھر.... ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے ـــ تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اُگ آئیں۔"

اور یہ کہہ کر منگو نے بڑے مزے لے لے کر نئے قانون کے متعلق اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ دوران گفتگو میں اس نے کئی مرتبہ نتھو گنجے کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا "تو دیکھتا رہ، کیا بنتا ہے۔ یہ روس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہے گا۔"

اُستاد منگو موجودہ سوویت نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا اور اسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں۔ اسی لئے اس نے "روس والے بادشاہ" کو "انڈیا ایکٹ" یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا اور پہلی اپریل کو نئے نظام میں جو نئی تبدیلیاں ہونے والی تھیں۔ وہ "انھیں "روس والے بادشاہ"

کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سُرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی۔ اُستاد منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں "روس والے بادشاہ" اور پھر نئے قانون کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سُنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ہیں یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا تھا۔

ایک روز اس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے نئے آئین پر بڑے زور سے تنقید کر رہے تھے اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سُن رہا تھا۔ ان میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا—

"جدید آئین کا دوسرا حصہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا۔ ایسی فیڈریشن دُنیا کی تاریخ میں آج تک نہ سُنی نہ دیکھی گئی ہے۔ سیاسی نظریہ کے اعتبار سے بھی یہ فیڈریشن بالکل غلط ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں!"

ان بیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو ہوئی چونکہ اس میں بیشتر الفاظ انگریزی کے تھے۔ اس سے اُستاد منگو صرف اوپر کے جملے ہی کو کسی قدر سمجھا اور اس نے خیال کیا یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو بُرا سمجھتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد ہو۔ چنانچہ اس خیال کے زیر اثر ان دو بیرسٹروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا "ٹوڈی بچے!"

جب کبھی وہ کسی کو دبی زبان میں "ٹوڈی بچہ" کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے بڑا خوش ہوتا تھا کہ اس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے اور یہ کہ وہ شریف آدمی اور ٹوڈی بچے میں تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس واقعے کے تیسرے روز وہ گورنمنٹ کالج کے تین طلبا کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا کہ اس نے ان تین لڑکوں کو آپس میں یہ باتیں کرتے سنا—

"نئے آئین نے میری امیدیں بڑھا دی ہیں۔ اگر .... صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی۔"

"ویسے بھی بہت سی جگہیں اور نکلیں گی۔ شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آ جائے۔" "ہاں ہاں، کیوں نہیں۔"

"وہ بے کار گریجویٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں ان میں کچھ تو کمی ہوگی۔"

اس گفتگو نے اُستاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بھی بڑھا دی اور وہ اس کو ایسی "چیز" سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو۔ "نیا قانون ......؟" وہ دن میں کئی بار سوچتا "یعنی کوئی نئی چیز!" اور ہر بار اس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ نیا ساز آ جاتا جو اس نے دو برس ہوئے چودھری خدا بخش سے بڑی اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا جگہ جگہ لوہے کی نکل چڑھی ہوئی کیلیں چمکتی تھیں اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا وہ تو سونے کی طرح دمکتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی "نئے قانون" کا درخشاں اور تاباں ہونا ضروری تھا۔

پہلی اپریل تک اُستاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سنا مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا۔ اور اس کو یقین تھا کہ اس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی ان سے اس کی آنکھوں کو ضرور ٹھنڈک پہنچے گی۔

آخر کار مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔ موسم خلاف معمول سرد تھا اور ہوا میں تازگی تھی۔ پہلی اپریل کو صبح سویرے اُستاد منگو اٹھا اور اصطبل میں جا کر تانگے میں گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی—— وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اس نے صبح کے سرد دھندلکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا مگر اسے ہر چیز پرانی نظر آئی—— آسمان کی طرح پرانی۔ اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں مگر سوائے اس کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی اور اس کے گھوڑے کے سر پر جمی ہوئی تھی اور سب چیزیں پرانی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی کلغی اس نے نئے قانون کی خوشی میں ۳۱ مارچ کو چودھری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنے میں خریدی تھی۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز، کالی سڑک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے، دکانوں کے بورڈ، اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھرو کی جھنجھناہٹ، بازار میں چلتے پھرتے آدمی...... ان میں سے کون سی چیز نئی تھی؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں لیکن اُستاد منگو مایوس نہیں تھا۔

"ابھی بہت سویرا ہے۔ دکانیں بھی تو سب کی سب بند ہیں۔"

اس خیال سے اسے تسکین ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا کہ اپریل کو تو نئے قانون کا کام شروع ہوتا ہے۔ اب اس سے پہلے نئے قانون کا کیا نظر آئے گا؟"

جب اس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے نو بجائے۔ جو طلباء کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے خوش پوش تھے۔ مگر اُستاد منگو کو نہ جانے ان کے کپڑے میلے میلے سے کیوں نظر آئے شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔

تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر انارکلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دکانیں کھل چکی تھیں اور اب لوگوں کی آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی۔ حلوائی کی دوکان پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی۔ منیاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں اور بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ مگر اُستاد منگو کے لئے ان تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب اُستاد منگو کے گھر میں بچہ پیدا ہونے والا تھا تو اس نے چار پانچ مہینے بڑی بے قراری میں گذارے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ بچہ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہوگا۔ مگر وہ انتظار کی گھڑیاں نہیں کاٹ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو صرف ایک نظر دیکھ لے اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہے۔ چنانچہ اسی غیر مغلوب خواہش کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ اپنی بیمار بیوی کے پیٹ کو دبا کر اور اس کے اوپر کان رکھ کر اپنے بچے کے متعلق کچھ جاننا چاہا تھا مگر ناکام رہا تھا۔ ایک مرتبہ انتظار کرتے کرتے اسقدر تنگ آگیا تھا کہ اپنی بیوی پر برس بھی پڑا تھا——

"تو ہر وقت مُردے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ اٹھ ذرا چل پھر تیرے انگ میں تھوڑی سی طاقت تو آئے۔ یوں تختہ بنے رہنے سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ تو سمجھتی ہے کہ اس طرح لیٹے لیٹے بچہ جن دے گی؟"

اُستاد منگو طبعاً بہت جلد باز واقع ہوا تھا۔ وہ ہر سبب کی عملی تشکیل دیکھنے کا نہ صرف خواہشمند تھا بلکہ متجسس تھا۔ اس کی بیوی گنگا وتی اس کی اس قسم کی بے قراریوں کو دیکھ کر عام طور پر یہ کہا کرتی تھی——

"ابھی کنواں کھودا نہیں گیا اور تم پیاس سے بے حال ہو رہے ہو۔" کچھ بھی ہو مگر اُستاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اتنا بے قرار نہیں تھا جتنا کہ اسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہئے تھا۔ وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے گاندھی یا جواہر لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لئے نکلتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ اُستاد منگو ہمیشہ ان کے جلوس کے ہنگاموں اور ان کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا۔ اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہو تو اُستاد منگو کے نزدیک وہ بڑا آدمی تھا اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ اپنے ذہن کے اسی ترازو میں تولنا چاہتا تھا۔

انارکلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چمکیلی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا موٹروں کی دکان کے پاس اسے چھاؤنی کی سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دل میں یہ خیال کیا——

"چلو یہ بھی اچھا ہوا —— شاید چھاؤنی ہی سے نئے قانون کا پتہ چل جائے۔"

چھاؤنی پہنچ کر اُستاد منگو نے سواری کو اس کی منزل مقصود پر اتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر سلگایا اور اگلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا—— جب اُستاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی یا اسے کسی بیتے ہوئے واقعہ پر غور کرنا ہوتا تو وہ عام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی باگیں دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا تھوڑا سا ہنہنانے کے بعد بڑی دھیمی چال چلنا شروع کر دیتا تھا۔ گویا اسے کچھ دیر کے لئے بھاگ دوڑ سے چھٹی مل گئی ہے۔

گھوڑے کی چال اور اُستاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سست تھی۔ جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا اسی طرح اُستاد منگو کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔

وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے

کے طریقے پر غور کر رہا تھا اور اس قابل غور بات کو آئینِ جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ اس سوچ بچار میں غرق تھا۔ اسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سواری نے اسے بلایا ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے اسے سڑک کے اس طرف دور بجلی کے کھمبے کے پاس ایک "گورا" کھڑا نظر آیا جو اسے ہاتھ سے بلا رہا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے اُستاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی جب اس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ پہلے اس کے جی میں آئی کہ بالکل توجہ نہ دے اور اس کو چھوڑ کر چلا جائے مگر بعد میں اس کو خیال آیا "ان کے پیسے چھوڑنا بھی بیوقوفی ہے۔ کلغی پر جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر دیئے ہیں۔ ان کی جیب ہی سے وصول کرنے چاہئیں۔ چلو چلتے ہیں۔"

خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگہ موڑ کر اس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور آنکھ جھپکنے میں وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا

"صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے؟"

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی۔ ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اس کا سارا چہرہ ہنس رہا تھا اور اپنے اندر اس نے اس "گورے" کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔

جب "گورے" نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کا رخ بچا کر سگریٹ سلگا رہا تھا مڑ کر تانگے کے پائیدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک اُستاد منگو اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولہ بن کر اوپر کو اُڑ گئیں۔

اُستاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اترنے والا تھا اپنے سامنے کھڑے "گورے" کو یوں دیکھ رہا تھا گویا وہ اس کے وجود کے ذرے ذرے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے اور گورا کچھ اس طرح اپنی پتلون پر سے غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا ہے گویا وہ اُستاد منگو کو اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

گورے نے سگریٹ کا دھواں نگلتے ہوئے کہا "جانا مانگتا یا پھر گڑبڑ کرے گا؟"

"وہی ہے" یہ الفاظ اُستاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگے۔

"وہی ہے" اس نے یہ الفاظ اپنے منہ کے اندر ہی اندر دہرائے اور ساتھ ہی اسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ گورا جو اس کے سامنے کھڑا تھا وہی ہے جس سے پچھلے برس اس کی جھڑپ ہوئی تھی اور اس خواہ مخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھی ہوئی شراب تھی، اسے طوعاً کرہاً بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔ اُستاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا بلکہ اس کے پرزے اڑا دیئے ہوتے مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور پر کوچوانوں پر گرتا ہے۔

اُستاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا "کہاں جانا مانگتا ہے؟"

اُستاد منگو کے لہجے میں چابک ایسی تیزی تھی

گورے نے جواب دیا "ہیرا منڈی"

"کرایہ پانچ روپیہ ہوگا" اُستاد منگو کی مونچھیں تھرتھرائیں۔

یہ سن کر گورا حیران ہو گیا۔ وہ چلایا "پانچ روپے۔ کیا تم ــــ؟"

"ہاں ہاں پانچ روپے" یہ کہتے ہوئے اُستاد منگو کا داہنا بالوں بھرا ہاتھ بھنچ کر ایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار کر گیا۔ "کیوں جاتے ہو یا بیکار باتیں بناؤ گے؟"

اُستاد منگو کا لہجہ سخت ہو گیا۔

گورا پچھلے برس کے واقعہ کو پیشِ نظر رکھ کر اُستاد منگو کے سینے کی چوڑائی نظر انداز کر چکا تھا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے۔ اس حوصلہ افزا خیال کے زیر اثر وہ تانگے کی طرف اکڑ کر بڑھا اور اپنی چھڑی سے اُستاد منگو کو تانگے پر سے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ بید کی یہ پالش کی ہوئی پتلی چھڑی اُستاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ چھوئی اس نے کھڑے کھڑے اوپر سے پست قد گورے کو دیکھا۔ گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اُسے پیس ڈالنا چاہتا ہے پھر اس کا گھونسہ کمان میں سے تیر کی طرح اوپر کو اٹھا اور چشم زدن میں گورے کی ٹھوڑی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے کر اس نے گورے کو پرے ہٹایا اور نیچے اتر کر اُسے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

ششدر و متحیر گورے نے سمجھا ہوا محسوس کر کے استاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اس کی آنکھوں میں شرارے برس رہے ہیں تو اس نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔ اس چیخ و پکار نے استاد منگو کی باہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا جو گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا

"پہلی اکتوبر کو بھی وہی اکڑفوں — پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں۔ اب ہمارا راج ہے بچہ!

لوگ جمع ہو گئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ استاد منگو ان دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی چوڑی چھاتی پھولی ہوئی سانس کی وجہ سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"وہ دن گزر گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے اب نیا قانون ہے میاں — نیا قانون"!

اور بے چارہ گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بے وقوفوں کی مانند کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔

استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ "نیا قانون" "نیا قانون" چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

"نیا قانون، نیا قانون، کیا بک رہے ہو — قانون وہی ہے پرانا"!

اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

غزل

ایم عقیل، شعبۂ اردو
بہادری کالج شموگہ

ان کی آنکھوں کو بھی دیکھا منور لوگو
آج آیا ہے سرِ بزم سخنور لوگو

ایک پگڈنڈی جو لہرا کے چلی
کتنی یادوں کے بچھا رکھی ہے د

کھول کر رکھ گیا اک پیکر الجھن کی
بے نوا شہر میں آیا ہے پیمبر لوگو

وہ کسک ہے جو جہاں دل میں گھر کر لی
نازک اندام پہ الزام ستمگر

جس گھڑی ذکر ترا سب کی زباں پر آیا
وہ گھڑی بن گئی صدیوں سے بہتر لوگو

اہلِ فن اپنی ہی کاوش سے لکھا
تم جسے کہتے ہو قسمت یا مقدر لوگو

کرب حالات کا اشعار میں ڈھالا گیا عقیل
اس کے قالب میں ہے لفظوں کا سمندر لوگو

غزل

احمد حسین شمس

چمن کے لئے جگ ہنسائی تو دیکھو
خزاں سے مری آشنائی تو دیکھو

درِ میکدہ پر وضو کر رہے ہیں
ذرا شیخ کی پارسائی تو دیکھو

نگاہوں سے تسخیر کرتے ہیں سب کو
حسینوں کی کشور کشائی تو دیکھو

اسے آج تک جان کر بھی نہ جانا
مری عقل کی نارسائی تو دیکھو

اساسِ حیات اصل میں پر نفس ہے
بہر سمت قصرِ ہوائی تو دیکھو

دمک ان کے چہرے کی گھونگھٹ سے چھلکے
جوانی کی یہ خود نمائی تو دیکھو

سرِ بزم ساقی کا منہ چومتے ہیں
ذرا شمس کی بے حیائی تو دیکھئے

دیوالی

کے مبارک تہوار پر

دلی

مبارک باد

قبول فرمائیے

ہم آپ کی ترقی خوشی، اور خوشحالی کے لیے
نیک خواہشات رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں
کہ ہمارا ملک اور ملک کا ہر باشندہ
خوش حال رہے

موہن گولڈ واٹر

ڈالی گنج۔ لکھنؤ۔ (یوپی)

تشنگی

ریحانہ تمنا کھاگانوی ۔ شیورت

مدتوں بعد ایک نوخیز کلی کا کنول کھلا تو باد[illegible] انے نور و نکہت نئے [illegible] رنگ اس کی جوانی میں بھر دیئے۔ شاخِ گل کی نزاکت اور نو شگفتہ کلیوں کی مسکان نے [illegible] سے نئی چمک دے دی تھی ہر کسی کی [illegible] اس کی شمعِ حسن کی ضو سے چکا چوند ہو جاتی، اسکی شریں گفتاری سے سنہری شعاعیں بھی شرماتی تھی۔ اس کا مسحور کن حسن کسی کو بھی دیوانہ بنانے کے لئے کافی تھا۔ وہ سراپا شہنازِ غزل تھی [illegible] کی جیتی جاگتی تخلیق۔ جو تصور و تخیل میں نہیں بلکہ ادب سے [illegible] عظیم ایک شریف النفس جوان رعنا سے مخاطب

عظیم صاحب میرا نہ اس [illegible] کے میرے پاس اور [illegible] دنیا والے حسن بکتے ہیں [illegible] جیت جھڑ کے موسم میں گرے [illegible] پتے کی طرح مجھے بے جان سمجھکر پیر گستوز بھی اڑاتے ہیں، [illegible] متعلق ہوں، میرے یوں کی دھجیاں اسی طرح روزانہ [illegible] کبھی بدچلنی کا الزام لگاکر اور میرے مرحوم شوہر کے قصیدے [illegible] ہیں [illegible] کے بھیڑیئے کی طرح مجھے گھورتے [illegible] اس کی بھی پرواہ نہیں کی آپ سے [illegible] بدچلنی تھی اور نہ ہوں ؟؟!

[illegible] سہیلی رفعت کی شادی میں آئی ہوئی تھی [illegible] رفعت ہی نے اسے عظیم سے متعارف کرایا تھا۔ وہ کوئی شادی کی [illegible] میں منہمک تھا۔ نفیسہ اور عظیم وقت گذاری کے لئے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے جس سے نفیسہ اپنے دل کے اندھیروں میں [illegible] کردی تھی اور عظیم نفیسہ کی ہر بات بڑے غور سے سُن رہا تھا۔"

نفیسہ آنکھوں میں آنسوؤں کے طوفان کو دبائے بڑی بے بسی سے کہہ رہی تھی عظیم صاحب میری ہر شام آرزوؤں [illegible] امنگوں کی آماجگاہ ہوتی تھی میری یہ [illegible] کی برات عالم خواب میں کیسے لٹی جو تجھ جو کس طرح اپنی ہی آرزوؤں کی قاتل بنی؟ میری راتیں سنہری مستقبل کے تصور میں گزرتی تھیں، میں نے کیسے کیسے خواب بُنے تھے، مگر زمانے کی ستم ظریفی نے مجھے ایسا مذاق کیا کہ میں بکھر کر رہ گئی کتنی سنگدل اور بے رحم ہے یہ دنیا جبکہ میں خوشبو کی طرح بکھر کر کھلی ہواؤں میں بہنا چاہتی تھی عظیم صاحب!" نفیسہ سسکی بھری"

شاید آج ہر وہ بات جو اس کے دل میں قیمتی خزانے کی مانند دفن تھی اُسے آنسوؤں میں بہا دینا چاہتی تھی۔

عظیم ایک شریف اور با اخلاق انسان کی طرح نفیسہ کو تسلی دے رہا تھا۔ مگر نفیسہ تھی کہ اُس کے آنسو دنیا کی ستم ظریفی کا ماتم کرتے ہوئے تھمنے میں نہیں آرہے تھے عظیم کی تسلیوں سے بھی نفیسہ کا جب دل ہلکا نہ ہوا تو عظیم نے خاموشی اختیار کرلی۔ کچھ دیر بعد نفیسہ بھی سسکیاں بھرتی ہوئی خاموش ہوگئی اور کچھ دیر بعد اس نے عظیم کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے زبان حال سے کہہ رہی ہو کیا تمہیں میری بے گناہی کا یقین نہیں آیا؟ ماحول کی خاموشی توڑتے ہوئے عظیم ایکدم کہہ اٹھا مگر شادی کے بعد اتنی جلدی ہی طلاق کی نوبت کیوں آگئی؟

نفیسہ نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا جس طرح نسیم سحری پھول بننے کے لئے گدگداتی ہے اور کلی کے پھول بن جانے کے بعد آرزو ہوتی ہے وہ کسی کے حجلۂ عروسی کی رونق بنے یا کسی کے گلے کا ہار۔ میں بھی جب کلی سے پھول بنی تو میری جوانی کی مہک میرے تمام رشتہ داروں میں پہنچی۔ اور جلد ہی دور کا کوئی رشتہ دار میرے لئے ایک رشتہ لیکر آگیا۔ میں بھی یہ سمجھنے لگی تھی کہ اب میں والدین کے لئے پریشان ہوں۔ والدین نے تھوڑی سی جانکاری کے بعد مجھے رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا۔

ویسے بھی ہر مذہب میں شادی کا رشتہ [illegible] رشتہ ہوتا ہے، اور میں جلد ہی اس [illegible] میں باندھ دی گئی اور جلد وہ گھڑی بھی آگئی جو ہر جوان لڑکی کے خوابوں کی تعبیر ہوتی ہے "والدین کا غم [illegible] کی شکل میں چھپا شاید انھیں ایک بیٹی کے والدین ہونے کی سزا مل رہی تھی، بہرحال نرگس کے کچھ جارہی تھی مگر آنسو تھے کہ برسات کی طرح برس رہے تھے۔ آخر مجھے سسرال روانہ کر دی گئی نئی دلہن ہونے کے ناطے مجھے سرآنکھوں پہ بٹھایا گیا سسر

باپ سے بڑھ کر پیار دیا تو ساس نے بیٹی سے بڑھ کر۔ میں سبھی کے دلی خلوص کے دائرہ میں سرشار تھی، مگر وہ دن میرے مجازی خدا جو میری زندگی کی کشتی کے پتوار تھے، وہ مجھ سے بجھے بجھے سے رہنے لگے، میں اُن کی شریک حیات تھی، ان کے ہر حکم پر مرمٹنے کو تیار تھی، مگر اُن کی سنجیدگی روز بروز بڑھتی اور کبھی ہنسی آتی کبھی نہ جانے کیوں مجھ سے سرد مہری سے پیش آنے لگے، میں نے اُن کی خوشنودی کے لئے ہر طرح پر حکمت آزمائی مگر بے سود۔ کبھی سوچا کرتی اللہ یہ کیسے مرد ہیں۔ میں اندر ہی اندر دل میں کُھٹتی جاتی، رفتہ رفتہ یہ نفرت کی چنگاری شعلہ بنتی گئی اور زبان کا نشانہ جو فحش گالیوں کی شکل میں بھیجتا میں تو حیرت تھی خدارا انکا ایسا سلوک کیوں ہے۔ میں نے تو انکی محبت کی کھیتی میں محبت بوئی مگر اُگ رہی تھی نفرت!۔

میرے کومل و نازک بدن میں رفتہ رفتہ شوہر کے خلاف نفرت کا زہر سرایت کرتا گیا، اب میں کچھ نڈر بھی ہو گئی تھی، مگر میرا دلیرانہ پن مارپیٹ کی شکل میں مجھ پر ہی مصیبت لاتا۔ مجھے اسطرح پیٹا جاتا گویا میں اسکی بیوی نہیں بلکہ سرکش جانور ہوں، میں صبر کے جام نوش کرتی رہی، اس لئے کہ شاید نفرت کے اندھیروں سے ایک دن خوشیوں کا اجالا نکلے، میں رفتہ رفتہ اسی جھیل کی طرح سوکھتی جا رہی تھی جو چلچلاتی ہوئی دھوپ کا شکار ہو۔،،

عظیم صاحب: جو گنگناتی گھٹائیں ساون اور بہاروں کے نغمات سنایا کرتی تھیں وہ میرے لئے کسطرح مرثیہ ہیں، میری امنگوں کے تاج محل کیسے ٹوٹے؟ کس طرح میرے ارمانوں کا سفینہ غرقِ دریا ہوا۔ نغمہ اپنے گرم گرم آنسوؤں کو اپنے صاف آنچل سے صاف کرتی ہوئی عظیم سے کہہ رہی تھی،

شاید غلطی اُن کی بھی نہ تھی، تھی تو میرے کاتب تقدیر کی جس نے میری زندگی کا شیش محل اتنی جلد چکنا چور کر دیا۔

ایک روز میں گھر میں صفائی کا کام کر رہی تھی سبھی چیزیں ڈھنگ سے سجا کر رکھ رہی تھی کہ چند کاغذات میرے ہاتھ آ گئے جو کسی پاگل خانہ سے تعلق رکھتے تھے، اور جسمیں میرے شوہر کا نام لکھا ہوا تھا، تب میں سمجھی کہ مجھے ایک پاگل شخص کے حوالے کر دیا گیا ہے، انکا کسی سے نہ ملنا، نہ اُن کے مزاج میں شوخی، ہر وقت سنجیدہ و غمگین رہنا، اور [illegible] بیٹھنا سب کچھ سمجھ میں آگیا، اور میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا کہ میں ایسے شخص کے ساتھ زندگی بتاؤں۔ اور پھر [illegible] والدین کے یہاں میرا قافلۂ حیات بوجھ بن کر آ گیا، اور میں جلد ہی "مطلقہ" بن گئی۔

عظیم نے نجانے کب سے اپنے جذبات کو سنبھالے ہوئے تھا آخر اُٹھا اور نغمہ کو اپنی باہوں میں لیتے ہوئے دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر ایسے ملے گویا ان میں ایک روح سما گئی ہو۔

"دور بہت دور سے شادی کی شہنائی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔!!

غزل

مقبول آلوڈی (بانس واڑہ)

زندگی میں اس کی فرقت رنگ کیا کیا لائے گی
روح آخر کار جا کر روح میں مل جائے گی
قلبِ مضطر آنکھ جویا، تم نگاہوں سے جدا
کیا محبت عمر بھر مجھ کو یونہی تڑپائے گی
آرزو کی چاندنی میں چاند کو دیکھا کئے
کیا خبر تھی تم نہ آؤ گے سحر ہو جائے گی
انکی آنکھیں خوں بہائیں گی وفاؤں پر مری
بعد میرے جب انہیں اپنی جفا یاد آئے گی
روح پھر سجدے کریگی آ کے قدموں پہ تیرے
عالمِ برزخ میں مجھکو جب تری یاد آئے گی
جس طرح فرقت میں تیری جل رہا ہوں روز و شب
اس سے بڑھ کر آتشِ دوزخ بھی کیا جھلسائیگی
دیکھنا مقبول جب ہونگی نگاہیں ان سے چار
زندگی اُس لمحہ اپنے آپ پر اترائے گی

جوابی خط لکھا کیجئے [illegible] آپ کو جواب [illegible] مل سکے جواب [illegible] کے لئے جوابی [illegible] ضروری ہے۔

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

"ہندی کے مسلمان شعراء" اور "آخری نظر"......تجزیاتی مطالعہ

ماہنامہ شانِ ہند (نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲) ایک ادبی جریدہ بھی ہے اور ایک تحریک بھی۔ اردو ادبیات سے وابستگی و بے پایاں عشق سے رسالہ ہذا کے مدیر سرکردہ لنوی کو اکثر و بیشتر اقتصادی مشکلات سے نبرد آزما ہونا پڑا ہے۔ مگر اردو ادبیات کو فروغ دینے کے لئے انہوں نے شانِ ہند کو ایک تحریک بنا دیا ہے۔ بالخصوص اس نقطۂ نظر سے کر نئے لکھنے والوں کو شانِ ہند ہمیشہ دستِ اعانت سے نوازتا رہا ہے اور اس سے ملنے والی پذیرائی نیز ہمت افزائی نے نہ جانے کتنے شعراء و ادباء کو معیار شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ اردو سے والہانہ عشق سے سرشار سرکردہ لنوی کو بطور ناشر بھی آنا پڑا۔ بہت سے گوہر شہوار سمندر کی تہہ میں پڑے رہ جاتے ہیں اور ان کے تو بیاں وہیں مٹ کر رہ جاتی ہیں دستِ اعانت سے محروم رہ جانے کی وجہ سے نہ جانے کتنوں کی ادبی خوبیاں تہہ ورقت میں غرق ہو کر رہ جاتی ہیں۔

رتن پنڈوری صاحب "فوری و بے فوری ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے شاعر بھی ہیں اور قابل توجہ ادیب بھی ہیں۔ "سیر مغفرت" ذکیہ منظوم مشہور سے ناآشنا تصنیف ہو کر رہ جاتی "آخری نظر" اور "ہندی کے مسلمان شعراء" جیسی در خود صد آفرین تصانیف بھی بغیر سرپرستی کاوش غیر مطبوعہ مسودہ سے کے علاوہ اور کیا ہوتیں۔

ہندی کے مسلمان شعراء ہر اعتبار سے گرانقدر ادبی تحفہ ہے جس کو ہر ادبی حلقے میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے پنجاب سرکار نے اس ادبی کاوش کو سراہا اور اس کی صد جلدیں خریدیں اگر یہ کتاب اردو میں شائع نہ ہو کر ہندی میں شائع ہوتی تو اس کی بے پناہ پذیرائی ہوتی ہوتی ہندی میں تحقیق کرنے والے کو ایسے مقالے پر ڈاکٹریٹ بھی مل سکتی تھی۔ یہ کتاب معمولی کتاب نہیں ہے بلکہ پیش کردہ موضوع پر ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔ ہندی زبان کی مختصر تاریخ "دوسری ہندوستانی زبانوں سے ہندی کا رشتہ" ہندی شاعری کی ترویج و ترقی میں مسلمانوں کی کارکردگی پر نہایت مبسوط و پر معلومات دروں بینی، محققانہ طرز و کاوش سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد رتن پنڈوری نے ہر دور کے مسلمان ہندی شعراء کے حالاتِ زندگی، نمونۂ کلام وغیرہ سے متعارف کرایا ہے۔ کم و بیش چار سو مسلمان ہندی شعراء کی بابت معلومات فراہم کرنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ مبارک ہیں وہ ادارے اور پرچے جنہوں نے تصنیف ھذا کی پذیرائی کی۔ قابلِ ترحم ہیں وہ اشخاص جو اپنے مضمرات ذہنی و ملوثات قلبی وجوہ پر اس کتاب کو دشمنی بھری نظر سے دیکھتے ہیں۔ "ہندی کے مسلمان شعراء" پر مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے دو ہزار روپیہ انعام، یا اور بہار اردو اکاڈمی نے تین ہزار روپیہ انعام کا اعلان دیا۔ دلی اردو اکاڈمی نے سنہ ۱۹۸۲ء کے بہترین کتاب کے سلسلہ میں ناشر کو دو ہزار روپیہ انعام دیا۔ اردو اکاڈمی اتر پردیش کی انعامی کمیٹی کی فرقہ پرستی نے اس کتاب کو صرف انعام کے قابل سمجھا۔

"آخری نظر" غزلیات، نظمیات، قطعات پر مشتمل دعوت فکر و نظر دینے والا مجموعۂ کلام ہے۔ رتن صاحب سادھو سنت ہیں۔ سنیاسی ہیں مگر ایسے گوشہ نشین نہیں ہیں، جو سماج سے منہ موڑ کر سماج پر بھاری بوجھ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ "دل بہ یار دست بکار" پر استوار فکر و نظر رتن سرگرم عمل رہی ہے اور اس طرح کہ نہ ستائش کی تمنا ہے نہ صلے کی پرواہ کلامِ رتن میں محراب و منبر سے روگردانی ہی ملتی ہے۔ ان کا شمار سور، تلسی، میرا، کبیر، رسکھان، سرمد ایسے شعراء ہی میں کیا جا سکتا ہے جو

کوئی کعبہ میں کوئی کاشی میں　　مدعی حق کے لئے پریشاں ہے
چشم باطن کھلی تو یہ دیکھا　　دل کے اندر وہ جلوہ ساماں ہے

بہت خوب "قارئین کو ہر صفحہ پر ایسے ہی منظوم خیالات ملیں گے۔ "آخری نظر" ختم ہے باقی عبادت اور آفاقی آدھیاتمک پر مرکز درگذر نظری، شاعر و ناشر دونوں داد و ستائش کے مستحق ہیں حالانکہ ان دونوں کو کبھی داد و ستائش کی تمنا نہیں رہی۔ کبھی صفحہ قیمت دونوں کتب نظر ریز ہے

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

جمنا کے دھارے

شام بارک پوری

صفحات: ۱۴۴ قیمت:- ۲۰ روپے۔

ملنے کا پتہ:- ماہنامہ شانِ ہند فلیٹ ۸ انصاری
یٹ ۔ دریا گنج ۔ نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۲

پدما کی موجیں ، میگھنا کی لہریں ، اور اب جمنا کے دھارے کتنے
رے ۔ کتنے سندر اور دلکش نام ہیں ان تینوں افسانوی مجموعوں
کے ۔ جیسے جھرنوں کی مدھر تان ، ندیوں کی گنگناہٹ ، ٹھنڈے
میٹھے چشموں کی روانی جیسے دھارے پر لہریں اور لہروں پر موجیں ۔
جمنا کے دھارے میں ۱۹ افسانے ہیں ۔ شروع میں حرفِ اوّل
۔ پھر خیر مقدم ہے ، دیباچہ ہے ، حرفِ آخر ہے ۔ ان کو لکھنے
لے چوٹی کے نقاد ہیں نلیب پر آراء ہیں
افسانہ نگار کے دل میں کسک ہے ۔ تڑپ ہے ۔ جو ادبھاتا
۔ وہ ماحول سے پریشان ہے بے چینی کی انتہا پر پہنچ کر یہ افسانے تخلیق
ئے ہیں کیونکہ ان میں رنج و غم درد و الم کرب و بیان ہے ۔ تلخی زندگی
ہے ۔

"اپنی جان بچانے کے لئے سرپٹ بھاگا ۔ وہ اپنے پیچھے
ان لوگوں کا فلک شگاف قہقہہ سن رہا تھا ۔ اسے محسوس
ہوا کہ آج کا ہر انسان بھاگ رہا ہے دنیا کے ایک کونے
سے دوسرے کونے تک ، قطب شمالی سے قطب جنوبی
تک جیسے کسی کو جائے پناہ نہ مل رہی ہو ۔ اور زندگی کی
طرح زمین بھی تنگ ہو گئی ہو ۔ (اجنبی جزیرے کا مسافر)

مچھیروں کی زندگی کی المناک کہانی سن کر دل میں اک
ہوک سی اٹھتی ہے ۔ اور سننے والوں کا دل دہل جاتا ہے ۔
یہ لوگ کتنی جفاکشی اور جواں مردی کی زندگی گزارتے ہیں ۔ جمنا
کی تیز لہروں کی پرواہ کئے بغیر اپنی زندگی کی بازی لگا دیتے ہیں
ان کی زندگی جرأت و عقلمندی کی نشانی ہے ۔ جو بیٹھے بٹھائے
اپنی روزی نہیں کماتے بلکہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
اپنا رزق حاصل کرتے ہیں"

(مچھیروں کی زندگی)

مصنف کو اپنی بات کہنے پر عبور حاصل ہے وہ طوفان سے کھیلتا
چلا جاتا ہے ۔ افسانوں میں حسنِ بیان ہے ۔ صاف ستھری زبان ہے
ہمکتے ہیں ۔ ڈرامائی انداز ہے ۔ قاری لطف لیتا ہے ۔ تحریر کی
روانی ملاحظہ ہو ۔

"جلد ہی رات کی دیوی نے شام کو نگل لیا جمنا کسی
دیوی کی طرح غضبناک ہو کر چنگھاڑ رہی تھی ۔ لہریں
آسمان سے باتیں کر رہی تھیں ۔ ایسی موسلادھار بارش
ہوئی جیسے آسمان پھٹ گیا ہو ۔ بجلی کی چمک ایسی تھی
جیسے کوئی شمشیر برہنہ میدان کارزار میں کود پڑی ہو ۔ بادل
کی گرج جیسے کسی نے توپ کے دہانے کھول دیئے ہوں
لہریں موت کی دیوی کی طرح پر پھیلائے جزیرے پر حملہ آور
تھیں" (جمنا دھیرے بہو)

قیمت زیادہ ہے کتابت طباعت اچھی ہے رام لال نابھوی

گگن کا "مذاہبِ عالم نمبر"

رفیق دہلوی

ماہنامہ گگن ایک منفرد قسم کا رسالہ ہے اس کا اپنا ایک انداز ہے جو عام رسالوں سے مختلف ہے شہری اور دیہاتوں نے انڈین ایکسپریس دہلی کے ۲۴ ستمبر کی سوموار ڈائری میں شمس کنول ایڈیٹر گگن کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ جناب سردار دیوان سنگھ مفتون کے اخبار "ریاست" میں بھی ان کے ساتھ کام کر چکے ہیں یعنی ایک طرح سے وہ شمس کنول کے اُستاد ہوئے۔ شمس کنول صاحب کی تحریر میں بھی بے باکی جرأت اور اقدام ہے وہ جس بات کو صحیح سمجھتے ہیں اسے دلیل کے ساتھ اور بلا مارکی زار دے کر پیش کرتے ہیں۔ ماننا نہ ماننا ایک الگ بات ہے۔ ایسی صورت حال سے تو نبی، پیغمبر، پیر، ولی کوئی بھی بچا ہوا نہیں تھا۔ مصلح معاشرے اور ادیب چونکہ عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ حساس اور دور اندیش ہوتے ہیں اس لئے وہ آنے والے حالات کو بہت پہلے محسوس کر لیتے ہیں اور اسی لحاظ سے عوام کو نصیحت کرتے ہیں۔ پڑھا لکھا اور سنجیدہ طبقہ ان کے خلوص پر یقین رکھتا ہے۔ اور نصیحت پر خواہ عمل نہ کرے لیکن پشت پناہی ضرور کرتا ہے۔ اور اپنے ہی حال میں مست رہنے والے مخالفت بھی کرتے ہیں اور تنقید بھی۔

بہر حال اس وقت ہمارے سامنے گگن کے "مذاہب عالم نمبر" ہے جو اپنی ضخامت اور مواد کے اعتبار سے اتنا پھیلا ہوا ہے کہ کسی ایک تبصرے میں اس پر تفصیلی بات چیت نہیں کی جا سکتی۔ اس نمبر کی سب سے اہم خصوصیت تو یہ ہے کہ قومی یک جہتی اور محبت و اخوت کے لحاظ سے یہ ایک بے حد کارآمد چیز ہے۔ اور وقت کی ضرورت کو ملحوظ رکھا جائے تو بے مثال کارنامہ ہے۔

اس میں موضوع کے لحاظ سے سترہ باب ہیں جن میں سے چند کا ذکر کریں گے۔ باب "آگہی" کے عنوان جو حصہ دیا گیا ہے اس میں تمام بڑے مذاہب، دھرم کا تفصیلی تعارف دیا گیا ہے۔ نہ صرف ان کا تعارف بلکہ ان میں موجود مختلف فرقے اور جماعتوں کا بھی ذکر ہے۔ جیسے اسلام، عیسائیت، ہندو دھرم، یہودیت، پارسی، بدھ مت، جین مت وغیرہ۔ پھر ان کے مختلف فرقے مثلاً اسلام میں، خوجہ، بوہری، میمن، شیعہ، دین دار، سنوسی تحریک، صوفی ازم۔ اور ہندو دھرم میں برہمو سماج، تنتر اسلام، آریہ سماج، تھیوسوفیکل سوسائٹی اور علاقائی ہندو ناتیں۔ اسی انداز سے [illegible] دیا گیا ہے ان تمام اہم مذاہب کے۔

شروع میں مذہب یا دھرم کے بانی یا بزرگ کا تعارف کیا ہے حضرت عیسیٰؑ، حضرت موسیٰؑ، شری رام چندر جی، مہاتما بدھ، حضرت گرونانک اور حضرت محمد صلعم۔ اس طرح کی ایک اور خوبی کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ ہر مذہب اور دھرم کا تعارف اسی مذہب کے کسی عالم اور سنجیدہ شخصیت نے کرایا ہے۔ تاکہ بالکل صحیح معلومات حاصل ہو سکے۔ ان علماء میں [illegible] اکبر آبادی (اسلام) ڈاکٹر ہیرالال چوپڑا (ہندو دھرم) فادر [illegible] (عیسائیت) شیلم سیموئیل (یہودیت) بھکشو [illegible] (بدھ مت) چندن مل چاند (جین مت) بی کے کرنجیا (پارسی) پروفیسر [illegible] آہوجہ (سکھ دھرم) جیسی بلند ہستیاں ہیں۔

"علم و عرفان" کے تحت جو مواد دیا گیا ہے اس میں ملک اور بیرون ملک کے عالموں ادیبوں صحافیوں دانشوروں نے مذاہب کے بارے میں خیالات پیش کئے ہیں۔ مختلف تحریکوں پر لکھا ہے۔ اور مذہب پر تاریخ، جغرافیہ، سائنس کے اثرات بھی بتائے ہیں۔ اسی باب میں مقدس کتابوں (رامائن، گیتا، انجیل کی تشریح) پر بھی مفصل مضامین ہیں۔ مذہبی رواج ماقبل تاریخ کے مذہب، مذہب اور طب، قدیم مذاہب، ذکر [illegible] عہد نبوت میں دنیا کے حالات، شجرہ آل رسولؐ، مختلف مذاہب میں [illegible] کا تصور، ماہ نامہ نیرنگ خیال لاہور کا رامائن نمبر، ہندو فلسفہ زندگی جیسے معلومات اور دلچسپ مضامین بھی ہیں۔ یہ صرف چند کا ذکر ہے۔ ایسے [illegible] مضامین ہیں۔

اس وقت ساری دنیا کے دانشور اس بات پر متفق ہیں کہ دنیا کے انسانوں کو انسان ہونے کے ناطے ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھنا چاہیئے اور مذہب کو محبت کے لئے استعمال کرنا چاہیئے۔ مذاہب عالم نمبر میں اس چیز کو "ایشور اللہ تیرے نام" سے پیش کیا گیا ہے۔ بے حد اہم اور ہمارے نزدیک بہت مقدس باب ہے۔ اس میں قومی عالمی بھائی چارہ اور سیکولر مزاج رکھنے والے ان نیک باطن نیک صوفیوں، سنتوں، بھگتوں، ولیوں، پیروں، فقیروں کا ذکر ہے [illegible] کا پیغام دیا۔ ان سب کے [illegible] خاکے ہیں۔

گئے ہیں۔

"یہ سلطنت شہر" باب میں دنیا کے تمام قبائل کا ذکر ہے۔ اور "تاریخ عالم تمام مذاہب کے تہوار اور رسوم کا حوال ہے۔ "عالم میں انتخاب" کے مقدس تاریخی شہر جو مختلف مذاہب کے لحاظ سے ساری دنیا میں ہیں کا ذکر ہے۔

اس نمبر کا ایک اور اہم باب ہے "نقطۂ حکایت" یہ مذہبی ... ہے یعنی تمام مذاہب کی مذہبی اصطلاحات دے کر ان کی وجہ اور تعارف دیا گیا ہے جیسے، کاشتری، اگوری، کنتھا، کبود، مکلپ، اربندو، ... لیپا، ہشت دھہزار، عالم، جلی قاسیون، چلہ خشب، نخل مریم، ... گشتاسپ، اصحاب اخدود، بیت العتیق، رسول اللہ کی چو...، اصحاب صفہ، یوپا شا، وجودی، غلان بل فور، شمشیر دل سپہ رڈ، ... وش کوش، زابلی، راجوتنال، ذیذ سیما، اسکوئیل سینٹ آگسٹائن، ... ہرنیا کیسپو وغیرہ وغیرہ۔ یہ فرہنگ تقریباً ڈیڑھ سو صفحات میں ہے ... بہت انگیز انکشافات کی حامل ہے۔

دراصل گگن کا "مذاہب عالم نمبر" ایک طرح سے مذہبی انسا... ئیکلوپیڈیا ہے۔ جو ریسرچ اسکالرس کے لئے ایک بے حد قیمتی اور مفید کتاب ثابت ہوگی اور ان علمی ذہن رکھنے والے مطالعے کے شوقین افراد کے لئے بیش قیمت تحفہ ہوگا۔ جو فراخ دلی سے ہر قسم کی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

۱۲۴۶ صفحات کا یہ ضخیم نمبر ایک سو پچاس روپئے میں مناسب ... دے کر ایک عمدہ چیز حاصل کرنا ہے لائبریریوں اور علمی اداروں کے لئے اس نمبر کی قیمت 175/- روپے ہیں۔ منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ... مندرجہ ذیل پتہ سے منگوایا جاسکتا ہے۔

ماہنامہ گگن میگزین معرفت اکمل پرفیومرس۔ 6/A نواب مسجد مہاراشٹر بمبئی ۳ ۔ دفتر شان ہند سے بھی طلب کیا جاسکتا ہے۔

... اور ساغر نظامی تشریف لائے ہیں۔ جناب ساغر نظامی محترمہ ... اللہ نیر۔ جناب گوپال متل، بانو طاہرہ سعید صاحبہ، جناب ظفر ... صاحب، سعدی دہلوی، جناب شہریار پروانہ اور آخر میں جناب ... صاحب نے ان سامعین کے ذوق شعری کی پیاس خوب بجھائی ہے۔ اور خوب خوب ... ہے۔ اور سامعین بیچ یہ یادگار محفل ختم کردی گئی ہے۔

نقوشِ یکجہتی

توصیف علوی

ماتی

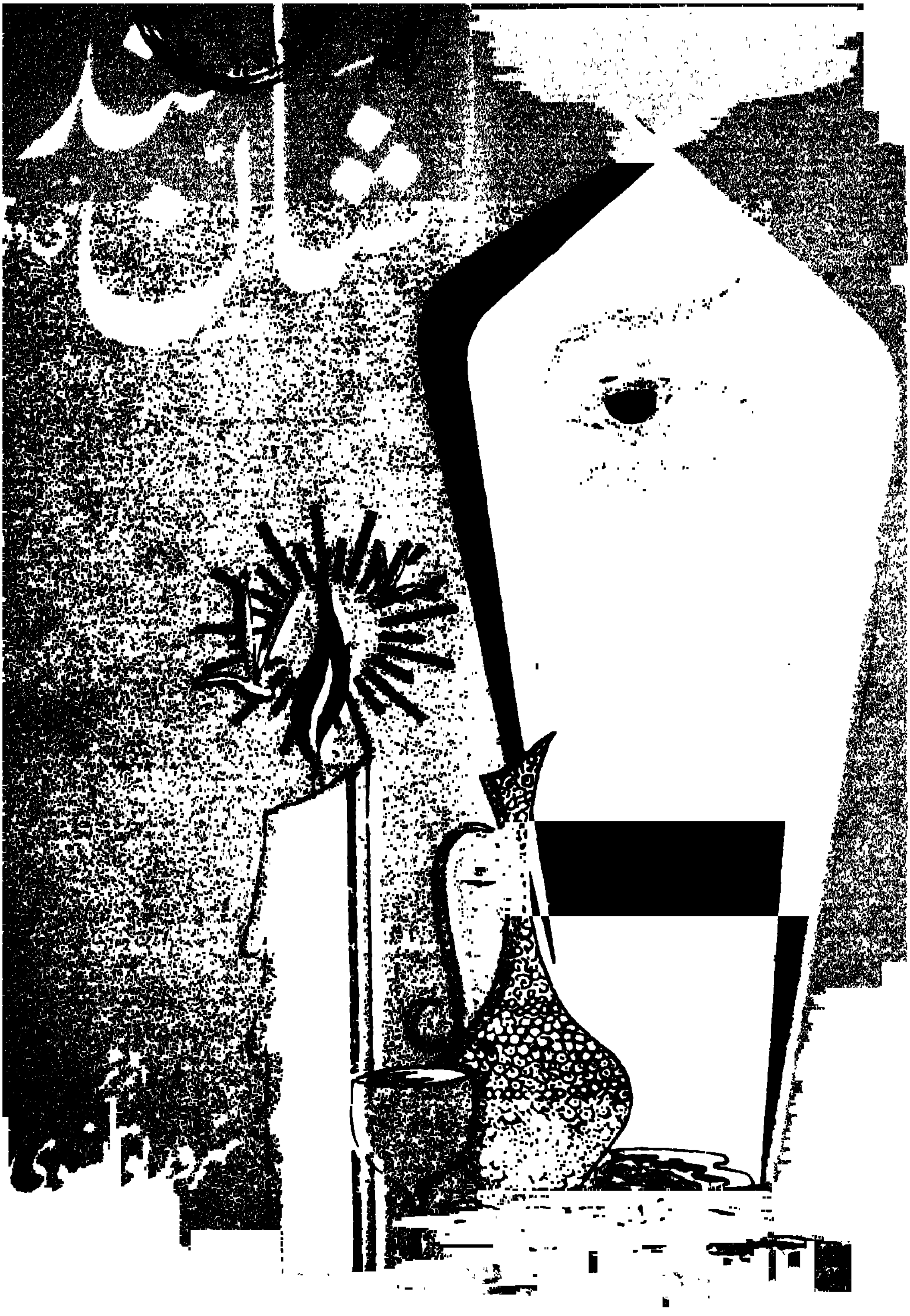
بی۔ اے

کرانوی

رنگ پھولوں کے جدا صحنِ گلستاں ایک ہے
ہیں فضائیں نو بہ نو فصلِ بہاراں ایک ہے
مختلف جام و سبو ماناکہ ہیں رندوں کے پاس
ایک لیکن میکدہ ہے بزمِ رنداں ایک ہے
نام ارباب جنوں کے ہیں جدا گانہ تو کیا
ایک ہے ذوقِ جنوں چاکِ گریباں ایک ہے
دیر اور کعبہ کی راہوں کی الگ سمتیں سہی
ایک ہے سجدہ ... کا محور اے عزیزاں ایک ہے
ہیں اگرچہ مختلف ہر سو گرفتاران شوق
ایک ہیں زلفوں کے خم گیسوئے جاناں ایک ہے
طالبانِ فکر کے انداز ہیں گو مختلف
ایک ہے جہدِ طلب صحنِ دبستاں ایک ہے
یوں تو پیراہن الگ ہیں اور پیکر ہیں الگ
ایک ہے ہر روح قالب جانِ جاناں ایک ہے
کون ہے کس طرح بسمل یہ رہی فطرت کی بات
ایک ہے دل کی خلش سینہ میں پیکاں ایک ہے
دل کے گوشوں نہ دیکھو وہ جداگانہ ہی سہی
ایک ہے لیکن تڑپ دنیائے ارماں ایک ہے
گو الگ انداز سے دیتا ہے مانا ہر چراغ
ایک ہے بزمِ طرب شانِ چراغاں ایک ہے
ہم نے مانا پیکر کا ہے الگ سارنگ ...
ایک ہے نبضوں کی حرکت خونِ انساں ایک ہے
ہر طرف بکھرے ہیں تارے آسماں پہ بےشمار
ایک ہے چرخ کہن ماہِ درخشاں ایک ہے
گرچہ رکھتا ہے الگ ہی دھن ہر اک فرہاد و قیس
ایک ہے رنگِ جنوں صحنِ بیاباں ایک ہے
چاہے ہوں رنگ سخن شیخ و برہمن کا جدا
ایک لیکن درسِ گیتا، درسِ قرآں ایک ہے
یوں تو ہے ماتی جدا ہر ایک اہلِ فن کا رنگ
ایک دل کی دھڑکنیں ہیں سوزِ پنہاں ایک ہے

OCTOBER
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002
Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57





ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۸۰۰	رجسٹرار آف نیوز پیپر رسالہ ہٰذا کا رجسٹریشن نمبر ۵۷/۰۵ ۲۲۴۴	رجسٹرڈ نمبر ڈی ۰۰۶۰/۲۲۴

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
واعظ پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ماہنامہ

ہر ذرۂ وطن ہے یہ فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
فیاض کوہ شاری

شانِ ہند
نئی دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

فی پرچہ ۵۰/ پیسے
زرِ سالانہ ۔ ۶/ روپے

جلد نمبر ۴۵ | نومبر سنہ ۱۹۸۴ء | شمارہ نمبر ۱۱

- ریاست تامل ناڈو کی سرکار ہر مہینے میں پچاس بوری شکر گرو وایور کے کرشنا مندر کے لئے الاٹ کرتی ہے. اس مندر کا یہ رواج ہے کہ اس کی مورتیوں کو کھیر کا بھوگ لگایا جاتا اور کھیر ہی کے لئے سرکار شکر الاٹ کرتی ہے.
- جو خلق کو پرے ہٹا کر خالق تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ خلق اور خالق دونوں کی محبت سے محروم رہتے ہیں۔ (مولانا رومؒ)
- اگر انسان کی نیت میلی ہے تو تیرتھوں میں جا کر تن صاف کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ــــــــــ (گورونانکؒ)
- اے بندے! تو مجھے کہاں ڈھونڈھتا ہے میں تو تیرے پاس ہوں. میں نہ مندر میں ہوں، نہ مسجد میں، اور نہ کیلاش میں! (سنت کبیر)
- خوف کی بنیاد پر جو تنظیم ہو گی وہ انسان کو مجبور بنا دے گی۔ وہ نماز نماز کیا جو دوزخ کے ڈر سے یا جنت کے مزوں کی اُمید میں پڑھی جائے۔ لوگ مذہب کی پابندی زیادہ تر دوسروں کے دکھاوے مرعوب کرنے یا ملامت دہنای کے ڈر سے کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ بزدلی ہے یا مکاری ــــــــــ (قاضی عبدالغفار)
- بزرگاں دین حاجی شریعت اللہ نے توبہ کی تحریک شروع کی تھی ایک بار اپنے گاؤں جا رہے تھے کہ راستہ میں ڈاکوؤں نے ان کا سارا سامان اور کتابیں لوٹ لیں. جب زندگی کا تمام اثاثہ لٹ گیا تو حاجی صاحب ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہو گئے اور کچھ دن ڈاکوؤں کے ساتھ رہ کر خود بھی ڈاکو بن گئے۔ مگر اپنے روزہ نماز کے معمولات کو جاری رکھا اور تبلیغ بھی ہوتے رہے حاجی صاحب کے اس استقلال سے وہ سب ڈاکو بہت متاثر ہوئے اور آخر کار ان ڈاکوؤں نے بھی اپنے گناہوں اور گناہ آمیز زندگی سے توبہ کر لی اور وہ سب حاجی صاحب کی توبہ تحریک میں شامل ہو گئے۔

مہتمم و پبلشر سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے لیتھو کے صفحات خواجہ پریس چتلی قبر سے چھپوا کر جامع مسجد دہلی سے شائع کیا ۔ ادیب سرور تونسوی دفتر ناشر پائیلٹ

کتاب سے بڑھ کر کوئی اچھا ساتھی نہیں

انتشار کا ترکی ترجمہ	سید ظہیر الدین	۴/۵۰	تحریک خلافت	قاضی محمد عدیل عباسی	۱۱/۵۰
حیات جاوید (دوسرا ایڈیشن)	الطاف حسین حالی	۳۰/۰	تشریح الہیکل (علم الابدان)	سید محمد کمال الدین	۱۱/۰
عصمت عظیم آبادی	اسما سعیدی	۱۸/۰	تیمارداری	حسین فاروقی	۱۲/۵۰
شعریات	شمس الرحمن فاروقی	۵/۲۵	تطہیری علاج	حسن امین احمد	۶/۰
اردو غزل کی تعلیم	اختر انصاری	۱۰/۲۵	یونانی ادویہ مفردہ	حکیم سید صفی الدین علی	۷/۵۰
کلیات ذوق	مرتبہ: تنویر احمد علوی	۲۰/۵۰	چھ عام بیماریاں	حسین فاروقی	۳/۵۰
نصیحت نامہ	نایف: ترقی اردو بیورو	۷/۰	بچے کی صحت	شمیم نکہت	۵/۷۵
قدیم دہلی کی آخری بہار	مرزا اصغر حسین	۲۷/۰	سرطان کیا ہے؟	محمد برہان حسین	۷/۰
ہندوستان کے ادبی معرکے	محمد یعقوب عامر	۲۳/۰	تشریح الاعضاء	حکیم سید کمال الدین	۱۹/۵۰
آدمی میں چراغ	خواجہ غلام السیدین	۱۳/۰	موجز القانون	کوثر چاندپوری	۲۶/۷۵
ہندوستانی ادب کی تنقیدی تاریخ	سید احتشام حسین	۱۴/۷۵	امراض انسان	حکیم خورشید احمد	۳۴/۰
رنگین نثر کا انتخاب	سیدہ جعفر	۹/۵۰	کلیات میر	مرتبہ: ظل عباس عباسی	۵۲/۰
کلیات سراج	سراج اورنگ آبادی	۴۴/۰	پریم چند کی کہانیاں	جوگندر پال	۱۰/۰
زبان و قواعد	رشید حسن خاں	۱۸/۷۵	بابرنامہ	محمد قاسم صدیقی	۴/۰
لسانی مطالعے	گیان چند جین	۸/۵۰	حالی	صالحہ عابد حسین	۴/۵۰
نئی اردو قواعد	عصمت جاوید	۱۷/۰	خواجہ میر درد	ظہیر احمد صدیقی	۴/۵۰
تاریخ جہانگیر	رحم علی الہاشمی	۱۷/۷۵	اکبر الہ آبادی	صغرا مہدی	۳/۵۰
تاریخ شاہجہان	سید اعجاز حسین	۱۲/۰	غبار خاطر	ابوالکلام آزاد	۴۰/۰
جنوبی ہند کی تاریخ	آر، کے بجنائر	۲۲/۰	تذکرہ	ابوالکلام آزاد	۲۵/۰
حیدر علی	اقتدار حسین صدیقی	۱۷/۰	خطبات	ابوالکلام آزاد	۳۰/۰
خلجی خاندان	محمد یسین مظہر صدیقی	۱۶/۰	دیوان غالب	مرتبہ: مالک رام	۱۲/۵۰
رنجیت سنگھ	کیلاش چندر چودھری	۹/۲۵	یادوں کی برات	جوش ملیح آبادی	۴۰/۰
سلاطین دہلی کا سیاسی نظریہ	سید جمال اشرف	۱۲/۰	شیشے کی چٹان	سراج انور	۲۰/۰
کتاب کی تاریخ	شایان تمدنی	۳/۵۰	خاک دل	جاں نثار اختر	۲۵/۰
اکبر سے اورنگ زیب تک	جمال محمد صدیقی	۲۱/۵۰	ایک خوشبو ہزار دیوانے	کرشن چندر	۱۵/۰
ہمایوں نامہ	عثمان حیدر مرزا	۶/۲۵			
شیر شاہ اور اس کا عہد	رام آسرے شرما	۳۳/۰			

بُلبُل چہ گفت بگُل چہ شنید؟ وصبا چہ کرد؟

راجیو گاندھی کے نام کھلا خط

"بھارت ماں" شریمتی اندرا گاندھی کی شہادت کے بعد کانگریس کے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کی متفقہ سفارش سے راشٹرپتی جی نے آپ کو ہندوستان کے وزیر اعظم کے عہدے کا حلف دلایا۔ اس کے بعد کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کی ایگزیکیٹو کے علاوہ جنرل باڈی نے بھی آپ کو پارٹی لیڈر منتخب کر لیا۔ سچ پوچھئے تو عرض کیا جائے کہ کانگریس کے ان ذمہ داران اونچان کا یہ متفقہ فیصلہ ایک تاریخی فیصلہ ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ کانگریس کے ہر ذمہ دار رکن نے اس فیصلہ کی تصدیق کر کے ملک کی صحیح رہنمائی کی ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ چنانچہ ایک ہندوستانی شہری کے ناطے مجھ ناچیز کی بھی مبارکباد قبول فرمائیے۔

بھارت ماں کی شہادت کے بعد ملک بھر میں خصوصاً دلی میں جو تشدد پھوٹ پڑا اُس پر قابو پانے کے لیے آپ نے دکھ بھرے لمحات میں جب کہ بھارت ماں کا بے جان شریر تین مورتی بھون میں رکھا ہوا تھا۔ جو قدم اُٹھائے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ملک کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی نے آپ کو اپنا لیڈر تسلیم کرنے میں کوئی غلطی نہیں کی۔

لفٹنٹ گورنر گواتی کی جگہ فوری طور پر جناب ایم۔ ایم۔ کے دلی کا لفٹنٹ گورنر مقرر کیا جانا رات کے ایک بجے سے صبح کے ساڑھے سات بجے تک فساد زدہ علاقوں میں آپ کا بنفسِ نفیس تشریف لے جانا اور بھارت ماں کی آخری رسوم کے فوراً بعد فساد زدہ علاقوں میں دوبارہ تشریف لے جانے سے تشدد میں جو کمی ہوئی اور آپ نے دیگر سخت اقدام جو اس سلسلے میں اُٹھائے اُن کے نتیجے میں سیاسی اشتعال انگیزی حرکت میں آئی اور ساجد صاحب کی فضا تو تعمیر کم وقت میں معمول پر آگئی اور اس وقت ہر نو مبر کشمیر لیڈر ...

اس مشکل وقت میں جو ذمہ داری سنبھالی اس سے ملک کے ہر شہری کو یقین سا ہو چلا ہے کہ جو عظیم ذمہ داری آپ کے کندھوں پر ڈالی گئی ہے اُسے آپ بطریق احسن نبھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

مجھے سوگیہ پنڈت موتی لال نہرو کے بقدم بوسی کا بھی شرف ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے تو ہر ہندوستانی کے دل پر حکومت کی اور مجھے فخر ہے کہ ایک صحافی کی حیثیت سے مجھے ان کی خدمت میں چند بار حاضری کا موقع ملا۔ بھارت ماں شریمتی اندرا گاندھی کے تو مجھے جب بھی کوئی گزارش کرنی ہوتی تھی تو میں صرف پی۔ اے۔ یا سکریٹری سے دریافت کرنے کے بعد کہ وہ دہلی میں قیام فرما ہیں صبح آٹھ بجے آپ کی اسی رہائش گاہ پر پہنچ جاتا تھا اور اپنا مدعا ان سے بیان کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آتی تھی۔ میری التجا پر انھوں نے کئی بار اپنے ساتھ تصویر کھنچوانے کی اجازت دی آپ کے والد محترم جناب فیروز گاندھی صاحب سے بھی چار پانچ بار ایک صحافی کی حیثیت سے ملاقات کرنے کا اعزاز ملا۔ اور مجھے دلی خوشی ہے کہ پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، شریمتی اندرا گاندھی، اور فیروز گاندھی کی عظمت آپ کو ورثہ میں ودیعت ہوئی ہے۔ اور عالم بالا کی بہ حیات افراد ان سب کی مقدس روحیں آپ پر پھول برسا رہی ہیں۔ اور آپ کی درازیٔ عمر اور صحت و ثبات کے لئے خدا کے حضور میں سرِ نیاز جھکا کر دعائیں کر رہی ہیں۔ اور ان دعاؤں میں ہندوستان کا ہر وہ باشندہ ہے جسے اپنے ملک کی حفاظت کا احساس ہے یا جسے اپنا ملک پیارا ہے اور جو اپنے ملک کو امن و امان سے ترقی کی منزلیں طے کرتے دیکھنا چاہتا ہے شامل ہے اور دل و جان سے چاہتا ہے کہ ہندوستان آپ کی قیادت میں ایک ایسا مضبوط اور ترقی یافتہ ملک بن جائے جس کی طرف کوئی دشمن غلط نظر سے نہ دیکھ سکے

آیا واجب الادا آپ سے ہے

اب میں کچھ ایسی معروضات خدمت عالیہ میں اس لئے غور کے قابل پیش کرنا چاہتا ہوں جو یقیناً آپ کو اور عوام کو پسند آئیں گی۔ بلکہ مجھے امید ہے کہ آپ ایسا متین، سنجیدہ، شریف، با اخلاق مزاج اور انسانیت شناس وزیر اعظم ان پر مناسب دھیان دے گا اور ایک مثالی وزیر اعظم کی حیثیت سے دنیا میں شہرت پائے گا۔ میرا دل یہ گواہی دے رہا ہے کہ جس عقیدت، نیک نیتی اور خلوص کے نیک جذبے سے میں یہ معروضات خدمت عالیہ میں پیش کرتا ہوں آپ اس پر کسی قسم کا شک نہ کریں گے۔

ایک یورپی مصنف غالباً "بائرن" نے کئی کتابیں ان موضوعات پر لکھی ہیں۔

"کسی ملک کا صدر کیسا ہونا چاہئے؟" "کسی ملک کا وزیر اعظم کیسا ہونا چاہئے؟" اس کتاب میں ایک ضمنی باب تھا۔ "اگر وزیر اعظم خاتون ہو تو اسے کیسا ہونا چاہئے؟" اسی قسم کے مختلف موضوعات پر بارہ مختلف کتابوں کا مجموعہ سیٹ مرحوم برہم ناتھ دت قیصر امرتسری کی ذاتی لائبریری میں تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین اس وقت کے صدر جمہوریہ ہند کی خدمت میں "کسی ملک کا صدر کیسا ہونا چاہئے" کتاب بھجوائی تو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے (جو قیصر صاحب کے قلبی دوست تھے) کتاب پڑھنے کے بعد جب قیصر صاحب کو یہ کتاب واپس بھجوائی تو اپنے مکتوب گرامی میں لکھا کہ میں ذاتی طور پر آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے ایسی مفید کتاب مجھے مطالعہ کے لئے بھجوائی۔ یقین فرمائیے کہ میں ہر ممکن کوشش کروں گا کہ ایسا صدر ثابت ہو سکوں جس کی نشان دہی اس کتاب میں کی گئی ہے۔ قیصر صاحب نے دوسری کتاب "کسی ملک کا وزیر اعظم کیسا ہونا چاہئے" آپ کی والدہ محترمہ اندرا گاندھی کی خدمت میں بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ بھجوائی۔ یہ کتاب یقیناً پرائم منسٹر سکریٹریٹ لائبریری میں موجود ہوگی۔ اگر آپ تکلیف فرما کر اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں تو یقیناً آپ کے لئے یہ کتاب ایک اچھے رہنما کا کام دے گی۔ دعاؤں کے ساتھ، کیونکہ اس کتاب میں اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ جب کہ وزیر اعظم نوجوان ہو — یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ ہندوستان کے تمام سابقہ پردھان منتریوں بلکہ دنیا بھر کے وزیر اعظموں میں آپ سب سے کم عمر ہیں۔ اس لئے اس کتاب کا مطالعہ آپ کے لئے اور بھی ضروری ہے۔

محترم وزیر اعظم

اس کتاب میں ہر وزیر اعظم کے لئے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ ہر قسم کے خوشامدیوں سے نہ صرف بچے بلکہ ان کی حرکات و سکنات سے بھی پوری طرح سے باخبر رہے۔ جس زمانہ میں یہ کتاب لکھی گئی اس وقت غالباً مصنف کے ملک میں خوشامد کی بدعت موجود نہیں تھی اس لئے مصنف نے "خوشامد" کے موضوع پر تفصیل سے نہیں لکھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کا یہ بیان نہ محض اردو ادب تک ہی اپنا مطالعہ محدود رکھتا ہے۔ اور آپ نے تو انگریزی ادب کا بغور مطالعہ فرمایا ہوگا۔ مگر "خوشامد" کے بارے میں۔ اردو، فارسی اور عربی ادب میں جو تفصیل سے لکھا گیا ہے اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ خوشامد نے کئی تاجداروں کے سفینے ڈبوئے ہیں۔ دیمک ہے خوشامد۔ بادشاہ کو رعایا سے۔ آجر کو مزدور سے، اور راہنما کو عوام سے دور رکھتی ہے۔ خوشامد ایسا زہر ہے جو کسی کے جسم میں سرایت کر جائے تو خودستائی اس کی فطرت بن جاتی ہے۔ یہی انسانی کمزوری ہے کہ وہ اپنی تعریف کرانے سے خوش ہوتا ہے۔ جیسے عورت اپنی پسند کا زیور پہن کر شاداں و فرحاں ہوتی ہے۔

محترم آپ کے قیمتی وقت کا مجھے احساس ہے۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ خوشامد کے سلسلے میں آپ کی کچھ اور سمع خراشی کروں براہ کرم ذیل کی تحریر پر مناسب دھیان دیجئے کیونکہ یہ تحریر "خوشامد" کی تاریخ ہی نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جسے آج تک کوئی جھٹلا نہیں سکا۔

"خوشامد کے معنی چاپلوسی یا چاپلوسی سے مخاطب کو مرعوب کرنا خوشامد آمریت کی غذا کوکھ سے نکلی۔ ملوکیت۔ اور آمریت کے محلوں میں جہاں انسانیت کی بربادی کے لئے اور سازشیں پرورش پاتی رہیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی۔ ملوکیتی درباروں میں موقع پرستی اور شخصیت پرستی بھی یوں کہ جیسے صدیوں کا عمل اسے راس آیا۔ اور یہ بہت مدت پروان چڑھتی رہی۔

مسلم پیریڈ کے بعد جیسے ہی دیوانی سلطانی کا خوف تبدیل ہوئیں اور باقاعدہ سلطنتیں بن گئیں دیوان خانوں کی زینت تو خوشامدی درباریوں، نورتنوں، مصاحبین اور قصیدہ خوانوں سے

رفتہ رفتہ درباری زندگی کا جزو بن کر حضوری کے مستحقین عالی
شان والے محلوں کی زینت بن گئی۔ ایسے حیا خوشامد کے بغیر
اپنے اندر شدید کمی محسوس کرنے لگے یہاں تک کہ ملوکیت اور
خوشامد لازم و ملزوم بن گئے۔ تاریخ عالم کے اوراق گواہ ہیں
کہ رعونت اور خشونت سے بھرپور آمر مطلق کا شاید ہی کوئی دربار
اس خرافت سے مبرا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک سلطانی
محلوں کے اندر زمین و آسمان کے قلابے ملا کر آمر مطلق کی حمد تک
مدح سرائی نہ کی جاتی اور خوشامد کا پُر جمال نشہ آور جام
مصاحبوں اور قصیدہ خوانوں کے ہاتھوں آمیز تحسین کے مرکب
میں حل کر کے پلایا نہ جاتا اس وقت تک وہ امور سلطنت میں
دلچسپی نہ لیتا۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ مغل شہنشاہ شاہجہان کے عہد
میں جب ایرانی وفد ہندوستان آیا تو ایک ایرانی نمائندے
نے شاہ سے سوال کیا کہ آپ شہنشاہ ہند ہیں مگر لقب شاہجہان
ہے لیکن نواب سعد اللہ خان چنیوٹی نے جو انتہائی زیرک وزیر تھا
برجستہ کہا کہ ظل الٰہی شہنشاہ ہند تو ضرور ہیں مگر شاہجہان اور شہنشاہ
ہند کے الفاظ کے اعداد میں یکسانیت ہے۔ مگر شہنشاہ جہانگیر
کے دربار میں ایک مرد حق کو حضرت مجدد الف ثانی نے للکار کر کہا
تھا کہ میں دربار میں ایسے ہی داخل ہوں گا جیسے میرا مذہب مجھے اجازت
دیتا ہے۔ معلوم ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی اور نواب سعد اللہ خان
ہم درس تھے اور دونوں کی بصارت کا فرق اپنی اپنی جگہ نمایاں ہے

۱۸۵۷ء میں جب ملوکیتی سرداری آخری ہچکی لے رہی تھی تب بھی
نام کے بادشاہ بہادر شاہ ظفر جس کی فرمانروائی صرف لال قلعہ دہلی
کے حصار میں تھی۔ ظل الٰہی اور ظل سبحانی کے القابات سے نوازا
جاتا۔ جب کہ اس کی چار دیواری کے باہر گھٹیا آدمی بھی عنصر شاہی کا لے
آدمی کو دجل و فریب سے اپنے دام تزویر میں پھانس کر جور و استبداد
کے ڈنڈے کے ساتھ غیرت ملی اور قومی غیرت کو ختم کر کے کالے
آدمی اور گورے صاحب بہادر کے درمیان امتیازی فرق کو نمایاں
کر رہا تھا۔ انگریز صاحب بہادر کے استبداد اور ظلم سے نجات پانے کے
لئے ہر کس و ناکس نے خوشامد کو اپنایا۔ جھوٹ اور سچ میں تمیز ختم
ہو گئی اور صاحب بہادر کی خوشنودی کے لئے ذہن کو ذات اور مات
کو ان [illegible] گئے

تھ مغرب کے دروازے سے گزر کر چاپلوسی کا زینہ استعمال کیا جائے
گا۔

مائی باپ! آپ محب یا زمند سے کہیں بہتر طور پر جانتے ہیں کہ موجودہ
وقت میں وطن عزیز کا کوئی محکمہ یا شعبہ ایسا نہیں جہاں اس صنف
کثیف (خوشامد) کا زہر سرایت نہ کر چکا ہو۔ اس پر فتن دور میں تقریباً
ہر شخص اس سیاہ بختی کا شکار ہے اور اب تو یہ فن کی صورت اختیار
کر چکا ہے۔ مختار ہو یا مجبور، آجر ہو یا مزدور، حاجت مند ہو یا جیب
دیکھنے والے ائیرکنڈیشن کمرے میں بیٹھنے والے کے درمیان رابطہ قائم
کرنے کا ذریعہ صرف اور صرف خوشامد ہی ہے۔ سیاسی بحران ہو یا سماجی
و معاشرتی ہر جگہ خوشامد کا عمل دخل ہے۔ مریض تو درکنار معالج بھی اس
کا آسیب زدہ ہے۔ جو معاشرہ ایسی نفسیاتی الجھنوں کے علاج سے عاری
ہو وہ تحقیق و انکشاف حق سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے
کہ ایسی گراں مایہ مخلوق وطن عزیز میں کمیاب ہے۔ بلکہ سابقین
میں چلی گئی ہے ایسی آسیب زدہ معاشرت خود دار مخلوق کے
لئے امتحان گاہ اور بے وسیلہ مخلوق کے لئے جہنم بن جاتی ہے
بلکہ انسانیت، انسانیت کی پہچان سے یکسر عاری ہو جاتی ہے
خوشامد انسانی سوچ اور فکر کو خود غرضی تک محدود کر کے اجتماعیت
پر مبنی قدرت مدرکہ کو سلب کر لیتی ہے۔ مشرک اور خوشامد پرست
میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اول الذکر میں ایمان نہیں ہوتا اور مؤخر الذکر
کا ضمیر نہیں۔ خوشامد پرست سے آشنا ہوتے ہوئے بھی مادی
وسائل پیدا کرنے والا ایک ایسا ڈھانچہ کو مجازی خدا تصور
کر کے التجا اور التفات کی صدائے جرس سننے کا متمنی ہوتا ہے
(عرض حال) یہ ہے "خوشامد" اور خوشامدی کی کہانی جسے کافی
اختصار سے پیش کیا گیا ہے ورنہ اس موضوع پر صفحات کے صفحات
لکھے جا سکتے ہیں کہ خوشامد نے کیا کیا غضب ڈھائے ہیں۔

وطن عزیز کو آزاد ہوئے ۴۰ سال سے زائد عرصہ ہو گیا ہے
لازم تھا کہ اس مدت کے دوران اپنے قومی وقار کے مطابق معاشرتی
اور سماجی اقدار کو اپناتے لیکن افسوس ہم اسی سماج اور معاشرت
کے خوگر ہیں جو غیر ملکی حاکم خانہ خراب کی کوشش بار چھوڑ گئے تھے
تمام تاسف ہے کہ ہم آزادی کے معاملے میں بھی قدامت
پسند ہیں

ہندوستان کی مکمل باگ ڈور تمغہ کے طور پر آپ کے ہاتھ میں سونپی گئی ہے۔ اور آج ملک کا بچہ بچہ آپ کی کامیابی اور درازیٔ عمر کے لئے دعائیں مانگ رہا ہے۔ آپ جب حیدرآباد گئے ہوائی اڈے پر اس وقت کے آندھرا پردیش کے چیف منسٹر اور ایک دوسرے صنعت کار کی خوشامد کا جو منہ توڑ جواب دیا تھا اس کی یاد اب تک باقی ہے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت آپ وزیراعظم ہند کے فرزند ارجمند تھے۔ اور ایک سرکاری ملازم، مگر خوشامدیوں نے آپ کو رجھانے میں اسی وقت اپنی کوششوں کو بروئے کار لانے میں سلسلہ جنبانی کر دی تھی۔ اور اب جب کہ آپ ملک کے وزیراعظم ہیں تو ازلی خوشامدی کس کس طرح آپ کی خوشامد میں زمین اور آسمان کے قلابے ملانے کی کوشش نہیں کریں گے۔

مگر آپ کی کامیابی کا راز صرف اسی راستہ میں ہے جو آپ کی والدہ محترمہ آپ کو اور ہم سب کو دکھا گئی ہیں۔ ملک کی یکتا اور قومی یکجہتی، بچھڑے ہوئے عوام کو انسانوں کی سی زندگی عطا کرنا ——— کسانوں کی پیداوار میں اضافہ۔ غرضیکہ ملک کی ترقی و بہبودی میں ہر وہ قدم اٹھایا جائے جو ممکن ہو سکے۔ اور یہ سب کچھ تبھی ہوگا اگر آپ خوشامدیوں سے دور رہیں گے۔ اس لئے نہایت مؤدبانہ گزارش ہے کہ ہمارے ملک میں خوشامدیوں کا ہر ٹیڈ ٹولہ موجود ہے انہیں دھتکار دیجئے۔ اور پھر فریادی، مصیبت زدہ، مفلوک الحال، اور ملک کی ترقی چاہنے والے کے لئے اپنے دل کے دروازے کھلے رکھیئے۔ اور پھر دیکھئے کہ ہندوستان آپ کی سربراہی میں کس طرح پھولتا پھلتا ہے۔ فقط

آپ کا جاں نثار خادم
سرور تونسوی (ایڈیٹر)

(بقیہ صفحہ کا) کہ تم کلکٹر یعنی سرکاری افسر ہو۔ لہذا اپنی ضمانت دے دو۔ ہربنس لال نے قلم اٹھایا اور تمام کی خانہ پری ختم کر دی۔ جب ہربنس نے لڑکی سے اس کے باپ کا نام پوچھا تو کانتا نے کہا "ودیا پرکاش" ہربنس نے لڑکی کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف اور باپ کا نام "ودیا پرکاش" لکھ دیا۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کانتا مہرا کی خوشی کا اس وقت کیا عالم تھا ہربنس نے اصرار کیا کہ چائے وغیرہ پی لی جائے۔ مگر مجھے تو قبل از وقت پر کانتا مہرا کی حاضری بہ حیثیت ٹیلی فون آپریٹر ٹریننگ سنٹر میں لگوانی تھی۔ لہذا فوری طور پر اسے متعلقہ دفتر میں لے جا کر جلد کوائف کی خانہ پری کرانے کے بعد دفتر واپس آ گیا۔ شام کو کانتا مہرا ٹریننگ سنٹر سے جب گھر واپس آئی تو پہلے دفتر شانِ ہند میں آ اور خوشی کے آنسو آنکھوں میں لاتے ہوئے مجھ سے ایسے چمٹ گئی جیسے میری اپنی بیٹی ہو۔

اب کانتا مہرا کی شادی ہو چکی ہے۔ اور وہ بچے کی ماں بھی ہو گئی ہے مگر ہر جگہ سرکاری کاغذات میں اس کے باپ کا نام "ودیا پرکاش" ہی لکھا جاتا ہے۔ اور واقعی وہ مجھے اپنے باپ ہی کی طرح سمجھتی ہے

بہ کوئے یار بلند از محرمانہ گزر

مسعود قریشی

دس بارہ سال ہوئے ڈاکخانہ کا انتظامی حلقہ (دریا گنج) کے سب پوسٹ ماسٹر مہتہ صاحب تھے۔ مہتہ صاحب ہمارے ایک ریٹائرڈ پوسٹ ماسٹر مہرا جی کا انتقال ہو گیا ہے۔ ان کا لڑکا پاگل ہے اور بیوی ضعیف العمر۔ دو لڑکیاں ہیں۔ ایک کسی پرائیویٹ فرم میں کام کرتی ہے جس کی آمدنی سے ایک کنبہ کی گزر اوقات نہیں ہو سکتی۔ دوسری لڑکی ہائر سکنڈری تک تعلیم پائے ہوئے ہے۔ اگر آپ اسے دفتر میں کوئی کام دیدیں تو انہیں کچھ راحت مل جائے گی۔ مہتہ صاحب جانتے تھے کہ شان ہند اردو کا ماہنامہ ہے اور ہمارے یہاں دفتر میں جو بھی کام کرنے والے ساتھی ہوں گے ان کا اردو جاننا انتہائی ضروری ہے اس لئے انہوں نے پیش بندی کے طور پر از خود ہی فرمایا کہ یہ لڑکی ہندی انگریزی جانتی ہے اردو مطلقاً نہیں مگر اس کے باوجود آپ کو اسے اپنے ہاں کوئی نہ کوئی کام دینا ہی ہے۔

ایک تو مہتہ صاحب سے میرے دیرینہ ذاتی تعلقات تھے اور پھر وہ جلتے ہوئے ڈاکخانہ کے کرتا دھرتا تھے۔ جہاں سے ہمیں ہر روز اور بڑا اہم اسی ڈاکخانے سے رسالہ شان ہند مقررہ تاریخوں پر ڈاک کیا جاتا تھا۔ میں نے مروت کے طور پر کہہ دیا کہ اچھا آپ اس لڑکی کو میرے ہاں بھیج دیجئے گا۔ میں دیکھوں گا کہ اس سے کیا لیا جا سکتا ہے۔

دوسرے دن میں دس بجے صبح لڑکی دفتر میں آئی اور کہنے لگی پتا جی نمستے۔ لڑکی کی معصومیت، سادگی، اور سنجیدگی اپنے آپ قابل تعریف تھی۔ اس نے خود ہی اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا میرا نام کانتا مہرا ہے۔ اور مجھے ڈاکخانہ کے ہیڈ پوسٹ آفس کے پوسٹ ماسٹر صاحب نے آپ کے ہاں بھجوایا ہے۔

پوسٹ ماسٹر سے اس سلسلہ میں گفتگو کے بارے میں نے اپنی بیوی سے بھی تذکرہ کیا تھا۔ چنانچہ میں نے بیوی کو بھی بتایا صاحب نے جس لڑکی کے بارے میں کہا تھا وہ آگئی ہے آپ بھی ان سے مل لیجئے۔

خریداروں کا رجسٹر میں نے کانتا مہرا کے سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ اس میں دو لیڈریس نقل کرو۔ کانتا نے ایڈریس لکھے اس کی ہینڈ رائٹنگ انگریزی کتابت بہا خوبصورت تھا پھر میں نے ہندی میں بھی لکھنے کو کہا تو اس کا ہندی ہینڈ رائٹنگ بھی قابل تعریف تھا۔ چنانچہ کانتا سے کہا گیا کہ وہ خریداروں کے پتے انگریزی میں لکھتی رہے۔ دوپہر کو ایک گھنٹہ دن کا کھانا کھانے کے لئے اپنے گھر چلی گئی اور نصف گھنٹہ میں ہی واپس آ کر اپنے کام میں لگ گئی۔ چھ ساڑھے چھ گھنٹے میں بیٹھ کر اس نے تقریباً ڈیڑھ سو ایڈریس لکھا ہو میں اب بھی زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو گھنٹے میں لکھ سکتا ہوں۔ مگر اس خیال سے کہ پہلا دن ہے اور خریداروں کے پتے اس کے لئے نئے نئے ہیں کیونکہ بعض شہروں قصبات [illegible] کے نام پڑھنے اور لکھنے میں دشواری بھی پیش آتی تھی۔ اس لئے سوچا کہ چند دنوں میں اس کے کام کی رفتار بڑھ سکے گی۔ دوسرے دن جب وہ شام کو گھر جانے لگی تو میں نے پوچھا تمہاری تنخواہ رجسٹر میں کیا لکھوں۔ کہنے لگی جو مہتہ انکل کہیں گے وہی دے دیجئے گا میں نے اسی وقت مہتہ صاحب کو ڈاکخانہ میں فون کیا اور ان سے دریافت کیا کہ کانتا مہرا کو کیا تنخواہ دینی ہوگی تو انہوں نے فرمایا کہ وہ سو روپیہ دے دینا۔ میں نے کانتا سے کہا کہ مہتہ صاحب تو آپ کی تنخواہ سو روپیہ بتاتے ہیں۔ کہنے لگی مجھے صرف ڈیڑھ سو چاہئے سو روپے نہیں۔ ہمیں اگر ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ اور مل جایا کرے تو ہمارے گھر کا سب خرچ پورا ہو سکتا ہے چونکہ آپ بغیر ضرورت رکھ رہے ہیں اس لئے میں آپ پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی۔ اس لئے جتنی مجھے ضرورت ہے وہی دے دیا کریں۔

کچھ تو کانتا مہرا کی اس بات اور سادگی نے میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی کا جذبہ پیدا کیا اور جب وہ دفتر میں آتی تو پتا جی نمستے اور جب شام کو گھر جاتی تو پتا جی نمستے

اٹھ کر جاتی جس سے مجھے یوں محسوس ہوتا کہ جیسے میری اپنی بیٹی
کہہ رہی ہو پتاجی نمستے۔

یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ صرف ایک ایسی لڑکی ہے
لہٰذا میں نے اُس کے لئے کام نکالنے کے لئے ہندی کتب
کی فروختگی کا بھی کام شروع کر دیا۔ اور ہندی کی تمام کتابوں
کی مکمل فہرست کا بھی ذکر کر دیا۔ ایک وقت میں تین کاپیاں نکالتے
دن بھر میں جتنی بھی فہرستیں تیار ہو جاتیں وہ لائبریری وغیرہ
میں بھیج دی جاتیں۔ چونکہ اُسے کام میں مشغول رکھنے کے لئے ہندی
کتب کا کاروبار شروع کر لیا۔ اب یہ اُس کی قسمت سمجھئے یا بھگوان
کی مہربانی کہ ہندی کتب کی فروختگی سے اس کے لئے دو اڑھائی صد
روپیہ ماہانہ علاوہ اخراجات و ہندی کتب اپنے سے ہونے کے بعد منافع
ہونے لگا۔ اور اُسے چھ سو روپیہ ماہانہ باقاعدہ اب ڈھائی
صد کر دیا گیا۔ ایک دن دفتر کے وقت سے ایک گھنٹہ پہلے کانتا
آئی اور کہنے لگی پتا جی مجھے آج کی چھٹی چاہئے اور اُس نے چھٹی
کے لئے از خود یہ بتایا کہ اُسے محکمہ ٹیلی فون سے انٹرویو کال
ملی ہے۔ اور وہ انٹرویو کے لئے جائے گی۔ چنانچہ اُسے چھٹی
بھی دے دی گئی۔ دوسرے دن وہ حسب معمول کام پر آئی تو بات
کرنے پر کانتا کہنے لگی پتا جی تیس لڑکیاں تھیں اور کل بائیس
جگہیں خالی ہیں مجھے کون رکھے گا۔ سب سفارشی لڑکیاں کامیاب
ہو جائیں گی۔ کانتا نے یہ بات اس قدر بے بسی سے کہی کہ
قدرت کے مالک تک کو اس یتیم بچی کی اس بے بسی پہ ندامت
محسوس ہوئی ہوگی۔

قریباً ایک ماہ بعد کانتا نے ایک روز کی رخصت
طلب کی اور اپنی بے بسی کو چھپاتے ہوئے بتایا کہ محکمہ ٹیلی فون
والوں نے ٹیلیفون بلڈنگ میں بلایا ہے۔ دوسرے روز جب
کانتا کام پر آئی تو بڑی چپ چاپ سی تھی۔ میں نے دیکھا کہ کام
کرتے کرتے کئی بار اُس کی آنکھیں بھر بھر جاتیں۔ میں دیدہ دانستہ
چپ رہا۔ اور اُس کا حوصلہ نہ بڑھاتا کہ وہ اصل بات مجھ سے کہے
دوپہر کو کھانا کھانے کے لئے بھی گھر نہ گئی تو دریافت کرنے پر کہنے
لگی کہ بھوک نہیں ہے۔ اب میں نے اُس سے پوچھا کہ تم نے بتایا
ہی نہیں کہ کیا ہوا۔ بس میرا یہ کہنا تھا کہ کانتا زار و قطار رونے لگی

میری بیوی یہ سنتے ہی بھاگی دوسرے کمرے سے آگئی۔ بڑی مشکل
سے کانتا کو چپ کرایا۔ اور اُس نے روتی ہوئی آواز میں بتایا
کہ مجھے کل شیل وقت آپریٹرشپ کے لئے جو ٹیسٹ ہوا تھا ٹیلی فون والوں نے
شورٹی فارم دیا ہے کہ دو دن کے اندر اندر شورٹی فارم مکمل
کر کے ٹریننگ سینٹر میں حاضری دوں۔

میری بیوی کہنے لگی تو اس میں رونے کی کون سی بات ہے۔
شورٹی فارم کی خانہ پری کر کے لے جاؤ اور نوکری پر حاضر ہو جاؤ
یہاں تمہیں اڑھائی سو ماہوار ملتا ہے وہاں چھ سات صد ماہوار ملے گا
یہ تو خوشی کی بات ہے یا رونے کی۔ تمہیں تو بھگوان کا شکر کرنا چاہئے
کہ سینکڑوں لڑکیوں میں سے جو بائیس لڑکیاں منتخب کی گئی ہیں
اُن میں سب سے پہلے تمہارا نام ہے۔

کانتا سسکیاں بھرتے ہوئے شورٹی فارم میرے سامنے
رکھتے ہوئے کہا کہ اسے پڑھئے۔ اس فارم میں ایسے سرکاری
ملازم کی ضمانت چاہی گئی تھی جو کنفرمڈ ہو۔ سرکاری ملازمت
میں دس دس پندرہ پندرہ سال تک ملازمین کنفرمڈ نہیں ہوتے۔ اس
نے اُس کے رشتہ داروں یا پڑوس میں جو چار سرکاری
ملازم تھے سب نے کہہ دیا کہ وہ تو کنفرمڈ ہی نہیں۔ اور میرا کون ہے یتیم
اور بے بس لڑکی کے لئے ضمانت دے بھی تو کیوں۔ یہ ضمانت صرف
اس امر کی ہوتی ہے کہ اگر اس امیدوار نے بعد میں سرکاری ملازمت
سے علیحدگی اختیار کر لی تو جو اخراجات محکمہ نے اس کی ٹریننگ پر کئے
یا ٹریننگ کے دوران اسے تنخواہ دیتی رہی وہ تمام رقوم سرکار کو واپس
کرنے کا میں ضامن ہوں۔

میرا بڑا لڑکا اُن دنوں پولیس انفارمیشن بیورو میں پولیس آفیسر
تھا۔ میں نے اُس کے دفتر میں اُسے فون کیا تو پتہ چلا کہ وہ آج
چھٹی پر ہے چنانچہ ٹیلیفون ڈائریکٹری سے اس کے مکان پر فون کیا گیا تو پتہ
چلا کہ خرابی صحت کے باعث اس نے دفتر سے چھٹی لے رکھی ہے۔ میں
نے فون بند کیا اور کانتا سے کہا چلو بیٹا میرے ساتھ۔ شانتی نگر
کے دفتر دریا گنج سے محض چند فرلانگ زیادہ فاصلہ پر نہیں۔ لہٰذا رکشا پر ہم
اُس کے مکان پر پہنچے ہی چند ہی منٹ لگے ہوں گے۔ میں نے اپنے لڑکے
کو سب حالات کے ساتھ شورٹی فارم رکھتے ہوئے کہا بیٹا اس لڑکی کو
ملازمت کی ضرورت ہے جس کے لئے شورٹی دینا ضروری

بقیہ صفحہ

مشاعرہ کل ہند اردو کانفرنس دہلی

(سرور تونسوی)

قریباً چھبیس سال پہلے ۱۱ رفروری [illegible] کو دلی میں اردو کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس سلسلہ میں ایک کل ہند مشاعرہ بھی ہوا۔ اس مشاعرہ کی روداد شان ہند کی اشاعت ۱۵ اپریل [illegible] میں شائع کی گئی تھی۔ آیئے چھبیس سال پہلے کے مشاعرہ سے لطف اٹھایئے ہمیں افسوس ہے کہ کچھ شعرا کے بارے میں جو ریمارکس دیئے گئے ہیں ان کے انتقال فرما جانے کے بعد وہ ذوق سلیم پر گراں گذریں گے۔ مگر یہ نہ بھولئے کہ یہ مشاعرہ چوتھائی صدی پیشتر ہوا تھا۔ اس وقت جو صورت حال تھی اسے اگر ذہن میں رکھا جائے تو پھر آپ یقیناً لطف اٹھا سکیں گے۔ (ادارہ)

آج ۱۱ رفروری [illegible] سوموار ہے اس وقت رات کے ۹½ بجے ہیں، حضرت امین لکھنوی نے شعرائے کرام کی فہرست سنائی ہے اور فرمایا ہے کہ یہ شاعر حضرات سٹیج پر تشریف لے آئیں اور اسکے ساتھ ہی اعلان فرمایا ہے کہ صدر مجوزہ شری پرشوتم راج کپور جب تشریف لائیں گے تو مسند صدارت سنبھال لیں گے، فی الحال پنڈت سندرلال جی کی صدارت میں مشاعرہ کی کارروائی شروع کی جا رہی ہے۔

سامعین کی تعداد کانفرنس کی شایان شان ہے۔ جناب شمیم کاکوروی فرمانے لگے سرور صاحب ایمان سے کہنا کہ جے پور کی کل راجستھان اُردو کانفرنس زیادہ کامیاب تھی یا یہ کانفرنس۔ میں نے عرض کیا کہ سوائے اس کے کہ اس کانفرنس میں پنڈت نہرو اور مولانا آزاد تشریف لائے ہیں ...... باقی ہر لحاظ سے جے پور کی کانفرنس زیادہ کامیاب اور پر رونق تھی بیشک یہ کانفرنس سارے ہندوستان کی نمائندگی کرتی ہے مگر جہاں کل راجستھان اُردو کانفرنس میں تھی وہ اس میں نہیں، وہاں ڈسپلن تھا، پنڈال کا انتظام اچھا تھا، یہاں ڈسپلن نام کو نہیں، انتظام کا یہ حال ہے کہ رضا کار اپنے لئے یہ حق رجسٹرڈ کرائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ وہ جس کی چاہیں بے عزتی کر دیں اور تو اور سرو اسٹار ماسٹر جگت سنگھ ڈپٹی ڈائرکٹر تعلیم کی توہین کی گئی جو پچاس سال سے ایک اُردو رسالہ نکالتے ہیں اور جن کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے اردو کی بہت زیادہ حد تک خدمت کی ہے کیا ستم ظریفی ہے کہ ایک خادم اردو کی توہین اردو کانفرنس میں ہوتی ہے۔ ڈیلی گیٹوں کی رہائش کا انتظام قطعاً خراب ہے جو دہلی کی مشکلات کو دیکھتے ہوئے نظرانداز کیا جا سکتا ہے کھانے کے متعلق بھی شکایت ہے کہ پہلے بھی گوشت کھانے والوں کو دال مہیا کی گئی اور دال کھانے والوں کو گوشت بشرت مہیا کی! اور پروفیسر ریم لکھ صاحب بہت پوری یہ سب باتیں سن رہے تھے فرمانے لگے سرور صاحب آپنے واقعی ایمانداری سے رائے زنی کی ہے۔ سنا تو پنڈت سندرلال جی جناب کشور جوہر سے کلام سنانے کے لئے کہہ رہے تھے مگر کشور جوہر اسٹیج پر تشریف نہیں لائے۔ آخر وہ صحب سے پہلے یہ ہمیں بھی کہوں؟ کیا غضب ہے کہ کشور جوہر الیاس قاسمی اعظم "انشری" پروگرام میں نہ لیا گیا آخر کار جناب ہیش چندر نقش مصنف "خام" مائیک پر تشریف لائے ہیں اور فرما رہے ہیں ؎

خوف ہے دل کی آرزوں کا کہ میرے اشکوں کی جھلملاہٹ میں
ایک دنیائے برق ہوتی ہے دل شکستہ کی مسکراہٹ میں

اس قطعہ پر داد پانے کے بعد ارشاد ہوا ہے ؎

ساری باتیں وہ سب بہشت ملیں حور و کوثر کی کیا حقیقت ہے
میری دنیا میں تم سہی لیکن وہ تیری جنت سے خوبصورت ہے

جناب نقش قطعات پر اچھی داد لینے کے بعد اپنی جگہ پر تشریف لے گئے ہیں اور صاحب صدر نے جناب للہ بیتا لال [illegible] سے کلام سنانے کی گذارش کی ہے، سنئے جناب جوہری ارشاد فرما رہے ہیں ؎

زباں کھلی تو مری عرض داستاں کیلئے
مگر نہ لفظ کوئی مل سکا بیاں کیلئے
تم جہاں کا بھی افسانہ کہہ گئے ہیں

ہم جیب ہیں ہم فقط بیاں کے لئے

مخالفت بھی ہو کل تک بڑی اردو کی
تڑپ رہی ہے وہی آج اس زباں کے لئے

پنا لال جی جوہری کے بعد جناب ملک روپڑی مائیک پر تشریف لائے ہیں محترم صاحب سے اجازت لیکر ترنم سے ایک غزل سنائی ہے۔ سامعین کے شور میں ایک شعر بھی سنائی نہ دے سکا۔ اب اعلان کیا گیا ہے کہ جناب گور سرن لال ادیب لکھنوی کلام ارشاد فرما رہے ہیں۔ ہال وہی دلی میڈیکل ایسوسی ایشن ہے یہ مشاعرہ شروع ہو گیا جناب ادیب کا مطلع سنئے فرماتے ہیں ؎

افسانۂ حیات کا عنوان بنا دیا ، جو ایک مشت خاک تھی جسم انساں بنا دیا

مطلع کے بعد اول ہی تھی کہ صدر محترم جناب پرتھوی راج کپور تشریف لے آئے ہیں۔ جیسے ہی کپور صاحب تشریف لائے تو سامعین نے پُر زور تالیوں سے خیر مقدم کیا ہے۔ مسٹر سندر لال جی نے کپور صاحب کو ہار پہنایا ہے حضرت امن لکھنوی کی تحریک اور الیاس احمد سرور کی تائید کے بعد کپور صاحب مسند صدارت پر تشریف لائے اور بہت اچھے انداز میں صدارتی تقریر فرمائی ہے۔ پرتھوی راج نے ایک فارسی رباعی بھی سنائی اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ صرف ایکٹر ہی نہیں ادبی میدان میں بھی دسترس رکھتے ہیں۔ اب نقیب مشاعرہ حضرت ساغر نظامی ہو گئے ہیں تاکہ آگے آواز ریڈیو پر بار بار سنی جائے گی۔ ساغر صاحب نے جذباتی انداز میں چند الفاظ کہنے کے بعد جناب چندر سنہا سے کلام سنانے کی گذارش کی ہے۔ سنہا صاحب کے موجود نہ ہونے کے باعث ساغر صاحب نے اعلان فرمایا کہ اگر چندر سنہا صاحب نہیں ہیں تو رمز عظیم آبادی تشریف لائیں رمز صاحب مائیک پہ تشریف لائے تو ان کے چہرے مہرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ چار شعر سنا کر بیٹھ جائیں گے۔ مگر صاحب رمز صاحب تو چھپے رستم نکلے فرمانے لگے ایک نظم "سنم و حرم" کے عنوان سے پیش کر رہا ہوں اور اس کے بعد انتہائی دلکش انداز میں تحت اللفظ ارشاد فرمانا شروع کیا ؎

سب سے حسیں اردو زباں
اردو زباں سب کی زباں

ابر بہار قوس قزح ، شمع حرم حسن بتاں
شرح حدیث میکدہ ، رنگ جمال کہکشاں

فکر و نظر کی انجمن ، عشق و وفا کی داستاں
گنجینۂ علم و ہنر ، سرمایۂ ہندوستاں
سب سے حسیں اردو زباں ، اردو زباں سب کی زباں

نظم کے پہلے بند نے ہی مشاعرے کا رنگ پلٹ دیا، داد ہے کہ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ دوسرا بند سنئے فرماتے ہیں ؎

موج خرام بوئے گل ! خسرو سخن کی داستاں
حسن ریاض قومیت ، جان بہار گلستاں
دُر ثمین لعل یمن ، نقش و نگار مہوشاں
گیسوئے شب نور سحر ، غنچہ دہن شبنم چکاں
سب سے حسیں اردو زباں ، اردو زباں سب کی زباں

حضرت امن، جناب صدر، پنڈت سندر لال، مولانا حفظ الرحمٰن مصطفیٰ شیروانی اور جملہ سامعین بے تحاشہ داد دے رہے ہیں اور جناب ساغر نظامی کھلی کھلی آنکھوں اور منہ پھاڑے دیکھ رہے ہیں کہ کیا آج ساری داد یہ رمز عظیم آبادی ہی لے جائے گا۔ سنئے رمز صاحب کیا فرما رہے ہیں ؎

تہذیب کہنہ کی امیں ، اور عصر نو کی نغمہ خواں
یہ نظم ہے تاریخ کا ! مٹتا نہیں اس کا نشاں
بھولے گی دنیا کس طرح ، خسرو کی میٹھی بولیاں
تلسی کی رامائن میں بھی ، اردو کا انداز بیاں
سب سے حسیں اردو زباں ، اردو زباں سب کی زباں

عشرت میثاقی، پروفیسر ہیم شنکر اور دوسرے سخن فہم حضرات کہہ رہے ہیں کہ رمز صاحب کی نظم نے پیسے وصول کرا دیئے۔ اب اس نظم کے بعد اگر کسی شاعر کا بھی کلام نہ سنا جائے تو کوئی ملال نہ ہوگا۔ سنا؟ جناب رمز فرما رہے تھے ؎

دلکش حسیں جاذب نظر ، فخر سرور ماہ جبیں
ہم لب طرب رباب و چنگ ، دف و مطرب مثل نازنیں
رنگ شفق روح غزل ، لیلیٰ فن محمل نشیں
کشمیر کی زہرہ جبیں ، پنجاب کی لالہ رخاں
سب سے حسیں اردو زباں ، اردو زباں سب کی زباں

داد ہے کہ بس تھمنے نہ پائے ، ساغر نظامی طلب ہی دل میں شرمندہ ہو رہے ہیں کہ وہ اردو پہ کلام رمزی ایسے غیر شاعروں کو

پروگرام دیگر عوام کا روپیہ ضائع کر رہے ہیں اور ایسے شاعر جن کے ایک ایک لفظ پر سامعین سر دھن رہے ہیں انہیں وہ ریڈیو اسٹیشن کے قریب نہیں آنے دیتے۔ سنئے رمز صاحب کن رموز کنایات میں فرما رہے ہیں ؎

جو یہ دانشِ وراں | سعیٔ کمالِ اہلِ فن
گل چہرہ گل رخ سیم بر | گلنار و گل گوں گلبدن
کافر ادا، جادو نظر | شکر صفت شیریں سخن
سوزِ دلِ آشفتگاں | برقِ نگاہِ دل براں
سب کی حسیں اُردو زباں | اُردو زباں سب کی زباں

راقم الحروف نے سیکڑوں مشاعرے سنے ہیں اور شعراء کو بے انداز داد بھی ملتے دیکھی ہے مگر جس انداز سے رمز صاحب کو داد ملی ہے ایسی داد شاذ ہی کسی شاعر کو نصیب ہوئی ہو، اس لئے حضرت ساغر کے چہرۂ پُر نور پر صاف حسد و جلن کی لکیریں نمایاں طور پر نظر آنے لگی ہیں شاعروں میں اس قسم کا دل گردہ عام طور پر بہت کم ہی ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کسی شاعر کو اس قسم کی بے پناہ داد ملتے ہوئے برداشت کر سکیں مگر بہار کا یہ قابلِ فخر فرزند داد و ستائش سے بے پروا چھٹا بند سنا رہا ہے ؎

یہ ملکیت ہے قوم کی | شاہوں کی گودی کی پلی
آزاد و نہرو کی زباں | بھارت کے گلشن کی کلی
پیکر میں قند پارسی | نزہت میں مصری کی ڈلی
جو داستاں کیف تھی | کیوں ہے سماعت پر گراں
سب کی حسیں اُردو زباں | اُردو زباں سب کی زباں

داد نے اب ہر مصرع پہ پُر جوش اور طویل تالیوں کی صورت اختیار کر لی ہے اور تالیوں کی یہ آواز جناب ساغر کے دل و دماغ پر ہتھوڑے مارتی ہوئی صاف دکھائی دے رہی ہے، دیکھئے رمز کیا آفت ڈھا رہا ہے ؎

اس کے اسیرِ زلف تھے | چکبست خوش معیار بھی
پنڈت دیا شنکر نسیم | آتش بھی اور سرشار بھی
مومن سا ندرت پاس سا | غالب سا بادہ خوار بھی
کوثر کی موجیں بھی رواں | گنگا کے دھارے بھی رواں

(خدا لگتی کہئے گا آپ نے اُردو کی تعریف میں اس سے بہتر نظم پہلے بھی کوئی سنی ہے اور کیا یہ غلط ہے کہ آپ بہر بند بلکہ ہر مصرعے پر داد دیتے رہے) ساغر صاحب اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے فرماتے ہیں تو کیا ہم چالیس سال سے جھک مار رہے ہیں جو رمز نے اس بند میں ہمارا نام نہیں لیا۔ ان صاحب نے عرض کیا حضور اس بند میں تو سب مرے ہوئے شاعروں کا نام لیا گیا ہے آپ تو ابھی زندہ ہیں۔ آپکا نام کیسے لیا جاسکتا تھا، ساغر صاحب جواباً فرمانے لگے اچھا یہ بات ہے تو اگلے ماہ ریڈیائی ماہنامہ "نئی کرن" میں آپکو ضرور پروگرام دیا جائے گا اور یہ صاحب آداب بجا لائے ہیں، سنئے رمز صاحب کیا فرما رہے ہیں ؎

ادعائے یثربی و عیسوی | مریم کا پیراہن بھی ہے
موسیٰ کا کوہِ طور بھی | موہن کا بندرابن بھی ہے
اکسیر بھی کندن بھی ہے | صندل بھی ہے چندن بھی ہے
ہے مشترک تہذیب کا | شفاف اک دریا رواں
سب کی حسیں اُردو زباں | اُردو زباں سب کی زباں

اس بند پر حضرت امن لکھنوی، شفیق برتری ماہ، پنڈت ... اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے بہت زیادہ داد دی ہے اور جناب رمز ارشاد فرما رہے ہیں ؎

حسنِ مسیحائی بھی ہے | اس کے لبِ اعجاز میں
گیتوں کی زیر و بم سی ہے | جادو بھی ہے آواز میں
سیلاب رنگ و نور کا | اُردو کی بزمِ ناز میں
صبحِ بنارس کی جھلک | شامِ اودھ کی سرخیاں
سب کی حسیں اُردو زباں | اُردو زباں سب کی زباں

آخری بند ملاحظہ فرمائیے ارشاد ہوتا ہے ؎

فصلِ بہار آئی مگر | ہے کیفیِ دل ہے وہی
جو کارواں سالار تھی | اب گردِ منزل ہے وہی
جو صدرِ محفل تھی کبھی | رسوائے محفل ہے وہی
روشن ہے جس کے فیض سے | مستقبلِ ہندوستاں
سب کی حسیں اُردو زباں | اُردو زباں سب کی زباں

جناب رمز عظیم آبادی نظم سنا نے اور بے انداز داد پا نے کے

فرمایا ہے کہ اب جناب امین سلونوی صاحب کلام سنائیں گے، امین صاحب مائیک پر تشریف لائے تو اپنی شاعری کے متعلق تقریر فرمانے لگے، خدا خدا کرکے مطلع کا پہلا مصرعہ "تلخ ہر گھونٹ محبت میں پئے بیٹھے ہیں" سنایا تھا کہ "محبت" کے معنی سمجھانے کیلئے تقریر پھر شروع کردی ہے۔ چونکہ مشاعرہ براڈکاسٹ ہو رہا ہے اور تقریر بازی میں مفت میں وقت ضائع کر رہے ہیں، اس لئے ساغر صاحب نے ناراضگی کے لہجے میں فرمایا ہے مولانا اشعار سنائیے مگر امین صاحب ہیں کہ "محبت" کی تشریح فرمائے جا رہے ہیں۔ سامعین سے ایک آواز آئی ہے حضرت محبت کے معنی آپ سے تو آپ کے نواسے یا پوتے بہتر بتا سکتے، اس پر امین صاحب نے تقریر بند کی ہے اور مطلع ارشاد فرمایا ہے ؎

تلخ ہر گھونٹ محبت میں پئے بیٹھے ہیں
کونسی بات نہیں ضبط کئے بیٹھے ہیں

مطلع کے بعد پھر تقریر شروع کی تھی کہ ہوٹنگ شروع ہو گئی ہے اور امین صاحب اسی شور میں دو تین اشعار سنا کر بیٹھ گئے ہیں اور جناب باقر مہدی مائیک پر تشریف لائے ہیں فرماتے ہیں ؎

بہک گئے تھے، سنبھل گئے ہیں ستم کی حد سے نکل گئے ہیں
ہم اہلِ دل یہ سمجھ گئے ہیں کہ کشمکشِ روزگار کیا ہے

عشرت مینائی فرمانے لگے اس کے بال تو ترقی پسندانہ ہیں مگر کلام تو غیر ترقی پسندانہ بھی نہیں ہے ساغر صاحب فرما رہے ہیں کہ اب جناب سچدانند سنہا صاحب تشریف لے آئے ہیں لہذا اپنے گذارش ہے کہ کلام سنائیں (خدا لگتی کہیے گا کبھی آپ نے شاعروں میں یہ نام بھی سنا ہے، لیجئے جناب سنہا صاحب مائیک پر تشریف لے آئے ہیں، سنا ہے یہ ممبر پارلیمنٹ ہیں، لہذا ان کے دو تین اشعار سن ہی لیجئے فرماتے ہیں ؎

جشنِ بہار دوستی ابھی کچھ خام ہے ساقی ترے رندوں میں ذکرِ گردشِ ایام ہے ساقی
مئے گلفام ہے ساقی چھلکتا جام ہے ساقی بڑی پرکیف تیرے میکدے کی شام ہے ساقی
بہارِ میکدہ قائم ہے تیرے حسن سے ورنہ بادۂ رنگیں برائے نام ہے ساقی

غالباً فوٹو گرافر آل انڈیا ریڈیو والوں کا ہے جو ساغر صاحب کے اشارے پر ہی کسی شاعر کی تصویر لیتا ہے۔

اعلان ہوا ہے کہ اب جناب شعری بھوپالی کلام سنائیں گے

لیجئے جناب شعری "پان بہ لب" مائیک پر تشریف لے آئے ہیں آپ فرماتے ہیں ؎

مآلِ تلاش تو دیکھ لیجئے! وہی در ہے چاہے جدھر دیکھ لیجئے
ابھی دیکھ کر آئی ہوں تصویر ان کی کہ دل نے کہا پھر ادھر دیکھ لیجئے

قطعہ پر بہت اچھی داد ملی ہے اور جناب شعری غزل ارشاد فرما رہے ہیں ؎

تیری دزدیدہ نگاہوں کو دعا دیتے ہیں
جنکو چاہتے ہیں یہی اتنا سزا دیتے ہیں
مسکراتے ہوئے پیغامِ وفا دیتے ہیں!!
دل کے انگاروں کو کیوں آپ ہوا دیتے ہیں
اپنی بربادی پہ خوش ہوں یہ تعجب ہے
وہ جسے اپنا سمجھتے ہیں مٹا دیتے ہیں!

داد بہت اچھی مل رہی ہے اور شعری صاحب بھی آج موڈ میں ہیں لہذا والہانہ طور پر فرما رہے ہیں ؎

جو نہ ایفا ہو اسی وعدۂ فردا کی قسم
روز وہ قید کی میعاد بڑھا دیتے ہیں
اپنے دامن کو ذرا آپ بچائے رکھئے
سرد آہوں سے بھی ہم آگ لگا دیتے ہیں

شعری کا گلا سوکھ گیا ہے اور آواز نہیں نکل رہی ہے لہذا وہ غزل کو ختم کرکے اپنی جگہ بیٹھ گئے ہیں بہت مدت کے بعد شعری کو ایسی اچھی داد نصیب ہوئی ہے، اب اعلان ہوا کہ جناب حبیب احمد صاحب صدیقی کلام سنائیں گے، ذرا دماغ پر زور دیجئے اس سے پہلے کسی شاعر کا یہ نام آپ نے سنا ہے؟ خیر ان کا بھی ایک شعر سن لیجئے۔ ارشاد ہوا ہے ؎

آسماں سے نہ برقِ تپاں سے ڈرتا ہوں
میں تنگ چشمیٔ اہلِ جہاں سے ڈرتا ہوں

عشرت مینائی فرماتے ہیں "تنگ چشمی" اصطلاح غیر مستعمل ہے ساغر صاحب نے اعلان کیا ہے کہ اب جناب مخدوم محی الدین صاحب سے کلام سنیئے، سامعین نے مخدوم صاحب کا پرجوش تالیوں سے خیر مقدم کیا ہے آپ فرما رہے ہیں کہ دکن کا اور خاص تلنگانہ کا ایک واقعہ ہے جسے نظم کیا گیا ہے اور یہ واقعہ اکبر کے

ہد میں قلی قطب شاہ کی محبوبہ بھاگمتی سے متعلق ہے، بھاگ نگر جس بھاگمتی کے نام پر پہلے حیدر آباد کا نام تھا ارشاد ہوا ہے ؎

بار سے آنکھ بھر آتی پہ کنول کھلتے ہیں ؛ جب کبھی لب پہ ترا نام وفا آتا ہے
نت کی راتیں میں بتاتی نہیں سے نکلی　　راگ کی مانگ کی بار آہ یہیں سے نکلی
نقلابات کی ہر بات یہیں سے نکلی　　گنگناتی ہوئی ہر رات یہیں سے نکلی
من کی گھنگھور گھٹائیں دہن کے بادل　　سونے چاندی کے قلی کو بچہ نہ پیارکے محل
ج بھی جسم کے انبار ہیں بازاروں میں　　خواجہ شہر ہے یوسف کے خریداروں میں
ہر باقی ہے محبت کا نشاں باقی ہے　　دلبری باقی ہے دلداری جاں باقی ہے
بر فہرست نگاراں جہاں باقی ہے　　تو نہیں ہے تری چشم نگراں باقی ہے

مخدوم صاحب کے اس نظم پر مناسب داد ملی ہے یا یوں کہہ یہ کہ ان کی شہرت کو داد ملی ہے اور اب اعلان ہوا ہے کہ جناب ملی جو اور زیدی صاحب سے ان کا کلام سنیے، زیدی صاحب نے بھی یہ نظم سنائی ہے چونکہ آپ بہت جلد پڑھتے ہیں اس لئے نظم نقل ہو سکی، تاہم نظم اچھی تھی لیجئے اب حضرت مولانا علامہ انور صابری سے ئیک پر تشریف لائے ہیں عشرت مینائی فرمانے لگے سرور صاحب بہ چوڑا ہوتا ہی چلا جا رہا ہے انور صاحب نے ایک قطعہ سنایا ہے، ر جلدی سے اپنی جگہ پر تشریف لے گئے ہیں اور اب اعلان ہوا کہ انجمن قی اردو ہند کے جنرل سکریٹری جناب آل احمد سرور کلام سنا رہے یں سنیئے سرور صاحب فرما رہے ہیں ؎

ندھیری راتوں میں جب جب بجھے دلوں کے چراغ
ستارۂ سحری بن کے جگمگائے ہیں !!

ئے تو نکی وادی پہ اک نوک خار لگی ہے ؛ لہو کی بوند سے نقش قدم بنائے ہیں
ش بزمی پہ کسائی ہیں سو طرح چمن ؛ وہم و ذہن نے سیکھ سمجھائے ہیں
سک چشم سے موتی لٹائے ہیں کیا کیا ؛ ستارے ٹوٹے ہیں، در سپہر ماہ اگائے ہیں
ک شہر کو دکھائی شعلہ افشانی ؛ شکستہ پائی کو منزل پہ کھینچ لائے ہیں
اپنی بزم میں ظلمت کا کیا گزر ہوگا ؛ ہزاروں سینے نقوش دیدہ جلائے ہیں

سرور صاحب کے بعد اعلان ہوا ہے کہ ذاکر صاحب [illegible] نام ارشاد فرما رہے ہیں۔ لیجئے جذبی صاحب مائیک پر تشریف لے آئے ہیں اور ارشاد فرما رہے ہیں ؎

الٹے غم نہ محرم راز حیات ہم　　دھڑکا رہے ہیں ہر ہمی دل کائنات ہم
ن ایک لا ابالی کے حق ... ضرور مانا کہ مذاق ... التفات ہم

ان کے نوں کا ہائے سہارا نہ پوچھئے　　کچھ پا گئے ہیں اپنے فرات نجات ہم

جذبی صاحب غزل سنانے اور مناسب داد پانے کے بعد اپنی جگہ پر تشریف لے گئے ہیں اور جناب مسعود اختر جمال صاحب مائیک پہ تشریف لے آئے ہیں ان کا بھی ایک شعر سماعت فرمایے ؎

اٹھا نظر کو نظاروں میں جان پڑ جائے　　حجاب کم نظری بے حجاب کی لو ہیں

انہیں داد بھی کچھ واجبی سی ملی ہے۔ اب اعلان ہوا ہے کہ جناب عزیز عظیم آبادی کلام ارشاد فرمائیں گے۔

سنیئے عزیز صاحب رباعیات سنا رہے ہیں فرماتے ہیں ؎

بادل عیش و طرب کے چھائے ساقی　　آئے ہم بھی مزے پہ آئے ساقی
ساغر بکرم ذرا سہارا دیدے　　بس لب پہ ہاتھ تھرتھرائے ساقی

دوسری رباعی کے دو مصرعے بھی سنیئے اچھے مصرعے ہیں فرماتے ہیں ؎

قطرات جو حلق سے اترتے ہیں عزیز　　رخسار پہ آکے پھول بن جاتے ہیں

رباعیات پر بہت اچھی داد پانے کے بعد غزل شروع کی ہے ارشاد ہوا ہے ؎

ساقیا ساغر کی گردش کم نہ ہو　　گرچہ فصل دہبار آئی ہے
جو کلی مرجھا چکی مرجھا چکی　　اب گلستاں میں بہار آئی ہے
ان کی مرضی ہے یہی اے درد دل　　اک صدا گریہ قرار آئی ہے
بے وفائی قبر تک پہنچا چکی　　اب وفا سوئے مزار آئی ہے
کٹ گئی ناسازگاری میں عزیز　　اب نوید سازگاری آئی ہے

عزیز عظیم آبادی بہت اچھی داد پا کر اپنی جگہ پر تشریف لے گئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس مشاعرہ میں داد صرف بہار کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے، ساغر صاحب نے اعلان فرما لیا ہے کہ اب پروفیسر احتشام حسین صاحب سے ان کا کلام سنیئے، احتشام صاحب کا نام سنتے ہی سامعین نے تالیوں سے خیر مقدم کیا ہے، احتشام صاحب مائیک پہ تشریف لائے ہیں اور غزل شروع فرمائی ہے فرماتے ہیں ؎

نگاہ دوست بہ انداز التفات ملی　　اب اور چاہیئے کیا دولت حیات ملی
ہزار بار کفن سر سے باندھ کر نکلے　　ہزار بار تری راہ میں حیات ملی

داد ہے کہ سامعین کے باذوق ہونے کا ثبوت دے رہی ہے۔ راقم الحروف نے احتشام صاحب کا کلام پہلی مرتبہ سنا ہے القصہ مختصر ... کے سلسلے میں تو ... احتشام صاحب اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں ... یہ آج ہی پتہ چلا کہ وہ اس "شاعرستان" میں بھی خاص جگہ رکھتے

ہیں سنیئے کتنے اچھے اشعار فرما رہے ہیں ؎

ترا خیال تھا جب تک یہ کائنات تھی :: ترے خیال سے چھٹتے ہی کائنات ملی

مری وفا کو تغافل کا ہو گیا دھوکا :: اس احتیاط سے وہ چشمِ التفات ملی

جو زندگی کے لئے زہر بھی ہے آخر بھی :: ترے ریاض سے وہ تلخیٔ حیات ملی

داد خوب مل رہی ہے، کچھ حضرات نے داد تالیوں سے دینا شروع کی ہے تو یہ شعوی دراج فرمانے لگے تالیاں زور سے بجایئے، بخل سے کیوں کام لیتے ہو، احتشام صاحب کو اس کامیاب غزل پر بہت اچھی داد ملی ہے، ساغر صاحب بار بار ایک ریڈیو کرم جاری کے ذریعہ امن صاحب سے کچھ کہلوا رہے ہیں، جسے سننے کے بعد امن صاحب کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ یہ بتا رہا ہے کہ وہ اس پیغام کو پسند نہیں فرما رہے۔ ساغر صاحب نے اعلان فرمایا ہے کہ اب ڈاکٹر مسعود حسین صاحب جو کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ریڈر ہیں سے کلام سنیئے ڈاکٹر صاحب مائیک پر تشریف لے آئے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

ذرّہ خاک میں جب ہو چکی شیطاں کی تلاش
پھر زمانے کو ہوئی حضرتِ انساں کی تلاش

ایسی جنّت سے چلو ایسے جہنم سے چلو
جہاں انساں کو نہیں اک غمِ انساں کی تلاش

ڈھونڈھتے اہلِ حرم ہند میں آئے ہیں مجھے
ہے صنم خانہ میں اک مردِ مسلماں کی تلاش

ڈاکٹر مسعود صاحب کلام سنا کر اپنی جگہ پر تشریف لے گئے ہیں ساغر صاحب نے امن صاحب کو پھر پیغام بھجوایا ہے اور وہ بادلِ ناخواستہ مائیک پر گئے ہیں اور اعلان فرمایا ہے کہ اب ساغر نظامی کلام سنا رہے ہیں، لیجئے ساغر صاحب ارشاد فرما رہے ہیں ؎

جو ہیں تغیرات نہیں موت ہے موت وہ حیات نہیں
دل نہیں آشنائے حیات نہیں ہم نہیں ہیں یا کائنات نہیں
اے انجم تھے انتخاب لالہ و گل وہ نہیں ہیں تو کائنات نہیں

اس شعر پر داد بہت اچھی ملی ہے، غزل معلوم ہوتا ہے بادۂ مشرق کی ہے کیونکہ ساغر صاحب کا وہ کلام جو بادۂ مشرق میں ہے وہ تو اب بھی داد لیتا ہے کیونکہ وہ غور و فکر کے سمندر میں ڈوب کر کہا ہوا ہے اور آج کل جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہ ماشاء اللہ ریڈیائی لہروں کا رہینِ منت ہے اس لئے یہ ہوائی کلام عام طور پر ہر مشاعرہ میں ہوٹنگ کا باعث ہوتا ہے۔ سنیئے ساغر صاحب میری پیدائش سے پہلے کی لکھی ہوئی اس غزل کے شعر سنا رہے ہیں ؎

اس طرح بزم میں وہ بیٹھے ہیں جیسے باہم تعلقات نہیں

ساغر صاحب فرما رہے ہیں یہ شعر سجاد ظہیر صاحب کی نذر کرتا ہوں فرماتے ہیں ؎

ذکرِ ساں ہے اور نہ دامن چاک اب وہ آرائشِ حیات نہیں

مگر افسوس ہے کہ سجاد ظہیر کو نذر کیا ہوا شعر سامعین تو کیا خود ظہیر صاحب سے بھی داد نہ لے سکا اس پر ساغر صاحب فرمانے لگے اب جو شعر سنا رہا ہوں شاید اسیں آپ کو پہلے شعر کا مطلب مل سکے (یعنی ساغر صاحب یہ سمجھ رہے ہیں کہ اگر اس شعر پر داد نہیں ملی تو اس کا یہ سبب ہے کہ سامعین اور سجاد ظہیر اس شعر کا مطلب نہ سمجھ سکے) وضاحتی شعر ارشاد ہوا ہے ؎

کچھ بہاروں پہ ہی نہیں موقوف میری وحشت کو بھی ثبات نہیں

اس وضاحتی شعر سے ہی ہوٹنگ کی تالیاں شروع ہو گئی ہیں کیونکہ غزل بہت طویل ہے اور پھر ساغر صاحب کا یہ کلام نشر ہو رہا ہے اس لئے وہ ہر شعر کو ایک ایک کر تین مرتبہ پڑھ رہے ہیں جس سے سامعین بور ہو گئے ہیں، ساغر صاحب نے جب داد کو بیداد میں تبدیل ہوتے دیکھا تو انھوں نے کچھ ہنسی مذاق کی فضا پیدا کرنے کے لئے فرمایا سنیئے جناب بسمل شاہجہاں پوری کی فرمائش پر اُن کا پسندیدہ شعر سنا رہا ہوں ؎

شاخِ گل بن کے گردن مینا میرے ہاتھوں میں اُن کا ہات نہیں

چونکہ بسمل صاحب باریش و باشرع مسلمان ہیں اس لئے ان کی فرمائش اور پسند کے شعر میں "گردنِ مینا" سن کر سامعین نے قہقہہ لگایا ہے اور جناب ساغر بھی اپنے نقلی دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے ہنسنے لگے تو بسمل شاہجہاں پوری فرمانے لگے آپ کے عاشقوں میں ہوں حضور" اس پر تو قہقہوں کا ایک طوفان ہے کہ ختم ہوتے ہی نہیں اور ساغر صاحب جھینپنے کے سے انداز میں یہ شعر سنا رہے ہیں ؎

کعبہ و دیر کو ثبات ہو کیا میکدے کو اگر ثبات نہیں

ساغر صاحب کلام سنانے کے بعد بیٹھ گئے ہیں اور امن صاحب نے اعلان کیا ہے کہ اب جناب روشن صدیقی کلام سنا رہے ہیں رو

صاحب مائیک پر تشریف لے آئے ہیں ایک بہت پرانا قطعہ سُنانے کے بعد دس سالہ پرانی غزل ارشاد فرما رہے ہیں ؎

آتشِ سینۂ افلاک کہیں تک پہنچے ! سرد ہو جائے جو ہم اہلِ زمیں تک پہنچے
کس کو معلوم کہ ہم حسن شناسانِ ازل گھٹتا اوہام سے گذرے تو یقین تک پہنچے
شکوہ و بے رُخی حالِ غم دل نہ سہی ! آگئی بات زباں پر تو کہیں تک پہنچے
جتنے ساغر بھی کئے وقت نے زہر آلودہ سب وہ ارباب خرابات نشیں تک پہنچے

روشن صاحب کو ہر شعر پر داد مل رہی ہے اور حق بھی یہ ہے کہ ان کی یہ غزل ایک کامیاب ترین غزل ہے فرماتے ہیں ؎

غم ہستی نے جہاں سے بھی پکارا ہے دوست ہم اسیرانِ غم عشق وہیں تک پہنچے

روشن صدیقی فرما رہے ہیں شعر سنیئے شاید ماحول کی ترجمانی غزل اس طرح کرتی ہے۔

اپنی دنیا میں شیخ کے سر پر حرم بیٹھ گئے کافرِ عشق ہی اس دشمنِ دیں تک پہنچے
میہمانِ ساقیِ محفل کو تو دیکھا ہے روشن اب یہ ضد ہے کہ ہر اک جام ہمیں تک پہنچے

حضرت روشن صدیقی کلام سنانے کے بعد اور بہت اچھی داد پانے کے بعد تالیوں کے شور میں اپنی جگہ پر تشریف لے گئے ہیں اور اب حضرت بسمل شاہجہانپوری مائیک پر تشریف لائے ہیں، انھوں نے بھی ایک پرانا اور پیشنٹ قطعہ سنایا ہے اور اس کے بعد ایک نظم شروع کر دی ہے چونکہ براڈکاسٹنگ کا وقت بہت کم رہ گیا ہے اور ابھی گلزار دہلوی کو پڑھوانا ضروری ہے لہٰذا قبلہ امن صاحب اور ساغر نظامی بسمل صاحب کی اس حرکت سے بہت ناراض ہو رہے ہیں کہ یہ نظم صبح تک ختم نہ ہوگی اور ادھر گلزار صاحب کی تلملاہٹ مزا لے رہی ہے، ایک فوٹوگرافر بسمل صاحب کی تصویر لینے لگا تو انھوں نے حسب سابق دوکاندارانہ لہجہ میں فرمایا، اے صاحب زادے میری تصویر لیکر کیا کرو گے اسے کون دیکھے گا، امن صاحب نے غصہ کے لہجے میں بسمل صاحب کو روکا ہے کہ وہ جلدی سے کلام ختم کریں اور اس قسم کی مہمل اور بے فائدہ گفتگو سے وقت ضائع نہ کریں، مگر بسمل صاحب سب سے بے نیازانہ "بھکارن" سنائے جا رہے ہیں، گلزار کی تلملاہٹ عروج پر ہے ان کے کمال شروع ہو گئے ہیں اور وہ ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر بھاگتے ہوئے نظر آ رہے ہیں آخر کار انھوں نے ریڈیو والوں کو اُکسا لیا ہے کہ وہ دو چار منٹ اور دے دیں گے بسمل صاحب سے کہا گیا ہے کہ اب بس کیجئے تو انھوں نے "بھکارن" کو ختم کیا ہے، اور اب امن صاحب نے گلزار دہلوی کا اعلان فرمایا ہے، مگر اعلان سے پہلے ہی گلزار صاحب مائیک پر تشریف لے آئے ہیں، فرماتے ہیں میری نظم یو۔پی کے چیف منسٹر ڈاکٹر سمپورنا نند کی آج کل کی اردو دشمنی کے متعلق ہے، مگر امن صاحب نے فوراً روک دیا ہے کہ وہ یہ نظم نہیں سنا سکتے، لہٰذا گلزار نے کچھ اور سنایا ہے جسے سامعین نے پسند نہیں فرمایا۔

ساڑھے گیارہ بجے براڈکاسٹنگ بند ہو گئی ہے کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ وہ دلی جہاں شرافت اور اخلاق نے اپنے جھنڈے گاڑے تھے، اسی دلی میں اب پڑھے لکھے حضرات میں بھی ان دونوں چیزوں کا فقدان پایا جا رہا ہے، حضرت ساغر نظامی اور حضرت روشن صدیقی محکمہ ریڈیو میں ملازم ہیں اور انھیں ہر روز ریڈیو سے اپنا اچھا بُرا کلام اور دیگر پروگرام براڈکاسٹنگ کرنے کے مواقع حاصل ہیں، قبلہ محروم نہیں ......

جناب امن لکھنوی اور دیگر کئی مقامی و غیر مقامی صف اول کے شاعران کرام تشریف فرما ہیں انھیں براڈکاسٹنگ پروگرام میں موقع نہیں دیا گیا۔ اور وہ لوگ جن کے نام کے ساتھ موٹی موٹی ڈگریاں تھیں یا جن کے ساتھ منتظمین یا جناب ساغر نظامی کے دوستانہ راسم تھے انھیں ریڈیو پروگرام میں موقع دیا گیا، جناب ساغر سے تو ہمیں کوئی توقع نہیں مگر جناب روشن سے اس بے ادبی کی ہمیں امید نہ تھی تاہم اگر ساغر صاحب دلی کی مثالی شرافت کو نقصان نہ پہنچاتے تو ان کا احسان ہوگا۔

ریڈیو سے مشاعرہ نشر ہونا بند کیا ہوا، شعرا حضرات جنہیں یہ توقع تھی کہ انھیں موقع ملے گا وہ سب اُٹھ کر جا رہے ہیں سامعین کی بھی ایک بڑی تعداد چلی گئی ہے۔ انجمن ترقی اردو راجستھان کے جنرل سکریٹری جناب شاغل جے پوری بھی اسٹیج سے اُٹھ کر چلے گئے ہیں، کل راجستھان اردو کانفرنس کے مشاعرہ میں شاغل صاحب اور ان کے ساتھیوں نے حق داروں کا حق مار کر بعض چند قسم کے سفارشی شعرا اور دہلوی شعرا کو ریڈیو پر پڑھوایا تھا اور راجستھان کے نمائندہ شاعروں کی توہین کرتے ہوئے انھیں موقع نہیں دیا تھا لہٰذا اس موقع کے اثرات آج شاغل صاحب کے سامنے حقیقت بن کر کھڑے ہو گئے ہیں اور کل ہند اردو کانفرنس والوں نے ریڈیو مشاعرہ پر راجستھان کے ایک شاعر کو بھی اس لائق نہ سمجھا کہ؟

اس پر کلام ہی موقع دیا جاتا کیونکہ جب راجستھان والے ہی راجستھانی شعرا کی قدر نہ کریں گے تو باہر والے ان کی قدر کیوں کرنے لگے۔ شاغل صاحب غصّے سے بھرے ہوئے تشریف لے گئے ہیں۔ انھیں آج معلوم ہوا ہے کہ محض کل راجستھان اردو کانفرنس کی مشاعرہ کمیٹی کے باعث آج راجستھانی شعرا کی بے عزتی کل ہند اردو کانفرنس میں ہوئی ہے

مشاعرہ عملی طور پر تو ختم ہی سمجھئے تاہم کارروائی جاری ہے شاہد نوقی رعنا جگی اور دیگر شعرائے کرام نے ایک ایک دو دو اشعار سنائے ہیں اور گلو خلاصی کرائی ہے، قبلہ مرحوم صاحب کی خدمت عالیہ میں گذارش ہے کہ ایسے بے ہنگم موقوف پر وہ اگر فراخ دلی کا ثبوت نہ دیا کریں تو بہتر ہے، دلگیر غیرانی اسٹیج پر آئے تو فرمانے لگے کہ حضرات میں آج "گلزار نامہ" سنانے آیا تھا مگر قبلہ احسن لکھنوی کے فرمان پر وہ نہیں سنا رہا۔ بالسباں وہی گلزار جسے پرسوں پر دھان منتری اور مولانا آزاد کے ساتھ تصویر کھینچوانے کی کوشش کرنے وقت سیکورٹی پولس نے دھکے مار مار کر پیچھے کیا مگر وہ تصویر کھینچوا کر ہی رہا، اور وہی گلزار جس کی کارگزاریوں کے متعلق پچاس سے زائد اشخاص نے اپنے دستخطوں اور ہتوں سے ایک پمفلٹ چھاپ کر اردو کانفرنس میں کھلے بندوں تقسیم کیا ہے اس کے بعد دلگیر سنیرانی صاحب نے فرمایا کہ اب جو غزل سنا رہا ہوں اگر گلزار ایسی غزل کہہ دے تو شاعری چھوڑ دونگا۔

بدنظمی کے عروج میں یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ صاحبِ صدر تشریف لے جا رہے ہیں اس لئے وہ جانے سے پہلے اپنا کلام سناتے جائیں، اس پر پرتھوی راج کپور خالص شاعرانہ انداز میں گویا ہوئے ؎

نظامِ خلق میں میری بھی کیا تخلیق کی تو نے!!
ملک سے آدمی آدم سے حیواں ہوتا جاتا ہوں

بہری قربت میں تجھے ماسوا، وحشت کچھ پایا!
تری قربت میں وحشی سے میں انساں ہوتا جاتا ہوں

اس غزل پر کپور صاحب کو بہت اچھی داد ملی تو انھوں نے دوسری غزل ایکٹنگ کی جملہ رعنائیوں کے ساتھ یوں ارشاد فرمائی ؎

مرد یا تو نے اپنے دل سے بھلادی پھر ہنس کے کہنے بھلادی بھلادی
مرے پیار تو تھی اک کھیل جانا ٭ یہ بازی اٹھا دی یہ بازی بچھا دی
لپٹ کر رہے پاؤں سے تو نے اکثر ٭ کہا تھا کہ جنت زمیں پر بسا دی

پرتھوی راج کپور بڑے بڑے شاعروں کے مقابلے میں زیادہ داد پا رہے ہیں ؎

مجھے اپنے قدموں سے نہ دور کرنا ٭ یہ بات آج تم نے بھلادی بھلادی
تمھیں بھول جاؤں یہ کیا کہہ رہے ہو ٭ یہ کیا الٹی پٹی کسی نے پڑھادی
گلہ ہو نہ شکوہ نہ اُف ہو نہ ہائے ٭ کڑی شرط یہ پیار پہ کیا لگا دی
کہیں دور آموں پہ کوکے جو کوئل ٭ یہ سمجھا ہے دل نے تری ہی صدا دی

مری زندگی اک مسلسل سفر ہے!
جو منزل پہ پہنچے تو منزل بڑھا دی

کُل ہند اُردو کانفرنس کے اس ناکام ترین مشاعرے کی رُوداد صاحبِ صدر کی اس غزل پر ختم کر رہا ہوں۔

پہلی قسط

اور دھرتی کانپ اٹھی

احمد حسین شمس

یہ کل ہی کی بات تو ہے جب صرف ایک امرود کے لئے ہیرا نے اس کے ہاتھ کو دانتوں سے کاٹ لیا تھا اور جب منوہر نے اسے ایک چپت ماری تو وہ لگی رونے...

میں تمہارے ساتھ نہ کھیلوں گی ۔

میری بلا سے ۔

یہ امرود تمہارے باپ کا تھا

خبردار ہیرا ۔ زبان سنبھال کر بول ورنہ تیرے سر کے بال نوچ لوں گا۔

بڑا آیا ۔ اب آنا میرے گھر گھروندے نکلوا نہ دوں تو میرا نام نہیں ۔

میں اپنے گڈے کا بیاہ موہنی کی گڑیا سے رچاؤں گا ۔ پھر میری خوشامد نہ کرنا ہاں ۔

" جاؤ میں تم سے نہیں بولتی " اور پھر منہ بسور کر ہیرا وہیں بیٹھ گئی تھی ۔ منوہر نے خوشامد منت کی حد کر دی مگر ہیرا تھی کہ چپ سادھے منہ پھلائے بیٹھی رہی ایک کے بدلے منوہر نے دس امرود اسی وقت درخت سے توڑ کر دئے مگر ہیرا نہ بولی اور نہ بولی وہ چپ چاپ اٹھ کر اپنے مکان کی طرف چلی ۔ منوہر [illegible] کے پیچھے پیچھے چلا ۔ ہیرا مکان جا کر اپنی ماں کی گود میں منہ چھپا کر رونے لگی منوہر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا ۔ مقدمہ ہیرا کی ماں کی عدالت میں پیش ہوا ۔ ہیرا نے اپنا زخمی گال دکھلایا منوہر نے اپنا ہاتھ [illegible] کر رہا تھا ۔ دونوں پھر [illegible]

اور اسی طرح دونوں کھیلتے کودتے جوان ہوئے ۔ مگر جوانی دونوں کے حق میں ایک بلا بن گئی ۔ شباب آہنی دیوار بن کر دونوں کے درمیان حائل ہو گیا ۔ دونوں جوں جوں قربت کا احساس ہوتا چلا دونوں کے جسم اسی قدر ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے ۔ صرف تخیلات تھے جو دونوں کو تسکین دے رہے تھے ۔ امید موہوم تھی مگر اسی امید پر دونوں نے اپنی عمارت کھڑی کی ۔ امید خلافِ امید تھی مگر جینے کا سہارا تو تھی ۔ پیار اگرچہ بند تھی مگر دل کی دھڑکنیں تو ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہی تھیں ۔ منوہر کا دل شاعر بنتا گیا اور ہیرا جانِ شعریت بن گئی ۔ منوہر سوچتا ...... ایک پہلے زمانے کے عاشق تھے جو لاکھوں رسوائیوں کے باوجود کم از کم اپنے دل کی بات اپنے محبوب کے گوش گزار کرا دیتے تھے اور ایک میں ہوں کہ اپنی آہ کی آواز کو اس کے کان تک پہنچا نہیں سکتا ۔ وہ افسانہ کیوں کر ہے جو عاشق اور معشوق کے درمیان نامہ بر کا کام انجام دیا کرتا تھا ۔ کالی داس نے بادل کے ذریعہ یہ تیم تک کا پیغام پہنچایا تھا آج وہی بادل ہیں مگر افسوس کہ میرے دل کی دھڑکنیں تک نہیں پہنچ سکتے ۔ [illegible] جب مکان آتا ہوں تو صرف اس امید پر کہ کسی [illegible] کا دیدار نصیب ہو جائے ۔ مگر [illegible] قدم آگے بڑھ کر [illegible] مقام لیتی ہے ۔ آخر کشن [illegible] کو [illegible]

کرتی ہے کہ اس نے میرا ہر پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ وہ
... قدم نہیں نکال سکتی جس کی پرورش ہو گیا
ہے۔ آنکھیں ... کو ترس جاتی ہیں مگر میرا کی پرچھائیں تک
... آتی۔"

منوہر کی ماں اس کے کمرے میں آئی اس وقت منوہر
آرام کرسی پر بیٹھا کرسی سب کچھ سوچ رہا تھا۔ ماں کو دیکھ کر
مسکرانے لگا۔ اس کی ماں نے کہا۔ "تمہاری بھابی آئی تھی؟"

"ہاں تو۔"

"تم نے ناشتہ کر لیا؟"

"نہیں تو۔"

"اب کب کھاؤ گے؟ آٹھ بج رہے ہیں۔"

"نہیں تو۔"

"یہ نہیں تو کیا۔ میں پوچھتی ہوں اب ناشتہ کب کرو گے؟"

"کھانے کی خواہش نہیں۔"

"کیوں؟"

"عقلمندوں نے کہا ہے کیوں کا کوئی جواب نہیں۔"

"کیوں نہیں؟"

"یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں ماں۔ اور کل سے یہی
سوچ رہا ہوں کہ کیوں کا جواب آخر کیوں نہیں۔ فرض کرو
ماں کوئی تم سے پوچھے یہ زمین آسمان بھگوان نے کیوں بنائے؟"

"ارے بیوقوف تمہاری ماں بھی کیا تمہاری طرح
وکیل بن رہی ہے کہ ان بحثوں میں وقت برباد کرے۔ وکیل
بھی کرتا تو کیا کہوں اور ... مسئلہ ... کیا سے کرتے
میں کہتی ہوں ناشتہ کر لے۔" اور پھر اس کی ماں نے آواز
دی۔ "بڑی بہو، منوہر کا ناشتہ یہاں لے آ۔"

منوہر کی بھابی ... آئی اور بولی۔ "منو آج ناشتہ
... کر رہے ..."

"... بھی دیکھا ... ہے ... وکالت پڑھ رہا ہے
مگر اسے بھگوان ... عقل ... نہ جانے کیسے
... اب ... ناشتہ نہ کریں تو
اس کے منہ ... [illegible]

اس کی عادت ہی رہی جب تک تم نے بنا کر اس کے
منہ میں نہ ڈالو یہ کھانا کھاتا ہی نہ تھا۔"

ماں چلی گئی۔ منوہر کی بھابی نے کہا۔ "منو کس
کی چنتا ہے؟"

"ہولی کے دو روز بعد چلا جاؤں گا۔"

"تو کیا یہ سال بھر تک روز تمہارے منہ
میں کچوریاں ٹھونس دیا کروں گی۔"

"تم بھی تو مذاق کرنے لگیں بھابی۔"

"آخر تم ناشتہ کیوں نہیں کرتے؟"

"بھابی ایک بات کہوں؟"

"نہیں پہلے ناشتہ کر لو ورنہ تمہارے
بھیا سنیں گے تو الٹا مجھے ہی ڈانٹنے لگیں گے۔"

"بھابی آج اگر پتا جی ہوتے تو کشن لال
کو نیچی نظروں سے نہ دیکھتے۔"

"ہائے دیا اس وقت سے تم یہی سب سوچ رہے ..."

"ہاں اور اسی فکر نے میری بھوک مار دی ہے"

"تب تو واقعی میں تمہارے منہ میں کچوریاں ٹھونسنی پڑیں
گی۔" یہ کہتی ہوئی اس کی بھابی کمرے سے باہر نکل گئی
ادھر منوہر کے لب پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی
مگر یہ وہ مسکراہٹ تھی جسے مسکراہٹ کہنا اس کی توہین
تھی۔ دل کے جذبۂ غم نے پیچ و تاب کھا کر اس کے
چہرے پر چند شکنیں پیدا کر دیں اور بس۔ منوہر کا دل
چاہتا تھا۔ آنکھیں اس کے رازوں کی غمازی کرتی
تھیں مگر وہ منزل ابھی دور تھی جہاں عقل ایک
کو تنہا چھوڑ دیتی ہے۔ عشق گریبان چاک
کا نام نہیں بلکہ اپنے محبوب کی پرستش کا نام ہے
تک پہنچنے کے لئے عقل کی رہنمائی کی ضرورت
نہیں۔ شاعری کی دنیا اور ہے واقعات کی د...
شاعر کے نغمے سکون نہیں بخشتے بلکہ فریب سکوں
عاشق اپنے کو فریب دینے کے لئے نئی نئی تجویز
... مگر وہ ... [illegible]

کے قدموں پر نہیں بلکہ خود اپنے قدموں کے نیچے کامیابی کو زیر کرنا چاہتا ہے اس کا بہترین حربہ جنون نہیں عقل ہے۔ جنون نام ہے شکستِ تمنا کا۔ منوہر اپنی تمنا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہونے کے باوجود اسے عقل کی رہنمائی منظور تھی۔

تقدیر کی غلامی مجبوری کا دوسرا نام ہے اور تقدیر پر حکومت کرنے والے اپنے کو مختار کہتے ہیں آنکھیں اس لئے نہیں کہ انہیں بند کرکے راستہ طے کیا جائے بلکہ اس لئے ہیں کہ راہ کے سنگریزوں اور کانٹوں سے پاؤں صحیح سلامت رہیں۔ منزل اگر نظر آ گئی تو پھر راہ کی دشواریاں بازیچۂ اطفال سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ منوہر نے طے کر لیا ـــــ اس کے دل نے بھی اور اس کی عقل نے بھی۔ ہیرا کو حاصل کرنا ہی مقصدِ حیات ہے۔ ہیرا کے بغیر منوہر ایک جسدِ بے رُوح ہے۔

بھابی ناشتہ لے کر آئی تو منوہر نے کہا: "تو کیا مجھے کھانا ہی پڑے گا؟"

"جی نہیں، مجھے کھلانا پڑے گا" بھابی نے کچھ اس انداز میں کہا کہ منوہر ہنس پڑا۔

"بھابی! تم بھی ہزاروں میں ایک ہو۔ جب میں چھٹیوں میں آتا ہوں اور تم نہیں رہتیں تو رام قسم میرا جی نہیں لگتا۔"

اور اس کی بھابی شرما گئی۔

"چلو بھی۔ تمہاری یہ سب باتیں مجھے اچھی نہیں لگتیں۔"

"ہاں اچھی کیوں لگنے لگیں" منوہر نے ذرا نقل اتارتے ہوئے کہا: "یہی بات اگر بھیا کہتے تو اچھل کر ان کی گود میں جا بیٹھتیں مگر کہا منوہر نے، اسی لئے بُری ہو گئیں۔"

"ہاں جب تمہاری شریمتی جی آئیں گی تب دیکھوں گی مجھ سے بات کرنے کا وقت بھی ملتا ہے یا نہیں۔"

"میں نے تو کنوارا رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے بھابی۔"

"رام کہو ایسی بُری باتیں منہ سے نہیں نکالتے۔ رشیوں اور منیوں نے سیکڑوں دیوتاؤں اور بھگوانوں کی پتنیاں ہیں تو تم تو انسان ہو" بھابی

نے میز پر ناشتہ رکھتے ہوئے کہا۔

"سچ کہتا ہوں بھابی شادی کرنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"ابھی تو کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا، اب شادی کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ شادی نہ ہوئی ناشتہ ہو گیا کہ جب جی چاہا ناشتہ کیا اور جب جی چاہا نہیں کیا۔"

"یقین مانو بھابی۔ اس جھنجھٹ میں کون پڑے گا۔"

"تو جس طرح یہ ناشتہ تمہیں زبردستی کھلاؤں گی اسی طرح تمہاری شادی بھی زبردستی کر دوں گی۔"

"مگر تمہاری طرح پڑھی لکھی عقلمند سگھڑ اور نیک لڑکی کہاں ملتی ہے؟"

"اچھا باتوں میں وقت برباد مت کرو پہلے ناشتہ کر لو پھر دوسری بات ہو گی۔"

"تم تو زبردستی کھلاؤ گی" اور منوہر ناشتہ کرنے لگا اور اس کی بھابی چائے لانے گئی۔

منوہر ناشتہ کر رہا تھا اور سوچتا بھی جا رہا تھا کہ کس طرح ہیرا سے دو بات ہو، بات نہ سہی ملاقات ہی سہی، ملاقات نہیں تو کم سے کم اسے ایک جھلک ہی دیکھ لوں۔ مگر تدبیر کون سی اختیار کی جائے۔ برادری میں پردہ کا رواج نہ رہنے کے باوجود ہیرا سے ملاقات کرنا آسان کام نہیں۔ کشن لال نے سخت تاکید کر دی ہے کہ ہیرا گھر سے باہر قدم نہ رکھے۔ دولت اور علم نے بھی کشن لال کے گھرانے کو بالکل قدامت پسند بنا ڈالا تھا۔ علم انسان کو فراخدل بناتا ہے مگر کشن لال پر اس نے الٹا اثر کیا۔ کشن لال لاکھ دولت مند ہوں پھر تعلیم یافتہ ہوں مگر وہ برہمن اور راجپوت نہیں ہو سکتے [illegible] کی سگائی اپنی برادری [illegible] خاندان اور خصوصاً منوہر سے [illegible] ذرا وہ اپنی لڑکی سے پوچھے کیوں [illegible] منوہر پسند ہے کیا تمہاری شادی [illegible] اور منوہر آپ ہی آپ [illegible] اس کی کیا پڑی ہے کہ اس معاملے [illegible]

[illegible] بلندی حاصل کریں انہیں تو ہیرا کے جسم اور جان [illegible] پر اختیار ہے جہاں چاہیں جھونک دیں وہ [illegible] بیان کیا کرے گی ۔ ۔ ۔ ۔

منو ــ اور منوہر کا سلسلہ خیال ٹوٹ گیا اس نے [در]وازے کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا اس کے بھیا موہن [کھڑے] ہیں ۔ منوہر نے کھڑا ہونا چاہا مگر موہن نے کہا [بیٹھے ر]ہو ۔ میں یہ پوچھنے آیا ہوں تم نو بجے دن تک [اپنے] کمرے میں پڑے کیا کر رہے ہو شہر سے آئے ہو ذرا [گھر] کے بزرگوں سے مل آؤ ۔ ابھی کشن لال کا آدمی آیا تھا [تمہارے] بارے میں پوچھ رہا تھا ۔

"کیا پوچھ رہا تھا وہ ؟ منوہر کے دماغ میں بہت [سے خی]الات یکے بعد دیگرے آنے لگے محبت ہندوستان [میں ا]یک جرم ہے اور مجرم کا ذہن کبھی شک سے خالی [نہیں] رہتا منوہر کو ایسا محسوس ہوا دروازے پر [اس] کے بھیا موہن نہیں بلکہ کوئی پولیس کا آدمی کھڑا [ہے] اور اب یہ گرفتار ہوا چاہتا ہے ۔

"اس نے کچھ کھل کر تو نہیں کہا صرف اس قدر کہا [تھا] کشن لال یاد کر رہے ہیں تم ناشتہ کر کے ان سے [مل لو] اور اب تو میرے آفس جانے کا وقت ہو گیا ۔ ہاں [تمہار]ی بھابی کہاں ہے ؟ "

"باورچی خانے گئی ہیں ۔"

"اچھا میں اپنے کمرے میں جاتا ہوں اسے وہیں [بھیج] دینا ۔"

موہن لال چلے گئے اور ادھر بھابی چائے لا کر کھڑی ۔ منوہر نے پیالی اٹھائی اور کہا ۔ "بھیا آئے تھے ۔"

"ہاں میں سن چکی انہیں کچہری جانا ہے دہلی کی [ل]الن کے یہاں کل سے ہے ۔"

"وہ سائیکل پر شہر جاتے ہیں ؟"

"لیکن آج وہ نہیں جائیں گے بھابی نے کہا اور [دوپٹ]ے کے انگلی سے تولیہ لیتے ہوئے کہا "شہر یہاں [سے دور] ہے تو ہے آج وہ پیدل ہی جائیں گے

اس لئے اتنی عجلت ہے ۔"

"بھابی ۔ کشن لال نے مجھے کیوں بلایا ہے ؟"

"ابھی ٹھہرو ۔ ذرا میں تمہارے بھیا کو بھوجن دے آؤں پھر تم سے باتیں ہوتی ہیں ۔"

منوہر کی بھابی آنچل سنبھالتی ہوئی وہاں سے چلی اور منوہر پھر چند متضاد باتیں سوچنے لگا ۔

(باقی آئندہ)

غزل

قمر ایوبی ۔ بی ۔ اے ۔ پال گھیر

فکر کی آگ میں یوں تپ کے سخنور نکلے
کان سے جیسے تراشے ہوئے جوہر نکلے

ہم تو سہہ سہہ کے ستم ہو گئے خوگر لیکن
تیرے ارمانِ ستم کیوں نہ ستمگر نکلے

داغِ بدنامیِ الفت نہ مٹا پر نہ مٹا
آنکھوں سے لاکھ ندامت کے سمندر نکلے

جوہری ہو کے پرکھ بھی نہ سکے انساں کو
ہم نے گوہر جنہیں سمجھا تھا وہ کنکر نکلے

کارواں اپنی طلب میں سرِ منزل پہنچا
رہ گئے پیچھے جو دیکھا تو وہ رہبر نکلے

جس نے ٹھکرا دیا دنیا کو قلندر کی طرح
اس کی ٹھوکر میں تو شاہوں کے بھی افسر نکلے

ہم نے پتوار تدبر کی سنبھالی پیہم
تب کہیں جا کے حوادث کے یہ چکر نکلے

اس قدر ظاہر و باطن میں تفاوت دیکھو
شیش محلوں کی بھی بنیاد میں پتھر نکلے

دوستی پر تھا بہت ناز ہمیں جن کی قمر
آستینوں میں لئے آج وہ خنجر نکلے

اللہ کا انصاف

(ڈاکٹر آدم سے سرت ارمان (جاری)

بیوپاری ٹرک ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا اپنا مال شہر منڈی
ے جا رہا تھا۔ ڈرائیور اپنی گھریلو کشمکش کے بارے میں
ا سے اپنی بیوی کے چڑچڑے پن اور حماقتوں کی تفصیل
ان امیر حمزہ کی طرح بیان کیے جا رہا تھا کہ بیوپاری نے
ی سے کہا دیکھو ڈرائیور بھائی کھولتے تیل میں پانی گرنے
واقعہ ہوتی ہے۔ مگر جب وہی پانی ٹھنڈے تیل میں گرتا
کچھ بھی آواز نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ دونوں کا مزاج ملتا ہے
ح اگر میاں بیوی دونوں ہم خیال اور ایک طرح سے گھر کے
کے لئے سوچیں تو کبھی بدمزگی نہیں ہو سکتا۔

ٹرک کا اسٹیرنگ کو چابک دستی سے گھماتے ہوئے ڈرائیور نے
ا کی دلیل کو تسلیم کرتے ہوئے راہ میں ایک مسافر کا اشارہ
ا بیٹھتے ہوئے ٹرک کو سڑک کے ایک کنارے روکا
سافر سے شہر تک کا کرایہ طے کر کے بیوپاری کے پاس ہی
بٹھا لیا۔

بیوپاری کہنے لگا ڈرائیور صاحب! میرے مال کو تم نے شہر
تک پہنچانے کے لئے ڈیڑھ صد روپیہ بھاڑا لیا ہے
ے کا سارا تمہاری جیب میں ہی ہو جائے گا۔ کیونکہ ٹرک
اس کا کوئی علم نہیں ہے وہ تو یہی سمجھے گا کہ واپسی پر ٹرک
پس آیا ہے۔ اس پر بھی روپیہ ڈیڑھ روپیہ کرایہ کما لیتے
ہو۔ اور خلاف قاعدہ مسافروں کو ٹرک میں بٹھاتے ہو۔

ڈرائیور نے ذرا طنزیہ انداز میں کہا سوچی اگر آپ کے
یں ہزاروں روپے پڑے ہوں اور راستے میں ایک روپیہ
جائے تو کیا آپ اسے چھوڑ دیں گے۔ بیوپاری مسکراتے
کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

راستے میں بٹھائے گئے مسافر نے ناک پر ہاتھ رکھتے ہوئے
ہائی شراب کی بو آ رہی ہے۔ ڈرائیور فوراً کہنے لگا میاں مجھے
سے چلنے والی گاڑیوں میں ایسی بو آتی ہے۔ میاں جی یہ سنتے
ہوتے سمجھ گئے کہ ڈرائیور جھوٹ بول رہا ہے اور بات بنا رہا ہے
خاموش ہو گئے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ڈیزل سے شراب کی
بو کیا آئے گی ڈرائیور خود شراب پیئے ہوئے ہے۔

تھوڑی دیر بعد میاں جی کہنے لگے ڈرائیور صاحب! اللہ ہر کسی کی
حفاظت کرے، ویسے سنا ہے کہ سرکار نے یہ قانون بنایا ہے کہ
ایکسیڈینٹ میں مرنے والے کے وارثوں کو گاڑی کے مالک کو
پندرہ ہزار روپیہ راحت کے طور پر دینا ہوگا۔ اگر واقعی ایسا قانون
بن گیا ہے تو حادثات میں کچھ کمی آ جائے گی۔ ڈرائیور نے کسی حد تک
قہقہہ لگاتے ہوئے کہا میاں جی! کہیں ایسی باتوں سے ایکسیڈینٹ
رکتے ہیں۔ ایکسیڈینٹ ڈرائیور نہیں کرتے بلکہ آر۔ ٹی۔ او
صاحب کراتے ہیں۔ جو ایسے لوگوں کو بھی ڈرائیونگ لائسنس
دے دیتے ہیں جنہیں اسٹیرنگ پکڑنا نہیں آتا۔ مگر رشوت کے
صدقے ان لوگوں کو گھر بیٹھے لائسنس مل جاتا ہے۔ قاعدہ تو یہ ہے
کہ آر۔ ٹی۔ او اپنے سامنے لائسنس لینے والے سے گاڑی چلوا کر
دیکھیں۔ اُن سے موڑ کٹوائیں۔ اُن سے گاڑی کو بیک کرائیں
ٹریفک کے نشانات کے بارے میں دریافت کریں۔ جیسا کہ ہر
ترقی یافتہ ملک میں ہوتا ہے۔

ڈرائیور بڑے فخر سے کہنے لگا کہ سرکار قانون بناتی ہے مگر
ہر قانون سے بچنے کا راستہ یار لوگ نکال ہی لیتے ہیں۔ میاں جی اور بیوپاری
وقت کٹی کے طور پر ڈرائیور کی باتیں بغور سن رہے تھے۔ ڈرائیور
نے کھڑکی سے باہر تھوکا اور آستین سے منہ پونچھتے ہوئے سلسلہ
کلام یوں جاری رکھا۔

ایک بار مجھ سے عین کوتوالی کے سامنے ایک اسکولی بچہ کچلا گیا
ایکسیڈینٹ ہونے پر ڈرائیور نہ قانون سے ڈرتا ہے اور نہ ہی پولیس
کا اسے خوف ہوتا ہے۔ وہ ڈرتا ہے موقع پر جمع ہو جانے والے مجمع
سے۔ جو غصہ سے بے قابو ہو کر ڈرائیور کو اکثر اوقات جان سے ہی
ختم کر دیتا ہے۔ لہٰذا میں نے ہوش و حواس ٹھکانے رکھے

بمشکل نیچے اُتر کر ٹرک کے بریک کا تار کاٹ دیا۔ اور موقع واردات سے فرار ہوگیا۔ پولیس آئی اور گاڑی کو کھینچ کر کوتوالی کے احاطے میں لے گئی۔ اور مُردہ بچے کے بارے میں مناسب کارروائی کے بعد پوسٹ مارٹم کیلئے بھیج دیا۔ میں سیدھا ہیڈ ڈرائیور کے پاس پہنچا اور سو سو کے دو نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا! حضور میں آپ کا ہمپیشہ ہوں۔ اور سات بچوں کا باپ ہوں۔ ہیڈ ڈرائیور خود بھی نصف درجن بچوں کا باپ تھا۔ لہٰذا اُسے میرا مدعا سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ لہٰذا میری بات کاٹتے ہوئے بولا!— گاڑی کیسی ہے؟ میں نے گاڑی کو جس طرح سیٹ کیا تھا ہیڈ ڈرائیور کو سب کچھ بتا دیا۔ چنانچہ جب گاڑی کا سرکاری طور پر معائنہ کرنے کیلئے ہیڈ ڈرائیور کو بھیجا گیا تو انہوں نے رپورٹ میں لکھا کہ ایک بچے کی موت پر ہی حادثہ ٹل گیا ورنہ ٹرک کے بریک فیل ہو جانے کے باعث حادثہ کی نوعیت کہیں زیادہ خوفناک ہو سکتی تھی۔ ڈرائیور کی کوئی خطا نہیں ہے۔ اگر ڈرائیور بے خطا ٹھہر جائے تو پھر پولیس وغیرہ کی بھی خدمت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی لہٰذا نہ ہی مالک کو کسی قسم کا جرمانہ ہوا۔ اور نہ ہی مجھے سزا۔ ہاں کچھ دنوں تک تھانے اور کچہری کے چکر ضرور لگانے پڑے۔

میاں جی سے رہا نہ گیا اور اُن کی زبان سے نکل ہی گیا۔ ڈرائیور صاحب تم نے چالاکی سے اپنے آپ کو سزا اور مالک کو ہرجانہ ادا کرنے سے بچا لیا۔ مگر بیچارے مرنے والے کے ساتھ تو ظلم اور بے انصافی ہوئی۔ ڈرائیور نے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا! بڑے میاں اِس دُنیا میں انصاف ڈھونڈتے ہو؟

میاں جی نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اور ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا بھئی اِس دنیا میں انصاف ہے یا نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کے ہاں نہ رشوت چل سکتی ہے اور نہ ہی کسی کارستانی کے باعث سزا سے بچا جا سکتا ہے۔ اس لئے وہاں تو ہر ایک کے ساتھ انصاف ہوتا ہے۔ ڈرائیور نے پھر پُرغرور انداز میں کہا! میاں جی وہاں کی وہاں دیکھی جائے گی۔ ڈرائیور بار بار ہارن بجا رہا تھا اور گاڑی کی رفتار اس کے نشے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ میاں جی سہمے ہوئے انداز میں کہا ڈرائیور صاحب ڈرائیور کو اول تو شراب پی کر گاڑی چلانی ہی نہیں چاہئے۔ اور اگر وہ اس کا عادی ہے تو بھی گاڑی کو مناسب رفتار سے چلاتے ہوئے ہر ممکن طور پر اپنے اور راہ چلتے لوگوں کی زندگی کا خیال رکھنا چاہئے۔ مگر ڈرائیور میاں جی کی باتوں کا تمسخر اُڑاتے ہوئے گاڑی کو بے تحاشہ چلاتا رہا۔ ابھی کچھ ہی فاصلہ طے ہوا تھا کہ ڈرائیور نے بار بار مسلسل ہارن بجانا شروع کیا۔ دیکھا تو سامنے سڑک پر ایک بوڑھا لاٹھی ٹیکے پوٹلی لٹکائے کندھے پر رکھے جا رہا تھا۔ جو ہارن کی مسلسل آواز کے باوجود بھی سڑک کے کنارے نہیں ہو رہا تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار کو کم نہ کیا مگر ہارن بجاتا رہا۔ اور یہاں تک کہ راہگیر کے بالکل قریب جا کر اُس نے پھر ہارن کو مسلسل بجایا۔ راہگیر جو اتفاق سے بہرہ تھا۔ بالکل اپنے قریب ہارن کی آواز کسی حد تک سُن کر چونکا۔ اور صحیح فیصلہ نہ کر سکا۔ اور گھبراہٹ میں اور بھی سڑک کے درمیان میں آگیا۔ اِدھر ڈرائیور بھی راہگیر کو بچانے کی کوئی بھی ترکیب اختیار نہ کر سکا تھا۔ نتیجے میں گاڑی کی ہیڈ لائٹ بڈھے کی کمر سے ٹکرائی جس سے وہ گر پڑا۔ اور اس کی لاٹھی ہیلپر راڈ میں کڑاک سے لگی۔ ہمارا کیا بگڑتا تھا۔ "مر گیا بے چارہ" بیوپاری اور میاں جی کی مُشترکہ آواز سُنتے ہی ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار اور تیز کر دی۔ جیسے آگ لگنے پر ہوا میں بھی از خود تیزی آجاتی ہے۔ بیوپاری اور میاں جی نے ڈرائیور سے بار بار کہا کہ بھائی گاڑی دھیرے چلاؤ ورنہ کسی اور کو بھی کچل دو گے۔ ڈرائیور نے سپیڈ کو تیز سے تیز رکھتے ہوئے کہا کہ ایسے وقت بھاگ جانے میں ہی خیریت ہے۔ سڑک کے دونوں طرف گاؤں ہیں۔ کسی نے دیکھ لیا یا گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا تو آفت آجائے گی۔ میاں جی کھڑکی سے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا کہ گاؤں کے کسان جو کھیتوں میں کام کر رہے تھے وہ لاش کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ ڈرائیور نے بڑی لاپرواہی سے کہا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بیوپاری نے افسوس لہجے میں کہا! ڈرائیور بھائی آپ لوگ کبھی کبھی بڑا ظلم کرتے ہیں۔ ڈرائیور نے بدمزگی کے انداز میں کہا لالہ جی ہندو ہو کر ایسی باتیں کرتے ہیں۔ مارنے ہم ظلم کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ ہر آدمی کو پچھلے جنم کے کرموں کا پھل بھگتنا ہوتا ہے۔ ہر جیو کو اپنے کرموں کی سزا ملتی ہے۔ بھگوان کے حکم کے بغیر پتا نہیں ہل سکتا۔ کیوں میاں جی ہے نہ قرآن شریف کی زبان ...... میاں جی ڈرائیور کی اس بے معنی اور بے موقع باتوں کے جواب میں خاموش ہی رہے۔ مگر بیوپاری نے کہہ ہی دیا کہ بے شک

ایسا کہہ کر دامن بچالو۔ مگر اس بچارے کی موت کے ذمہ دار تم ہی ہو۔ اس لئے اس کرم کا بھی تم کو بھی بھگتنا پڑے گا۔ لالہ جی آپ تو یونہی باتیں بنا رہے ہو۔ کہتے ہوئے ڈرائیور نے میاں جی کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا! کیوں بڑے میاں بغیر ثبوت کے بھی کسی کو سزا دی جا سکتی ہے؟ مانا کہ یہ بڈھا میری گاڑی کے نیچے میری بے پرواہی کے باعث کچلا گیا ہے۔ مگر عدالت کے پاس ان باتوں کا کیا ثبوت ہے۔ تھوڑی دیر میں گاڑی شہر منڈی میں پہنچ جائے گی۔ ڈرائیور بار بار شیشے میں دیکھ رہا تھا کہ کوئی اس کا پیچھا تو نہیں کر رہا۔ کچھ دور ایک موڑ آیا اور سڑک کی سمت بدل جانے کے باعث پیچھے دیکھنے کی بھی ڈرائیور کو ضرورت نہ رہی۔ میاں جی اپنی مالی پریشانیوں کے پیش نظر مرنے والے بڈھے کے گھر والوں کی اقتصادی پریشانیوں اور دیگر کئی باتوں کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ بیوپاری کو یہ ڈر لگ رہا تھا کہ اگر گاڑی پکڑی گئی تو اس کا مال بھی کھٹے میں پڑ جائے گا۔ اور گواہی وغیرہ کے جھنجھٹ میں الگ پھنسنا ہوگا۔ اس لئے تو وہ چاہتا تھا کہ ڈرائیور جلد سے جلد شہر پہنچ جائے۔ لالہ جی نے اپنی پریشانی کو کسی حد تک کم کرنے کے لئے ڈرائیور سے پوچھا کہ بیٹا تم منڈی پہنچ کر بالکل سیف ہو جاؤ گے ابھی وہاں پہنچ کر تو میں گاڑی کو ایسی جگہ کھڑی کر دوں گا کہ کسی کو پتہ بھی نہ چل سکے گا۔ میاں جی دل ہی دل میں کہنے لگے کیا مرنے والے کے پسماندگان کی بددعا بھی وہاں نہ پہنچ سکے گی۔ کیا خدا کو بھی پتہ نہ چل سکے گا کہ گاڑی کہاں کھڑی کی گئی ہے۔ ڈرائیور نے اطمینان بھری آواز میں کہا۔ لالہ جی گھبراؤ مت۔ اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔ ہم کافی دور نکل آئے ہیں۔ لاش کے ماتھے پر میری گاڑی کی تصویر تھوڑے ہی کھنچ گئی ہو گی۔ اب میاں جی سے چپ نہ رہا گیا کہنے لگے ڈرائیور صاحب.. مقتول کے خون کے قطرے قطرے میں قاتل کی تصویر کھنچ جاتی ہے۔ چور۔ ڈکیت اور قاتل ہر واردات کے وقت موقع پر کوئی نہ کوئی ایسا نشان یا کوئی چیز چھوڑ جاتے ہیں جس واردات کرنے والوں کا سراغ ملنے میں اکثر پولیس کو کامیابی ہوتی ہے۔ ارے میاں نوٹ کے سامنے سب کچھ بیکار ہوتا ہے۔ معصوم بے گناہ سولی پر چڑھ جاتے ہیں اور قاتل باعزت رہا ہو جاتے ہیں۔ ڈرائیور نے ذرا اکڑتے ہوئے کہا۔ میاں جی نے ڈرائیور کی خشک باتوں پر خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا [illegible] شہر میں داخل ہونے ہی والا تھا

کر چوراہے کی ریڈ لائٹ کے باعث ٹریفک رک گیا۔ ڈرائیور نے سگریٹ سلگایا اور ابھی ایک کش ہی لگایا تھا کہ ہری بتی ہونے پر ٹریفک چلنے لگا۔ جوں ہی ٹرک چوراہے کے پاس پہنچا ایک سپاہی نے ڈنڈے کے اشارے سے روکا اور بلند آواز سے کہا کہ گاڑی کو ایک طرف لگاؤ۔ کھڑکی سے ڈرائیور نے باہر سر نکال کر کہا کیوں دیوان جی کیا بات ہے... سپاہی نے حاکمانہ لہجے میں کہا نیچے اترو تب بتائیں گے کہ کیا بات ہے۔ ڈرائیور نیچے آیا تو سپاہی نے ڈانٹتے ہوئے کہا تم سمگلنگ کرتے ہو؟

کیا سمگلنگ؟ ڈرائیور نے معصومانہ انداز میں پوچھا۔

الو کے پٹھے۔ حرام زادے سامنے ہیں بے وقوف بناتا ہے سپاہی نے پولیس پران کا پہلا اصول اپناتے ہوئے دو تین مرتبہ ڈنڈے سے ڈرائیور کی خاطر مدارات کرتے ہوئے کہا۔ نمبر پلیٹ کہاں [illegible] اور ڈنڈے سے نیچے اشارہ کرتے ہوئے کہا ریڈی ایٹر کی [illegible] کیسی ٹنگی ہے۔ سپاہی نے ٹوپی ہاتھ میں لے لی اور [illegible] میں کہا تو یکسی ڈینٹ کر کے آئے ہو اور یہ چارے [illegible] کی ٹوپی بھی اتار لائے ہو؟

نہیں صاحب یہ ٹوپی تو میری ہے۔ میں نے ڈھابے پر [illegible] کھاتے وقت اس دھو کر سکھانے کو لٹکا دیا تھا۔ چلتے وقت [illegible] میں اسے اتارنا بھول گیا۔ ڈرائیور نے گھبرائی ہوئی آواز میں بات [illegible] مرنی کے نیچے تھانہ جھنڈے کوتوالی میں وائرلیس آیا ہے کہ [illegible] نزدیک ایک ٹرک والا ایک بڈھے کو سڑک پر کچل گیا ہے۔ [illegible] بھگا کر لے گیا ہے۔ اور مرنے والا اپنی لڑکی کی شادی کے لئے [illegible] سے سامان لینے جا رہا تھا۔ اور بس لڑکی کا بوڑھے باپ کے اور کوئی دوسرا سہارا بھی نہیں ہے۔ تیری گاڑی کی نمبر [illegible] بڈھے کی لاٹھی میں الجھ کر وہیں گر گئی ہے جس کو چوکیدار نے [illegible] میں جمع کرایا ہے۔ سپاہی نے گاڑی کی پچھلی جانب کو دیکھا تو اس پر وہی نمبر لکھا ہوا تھا جس نمبر کی پلیٹ میں چوکیدار نے جمع کرائی تھی یہ سب کچھ وائرلیس سے [illegible] چکا تھا سپاہی نے ایک [illegible] نکال گاڑی کے [illegible] سپاہی نے [illegible]

صادق قرولوی
(جے پور)

امن اور جنگ

امن اک لطف و مسرت کی حسیں وادی ہے
امن تعمیر چمن، نغمۂ آزاری ہے

یو، این، او بس جو ملا کرتی ہیں باہم قومیں   اپنے احباب پہ چلتے ہیں ستم کی رو میں
فیصلے ہونے سکے مسئلے کی روشن ضو میں   ہو گئے ملک تباہ امن کی جلتی لو میں
وارث امن کو دیکھے تو کوئی اہلِ نظر   ان کے پاس بھی ہوتا ہے کہاں ان کا گزر
یہ اسی بات پہ کرتے ہیں یونہی شور و شر   ساری دنیا میں ہیں تو ہیں قوی کے دست نگر

آرزوئے عیش کی اور سب مرحلے پاؤں تلے
محفل امن میں یوں رہبر اقوام چلے

امن کا نام دیا رقص کی محفل چمکی   ہو گئی مات پہ لاکھ تو جام جم کی
طالب عیش میں ہوتی نہیں جرأت غم کی   آئی جب امن کی آواز تو دے دی دھمکی
بزم انصاف میں پہنچے یہ سپاہی بن کر   آئے عالم کے لئے قہر و تباہی بن کر
یہ نگہبان جہاں ایک پناہی بن کر   ابھی دو دَر کے فرعون خدا ہی بن کر

بے پناہوں سے خدا اپنی پناہ میں رکھیو
ان کا ہر فعل سیاہ اپنی نگہ میں رکھیو

جنگ کے نام سے جل جائیں ابھی قلب و جگر   بستاں جنگ سے ہو جائیں فقط نام صفر
نفس کی جنگ نے آدم کو کیا خلد بدر   جنگ قابیل نے توڑا کبھی ہابیل کا سر
نوح کی قوم نے جب حد بغاوت کر دی   جوش سیلاب سے قدرت نے قیامت کر دی
شس بدکاروں کی موقوف ملامت کر دی   زندگی جس نے کے لئے ایک مصیبت کر دی

جنگ تخریب پسندوں کی سحر ہے تاباں
لیلۃ القدر سمجھتے ہیں حریف انساں

مٹ گئے جنگ سے سب شاہ و گورنر اک دن   خاک میں مل کے ہوئے آہ برابر اک دن
مٹ گئے دہر سے کتنے ہی ستم گر اک دن   ظالم و ظلم نے مٹنا ہے سراسر اک دن
پی گئی جام فنا شان سکندر اک دن   مائل ضعف ہوا زور ید مشتر اک دن
جنگ کی آتش میں ہوئے ماؤں و ہٹلر اک دن   ڈوبا ہے جنگ میں فرعون کا لشکر اک دن

حوصلے تنگ ہوئے جنگ سے قذاقی کے
بیشتر ہوتے ہیں انجام یہ ناچاقی کے

ایسی اک ہی ہیں مثالیں بہیں بے حد لاکھوں — دہر فانی سے گئے ہو کے سپرد لاکھوں
جنگ سے بن گئے چنگیز سے ڈاکو لاکھوں — ہو گئے جنگ سے برباد گھر لاکھوں
آدمی بن گئے انسان سے حیوان لاکھوں — آدمی ہو گئے مفلوک و پریشاں لاکھوں
ملک اور شہر بنے خشک بیاباں لاکھوں — ہو گئے جنگ سے برباد گلستاں لاکھوں

جنگ اک آگ ہے طوفان ہے بربادی ہے
ہاں بچے جنگ سے امن میں آزادی ہے

نفرت جنگ ہے تفریق و تصادم صادق — جیت کے جنگ بھی رکھتے ہیں تو ہم صادق
جنگ کو ہار کے ہو جاتے ہیں گم نام صادق — نغمۂ امن ہے شاداب و خرم صادق
فتنہ رقص ہے سیماب مجسم صادق — پارسا ہو نہ سکے رند سے ہم صادق
فرحت دل سے کہیں حسن تبسم صادق — صبح دم ڈوب گئے لاکھوں ہی انجم صادق

امن غالب ہو تو رہزن بھی بنے ہیں راہی
جنگ غالب ہو تو بھولے ہیں طرز بھی شاہی

امن عالم تو ہے ہر دور کا ممتاز رفیق — امن عالم کے ہیں شیدا جوانان خلیق
دعوت امن پہ لاکھوں سخنور آئے — شاد و شیدا تو کہیں ساغل و احمر آئے
صورت مہر و قمر تا بہ تبسم و کوثر آئے — شکل مونس میں فضا اور منور آئے
کتنے اوتار ہوئے کتنے پیمبر آئے — امن دنیا کے لئے فاتح خیبر آئے
پیمبر امن لئے شافع محشر آئے — تشنۂ دیں کے لئے ساقی کوثر آئے

سب کو پیغام دیا ایک خدا ہے لوگو
امن عالم میں رکھو حق کی رضا ہے لوگو

امن انوار تجلی ہے پیام حق ہے — رشتۂ زیست کبھی تنگ نہ ہونے دینا
دل کسی کا کبھی سنگ نہ ہونے دینا — بازیٔ امن کو بد رنگ نہ ہونے دینا

جنگ اک آگ ہے طوفان ہے بربادی ہے
امن تعمیر چمن نغمۂ آزادی ہے

تم نے سوچا نہیں کیا جنگ کا انجام کبھی — جنگ سے بنتے نہیں بگڑے ہوئے کام کبھی
جنگ بن جائے نہ اک جنگ کا پیغام کبھی — قول صادق ہے نہ لو جنگ کا تم نام کبھی

صادق قردوی

پلاٹ ۴ - زیر قلعہ - ناھر گڑھ - پرانی بستی جے پور

اختر شاہجہاں پوری ـــ ایک "فن اور شخصیت"

خلیل انجم ([illegible] ناگپور)

ایک زندہ زبان کی پہچان یہی ہے کہ وہ ہر دور میں مختلف مسائل سے دوچار رہنے کے باوجود اپنی آن بان اور وقار کا [illegible] ادا کرنے کے لئے نئے حالات سے نبرد آزما رہے۔ اردو جو مغلوں کے زمانے میں ہندوستانیوں اور مغلوں کے درمیان باہمی تعاون اور رشتے کا سبب بن کر وجود میں آئی۔ اپنی بے پناہ شیرینی اور لطافت کی وجہ سے آج ہندوستان کی مقبول ترین زبان ہے۔ یعنی بقول داغ ؎

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اردو زبان کو مقبولِ عام بنانے میں اردو شاعری نے بہت بڑا [illegible] ادا کیا ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ بہت زیادہ پرانی تو نہیں لیکن دنیا کی ادب میں ایک تاریخی حیثیت کی حامل ضرور ہے۔ مرزا سودا، میر تقی میر، اور مرزا غالب سے لے کر جگر تک اردو شاعری نے ایک طویل سفر طے کیا ہے۔ اس سفر کو روایتی شاعری کا سفر بھی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ روایتی شاعری سے مراد یہ ہے کہ اردو شاعری اس سفر میں کچھ مخصوص قسم کے مضامین کے اردگرد گھومتی رہی۔ حسن و عشق کی واردات، گل و بلبل کی رعنائیاں، شمع و پروانہ کا سوز و گداز، زلف و رخسار کی باتیں، وصال و ہجر کی حکایات، جام و مینا کی سرمستیاں وغیرہ ایسے مضامین اردو شاعری کے لئے لازم و ملزوم تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد پوری دنیا میں سیاسی انقلاب تیزی کے ساتھ ابھرنے لگے۔ بڑے بڑے سائنسی تجربے سامنے آئے۔ دنیا کے اس سیاسی انقلاب نے اردو شعر و ادب کو بھی کسی حد تک متاثر کیا۔ انگریزی تہذیب و ادب دوسری تہذیب و ادب پر غالب آنے لگے۔ اردو ادب بھی اس انقلاب سے بہت متاثر ہوا۔ [illegible] میں جو اردو شاعری [illegible] تھے رفتہ رفتہ نئی شکلوں میں تبدیل ہونے لگے۔ ایک نئی تحریک وجود میں آئی جسے ترقی پسند تحریک کا نام دیا گیا۔ ادب میں ایک نیا انقلاب رونما ہوا۔ نئے تجربات، سیاسی حالات، [illegible] کشمکش، [illegible] حصولِ آزادی کے لئے جدوجہد وغیرہ جیسے موضوعات شاعری کا عنوان بن گئے۔ پھر ملک تقسیم ہوا اور اردو شاعری جمود کا شکار ہو گئی۔ لیکن حالات جلد ہی بہتر ہونے چلے گئے۔ ایک نئی تحریک آناً فاناً وجود میں آئی جسے جدید شاعری کا نام دیا جانے لگا۔ لیکن جلد ہی یہ تحریک بھی دم توڑنے لگی۔ تاہم اردو شاعری کی مقبولیت میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ اردو شاعری کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز یہ بھی ہے کہ اسے آسان اور عام فہم بنانے کے علاوہ وہی بات پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جو عوام کے دلوں کی بات ہو۔ اختر شاہجہاں پوری یوپی کے ان نوجوان شعراء میں ہیں جو شاعری کے ذریعے ایسی ہی بات پیش کرتے ہیں جس میں عوام کے دل کی دھڑکن یا جسے سن کر ہمارے جذبات مشتعل ہو جائیں۔ اختر شاہجہاں پوری کے کسی بھی شعر کو لیجئے اس میں آپ کو حقیقت نگاری کے علاوہ ان کی معصومیت اور سادگی کے کچھ پہلو بھی آپ کو نظر آئیں گے۔ اگرچہ اختر شاہجہاں پوری کی شاعری کی عمر ابھی زیادہ نہیں ہے۔ لیکن مستقبل میں ان سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔

اختر علی خاں اختر شاہجہاں پوری کا پورا نام ہے۔ آپ آرڈننس کلودنگ فیکٹری شاہجہاں پور میں ایک اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ آپ کے والد محترم یعقوب علی خاں مرحوم تقسیم سے پہلے پانی پت کرنال میں ایک اسکول میں ٹیچر تھے۔ شعر و شاعری کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ ملک تقسیم ہوا تو تبادلۂ آبادی کا [illegible] زور شور رہا۔ مگر والد مرحوم نے پاکستان جانا مناسب نہیں سمجھا اور اپنے آبائی وطن شاہجہاں پور ہی میں سکونت اختیار کی۔ والد کے انتقال کے بعد اختر شاہجہاں پوری کے [illegible] پر گھر کی کفالت کی ذمہ داری کا بوجھ آن پڑا۔ جس کی وجہ سے ان کا تعلیمی سلسلہ انٹرمیڈیٹ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ گھر کی ذمہ داریاں

... ساتھ ساتھ اختر شاہجہاں پوری ادبی ذمہ داریاں کو نبھاتے ہیں۔ اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ وہ کئی ادبی انجمنوں سے وابستہ ہیں۔ جن میں آل انڈیا اردو ہندی سنگم، بزم ادب ... شاہجہاں پور، بزم استاد رشید رام پوری وغیرہ انجمنیں ہیں جن کے اختر شاہجہاں پوری روح رواں تصور کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ "پرتھا" نامی میگزین کی ادارت کے فرائض بھی آپ ہی کے سر ہے۔

... میں لکھنؤ کے بعد شاہجہاں پور کی ادبی حیثیت وہی ہے جو ... شہر پر کسی بھی مقام کی کسی بھی اعتبار سے ہوتی ہے۔ بلکہ ... میں آباد اس شہر نے اپنے لیے مایہ ناز اور ... فن کار ادب کو دیئے ہیں جن پر اردو شاعری بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ ... میرے موضوع سے مختلف نہیں ہوگا اگر میں شاہجہاں پور ... ذکر ماضی اور حال کے چند مستند شعرائے کرام کے اشعار بھی درج کر دوں۔ جو محض اس لئے کہ اختر شاہجہاں پوری کا جس سرزمین سے ہے وہ ادبی اعتبار سے کتنی زرخیز ہے۔ اور جس ماحول میں شاعر کی پرورش ہوتی ہے وہ شاعری کے ... س قدر سود مند ... ساز گار ہے۔ تو آئیے ملاحظہ فرمائیے ؎

... نہیں سکتا ہے موت کا۔

لیکن یہ دیکھنا ہے کہ شی کہاں کی ہے

... نواب ناظم علی ... "

... کر کے میاں میں بیٹھے ہیں عاشق

جیسے ہمارا ... کوئی بات ہی نہ تھی

— حضرت ... شاہجہاں پوری"

... چشم ساقی کی سہارا جام کا

نہ ... رو کے گھر رہا ہوں گردش ایام کا

— حضرت اسعد شاہجہاں پوری"

بے خودی میں جس جگہ ہم نے ... رکھ دی

زمیں اٹھی فرشتوں نے سر عرش بریں رکھ دی

— حضرت اختر شاہجہاں پوری"

... نصیب ہے عابد — فیض ساقی تو عام ہوتا ہے

... ہے میکدے میں اسے — جن کی قسمت میں جام ہوتا ہے

— حضرت عابد مینائی"

بلند و پست کی پستیوں میں غلام کب تک جیا کریں گے

ہمیں ہماری زمین دے دو ہم آسماں لے کے کیا کریں گے

— مظفر شاہجہاں پوری"

ابھی فکر ہیرے کارواں کی — جسے دیکھو وہ میر کارواں ہے

— بسمل شاہجہاں پوری"

ڈوب جاتے ہیں یہاں شام سے پہلے سورج

اب قدم سوچ کے تو دلاوتی ارمان میں رکھ

— خالد علوی"

ہر ایک شے پر تو حسن حقیقت — ستارے کیا قمر کیا کہکشاں کیا

— تسنیم شاہجہاں پوری"

حال موسم ہی کا پوچھے گا وہ جب پوچھے گا

مجھ سے کب میری اداسی کا سبب پوچھے گا

— محترمہ سعیدہ شان سرور"

اختر شاہجہاں پوری کا کلام پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے شہر کے ادبی و شعری ماحول کا پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اور وہ بھی خوب سے خوب تر کی تلاش میں مصروف سفر ہیں۔ ایک معمولی سی شے بھی جسے عام آدمی نظر انداز کر دیتا ہے۔ اختر شاہجہاں پوری اس شے میں بھی مشاہدہ اور تجربہ کا کوئی نہ کوئی عنصر تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یعنی بقول اقبال ؎

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں — کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

اختر شاہجہاں پوری کے چند شعر اس مضمون میں ملاحظہ فرمائیں۔ کیا خوب کہتے ہیں ؎

بھیک یہ سوچ کے غربت میں بھی مانگی نہ گئی

کیا خبر کون سے کوچہ میں شناسا ہوگا

قابل تعلیم ہیں وہ لوگ بھی دانش ور

کچھ نہ کرنے پر جنہیں منصب ملے تمغے ملے

جرم الفت کی سزا اور بڑھا دی جائے

یعنی بیمار کو جینے کی دعا دی جائے

ہم تو بیزار تھے جینے سے مگر ساقی نے

ایک جینے کے عوض دی ہیں دعائیں کیا کیا

غربت میں کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا یا بھیک مانگنا ہمارے معاشرے

...ناعیب نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن غیرت مند آدمی کے لئے ایسی ...یں بھی یہ فعل زیب نہیں دیتا۔ اور دوسرے شعر میں شاعر ...نا چاہتا ہے کہ پھر ہاتھ پیر ہلائے جیسے سب کچھ مل جائے یہ ...چھا ہنر ہے۔ اس لئے ایسے لوگوں کو بھی قدر کی نگاہ ...نا چاہئے۔ حالانکہ لوگ ایسے آدمی سے دلی بغض رکھتے ہیں ایک خوبصورت سزا ہے اس لئے محبت کا بیمار کبھی نہیں چاہتا ...س قید سے آزاد ہو۔ چوتھے اور آخری شعر میں بھی شاعر نے ایک ...بات میں مشاہدہ کا عنصر تلاش کیا ہے کہ زندگی سے ...ن کی مسائل کو ایک معمولی سا سکہ خیرات میں دے کر جیسے ...وصول کرلیتا ہے۔ حالانکہ مسائل سے اس سے زیادہ کیا جاسکتی ہے۔

شاعر کے مندرجہ بالا اشعار اسباب کا بھی ثبوت پیش کرتے ...ی شاعری وہی ہوتی ہے جس میں نہایت ایمانداری اور ...ا کے ساتھ اپنے خیالات وجذبات کو پیش کیا جائے ...ر کو پیش کرنے میں الفاظ شاعر کے خیالات وجذبات کا ...دیں تو شعر میں جھول پڑ جاتا ہے۔ اور سماعت پر گراں ...ے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ الفاظ کا مناسب استعمال ہی کشش پیدا کرتا ہے۔ اور مناسب الفاظ کی تلاش میں بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ ہمارے مطالعہ میں اکثر ایسے ...تے ہیں جن میں ایک لفظ کی موزونیت سے وہ شعر خوبصورت ہے۔ یا پھر کسی لفظ کے مناسب استعمال سے اس شعر میں ...گی پن نظر آتا ہے۔ اختر شاہجہاں پوری کے کلام کا مطالعہ ...ے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ وہ اپنے اشعار میں الفاظ ...ت و برجستگی پر خصوصی توجہ دیتے ہیں بلکہ جب تک انہیں ...یں ہو جاتا آگے نہیں بڑھتے۔ حالانکہ شاعری جذبات کے ...نام ہے لیکن جذبات کے اظہار کے لئے ایسے الفاظ کا ضروری ہے جو شعر کی قدر ومنزلت میں اضافہ کرسکیں اور ...ے ذہن میں شاعر کی بات آسانی سے سمجھ میں آسکے اور وہ خوش ...ذیل میں اختر شاہجہاں پوری کے چند اشعار پیش کئے جن میں الفاظ کی نشست و برجستگی، جذبات کی سادگی و شگفتگی اور قافیہ اور ردیف کی ہم آہنگی پر شاعر نے خوب محنت کی ہے۔ اور اسی لئے اشعار ہماری زندگی سے قریب ہو گئے ہیں ؎

سارا گھر مہکنے لگتا ہے ؛ اب نہ تم خط کتاب میں رکھنا

روشنی شہر میں بڑھتی ہی چلی جاتی ہے
کون سے گاؤں گئے آگ بجھانے والے

جی چاہتے ہوئے بھی اسے خط نہ لکھ سکوں
حالانکہ ان دنوں کوئی مصروفیت نہیں

سبز پتے گر رہے ٹوٹ کر ... اے ہوا چلنا تجھے آتا نہیں

ایسے زندہ اشعار کی اختر شاہجہاں پوری کے پاس کمی نہیں۔ اردو شاعری میں ایسے اشعار کی بڑی قدر وقیمت ہے۔ جن کا انداز بیان نثر کی طرح ہو جسے شاعر کی اصطلاح میں سہل ممتنع کہا جاتا ہے۔ مندرجہ بالا چاروں اشعار سہل ممتنع میں کہے گئے ہیں۔ اس اصطلاح میں شعر کہنا بظاہر آسان مگر حقیقت میں بہت مشکل ہے۔ یعنی بقول حضرت امیر مینائی ؎

خشک سیروں تن شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے ایک مصرعۂ تر کی صورت

ایک مصرعۂ تر کی تخلیق کے لئے اختر شاہجہاں نے بھی اپنے جسم کے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑا ہے تب کہیں جاکے انہیں یہ انداز بیان نصیب ہوا ہے۔ پھر بھی وہ اپنے فن سے مطمئن نظر نہیں آتے اور خود سفر پر آمادہ ہیں فرماتے ہیں ؎

ہر ایک موڑ پہ لگتا ہے یہی تو گھر میرا
مگر نہ ختم ہوا آج تک سفر میرا

زندگی کے سفر میں اختر شاہجہاں پوری کئی نشیب و فراز سے گزرے ہیں۔ کم عمری ہی میں گھر کی کفالت کی ذمہ داری کا بوجھ پڑ جانے سے انہیں طرح طرح کی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ دنیا کی بے مہری دوستوں کی بے وفائی۔ محبوب کی کج ادائی وغیرہ ایسے غم تھے جن سے برسوں نبرد آزما رہے۔ ان تجربوں کو انہوں نے اتنی خوبصورتی کے ساتھ اپنے اشعار میں ڈھالا ہے کہ قاری کو ان سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ ذیل کے اشعار میں ان کے تجربوں کو ملاحظہ فرمائیں ؎

بہار سے ہیں یہ دنیا کی کیا نظر ٹھہرے
کہ ہم تو ایک شجر خشک و بے ثمر ٹھہرے

جو کر رہے ہیں عہد ز آہستہ تو بیتے رہو
دوستوں کی بے وفائی کی خبر دیتے رہو

انکار کا گمان ہے نہ اقرار کا یقین
اس طرح کا طریقۂ گفتار دیکھنا

زندگی میں وقتاً فوقتاً رونما ہونے والے ان حادثات نے اختر شاہجہاں پوری کو حساس طبیعت کا مالک بنا دیا ہے۔ حادثہ خواہ سنگین ہو یا معمولی نوعیت کا دونوں صورتوں میں وہ متاثر ہوئے ہیں اور نہ ہی ان کے ماتھے پر پریشانی کی شکنیں ابھرتے ہیں۔ وہ ہر حادثہ کا خندہ پیشانی کے ساتھ استقبال کرتے ہیں اور فرماتے ہیں ؎

کیا لائیں گے خاطر میں طوفانِ حوادث کو
پروردۂ طوفاں ہیں ہم رنج و محن والے

اور اپنے دوستوں کو تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

جو حوادث کے مقابل نہیں ہونے پاتے
میرے احباب میں شامل نہیں ہونے پاتے

ایک سچے فن کار کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے فن کے ذریعے اپنے معاشرے کی اصلاح کرے۔ اور محبت کے چراغ جلا کر نفرت کے اندھیروں کو دور کرے۔ اختر شاہجہاں پوری کی شاعری ایک ایسا نغمہ ہے جسے سن کر دوست اور دشمن دونوں یک وقت محظوظ ہو سکتے ہیں۔ ان کی شاعری میں جو درد ہے وہ دھیرے دھیرے قاری کے دل میں جگہ بناتا جاتا ہے۔ یہ وہ درد ہے جو ہمارے دلوں میں ہمدردی اور خلوص کے جذبات کو مشتعل کرتا ہے۔ کیا خوب فرماتے ہیں ؎

دوستوں کی بزم ہو یا دشمنوں کی انجمن
اپنے چہرے پر خلوص بیکراں لیتے چلو
دوستو آؤ گلے مل لو یہ فانی دنیا
کب جز کون سے لے شادی بچھائے

اختر شاہجہاں پوری مختلف ادبی انجمنوں کے سرگرم رکن ہیں۔ ان کی ادبی زندگی بہت مصروف ترین ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنے کلام کی اشاعت کی طرف سے غافل نہیں ہیں۔ ملک کے بے شمار اردو رسائل و جرائد شائع ہو رہے ہیں۔ مقبول اور مستند ماہناموں کی بھی ہمارے یہاں ابھی خاصی تعداد ہے جو پابندی سے شائع ہو رہے ہیں۔ اختر شاہجہاں پوری کی غزلوں کی اشاعت کا سلسلہ ۱۹۵۹ء سے شروع ہوا۔ شروع میں انہیں کچھ دشواری ضرور ہوئی لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری ____ آج یہ عالم ہے کہ وہ کسی بھی رسالہ میں وہ اپنی غزل بھیج دیتے ہیں تو مناسب طریقے سے شائع ہو جاتی ہے۔ ہندوستان کے علاوہ پاکستان کے متعدد رسائل میں بھی ان کی غزلیں اکثر و بیشتر شائع ہوتی رہتی ہیں ____ غرض اختر شاہجہاں پوری ایک جانے پہچانے اور مقبول شاعر ہیں گرچہ ان کا ابھی تک کوئی شعری مجموعہ طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر نہیں آیا ہے لیکن یہ کیا کم ہے کہ ان کی بیشتر غزلیں ملک کے مقبول و ممتاز رسائل و جرائد میں ہماری نظروں سے گزرتی رہتی ہیں۔ تاہم "ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں" کے مصداق اختر شاہجہاں پوری ابھی جوان ہیں اور اپنی منزل کی طرف عزم و استقلال کے ساتھ رواں دواں ہیں۔ ان کا شعری مستقبل بہت روشن ہے۔ اور توقع ہے جلد ہی طباعت و اشاعت کی منزل سے گزر کر ان کا شعری مجموعہ اہل ادب کے ہاتھوں میں پہونچے گا اور قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

بقیہ صفحہ ... کا ... کر کوتوالی لے جایا جا سکے۔ بیرٹنے آن واحد میں سپاہی کے ساتھ مل کر ڈرائیور کو رسّے سے باندھ کر کوتوالی پہنچا دیا۔ اور ڈپٹی افسر نے آن واحد میں ڈرائیور کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دی۔

ڈرائیور میاں جی کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے زبان حال سے کہہ رہا ہو میاں جی آپ سچ کہتے تھے کہ مقتول کی آنکھوں میں قاتل کی تصویر کھنچ جاتی ہے۔

بڑے میاں اللہ کے انصاف کو دیکھتے ہوئے سجدۂ شکرانہ ادا کر رہے تھے اور دل ہی دل میں کہہ رہے تھے کہ مرنے والے غریب کی لڑکی کو شادی کے لئے ۵ ہزار روپے مل سکیں گے ..

تذکرہ شعرائے اجین

از محمد خالد عابدی (اندور)

حکیم اطہر حسن اطہر لکھنوی :- آپ محلہ رانی پورہ ۱۹۰۴ء میں جولائی ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ فرنگی محل لکھنؤ اور دارالعلوم کالج اجین میں آپ نے تعلیم حاصل کی۔ لکھنؤ کے ماحول سے شعر و سخن میں دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔ لیکن اجین میں رہ کر آپ نے باقاعدہ حضرت ساغر چشتی اجینی کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ توپخانہ اجین میں آپ کی رہائش تھی۔ اجین میں ہی آپ مطب کرتے تھے ۱۹۶۹ء میں تقریباً پینسٹھ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ آپ کا مجموعہ کلام "موج اطہر" کے نام سے ترتیب پاگیا ہے۔ لیکن ہنوز اشاعت نہیں ہو سکی ہے۔ مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی کو بھی چاہئے کہ وہ اس کی اشاعت کا مسئلہ حل کرنے میں تعاون دے۔

اطہر حسن اطہر لکھنوی کی شاعری میں حسرت و یاس اور حزن کی کیفیت نمایاں ہے۔

نمونۂ کلام

بہکی بہکی سی نگاہیں کھوئے کھوئے سے حواس
جب یہ عالم ہے تو جینے کی تمنا کیا کریں

میری حیات خشک میں رنگینیاں کہاں
بے خود بنا کے ہوش میں لایا گیا ہوں

مجھے بادۂ بے خودی پھر پلا دے
میں اپنے کو پھر بھولنا چاہتا ہوں!

شبنمی آنکھوں میں عکس روئے روشن ڈال کر
آئیے اور آگ پانی میں لگاتے جائیے

سلامت رہے ذوق نظارہ اطہر
سر حشر دیکھیں گے جلوہ کسی کا

الٰہی بخش عاقل مہوی :- آپ ۱۹۱۶ء میں مہو چھاؤنی ضلع اندور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی۔ معاشی پریشانیوں کے باعث آپ اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکے۔ جب آپ چودہ پندرہ سال کے ہوئے تو ماحول سے متاثر ہو کر شعر گوئی کی طرف طبیعت مائل ہوئی۔ کامل قریشی مہوی سے اصلاح لینی شروع کی۔ استاد نے اپنے تخلص کی رعایت سے عاقل تخلص کیا۔ استاد کامل قریشی مہوی بہت پرگو تھے۔ ان کا کلام ملک کے بیشتر رسائل میں شائع ہوا کرتا تھا۔ استاد کامل قریشی کے انتقال کے بعد کچھ عرصے آپ نے ظفر گھنڈوی سے بھی سلسلۂ اصلاح قائم کیا تھا۔

الٰہی بخش عاقل مہوی بسلسلۂ تلاش معاش اجین وارد ہوئے اور یہیں کے ہو رہے۔ آپ نے اجین میں اردو کے فروغ کے لئے اپنی گراں قدر خدمات پیش کی تھیں۔ آپ نے مجاہد اردو سلطان صدیقی کی سرپرستی و نگرانی میں "بزم اہل ادب اجین" قائم کی تھی۔ غالباً ۱۹۵۳ء میں توپ خانہ روڈ اجین میں دفتر قائم تھا۔ "بزم اہل ادب" کے تحت لڑکے اور لڑکیوں کو مفت شبینہ کلاس میں اردو عربی اور قرآن شریف کا درس دیا کرتے تھے۔ بعد نماز شعراء کا اجتماع ہوتا تھا۔ شعراء اپنا تازہ کلام سناتے تھے۔ "بزم ادب اجین" کی جانب سے ایسی نشستوں اور مشاعروں کا انعقاد ہوتا تھا جس میں اجین کی دیگر بزموں کے شعراء بھی شرکت کرتے تھے۔ عاقل مہوی دفتر وغیرہ کے تمام مصارف خود ہی برداشت کرتے تھے۔ سلطان احمد صدیقی نے الٰہی بخش عاقل مہوی پر جو سطور لکھی ہیں اس میں وہ لکھتے ہیں کہ :-

"عاقل مہوی بڑے پرخلوص، مرنجان مرنج، پابند صوم و صلوٰۃ، خوش اخلاق اور ملنسار انسان تھے۔ ہر شخص ان کی بے حد عزت کرتا تھا۔ ہر دل عزیز باکمال استاد عاقل مہوی کا بعارضہ بلڈ کینسر ۲۲ ستمبر ۱۹۸۶ء کو اندور میں انتقال ہوا لیکن تجہیز و تکفین ان کے وطن مہو چھاؤنی میں ہوئی۔ اپنی بیماری اور وفات سے ایک سال قبل کمال ... کو اپنا جانشین اور بزم اہل ادب اجین کا صدر مقرر کیا تھا لیکن اب عاقل مہوی کے زمانے کی سی بات نہیں ہے نہ وہ شبینہ مدرسہ ہے اور نہ وہ دفتر۔"

الٰہی بخش عاقل ہوشیار پوری مرحوم کی یاد میں بزم اہلِ ادب امین کی جانب سے ... یوم عاقل ہوشیار پوری ... مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا۔ اس موقع پر ... انہیں منظوم خراجِ عقیدت اس طرح پیش کیا تھا ؎

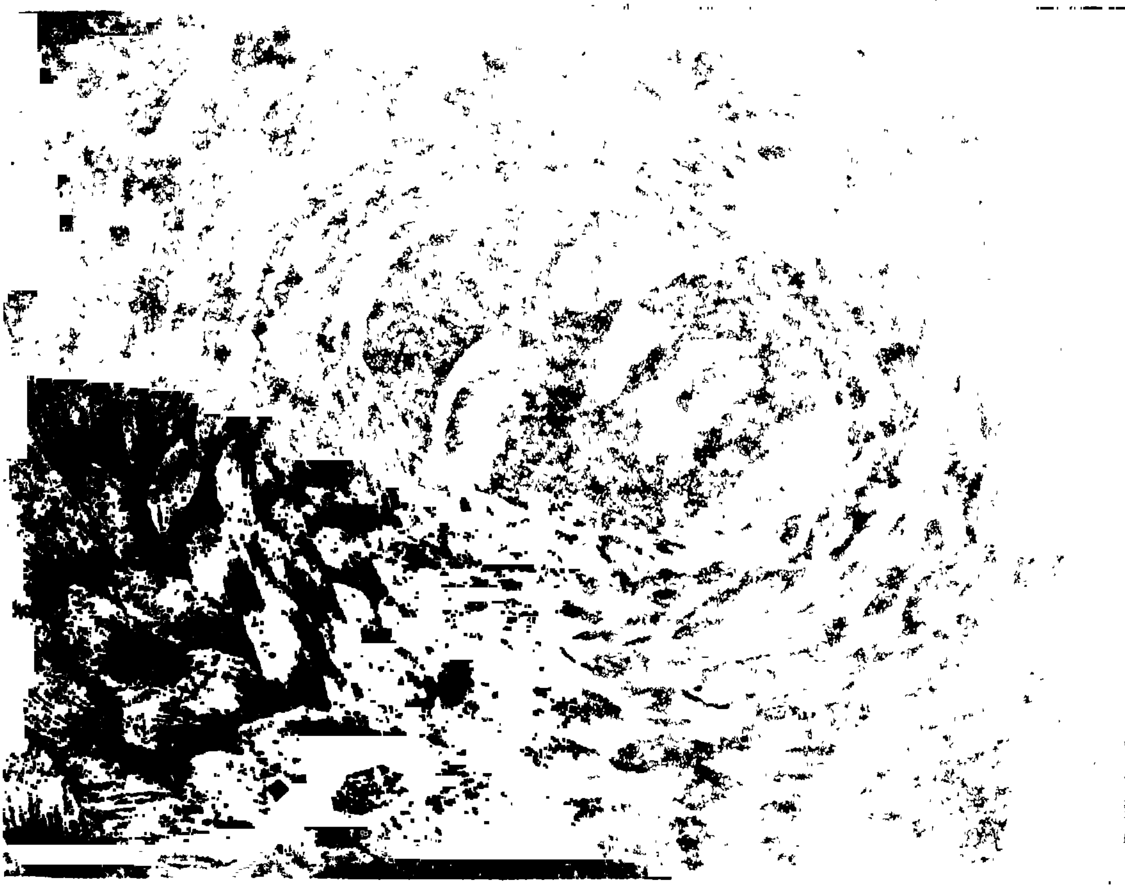
الٰہی بخش عاقل آؤ آؤ	کہاں ہو کچھ پتہ اپنا بتاؤ
ہمیں آواز بھی اپنی سناؤ	رُخِ پر نور سے پردہ ہٹاؤ
دلِ سلطان کو ہو جائے تسکیں	مرقع ہو جو غزلیں وہ سناؤ

نمونۂ کلام

نفاق و جور و ستم تیرا باغباں تو نہیں
ہمارے سر پہ نیا کوئی آسماں تو نہیں
قدم قدم پہ نئے انقلاب آتے ہیں
الٰہی خیر ہو یہ میرا امتحاں تو نہیں
یہ کیسے شعلے بھڑکتے ہیں آج گلشن میں
جو جل رہا ہے کہیں میرا آشیاں تو نہیں
نمِ ذوق کی بے چینیاں ارے توبہ
و میرا سالِ یہاں ہے وہی یہاں تو نہیں
کسی کا ظلم و ستم راس آگیا عاقل
خدا کا شکر ہے یہ بار کچھ گراں تو نہیں

بزم میں شاعر وہ اچھی داد پا سکتا نہیں
جو ترنم سے غزل اپنی سنا سکتا نہیں
ابھی تو انقلابات اور بھی آئیں گے دنیا میں
ابھی آجائے اے عاقل قیامت غیر ممکن ہے
مجھے پاس اہم ہے وطنی، مظلومی
لاکھ غم ساتھ ہے اور عالمِ تنہائی ہے
وہ فسانۂ محبت جو نہ کہہ سکے کسی سے
انہیں ہم سنا کے روئے وہ ہمیں سنا کے روئے
جلوۂ یار دیکھ کر موسیٰ
کیا ہوا کچھ تو ماجرا کہئے

NOVEMBER 1984 Phone : 275601 Regd. No.D-(DN) 378
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002
Regd with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57







ٹیلیفون نمبر ۲۲۵۵۰۰ رجسٹرڈ ... نمبر ۵۷/۶۶۶ ... نمبر ۱۸۰/ ...

ہندو پرست ہوں نہ مسلمان پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار

دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
یعنی وطن پرست ہوں انسان پرست ہوں

ماہنامہ

شانِ ہند

نئی دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

فی پرچہ ۲/ روپے
زرِ سالانہ

جلد نمبر ۴۵ دسمبر سنہ ۱۹۸۴ء شمارہ نمبر ۱۲

نوجوانانِ وطن کے نام

[illegible]

آج ہم آزاد ہیں آزاد ہے اپنا وطن
ذرّے ذرّے پر یہاں کے ہے ہمارا اختیار
اس کی ہر وادی ہے جنت اسکا ہر خطہ ارم
آج اس گلشن کا ہر اک پھول ہے راحت فزا
ہر سماں ہے روح پرور ہر نظارا پُر بہار
آج دامانِ نظر کو بخشتے ہیں تازگی
متحد اور یکجہت ہو کر بڑھو آگے بڑھو
پرچمِ ہندوستاں کو لے کے اپنے دوش پر

آج اپنا ہے ہمالہ اپنے ہیں گنگ و جمن
باغ اپنے کھیت اپنے اپنے ہیں دشت و دمن
کس قدر پیارا ہے یہ اپنا وطن اپنا وطن
یہ گل و لالہ یہ نسریں اور یہ سرو و سمن
لہلہاتا ہے ہماری آرزوؤں کا چمن
یہ زمیں یہ چاند تارے اور یہ نیلا گگن
نوجوانانِ وطن اے نوجوانانِ وطن
عام کر دو ساری دنیا میں محبت کا چلن

پھولتا پھلتا رہے یونہی یہ اپنا گلستاں
یہ دعا ہے گل کی یارب اور یہی لب پر سخن

ودیا پرکاش سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے لیتھو کے صفحات خواجہ پریس چتہ شیخ مٹکو جامع مسجد دہلی اور سرورق یابلیکیشنز دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند۔ فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔



"اگر میں قوم کی خدمت کرتے ہوئے مر بھی جاؤں تو میرے لئے یہ بڑے فخر کی بات ہوگی
مجھے یقین ہے کہ میرے [illegible] کا ہر قطرہ اس قوم کے فروغ میں کام آئے گا اور اسے
مستحکم اور متحرک [illegible] مددگار ثابت ہوگا"

30 اکتوبر 1984 — شریمتی اندرا گاندھی

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ وصبا چہ کرد؟

اُتر پردیش اُردو اکاڈمی

ایڈیٹر شانِ ہند پچھلے دِنوں ایک ہفتہ لکھنؤ رہا۔ اُس دوران لکھنؤ کے علمی۔ اور ادبی حلقوں سے اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کے سِلسلے میں جو حیران کن باتیں اِسے معلوم ہوئیں اُن کے پیشِ نظر صرف یہی کہہ دینا کافی ہے کہ جناب عمار رضوی نے نہ معلوم کب کا بدلہ اُردو اکاڈمی سے لیا ہے کہ اُنہوں نے اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کی برق رفتار ترقی کو یکدم بریک لگا دیا۔ جہاں جناب ڈاکٹر محمود الٰہی سابق چیرمین اُردو اکاڈمی نے اکاڈمی سے لاتعداد بہترین اور کم قیمت کتابیں شائع کیں۔ جونہی وہاں نئے چیرمین صاحب تشریف لائے تو اُنہوں نے اِس طرف توجہ ہی نہیں دی۔ جناب محمود الٰہی صاحب نے اکاڈمی کا جو مقام قائم کر دیا تھا۔ نئے چیرمین صاحب اُسے قائم نہ رکھ سکے۔ اور تو اور محمود الٰہی صاحب کے وقت کی درجنوں کتابیں ابھی تک شرمندۂ اشاعت ہیں جس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ چیرمین صاحب اپنے نائب چیرمین جناب رام لعل صاحب تک کو اچھوت سمجھتے ہیں۔ اور اُن سے کسی قسم کی علمی ادبی یا انتظامی مدد لینا گناہ سمجھتے ہیں اور تو اور رام لعل صاحب کی نشست بھی اپنے کمرہ سے ہٹا دی ہے۔ حالانکہ جب سے اکاڈمی بنی ہے تب سے چیرمین اور وائس چیرمین کی نشست ایک ہی کمرہ میں رہی ہے۔ رام لعل صاحب نے بتایا کہ چیرمین صاحب کی تنگ مزاجی کا یہ عالم ہے کہ وہ اُن کے سلام تک کا جواب بھی نہیں دیتے جس کی وجہ سے رام لعل صاحب نے چیرمین صاحب کو سلام کرنا ہی ترک کر دیا۔ حالانکہ اِسلام میں سلام کے بارے میں جو ہدایات ہیں اُن کی رُو سے کبھی کسی کے سلام کا جواب نہ دینا کوئی اچھا امر نہیں ہے اور سلام کرنے میں اوّلیت رکھنے والا شخص قابلِ ستائش ہے اور سوار کے لئے ہدایت ہے کہ وہ پیدل چلنے والے کو پہلے سلام کرے۔ ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب نے وائس چیرمین ڈاکٹر [illegible] کو اپنا دستِ راست سمجھا اور رام لعل صاحب کے ساتھ جو نامناسب سلوک روا رکھا جا رہا ہے اس کے پیشِ نظر انہیں اُن کے چند احباب نے یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ اکاڈمی کی وائس چیرمینی سے مستعفی ہو جائیں اور رام لعل صاحب نے پریذیڈنٹ صاحبہ کو اپنا استعفیٰ دے بھی دیا جسے انہوں نے منظور نہیں کیا بلکہ پریذیڈنٹ صاحبہ نے حال ہی میں رام لعل صاحب کو رسالہ "اکاڈمی" اور "خبر نامہ" کی نگرانی کا کام سونپا ہے کیونکہ کمیٹی نے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ چیرمین صاحب جو کام نائب چیرمین سے لینا مناسب خیال کریں وہ اُن کے ذمہ [illegible] مگر جو صاحب رام لعل صاحب کے سلام کا جواب نہ دیں وہ اِس سلسلے میں رام لعل صاحب سے صلاح مشورہ کیسے کرتے لہٰذا پریذیڈنٹ صاحبہ نے رام لعل صاحب سے بات چیت کر کے اُنکی کچھ خدمات حاصل کی ہیں۔ عمار رضوی صاحب نے نہ معلوم کن مصلحتوں کی بنا پر ایسے فیصلے کئے جو اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کے لئے کسی بھی صورت سود مند نہیں تھے۔ اور اِس طرح سے عمار رضوی صاحب نے یو۔ پی اُردو اکاڈمی کی اُردو خدمات کو بڑی حد تک ختم کر کے رکھ دیا۔ عین ممکن ہے کہ عمار رضوی صاحب نے اُردو کے ساتھ جو ناانصافی کی ہے اُس کی سزا قدرت نے اُنہیں یہ دی ہو کہ اُنکی وزارت ختم ہو کر رہ گئی۔ اکاڈمی کے چیرمین صاحب اکاڈمی کے ایسے [illegible] ہیں کہ جب بھی کوئی سیمینار اکاڈمی کی طرف سے ہوتا ہے تو یہ صاحب خود بھی مقالہ پڑھتے ہیں اور مقالہ کی اُجرت پانچ سو روپیہ وصول کرتے ہیں۔ کیا چیرمین صاحب بتا سکتے

ہیں کہ جب تک وہ اس اکادمی کے چیئرمین نہیں تھے تو انہیں کسی نے یہاں مقالہ پڑھنے کے لئے کسی ادارے نے مدعو کیا؟

چیئرمین صاحب کو یہ بھی شکایت ہے کہ لکھنؤ دوردرشن اور لکھنؤ آکاش وانی انہیں عام ادیبوں کے مقابلے میں کم فیس دیتے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ جناب تیواری صاحب اکادمی میں کسی تقریب کے سلسلے میں تشریف لائے تو چیئرمین صاحب نے ان کا استقبال کرتے ہوئے جو تقریر فرمائی اس میں وہاں یہ بھی کہی کہ لکھنؤ دوردرشن اور لکھنؤ آکاش وانی والے انہیں وہ فیس نہیں دیتے جو کہ دوسرے ادیبوں کو دی جاتی ہے کاش چیئرمین صاحب نے اپنے دو مشیرانِ خاص سے بھی دریافت کیا ہوتا کہ آکاش وانی اور دوردرشن کے پروگراموں کی فیس بڑھوانے کے بارے میں وزیرِ اعلیٰ کا کوئی دخل نہیں ہے۔

چیئرمین صاحب کی خوش انتظامی کا یہ عالم ہے کہ پریس سے چھپائی کے نرخناموں کا ٹنڈر لینے کے لئے آپ خود دہلی تشریف لائے اور یہ ٹنڈر صرف گنتی کے تین پریسوں سے لیا گیا جب کہ دہلی میں دو ہزار سے زائد پریس ہیں۔ چیئرمین صاحب دفتر کے ایک کارندے کو بھی اپنے ساتھ لائے اور جو اخراجات ہوئے ان سے ایک کتاب اکادمی شائع کر سکتی تھی اور [illegible] بذریعہ ڈاک منگائے جا سکتے تھے۔ چیئرمین صاحب کی کچھ دیگر خوش انتظامیوں کے بارے میں کچھ تفصیلات کی نشاندہی کی جا رہی ہے جن پر آئندہ روشنی ڈالی جائے گی۔

چیئرمین صاحب کی مذہبی حیثیت مسلّم ہے مگر ان کی علمی اور ادبی خدمات کا معیار ایسا نہیں تھا کہ انہیں اتر پردیش اردو اکادمی ایسے فعال ادارے کا چیئرمین بنایا جاتا چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ انہیں اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرنے کے لئے کچھ ایسے مددگاروں کی ضرورت لاحق ہوئی جو اس معاملہ میں شاطرانہ مزاج رکھتے ہیں۔ اور قدرت کے اس گلے سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جب بھی چیئرمین صاحب کوئی ایک قدم اٹھاتے ہیں جس کے وہ خود واقف نہیں ہوتے تو "کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں" کا ورد ہر زبان پر ہونے لگتا ہے۔

اردو اکادمی کے چیئرمین وغیرہ کا تقرر ہوئے دو سال کے بعد ایک سال اور چار ماہ ہو چکے ہیں اور نئی انتظامیہ کونسل کا نہ جانے کب وجود میں آئے گا۔ مگر یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ یہ کا عرصہ اتر پردیش اردو اکادمی کی تاریخ میں یادگار رہے گا اور "بے زبان اردو" عمار رضوی صاحب کو کبھی معاف نہیں

نقش صحرائی

جناب بھگوان داس نقش صحرائی کو پچھلے ایک حادثہ پیش آیا اور دو ماہ کے علاج کے بعد ڈاکٹروں نے ایک ٹانگ کاٹ دی مگر معاملہ ٹھیک نہ بیٹھا اور کچھ روز بعد نقش صاحب کا انتقال ہو گیا۔

نقش صاحب مظفر گڑھ (پاکستان) کے رہنے والے تھے اور تقسیمِ وطن کے بعد دہلی تشریف لائے۔ اچھے شاعر بہترین مترجم ہونے کے باعث انہیں اخبار "تیج" میں سب ایڈیٹر رکھا گیا اور جناب جمنا داس اختر صاحب کی سرپرستی میں آپ نے خوب خوب تجربہ حاصل کیا اور اخبار "پرتاپ" میں ترقی پا کر ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ "پرتاپ" سے ریٹائرڈ ہوئے تو پھر اخبار [illegible] نے ان کی خدمت حاصل کر لیں۔ نقش صحرائی۔ ظفر ادیب۔ کیف ملتانی۔ ایڈیٹر شانِ ہند۔ غلام حسن قیصر ملتانی اور جناب غنچہ امروہوی ایسے ہم جلیس تھے جو ملتانی ادبی سرگرمیوں کو جاری رکھے ہوئے تھے۔ نقش صاحب نوائے لاہور کے دہلوی نامہ نگار کی حیثیت سے بھی کئی سال کام کرتے رہے۔ ایڈیٹر شانِ ہند کو دلی افسوس ہے کہ نقش صحرائی ایسا دوست ہمیشہ کے لئے جاتا رہا۔ نقش صاحب اپنی زندگی کے واقعات "نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل" عنوان سے کتابی صورت میں لکھ رہے تھے۔ نہ معلوم اب یہ اور رنگین واقعات پر مبنی کتاب شائع بھی ہو سکے گی۔

رام کرشن مضطر

غالباً ۱۹۵۰ء میں رام کرشن

پنے گاؤں سے دفتر شانِ ہند میں تشریف لائے اور چند لمحوں
بات چیت کے بعد اُن سے ایسے برادرانہ تعلقات قائم ہوئے
ایڈیٹر شانِ ہند نے ہر ممکن کوشش کر کے جناب رنبیر سنگھ صاحب مرحوم
لک دا ایڈیٹر "ملاپ" کو مجبور کر دیا کہ وہ مضطر صاحب کو "ملاپ"
بکام دیں اور مضطر صاحب نے اپنی محنت لگن اور خوش اخلاقی
سے ملاپ پریوار کا ایسا تعاون پایا کہ "ملاپ" سے ہی وہ دو
سال ہوئے ریٹائرڈ ہوئے۔

رام کرشن مضطر بہت اچھے شاعر تھے اور ہندوستان
میں رواں دواں جدید فارسی بولنے میں انگلیوں پر گنے جانے
والے حضرات میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔

دلی اردو اکادمی کے تجرباتی مشاعرے میں ملاقات ہوئی
تو فرمانے لگے بھائی صاحب شراب نوشی کی عادت پڑ گئی
ہے مشورہ دیا گیا کہ کم پیا کیجئے تو فرمانے لگے اب یہ میرے بس میں
نہیں ہے۔ پچھلے دنوں محترم ممتاز مرزا صاحب نے بتایا کہ جب آنجہانی
اندرا جی کے قتل کے سلسلے میں ہوئی گڑبڑ کے باعث دہلی میں
کرفیو نافذ ہوا تو شراب ملنا مشکل ہو گیا اور مضطر صاحب نے اپنے
جوان بچوں کو گالی گلوچ بلکہ مار پیٹ سے مجبور کر دیا کہ وہ کہیں سے
بھی اُن کے لئے شراب لائیں آخر کار بلیک میں تین صد روپیہ
میں ایک بوتل خریدی گئی۔ افسوس کہ حال ہی میں کثرتِ
شراب نوشی کی وجہ سے اُن کے دماغ کی نس پھٹ جانے
کے باعث موت ہو گئی۔ اس پر انتہائی افسوسناک بات
یہ ہوئی کہ مضطر صاحب کی موت کے دوسرے ہی دن اُنکا
بڑا لڑکا جو کہ بینک میں ملازم تھا اور مضطر صاحب کے بعد اپنی
ماں اور بہن بھائیوں کی کفالت کا بوجھ اُٹھاتا بھی چل بسا
باپ اور بیٹے کی یکے بعد دیگرے موت کے باعث مضطر صاحب
کے گھر پر موت کی خاموشی سی چھائی ہوئی ہے۔ مضطر صاحب
کے تین چھوٹے بچے ابھی اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔
خدا ہی ہے جو اُن یتیموں اور مضطر صاحب کی بیوہ کا سہارا ہے۔
دلی اردو اکادمی ایک سال کے لئے مضطر صاحب کی بیوہ کو
تین صد روپیہ ماہوار کی مدد منظور کر سکیگی۔ اور باقی کیا ہو سکتا
یہ سوچنا اُردو والوں کا کام ہے۔ کیا ہم سب مل کر مضطر صاحب
کے چھوٹے چھوٹے بچوں اور اُن کی بیوہ کے لئے کچھ کر سکتے ہیں؟
اس سلسلے میں ایڈیٹر شانِ ہند مقدور بھر مالی خدمت
کی پہل کر رہا ہے۔ اور جو حضرات اس کارِ خیر میں حصہ لینا
چاہیں وہ دفتر شانِ ہند میں رقوم بذریعہ منی آرڈر یا چیک
بھجوا سکتے ہیں جو مضطر صاحب کی بیوہ تک پہنچا دیئے جائینگے۔
اور اس کارِ خیر میں حصہ لینے والے حضرات کے اسمائے گرامی بھی
شانِ ہند میں شائع کئے جائینگے۔ قارئین شانِ ہند سے
مدیر شانِ ہند کی ذاتی درخواست ہے کہ وہ اس کارِ خیر میں
ضرور حصہ لیں۔

راجدھانی کی کوئیک میل سروس

ڈاکخانہ دریا گنج
سے ملحق دو لیٹر بکس ہیں۔ ایک کوئیک میل سروس کے لئے
اور دوسرا عام ڈاک کے لئے۔ پچھلے دنوں دیکھا گیا کہ کوئیک میل
سروس والا لیٹر بکس کئی دنوں تک کھولا ہی نہیں گیا۔ اور
لیٹر بکس خطوط سے اس قدر بھر گیا کہ جہاں سے لیٹر بکس میں
خطوط ڈالے جاتے ہیں وہاں سے راہ چلتے اسکولی بچے خطوط
نکال نکال کر کھیلنے میں مصروف تھے اور لطف کی بات یہ
تھی کہ لیٹر بکس کو تالا بھی نہیں لگا ہوا تھا۔ ایڈیٹر شانِ ہند
نے سب پوسٹ ماسٹر دریا گنج کو اس امر کی اطلاع دی
تو وہ کہنے لگے کہ اِن لیٹر بکسوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں آپ
اندرپرستھ ہیڈ آفس میں اطلاع دیجئے۔ لہٰذا اندرپرستھ ہیڈ
آفس کے پوسٹ ماسٹر صاحب کو اطلاع دی گئی تو انہوں نے
فرمایا کہ عام ڈاک والا لیٹر بکس تو ہماری ذمہ داری میں ہے
کوئیک میل سروس کا لیٹر بکس گول ڈاکخانہ نئی دہلی والوں کے
تحت میں آتا ہے لہٰذا اُن سے کہیئے۔ پوسٹ ماسٹر صاحب
نے ازراہِ کرم گول ڈاکخانہ کا ٹیلی فون نمبر بھی بتا دیا چنانچہ
گول ڈاک خانہ والوں سے کہا گیا تو وہ کہنے لگے کہ آپ دریا گنج
کے ڈاک خانہ کے لیٹر بکس کو کہہ رہے ہیں یہاں دہلی اور
نئی دہلی میں کوئیک میل سروس والے کئی لیٹر بکس اسی طرح
بھرے ہوتے ہیں کیونکہ ایک تو عوام انہیں ہر قسم کی ڈاک
یہاں تک کہ سیکنڈ کلاس میل بھی ڈال دیتے ہیں اور دوسرے

اسٹاف کی کمی ہے اور ہمارے بس سے باہر ہے کہ ہم انتظام کر سکیں۔ تاہم کوشش کرینگے کہ پرسوں پیر کو دریا گنج والے لیٹر بکس کو کلیئر کرا دیں۔ یہ سنیچر کی شام کا واقعہ ہے دوسرے دن اتوار تھا۔ پیر کے روز پھر معاملہ ویسے کا ویسا ہی تھا دوپہر کے بعد پھر گول ڈاک خانہ میں فون کیا گیا تو جواب ملا کہ اگر آپ بار بار شکایت کرینگے تو جانتے ہیں اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ہم نے بڑی عاجزی سے پوچھا کہ صاحب کیا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ بابو صاحب فرمانے لگے کہ یہ سب ڈاک نذرِ آتش ہو جائیگی یہ سنتے ہی پاؤں تلے کی زمین نکلتی ہوئی معلوم دی کیونکہ گذشتہ دس دنوں سے کوئیک میل سروس والے خطوط دفتر شانِ ہند کے بھی اُسی لیٹر بکس میں پڑے موجود تھے۔ بابو صاحب کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ جناب کیا راجدھانی میں ڈاک کے سلسلے میں یہ اندھیر ہو سکتا ہے بابو۔ فرمانے لگے ایڈیٹر صاحب آپ بھی بڑے بھولے ہیں جب راجدھانی میں ہزارہا مکانات اور دوکانات جلائے جا سکتے ہیں۔ انسان زندہ جلائے جا سکتے ہیں اور اس تباہی مچانے والوں کا کچھ نہیں بگڑا تو یہ چند سو خطوط جلا دینے پر کون باز پرس کریگا۔ یہ کہتے ہوئے بابو صاحب نے ٹیلی فون کا چونگا دھڑاک سے ٹیلی فون پر دے مارا اور معاملہ ختم ہو گیا۔

اس کے بعد ہم نے پوسٹ ماسٹر جنرل کا فون کھٹکھٹایا حالانکہ پانچ بج چکے تھے مگر پی۔ ایم۔ جی صاحب دفتر میں موجود تھے۔ ہمیں دریا گنج ڈاک خانہ کے سب پوسٹ ماسٹر نے بتایا تھا کہ پی۔ ایم۔ جی اعلیٰ پایہ کے منتظم ہیں اور اگر آپ کی اُن سے بات ہو گئی تو لیٹر بکس آج ہی صاف ہو جائے گا بہر کیف پوسٹ ماسٹر جنرل صاحب کی خدمت میں تمام قصہ بیان کیا گیا تو فرمانے لگے میں ابھی اس کا انتظام کرتا ہوں اور انہوں نے اس کا انتظام کیا بھی۔ ڈاک نکلوائی گئی اور لیٹر بکس کو نیا تالا لگایا گیا۔ مگر اس کے بعد بھی اس لیٹر بکس کی حالت یہی ہوتی رہی اور ہمیں پھر پی۔ ایم۔ جی صاحب سے شکایت کرنی پڑی۔ جس پر انہوں نے یقین دلایا کہ اس لیٹر بکس کی خاص طور پر نگرانی کرائی جائے گی۔

راجدھانی میں محکمۂ ڈاک کی ناقص انتظامی کا صرف ایک واقعہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ راجدھانی میں محکمۂ ڈاک کے بس کی بات ہی نہیں رہی کہ وہ ڈاک کو بہتر انداز سے نپٹا سکے۔ سیکنڈ کلاس میل کا تو خدا ہی حافظ ہے۔ اخبارات و رسائل پیپر سارٹنگ آفس میں پوسٹ کرنے کے باوجود دس دس پندرہ پندرہ دن کے بعد لکھنؤ اور دیگر مقامات پر ڈلیور کئے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں پی۔ ایم۔ جی صاحب نے خود فرمایا کہ راجدھانی میں اس قدر زیادہ خطوط۔ اور سیکنڈ کلاس میل ہوتی ہے کہ ہم انہیں وقت پر نپٹانے سے قاصر ہیں۔

ویسے یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ ہر ڈاک خانہ میں پارسلوں پیکٹوں کے ڈھیر لگ رہے ہیں۔ لیٹر بکس خطوط سے بھرے ہوتے ہیں پیپر سارٹنگ آفس کا نظارہ تو اور بھی ہوش رُبا ہوتا ہے۔

کیا ہماری سرکار راجدھانی کے محکمۂ ڈاک میں سدھار نہیں لا سکتی؟ کیوں نہیں سٹاف بڑھایا جاتا [حالانکہ موجودہ سٹاف اگر دلجمعی اور ایمانداری سے کام کرے تو بہتر نتائج پیدا ہو سکتے ہیں]

اُمید کی جا سکتی ہے کہ الیکشن کے بعد راجیو گاندھی صاحب کی نئی وزارت میں محکمۂ ڈاک کسی ایسے وزیر کے سپرد کیا جائے گا جو واقعی اِن تکلیف دہ واقعات کو سلجھا سکے گا۔

بقیہ صفحہ ۸ کا والدین سے پوچھے بغیر وہ گوجرانوالہ سے ضلع کا نگرہ اور اپنی بیوی اور بچی کو لیکر سیدھے ملتان میرے پاس چلے آئے کوئی ڈیڑھ ماہ تک چوپڑہ صاحب معہ بیوی اور بچی کے میرے یہاں قیام فرما رہے کہ انکی والدہ کی علالت کا تار آیا اور وہ فوری طور پر اکیلے گوجرانوالہ تشریف لیگئے اور دو روز بعد انکا خط آیا کہ انکی بیوی اور بچی کو ملتان چھاؤنی سے لاہور آنے والی گاڑی پر بٹھا دیا جائے اور لاہور اسٹیشن پر وہ خود موجود ہونگے۔

وقت گزرتا رہا اور خط و کتابت کا یہ عالم تھا کہ ہر روز گوجرانوالہ سے چوپڑہ صاحب مجھے اور میں ملتان سے انہیں بغیر کسی خط کا انتظار کئے خطوط لکھتا۔ دو سال بعد چوپڑہ صاحب کو پنجاب نیشنل بینک دہلی میں ملازمت مل گئی اور وہ دہلی چلے آئے۔ اور ستنگر قرول باغ میں رہائش رکھ لی ۱۹۴۵ء میں انہیں ملنے ملتان سے دہلی آیا ہفتہ عشرہ ان کے پاس رہ کر واپس ملتان چلا آیا۔ اور سلسلہ خط و کتابت حسب سابق جاری رہا۔

[باقی پھر]

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

(سرور [illegible] نقوی)

۱۹۳۵ء میں میں نے آغا حشر کاشمیری کی یاد میں ماہنامہ "حشر" جالندھر سے جاری کیا۔ ڈسٹرکٹ کورٹس سے ملحق جالندھر ہیڈ پوسٹ آفس سے ہر روز صبح ڈاک لانے جانا میرا معمول تھا جناب اختر وارثی ایڈیٹر "بہارستان" بھی ڈاک لینے ہر روز ڈاک خانہ تشریف لاتے تھے۔ اُن دنوں جالندھر میں روزانہ اخبارات پرتاپ۔ ملاپ۔ وغیرہ سب لاہور سے ہی آیا کرتے تھے لاہور سے اخبارات لانے والی ریل گاڑی صبح ساڑھے دس بجے جالندھر شہر اسٹیشن پر آتی تھی۔ لہٰذا ڈاک خانہ سے میں اور اختر صاحب ٹہلتے ٹہلتے ریلوے اسٹیشن پہنچتے اور اپنی اپنی پسند کے اخبارات خرید کر گھروں کو چلے جاتے۔ ایک نہایت ہی معقول دراز قد لحیم شحیم خوش پوش نوجوان بھی ہر روز سائیکل پر ڈاک لینے آتا اور ہماری ہی طرح ریلوے اسٹیشن پر اخبار لینے آتا تھا۔ ایک دن اختر صاحب کہنے لگے سرور صاحب یہ نوجوان کون ہے اور اِن کا کیا کاروبار ہے جو یہ روزانہ ڈاک وصول کرنے ڈاک خانے آتا ہے۔

میں نے اس نوجوان کو اکثر اوقات کوٹ کشن چند میں جہاں میری رہائش تھی اور ریلوے روڈ پوسٹ آفس میں وی۔ پی پارسل وصول کراتے دیکھا تھا۔ مگر اسکے حسب نسب سے واقفیت نہیں تھی۔ اُن دنوں میں سیٹھ سُندرشن کی ایکشن مہم کا پروپیگنڈہ انچارج تھا۔ ایک دن یہ نوجوان ایک نہایت ہی خوش پوش اور زیرک شخص کے ساتھ سیٹھ سُندرشن کی کوٹھی کے سامنے سے نکلا تو میں نے سیٹھ سُندرشن کے منیم سے دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں۔ منیم صاحب نے بتلایا کہ یہ دیوان پنڈی داس چوپڑہ ہیں ویسے تو یہ ناک کی دوا کا اشتہار بھونی کی دوکان کے نام سے اخبارات میں شائع کراتے ہیں مگر کہا جاتا ہے کہ یہ کشمیر میں وکالت کرتے تھے اب سی۔ آئی۔ ڈی کے آدمی ہیں اور دوسرا لمبا نوجوان انکا بیٹا وِدیا ساگر ہے۔

دوسرے روز ڈاکخانے سے ڈاک لینے کے بعد ریلوے اسٹیشن اخبار لانے کے لئے جاتے ہوئے راستہ میں میں نے اختر صاحب کو اُس نوجوان کے بارے میں وہ واقفیت بہم پہونچائی جو مجھے سیٹھ سُندرشن کے منیم صاحب نے بتائی تھی۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ کچھ دنوں کے بعد میں رسالہ "حشر" کے سلسلے میں لاہور گیا اور وہاں مجھے ایک ہفتہ لگ گیا۔ میری عدم موجودگی میں اختر صاحب نے ڈاکخانہ میں اس نوجوان سے علیک سلیک کے بعد راہ و رسم پیدا کرلی اور اُس نوجوان سے یہ بھی کہہ دیا کہ سرور صاحب نے انہیں انکے اور انکے والد صاحب کے بارے میں سب کچھ بتا رکھا ہے۔

جب میں لاہور سے واپس آیا تو اختر وارثی جالندھر سے کہیں باہر تشریف لے گئے ہوئے تھے۔ دو تین دن کے بعد میں ڈاکخانہ سے ڈاک وصول کرنے کے بعد ریلوے اسٹیشن پر اخبار لے رہا تھا کہ پیچھے سے میرے کندھے پر ایک مضبوط گرفت نے مجھے پیچھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کیا دیکھا تو وہی لحیم شحیم نوجوان چہرہ سرخ کئے کھڑے ہوئے تھے۔ بڑی رواں دواں انگریزی میں کہنے لگے مجھے آپ سے اسی وقت بلکہ ابھی کچھ باتیں کرنی ہیں میں نے اے۔ ایم۔ ایس کے برآمدے میں رکھے بنچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا آئیے وہاں بیٹھ کر باتیں کیجئے۔ انہوں نے سائیکل کو ایک طرف کھڑا کیا اور میرے ساتھ بنچ پر بیٹھ گئے اور کہنے لگے کہ آپ کا نام کیا ہے کیا کرتے ہیں اور کہاں رہتے ہیں میں نے فدا مزاحی انداز میں کہا کہ میں نے تو سُنا تھا کہ آپکے والد محترم سی۔ آئی۔ ڈی میں ہیں مگر آپکے طرزِ تکلم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی انکے ساتھ ہی یہ نیک فرض انجام دیتے ہیں۔ میرا یہ کہنا تھا کہ انکا منہ اور بھی سرخ ہوگیا اور چلا کر کہنے لگے "نان سینس"

میں نے عرض کیا کہ کم عقلی کی بات تو آپ نے خود کی ہے کہ اپنا حسب نسب بتائے بغیر تفتیشی پولیس آفیسر کی طرح سوالات کی بوچھاڑ کردی اور مجھے کہہ رہے ہیں کہ میں عقل کی بات کروں۔ میرے جواب سے اُس نوجوان نے اندازہ لگالیا کہ اُسکا مخاطب اُس سے

مرعوب نہیں بلکہ وہ آپ کو اس سے برتر سمجھتا ہے۔ لہٰذا لازم اور اپنائیت کے لہجے میں بولے کہ مجھے تو آپ سے صرف یہ پوچھنا ہے کہ آپ نے میرے باپ کے بارے میں جو کچھ اختر رمانی صاحب سے کہا ہے وہ آپ نے کس بنا پر کہا۔ اب مجھے انکے لال پیلے ہونے کا سبب معلوم ہو گیا تو میں نے بے دھڑک کہا کہ میں سیٹھ سندرسن کے ہاں انکے الیکشن کا پروپگنڈہ انچارج ہوں سیٹھ صاحب کے ہاں دن بھر سینکڑوں لوگ آتے ہیں آپ کے والد صاحب کا جب بھی وہاں ذکر آیا تو یہی بتایا گیا جو میں نے اختر وارثی سے کہا ہے۔ فرمانے لگے کسی آدمی کا نام بتا سکتے ہیں کہ ایسا کس نے کہا۔ عرض کیا گیا کہ میں کسی آدمی کا نام نہیں جانتا سوائے سیٹھ سندرسن انکے صاحبزادے راجکمار اور انکے سٹاف کے ممبران کے۔ یہ سن کر وہ چلے گئے مگر گئے معقول انداز میں مصافحہ کرنے کے بعد۔

دو چار دنوں کے بعد میں ڈاکخانے سے پیدل ریلوے اسٹیشن پر اخبار لینے جا رہا تھا کہ راستے میں ملے اور کہنے لگے آئیے سائیکل پر میرے ساتھ بیٹھ جائیے میں نے انکے فرمان کی تعمیل کی اور پیچھے کیریئر پر بیٹھ گیا۔ اسٹیشن سے اخبار لینے کے بعد پھر مجھے سائیکل پر بٹھا لیا اور کہنے لگے ہم کوٹ کشن چند میں رہتے ہیں اور میں بکرم پورہ میں آپ کا گھر پہلے آئیگا لہٰذا میں آپکو گھر چھوڑتا ہوا چلا جاؤنگا میں نے شکریہ ادا کیا اور کچھ نہ کہا۔ میرا غریب خانہ آیا تو میں نے اخلاقاً کہا کہ آیئے لسی یا شکنجبین پی لیجئے۔ ان دنوں چائے کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا فرمانے لگے پھر کبھی۔

اب یہ روز کا معمول ہو گیا کہ وہ مجھے ڈاکخانے سے اسٹیشن تک اور اسٹیشن سے میرے غریب خانہ تک سائیکل پر بٹھا کر لاتے اور ہمارے تعلقات میں قدرے اپنائیت آنے لگی۔ آٹھ دس دن بعد فرمانے لگے کہ آج آپکو میرے گھر چلنا ہوگا میرے والد صاحب نے آپکو بلایا ہے۔ میں خاموش رہا اور وہ سائیکل پر بٹھائے بکرم پورہ میں اپنے مکان کے سامنے آ رکے دروازہ کھول کر مجھے اندر بلایا۔ سامنے پلنگ پر انکے والد محترم دیوان پنڈی داس چوپڑہ تشریف فرما تھے۔ انہوں نے اس انداز سے گفتگو کی جیسے برسوں سے جانتے ہوں اور لب و لہجہ نہایت شستہ۔ کبھی خالص پنجابی میں بولنے لگتے اور کبھی رواں دواں انگریزی میں اور کبھی شدھ ہندی تو کبھی فارسی اشعار موقع محل کی مناسبت سے سناتے۔ اردو کے بارے میں تو انہیں خاصی واقفیت تھی۔ قریباً ایک گھنٹہ خالص ادبی گفتگو کرتے رہے اور اسی دوران انہوں نے سب کچھ پوچھ لیا کہ میں کون ہوں کیا کام کرتا ہوں کب سے جالندھر میں ہوں اور سیٹھ سندرسن سے میری واقفیت کیونکر ہوئی اور الیکشن کے بارے میں میرے لکھے ہوئے پمفلٹ انہوں نے بیحد پسند فرمایا۔

دو ہی ماہ میں اس نوجوان ودیا ساگر چوپڑہ اور میرے تعلقات اس حد تک بڑھ گئے کہ جب بھی موقع ملتا ہم اکٹھے ہوتے اور گھنٹوں باتیں کرتے۔ چوپڑہ صاحب کی مالی حالت مجھ سے بہت اچھی تھی اور یہ بات مجھے کھٹکتی کہ میں اس ڈگر میں انکی برابری نہیں کر سکتا تھا۔ اور وہ اکثر اوقات ریستوران میں یا ریلوے روڈ پر میرا اپنے تلی ہوئی مچھلی کھانے کے بعد بل کی ادائیگی اور اس انداز سے کہ مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس نہ ہو۔ چوپڑہ صاحب کے ہاں ایک رکھ رکھاؤ تھا اور شرافت تو انہیں گھٹی میں ملی تھی کیا مجال قبلہ۔ یا مہربان من ایسے الفاظ کے بغیر مخاطب کرتے اور انکا یہ آخری دم تک قائم رہا۔

اب ہماری دوستی اتنی گہری ہو چکی تھی کہ چوپڑہ صاحب کے والد صاحب اس میں رخنہ اندازی نہیں کر سکتے تھے۔ اور دن کا بیشتر حصہ اور کبھی رات اکٹھے رہتے۔ ان دنوں ہٹلر اور میسولینی کا زمانہ تھا چنانچہ جالندھر میں جوڑی کو ہٹلر اور میسولینی کہہ کر پکارا جانے لگا ہٹلر دیوان ودیا ساگر چوپڑہ اور مجھے کہا جاتا۔ ہم دونوں نے ملکر کیا کیا کارنامے انجام دیئے اس پر کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم چھڑی تو [illegible] نے لکھا کہ فوراً وطن تونسہ شریف چلے آؤ چنانچہ میں نے رخت سفر باندھ اہل و عیال کو ساتھ لیے تونسہ شریف کیلئے روانہ ہوا تو دیوان ودیا ساگر تک چھوڑنے آئے اور باچشم نم ملتان جانیوالی گاڑی میں بٹھا کر و

دیوان ودیا ساگر چوپڑہ کے سسرال سے انکے والد صاحب کی نہیں بنتی تھی اور ودیا ساگر صاحب چوپڑہ کے والد صاحب دیوان پنڈی داس چوپڑہ نے کسی اپنے بیٹے اور اسکے سسرال میں ناخوشگواری پیدا کر رکھی تھی تاکہ وہ بیوی کے کہنے میں نہ رہے بلکہ اپنے ماں باپ کے ہی بس میں رہے۔ چنانچہ حالات کہ ودیا ساگر چوپڑہ کی بیوی اپنے میکے ضلع کانگڑہ چلی گئی۔ چنانچہ چوپڑہ کا ایک خط آتا اور وہ اپنی بیوی اور بچی کی جدائی میں جو کچھ لکھتے وہ اردو کا تحریری نمونہ شمار کرنے کے قابل ہوتے۔ اسی دوران ۱۹۴۲ء [illegible] میں سکونت اختیار کر لی اور ملتان سے ہی شان ہند ہفت روزہ جاری کر دیا۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ چوپڑہ صاحب اپنی بیوی اور بچی بغیر اطلاع دیئے آ گئے۔ ان دنوں دیوان پنڈی داس چوپڑہ چھوڑ کر اپنے آبائی وطن گوجرانوالہ چلے گئے تھے۔ باتوں باتوں ساگر چوپڑہ نے بتایا کہ وہ بیوی اور بچی کی جدائی برداشت نہ کر

باقی صفحہ ۴۹۶

شاہجہاں پور کا قومی یکجہتی مشاعرہ

خلیل انجم ہاشمی

غالباً ۱۹۵۳ء کا ذکر ہے کہ کانپور میں ربانی ہائی اسکول کے کمپاؤنڈ میں ایک شاندار کل ہند سطح پر مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا۔ یہ میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔ اس مشاعرے میں ایک شعر پر بہت داد دی گئی تھی اور آج بھی یہ شعر ان لوگوں کو یاد ہوگا جو اس مشاعرے میں شریک تھے۔ شعر تھا ؎

بلند و عدول کی بستیوں میں غلام کب تک جیا کریں گے
ہمیں ہماری زمیں دیدو ہم آسماں لیکے کیا کریں گے

اور جس لے اور ترنم کیساتھ یہ غزل پڑھی گئی تھی اُسے کانپور کے سامعین آج بھی نہیں بھولے ہیں۔ اس شعر کے خالق تھے حضرت مظفر شاہجہانپوری۔ شاہجہاں پور کا نام پہلی بار میں نے سنا تھا اور پھر شاعروں کے تعلق سے بار بار یہ نام گوشِ سماعت سے ٹکراتا رہا۔

۸ اکتوبر ۱۹۸۳ء کی علی الصبح میں شاہجہاں پور کے ریلوے اسٹیشن پر تھا۔ شعر و ادب کا یہ قابلِ ذکر شہر جس کا نام بچپن سے سنتا آیا تھا آج قسمت نے مجھے وہاں پہونچا دیا۔ آج شاہجہانپور میں قومی یکجہتی کے سلسلے میں ایک شاندار کل ہند مشاعرے کا انعقاد کلچرل کمیٹی شاہجہاں پور کے زیرِ اہتمام کیا گیا ہے۔ میں اس مشاعرے میں مدعو ہوں اور ایک طویل سفر طے کرنے کے بعد یہاں پہونچا ہوں۔

آرڈیننس کلوتھنگ فیکٹری اسٹیٹ شاہجہاں پور کے رام لیلا گراؤنڈ میں بنے اسٹیج کو خوبصورتی کے ساتھ سجایا گیا ہے۔ رنگ برنگے پنڈال کے نیچے بیٹھے سامعین کی ایک بڑی تعداد ہے جس میں شاہجہاں پور کے آس پاس کے دیہاتوں سے بھی لوگ شعرائے کرام کے کلام سے لطف اندوز ہونے آئے ہیں۔ فیکٹری کے جنرل منیجر سردار جگجیت سنگھ آج کے مہمانِ خصوصی ہیں۔ جن کا شایانِ شان استقبال کیا جا رہا ہے۔ مشاعرے کا افتتاح فرماتے ہوئے صاحبِ موصوف نے اُردو شاعری اور قومی یکجہتی پر مختصر مگر سلجھی ہوئی تقریر کی جسے سامعین نے بڑی توجہ سے سماعت فرمایا۔ مشاعرے کی کارروائی ٹھیک ساڑھے دس بجے شروع ہوئی ہے۔ مشاعرے کی صدارت جناب طالب ... فرما رہے ہیں اور نظامت کے فرائض معراج فیض آبادی انجام دے رہے ہیں۔ نقیب مشاعرہ نے مشاعرے کا آغاز کرتے ہوئے آصف بریلوی کو آواز دی ہے۔ آصف بریلوی نے پہلے چند شعر تحت میں سنا کر غزل ترنم میں سنا رہے ہیں ؎

قاتلوں کی بستی میں یہ بھی سوچنا ہوگا
میں تو جان دیدونگا میرے بعد کیا ہوگا

سوچتا ہوں میں اکثر زندگی کے ساغر میں
کون تیرتا ہوگا کون ڈوبتا ہوگا

یہ فریب کیا دیکھو دیکھنے سے لگتا تھا
اتنا دلنشیں چہرہ اتنا بے وفا ہوگا

میں تو گھر سے نکلا ہوں سوچ کر یہی آصف
رات کے اندھیروں سے میرا واسطہ ہوگا

مشاعرے کا آغاز بہت اچھا ہوا ہے۔ اور اب تشریف لا رہے ہیں کفیل بسوانی۔ فرما رہے ہیں ؎

ہر ایک چراغ اب بھی آندھی سے الجھتا ہے
دل ایسا ملا ہے جو ہر حال میں جلتا ہے

ساحل اسے ملتا ہے جو چیر دے دریا کو
اس طرح ہواؤں سے طوفان کہیں ٹلتا ہے

جیسے کسی قیدی کی زنداں سے رہائی ہو
یوں گھر سے کفیل اپنے ہر صبح نکلتا ہے

کفیل صاحب اپنی بلند آواز کی بدولت سامعین سے داد وصول کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اب فتح پور کے شاعر ... کو آواز دی گئی ہے۔ ضیا عثمانی ... ہر چند سنجیدہ آدمی ہیں مگر طنز و مزاح سے بھرپور کلام سے سامعین کو ہنسنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

ان کا ایک شعر ملاحظہ فرمایئے ؎
ایک ننھا سا پتنگا بھی کل شعلے میں ٭ وہ جو جلایا تھا وہ لو کا بخشش اب برس

اب معراج صاحب خود کلام سنا رہے ہیں۔ چند شعر سخت
میں سنا رہے ہیں ملاحظہ فرمائیں ؎
پہ تجربات کی اونچی اڑان رہنے دو ٭ ہمارے سر پہ کھلا آسمان رہنے دو
تمہارے لطف و توجہ کا شکریہ لیکن ٭ ہمارے منہ میں ہماری زبان رہنے دو
لذت دیدار بھی ہو دل کو زیادہ اچھا لگا ٭ بیچ منجدھار پہ بہت تھی ڈوبنا اچھا لگا
دل کی رکھتے محبت اور احساس خفا ٭ پھل توڑ پہلے تھے لیکن ذائقہ اچھا لگا
اب ترنم میں غزل شروع کی ہے۔ چند شعر دیکھئے ؎
میں نے کھوئے ہیں یہاں اپنے سنہرے شب و روز
در و دیوار کسی کے ہوں یہ گھر میرا ہے
میرا اسلاف سے رشتہ نہ توڑے دنیا
سب محل تیرے ہیں لیکن یہ کھنڈر میرا ہے
اب وہ شعر سنئے جو ان سے دو تین مرتبہ پڑھوایا گیا ؎
جب بھی تلوار اٹھاتا ہوں کہ چھیڑوں کوئی جنگ
ایسا لگتا ہے کہ ہر شانے پہ سر میرا ہے
معراج صاحب کامیاب رہے۔ انہیں داد بھی خوب ملی ہے
معراج صاحب ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے نشاط صدیقی کو دعوت سخن
دے رہے ہیں۔ نشاط صدیقی دبلی پتلی اور نازک سی لڑکی
ہیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے اکبر الٰہ آبادی کا یہ شعر یاد آگیا ؎
نازکی اس کی دیکھی تو مصور نے کہا
ڈر ہے تم بھی کہیں کھنچ آؤ نہ تصویر کے ساتھ
کچھ نوجوان اور من چلے سامعین نشاط صدیقی کا استقبال
تالیاں بجا کر رہے ہیں۔ مگر نشاط صدیقی نے کوئی نوٹس نہیں
لیا۔ نشاط صدیقی کچھ سال پہلے نائیجیریا کے انڈو پاک مشاعرے
میں شریک ہوئی تھیں مگر ان کی غزل نے کچھ تاثر نہیں دیا۔ لیکن
آج جسم جلے اور اطمینان کے ساتھ غزل سرا ہیں۔ ان کا
ترنم بھی پہلے کی بہ نسبت کچھ نکھرا ہوا ہے۔ سماعت فرمائیں ؎
جب انہیں شرمسار دیکھا ہے تو دل کو بے اختیار دیکھا ہے
ہم پہ جو کچھ گزر گیا کیا کیا ٭ ہم نے جشن بہار دیکھا ہے
وفا ہم نے تیرے وعدے کا تو ٭ عمر بھر انتظار دیکھا ہے

ان کی دوسری غزل بھی چھوٹی بحر میں ہے۔ چند شعر ایک نذر ہیں ؎
ہم بھی ہوتے شناسائے سوز الم ٭ کاش ہوتی جو درد آشنا زندگی
آج بھی ان کے کوچے میں ہر موڑ پر ٭ دیکھتی ہے برابر استمبد گی
غم کے ماروں سے کوئی نہیں پوچھتا ٭ نام رکھا ہے کیوں موت کا زندگی
اب تامی سیت پوری تشریف لائے ہیں۔ اور آتے ہی اپنا شعر سنا
پڑھنے لگے۔ شروع میں تو لوگوں کو کچھ ہنسی بھی آئی مگر بعد میں
آوازیں آنے لگیں "مقطع پڑھو"۔ مگر سیت صاحب ٹس سے
مس نہیں ہوئے۔ ان کا بھی ایک شعر سن لیجئے ؎
کس میزان پر نامی اتر سکتے نہیں پورے
وہ جن کی زندگی میں ہو فریب زندگی اتنا
اب ضرورت کسی ایسے شاعر کی تھی جو مشاعرے کو دوبارہ
زندگی دے سکے۔ نقیب مشاعرہ معراج فیض آبادی نے
یہ امتحان کی گھڑی تھی۔ تو لیجئے مراد آباد کے گگن بھارتی کو
آواز دی جا رہی ہے۔ گگن بھارتی پہلے ایک قطعہ سنا رہے ہیں
آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎
بنجارن نے اپنا بجن بیچ ڈالا ٭ سیاست کو بیچا چلن بیچ ڈالا
یہ وہ دور ہے جس میں مجبور ہو کر ٭ بھکارن نے اپنا بدن بیچ ڈالا
پڑھنے کا انداز بہت اچھا ہے۔ داد بھی خوب مل رہی ہے۔ اب ایک
نظم بڑے جوش و خروش کے ساتھ سنا رہے ہیں۔ نظم کا
عنوان ہے "رام راج" جو طنز سے بھری ہوئی ہے۔ لوگ بھی
داد دے رہے ہیں۔ مشاعرہ ایک بار پھر عروج پر آگیا۔ نظم کے
بول ہیں "رام جی کے دیش میں راولنوں کا راج ہے"
میں گگن بھارتی کے پڑھنے کے انداز سے اس قدر متاثر تھا
کہ سوائے اس شعر کے اور کچھ نوٹ ہی نہیں کر سکا ؎
ہم کتنے رحم دل ہیں کہ مذہب کے نام پر
انسان مل گیا تو اسے کیا اسکھائیں گے
اب آفتاب لکھنوی صاحب کو زحمت دی جا رہی ہے۔
آفتاب طنز و مزاح کے شاعر ہیں۔ مشاعروں کی دنیا
میں کافی مقبول ہیں۔ مائیک پر آتے ہی فرمانے لگے
"ایک قطعہ پیش کروں گا پھر اس کے بعد اپنی اوقات
پر آجاؤں گا" ان کے پہلے قطعہ کے آخری دو مصرعے سماعت

رماتیں ہیں میں اُنہیں کافی داد ملی ہے
ہ شاعری میں آنچل کو اِس لئے شامل
میں ایشیاڈ کا بھاگا ہوا کھلاڑی ہوں

یں نے سوچا واقعی یہ اپنی اوقات پر آگئے ہیں۔ آفتاب صاحب
اب کافی ضعیف ہوگئے ہیں۔ انکے منھ سے سستا اور بازاری قسم
امزاق اب اچھا نہیں لگتا۔ مشاعرہ مزاق کی نذر ہوگیا ہے۔
فتاب صاحب مائک سے ہٹے تو [illegible] تبسم شاہجہاں
پوری کو آواز دی جارہی ہے۔ تبسم صاحب بڑے اہتمام اور
اعتماد کے ساتھ غزل سناتے ہیں۔ ماشاء اللہ آواز بھی خوب ہے۔
چند اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

م نے اُلفت کے تقاضوں کو جو سمجھا ہوتا
آج بدنام نہ یہ درد کا رشتہ ہوتا
یں بھی آنکھوں میں جیسے خواب لئے بیٹھا ہوں
زندگی تو نے کبھی مرگ دیکھا ہوتا
ب نے ہر منزل اِمکاں پہ جلائے ہیں چراغ
ورنہ ہر قافلہ راہوں میں بھٹکتا ہوتا

ب وہ شعر سنئے جسے سامعین کے علاوہ اسٹیج پہ بیٹھے شعرائے کرام نے
ی بے حد پسند فرمایا اور دو بار پڑھوایا ہے

رے شانوں پہ چھلکتی ہوئی زُلفیں توبہ
کاش یہ ابر کبھی ٹوٹ کے برسا ہوتا

تبسم صاحب غزل ختم کرکے نہایت کامیاب مائک سے رُخصت
ہو رہے ہیں اور اب زحمت دی جارہی ہے ملک کے جانے پہچانے شاعر
اور ہندی اُردو سنگم کے سکریٹری جناب حیات وارثی صاحب کو۔ حیات
وارثی صاحب ابھی آکر مائک پر کھڑے ہی ہوئے تھے کہ فرمائشوں کا
شور اُٹھنے لگا۔ تاہم فرمائشوں کا احترام کرتے ہوئے اپنی کسی
پرانی غزل کے دو شعر سنا رہے ہیں۔ ایک آپ بھی سنئے ؎

ن کے قبضے میں نظامِ گردشِ ایام ہے
لاکھ نظروں سے چھپیں وہ اُنکا جلوہ عام ہے

ب اپنے پسند کی ایک غزل سے نواز رہے ہیں۔ غزل کے دو شعر آپکی
نذر ہیں ؎

شاید کسی راہی کو سائے کی ضرورت ہے
اِس واسطے آبلہ وہم دھوپ میں چلتے ہیں
چہروں کے تغیر کا احساس نہیں ہمکو
ہم جب بھی بدلتے ہیں آئینے بدلتے ہیں

حیات وارثی صاحب بہت کامیاب رہے مگر نہ جانے کیوں وہ
آج سنانے کے موڈ میں نہیں ہیں حالانکہ "ایک اور" "ایک اور"
کی بہت سی آوازیں آئیں مگر وہ نظر انداز کرکے بیٹھ گئے۔ خیر اب
راقم الحروف کو یاد کیا جارہا ہے۔ معراج صاحب نے جس انداز میں
خاکسار کا تعارف کروایا ہے۔ یہ سب معراج صاحب کا خلوص ہے
پہلے تحت میں ایک غزل کے چند شعر سنا رہا ہوں۔ سامعین اپنی بیداری
کا ثبوت دے رہے ہیں اور خاکسار کی حوصلہ افزائی بھی فرما رہے
ہیں۔ اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

وہ قہر ہے آفت ہے مصیبت ہے بلا ہے
دل ہے کہ اسی دُشمنِ جانی پہ فدا ہے
غم جب بھی ملا ہے تو سلیقے سے ملا ہے
شائد مری فطرت کو وہ پہچان گیا ہے
میں تم کو جُھلستے ہوئے صحرا میں ملونگا
ممکن ہے یہی اور یہی میرا پتہ ہے

اب ایک غزل کے چند شعر ترنم میں سُنا رہا ہوں ؎

چھوڑ کر چمن اپنا جا رہے ہیں صحرا کو رنگ و بو کے دیوانے
دور ہے تغیر کا شہر میں کسی نا بس نا ہیں ویرانے
بادۂ شبانہ کا دور ہو گیا رخصت اور اب یہ عالم ہے
صبح دم سرِ محفل ڈھونڈتے ہیں [illegible] دیوانے
ابر زلف چھایا ہے اور برستی ہے نیم باز آنکھوں سے
رقص میں صراحی ہے وجد میں ہیں [illegible] پیمانے

شاد و ناشاد اپنی غزل ختم کرکے بیٹھا ہی تھا کہ تسنیم صدیقی صاحب کو
آواز دی گئی۔ رات اپنی آخری منزلوں میں ہے اور مشاعرہ اپنے شباب
پر۔ تسنیم صدیقی ماحول کا جائزہ لیکر چند شعر تحت میں پڑھ رہی ہیں
سامعین داد و تحسین کے پھول اُن پہ نچھاور کر رہے ہیں۔ تسنیم اب
اپنے دل نواز ترنم میں جس کیلئے وہ مشہور ہیں ایک غزل
سُنا رہی ہیں ؎

اسکی گوشہ گوشہ کو ہم نے خود سنوارا ہے تو اُنھیاں [illegible] جارہا ہے

مقابل پر اختیار کریں گے؟ لوگ یوں وفا کیجیں یہ کیسے گوارا ہے
تبسم صدیقی کسبا ہتہ اسکے پیشتر بھی چند مشاعروں میں سابقہ
پڑچکا ہے مگر آج انہیں وہ رنگ وہ روق نہیں ہے۔ آج وہ کچھ بیمار
سی لگ رہی سی نظر آرہی ہیں اسلئے بڑی بے دلی کا مظاہرہ کررہی
ہیں۔ تاہم غزل ختم کرکے واپس ہونا چاہتی تھیں مگر ایک اور
ایک اور کے شور نے انہیں مائیک سے ہٹنے نہیں دیا۔ کچھ لوگوں
نے گیت کی فرمائش کی ہے۔ میرے خیال میں گیت کے لئے
مشاعروں کا اسٹیج موزوں نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے
مشاعرے اب اپنا حسن اور وقار کھوتے جارہے ہیں۔ بہرحال
تبسم صاحبہ آج زیادہ کامیابی حاصل نہیں کرپائیں واقعی ے
ان کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ اب بڑے اہتمام کے ساتھ
محترم رئیس رامپوری صاحب سے درخواست کی جارہی ہے
رئیس صاحب تحت میں ارشاد فرمارہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے ہ

شہر کی اونچی اونچی عمارات میں کہاں

جو پیار اب بھی گاؤں کی انگنائیوں میں ہے

غم یہ نہیں کہ اسکی بدولت ہوا یہ حال

دُکھ تو یہ ہے کہ وہ بھی تماشائیوں میں ہے

گھر سے جو آج نکلو تو ہنستے ہوئے رئیس

رونے کا اختیار تو تنہائیوں میں ہے

داد سے جھولیاں بھرے غزل ختم کرچکے تو دوسری غزل سنا رہے ہیں
جو چھوٹی بحر میں ہے۔ چھوٹی بحر میں غزل کہنا بظاہر بہت آسان
مگر حقیقت میں بہت مشکل کام ہے۔ اس بحر میں بھی رواں
دواں شعر رئیس صاحب سنا رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں

دوستی کی علامتیں ہیں بہت ÷ انکو مجھ سے شکایتیں ہیں بہت
اب جو خفا اس نے مجھ کو بیجا ہے ÷ اسمیں لفظی رعایتیں ہیں بہت
دوستی دشمنی سے مشکل ہے ÷ دوستی کی نزاکتیں ہیں بہت
مجھ کو تباہ کرنے کو ÷ میری اپنی ہی عادتیں ہیں بہت
میں نے جام کیسے بے نیاز سے توڑ دیا ÷ اور بڑوں کی ہدایتیں ہیں بہت
وقت ناساز گار ہو تو رئیس ÷ چھاؤں میں بھی تمازتیں ہیں بہت

رئیس صاحب غزل ختم کرکے نہایت کامیاب لوٹ
رہے ہیں۔ اب مشاعرے کے دو شاعر باقی رہ گئے ہیں،
ایک وسیم بریلوی اور دوسرے صدر مشاعرہ محترم والی آسی
صاحب ـــــ وسیم بریلوی شاعروں کے بڑے کامیاب
شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں ایک نیا آہنگ
ہوتا ہے جو سننے والوں پر ایک عجیب سی کیفیت طاری
کرتا ہے۔ مائیک پر اگرچہ شعر تحت میں پڑھ رہے ہیں۔
شعر آپ کی نذر ہیں ـــ

کوئی حد بھی تو ہوا اختلافات کی ÷ بات دن کی کہی تو لگی رات
فشک موسم میں پلکیں سلگنے لگیں ÷ میری آنکھوں کو عادت ہے
سلگتی آنکھوں سے خون آشام ہوتا ہے ÷ دسکتی تو یہ کوئی تیرا نام لکھ
تمہارے بارے میں کچھ سوچنے کا حق بھی نہیں ÷ مگر تمہارے ہی بارے میں سوچنا
کتنی گنہگار ہے راتوں کی زندگی ÷ دیکھو کسی چراغ کی آنکھوں میں
ماحول سازگار ہوا تو وسیم صاحب ترنم میں اپنی غزل سنانے لگے۔

اب ان آنکھوں میں کوئی کہانی نہیں ÷ کیسے دریا ہو جن میں پانی
کھو گئی مل گئی وقت کی دھول میں ÷ وہ محبت جو لگتا اتفاق
ریزہ ریزہ بکھرنا مقدر رہا ÷ تو بار کبھی کبھی ہار مانی نہ
سارا قصہ سفر کے ارادوں کا ہے ÷ راستوں کی تو کوئی کہانی
بھاگتی بھیڑ سے کوئی کہہ دے وسیم ÷ میری آنکھوں میں آنسو ہیں پانی

وسیم صاحب غزل ختم کرکے رخصت ہونا چاہتے تھے مگر مجمع میں
آوازیں ایک ساتھ گیت، گیت، گیت کی آنے لگیں
صاحب گیت سنانے لگے۔ گیت کبھی وسیم صاحب بڑا اچھا
پڑھتے ہیں۔ گیت کا مکھڑا ہے "کیسا موسم آیا سکھی رے پھولو
پچھ جائے" وسیم صاحب واقعی آج بہت کامیاب ہیں۔ گیت
نظم تحت میں پڑھ رہے ہیں۔ نظم بڑی موثر ہے۔ وسیم صاحب نے
کتنی گناہ گار ہے راتوں کی زندگی ÷ دیکھو کسی چراغ کی آنکھوں میں
یہ نظم رات کے اندھیروں میں ہونے والے گناہوں کی طرف اشارہ کرتی ہے
ایک نوجوان آدمی باسی دوشیزہ اپنی عصمت کی حفاظت
ہوتے اپنی جان دیدیتی ہے۔ وسیم صاحب بہت کامیاب
نظم کو بے حد پسند فرمایا۔ اب صدر محترم والی آسی صاحب
سخن دی جارہی ہے۔ رات کے تقریباً ڈھائی بج رہے ہیں محترم
صاحب کچھ بے دلی سی دکھا رہے ہیں۔ دراصل وہ اپنے
کے عہدے سے خوش نہیں ہیں۔ حالانکہ ان سے بہتر اور کون

تعزیت نامہ

بروفات حسرت آیات شریمتی اندرا گاندھی وزیر اعظم ہندوستان

کر دیا کچھ ظالموں نے اندرا گاندھی کا قتل
بن گئی ماتم کدہ عیش و خوشی کی انجمن

ٹوٹ کر ہم پر گریں غم کی ہزاروں بجلیاں
ہے نگاہِ آسماں بھی آج تو شعلہ فگن

گلشنِ ہندوستاں میں آگیا دورِ خزاں
کر دیا تاراج طوفانِ جنوں نے یہ چمن

آگئی ہیہات ہم پر ہی قیامت آگئی
ایک کے مرتے ہی گویا مر گئے سب مرد و زن

دردمندوں کی مسیحا بیکسوں کی دستگیر
خدمتِ قوم و وطن کی جس کے دل میں تھی لگن

دوستی کا ہاتھ رکھا دشمنوں کی سمت بھی
واہ یہ مہر و محبت آفریں اس کا چلن

دور تھی فرقہ پرستی اُس کے قُرب میں تھی
مطلقاً دل میں نہ آیا فرقِ شیخ و برہمن

اتحادِ باہمی تھا نصب العین زندگی
چاہتی تھی سب کو کرنا ایک دل اور ایک من

دیس کو رکھا بچا کے دو گٹوں کے جال سے
غیر جانب دار ملکوں کا کیا اک سنگٹھن

جذبۂ خود اعتمادی ہم میں یوں پیدا کیا
روحِ احساسات میں اُبھرا اتنا ہی بانکپن

تھا منشا ہیر جہاں میں اُس کا وہ ارفع مقام
پڑ نہ پائیں گے کبھی جس جا فرشتوں کے چرن

کر دیا اپنے ہی ہاتھوں اپنے محسن کو شہید
منہ پہ تھوکے گا ہمارے یہ اور یہ زمن

موت کے اس زلزلہ سے ہل گئی کل کائنات
ہے تزلزل میں زمیں تھرا اُٹھا چرخِ کہن

ہے امر تو اے وزیر اعظم ہندوستاں
ہے شہادت عرفانی زندگی کا پیرہن

چھپ گیا گو جسمِ خاکی موت کے آغوش میں
نام کو ڈھک پائے گا لیکن نہ میت کا کفن

تیری عظمت کا ترنگا تا ابد لہرائے گا
ہند کی دھرتی پہ جب تک ہیں رواں گنگ و جمن

ہے یہی نذرِ عقیدت اور یہی شعر و معا تجلی
ہوں ترے نقشِ قدم پر ہم سدا ہی گامزن

سالِ ہجری اندرا گاندھی کی رحلت کا ہے یہ
حادثہ واقع ہوا ہے دردناک و دل شکن

تعمیر سے آگے لکھو دوسرا مصرع ضیا
دیس کی تدح ورداں فخر و ہاتِ وطن

پیش کرتا ہوں ترے قدموں میں یہ اشکوں کے پھول

الوداع اے دخترِ نہرو دلِ بھارت رتن

سوگوار —
ضیا میرٹھی غازی آبادی

گہر از غم

نکہت شاجاپوری

بہار بے خزاں تھی اس چمن کی جان تھی اندرا
وطن کی آبرو تھی دھرم و ایماں تھی اندرا

امن کی زندگی کے واسطے وردان تھی اندرا
اخوت کے فسانے کا حسیں عنوان تھی اندرا

حقیقت یہ کہ ہندوستان کی پہچان تھی اندرا
وطن کی شان تھی اور وقت کی سلطان تھی اندرا

مہک سے جس کی پروائی مہکتی تھی بہاروں کی
ضیا دکھ میں فضا دیکھی چمکتی تھی ستاروں کی

یہ وہ بھارت کی بیٹی تھی جسے سب پیار کرتے تھے
تھا اور اس پہ ہونے کے لئے اقرار کرتے تھے

یہ اس کی موت ہے جو لوٹ ستم ڈھاتی ہوئی آئی
ہر اک قلبِ حزیں کو غم سے تڑپاتی ہوئی آئی

زمانہ بے وفا پہلے بھی تھا لیکن نہ تھا اتنا
جنوں کا سلسلہ پہلے بھی تھا لیکن نہ تھا اتنا

کہ گلشن کی اسی پیاری کلی پر وار کر بیٹھے
ترقی کے اسی مینار کو مسمار کر بیٹھے

محافظ بن کے جن ناگوں نے تم کو ڈس لیا اندرا
شکنجوں میں انہیں بدبختوں نے کس لیا اندرا

زمانہ لعنتیں بھیجے گا ان کے نام پر صدیوں
ہر اک اہلِ وطن تھوکے گا انکے نام پر صدیوں

ستم دورِ زماں نے ہم پہ یہ کیسا کر دیا نکہت
اندھیروں نے اجالوں کو یہ کیسا ڈس لیا نکہت

تاثرات

از حضرت مہذب لکھنوی
(پدم شری)

اہلِ دل کرتے ہیں ماتم سوگ کرتا ہے جہاں
جب زمیں پر بے خطا کا خون ہوتا ہے رواں

تیرِ صیادِ اجل نے ختم کر دی داستاں
لے گئی بلبل بہارِ گلشنِ ہندوستاں

روحِ موتی لال تھی جانِ جواہر لال تھی
پیروِ گاندھی وزیرِ اعظمِ ہندوستاں

صنفِ نازک پر گریں اتنی مسلسل بجلیاں
چھٹ گئی دنیا کہاں کا باغ کیسا آشیاں

روح نکلی اہلِ گلشن سے یہی کہتی ہوئی
خوش رہو اہلِ چمن اب تم یہاں اور ہم کہاں

سنگ نالی بے خطا کی موت اندرا اٹھ گئیں
خون کے آنسو بہے ہیں چشمِ نرگس سے رواں

پھول کمہلائے اداسی سی چمن میں چھا گئی
ہو گئی فریادِ الم بستہ سوسن کی زباں

بال سنبل کے کھلے گیسو نے کھایا پیچ و تاب
جل اٹھا لالے کا داغ آئی صدائے الاماں

قمریاں خاموش ہیں طاؤس غم سے سرنگوں
ہر طرف ہے باغ میں شہرِ خموشاں کا سماں

آئے تھے شرکت کی خاطر ملکوں ملکوں سے شفیق
ساتھ تھا ارتھی کے ملکوں اہلِ دل کا کارواں

خاک تیری رہی تھی جب ہوا میں کر رہیں
دیکھتا تھا غور سے جھک جھک کے پیرِ آسماں

مل گیا راجو کو ماں کی جانشینی کا شرف
ہے یقیں ہو گی عدم میں روحِ اندرا شادماں

مرحومہ وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی امن کی مسیحا کی رحلت پر نذرانۂ عقیدت

تحریر: ریشی امروہوی

چلتے چلتے رُک گیا ہر کاروبارِ زندگی — رُک تڑپے اُڑ گیا رنگِ بہارِ زندگی
آہ و آنسو میں نظر آیا دیارِ زندگی — ہر کسی کا لُٹ گیا صبر و قرارِ زندگی
اشکِ غم تھمتے نہیں، دل کو قرار آتا نہیں
اندرا جی جا چکی ہیں اعتبار آتا نہیں

غمزدہ ہے ہر نظر، سارے نظارے ہیں اُداس — دل میں ہیں بے چینیاں، جیون کے دھارے ہیں اُداس
دیش رنجیدہ ہے، انساں غم کے مارے ہیں اُداس — ہر طرف ہم بے سہاروں کے سہارے ہیں اُداس
جیت کر جنتا کا دل جنتا سے رخصت ہو گئیں
اندرا جی آج اِس دُنیا سے رخصت ہو گئیں

بجھ گئی جل کر چتا، پلکوں پہ دِل کا درد ہے — آج چہرہ ہر کسی کا فرطِ غم سے زرد ہے
دامنِ احساس پہ دُنیائے غم کی گرد ہے — اشک جاری ہیں ابھی ہونٹوں پہ آہِ سرد ہے
چھا گئے غم کے اندھیرے دھوپ ڈھل کے رہ گئی
اندرا جی کیا گئیں دُنیا بدل کے رہ گئی

وقت نے چکر چلایا زندگی جاتی رہی — دُشمنی نے سر اُٹھایا زندگی جاتی رہی
جسم کو زخمی بنایا زندگی جاتی رہی — موت کا سیلاب آیا زندگی جاتی رہی
آگ جیسے ظلم کا بادل برس کے رہ گیا
پھول سا اِک جسم شعلوں میں جھلس کے رہ گیا

ہر بلا سے ناگہاں ختم ہو کر رہ گئی — خون کی آخر روانی ختم ہو کر رہ گئی
دھرتی ماتا کی نشانی ختم ہو کر رہ گئی — امنِ عالم کی کہانی ختم ہو کر رہ گئی
سوز کیا ساحس تھا اِک سلجھا ہوا انداز تھا
اندرا جی پر ہمیں کیا ہر کسی کو ناز تھا

سلیکہ چندچین قابل
(دہلوی)

اِندرا کی ہتیا

تیری ہتیا کی اے اِندرا جب خبر ہم نے سُنی
تھرتھرا کے رہ گئی اہلِ وطن کی زندگی

کیا ہُوا کیونکر ہُوا حیرت میں تھا ہر آدمی
دفعتاً کیسے یہ رنج و غم کی بجلی گر پڑی

جو مخالف تھے تیرے وہ بھی تو روتے زار زار
ہر زباں پر آہ تھی ہر لب پہ تھی چیخ و پُکار

خدمتِ قوم و وطن کی تیرے دِل میں تھی لگن
تھی خلش سینے میں تیرے قلب میں اِک چبھن

باغِ جنت سے بھی بڑھ کر ہو یہ بھارت کا چمن
عمر بھر کرتی رہی تو خدمتِ قوم و وطن

تو سراپا مستیٔ عشقِ وطن میں چُور تھی
بادۂ مہر و وفا سے مست تھی مخمور تھی

تیری شہرت غیرفانی تیری ہمت لازوال
تو نے آساں کر دکھایا کام جو بھی تھا مُحال

سامنے آتا تیرے یہ تھی بھلا کس کی مجال
ہاں اگر اپنے ہی دھوکہ دیں تو پھر کیسا سوال

تو نے دُنیا میں کیا ہندوستاں کا سر بلند
کر چکے تسلیم جس کو کُل جہاں کے ہوش مند

کہہ رہے ہیں آج دل سے اہلِ دل اہلِ نظر
مُلک و ملت کے لیے اُس نے دیا خونِ جگر

سب کی آزادی کی خواہاں تھی بالفاظِ دگر
شکلِ انساں میں تھی قابلؔ وہ دیوی سر بسر

عرش پر جب تک رہیں گے آفتاب و ماہتاب
دہر میں زندہ رہے گا اُس کا کارِ لاجواب

از بی۔ اے
ادیب لکھنؤ

قطعات رحلت فخرِ ہند وزیرِ اعظم اندرا گاندھی

قطعہ

[illegible] سیاست ہی کا کب تھا کچھ بھیان ہاں دیش کی خدمت کری دن رات سی
[illegible] سن ہجری چودہ سو پانچ ہائے رحلت اندرا گاندھی سیاست
۱۴۰۵ھ

قطعہ دیگر

[illegible] اندرا جی دیوی کو بہار [illegible]
[illegible] آگ جہنم کی لگی جو [illegible]
۱۹۸۴ء

نشوں کی پنچایت

(شفیعہ ناصر حیدرآباد دکن)

سنکھیا :- آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں ؟

تمباکو :- ارے! آپ ہمیں نہیں پہچانتے ؟ جو آپ ہیں وہی ہم ہیں میرا نام تمباکو ہے، میرا ایک لڑکا ہے جس کا نام حقہ ہے اور دو لڑکیاں ہیں، ایک بیڑی، دوسری سگریٹ، یہ جو میرے پاس کھڑی ہیں انکا نام شراب ہے، یہ گانجا، یہ چرس اور یہ افیم ہے۔

سنکھیا :- آپ میرے پاس کس لئے آئے ہیں ؟

تمباکو :- اور کس کے پاس جائیں ؟ برادری والوں کو چھوڑ کر دوسری جگہ کہاں جائیں گے ؟

سنکھیا - میں یہی تو پوچھ رہا ہوں، آپ میری برادری کے کیسے ہیں، میں ہوں زہریلا ہلاہل، میرا کام آدمی کو مار ڈالنا ہے، آپ سب زہر نہیں، مزے کی چیزیں ہیں۔

تمباکو :- ہنستے ہوئے، یہی تو آپ کی بھول ہے۔ ہم بھی زہر ہی ہیں۔

سنکھیا - کیا آپ مجھے دودھ پیتا بچہ سمجھتے ہیں ؟ کیا مجھے ہر کا پتہ نہیں ہے ؟ دھتورہ، کچلا، سنکھیا، میٹھا تیلیا کے نام مجھے معلوم ہیں، کیونکہ وہ بھی میری طرح مارنے کا کام کرتے ہیں، پھر میں نے یہ کبھی نہیں سنا کہ تمباکو، شراب، بھنگ، گانجا، چرس، اور چائے سے بھی آدمی مر جاتے ہیں۔

تمباکو :- اچھا آپ یوں کہتے ہیں تو ذرا سوچ کر بتایئے کہ سال پورے ضلع میں سنکھیا، دھتورہ، کچلا، میٹھا تیلیا سے سب ملا کر کتنے آدمی مرے ؟

سنکھیا :- (سوچتے ہوئے) کم سے کم دس آدمی تو مرے ہی ہونگے۔

تمباکو :- بس کل دس آدمی ؟ اسی برتے پر آپ اور آپ کو ہلاہل زہر کہتے ہیں اور ہم پر نام دھرتے ہیں۔

سنکھیا :- دس کیا کم ہیں ؟ اور پھر کوئی ہمیں کھائے گا ہی نہیں تو مریں گے کیوں کر ؟

تمباکو :- تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ اب آدمیوں کے مارنے کے کام کے آپ نہیں رہے۔

سنکھیا :- یہ ماننا ہی پڑے گا کہ آج کل زہر کھا کر بہت کم آدمی مرتے ہیں، کیا آپ میں بھی آدمی کو مارنے کا بل ہے ؟

تمباکو :- آپ سے زیادہ اور آپ سے بڑھ کر ہمارا مارا تو جی ہی نہیں سکتا۔

سنکھیا :- اچھا!

تمباکو :- جی ہاں! ہم ہم آپ کی سی بیوقوفی نہیں کرتے۔

سنکھیا :- ہم کیا بیوقوفی کرتے ہیں ؟

تمباکو :- آپ کی بیوقوفی یہ ہے کہ آپ کھاتے ہی جان لیتے ہیں، اسی لئے معمولی آدمی آپ سے بچ کر دور ہی دور رہتے ہیں ان کو آپ کے پاس پھٹکنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی

سنکھیا :- اسی سے تو ہمارے بل کا پتہ چلتا ہے، اسمیں بیوقوفی کیا ہے ؟

تمباکو :- بس یہی کہ تھوڑے دن میں آپ کا نام ہی مٹ جائے گا لیکن تو ہمارے کام کرنے کے ڈھنگ کی ہے۔ کہ مرنے والے کو پتہ نہیں لگنے دیتے اور اس کو موت کے گھاٹ لے جاتے ہیں۔

سنکھیا :- میں اس کو کایر تا کہتا ہوں۔

تمباکو :- جو کچھ کہیں۔ پر آپ اس دنیا میں گھوم گھوم کر دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ اکیلے میرے ہی کارن کتنے آدمی موت کی گھڑیاں گن رہے ہیں۔

سنکھیا :- ذرا سنوں تو۔

تمباکو :۔ ڈاکٹروں نے حساب لگاکر دیکھا ہے کہ تپ دق، کھانسی، دمہ، بدہضمی، دل کی گھبراہٹ اور پاگل پن سے مرنے والوں میں سب سے بڑی تعداد تمباکو پینے والوں کی ہے۔

سنکھیا :۔ کیوں کر ؟

تمباکو :۔ آپ تمباکو پینے والوں پہ دھیان دیں تو دیکھیں گے کہ سب سے پہلے دانتوں کو نقصان دیتا ہے اور ان میں کیڑا پیدا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ دھواں گلے اور پھیپھڑے میں جاتا ہے۔ پھیپھڑوں میں آکر خون صاف ہوتا ہے، پر تمباکو پینے والوں کا خون صاف ہو نہیں پاتا، اسلئے اسمیں تمباکو کا زہر پھیل جاتا ہے، جس کے کارن بدہضمی، پاگل پن، گھبراہٹ، کام میں من نہ لگنے کے روگ ہو جاتے ہیں، چھاتی و گلے میں جلن اور کھانسی پیدا کرکے میں انھیں آسانی سے دمہ اور تپ دق کے لئے تیار کر دیتا ہوں۔

سنکھیا :۔ آپ بہت بڑا دعویٰ کر رہے ہیں۔ یقین نہیں آتا۔

تمباکو :۔ ڈاکٹروں کی رائے تو مانو گے وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے رہتے ہیں، پر جس نے مجھ سے ایکبار ناتا جوڑ لیا پھر اس کے جال سے نکلنا ہی کٹھن ہے، مرکر پیچھا چھوٹتا ہے۔

سنکھیا :۔ اگر لوگ جان جائیں گے کہ تمباکو پینے سے تپ دق، دمہ، دانتوں کی بیماری، پاگل پن، دل کی بیماری جیسے روگ ہو جاتے ہیں تو وہ چھوڑ دیں گے ؟

تمباکو :۔ چھوڑنا کیا آسان ہے۔ جناب ڈاکٹر۔ لاکھوں روپیہ خرچ کرکے فلمیں بناتے ہیں اور ایک ایک روگ کو ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتے دیکھتے ہیں پر ان کی سنتا کون ہے ؟

سنکھیا :۔ کیوں نہیں چھوڑ سکتے۔ کیا اس میں کوئی بھید ہے۔

تمباکو :۔ بھید ہی تو ہے۔ ہم سب کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ جو لوگ ہمارا استعمال کرتے ہیں، ہم سے چھٹکارا پانے کی طاقت ہی ہم برباد کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد کوئی سوچے بھی وہ ہم سے نجات نہیں پا سکتا۔

سنکھیا :۔ شراب کا جھما وغیرہ کی طرف دیکھ کر اچھا اب آپ بھی اپنی جان پہچان کرائیے۔

شراب :۔ میں ہوں وہی خراب ہوں، مجھ سے پہلے پہل آدمی کا پیار اس طرح شروع ہوتا ہے کہ آدمی جب تھکا ماندہ ہے یا تھوڑا بہت کھانسی کھٹرا ہو جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں ”تھوڑی سی شراب پی لو“ ایک بار پینے پر دوسری بار اور پھر بار بار پینے کو من کرتا ہے۔

سنکھیا :۔ کیوں ؟

شراب :۔ کیونکہ مجھے پیتے ہی خون میں تیزی آ جاتی ہے اور خون رگوں میں جلدی جلدی دوڑنے لگتا ہے۔ من میں ایک آنند سا آنے لگتا ہے تھوڑی دیر کے لئے سارے دکھ درد دور ہو جاتے ہیں۔

سنکھیا :۔ ہاں یہی بات ہوگی، میں نے دیکھا ہے، مزدور شراب بہت پیتے ہیں، کیونکہ دن بھر انھیں کڑا کام تو کرنا ہی پڑتا ساتھ ہی انھیں گھر پر بھی آرام نہیں ملتا۔ مزدور شائد اپنا دکھ بھلانے کے لئے ہی شراب پیتے ہیں۔

شراب :۔ جی ہاں، تمباکو پینے سے آدمی پر اتنا تیز نشہ نہیں چڑھتا اس لئے لوگ ایک دن دو دو روپئے خرچ کرکے مجھے پیتے ہیں۔ (تمباکو کچھ کہنا چاہتا ہے مگر چپ رہ جاتا ہے؟)

سنکھیا :۔ کیا شراب سے بھی روگ پڑتے ہیں۔

شراب :۔ روگ، تمباکو سے جو روگ برسوں میں ہوتا ہے وہ کام مہینوں میں کر ڈالتی ہوں، میرا کام ہے آنتوں اور پھیپھڑوں کو گلا دینا۔ میں جگر کو بھی خراب کر دیتی ہوں۔ اس سے شرابی میں خون ٹھیک نہیں بنتا اور اس کا مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ مجھے پینے والے کے گردے خراب ہو جاتے ہیں، کہ اچھی سے اچھی حالت میں بھی شرابی دوسرے آدمیوں سے دس سال کم جیتا ہے۔

سنکھیا :۔ میں آپکی یہ بات نہیں مان سکتا کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ کئی شراب پینے والوں کا منہ لال ہوتا ہے اور شرابی بھی خوب تگڑا ہو جاتا ہے۔

شراب :۔ وہ شراب سے نہیں بلکہ شراب کے ساتھ جو اچھے کھانے کھائے جاتے ہیں، ان کے کارن ہوتا ہے۔ شراب پینے والے کو اگر معمولی بھوجن دیا جائے تو وہ بہت جلد سوکھ جائے گا اور بیمار ہو کر مر جائے گا۔ ویسے جتنے گھروں نے اجاڑے ہیں وہ اور کسی نے برباد نہیں کئے۔

سنکھیا :۔ یہ کیسے ؟

شراب :۔ مجھے پی کر آدمی متوالا ہو جاتا ہے، متوالا ہو کر جھگڑا فساد کرتا ہے اور سر پھٹول ہو جاتی ہے، سیکڑوں آدمی میری مہربانی سے جیل جاتے ہیں، موٹر کے نیچے کچل کر مر جاتے ہیں۔

سنکھیا :۔ تو آپ تمباکو سے بھی بڑھ کر ہوئیں۔

(تمباکو کچھ بولنا چاہتا ہے، پر شراب ایکدم بولنے لگتی ہے)

شراب :۔ اس میں کیا شک ہے مجھے پی لینے سے آدمی اچھا برا نہیں دیکھتا، اور دوسروں کی عورتوں کی طرف بھی نظر ڈالتا ہے۔ جس سے آپس میں جھگڑے بھی ہوتے ہیں اور سماج میں بھی گندگی پھیلتی ہے۔

سنکھیا :۔ آپ تو خوب کام کرتی ہیں۔

شراب :۔ کرتی تو ہوں، جس کو میرا چسکا لگا پھر گھر میں بیوی، بچے چاہے دانے دانے کو ترستے رہیں، شرابی تو ہمیں پہنچ کر رہے گا

سنکھیا :۔ (گانجا، چرس اور چنڈو کی طرف دیکھ کر) آپ کون ہیں ؟

گانجا :۔ ہم ہیں گانجا، چرس اور چنڈو، تمباکو کی طرح ہم بھی پھیپھڑے، دل، خون، جگر اور معدہ خراب کرتے ہیں۔

سنکھیا :۔ (دوسری طرف دیکھ کر) ارے آپ ؟

بھنگ :۔ ہم ہیں بھنگ اور افیم، ہم بھی جگر اور معدہ کو بگاڑتے ہیں، تھوڑی دیر کے لئے ہمارے استعمال سے بھوک لگتی معلوم دیتی ہے پر وہ سب تھوڑی دیر کے لئے اس کے بعد پیٹ خراب ہونے لگتا ہے اور آدمی کی خوراک بھی گھٹ جاتی ہے۔

سنکھیا :۔ (چائے کی طرف دیکھ کر) آپ چائے اور قہوہ تو شائد نقصان نہیں پہنچاتے۔

چائے :۔ ہاں ایکدم نہیں، لیکن ہمارا بھی اپنا زہر ہوتا ہے جو آنتوں پر اثر ڈال کر بھوک کم کر دیتا ہے، ہمارے استعمال سے نیند بھی کم آتی ہے، طاقت بھی کم ہو جاتی ہے اور اس طرح اچھی صحت کی تینوں چیزیں بھوک، نیند اور طاقت بگڑ جاتی ہیں۔

سنکھیا :۔ آپ سب میں ایک بات ملتی ہے کہ آپ سب کے استعمال سے ہاضمہ بگڑ جاتا۔

شراب :۔ ٹھیک ہے ہم سب نشہ دے دے کر تو بگاڑتے ہی ہیں ہمارا اثر ہاضمہ پر بھی پڑتا ہے اسی لئے وہ نربل ہو جاتا ہے اور صحت برباد ہو جاتی ہے۔

سنکھیا :۔ تب تو سمجھنا چاہئے کہ آپ کے ہوتے ہوئے یم راج (موت کا دیوتا) کا بھی کام سہل ہو جائے گا۔

تمباکو :۔ سہل ہی کیوں، اگر ہم نشوں کے لئے آدمی اس طرح پاگل رہا تو گھر گھر ایک ڈاکٹر لگا دینے پر بھی روگ پیچھا نہیں چھوڑے گا۔

سنکھیا :۔ آپ کی باتیں سن کر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کے سب سے خوفناک دشمن اب ان کے گھر پہنچ چکے ہیں، اور اب ان کا نکلنا سہل نہیں۔

(ایک دم کہیں سے ودیا (علم) کمرے میں آ جاتی ہے)

ودیا :۔ نکلنا تو پڑے گا، یوں جوں میری روشنی اس جگہ میں پھیلتی جائے گی۔ آپ جیسی برائیوں کی جڑیں ڈھیلی ہوتی جائیں گی۔ اور آج نہیں تو کل آپ کو کچھ کرنا ہی پڑے گا، پھر یہ بھی یاد رکھو کہ جن چیزوں کو لوگ اب تک زہر سمجھتے تھے ہیں۔ انہیں سے میری کرپا سے ایسی دوائیاں بنیں گی کہ خوفناک سے خوفناک روگ سے بھی آدمی کو بچایا جا سکے گا۔

تمباکو :۔ ہو ہو، آپ کو اس پنچایت میں کیا پاس تھا اگر آپ پر آدمی کا کلیان کرنے کی دھن سوار ہے تو آپ کا دوسروں کے کام سے کیا کام ہے ؟

ودیا :۔ کام یہی ہے کہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ آپ کی [illegible] چل جائے گی۔

شراب، گانجا، افیم، چائے اور تمباکو کچھ دیکھا جائے گا [illegible] کمرے سے نکلنے لگتے ہیں،

ودیا :۔ دیکھا جائے گا [illegible]

جوابی خط لکھا کیجئے۔ تاکہ آپ کو جواب فوراً مل سکے جواب طلب امور کے لئے جوابی خط بھیجا کریں۔ [illegible]

اور دھرتی کانپ اُٹھی

احمد حسین شمس ایڈووکیٹ
(کشن گنج)

(دوسری قسط)

کشن لال اپنے بنگلے میں بیٹھے منہ سے حقہ لگائے اپنی عزیز تر از جان بیٹی ہیرا کے مستقبل پر غور کر رہے ہیں انہیں اپنی لڑکی کے لئے ایک ایسے ور کی تلاش تھی جو تعلیم یافتہ ہو خوبصورت اور نیک ہو مالی حالت ایسی بہتر ہو کہ ان کی ہیرا اس گھر میں جا کر راجکماریوں جیسی زندگی گزارے جہاں جہاں سراغ ملا دیا وہاں کشن لال گئے مگر کہیں بر پسند آیا تو گھر نہیں اور گھر ٹھیک پایا تو بر اچھا نہیں ملا آج سال بھر سے ان کی پیہم کوششیں رائگاں جا رہی تھیں ہیرا جوان ہو چلی جوان لڑکی کب تک اپنے والدین کے گھر میں رہ سکتی ہے۔ لڑکی اپنے شوہر ہی کے گھر کی شوبھا ہے وہ پرایا دھن ہے۔ آج باپ کے گھر ہے کل سب سے منہ موڑ کر اپنے شوہر کے گھر چلی جائے گی یہی رسم دنیا ہے۔

لڑکی جب پیدا ہوتی ہے تو اس وقت اگر ماں نہیں تو باپ ضرور کچھ نہ کچھ ملول خاطر ہو جاتا ہے مگر بیٹی کی ذات میں قدرت نے کچھ ایسی کشش پنہاں رکھی ہے کہ چند روز کے بعد وہی بیٹی جو پیدائش کے وقت ایک بوجھ معلوم ہو رہی تھی رفتہ رفتہ والدین کے دل کا سکون اور آنکھوں کی ٹھنڈک بن کر رہ جاتی ہے۔ قدرت ایسا انتظام اگر نہ کرتی تو شاید دنیا کی کسی لڑکی کی تعلیم و تربیت پرورش و پرداخت میں کوئی باپ اس انہماک اور جوش و خروش سے کام نہ لیتا مگر وہ بوجھ جس کی طرف سے بارہ سال والدین بے خبر رہتے ہیں۔ ٹھیک بارھویں تیرھویں سال ماں باپ کو محسوس ہونے لگتا ہے۔ پیدائش کے وقت جو احساس نادانستہ طور پر والدین کے دل و دماغ میں پیدا ہو جاتا ہے، وہی احساس اس وقت کانٹے کی طرح دل میں چبھنے لگتا ہے جب لڑکی نیم بالغ ہو جاتی ہے اسکی چبھن روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ باپ پریشان الگ، ماں الگ، نہ دن کو چین نہ رات کو آرام ایک پھانس سی دل میں اٹک کر رہ جاتی ہے۔ ماں اس پھانس کی نوعیت پر غور کرتی ہے۔ باپ اسے جلد از جلد گلے سے نکالنا چاہتا ہے یہ پھانس لاکھ تکلیف دہ سہی مگر کوئی باپ یہ نہیں چاہتا کہ اُسے نکال کر پھینک دے وہ حتی المقدور اپنی لڑکی کی آئندہ زندگی سنوارنے کی ہی کوشش کرتا ہے کون ہے جو یہ نہیں چاہتا کہ اس کی لڑکی کسی شریف اور دولت مند گھرانے میں بیاہی جائے۔

کشن لال نے ہر ممکن کوشش کی۔ جہیز میں کافی سامان دینے کا خیال ظاہر کیا تلک میں تین ہزار نقد دینے کا ارادہ تھا مگر ان کی طبیعت کے موافق کہیں کوئی لڑکا نظر نہیں آیا۔ وہ سال بھر سے گھر گرہستی کے معاملے سے بے خبر۔ دن رات ہیرا کی سگائی ہی کی فکر کر رہے تھے کھیتی باڑی کا کام بڑے لڑکے کے ذمے تھا اور لین دین کے معاملے کو چھوٹے نے سنبھال رکھا تھا۔

کشن لال کو جب یہ معلوم ہوا کہ کل منوہر ہولی کی چھٹی میں پٹنے سے آیا ہے تو اُس سے ملنے کے لئے وہ ذرا متجسس ہو گئے صبح اُنھوں نے اپنے نوکر کو بھیجا اور جب اس نے آکر ان سے کہا ایک ڈیڑھ گھنٹہ میں منوہر آ جاتا ہے تو اُنھیں قدرے سکون ہوا منوہر کے باپ سے کشن لال کی بڑی دوستی تھی دونوں ایک دوسرے کے دکھ درد کے ساتھی تھے۔ منوہر کی پیدائش پر کشن لال نے خوشیاں منائی تھیں اور چار سال کے بعد جب ہیرا پیدا ہوئی تھی تو منوہر کے باپ نے اپنے خرچ سے گاؤں میں ناچ اور رام لیلا کا انتظام کیا تھا منوہر کے باپ کو انتقال کئے آٹھ نو سال ہو گئے مگر اب تک کشن لال کے دل میں بہت سی رنگین داستانیں جو منوہر کے باپ سے وابستہ تھیں، چٹکیاں لے رہی تھیں۔ یوں تو کشن لال کچھ زیادہ مانتے تھے اور منوہر ذرا ان کی نظر میں کھٹکتا تھا اور اسکی وجہ صرف یہ تھی کہ منوہر کے خیالات نئی روشنی کے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد منوہر آیا اور انہیں آداب بجا لا کر

بیٹھ سکیں۔ کشن لال نے ذرا مسکرا کر پوچھا۔ "خیریت تو ہے"

"آپ کی دعا ہے"

"اب اور کتنے دنوں تک پڑھنا ہے"

"دو سال کے بعد میں آپ کی دعا سے وکالت پاس کر لوں گا۔"

"پھر کیا ارادہ ہے"

"ابھی تو سامنے دو سال ہیں ابھی سے ارادہ کیسے ظاہر کردں"

"نہیں میرا مقصد ہے کہ نوکری کرنے کا ارادہ ہے کہ وکالت کا۔"

"اگرچہ ہماری گورنمنٹ پسماندہ قوم والوں پر مہربان ہے مگر پھر بھی نوکری آسانی سے نہیں ملتی۔"

"کیوں؟ اپنی حکومت نے پسماندہ قوم والوں کے لئے ہر شعبے میں جگہیں مخصوص کر دی ہیں۔"

"مگر انہیں مخصوص جگہوں کے لئے ایک پر سو درخواستیں پڑتی ہیں مقابلہ بڑا سخت ہوتا ہے۔"

"تو مطلب یہ ہوا کہ اپنی برادری میں تعلیم اس قدر عام ہے کہ ...."

"پچھڑی ذات والے صرف ہمیں لوگ تو نہیں"

"پھر بھی ذرا میں سنوں اپنی برادری کے کتنے لڑکے تمہارے ساتھ تعلیم پاتے ہیں؟"

"اپنی برادری سے الگ عام طور سے برادری مقصد ہے تو بیس بارہ لڑکے کالج میں ہیں مگر ست گوپ برادری کے پٹنہ کالج میں صرف دو ہیں ایک تو میں خود دوسرا بی۔ اے۔ کا طالب علم"

"کہاں کا رہنے والا ہے وہ؟" بجزان ایک طرف رکھتے ہوئے کشن لال پوچھ بیٹھے۔

منوہر ان کے اندرونی جذبے کو تاڑ گیا ہیرا کی بھولی بھالی صورت اس کی نگاہوں میں پھر گئی اسے ایسا محسوس ہوا کہ ہیرا اس کے سامنے کھڑی منع کر رہی ہے کہ اس لڑکے کے بارے میں کچھ نہ کہنا منوہر کے جی میں آیا کہ وہ اپنی لاعلمی ظاہر کر دے اس لڑکے کا پتہ دیکر بہت ممکن ہے ہیرا کو کھو بیٹھے ہیرا منوہر کی ہے منوہر ہیرا کا یہ سال بھر سے کشن لال کوشش کر رہے ہیں مگر جس حسین دوشیزہ کو قدرت نے منوہر کے لئے منتخب کر لیا ہے وہ منوہر کی نہ ہو کر دوسرے کے لئے کیسے ہو سکتی ہے۔ منوہر صاف صاف کیوں نہ پوچھ لے کہ شادی بیاہ کے معاملے میں کیا انہوں نے کبھی ہیرا کی مرضی بھی دریافت کی ہے مگر اس دریافت سے فائدہ ہی کیا۔ ہیرا منہ کھول کر کچھ یوں تو نہیں کہہ سکتی۔ تمناؤں کا خون ہی کیوں نہ ہو جائے مگر ہندوستانی عورتیں جس مفروضہ شرم و حیا کی پابند ہوتی ہیں ان سے ایک سخت بغاوت کیوں کر ممکن ہے ہیرا حسین ہے سگھڑ ہے نیک ہے تعلیم یافتہ ہے جس ہیرا کو منوہر اتنے دنوں تک اپنے دل کے گوشے میں بٹھا کر پرستش کر رہا تھا کیا آج وہ خود اسے اپنے دل سے نکال دے۔ ہیرا اس کی جان تمنا تھی وہ اس کے خون کے قطرے قطرے میں رس بس گئی تھی، ہیرا کو وہ کسی قیمت بھی چھوڑ نہیں سکتا تو کیا وہ کہہ دے کہ اس لڑکے کے بارے میں منوہر کچھ نہیں جانتا یا یہ کہ اس لڑکے کی دو چار برائیاں گنوا دے کہ کشن لال فوراً اس سے متنفر ہو جائیں مگر اس سے حاصل؟ ہیرا کو حاصل کرنے کا مطلب ہے کشن لال کے دل کو فتح کرنا۔ اگر کشن لال نے حامی بھر دی تو پھر ہیرا منوہر کی ہے مگر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

کشن لال نے پھر پوچھا۔ "وہ کون لڑکا ہے"

منوہر چونک اٹھا اس نے کہا "یہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ اس کا صحیح پتہ کیا ہے"

"لیکن رہتا تو ہے پٹنہ ہی میں"

"ہاں اور میرے کمرے ہی میں"

"جب تو اس سے اچھی طرح واقف ہو گے"

"وہ رہنے والا ضلع مظفرپور کا ہے"

"کھاتے پیتے لوگ ہیں"

"اس کے گھر کی حالت سے میں اچھی طرح واقف نہیں ہوں مگر آپ اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہیں"

"منوہر! ہیرا کی فکر نے مجھے پریشان کر رکھا ہے"

"تو آپ اس کی سگائی کی سوچ رہے ہیں؟"

"اسی لئے تو میں نے تمھیں بلوایا ہے تم میرے کوئی غیر نہیں اگر آج تمھارا باپ زندہ ہوتا تو مجھے اس قدر تردد نہ کرنا پڑتا بیٹے ننھے کی دلہن خود تمھارے باپ نے تلاش کی تھی۔ آج وہ نہیں میں بے یار و مددگار ہوں۔ تمھارے بھیا کو کچہری سے فرصت نہیں اور تمھیں کالج سے اور ادھر میرا اشارہ تمھیں کی عمر کو پہونچ رہی ہے؟"

کشن لال نے ایک لمبی سانس لی۔

"مگر آپ تو سال بھر سے لڑکے کی تلاش میں ہیں؟"

"ہوں تو سہی مگر میں اپنی لڑکی کو گڑھے میں ڈھکیل تو نہ دوں گا۔"

"تو کیا آپ کو اپنے علاقے میں کوئی لڑکا نظر نہیں آتا؟"

"اگر نظر ہی آجاتا تو اتنی فکر کاہے کو تھی۔"

"اتنے میں اندر سے کشن لال کا پوتا بیرج نندن دوڑا دوڑا آیا اور اپنے دادا کی گود میں بیٹھ کر مچلنے لگا۔ کشن لال نے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا کیوں رے نندن منوہر کاکا کو تو نے سلام نہ کیا۔ یہ دیکھو کالج سے آیا ہے — اور تو کیا پڑھتا ہے؟"

نندن نے اپنا چہرہ دادا کی گود میں چھپا لیا۔

"بڑا شرمیلا ہے" منوہر نے کہا۔

"اسے شرمیلا نہ کہو ایک نمبر کا شیطان ہے ابھی تمھیں دیکھ کر شرما رہا ہے تم سے مانوس نہیں ورنہ ابھی تمھاری جان کھا جاتا۔ دن بھر طوطے کی طرح ٹائیں ٹائیں کرتا رہتا ہے۔"

نندن نے دو تین گھونسے دادا کی توند پر جما دیئے۔

"اب سوجھی ہے شرارت۔ اُٹھا کر پٹک دوں گا زمین پر"
کشن لال نے ذرا غصے سے کہا اور نندن گلے میں باہیں ڈال کر لٹک گیا۔

نندن نے اپنے دادا کے کان میں پوچھا، یہ کون ہیں دادا؟

"لے اب مجھ سے پوچھتا ہے منوہر تیرا کاکا ہے لے اب آداب کر۔"

نندن ان کی گود سے اتر کر بھاگا بھاگا اندر چلا گیا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد منوہر نے دیکھا کہ اوٹ سے کوئی جھانک رہا ہے دو تین مرتبہ منوہر نے کام کوشش کی مگر بغیر اس کے کہ کوئی اوٹ سے سامنے آئے کچھ پتہ نہ چلا سامنے کشن لال تھے اس لئے اندازہ

بیٹا سکا نہ تھا بلکہ اس کے انداز میں خوف اور حجاب جھلکتے ہوئے اٹھا تھے۔ ایک دفعہ اتفاق سے وہ بڑی بڑی گہری آنکھیں اس کی آنکھوں سے ملا گئیں اور پھر وہ آنکھیں غائب تھیں اور ادھر ایک بجلی سی منوہر کے سارے بدن میں دوڑ گئی اسے ایسا معلوم ہوا کسی نے اس کے دل کو چٹکیوں سے مسل ڈالا وہ تلملا اٹھا آنکھوں نے شراب پلا دی۔ منوہر کے کان میں پائل کی ایک ہلکی سی جھنکار محسوس ہوئی اور پھر وہ جھنکار دفعتاً غائب ہو گئی شاید کوئی دبے پاؤں وہاں سے کھسک گیا اور اس کے کانوں میں پائل کی جھنکار گونجتی رہی۔

کشن لال نے پھر پوچھا "ہولی تک تم رہتے ہو؟"

"جی ہاں"

"اور ہولی کے بعد وہ لڑکا بھی کالج آجائے گا؟"

"آجانا تو چاہیئے"

"میں چاہتا ہوں اب کی مرتبہ تمھارے ساتھ میں بھی پٹنہ چلوں۔"

"بہت خوب"

"میرا خیال ہے وہ کسی اعلیٰ خاندان کا چشم و چراغ ہوگا!"

"اعلیٰ خاندان سے آپ کا مطلب؟"

"یعنی یہی کہ وہ کسی امیر گھرانے کا لڑکا ......؟"

"تو شرافت آپ کے خیال کے مطابق اسی دولت کا دوسرا نام ہے۔"

"تم نے سمجھنے میں غلطی کی شرافت یقیناً دولت سے علیحدہ کوئی اور چیز ہے مگر زمانہ زر ہی کی بدولت عزت ہے جن کے پاس دولت نہیں وہ بھی کوئی انسان ہے غربت بدترین لعنت ہے منوہر!"

"بیشک مگر شرافت اور عزت کو دولت سے کیا نسبت! بڑے بڑے شہروں میں بہت سی طوائفیں اور ایکٹریس لکھپتی ہیں آج کیا ان کی دولت دیکھ کر ہم اور آپ اپنے لڑکوں کی نسبت ان مال زادیوں سے کر دیں؟ بہت سے چور اور ڈاکو اپنے پاس دولت کے انبار رکھتے ہیں تو کیا اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم ان سے رشتہ داریاں قائم کر لیں!" منوہر کی زبان ذرا سے تلخی ہو چلی اس نے محسوس کیا کشن لال نے در پردہ اس کی غربت کا مذاق اڑایا ہے انھوں نے اس کے گال پر ایک چپت لگا دی ہے اس کا دل

ترشپ اُٹھا۔

"منوہر! کالج کی تعلیم نے تمھارے زاویہ نگاہ کو بدل دیا؟ تم تخیلات کے عالم میں سانس لے رہے ہو جب واقعات نیا میں قدم رکھوگے اس وقت تم پر یہ عقدہ کھلے گا کہ دولت ، کتنی عزیز شے ہے ذرا وکالت تو پاس کر لو پھر تمہیں چور سادھو میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا" کشن لال ہنس اور پھر نوکر کو آواز دی کہ چلم بھر لائے۔

"مگر میں پوچھتا ہوں کا کا پائیداری عزت کو ہے یا دولت کو؟"

"دونوں کو نہیں۔ دولت ہاتھ کا میل ہے، عزت کا پانی۔ جس طرح ہاتھ کے میل کو جانے میں دیر نہیں اسی طرح کے پانی کو اترنے میں۔ پیٹ پر پتھر باندھ کر کوئی شریف نہیں رہ سکتا آج نہ کل اسے چوری کرنی ہی پڑے گی بڑے نواب زادوں کو میں نے دیکھا ہے دوسروں کے ب چلم بھرنے کے لئے نوکر ہیں تو کیا ہم ان کی صرف اسلئے ت کریں کہ وہ نواب خاندان سے تعلق رکھتے ہیں شیام ، کو تم جانتے ہوگے موجودہ اسمبلی کا وہ ایک رکن اعظم ہے مگر کا لڑکا کمیونسٹ بن کر ڈکیتیاں کرتا پھرتا ہے میں شیام لال زت کرتا ہوں ان کے صاحبزادے کی نہیں۔ شرافت ت کی محکوم ہے دولت شرافت کی نہیں۔ ایک دولت مند ، ہو سکتا ہے مگر ایک شریف غریب نہیں ہو سکتا" کشن لال کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

"مگر مجھے آپ سے اختلاف ہے"

"اختلاف ہونا ہی چاہیئے" بڑے اطمنان سے کشن لال کہا۔

"مگر اپنے دعویٰ کی دلیل رکھتا ہوں"

"دیکھو منوہر! بحث و مباحثے کے لئے ایسے عنوان بہت سب ہوتے ہیں مگر حقیقت کی دنیا اور ہوتی ہے۔ تم بھی کہو گے لت حاصل کرنے کے لئے ہر انسان کو چوری کرنی پڑتی ہے اور مثال میں تم چند آدمیوں کے نام گنوا دوگے۔ نسٹ اس قسم کے طریقہ بحث صرف کمیونسٹوں کے ہیں کیو ، ایسی باتیں کہہ کر عوام کو بہلے ورغلا لیں نوجوانوں کی

ذہنیت پر وہ بھلے چھاپہ مار سکتے ہیں مگر جسے بھگوان نے ذرا بھی سوجھ بوجھ اور عقل دی ہے وہ ان دلیلوں کے کھوکھلے پن کو فوراً بھانپ جاتا ہے میری بات چھوڑو میاں حسین بخش نے کس کی جان ماری ہے اور کس کا خون کیا ہے مگر انہیں دیکھو آج اس علاقے میں ان سے بڑھ کر دولت مند کوئی نہیں ہے کیا تم ان کی شرافت میں حرف لا سکتے ہو؟" کشن لال نے پوچھا۔

"کیا حسین بخش کے مذہب میں سود لینا جائز ہے؟" منوہر نے غصے سے پوچھا۔

"نہیں حرام ہے"

"مگر اچھی طرح جانتا ہوں ان کا سارا کاروبار سود پر چلتا ہے"

"دیکھو حرام اور حلال صرف مذہبی پابندیاں ہیں جو موقع محل دیکھ کر لگا دی جاتی ہیں۔ اگر وہ مذہب اسلام کا پیرو نہ ہو کر ہندو ہوتے تو کیا تم ایسی بات کہہ سکتے تھے اسلام کے سوا اور کسی مذہب میں سود لینا حرام نہیں تم انھیں صرف اس لئے برا سمجھتے ہو کہ وہ مسلمان ہیں اور سود لیتے ہیں مگر حسین بخش ہی کا نہیں ساری دنیا کا کاروبار سود پر چلتا ہے"

"تو کیا ایک کی جگہ دس وصول کرنا جرم نہیں؟"

"اگر یہ جرم ہے تو پھر ضرورت مندوں کی ضرورتیں کیسے پوری ہو سکتی ہیں"

یہی تو جال سرمایہ دارانہ نظام نے بچھا رکھا ہے۔

"تو میں کہتا نہ تھا کہ تم لوگوں کے دل و دماغ پر کمیونزم کا اثر غالب ہے یہ کمیونسٹ تو چاہتے ہی ہیں کہ سرمایہ، بورژوا، پرلتاری وغیرہ چند لفظوں کے مفہوم سمجھا کر تم لوگوں کو روس کا غلام بنا دیں۔ میں کہتا ہوں منوہر! ہر ملک کی ضرورتیں علیحدہ ہوتی ہیں۔ ہر دیش کا موقع محل الگ الگ ہوتا ہے روس، چین اور بھارت میں مماثلت کیسی کہ تم لوگ بھی لینن اور اسٹالین کو اپنا دیوتا سمجھ بیٹھے ہو۔ روس کی بغاوت معاشی نہ تھی بلکہ تھی مذہبی، اور اسی مذہبی انقلاب کو معاشی انقلاب کا نام دے کر جنتا کو ہم زبان بنا لیا آج روس میں کوئی خدا کا

نام نہیں لیتا مارکس نے جو منتر پڑھا اُسے اسٹالن نے پھونکا اور یہ جادو کام کر گیا مگر ہندوستان رشیوں اور منیوں کا ملک ہے

چند ہزار سال پہلے کی بات چھوڑو کیا مغلوں کے دورِ حکومت میں ہندوستان بھوکا ملک تھا؟ دولت کی فراوانی تھی جنتا سکھ چین کی زندگی گزار رہی تھی یہ تو انگریزوں نے ہم لوگوں کو بالکل قلاش بنا ڈالا سو بھگوان کی کرپا سے انگریز بھاگ گئے۔ اب ہم پھر کوشش کریں تو وہی زمانہ ہم دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں اس کے لئے رُوس اور چین کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں"

کشن لال نے پھر پیچوان منہ سے لگایا تو خوشبودار دھویں خیالات پریشاں کی طرح فضا میں بکھر گئے۔

منوہر نے کہا" آپ نے تو موضوع ہی بدل ڈالا سوال کمیونزم اور سرمایہ داری کا نہیں سوال یہ ہے کہ شرافت کا تعلق دولت سے نہیں۔"

" میں بھی تو یہی کہتا ہوں مگر قدرے ترمیم کیساتھ ایک شریف کا امیر ہونا لازمی ہے ایک غریب شریف ہو ہی نہیں سکتا غربت خود ایک ذلت اور رسوائی کا نام ہے عزت کی حفاظت صرف دولت کر سکتی ہے عزت غربت کی پناہ نہیں لے سکتی جب یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ ضروریاتِ زندگی ایک انسان کا پیچھا نہیں چھوڑ سکتیں تو پھر ہم یہ کیوں نہ مان لیں کہ جس شخص کے پاس دولت نہیں وہ اپنی ضرورتیں کسی ایسے طریقے پر پوری کرنے پر مجبور ہے جو سماج اور قانون کی نظر میں گناہ اور جرم ہے بھوکے کو کھانا چاہیئے مگر تمھیں خوراک جائز ہو یہ نہیں کہ ہم چوری کریں کسی کا گلا گھونٹ دیں اور اس طرح اپنی روزی حاصل کریں میرا خیال ہے اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ امیر اور غریب میں کون اپنے کھانے کو جائز طریقے سے حاصل کرتا ہے......"

ابھی یہیں تک بات ہو پائی تھی کہ ایک مسلمان دوڑا دوڑا آیا اور کشن لال کے قدموں پر سر پٹکنے لگا منوہر ہکا بکا رہ گیا کہ بات کیا ہے کشن لال نے نووارد کا سر اُٹھایا اور کہا سلیم میاں اس قدر بدحواس ہونے کی ضرورت نہیں، "مشکلے نیست کہ آساں نہ شود"۔۔

سلیم نے سر اُٹھایا اور ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا" اگر آپ نے فوراً مدد نہ کی تو کان ندے میری جائداد کا ستیاناس کر دیں گے حضور فوراً — کوئی کام کریں ورنہ میں لُٹ جاؤں گا۔"

منوہر کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی اُس نے پوچھا" سلیم کا کا؟ یہ کون سے کان ندے ہیں جو آپ پر ظلم ڈھا رہے ہیں"

"عدالت کا ایک چپراسی دو چوکیدار کے ساتھ میرے دروازہ پر اُدھم مچا رہا ہے۔ لوٹا تھالی دیگ برتن گھر میں گھس کر نکال ڈالا گویا اس سے چارپائیں دو بچھڑے اُٹھ بیل اور دو بھینس کھول لیں اور کہتا ہے اِن ساری چیزوں کو گوپال گنج عدالت میں جمع کر دوں گا" پھر اس نے کشن لال کو مخاطب کر کے کہا" میں لُٹ جاؤں گا سرکار جلدی کیجئے ورنہ یہ چپراسی مجھے کہیں کا نہ رکھے گا"

کشن لال نے کہا" تم خاطر جمع رکھو میں اپنا نوکر بھیج کر اُسے یہیں بلا لیتا ہوں"

" ذرا میں بھی سنوں آخر بات کیا ہے؟" منوہر نے پوچھا

کشن لال نے کہا" جب تم وکالت کرنے لگو گے تب تمھیں یہ باتیں سمجھ میں آئیں گی" پھر انھوں نے سلیم سے کہا" تم جاؤ ابھی میں اپنا نوکر بھیجتا ہوں چپراسی کے ساتھ تم بھی آجانا ہاں یہ تو کہو تمھارے پاس کچھ نقد روپے ہیں؟"

" حضور ابھی تو ہاتھ بالکل خالی ہے دس پانچ کا انتظام ہو سکتا ہے البتہ گھر والی کے زیورات ہیں کہئے تو ایک دو لیتا آؤں"

" ضرور لیتے آؤ روپے تو میں تمھیں یوں بھی دے سکتا تھا مگر جانتے ہو زمانہ خراب ہے کسی پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اگر میاں حسین بخش کے پاس تمھارا ہینڈ نوٹ نہ رہتا تو تم اُن کے پچاس روپے غائب ہی کر چکے ہوتے کیسے کسی پر اعتماد کیا جائے تعجب ہے تمھارے خلاف میاں حسین بخش جیسے فرشتہ صفت انسان کو نالش کرنے کی ضرورت پڑی"

" مگر حضور کچھ میری بھی سُنئے گا"

" خاموش" کشن لال نے ڈپٹ کر کہا" میاں حسین بخش تمھاری طرح بے ایمان نہیں انھوں نے تم پر نالش کی تمھارے نام سمن (summon) نکلا مگر تم نے سمن لینے سے انکار کر دیا اب یکطرفہ ڈگری ہو گئی تو خمیازہ کون بھگتے گا؟"

" مگر پچاس کی جگہ سَو روپے اُنھیں ادا بھی کر چکا ہوں"

"تمھیں بات تم اجلاس میں جا کر حاکم سے کہہ دیتے۔ تم نے ثمن لینے سے انکار ہی کیوں کیا تھا"

"مگر حضور کسی چپراسی کی صورت بھی تو نظر آئی"

"تو چپراسی نے جھوٹی رپورٹ دی؟"

"اب حضور جو سمجھیں مگر میں تو بالکل بے قصور ہوں"

"خیر مجھ سے بحث کر کے تم چپراسی کو احکام کی تعمیل سے روک نہیں سکتے میرے نوکر کے ساتھ جاؤ اور چپراسی کو یہیں لیتے آؤ"

کشن لال نے اپنے نوکر کو سلیم کیساتھ بھیج دیا اور منوہر کی طرف مخاطب ہوئے

منوہر نے پوچھا۔ تو یہ سلیم میاں حسین بخش کے قرضدار ہیں"

"کیا کہوں منوہر ان کسانوں کے دماغ کو کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں نے خراب کر رکھا ہے" کشن لال نے کہنا شروع کیا۔ "ورنہ یہ سلیم آدمی بڑا اچھا تھا آزادی کے بعد ان کسانوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ حکومت کا قانون آزادی کے ساتھ ہی ختم ہو گیا اگر عدالت فوجداری تھانہ پولیس نہ رہے تو یہ کسان دن دھاڑے ڈاکہ ڈالنے لگیں سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کو تو بس مفت کی کرسیاں چاہئیں جھوٹی ہمدردی جتا جتا کر دیہات کے جاہل اور ان پڑھ کسانوں کو اپنے دامِ فریب میں پھنساتے ہیں تاکہ آئندہ الکشن میں انھیں کسی طرح ووٹ مل جائیں مگر وہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ ہندوستان کی سرزمین سوشلزم کے لئے ہموار نہیں صرف ہلڑ مچانے سے کیا فائدہ وعدوں اور نعروں سے انسان زندہ نہیں رہ سکتا؟"

"مگر کانگریس کی کوئی مخالف پارٹی جب تک برسرِ اقتدار نہ ہو اس کی طرف سے بدگمانی اسوقت زیب نہیں دیتی"

"لیکن ہمیں بھی تو بھگوان نے عقل دی ہے سوشلزم کا کوئی اصول قابلِ تسلیم ہے؟"

"جس چیز کا تعلق عمل سے ہے اسے میں صرف باتوں سے کیونکر سمجھا دوں"

"یہی تمھاری کمزوری ہے بات ایسی کہو جو قابلِ قبول ہے"

باتوں ہی باتوں میں گیارہ بج گئے کشن لال اور منوہر کی گفتگو بڑی خشک تھی منوہر کشن لال سے ایسی باتیں کرنے کے لئے تیار نہ تھا کشن لال شرافت کو دولت کے پلڑے تولنا چاہتے ہیں یہ دولت کو شرافت کی ضد سمجھتا تھا دونوں کے خیال میں زمین آسمان کا فرق تھا کالج کی سوسائٹی اور نئی تعلیم نے منوہر کے روشن خیال [illegible] ڈالا تھا اور دیہاتی تنگ زندگی نے کشن لال کے دائرۂ خیال [illegible] تھا کشن لال کا خیال تھا ہندوستان میں کمیونزم کا اقتدار ہو ہی نہیں سکتا اور منوہر سوچتا تھا آج نہ کل ساری دنیا سرخ ہو جائے گی۔

غزل

ڈاکٹر کے۔ کے۔ رشی ۔ کوروکشیتر یونیورسٹی

حادثہ کیوں زوال کو سمجھو ۔ اپنے ماضی سے حال کو سمجھو
زیست نغمہ ہے تم اگر پا سکے ۔ سُر کو پہچانو۔ تال کو سمجھو
حُسن خود عشق کا تلاشی ہے ۔ حُسن کی چال ڈھال کو سمجھو
پانا چاہو صحیح جواب اگر ۔ دیکھو پہلے سوال کو سمجھو
یہ مسائل ہی ہے زوالِ بھی ۔ زندگی کے کمال کو سمجھو
راز پالو گے تم مسرت کا ۔ غم کو جانو ملال کو سمجھو
اُڑ گئے رنگ کتنے چہروں سے ۔ عارضی تم جلال کو سمجھو
دشمنوں ہی سے باخبر نہ رہو ۔ دوستوں کی بھی چال کو سمجھو
شعر اپنے رشیؔ ہیں گو سادہ ۔ تم ان کے گہرے خیال کو سمجھو

تذکرہ شعرائے اُجین

از محمد خالد عابدی (اندور)

عبدالرحیم حسرت قریشی

آپ ۲۵ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں اجین میں پیدا ہوئے تھے۔ گوالیار ریاست کے قوانین کا مطالعہ کرکے کسی وکیل کے منشی ہو گئے تھے۔ کچھ عرصے بعد علحدگی اختیار کرلی اور آزادانہ طور پر عرائض نویسی کرنے لگے۔ آپ کا شمار عدالت کے بہترین منشیوں میں ہوتا تھا عالم شباب میں آپ کو شاعری کا شوق ہوا تو عبدالغفور محیا قریشی اور امیر اُجینی کی مشترکہ صلاح سے آپ نے سید کرامت علی بشر سے اپنے کلام پر اصلاح لینی شروع کی۔ اپنے ایک شعر میں اس کا اشارہ بھی کیا ہے ؎

حسرت میں قابلیت فکر سخن نہ تھی
شاعر ہوا تو بہ فیض بشر ہوا

آپ کا کلام "آفتاب مالوہ اُجین اور نگار" کے علاوہ دیگر رسائل میں اکثر شائع ہوا کرتا تھا۔ آپ کا کلام پختگی، آمد روانی اور فصاحت کا غماز ہے۔

عبدالرحیم حسرت قریشی کے فرزند واجد قریشی کو بھی ورثے میں شاعری ملی ہے انہوں نے اپنے والد کی شاعری کے بارے میں یہ رائے قائم کی ہے کہ "وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے اور شعر و ادب کے نئے رجحانات پر وسیع نظر رکھتے تھے وہ ابہام مصروں میں مدھیہ پردیش کے ان شعرا میں سے ہیں جنہوں نے کامیاب تضمینیں بھی لکھی ہیں۔ تحریک آزادی میں بھی شریک رہے حسرت قریشی کو ان کی نظم "مشورہ" جو انہوں نے تحریک آزادی کے اندولن سے متاثر ہو کر کہی تھی چنانچہ پولیس کو ان کی تلاش تھی اتفاق سے اُن دنوں وہ اجین سے باہر تھے یہ گویا حسرت قریشی پر بغاوت کا الزام تھا۔ اُن کی نظم مشورہ کا آخری بند ملاحظہ فرمائیں اور اُن کی جسارت کی داد دیں کہ انہوں نے اقتدار کو کس سختی سے جھنجھوڑا ہے ؎

غریبی کو جہاں گنجائشیں ہوں سانس لینے کی
قدم چومے جہاں آسودگی اُس دیس میں چلئے
غلاموں کا وطن ایماں فروشوں کی یہ بستی ہے
مرے نزدیک تو رہنا یہاں توہین ہستی ہے

اجین کے بزرگ شاعروں میں یہ امر مشہور ہے کہ شہر بھوپال کے کسی طرحی مشاعرہ میں جب نیاز فتحپوری نے عبدالرحیم حسرت قریشی کا ایک مطلع سُنا تو انہوں نے حیاۃ اُجینو اور بلسا اُجینی کے روبرو حسرت قریشی کے لئے توصیفی کلمات ادا کئے اور کہا کہ کاش کہ میں اس شاعر سے مل سکتا۔ بہر کیف وہ مطلع یہ تھا ؎

اُف یہ کس کی آرزوؤں کا جنازہ جائے ہے
جو بھی آتا جائے ہے کاندھا لگاتا جائے ہے

عبدالرحیم حسرت قریشی کا ۲۳ ستمبر ۱۹۶۰ء کو انتقال ہوا۔ آپ کا مجموعۂ کلام "سفینۂ گل" کے نام سے اُن کے فرزند واجد قریشی قدرت کے پاس محفوظ ہے۔ گزشتہ سال مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی نے حسرت قریشی اُجینی کے مسودہ پر مالی امداد بھی منظور کی ہے۔

نمونۂ کلام

قدم اُٹھائے اگر یہ عزم صحیح انساں تو کیا نہیں ہے
وہیں وہیں آسرا ملے گا جہاں جہاں آسرا نہیں ہے
تری نگاہ خود آگہی کو شعور خود آشنا نہیں ہے
مقام کیا کیا میں نے زندگی کے مجھے ابھی کچھ پتا نہیں ہے
نئی نئی راہ سوجھتی ہے جنون ذوق طلب کو میرے
وہیں ہے سرگرم جستجو یہ جہاں کوئی راستا نہیں ہے
مری نگاہوں سے دور رہ کر سمجھ نہ اپنے کو دور مجھ سے
نگاہ و دل میں جو فاصلہ ہے وہ فاصلہ فاصلہ نہیں ہے
یہی وہ سوز تمام ہے جس نے عمر سوز دوام دی ہے
غم محبت سے مطمئن ہوں غم محبت میں کیا نہیں ہے

جبیں ہستی کو جگمگائے گی میری شان نیازمندی
جنوں ہے عشق وفا کا مجھکو غرور عشق وفا نہیں ہے

...ہے انسانیت کا جوہر خودی سے دامن چھڑانا حسرتؔ
خدا پرستی ہے خود شناسی خودی حریف خدا نہیں ہے

...یہ کس کی آرزوؤں کا جنازہ جائے ہے
...جو بھی آتا جائے ہے کاندھا لگاتا جائے ہے

...مقام عشق پہ پہوں کون سی منزل ہے یہ
ضبط ہی کرتے کرتے بنے ہے اور نہ تڑپا جائے ہے

یا تمام مریض عشق مایوسی کی موت
جو سہارا تھا غموں کا بے سہارا جائے ہے

...و ظالم کہ یہ فریاد ہے مظلوم کی
اس کمال سے تیر چھوٹے ہے تو اونچا جائے ہے

...ائے ہوش مندی یہ بیان دل گداز
تیرا دیوانہ تو دیوانہ بنا تا جائے ہے

کا میرا سا سنا کیسے ارادہ بات تھی
سوچ کر اس راہ میں کب پاؤں رکھا جائے ہے

...ئی غربت کا عالم غم کے ماروں سے نہ پوچھ
آپ ذرا سی چھاؤں مل جائے تو بند آ جائے ہے

...نے ہی والی ہے میت حسرتِ ناشاد کی
تم بھی ہو آؤ کہ مرا اپنا پرایا جائے ہے

...قصود علی مقصود اُجینی

آپ ۱۹۱۸ء میں اُجین کے ایک مولوی ...ندان، مولوی عبدالرحمٰن کے یہاں پیدا ہوئے۔ نانا صوفی ...ی عبدالعزیز چشتی قادری انظامی پائے کے ولی گزرے ہیں ...کا مزار مولانا مغیث الدین موج رحمۃ اللہ علیہ کے احاطہ قبرستان ...شہر میں واقع ہے۔ یہاں ۱۰ اور ۱۱ ربیع الاول کو عرس ...لی اور بھنڈارہ ہوتا ہے۔ مقصود اجینی نے ابتدائی تعلیم کے بعد ...بہ مدرسہ علی مدرسہ سے مزید تعلیم حاصل کر کے ادیب ماہر اور کامل ...متحانات جامعہ اردو علی گڑھ سے پاس کیے۔ سلطان احمد صدیقی ... آپ کے بارے میں لکھا ہے کہ :-

"شاعری کا شوق گھر کے ماحول سے نوجوانی میں ہوا۔ ابتدائی کلام پر عمدۃ الشعراء استاد حیدر اجینی سے اصلاح لی اس کے بعد خود اپنی طبیعت کو استاد بنایا۔ بزم شعراء کے رکن رہے جو کہ حیدر صاحب کے زیر نگرانی قائم ہوئی تھی۔ "بزم ادب" اور "بزم اہل ادب" کے ماہانہ اور سالانہ مشاعروں اور نشستوں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ آپ نے سب ہی اصناف سخن پر طبع آزمائی کی مگر طبیعت کو غزل گوئی سے زیادہ رغبت ہے۔ دہلی اسکول شاعری کا تتبع کرتے ہیں۔ کلام میں پختگی ہے آمد ہے اور روانی ہے۔ آپ پابند صوم و صلوٰۃ، خوش اخلاق ملنسار انسان ہیں۔ نام و نمود سے کتراتے ہیں۔"

نمونۂ کلام

تری بے رخی کو سنوار کر غم دو جہاں سے گزر گیا
میں وہی تو وجہ سکوں ہوا جو نسیم گل سے گزر گیا

کبھی تیرے ظلم شدید سے کبھی تیرے جور و مزید سے
مجھے یاد آئے تو یاد کریں کہاں کہاں سے گزر گیا

تیری بے رخی بے جا مگر تجھے کیا خبر رہ پُر خطر
کہ غبار غم مرے بھیس میں سر کارواں سے گزر گیا

ہے مجھے بھی علم کہ آہ میں پس سجدہ اپنی نگاہ میں
کئی حسرتوں کو لیے ہوئے تیرے آستاں سے گزر گیا

ترا آتے جاتے وہ دیکھنا مرا اس کے بعد یہ سوچنا
کہ وہ لمحہ کتنا حسین تھا جو ابھی یہاں سے گزر گیا

ارزانی موت کیا کہیے تسکین تن و جاں کی خاطر
کاغذ سے خرید کے گولیاں کھاتے ہیں جو اپنے پیاروں کو

اک درد تھا جو دل باقی ہے اشکوں کے سمندر سوکھ گئے
اب یاد کیا کرتا ہوں میں حالات کے بہتے دھاروں کو

مقصود سلگتے موسم میں ہم مرد حوادث کیا سمجھتے
حالات غم دل کیا لکھتے کچھ پوش نہ تن کا ساتھ گو

شاید یہ سوچ جہان کا عطیہ یہ سوچ کر
ہر غم کا ہم نے ناز اٹھایا ہے عمر بھر

کیا اب بھی ان کو بوئے محبت نہ آئے گی
مقصود ہم نے دل کو جلایا ہے عمر بھر

رام لعل نابھوی کا مزاح

ڈاکٹر انور سدید
(پاکستان)

اُردو ادب میں رام لعل نابھوی بڑی دیر سے وارد ہوئے اس سے قبل افسانہ نگار رام لعل اُردو ادب میں اپنے نام کا سکہ قائم کر چکے تھے چنانچہ المیہ یہ ہوا کہ جب رام لعل نابھوی کے مضامین اخبارات و جرائد میں چھپنے لگے تو انہیں بیشتر رام لعل افسانہ نگار سے منسوب کیا جاتا رہا۔ ہرچند رام لعل افسانہ نگار بھی طنز و مزاح کا رچا ہوا مذاق رکھتے ہیں اور ان کے افسانوں کے لفظوں سے کبھی کبھی مزاح کی ایک شوخ کرن یا اکثر اوقات طنز کی جراحت بھی سر ابھارتی ہے تاہم اُنھوں نے مزاح کو بطور ایک منفرد صنف اظہار کے کبھی قبول نہیں کیا۔ اس دلچسپ صورتِ حال کا سامنا درحقیقت رام لعل افسانہ نگار کو کم اور مزاح نگار رام لعل کو آمادہ کرنا پڑا۔ میں ان کے استقلال اور ثابت قدمی کا بے حد قائل ہوں کہ اُنہوں نے نہ صرف منفرد الگ پہچان کروائی بلکہ اپنے نام کی تبدیلی کو بھی قبول نہیں کیا اور اب وہ نہ صرف معروف مزاح نگاروں میں شمار ہوتے ہیں بلکہ اُن کی اولین کتاب "تبسم" پر ڈاکٹر وزیر آغا جیسے نقاد نے پیش لفظ لکھا ہے جس کی بازگشت اب ادبی حلقوں میں مسلسل سُنی جا رہی ہے۔

رام لعل نابھوی اُردو مزاح کی نئی آواز ہیں۔ اس کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اُنہوں نے ادب اور مزاح کو وظیفۂ حیات اُس وقت بنایا جب ان کا دامن زندگی کے تجربات سے بھر چکا تھا۔ وہ بعض نوجوان ادبا کی طرح منشی بھر تجربے لیکر میدانِ ادب میں نہیں کودے۔ بلکہ ان کے مزاح کے پس پشت زندگی کے بے شمار گرم و سرد سال جگمگا رہے ہیں اور رام لعل نابھوی فراز کوہ پر بیٹھ کر ان لمحات پر کشادہ دلی سے ایک ایسی نظر ڈالتے ہیں جس سے ایک شوخ سی مسکراہٹ خود بخود جنم لے لیتی ہے۔ یہ مسکراہٹ ایک آزادہ فکر ادیب اور کشادہ نظر انسان کی مسکراہٹ ہے۔ جس نے زندگی کے ماہ و سال طوعاً و کرہاً نہیں گزارے بلکہ جس نے زندگی کو سمجھا بھی ہے اور برتا بھی ہے۔ اس قسم کے ادیب کے ہاں یہ حوصلہ ہوتا ہے کہ اپنی کامیابیوں کو پرِ کاہ کی حیثیت بھی نہ دے لیکن اپنی ناکامیوں پر کھل کر قہقہہ لگائے۔ زمانے کو ہنستا دیکھے تو رونے لگے اور دُنیا رو رہی ہو تو اس کی آنکھوں میں ستارے جگمگانے لگیں۔ وہ یکسانیت اور ہمواریٔ زندگی پر طنز کرتا ہے اور ناہمواریوں کو اُجاگر کرتا چلا جاتا ہے۔ رام لعل نابھوی کا شمار ایسے لوگوں میں ہی کرنا چاہئے کہ اُن کے ہاں زندگی کو برتنے کا ایک سلیقہ نظر آتا ہے اور وہ اس سلیقے کو جب مزاح میں استعمال کرتے ہیں تو آپ کی سوچ کو بھی کروٹ مل جاتی ہے، اور آپ بے اختیار چونک پڑتے ہیں کہ زندگی کی تصویر کا ایک پہلو یہ بھی تھا۔

رام لعل نابھوی کا مزاح ایک بے ساختہ کیفیت کو سامنے لاتا ہے، یعنی وہ مزاح پیدا نہیں کرتے، مزاح خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کی تحریریں پڑھ کر مجھے بمبئی ٹاکیز کا وہ مشہور ایکٹر جس کا نام وی۔ ایچ۔ ڈیسائی تھا اور جس نے جھولا، بسنت قسمت وغیرہ فلموں میں اداکاری کا عمدہ مظاہرہ کیا ہے بے اختیار یاد آ رہا ہے۔ اس اداکار کی خوبی یہ تھی کہ وہ چارلی کی طرح چہرے کو بگاڑ کر یا اُچھل کود سے مزاح پیدا نہیں کرتا تھا بلکہ وہ جونہی اسٹیج پر نمودار ہوتا تو لوگ اُسے دیکھتے ہی ہنسنے لگتے۔ بے اختیاری کی یہ کیفیت رام لعل نابھوی کے ہاں بھی موجود ہے۔ میں اُسے مزاح کا معصوم زاویہ قرار دیتا ہوں کہ وہ بظاہر سنجیدہ گفتگو کر رہے ہیں لیکن درحقیقت مزاح پیدا کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر اُن کا ارشاد ہے۔

"اِس کتاب کا دیباچہ محض اِس لئے لکھا گیا ہے کیونکہ ہر کتاب کا ایک دیباچہ ہوتا ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ بغیر دیباچے کے کتاب کو کتاب ہی سمجھا نہیں جاتا۔"

آپ نے دیکھا اُنہوں نے کس معصومیت سے دیباچہ لکھنے کا جواز پیدا کیا اور اس کے ساتھ ہی کس خوبصورتی سے دیباچہ

نگاری کو طنز و مزاح کی زد میں بھی لے لیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ رام لعل نابھوی یہ دیباچہ لکھنے کے بعد اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں اور مزاح کو مجسم کرنے کے لئے کتاب کے باقی صفحات خالی چھوڑ دیں (پروفیسر ریاض مجید "سفید کتاب" ایڈیشن کر کے یہ کارنامہ سرانجام دے چکے ہیں) مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور اپنی کتاب میں کم و بیش اُنیس مضامین بھی شامل کئے ہیں۔ ان مضامین سے اُن کے مزاح کے نہ صرف انفرادی گوشے سامنے آتے ہیں بلکہ اُن کے مزاح کے بارے میں ایک مجموعی تاثر بھی مرتب ہوتا ہے۔ میں اِس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل پیش کرتا ہوں۔

رام لعل نابھوی کی اوّلین خوبی یہ ہے کہ اُنہوں نے آنکھ خارج کی طرف کھول رکھی ہے اور زندگی کو نسبتاً فاصلے سے دیکھتے ہیں، اُن کے ہاں گھمسان میں گھسنے اور کھوٹے سے کھوا چھلنے کا عمل موجود نہیں۔ تاہم دلچسپ بات یہ ہے کہ رام لعل نابھوی کا مزاح زیادہ تر صورتِ واقعہ سے اُبھرتا ہے۔ وہ زندگی کے ہنگام سے ایسے واقعات کو منتخب کرتے ہیں جن کے دُہرانے سے مُسکراہٹ کو تحریک ملتی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے ابوہ کو زیادہ اہمیت دی ہے اور ان مجمعوں کو اپنے مزاحی عمل کا موضوع بنایا ہے جن کا رُخ عوام کی طرف ہے۔ مثال کے طور پر مشاعرے، ادبی نشستیں، صبح کی سیر، ریام لیلا، جھنکیاں، راگ رنگ کی محفلیں دیکھ کر اُن پر ایک مخصوص قسم کی بشاشت طاری ہو جاتی ہے اور اُن کے قلم سے مزاح بے اختیار ٹپکنے لگتا ہے۔ ایک مشاعرے کا آغاز دیکھئے۔

"مشاعرہ کا آغاز ہونے والا ہے۔ شعراء نے بیاضیں سنبھال لی ہیں۔ شیروانیوں کے بٹن ڈھیلے کر دیتے ہیں گلا صاف کرنے کے لئے کھنکارنا شروع کر دیا ہے۔ ان میں فرّ بولنے والے۔ رُک رُک کر بولنے والے۔ آہستہ بولنے والے۔ تیخ کر بولنے والے۔ ناک میں بولنے والے۔ لکنت سے بولنے والے۔ سبھی قسم کے بولنے والے موجود ہیں۔ کچھ طرزا لائے ہیں۔ کچھ داغ کا حق ادا کرا لاتے ہیں۔ کچھ اشعار آبدار۔ غزلیں ساحت تار لائے ہیں۔ کچھ نئی بات نئے رنگ میں سنائیں گے کچھ پرانی بات پرانے ڈھنگ میں سنائیں گے۔ کچھ خوش گلو جھوتے ہوئے بس ترنم سے سنائیں گے۔ کچھ نظم کو نثر کی طرح کچھ نثر کو نظم کی طرح پڑھیں گے۔۔۔ کسی کے مضمون اور بیان دونوں غلط ہونگے۔ کچھ اچھوتا شعر کہیں گے۔ اور داد ملنے پر سلام بھی نہیں کریں گے۔"

[ایک نشست]

آپ نے دیکھا۔ رام لعل نابھوی نے سامعین کی صف میں فاصلے پر بیٹھ کر آپ کو ایک نشست کی واقعاتی تصویر کس خوبصورتی سے دکھا دی ہے اور خوبی کی بات یہ کہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے سوا انہوں نے آپ کو ہونٹ کھولنے اور دانت دکھانے کی زحمت بھی نہیں دی۔

ان کے مضمون رسمِ اجراء کا ماجرا یہ ہے کہ اس میں بظاہر بچوں سے خطاب کرتے ہیں لیکن باتوں باتوں میں کمالِ خوبصورتی سے کتابوں کی، رسمِ اجراء سے جو ناہمواری عمل میں آتی ہے اُسے مؤثر طنز بھی بنا ڈالتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"لو بچو۔ آج میں تمہیں رسمِ اجراء کے بارے میں بتاؤں گا۔ رسمِ اجراء کے معنی ہیں کسی چیز کے جاری کئے جانے پر اس کی رسم ادا کرنا۔ یہ رسم کسی چیز کے لئے بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن ادیبوں نے کمالِ ہوشیاری سے اُسے اپنے لئے محدود کر لیا ہے۔ یہ رسم حال ہی کی پیداوار ہے لیکن اس رسم نے بڑی ترقی کی ہے۔ یہ بات باعثِ حیرت ہے کہ جس رسم کی پیدائش پر کوئی رسم ادا نہیں ہوئی نہ اس کے اجراء کی رسم کی گئی۔۔۔ پچھلے دنوں میں ادیب رسمِ اجراء اس لئے ایجاد نہیں کر سکے کیوں کہ وہ اپنی شہرت کو معیوب سمجھتے تھے۔ اب وہ بات نہیں۔ اب تو بہت سے ادیب گمنام ادیبوں کی تخلیقات رد و بدل کر کے اپنے نام سے چھپواتے ہیں۔ تو بچو ملک میں حالات تیزی سے بدل رہے ہیں لڑکے لڑکیاں نظر آتے ہیں لڑکیاں لڑکے نظر آتے ہیں۔ ادب تو نام ہی نئی بات پیدا کرنے کا ہے۔۔۔۔"

اِس اقتباس سے رام لعل نابھوی کی ایک خصوصیت یہ بھی نظر آتی ہے کہ وہ "رسمِ اجراء" انشائیہ کو ایک خاص موڑ پر لاکر اس کا رُخ اچانک کسی اور نامعلوم جہت کی طرف موڑ دیتے ہیں

کے اقتباس میں "رسمِ اجرا" ہی اُن کی توجہ نہیں ۔۔۔
کھینچ رہی بلکہ اُنہوں نے پورے معاشرے کی خامیوں کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ اور رسمِ اجرا کا ذکر کرتے کرتے وہ اچانک لڑکوں کو لڑکیوں کی صورت میں۔ اور لڑکیوں کو لڑکوں کی شکل میں نظر آنے کے عمل کی طرف مڑ جاتے ہیں اور یوں طنز کے دائرے کو اسکول اور مدارس داخل کر دیتے ہیں۔

سجاد نقوی نے لکھا ہے کہ رام لعل نابھوی کا مزاح خود رو ہے یعنی انہوں نے اپنی راہ خود تراشی ہے۔ اُن کے مضامین سے ملاقات، لفافہ، مہمان، قواعد محفل طنز و مزاح پڑھ کر صاف نظر آتا ہے کہ اُن کا سلسلۂ ادب کنہیا لال کپور جیسے مزاح نگاروں سے جا ملتا ہے۔ یوں بھی اُنہوں نے ادب اور ادیب کو کنہیا لال کپور کے انداز میں ہی نشانۂ طنز بنایا ہے۔ تاہم سجاد نقوی صاحب نے بھی اپنا فیصلہ کچھ غلط نہیں دیا۔ رام لعل نابھوی کے مضامین "امداد سے ملاقات" "اعتقاد اور انسان" وغیرہ میں اُن کی اپنی انفرادی سوچ نمایاں نظر آتی ہے۔ اور مزاح بہر رنگ رقیبِ تقلید نظر آتا ہے ڈاکٹر وزیر آغا نے "امداد سے ملاقات" کو نہ صرف رام لعل نابھوی کا ایک اہم مضمون شمار کیا ہے بلکہ لکھا ہے کہ "اسمیں مزاح زیریں لہر کی طرح مزاح نگار کی سوچ کی کروٹوں میں رواں دواں دکھائی دیتا ہے۔ اور یہ   کی چیز ہے" میں سمجھتا ہوں کہ مزاح کے سب سے بڑے نقاد کی طرف سے رام لعل نابھوی کو یہ خراجِ تحسین ہی نہیں بلکہ اس بات کی گواہی کو اُن کے فن میں زندہ رہنے کی سکت موجود ہے۔ میں نے اُن کی کتاب "تبسم" عنوان سے لیکر پرنٹ لائن تک پڑھی ہے۔ اور بے حد محظوظ ہوا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وزیر آغا صاحب نے تذکرہ بلا الفاظ سے رام لعل نابھوی کے قلم کو اعتماد ہی نہیں بخشا بلکہ اُردو طنز و مزاح کو نوید دی ہے کہ ابھی اس کا مستقبل مضبوط ہاتھوں میں ہے۔

بقیہ صفحہ ۱۲ کا :- انتخاب بھی نہیں تھا۔ بہر حال مائیک پر آکر وہ چار شعر سنائے اور بیٹھ گئے۔ اُنہیں داد برابر ملی ہی

تھی۔ سامعین اور شعراء کے کلام اُن کے اس غیر متوقع رویے سے ناخوش گواری کا اظہار کر رہے ہیں۔ اُن کے دو شعر نذر کئے جا رہے ہیں ۔

ہمیں عجب ہے کہ سچ بولنا فضول ہے ٭ مگر نتیجہ صفر کے سوا کچھ اور نہیں
خون ریزی کا اک سلسلہ سا ہے ٭ لاشوں کا ڈھیر ہے خدا ساتھ ہے

اس طرح یہ مشاعرہ رات کے ڈھائی بجے ختم ہو گیا۔ بہر حال مشاعرہ کامیاب رہا جس کے لئے منتظمین مشاعرہ بالخصوص اختر شاہجہانپوری۔ قیصر شکیلی۔ ڈاکٹر یوسف گوہر وغیرہ مبارکباد کے مستحق ہیں جن کی انتھک کوششوں سے اس مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا۔

خلیل انجم

غزل

ڈاکٹر شمیم قدوائی (بارہ بنکوی)

سوز باقی ہے نہ اب دردِ جگر باقی ہے
یہ تمنا کہ ملوں اُن سے مگر باقی ہے
عہدِ رفتہ کی جفاؤں کا اثر باقی ہے
رات رو رو کے گذاری ہے سحر باقی ہے
سامنے آگئے جب وہ تو کیسے ہوش رہا
ہم یہ سمجھے تھے ابھی تابِ نظر باقی ہے
لے کے آیا ہوں ازل سے ہی مقدر ایسا
گردشوں کا مرے دامن پہ اثر باقی ہے
جشن ہم نے شبِ ہجراں میں منایا غم کا
نوکِ مژگاں پہ ابھی ایک گہر باقی ہے
اک زمانہ ہوا جب چوٹ لگی تھی دل پر
مدتیں بیت گئیں ٹیس مگر باقی ہے
گردشِ وقت نے لوٹا ہے کچھ اس طرح شمیم
اور تو کچھ نہ بچا حسنِ نظر باقی ہے

ڈاکٹر شمیم قدوائی۔ بارہ بنکوی